شرح
دیوانِ غالب (اُردو)
از
شادان بلگرامی

# غالب کی دوسویں سالگرہ

دوسویں (۲۰۰) سالگرہ ولادت حضرت غالب علیہ الرحمہ کے مبارک موقع پر خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے شرحِ دیوانِ غالب اُردو سے بہتر کوئی اور تحفہ نہیں ہو سکتا۔ غالب اُردو کے تاریخ ساز اور نابغہ روزگار شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ دُنیائے ادب میں ایک نئی رُوح پھونک دی جو رہتی دُنیا تک برقرار رہے گی۔

# اسنی المطالب

یعنی

# شرح دیوان اُردوئے

# حضرت غالب علیہ الرحمہ

از

تالیفات

پروفیسر سیّد اولاد حسین شادان بلگرامی مرحوم

مصنف

اکتیس فرہنگ وشروح وملخصات وتراجم وتصیحات کتب و

نصابہائے یونیورسٹیز

۱۹۹۷ء

اشاعتِ اوّل : ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۹۹۷ء

صفحات : ۶۸۸

تعداد : ایک ہزار

کتابت : سیّد اشفاق احمد

طباعت : پرنٹنگ محل، ناظم آباد۔ کراچی
کراچی

قیمت : تین سو روپیہ

ناشر و ملنے : سیّد احمد رضا بلگرامی

کا پتہ : الیف ۸۶۔ بلاک بی۔ نارتھ ناظم آباد
کراچی ۷۴۷۰۰

فون : ۶۶۴۷۹۹۸

## پیش لفظ

ڈاکٹر جمیل جالبی

سید اولاد حسین شاداں بلگرامی (۱۸۷۰ء - ۱۹۴۸ء) اپنے وقت کے جید عالم اور فارسی زبان و ادب کے نامور اُستاد تھے۔ ساری عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزاری۔ اُن کے بے شمار شاگرد برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے جن میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، علامہ عبدالعزیز میمن، عزیز لکھنوی، شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی، محمد علی خاں اثر، ڈاکٹر محمد باقر پرنسپل اورینٹل کالج لاہور اور سید ابن حسن جارچوی کے نام ہماری علمی و تہذیبی تاریخ کا روشن حصہ ہیں۔ تیس کے قریب ان کی مطبوعہ تالیفات ہیں جن سے فارسی زبان و ادب کے طلبہ نے اپنے زمانے میں خوب فیض اُٹھایا اور جن میں مستند کتابوں کی شرحیں، فرہنگیں اور تراجم مثلاً درہ نادرہ مع تصحیح و تحشی، شرح مقامات بدیعی، شرح بعض قصائدِ خاقانی و قاآنی، فرہنگ حاجی بابا اصفہانی، فرہنگِ دیوانِ فرخی کے علاوہ ترجمہ مرد خسیس و وکلائے مرافعہ، ترجمہ آئینِ اکبری دفتر سوم ابوالفضل وغیرہ شامل ہیں۔

شرح دیوانِ غالب (اُردو) شاداں بلگرامی کی آخری تالیف ہے جو ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی اور اب یہی شرح کم و بیش پچاس سال بعد اُن کے لائق پوتے سید احمد رضا بلگرامی کے ہاتھوں شائع ہو کر سامنے آئی ہے۔ جس کی روداد "عرضِ ناشر" کے ذیل میں انھوں نے لکھ دی ہے۔

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں جن کے کلام کی داد، مشکل گوئی کی وجہ سے، ان کی زندگی میں ویسی نہیں ملی جیسی مرنے کے بعد انہیں ملی اور بقول حامد حسن قادری: "دیوانِ غالب سے زیادہ کوئی دیوان نہ پڑھا گیا، نہ سمجھا گیا، نہ سمجھایا گیا نہ چھاپا گیا۔" اپنی ساری مشکل پسندی، گہری معنویت اور لطافتِ احساس کے باوجود کلامِ غالب کو نوجوان نسل آج بھی دل سے پسند کرتی ہے۔ عام آدمی کو بھی غالب کے شعر یاد ہیں اور خاص بھی ان کی غزلیں پڑھ کر جھوم اٹھتے ہیں۔ غالب کی یہی بڑائی ہے اور اسی لیئے وہ آج بھی ہماری تہذیب اور اس کے طرزِ احساس کے عظیم ترین شاعر ہیں۔

غالب کی اسی مشکل پسندی کی وجہ سے دیوانِ غالب (اردو) کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں جن میں نظم طباطبائی، شوکت میرٹھی، بے خود موہانی، عبدالباری آسی، حسرت موہانی، قاضی سعید الدین، اور آغا باقر کی شرحوں کے علاوہ روحِ کلام غالب (تضمین) از عزیز مرزا آسہار نپوری، بے خود دہلوی؛

کی مراۃ الغالب، حضرت سہا کی مطالبِ غالب، احسان دانش کی رموزِ غالب وغیرہ شامل ہیں ۔
شاداں بلگرامی کی زیرِ نظر شرحِ دیوانِ غالب بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے ۔ ان سب شرحوں کا تقابلی مطالعہ بذاتِ خود ایک دلچسپ موضوع ہے جس سے معانی کی آفاقیت اور رنگا رنگی کے بہت سے راز کھل کر سامنے آئیں گے ۔ ان شرحوں نے کلامِ غالب سے لطف اندوز ہونے کے تخلیقی عمل کو عام کیا ہے ۔ لفظ و خیال کے اشکال کو دور کر کے، انہیں سب کے لئے اتنا قابلِ فہم بنا دیا ہے کہ ہر سطح کا قاری کلامِ غالب سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے ۔ ان سب شرحوں نے کلامِ غالب کو مقبولِ عام بنانے میں بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر شخص نے اپنے اپنے طور پر کلامِ غالب کو سمجھا اور سمجھایا ہے جس کی وجہ سے معانی کی وسعتوں نے خود کلامِ غالب کے اردگرد روشنی کا ایک ہالہ بنا دیا ہے ۔ شاداں بلگرامی نے اپنی شرح دیوانِ غالب سے "ہالے کے اس رنگین مُنوّر دائرے" کو روشن تر کیا ہے ۔ شاداں چونکہ اُستاد تھے اس لئے وہ اشعارِ غالب کا مفہوم اس طرح بتاتے اور سمجھاتے ہیں کہ ذہن کے دریچے وا ہوجاتے ہیں اور مطلب کی صاف ہوا اور معانی کی نسیم، قاری کے ذہن کو تازہ دم کردیتی ہے ۔
خوشی کی بات ہے کہ شرحِ دیوانِ غالب (اُردو) کا یہ مُسوّدہ ضائع ہونے سے بچ گیا اور ان کے فاضل پوتے سید احمد رضا بلگرامی نے، اپنے خرچ سے اُسے چھاپ کر، ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا۔ شرحِ دیوانِ غالب کی اشاعت پر میں انہیں دلی مبارک باد دیتا ہوں ۔ خدا انہیں صحت مند و سلامت رکھے ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

کراچی: ۱۵ر نومبر ۱۹۹۶ء

# انتساب و اہدار

# DEDICATION

میری تالیفات مطبوعہ کے بعد یہ شرح دیوان اردوئے غالب علیہ الرحمہ اکتیسویں ہے۔
ایک لغت جدید فارسی زبان کا ۱۳۵۶ھ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اور تیس ہزار الفاظ الف سے لے کر یار تحتانی تک مع مترادفات انگلیسی بغیر ترتیب حروف تہجی ہر ردیف میں جیسی کہ لغات میں ہوا کرتی ہے جمع کر لئے تھے۔ اور ان کے مترادفات ٹھیٹ اردو کے لکھنے کا بھی ارادہ تھا۔ اور بتیس ہی ہزار کا مواد متفرق موجود ہے۔ مگر بوجوہ چند در چند اس کی تکمیل مجھ سے ناممکن ہوگئی ہے۔ بفرض محال اگر تکمیل کر بھی سکوں تو اس کے صاف کرنے اور چھپنے کے اسباب نہیں، اتنا بڑا کام بغیر اعانت رؤسا و متولین انجام نہیں پا سکتا ہے۔

چوں کہ سرکار ابد قرار اعلیٰ حضرت حضور پرنور ہز ہائنس عالی جناب نواب سید رضا علی خان صاحب بہادر بالقابہ دام اقبالہم و ملکہم خدا اُن کی عمر و دولت و جاہ میں اضافہ فرمائے۔ اور اولاد و احفاد کو پروان چڑھائے۔ اور ہز ہائنس حضرت علیاء کو زندہ و سلامت باکرامت رکھے۔ بڑے رعایا پرور اور علم دوست فضل ایزدی سے ہیں، چنانچہ سررشتہ تعلیم ریاست رامپور کے مصارف پہلے سے دس گنے کر دئے ہیں۔ اور علیگڈھ اور بنارس کی یونیورسٹیوں کی امداد لاکھوں سے فرماتے رہتے ہیں۔ اور سینتالیس سال سے میں اس ریاست کا نمک خوار ہوں لہٰذا ان سے بہتر انتساب و اہدار کے لئے میری نظر میں کون ہو سکتا ہے۔
اگرچہ یہ ہدیہ "زان ملخ پیش سلیمان برون" کا مصداق ہے مگر شرف منسوب الیہ سے اگر اس میں چار چاند لگ جائیں تو کچھ بعید نہیں۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند      آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

---

# عرضِ ناشر

علامہ سید اولاد حسین شاداں بلگرامی رشتہ میں میرے دادا ہوتے تھے اور مجھ سے بہت شفقت فرماتے تھے۔ تقسیم ہند سے غالباً چار پانچ سال قبل جب میں رامپور ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے شرح اُردو دیوان غالبؔ کا ابتدائی کام شروع کر دیا ہے۔

دسمبر ۱۹۴۶ء کو جب میں دادی صاحبہ کی عیادت کو دہلی سے رامپور گیا تو علامہ نے فرمایا کہ شرح مکمل کر کے میں نے شیخ عنایت حسین مالک کوہ نور بک ڈپو کو چھپنے کے لیئے لاہور بھیج دی ہے۔ اس نے ہمیں مطمئن کر دیا لیکن میں برابر معلوم کرتا رہا۔ تھوڑے دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ شیخ عنایت حسین نے علامہ کو اطلاع دی کہ اصل مسودہ کہیں گم ہوگیا ہے اور باوجود تلاش کے کہیں دستیاب نہ ہوسکا۔ اس سانحہ سے فطری طور پر میں بہت رنجیدہ ہوا اور علامہ مرحوم بھی متاثر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد کی ملاقات میں علامہ مرحوم نے فرمایا کہ تم غم نہ کرو۔ اگر مسودہ گم ہوگیا ہے تو میں دوسری شرح اس سے بہتر اور اضافوں کے ساتھ ترتیب دے دوں گا، کیوں کہ بنیادی سب کام ہو چکا ہے ؎

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

کچھ عرصہ کے بعد مرحوم کا ایک خط محررہ یکم جنوری ۱۹۴۷ء ہم کو موصول ہوا جس میں انھوں نے لکھا کہ شرح اردو غالبؔ لکھ رہا ہوں۔

جب میں شملہ میں تھا تو انھوں نے اطلاع دی کہ دوسری شرح بھی مکمل ہو گئی ہے لیکن اب وہ شیخ عنایت حسین کو نہیں دیں گے - یہ جولائی ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ یہ مرحوم کی آخری تالیف ہے۔ اس کے بعد اگست میں پاکستان بنتے ہی میں کراچی آگیا۔

علامہ شاداں بلگرامی کا انتقال

۱۷ر جنوری ۱۹۴۸ء کو بعارضہ سرطان بمقام رامپور ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد جب میں ہندوستان گیا تو علامہ مرحوم کی یہ آخری تصنیف دیکھنے کا موقع ملا - یہ شرح انھوں نے اپنے چچازاد بھائی اور برادر نسبتی سید الطاف حسین مرحوم کو دی جو ان کے ساتھ ہی رہتے تھے لیکن وہ خود اس کو چھپوا سکے اور نہ کسی دوسرے ذریعہ سے یہ چھپ سکی - تھوڑے دنوں کے بعد یہ سب رامپور سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ پھر لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوگیا - یہ شرح علامہ کے حقیقی بھانجے سید دلدار علی المعروف بہ منے آغا المتخلص راز اجتہادی کو ملی - انھوں نے اس کو اپنے بیٹے سید سکندر آغا نقوی کو جو راولپنڈی میں ملازم تھے بھیج دی - انھوں نے اس کی طباعت کی طرف توجہ نہ دی - اس عرصہ میں شیخ عنایت حسین نے پہلی شرح جو گمشدہ تھی - ۱۹۶۷ء میں شائع کر دی۔

---

۱۴ر جنوری ۱۹۴۸ء　　　　ریاست رامپور - یو۔پی۔ محلہ لال قبر
۲ر صفر ۱۳۶۷ھ
یوم چہار شنبہ

بسم اللہ تعالیٰ - دعا

تمہارا کارڈ ۲۰ر اکتوبر کا آیا تھا [illegible] اور کوئی اہم بات نہ تھی اسلئے جواب میں تاخیر ہوئی - نیز شرح دیوان اردوئے غالب لکھ رہا ہوں - دو مہینہ کا سونا چھوڑ دیا - جتنا وقت ملتا ہے اسمیں صرف کرتا ہوں [illegible]

میں نے اپنی دادی کی آنکھوں کے علاج کی نسبت دہلی کے کسی ڈاکٹر کے علاج کا مشورہ دیا ہے جو پسند آیا - امور ذیل کو دریافت کرکے جلد سے جلد جواب دو - وہاں [illegible] اسپتال خصوصیت سے آنکھوں کے علاج کا ہے - [illegible] وہاں سے علاج کرکے آئے ہیں اور بہت مداح ہیں - کہتے ہیں کہ بالکل FREE ہے

امور ذیل دریافت کرکے بہت جلد بتاؤ کیونکہ ۲۰ر جنوری کو [illegible]

مریضوں کو تو رکھتے ہی ہیں - دوسرے دو آدمیوں کو بھی ہمراہ مریض رہنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں جبکہ ساتھی اپنا کھانا خود دیں - کتنے دن اسپتال میں رکھتے ہیں - اور کس محلہ میں ہے اور اسٹیشن سے کتنی دور - اگر تم کو فرصت ہو تو [illegible] اور تاریخ بتانے پر اسٹیشن پر ملو - الطاف اور ان کی زوجہ ساتھ ہونگے - ریل سے اور [illegible] ہی سیدھے مع اسپتال جا سکتے ہیں - اگر [illegible] کی ضرورت ہو تو [illegible] تمہارا کوئی [illegible] ہے [illegible] - اگر ضرورت ہو تو [illegible]

اگر اسپتال پسند آیا تو میں نے الطاف کے ساتھ بھی آنکو لکھتے ہیں - اگر [illegible] بھی دہلی جاکر آنکھیں بنوائیں تو بہتر ہے

دادی - الطاف اور ان کی زوجہ دعا کہتی ہیں

یہ کارڈ سامنے رکھکر جواب لکھنا تاکہ کوئی بات جواب سے رہ نہ جائے

راقم [illegible]
سید اولاد حسین شاداں بلگرامی

---

ہماری جناب نقوی صاحب مرحوم سے علاوہ رشتہ داری کے بچپن کی دوستی تھی۔ ہمارے قیام اسلام آباد میں وہ ہفتہ میں دو ایک مرتبہ ضرور ملنے آجایا کرتے یا میں چلا جاتا - ایک دن وہ اس شرح کو لے کر ہمارے

پاس آئے اور کہا کہ اس وقت پاکستان میں سوائے تمہارے ہمارا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں لہٰذا یہ کتاب میں تم کو دیتا ہوں اگر چھپ سکے تو چھپواؤ ورنہ اپنے کتب خانہ کی زینت بناؤ۔ ہم نے ان سے وعدہ کیا کہ میں کوشش کروں گا کہ اس کو اپنے ذاتی وسائل سے چھپوادوں تاکہ صاحب علم اس سے فائدہ اٹھائیں اور علامہ مرحوم کی کاوش ضائع نہ ہو۔

نقوی صاحب مرحوم نے ۱۹۷۵ء میں کراچی آنے کا وعدہ کیا تھا اور ہم کو بذریعہ خط اطلاع دی تھی کہ آنے کی تیاری کرلی ہے۔ لیکن چند دنوں کے بعد ان کا بس کے حادثہ میں انتقال ہوگیا۔ اب ہمیں اس کی طباعت کی زیادہ فکر دامنگیر ہوئی۔ اس گرانی کے عالم میں مجھ ایسے شخص کے لیے یہ کام بہت مشکل تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد سے الحمد للہ کہ اب یہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر صاحب ذوق اور غالب نواز حضرات کی خدمت میں پیش ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں علامہ مرحوم کی روح سے سرخرو ہوا۔

اس کتاب کی اِدھر سے اُدھر منتقلی میں بداحتیاطی ہوئی جس کی وجہ سے اس کے کثرت سے اوراق پانی کی زد میں آگئے کہ اس کا پڑھنا بہت مشکل تھا۔ ہم نے اس کے لئے ممتاز محقق، نقاد اور ماہر تعلیم جناب ڈاکٹر جمیل جالبی (پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ)۔ ہلال امتیاز۔ ستارہ امتیاز۔ سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی سے رجوع کیا تو وہ باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے راضی ہوگئے۔ اور انھوں نے کافی عرق ریزی سے ہماری اس مشکل کو آسان کردیا۔ اگر ان کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو ہمارے لئے اس کی چھپائی مشکل ہی نہیں بلکہ محال تھی۔ میں اس کرم نوازی کا ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔

سید احمد رضا بلگرامی
بی اے۔ منشی فاضل
نبیرۂ سید اولاد حسین شاداں بلگرامی

---

# فہرست عناوین مقدمہ و سوانح عمری غالبؔ و شادانؔ

## مقدمہ



## سوانح عمری غالب

# فہرست مضامین شرح دیوان اردوئے غالب علیہ الرحمۃ

نوٹ

میرے نسیان کی وجہ سے اعداد وشمار نظم و اشعار قابل اعتبار نہیں صرف تخمینہ اس سے ہوسکتا ہے۔

# مقدمہ

**شعر** ۔ کلام کی دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ نظم اور نثر مابہ امتیاز دونوں میں اگر کوئی شے ہے تو وہ وزن ہی ہے۔ منطقیین جو صرف تخیل کا نام شعر رکھتے ہیں تو یہ ان کی اصطلاح خاص ہے۔ ان کی تعریف شعر سے کلام کی دو قسمیں نہیں رہتی ہیں۔ اگرچہ نظم وزن کی وجہ سے نثر تو یقیناً نہیں ہے۔

اگلے لوگوں نے جو یہ تعریف شعر کہ "کلام موزوں، مقفیٰ جو بالقصد کہا گیا ہو اور انقباض یا انبساط پیدا کرے"۔ لکھی ہے۔ وہ تحقق نفس شعر کے لیے نہیں ہو سکتی کیوں کہ اس تعریف میں بعض قیود و شرائط بالکل دور از کار ہیں مثلاً قید قافیہ یہ تو محضرات شعری میں سے ہے۔ تحقق نفس شعر اس پر مبنی نہیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک شعر کسی شاعر کا ہمارے سامنے آئے۔ بغیر اس کے ہم دوسرے شعر کے قافیہ کی تبیق نہیں ہو سکتی ہے تو کیا یہ بیت شعر نہ رہے گی جبکہ وزن بھی موجود ہے اور تخیل بھی۔

جناب میر شمس الدین فقیر دہلوی اپنی کتاب حدائق البلاغۃ میں اس قید قصد کو اس دلیل سے ضروری قرار دیتے ہیں کہ دنیا میں کوئی فرد ایسا نہ ہوگا جس کے منہ سے احیاناً عمر بھر میں کلام موزوں نہ نکل جاتا ہو لہٰذا ماننا پڑے گا کہ دنیا بھر شاعر ہے اور یہ ظاہر البطلان ہے۔

ان بزرگ کا ذہن کہیں سے کہیں منتقل ہوگیا۔ ذکر تو شعر کا ہے نہ کہ شاعر کا۔ جب کوئی ایسا شعر ہمارے سامنے آئے جس کے قائل کے ارادہ یا عدم ارادہ کا علم ہم کو ہو اور وزن اور تخیل موجود ہو تو ہم اسے شعر نہ کہیں گے تو کیا کہیں نثر تو کہہ نہیں سکتے۔ ہاں اس کا کہنے والا اگر اس کا ہمسر یا ہم جفت نہیں کہہ سکتا ہے تو وہ شاعر نہیں ہے مگر یہ شعر ضرور ہے۔

نبی صلواۃ اللہ علیہ وآلہ کی نسبت ارشاد کلام مجید ہے:

وما علمنا لا انتم وما ینبغی لہٗ کی بنا پر شعر کی نسبت مسلمانوں نے خیال اچھا نہ پیدا کیا۔ اس لیے قرآن شریف کو شعر سے بری رکھنے کے لیے قصداً اور عمد کا جھگڑا نکالا۔ اس جھگڑے سے اگر قرآن میں شعر ہے تو اللہ مرید نہیں رہتا ہے۔ اگر قرآن میں شعر کا ہونا نہیں چاہتے ہیں تو قرآن کو شعر سے مبرا یوں کر سکتے ہیں کہ ایک مصرع کو اہل فن شعر نہیں کہتے ہیں اور قرآن میں کوئی ایک آیۃ پوری اور متصل بغیر قطع و برید یا کسی دوسری یا تیسری آیۃ کا کوئی کلمہ چھوڑے یا لائے بغیر ایک شعر پورا ہم وزن نہیں ملتا ہے۔

اب انقباض یا انبساط پیدا کرنا یہ تو تاثیر شعر میں داخل ہے نہ تحقق نفس شعر امیں۔ غالبؔ یا کسی شاعر کے کٹ ھیئے اشعار جو اکثروں کی سمجھ سے باہر ہیں اور کوئی تاثیر نہیں پیدا کرتے ہیں کیا شعر نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اپنی اپنی سمجھ کے موافق بے معنی اشعار کہہ سکتے ہیں اور بس۔

نظامی عروضی سمرقندی اپنی کتاب چہار مقالہ میں تعریف شعر میں کہتا ہے کہ:

"شاعر انسان مقدمات موہومہ سے چھوٹی بات کو بڑا اور بڑی بات کو چھوٹا اور اچھے کو برا اور برے کو اچھا کر کے دکھاتا ہے۔"

اگر شاعری اسی کا نام ہے تو شاعری دو کوڑی کی چیز ہے۔ یہ شرط ان کو اس لئے لگانا پڑی کہ ایشیائی شاعر ممدوح میں وہ صفات قائم کرتے ہیں اور اس کے مقابل میں وہ صفات ذمیمہ دکھاتے ہیں محض اس غرض سے کہ ممدوح سے جلب منفعت کریں۔ چاہے وہ صفات ان دونوں میں نہ ہوں اور اگر ہوں تو ان کو گھٹا بڑھا کر دکھاتے ہیں۔

یورپ والوں نے بعد تدقیق و تحقیق شعر کی جو یہ تعریف کی کہ جو کلام احساسات و جذبات انسانی کو برانگیختہ کرے وہ شعر ہے۔ یہ الفاظ احساسات و جذبات گویا انھیں الفاظ انقباض و انبساط کے مترادف ہیں کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اور یہ بات تاثیر شعر سے تعلق رکھتی ہے نہ تعریف شعر سے

لہٰذا جو بھی عقل آرائی اور سخن آفرینی کی گئی سب فضول ہے۔

محقق طوسی علیہ الرحمہ نے جو تعریف شعر لکھی وہی ٹھیک ہے یعنی کلام موزوں حقیقی کا نام شعر ہے۔ کلام سے مراد کلام بامعنی ہی ہوا کرتا ہے اور کلام مفید کسی نہ کسی تخیل سے خالی نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے صرف "کلام موزوں" سے بھی تعریف شعر کی جا سکتی ہے۔

**حُسن** خوبی تالیف کا نام ہے۔ اگر ایسی تالیف الفاظ و معنی میں پائی جائے تو وہ شعر خوب ہے۔ اور اگر خط و خال میں پائی جائے تو وہ صورت حسین اور تصویر ہے اور اگر لکیروں اور نقوش میں ہو تو وہ خوش خطی ہے اور آوازیں ہو تو موسیقی ہے۔

ہر ملک اور ہر قوم کا معیار حُسن جداگانہ ہے۔ مثلاً یورپ کا حُسن صورت بھورے بال کرنجی آنکھیں اور شلجم کا ایسا سفید رنگ جلد کا ہونا ہے تو ایران میں سرخ و سپید رنگ کا ہونا اور سرو قامت اور سیاہ بال اور کالی پتلی اور ایڑی تک بالوں کا ہونا ہے اور فربہی بھی حُسن میں داخل ہے۔ مگر ہندوستان میں لوٹا سا قد اور چھریرا بدن اور سانولا رنگ اور زلف دراز ہونا حُسن ہے۔ افریقہ جنوبی میں اُلٹے توے کی طرح رنگ کا سیاہ ہونا۔ کوڑی ایسی چھوٹی چھوٹی حلقوں میں آنکھوں کا دھنسا اور کلے کی ہڈی کا ابھرا ہونا اور بالوں کا نہایت گھونگھرالا اور ناک چپٹی اور چوڑی اور ہونٹوں کا موٹا ہونا حُسن صورت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حُسن نام مسلمات جماعت کا ہے۔ کوئی امر عقلی نہیں اگر عقلی ہوتا تو دنیا کے کل عقلا ایک معیار پر متفق ہوتے، حتیٰ کہ کہہ سکتے ہیں کہ حسن صدق اور قبح کذب بھی عقلی نہیں، چنانچہ یورپ والے ڈپلومیسی۔ پالیٹکس، پروپیگنڈا جو دوسرے نام دروغ کے ہیں حُسن سمجھتے ہیں اور ان کے نہ جاننے والوں کو احمق سمجھتے ہیں۔ شریعت میں بھی الحرب خدعۃ آیا ہے اور شیخ سعدی کو بھی کہنا پڑا

"دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز"

یہی حال شعر کا بھی ہے کہ طبائع مختلفہ ہونے کی وجہ سے پسند اور ناپسند میں اختلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ غالب علیہ الرحمہ مومن کے اس شعر ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ۔۔۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دے دینے کو کہتے تھے۔ صرف اس بات پر کہ اس شعر میں شاعر اپنے آپ کو اتنا بڑا رشک کرنے والا ظاہر کرتا ہے کہ تصویر خیالی یار کو بھی مجمع اغیار میں پیش نظر لانا نہیں چاہتا ہے، حالانکہ اس شعر میں اس مطلب پر کوئی لفظ خیالی نہیں ہے۔ اپنی طرف سے جو جی چاہے بڑھا لو۔ اگر یہ مطلب مان بھی لیا جائے تب بھی خلاف مبالغہ پسندیدہ ہے۔

مجھ ہیچمدان کی پسند و ناپسند چیز ہی کیا ہے مگر مجھے اس غزل کا یہ شعر

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے　　　ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

بہت پسند ہے۔ مصرع اول کو افسوس اور حسرت کے لہجہ میں ذرا زور دے کے پڑھو مزید برآں کس قدر زبان کے مزہ سے پُر ہے۔

ایسے اشعار شعرا بہت کم ملیں گے جن کو سب متفق الرائے ہو کر اچھا کہتے ہوں۔ تخیل کے لحاظ سے کسی شعر کی خوبی پر متفق ہونا اختلاف طبائع کی وجہ سے دشوار ہے۔ لہٰذا معیار خوبی شعر بھی اس حیثیت سے قرار دینا دشوار ہے۔ بول چال کے موافق حُسن بندش کے ساتھ محاکات کے اشعار کو کیا عجب ہے کہ شعر فہم اشخاص سب کے سب اچھا کہیں۔

شیخ الرئیس بوعلی سینا اپنی کتاب شفاء میں شعر کے لذیذ ہونے کا سبب علاوہ وزن کے محاکات کو فرماتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کا نقشہ کھینچ دینا۔ چنانچہ ان کا ارشاد یہ ہے۔

والدلیل علیٰ فرحھم بالمحاکات انھم یتدون بتامل الصور المنتوشیۃ للحیوانات الکریھۃ ا
ولو شاھدھا انفسھا لیتنفروا عنھا فیکون

یعنی محاکات سے لذت پانے کی دلیل یہ ہے کہ متنفر اور قابل نفرت ان کی تصویر دیکھ کر لوگ خوش ہوتے ہیں اگر ان کو دیکھیں تو ادھر سے آنکھ پھیر لیں تو معلوم ہوا کہ نہ اس صورت میں لذت ہے نہ تصویر میں ہے بلکہ تصویر من حیث الجامعات لذیذ ہے۔ غرض یہ ہے کہ تصویر کے لذیذ ہونے کا جو سبب ہے شعر کے لذیذ ہونے کا بھی وہی باعث ہے، یعنی شاعری وہی اچھی ہوتی ہے جس میں مصوری کی شان نکلے۔ بہت بڑھیا شعر (خصوصاً غزل کا) وہی ہے جس میں معشوق کے کسی انداز یا کسی ادا کی تصویر کھینچی جائے کیوں کہ ایسا بیان فی النفس ہوا کرتا ہے۔ شعر کی خوبی خود الفاظ کے ذریعہ سے مصوری پر منحصر ہے۔

جناب سید علی محمد صاحب عارف مرحوم نوہ دختری جناب نفیس مرحوم کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

۔۔۔۔۔۔ بھر کے آہ کہتا ہے　　　کہ اختیار کسی کا نہیں مقدر پہ

یہ شعر بالکل اچھوتا ہے۔ اس مضمون کو فارسی عربی اور اُردو میں کسی نے نہ باندھا ہو گا۔

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں خدا جانے　　　میں گل بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پہ

جناب تعشق کا شعر ذیل بھی عجیب منظر پیش کرتا ہے ؎

نو گرفتار بلا ہوں نہیں آتی تدبیر پوچھتا پھرتا ہوں کیا ہو جو مرا دل ٹھہرے

عاشق کی مجبوری اور لاچاری اور نو گرفتار محبت ہونے کی تصویر کھینچ دی ہے۔

## شعر من حیث التاثیر نہیں

میں اس بیان میں شعر کی منطقی تعریف یعنی صرف تمثیل کو شعر مان کر کام لوں گا۔ اس لئے واعظ۔ لیکچرار سیاسی اور شاعر کو ایک کشتی میں ناتھ کر کچھ ایسی بکواس کروں گا جو جمہور عالم کے مسلمات کے برخلاف ہوگی اور اپنے آپ کو مطعون اور مردود خلائق بنا لوں گا۔ مگر کیا کروں اظہار رائے کیئے بغیر ... کی ہے اور نہ نظم کی بلکہ یہ ایک صنعت صنائع لفظی میں سے ہے، جسے نثر و نظم دونوں میں صرف کر سکتے ہیں۔ خاقانی کا شعر بھی حدائق البلاغت میں اس صنعت کا لکھا ہے۔ جسے میں نے شرح میں بھی شاید نقل کیا ہے۔ کتاب حدائق البلاغت اس وقت تلاش سے بھی ہاتھ نہ لگی۔ شرح میں سے نکالنا میرے لیے دشوار تھا۔ اس لیئے اس سے درگذر کیا۔

## اختلاف از بعض مسلمات جمہور

سب سے پہلے جناب غالبؔ علیہ الرحمہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ (دال معجمہ) فارسی ابجد حرف نہیں۔ اس کے بعد جناب شمس العلما حالی و شبلی اعلی اللہ مقامہما نے اس کا تتبع کیا اور اب تو سبھی اس کی پابندی کرتے ہیں۔ جناب مرزا رضا قلی ہدایت شیرازی اپنی فرہنگ انجمن آرائے ناصری کے دیباچہ میں بھی اسی بات کے قائل ہوئے ہیں پھر بھی اسی فرہنگ میں ایک فصل گاف فارسی مع ذال معجمہ کی قرار دے کر گذشتن اور گذاردن اور اس کے مشتقات تحریر فرماتے ہیں نہ معلوم کیوں۔

مولوی اوحد الدین ادیب بلگرامی مصطلحات الشعرا مطبوعہ قدیم کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ گذاشتن (رکھ دینا۔ چھوڑ دینا) اور گزاردن کے معنی ادا کرنے کے ہیں۔

پرانے زمانہ کی قلمی کتابوں میں جو دال مہملہ کہ بعد حروف مدہ واقع ہو اس پر نقطہ ضرور لگا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعد لین بھی دال مہملہ پر نقطہ دکھائی دیتا ہے۔ درۃ الاخبار تتمہ صوان الحکمہ مطبوعہ لاہور ملاحظہ

ہو۔

آذر سے مرکب اسماء شہر و اشخاص و آتشکدہ اور پھول کے سب دال معجمہ سے لغات میں ملتے ہیں جیسے آذر بیجان، آذر ہمایوں، آذر نوش، آذرم (زرین پوش)، آذر نگ (روشنی) آذر گشسپ (بجلی) اذین وغیرہ۔ یہ مرکبات اسلام سے بہت پہلے کے ہیں۔ متقدمین یعنی دور اول کے شعرا میں انوری فرماتے ہیں۔

رباعی

دستت بسخا چوں ید بیضا بنمود　　از جود تو در جہاں جہانے افزود
کس چو تو سخی بنود و نے نخواہد بود　　گو قافیہ دال شو ز بے عالم جود

بنود، افزود، بود میں چوں کہ دال بعد حروف مد (واو) واقع ہوئی ہے بنا بریں یہ ذال معجمہ ہے۔ اور جود عربی کا لفظ ہے اس کی دال مہملہ ذال معجمہ نہیں ہو سکتی ہے۔ اس طرح اس عیب و اختلاف روی کے دور کرنے کے لئے شاعر عذر پیش کرتا ہے اور جس عیب سے شاعر اطلاع دے دے وہ عیب پھر عیب نہیں مانا جاتا ہے۔

ظہیر فاریابی دور دوم کے متوسطین شعرا میں اپنے ایک ترکیب بند کے قوافی بامداد، داد، نہاد، باد، کشاد کے ساتھ لفظ عربی نفاذ کا قافیہ لائے ہیں۔ اس ترکیب بند کا مطلع یہ ہے۔

. . . . . . . . .

ان فارسی قوافی کے ساتھ جو قافیہ عربی الفاظ کے لائے ہیں وہ یہ ہے:

دانی مگر کہ موسم عیش است ازیں سبب : آفاق شد مسخر۔ حکیم نفاذ عید چوں کہ کل الفاظ فارسی والے قوافی ہیں۔ بنا بریں قاعدہ مسلمہ ذال معجمہ ہے اس لیئے عربی کا لفظ نفاذ جس کے آخر میں ذال معجمہ ہے قوافی میں لائے۔

متاخرین میں حضرت قاآنی اپنے ایک مسمط میں جس کا مطلع یہ ہے ؎

شاہے کہ بتخت خلافت مکاں گزید　　بدخواہ پشت دست ز غم ناگہاں گزید

اس قصیدے کے قوافی مزید، خزید، گزید، وزید، سزید سب کے سب فارسی ہیں اور بنا بر قاعدہ سب کے آخر میں ذال معجمہ ہے۔ ان کے ساتھ دو قافیے عربی الفاظ کے لائے اور اس کے دالات ذال معجمہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا عذر کر کے فرماتے ہیں۔

من مزید بگویند ہر دم جحیم از آں کہ　　خواہد ز جسم دشمن او ہر زماں مزید

فارسی الفاظ میں ــــ بعد حروف مدہ دال اور ذال کی شناخت کے واسطے قاعدہ بھی بنایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذال معجمہ بھی فارسی کا حرف ہے ورنہ کسی قاعدے کی کیوں ضرورت ہوتی۔ نصیرالدین فرماتے ہیں۔ مگر رضا قلی نے طوسی کی طرف منسوب کیا ہے۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرانند۔ در معرض دال ذال را بنشانند۔ ما قبل دے۔۔ دال است وگرنہ ذال معجم خوانند حلل مطرز میں فرماتے ہیں۔

زبان فارسی فرق عیاں دال و ذال — با تو گویم زانکہ نزدیک افاضل مبہم است

پیش او در لفظ مفرد گو صحیح ساکن ست — دال باشد ورنہ باقی جملہ ذال معجم است

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا جائے کہ ذال معجمہ فارسی میں نہیں تب بھی داخل تو ضرور کر لیا ہے جیسا کہ شعر بالا سے واضح ہے۔

## الفاظ دخیل

یہ صحیح ہے کہ ایک زبان کے الفاظ جب دوسری زبان میں منتقل ہو کر جاتے ہیں تو ان میں اعرابی لفظی، معنوی، کمی، زیادتی سبھی طرح کا تغیر ہو جاتا ہے۔ انگریزی کے الفاظ گلاس ایکٹ (ACT) اُردو میں آئے۔ بوتل انگریزی میں باٹل تھا۔ فارسی میں بطری ہو گیا۔ گلاس پورے تلفظ کے ساتھ آیا مگر معنی میں تصرف ہو گیا انگریزی میں شیشے کے معنی تھے مگر اُردو میں آکر پانی پینے کا شیشہ کا ظرف۔ لالٹین اصل میں لنٹرن تھا۔ سینکڑوں عربی، فارسی کے الفاظ اُردو میں آئے اور ان کے معانی بدل گئے عرصہ عربی و فارسی میں بمعنی میدان ہے اُردو میں مدت کے معنی ہو گئے۔

شعر اور شعرا کے ادوار اور شعر کے تنزل اور ترقی کے اسباب معلوم کرنے کے لئے فارسی شاعری کی بابت شعر العجم اور اُردو کے لئے شعر الہند دیکھنا چاہیئے یہ میری بحث سے خارج ہے۔

## شعر کیسا ہونا چاہیئے

اب تک کلام موزوں چار ہی اصناف پر منقسم ہے۔ غزل، قصیدہ مثنوی اور رباعی۔ مضامین کے لحاظ سے نظم رزمیہ یا حماسی، نظم تغزلی یا عشقیہ، نظم مدحیہ، نظم تماشائی یعنی DRAMATIC POETRY نظم ادبی یا اخلاقی، نظم تاریخی، نظم افسانہ، نظم مرثیہ ای پر تقسیم کر سکتے ہیں، واسوخت، شہر آشوب بھی ایک

ایک قسم قرار دے سکتے ہیں۔ قطعہ، مخمس، مسدس، ترکیب بند اور ترجیع بند وغیرہ یہ قسمیں فضول ہیں، کیوں کہ یہ اقسام نہ کسی وزن سے مخصوص ہیں اور نہ کسی مضمون سے خاص۔ غزل یا قصیدہ کے دو یا پندرہ اشعار تک مضمون واحد کو قطعہ کہتے ہیں۔

## غزل

ایران اور ہندوستان میں غزل شاعری کی ابجد ہے۔ اصل جوہر غزل کے سادگی و جوش و مبنی بہ حقیقت ہونا۔ روانی، الفاظ میں نرمی اور لوچ، طرز ادا کی دل کشی روزمرہ اور بول چال کی موافقت۔ تشبیہات و استعارات کا قریب الفہم ہونا ہیں تاکہ سامع سنتے ہی اس کے مفہوم کو سمجھ لے۔ سوچنے اور فکر کرنے کی ضرورت نہ پڑے اور قلب سامع پر فوراً اثر پیدا کرے۔ اگر سوچنے کی ضرورت ہوگی تو ایسا شعر چاہے وہ عرش کا تارہ ہی کیوں نہ ہو اس کا اثر ضائع ہو جائے گا اور مزہ اور لذت ایسے شعر کی جاتی رہے گی۔ دونوں کی مثالیں کلام غالب علیہ الرحمہ میں بکثرت موجود ہیں مگر اصل جوہر غالب کا مضامین آفرینی، بلند خیالی جدت پسندی ہے۔ صاف اور سادہ اور دل کش اشعار مشق اور کہنگی کے بعد شاید فیض سخن سے نکلے ہیں۔ مضمون کثیر ہوتا ہے۔ دو مصرعے اس کی گنجائش نہیں رکھتے ہیں۔ مصنف کے ذہن میں مضمون چکر لگاتا ہوتا ہے۔ اس کے لئے الفاظ بپابندی قافیہ اختیار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مفہوم ادا ہوگیا۔ مگر الفاظ کی کمی یا طرز ادا کے نقصان کی وجہ سے ناظرین و سامعین کو اس کے مفہوم تک پہنچنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ شاعر قافیہ کی مناسبت کے ساتھ ایک ہی بات پیدا کرتا ہے مگر طرز ادا اور نشست الفاظ کی وجہ سے ناظرین دو دو تین تین معانی اس میں ٹھونستے ہیں۔ جو شعر متحمل دو تین معانی کا ہو جائے اس میں طرز ادا کا نقصان سمجھنا چاہیئے کیوں کہ وہ قصد شاعر کے خلاف ہے چاہے دوسرے مفاہیم اعلیٰ ہی کیوں نہ ہوں۔

## غزل کے مضامین

ایشیا میں اب تک عشقیہ شاعری میں معشوق کا چنچل و شوخ، حسین و جمیل ہونا یا ناز و ادا اور دوسرے نکات دل کش اور اثر انگیز ہونے کے علاوہ اسے ظالم، قتال عالم، بے رحم، بے وفا، ناتوان عاشق صادق سے نفرت کرنے والا بوالہوس اور جھوٹا عشق دکھانے والوں سے رغبت اور محبت کرنے والا بیان کرتے ہیں اور اس میں ایسے صفات بھی بیان کر دیتے ہیں جو عفت و عصمت کے منافی مضامین ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک ایسے مضامین سے احتراز لازم ہے۔ مگر کسی شاعر کا کلام ایسے مضامین سے خالی نہیں ملتا ہے

کبھی خلاف عفت و عصمت مضامین کو ڈھکے ڈھکے الفاظ میں ادا کرتے ہیں اور کبھی بالکل عریاں اور حیاسوز الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ جیسے یہ شعر غالبؔ علیہ الرحمہ کا ؎

بغل میں غیر کے آج سوتے ہیں کہیں ورنہ | سبب کیا خواب میں آکر تبسمہائے پنہاں کا

یہ شعر معشوق کو غیر عفیف، شہوت پرست اور بازاری ظاہر کرتا ہے۔

اس کے تکالیف، وصال اور اس کی تمنا و مسرت، عاشق و معشوق دونوں کا بدگمان اور محبوب کا بدخو ہونا۔ رشک کے مضامین عاشق کا جنون اور صحرا بہ صحرا مارے مارے پھرنا۔ رقیبوں سے دشمنی معشوق کی گلی کے ہیرے پھیرے کرتے رہنا۔

اس مفہوم کو حضرت میرؔ کس قدر دل چسپ طریقہ سے ادا کر رہے ہیں۔

تیرے کوچہ ہر بہانے ہمیں دن سے رات کرنا | کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

معشوق سے شکایت کا دفتر دل میں لیئے رہنا۔ مگر سامنا ہو جانے پر رعب حسن یا اس کی اداؤں سے مرعوب ہو کر ایک حرف بھی شکایت کا منھ سے نہ نکلنا یا ان گلوں کو بھول جانا۔ حضرت میرؔ علیہ الرحمہ کس خوبی کے ساتھ نظم فرما رہے ہیں ؎

یوں کہتے یوں کہتے جو وہ یار آتا | سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

یہ مضمون مجھے بہت بھلا معلوم ہوا میں نے بھی اس بات کو کہنا چاہا۔ چوں کہ فطری شاعر نہیں ہوں صرف ناظم ہوں اس لئے طرز ادا یا خوبیٔ الفاظ میں اس سے بڑھا دینا تو درکنار برابر سے ادا بھی نہ کر سکا۔ اس لئے حد سرقہ میں ہو کے رہ گیا۔ قصہ مختصر ان کو نقل اس لئے کرتا ہوں کہ ناظرین کو ایک شاعر اور ایک ناظم کا فرق معلوم ہو جائے۔

یوں تو کہتا ہوں کروں گا میں شکایت ان سے | سامنا ہو تو ہو معلوم شکایت کیا ہے
سامنے جاتا ہوں کیا ان سے شکایت میں کروں | اس قدر رنج اُٹھائے کہ مجھے یاد نہیں

ے حکمت فلسفہ، تصوف، اخلاق اور پند و نصائح کے مضامین بھی غزل میں داخل ہو گئے ہیں۔

نالہ و آہ و فغاں اور گریہ و زاری، اضطراب، انتظار آمد یار اظہار درد و الم، آمد سوز و مصیبت کا تحمل اور کبھی عدم تحمل، عاجز آکر ترک عشق کرنا (جسے نہ ہونا چاہیئے کیوں کہ منافی عشق ہے) کوئی دوسرا معشوق پیدا کرنا۔ (یہ بھی نہ ہونا چاہیئے) عدم تحمل کے سبب سے خواہان مرگ ہونا۔ یعنی مایوس و ناامید ہونا۔ کبھی امیدوار ہونا اور مثل اس کے یہی مضامین جولانگاہ غزل ہیں۔

غزل، قصیدہ، مثنوی رباعی کے علاوہ فی الحال سیاسی نظمیں بھی داخل شاعری ہوگئیں ہیں۔
الفاظ کے تابع مفاہیم ہوا کرتے ہیں لہٰذا صرف الفاظ کی خوبی اور بول چال کے موافق زبان میں ڈوبے ہوئے الفاظ کی حظ سوا اہل زبان کے دوسرا زبان دان نہیں اٹھا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صائب حافظ شیراز کے ؎

سر بکوہ بیاباں تو دادی مارا

اس ایک لفظ "تو" کے بدلہ میں اپنا پورا دیوان دے دینے کو کہتے تھے۔ اسی طرح غالب کے اس شعر ؎

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید　　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

"ان سے" کے صرف کی خوبی و مزہ کو غیر اہلِ زبان کیا سمجھ سکتا ہے "ان سے" کو ٹون (لہجہ) بدل بدل کے پڑھنے سے۔ تعجب۔ حسرت مایوسی کے مضامین اس سے پیدا ہوتے ہیں۔
خیالات انسانی کے کما حقہٗ ادا کر دینے کے لئے کسی زبان میں الفاظ کفایت نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ اس "ان سے" کی خوبی پورے طور سے سمجھانے کے لئے الفاظ مجھے نہیں ملتے۔ یا۔ وہ دن گئے۔ اس محاورہ کے صرف کرتے وقت قائل جو دونوں ہاتھوں کو ایک خاص طریقہ سے حرکت دیتا اور اٹھاتا ہے اس کو الفاظ میں کسی نو آموز یا زبان دان کوئی کیسے سمجھائے۔

## قصیدہ

اسے نظم مدحیہ بھی کہہ سکتے ہیں اس میں مدح ممدوح کے لئے کیا کرتے ہیں۔ عرب اس میں مرثیہ بھی کہا کرتے تھے چنانچہ حماسہ کے دس بابوں میں سے ایک باب الراثی بھی ہے۔ مگر ہندوستان میں مرثیہ امام حسین علیہ السلام مسدس میں لکھنے کا رواج ہوگیا ہے۔
قصیدہ کے چار جز قرار دیئے ہیں ایک تمہید جسے تشبیب کہتے ہیں وہ تشبیب تغزل اور تسیب سے ہوتی ہے اور کبھی بہاریہ اور شکایت فلک میں ہوتی ہے اسے تشبیب حالیہ کہتے ہیں۔ کبھی تشبیب فخریہ بھی ہوتی ہے۔
دوسرے گریز یا تخلیص۔ بعد تشبیب ایک یا دو شعر ایسے کہتے ہیں جو تشبیب کو آئندہ اشعار سے مربوط کر دیں۔ گریز کے بعد کے اشعار مدح ممدوح میں ہوتے ہیں　　　کے لئے اکثر مدحیہ اشعار خلاف واقع مضامین پر مبنی ہوتے ہیں۔

رحم وکرم وعفو وسخاوت وشجاعت وشہسواری وکثرتِ لشکر و سپاہ کی تعریف ہوتی ہے اور مخالف ممدوح کی تحقیر وتذلیل، ختم مدح کے بعد چند اشعار دعا کے ہوتے ہیں مثلاً جب تک زمین وآسمان قائم رہیں تم زندہ رہو۔

غالب علیہ الرحمہ نے عید الفطر کے موقع پر مدح ظفر شاہ میں، ایک قصیدہ لکھا ہے جس میں تخاطب ماہ نو سے کیا ہے اور یہ نئی تشبیب ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے ؎

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام — جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

بہت سے اشعار کہے ہیں۔ غزل جو اس قصیدہ میں تضمین کی ہے وہ بھی خوب ہے۔

## مرثیہ

جو ایک صنف قصیدہ کی ہے میر انیسؔ اور دبیرؔ نے اسے معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ کل مضامین ہر صنف کلام منظوم کے بوجہ احسن واتم اس میں موجود ہیں۔ مرثیہ کے چہرہ میں تشبیب قصائد کے تمام مضامین اس میں پائے جاتے ہیں غزل کی ان باتوں کا بھی اس میں بیان ہوتا ہے جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں (دوبارہ لکھ کر طول کیوں دوں۔ مختصر نویس ہوں طول دینا نہیں آتا ہے) جیسے بھائی بہن، مادر وفرزند کی محبت واحساسات۔

## مثنوی

یہ قسم نظم کی بہت مفید ہے۔ اس میں مسلسل مضامین کی بہت گنجائش ہے۔ فارسی میں اخلاقی، رزمیہ، تاریخی وغیرہ مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ مگر اردو میں سوا افسانہ اور قصہ کے وہ بھی من گھڑت اور اصناف کی مثنویاں نہیں ملتی ہیں۔

## بلینک ورس BLANK VERSE

یورپ میں ایک قسم نظم کی یہ بھی ملتی ہے۔ اس میں قافیہ نہیں ہوتا ہے۔ گویا سب مصاریع ہوتے ہیں۔

حضرت غالبؔ نے اس کو مترادف نثر مرجز سمجھ کے ایک خط بھی لکھا ہے مگر بلینک ورس کا مترادف نثر مرجز نہیں۔ یہ دھوکا ان کو اس لئے ہوا کہ اہل فن نثر مرجز کی تعریف یوں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"آں کلامے ست نثر کہ وزن دارد و قافیہ ندارد"

اور مثال یوں لکھتے ہیں :

"خیال ناظم بے تعلق قامت دلربائے ناموزوں ست ؛ و قیاس تاثیر بے تمسک کاکل مومیائے نامربوط ۔

ظاہر ہے کہ یہ کلام موزوں بوزن عروضی نہیں ہے ۔ اور کیوں ہو جبکہ اسے سہ اقسام نثر، مرجز و مسجع و عاری میں داخل کرتے ہیں اور نثر و نظم میں مابہ الامتیاز جو چیز ہے وہ وزن ہی ہے ۔ پھر وزن عروضی اس میں کیوں ہونے لگا ۔

وزن سے مراد اس تعریف میں یہ ہے کہ ان دونوں جملوں کے الفاظ جیسے خیال و قیاس پر وزن فعول ہیں مگر باہم قافیہ نہیں ہو سکتے ہیں ۔ یہی حال ناظم و ناثر بے تعلق بے تمسک ، قامت و کاکل، دلربائے و مومیائے ۔ ناموزوں اور نامربوط کا ہے ۔ کہ یہ سب الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ ہم وزن تو ہیں مگر باہم قافیہ نہیں ۔

اصل میں غلطی نثر مرجز کو اقسام نثر میں داخل کرنے والوں سے ہوئی ۔ نثر مرجز کوئی قسم نہ نثر نہ نظم

اس زمانہ کا کوئی سیاسی لیڈر ہو اور وہ کتنی ہی رتبہ و حیثیت روحانی رکھتا ہو حتیٰ کہ اوتار یا نبی ہی کیوں نہ ہو مگر اپنا یہ خیال اس وقت میں قوم کے سامنے پیش کرے کہ انگریزوں کے قدموں پر گر پڑو تو اسے غدار کہیں گے اور اس کے مار ڈالنے پر آمادہ ہوں گے ۔ اسی طرح کوئی واعظ خلاف مذہب کوئی مادر پدر نکالے تو اس کے جانی دشمن ہو جائیں گے ۔ یا سر اقبال اور غالب کے کلام کے عیب واقعی دکھائے تو اسے پاگل اور نافہم اور جاہل سمجھیں گے کیوں کہ اس طرح کہ ان کے مسلمات اور معتقدات کے خلاف یہ صدا بلند ہوگی جس میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تک پسند نہیں کرتے ہیں ۔ ماننا تو درکنار ۔

یہی حال شعر کا بھی ہے ۔ ہر شخص کے خیالات و مسلمات میں اپنے معیار کے موافق جب کوئی کسی شعر کو پاتا ہے تو اس کا مداح شعر کو اگر کوئی دوسرا اپنے معیار کے موافق نہیں پاتا ہے تو اس کی قدح کرتا ہے جب ایک ہی شعر اچھا اور برا بھی ٹھہرا تو کوئی اس سے متاثر نہ ہوگا ۔ شعر اگر اچھا ہے تو سب پر اچھائی کا اثر پڑنا چاہیئے اور اگر برا ہے تو برائی کا اثر ہونا چاہیئے ۔ دو متضاد صفات کا ایک ہی شعر میں جمع ہونا ناممکن ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ سامعین کے مسلمات اور معتقدات کو اثر لینے میں بڑا دخل ہے تو پھر شعر کی تاثیر کہاں رہی ۔

ملک عرب چوں کہ ریگستان ہے اور وہاں پیداوار اور ذرائع آمدنی بہت کم ہیں ۔ پانی میسر نہیں ۔

جہاں کہیں کنوئیں کھودنے کے لیئے زمین ہے وہاں بہت دور پر پانی نکلتا ہے اور کھاری نکلتا ہے۔ بلند پہاڑ نہ ہونے کی وجہ سے بارش کم تر ہوتی ہے۔ اونٹ اور رطب ان کی بڑی دولت ہے۔ اونٹوں کے لیئے چراگاہوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اونٹوں کو پانی درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا چراگاہوں اور پانی پر لڑا کرتے تھے۔

آمدنی کم ہونے اور ضروریات پوری نہ ہونے کی وجہ سے لوٹ مار پر مجبور تھے۔۔۔ رجب، ذیقعدہ اور محرم کے علاوہ لوٹ مار کے لیئے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسرا بھی انھیں کی طرح ضرورت مند ہے وہ اپنا مال آسانی سے کیسے دے دے گا لہٰذا جان دینے اور جان لینے کی نوبت آپڑتی تھی۔ ہر جگہ کے ڈاکو جان پر کھیل کے ڈاکہ زنی کیا کرتے ہیں۔ ڈاکہ زنی کا نام شجاعت نہیں۔ مقتضائے عقل کے موافق قوت غضبی کے استعمال کرنے کا نام شجاعت ہے۔ یہ تو اوجڈپنا اور بربریت ہے نہ شجاعت۔

ہر قبیلہ کے شیوخ ہوتے تھے وہ ان کو ان حرکات قبیحہ سے الگ نہیں رکھ سکتے تھے۔ لڑائی بھڑائی میں مال غنیمت ہاتھ آتا تھا لہٰذا لڑا کرتے تھے۔ ایسی صورت میں جو کوئی ان کو جنگ کی حریص اور ترغیب کرتا تھا۔ بہت جلد اس کے لیئے تیار ہوجاتے تھے۔ چوں کہ کوئی حکومت منتظم نہ تھی جس کے سامنے اپنے معاملات کو پیش کرکے فصل قضایا چاہیں۔ اس لیئے انتقام اور دیت کی خواہش میں خود اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ شیوخ میں اتنی قوت نہ تھی کہ ظالموں کو گرفتار کرکے سزا دے سکیں۔ لوٹ مار کی عادت اب تک عربوں میں جاری ہے۔ حکومت حجاز نے بدوؤں کا وظیفہ معین کردیا ہے اس لیئے اس میں کسی قدر کمی واقع ہوگئی ہے۔ افغانی چوں کہ خود ہی مفلس اور نادار ہوتا ہے اور لوٹ مار کا خود بھی عادی ہوتا ہے اور "چمڑی جائے مگر دمڑی نہ جائے" کا پابند۔ اس لیئے ناواقفیت میں جب کسی بدو نے اس پر ہاتھ ڈالا تو کامیاب نہ ہوا۔ کیوں کہ بہ نسبت عرب یہ قوی الجثہ ہوتے ہیں تو پھر کوئی بدو ان پر ہاتھ نہ ڈالتا تھا۔ ہندوستانی کم زور اور غلامی کا عادی اسی کو لوٹا کرتے تھے۔ کم زور کو سب ہی دبا لیتے ہیں۔ کیا اسی کا نام شجاعت ہے۔ مداحی کسی مال دار کی کیا کرتے کوئی مال دار نہ تھا جس سے صلہ ملتا۔

چوں کہ انسان بھی ایک قسم کا درندہ حیوان ہے اور قوت غضبی دفع مضار و جلب نفع جائز کے لیئے اسے فطرتاً ملی ہے اس لئے طمع مال و حرص جاہ میں دنیا بھر کے لوگ جنگ کیا کرتے ہیں جو ایک وحشیانہ حرکت ہے۔ ایسے لوگ کیا شجاع ہیں۔ اس زمانہ میں اقوام ہند جو کشت و خون کررہے ہیں کیا یہ لوگ شجاع کہلائے جاسکتے ہیں۔

عرب کا ملک متمول نہیں ہے اور قصائد مدحیہ کسب زر کے لیئے کہنا دستور ہوگیا ہے۔ اس کی امید نہ تھی تو اپنی مدح میں فخریہ قصائد کہنے لگے اور اپنے لیئے اسی کو صلہ قرار دے لیا۔

نسب پر فخر از روئے عقل کہاں تک درست ہوسکتا ہے۔ سب اولاد آدم ہیں۔ کسی ابا واجداد نے ڈاکہ زنی کر کے ثروت وجاہ پیدا کی یا کسب کمالات نفسانی وعلم وفضل سے عزت حاصل کی تو اسے بھی فخر و غرور زیبا نہیں چہ جائیکہ اس کی اولاد جس میں ایسی خوبیاں نہیں اسے فخر کا کیا حق ہے:

"پدرم سلطان بود مرا چہ"

ایسی جاہل اور وحشی قوم اگر ان کے منشا کے خلاف کوئی ان کو زہد وتقویٰ اور نیک اعمال کی تعلیم دے تو کیا یہ اس کے عامل ہوسکتے ہیں۔

ایام جاہلیت کے عربوں میں کونسا علم وفضل پایا جاتا تھا اسی وجہ سے مسلمانوں نے زمانہ جاہلیت اس کا نام رکھا۔ مگر جب ایران وشام ومصر مسلمانوں کے قبضہ میں آئے خصوصاً سلطنت بنی العباس کے زمانہ میں تو عربی شعرا نے بھی وہی مدحیہ خوشامد آمیز قصائد کہنا شروع کر دیئے کیوں کہ امید صلہ ہوگئی۔ ایران کا تتبع اسے اس لیئے نہیں کہہ سکتے کہ فارسی شاعری کی ابتدا تیسری صدی ہجری سے مانتے ہیں۔ اور یہ خوشامدی شعرا عرب دو سو سال سے پہلے پائے جاتے ہیں کیوں کہ بنی اُمیہ کی حکومت ایک سو سال تک رہی۔ زمانہ سلطنت بنی اُمیہ میں بھی قصائد مدحیہ ملتے ہیں۔

مصالحہ بمعنی قوابل ہوگیا۔ ہمارے معزز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دینا چاہتے ہیں۔ مصالحہ کے آگے براکٹ ہیں (مسالا) بھی ۔ ۔ ۔ ۔ دیتے ہیں۔ تو چاہیئے ہے کہ عرصہ کو بھی (ارسا) لکھا کریں۔ اگر مصالحہ عربی میں بمعنی قوابل نہیں تو ہمارے متقدمین نے اس کا املا یہی قرار دیا۔ اُردو میں حروف ابجد عربی بھی ہیں۔ املا بدلنے کی کیا ضرورت۔ لفظ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہندی یا سنسکرت کا لفظ ہے جو بدلنے کی ضرورت ہو۔

تبدیل (ہ) بہ (یا) ایسے الفاظ جن کے آخر میں ہائے مختفی ہو بعض محل پر اس کا تلفظ (ی) کا کرنا پڑتا ہے۔ آج کل کے لوگ اس کو (ی) ہی سے لکھتے ہیں۔ جیسے آئینہ میں منھ دیکھا۔ اسکو یوں لکھتے ہیں۔ آئینے میں منھ دیکھا۔ کیا ہائے مختفی کسر ماقبل کے تلفظ کو مانع یا متعذر التلفظ ہے جو املا بدل کے (ی) جمع سے التباس پیدا کیا جائے۔ ایرانی گفتہ رفتہ کا تلفظ کسرہ تائے قرشت ہی سے کیا کرتے ہیں۔

عربی وفارسی کے الفاظ میں جب اُردو میں آکر تغیر اعرابی لفظی یا معنوی ہو جائے جیسے صاحب بفتح حا حطی یا ثمر بفتح میم یا عرصہ بمعنی مدت تو ان کو معطوف ومعطوف علیہ بواو عطف یا مضاف و مضاف الیہ بکسرہ اضافت نہ کرنا چاہیئے۔ ان غلط الفاظ کے استعمال میں کوئی مضایقہ نہیں جبکہ یہ غلط العام

ہوں یا ہیں۔ اوریجنل ORIGINAL تھیسس THESIS یا ریسرچ ورک میں سے RESEARCH کوئی بھی ہو ان کے AUTHOR کا یہی کام تو ہوتا ہے کہ اپنے مبحث کے موافق دوسرے مصنفوں کی لکھی ہوئی باتوں کو اپنی تصنیف میں جمع کردے۔ ورنہ مضمون تاریخی ہو یا کسی مصنف کی تصنیف وغیرہ ان مضامین میں مدت دراز کے بعد ایک مولف کی پیروی کیا چل سکتی ہے مگر ایسی تالیف کو وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں یا کسی پہلے مصنف کے تحاریر کی تصحیح کو بھی ریسرچ میں شمار کرلیتے ہیں۔ اس کام کے کرنے میں کتابوں کے علاوہ زرکثیر کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ سفر کرکے مختلف کتب خانوں کی کتابوں سے استفادہ کیا جاسکے۔ میں ان سب باتوں سے محروم ہوں۔ صرف اپنے تھوڑے سے معلومات اور حافظہ سے کام لیتا ہوں۔

مذکورہ بالا بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے میری تیس تالیفات میں سے ایک بھی اس معیار کی نہیں ہے، مگر اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ میری یہ تحریر بھی جدت سے خالی نہیں گو ایجاد بندہ اگرچہ گندہ کی مصداق ہے۔

شرح اشعار میں بھی اپنی حیثیت اور قابلیت کے موافق سعی اور تحقیق کی ہے اور تحقیق لغات میں صرف لغات متداولہ سے کام نہیں لیا ہے۔

کتب اور لغات غیر رائج مثلاً فقہ اللغۃ فی وغیرہ سے بھی کام لیا ہے اور وجہ ایک لفظ کی تاریخی حالت بھی لکھ دی ہے، مگر شرح اردو بھی ناقص ہونے کی وجہ سے ریسرچ میں اس کا شمار نہیں ہو سکتا ہے۔

## انتقاد بر کلام اُردوئے غالب علیہ الرحمہ

سب سے پہلے یہ بات بتادینا ضروری سمجھتا ہوں کہ غالب علیہ الرحمہ کے پیچیدہ اور کڈھب اشعار کے علاوہ میر اور غالب ہی کو اردو غزل گوئی میں اردو کا بہترین شاعر سمجھتا ہوں اور پیرو غالب ہوں لیکن جو مسامحات اور نقصانات ان کے کلام میں اپنی سمجھ کے موافق پاتا ہوں ان کا اظہار بھی ضروری جانتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ انسان کا کلام چاہے اس کی کتنی ہی بڑی ہستی ہو غلطی سے خالی نہیں ہو سکتا ہے۔

شرح میں ہر شعر کے ساتھ جسے قابل انتقاد سمجھا ہے انتقاد کرتا گیا ہوں۔ یہاں ہر فروگذاشت کے ایک ایک دو دو شعر لکھوں گا۔ اس کی ضرورت کیوں ہوئی۔ بعد انتقاد ظاہر کروں گا۔

غالب علیہ الرحمہ بات کے آگے کسی عیب کی پروا نہیں کرتے ہیں۔ بعض عیوب شعر کے الفاظ موجودہ میں ادنیٰ تغیر تقدم اور تاخر کا اگر کردیا جائے تو شعر جادہ استقامت پر آسکتا ہے مگر یہ اسے اسی طرح رہنے

دیتے ہیں۔ میں نے بعض اشعار میں اس طرح کا تصرف کر کے اپنے نزدیک انھیں سیدھا کر دیا ہے۔ شاعر نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے اسقام کا پیدا ہو جانا کچھ بعید نہیں۔

## صرف الفاظ مخل معنیٰ

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اس پہلے مطلع میں "شوخی تحریر" خلل انداز معنی ہے۔ چنانچہ خود غالبؔ اسے ترک کر کے جدائی و فراق وغیرہ ملا کر معنی تحریر فرما رہے ہیں۔ ؎

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست　　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی بمعنی انتشار و پریشانی ہے اس سے نقش سویدا کو تو اور بگڑ جانا چاہیئے۔ کچھ اسی طرح ہونا چاہیئے۔

آہوں کا ضبط نقش سویدا کا ہے سبب

## صرف الفاظ ثقیل

کاو کاوِ سخت جانیہائے پنہائی نہ پوچھ　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاو کاو اُردو میں بہت ثقیل معلوم ہوتا ہے ؎

کاوش سختی جاں خلوت کی اے دلبر نہ پوچھ

افسوس کہ دیدان کا کیا رزق فلک نے　　جن لوگوں کی تھی در خور عقد گہر انگشت

لفظ دیدان جمع الجمع دود ھ بمعنی کرم اور کیڑے مکوڑے اُردو میں نہایت ثقیل اور غیر مانوس ہے۔ جناب حسرت زاد عمرہ۔ وندان، (دانت) پڑھ کے معنی لکھتے ہیں مگر میری سمجھ سے باہر ہیں۔ کا کیا (ککیا) میں تنافر بھی ہے مگر ایسے تنافر سے کسی کا کلام بری نہیں۔

غالبؔ بچارے کیا کرتے۔ ردیف ہی منافی غزل ہے۔ تین شعر کہے اور تینوں کو غزل سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اس طرح ہی ہیں نہ کہتے مگر شعر نصیحت آمیز ہے مگر بے مزہ ہے ؎

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے　　بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیئے

بھوں کا مترادف اُردو میں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہے۔ ابرو۔ سماتا نہیں با ایں ہمہ کس قدر ناگوار سمع اس محل پر ہے۔

## صرف الفاظ غیر ضروری

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ        سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

لفظ خمار اس محل پر بالکل غیر ضروری ہے۔ اس کے مناسبات بھی شعر میں نہیں۔ یہ مصرع یوں یا اس کے مثل ہونا چاہیئے ؎

کس درجہ پائے بند رسوم و قیود تھا

اگر قافیہ مجبور نہ کرتا تو یوں ہونا چاہیئے تھا ؎

کس درجہ پائے بند رواج و رسوم تھا

## استعمال لفظ خلاف محاورہ

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا        تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

مرغوب آنا فارسی کے مرغوب آمدن کا ترجمہ ہے۔ اردو میں مرغوب ہونا بولتے ہیں۔ لفظ "پسند" کی قربت نے دھوکا دیا اس لیئے۔ آیا۔ کہہ گئے ؎

کیا کہوں بیماری غم کی فراغت کا بیاں        جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا

بیان کے ساتھ مصدر۔ کرنا ملاتے ہیں۔ کہوں کی جگہ۔ کروں۔ موزوں بھی ہے، ممکن ہے کہ کاتب کی غلطی ہو۔ مگر مختلف نسخوں میں۔ کہوں۔ ہی ملتا ہے۔ ؎

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے        ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

ایسے محل پر بجائے تقاضا۔ تقاضے بولتے ہیں۔ ؎

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے        ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

ممکن ہے کہ غالبؔ کے زمانہ میں دلی میں (تیوری) بروزن فاعلن بولتے ہوں مگر لکھنؤ وغیرہ میں بروزن فعلن بولتے ہیں۔ اور وہ اس طرح نظم بھی ہے ؎

تیوری چڑھی ہو نہ ہو اندر نقاب کے

دونوں مصرعوں کا مصدر بہ (ہے) ہونا بھی برا معلوم ہو رہا ہے۔

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے        دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

لت - بری عادت کو کہتے ہیں۔ لفظ شوق بتا رہا ہے کہ لپکا اور چسکے کی جگہ لاتے ہیں۔ نالہ کھینچنا بھی فارسی نالہ کشیدن کا ترجمہ ہے -

## تراجم محاورات فارسیہ

اس کی کلام غالب میں کثرت ہے۔ ترجمہ کر دینے سے نہ تو فارسی کا محاورہ باقی رہتا ہے اور نہ اُردو کا۔

کمال گرمی سعی تلاش دید نہ پوچھ — برنگ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

اس غزل میں، نفس کھینچنا، انتظار کھینچنا، ناز کھینچنا ساغر کھینچنا۔
دستر خوان پر کباب کھینچنا سب کے سب فارسی کے تراجم ہیں اُردو میں یوں نہیں بولتے۔ پھر تین متواتر اضافتوں کی اجازت دیتے ہیں۔ شعر بالا کے مصرعہ اولیٰ میں چار اضافتیں مسلسل ہیں۔

رندان در میکدہ گستاخ ہیں زاہد — زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں کے

طرف شدن بمعنی مقابل شدن کا ترجمہ کر دیا۔ یہ ترجمہ اُردو نہیں

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے — سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

(تو کہوے) تو گوئی کا پرانا ترجمہ ہے اُردو نہیں۔

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم — لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

لے لیا کسی سے کسی کو لے لینا۔ یہ خریدن کا ترجمہ ہے۔ یعنی کسی کو چھڑا لینا۔ بچا لینا۔ اسے اُردو سے کوئی تعلق نہیں۔ ہے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

گفتار میں آنا۔ بگفتار آمدن کا ترجمہ ہے مگر اُردو میں نہیں بولتے ہیں۔

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو — تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

دریغ آنا۔ دریغ آمدن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں دریغ ہونا یا کرنا بولتے ہیں۔

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر — تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

یہ (سے) بھی فارسی (با) کا ترجمہ ہے اُردو میں یوں نہیں بولتے۔

لخت دل بہ باد دے (لخت دل برباد کر دے) تماشا کرنا بمعنی دیدن۔

(سیر دیکھنا) کمتر ہے۔ سیر کرنا زیادہ ہے۔ ایسے سیکڑوں محاورے ہیں فارسی کے اُردو میں ترجمہ کر ڈالے جو اُردو میں نہیں بولے جاتے۔ انھیں کہاں تک لکھوں۔ شرح میں اپنی اپنی جگہ پر سب کچھ لکھ چکا

ہوں ۔

# بے معنی اشعار

جب میں ان کے سمجھنے سے عاجز ہوں تو میں اپنے نزدیک بے معنی نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ معانی ضرور ہوں گے۔ میں خود ہی بے معنی اور لایعنی ہوں جناب حالی ان اشعار کی تشبیب یادگار غالب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کے کہیں اس قسم کے اشعار کو ہم مہمل کہیں یا بے معنی مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے کہے ہوں گے۔ شاعر کا اپنے معمولی اشعار کاٹ دینے سے دل دکھتا ہے۔ بظاہر یہی سبب تھا کہ وقت انتخاب بہت سے اشعار جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے ان کے کاٹ دینے پر مرزا کا قلم نہ اٹھا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد ایسے اشعار ان کی نظر میں کھٹکے ہوں مگر دیوان شائع ہو چکا تھا اس لیئے دیوان میں باقی رہ گئے۔ دبے الفاظ میں یہ بزرگ بھی بے معنی اور مہمل ضرور سمجھتے ہیں۔ ؎

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ شعر میری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ کون سی مسلم اور مانی ہوئی بات ہے کہ یگانہ و یکتا دکھائی نہیں دیتا ہے اور کثیر دکھائی دیتے ہیں۔ سورج اور چاند پہلے علم ہیئت کے لحاظ سے واحد اور یکتا ہیں مگر دکھائی دیتے ہیں۔ فرشتے اور جنات کثیر ہیں مگر سب کو دکھائی نہیں دیتے۔ پھر اس شعر کے معنی کیا ہوں گے۔

اس شعر کی اصلاح اگر یوں کی جائے تو با معنی ہو سکتا ہے۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ وہ جسم سے بری ہے　　　ذرا بوئے جسم ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

ذرا (کے الف کا) دبنا اگرچہ بے قاعدہ نہیں مگر ثقالت پیدا کرتا ہے۔ یگانہ کو خبر یکتا کی قرار دیا ہے۔ چوں کہ یگانہ و یکتا ہم معنی ہیں لہٰذا ایک ان میں سے حشو ہوگا قبیح نہ سہی۔ دونوں کے درمیان عطف ہوتا تو معطوف علیہ کو مفسر مان لیتے ؎

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر　　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

پہلا مصرع وحدت وجود اور ہمہ اوست کو بتا رہا ہے اور دوسرا ہمہ اوست کو لہٰذا شعر میں تعارض و تضاد ہے اس لئے مصرع ثانی مثل اس کے ہونا چاہیئے ع

وہی ہم ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ع　　ہیں عین حق ہمارا پوچھنا کیا

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم　　　تیرے چہرہ سے عیاں ہو غم پنہاں میرا

بہت کچھ اپنی طرف سے ملا　کے شاید معنی پیدا ہوتے ہوں۔

گلشن میں بند وبست برنگ دگر ہے آج　　　قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

قمری کے طوق کے حلقۂ بیرون در ہونے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ باغ میں محبوب کے آنے سے قمری بھی باغ میں گھسنے نہیں پاتی ہے۔ کیوں بند وبست برنگِ دگر ہے اس کے لیئے شعر میں الفاظ نہیں۔ پھ باغ میں نہ آنے دینے کو اس طرح ادا کرنے میں کوئی لطف تعمیری سمجھ میں نہ آیا سوا اس کے کہ طوق قمری اور حلقہ در میں تشابہ ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں　　　ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

نام محبوب نہیں بتاتے اور محلہ کا نام نہیں لیتے پھر یہ کہنا ہر اک سے پوچھتا ہوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کرنا چاہیئے تھا ؎

اللہ تو ہی بتا دے جاؤں کدھر کو میں

**یا**

؎　　　اے دل تو ہی بتا دے جاؤں کدھر کو میں

**یا پھر**

یہ چھوڑا نہ رشک نے۔ یہ بھی رشک　نگذاشت کا ترجمہ ہے۔ ممکن ہے کہ اردو نہ ہو۔

قید ہستی سے رہائی معلوم　　　اشک کو بیر دپا باندھتے ہیں

چوں کہ میری سمجھ سے باہر ہے اس لئے بے معنی کہتا ہوں۔ جناب نظم اور حسرت کے معنی بتانے سے بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا　　　تعجب ہے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

مثل شعر بالا۔

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا　　　تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

ان تینوں اشعار کے معانی اگرچہ شرح میں لکھے ہیں مگر سب اٹکل پچو اور اوٹ پٹانگ ہیں سمجھ کے کچھ نہیں لکھا۔ محیط بادہ کے معنی نہ معلوم ہوئے محیط جام سے آخری خط جام کا مراد لے سکتے ہیں۔

## تصنع بے لطف

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

بے مزہ مبالغہ آمیز تصنع ہے۔

رگ لیلیٰ کو خاک دشت مجنوں ریشگی بخشے
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

تصنع بے لطف تو ہے ہی۔ پھر۔ حباب رفتار موج کہنا چاہیئے تھا۔

## شتر گربہ

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزہ پایا

آپ کا لفظ طعناً سہی پھر بھی شتر گربہ ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کوئی بتلا دے بولتے ہیں۔ شاید دلّی میں یوں ہی بولتے ہوں۔

## تعقید

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

کہنا یہ ہے کہ مے گلفام کے کم ہونے کا رنج بہت ہے۔ پھر گلفام محض قافیہ کے لئے ہے

## بیان میں تعارض

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

پہلے خاموش رہنے کو فرماتے ہیں پھر محبوب کو الزام نہ دینے کے لئے کہتے ہیں کہ ہم یہ بھی نہ کہیں گے کیوں ہم نہ کہتے تھے۔ حالاں کہ مثل مشہور ہے۔ السکوت کالاقرار۔ چپ رہنا اس بات پر دال ہے کہ غیروں کی وفاداری ان کو بھی تسلیم ہے۔ اگرچہ خموشی بعض اوقات کسی بزرگ کی بات پر اختلاف رائے میں بھی ہوتی ہے۔ مگر ایسی حالت میں کیوں ہم نہ کہتے تھے نہیں کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا مصرع ثانی یوں ہونا چاہیئے ۔؎

ے بیاں کرتے تھے تم پر ہم مخالف اس کے رہتے تھے

کیا کرتے تھے تم تقریر۔ یہ بھی طرز ادا فارسی کا ہے۔ اُردو میں ادا کر سکتے ہوں تو فارسی طرز ادا کی اُردو میں کیا ضرورت۔ ے

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں  آج غالب غزل سرا نہ ہوا

جس غزل کا یہ مقطع ہے اس میں دس شعر ہیں۔ کسی مشاعرہ کے لیئے کہی ہو اور پڑھی ہو یہ بات جاریہ کے خلاف ہے۔ پڑھی ہو تو یہ کہنا کہ ؎

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

بے معنی ہے۔ یہ تاویل کہ یہ غزل طرح کی نہ تھی اور لوگ طرح کی غزل کے متمنی تھے تو اس کے منافی۔ کچھ تو پڑھیئے۔ ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ طرح اور غیر طرح کا کوئی شعر بھی نہیں پڑھا۔

## تنافر

ترے تیرِ نیم کش کو کوئی میرے دل سے پوچھے  یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

جو جگر کے واو حذف ہو جانے سے (جُجگر) ہو کے تنافر پیدا ہو گیا۔ اگرچہ کسی شاعر کا کلام اس قسم کے تنافر سے خالی نہیں مگر بچا سکتے ہوں تو احتراز اولیٰ ہے۔

عشق کا تعلق سراسر دل سے ہے مگر شعرا قربت کی وجہ سے یا اعضائے رئیسہ میں ہونے کے سبب سے جگر کو بھی دل کی باتوں میں شریک کر لیتے ہیں۔ اگرچہ جگر میں اس قسم کا احساس نہیں ہے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ کے معنی " میں اسے بہت عزیز رکھتا ہوں " مان کے بھی دل ہی کا بیان مصرع ثانی میں بھی ہو نا کیا عجب ہے کہ بہتر ہو۔ خصوصاً اس لئے کہ تنافر دور ہو جاتا ہے لہٰذا مصرع تو شاید اچھا ہو ے

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو وہ دل کے پار ہوتا

اگرچہ (جو وہ) کے (واو۔ اور۔ ہ) گر جانے سے مصرع میں جھول آگیا ہے یہ تو میری کم مشقی پر دال ہے۔ کوئی دوسرا اس سے بہتر نظم کر سکتا ہے۔

زہر ملتا ہی نہیں مجکو ستم گر ورنہ  کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نسکوں

(کی کہ کھا) کی (کی ی) کہ (کی ہائے مختفی جو بیان حرکت کے لیئے) تھی گر کے (ککگھا) تین کاف جمع ہو کر سخت تنافر پیدا ہو گیا۔ ایسے محل پر کی (کہ) ہی استعمال کرتے ہیں ے

کیا قسم ہے ترے ملنے کی جو کھا بھی نہ سکوں

پڑھنے سے یہ تنافر دور ہو سکتا ہے۔

## اختلاف ازمنہ

مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب　　　آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

سیکوئنس آف ٹنس SEQUENCE OF TENSE مطابقت ازمنہ ٹھیک نہیں۔ یوں ہونے کی ضرورت ہے ؎

پی گئے بہت وہ مے بزم غیر میں یارب

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد :: ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا۔ 'تھا' ردیف چاہتی ہے کہ ؎

قید میں تھی الخ مطابقت زمانہ کیوں سے ہو

## بدل الفاظ مستعملہ غالبؔ

ہے خیال حسن میں حُسن عمل کا سا خیال　　　خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

دوسرے لفظ خیال کی جگہ شاید لفظ (اثر) اچھا ہو۔

سن اے غارتگر جنس وفا سُن　　　شکست قیمت دل کی صدا کیا

کسی چیز کے ٹوٹنے میں جبکہ وہ کم زور بھی ہو کچھ نہ کچھ آواز ضرور ہوتی ہے لہٰذا اس خفیف آواز کو کوئی کب سن سکتا ہے اور جب کوئی سُنے گا ہی نہیں تو پھر تم کو الزام کیا دے گا۔ عاشق کا دل توڑ کے اپنی خواہش پوری کرتے رہو۔

؎ شکست قیمت دل کی سزا کیا

دل شکنی عاشق کا انتقام نہیں لیا جاتا ہے یا ؎

شکست قیمت دل ہے بھلا کیا

دل شکنی عاشق بہت معمولی چیز ہے۔ تمہیں الزام کوئی نہیں دے سکتا۔ مگر ان کی جدت پسند طبیعت اتنا سیدھا کہنے پر کب راضی ہو سکتی تھی۔ لفظ قیمت کوئی معتد بہ فائدہ نہیں دے رہا ہے۔ انھوں نے شکست قیمت سے نرخ اور قدر گھٹ جانا مراد لیا ہے۔ اس شکست میں تو آواز مطلق نہیں ہوتی ہے اس لئے لفظ قیمت لائے۔ ؎

ہے خبر گرم ان کے آنے کی　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ہی کی جگہ (بھی چاہیئے) ممکن ہے یہ غلطی کتابت ہو۔ ؎

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا　　بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

دوسرا مصرع بطور تمثیل لائے ہیں ورنہ ؎

گھر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

سیدھا ہے بہر صورت ادعائے محض مبالغہ آمیز تو ہے ہی۔ پھر (بھی) کا محل (تو) کے بعد ہے۔

درد دل کہوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں

انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

مصرع ثانی چاہتا ہے کہ کہوں کی جگہ "لکھوں" ہو اور دکھلاؤں کی جگہ دکھلادوں تاکہ فورس (زور) بڑھ جائے۔ ؎

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے بعد　　تار نفس کمند شکار اثر ہے آج

بعد کی جگہ ساتھ چاہیئے۔ ؎

ہم اور فسردن اے تجلی افسوس　　تکرار روا نہیں تو تجدید ہی

مصرع ثانی یوں ہونا اچھا ہے ؎

جائز جو اعادہ نہیں تجدید سہی

اعادہ معدوم کو حکما ناجائز کہتے ہیں تو تجدید (بتجدید) کا تنافر بھی دور ہو گیا۔ تکرار کا مفاد بھی اعادہ میں موجود ہے اگر اعادہ معدوم سے کوئی غرض رکھی بھی جائے۔

## معشوق بازاری

صحبت میں غیر کے نہ پڑی ہو یہ خو کہیں　　دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ　　سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

دوسرے شعر میں معشوق کے بازاری ہونے کے علاوہ شہوت پرست اور بے حیا ہونے کا بھی اظہار ہے ؎

## بد مذاق اشعار

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

---

مگر لکھوائے اس کو کوئی خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پہ رکھ کر قلم نکلے

---

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

---

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

---

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچہ سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

جناب بیخودؔ دہلوی نے اس شعر کے ساتھ حکیم مومنؔ خاں کا واقعہ بھی لکھا ہے۔ تب بھی دیوان میں اس کے رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

دوسرے شعر میں "مگر" بھی بے محل معلوم ہوتا ہے۔ شاید فارسی کی طرح بمعنی بالضرور استعمال کیا ہے "اگر" اچھا خاصہ لفظ موجود تھا۔

## ناگوار سماعت

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں کعبہ سے ان بتوں کو نسبت ... ہے دور کی

(گو واں) (پہ واں) کس قدر ناگوار طبع ہے۔ بہت آسانی سے یہ عیب دور ہو سکتا تھا۔ مگر وہ روانی اور

صفائی کی نظم کرنے میں ادنی پروا نہیں کرتے ہیں ؎

گو اب وہاں نہیں پہ نکالے وہیں کے ہیں

سادہ پرکار ہیں خوباں غالبؔ　　ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

بلا عطف واضافت یہ جمع خوباں کیسی بری معلوم ہوتی ہے۔

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں

تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

نے (اہمال) اور نا (مشتبع) بجائے نہ اردو میں ثقیل ہے پھر (پا) بلا عطف واضافت فارسی بھی ناگوار ہے۔ ؎

پھر جگر کھودنے لگا ناخن　　آمد فصل لالہ کاری ہے

جگر کھودنا۔ فارسی جگر کاویدن کا ترجمہ کر ڈالا۔ اردو میں کیسا ناگوار سماعت ہے۔ ؎

کار ناخن ہے پھر جگر کاری　　آمد موسم بہاری ہے

مصادر فارسیہ یہ بھی اور ان کے ہم عصر شعرائے دہلوی بلا عطف واضافہ کرتے ہیں جو ناگوار طبع ہوتے ہیں۔ ؎

میں اور صد ہزار نوا ہائے جاں فراش　　تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

## اعلان نون بحالت مضاف الیہ

بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار یار میں　　فرمانروائے کشور ہندوستان ہے

لفظ ہندوستان کے اعلان نون پر جناب نظم و حسرت دونوں معترض ہیں۔ اس کا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح اعلان نون فارسی میں غیر فصیح ہے اسی طرح اردو میں بلا ترکیب اعلان ہی فصیح ہے۔ چوں کہ یہ لفظ ہندوستان با اعلان نون فصیح تھا اور علم بھی تھا لہٰذا اس میں تصرف نہ کیا اور بالاعلان نظم کر دیا۔ مگر اشعار ذیل میں ؎

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان　　ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

وہ کہ جس کی صورت تکوین میں　　مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

ہندوستان والی تاویل کام نہیں دیتی۔

# اختلاف قواعد تقطیع

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے  دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس کی بحر رمل مخبون محذوف یا مقصور ہے۔ اور مسدس ہے اس لیئے کم از کم دو رکنوں کو مخبون ہونا لازم ہے۔ صدر و ابتدا کو سالم بھی لا سکتے ہیں یعنی فاعلاتن فعلاتن فعلن بھی کہہ سکتے ہیں ورنہ اصلی وزن مخبون کا فعلاتن فعلاتن فعلن ہے۔ مصرعہ اولیٰ کے دوسرے لفظ "ویرانی" کی (ی) کو اگر باقی رکھیں تو وزن فاعلاتن فاعلاتن فعلن ہو جاتا ہے اور بنائے خبن قائم نہیں رہتی۔ اس لیئے ضروری ہوا کہ (ی) کو تقطیع سے خارج کر دیں تاکہ دوسرے کا ہم وزن رہے۔

ایرانی الف اور (یا) کے تقطیع سے حذف نہ کرنے کے سخت پابند ہیں مگر واو کو بعض الفاظ سے خصوصاً لفظ دو حرفی سے اکثر گرا دیتے ہیں۔ ناسخ نے اس قاعدہ کو کہ الفاظ عربیہ اور فارسیہ کے حروف علت کو جو آخر لفظ میں واقع ہوں ان کا حذف کرنا ناجائز قرار دیا۔ اُردو کے شعرا اردو الفاظ کے آخر سے (ی) کے حذف کرنے میں ذرا تکلف نہیں کرتے ہیں اس لیئے کہہ سکتے ہیں کہ قاعدہ ماننے کے بعد جو ان سے بھی فارسی کی (ی) گر گئی تو ضرور سہواً گری ہوگی۔ چنانچہ انھیں کا یہ مصرع ہے ؎

خوف بدہضمی کا ناسخ نہیں غم کھانے میں

حضرت انیسؔ اعلی اللہ مقامہ بھی اس قاعدہ کے پابند نہیں۔

جناب غالبؔ اس قاعدہ کے پابند معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایک تو اس شعر میں اور دوسرے شاید ایک اور شعر میں (ی) گر گئی ہے اور بس الف کہیں نہیں گرایا ہے۔

## ایطاء

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے  کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

اس غزل کے قوافی، آئے، ستائے۔ لگائے، چھپائے، اٹھائے، بلائے، بٹھائے ہیں۔ اور ان میں حرف روی (الف) ہے۔ روی کو لفظاً یا معنیً مختلف ہونا لازم ہے۔ سنائے اور بتائے میں الف جو روی ہے وہ تعدیہ کا ہے اور دونوں قوافی میں ایطاء ہے جسے اہل فن افحش عیوب قافیہ قرار دیتے ہیں۔

ایطاء، مصادر، مشتقات، صیغہ ہائے جمع وغیرہ میں ہوا کرتا ہے۔ شناخت ایطے کی یہ ہے کہ

حرف ردی دور کرنے سے مشتقات میں صیغہ امر باقی رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں قوافی سے الف روی دور کرنے کے بعد سن اور بن امر کے صیغے باقی رہتے ہیں لہٰذا ایطا ہوا (سنا اور بنا ہیں)۔

اُردو شاعری میں مطلع کے سوا اور تکرار قافیہ کو بجائے قبیح احسن مانتے ہیں اور ایک ہی قافیہ میں ساری خوب سمجھی جاتی ہے اور کمال شاعر مانتے ہیں۔

## مجریٰ۔یا۔غلو

آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے　　　نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ ہے

بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا　　　شیشہ میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

اول تو سیلاب کیسا اور کہاں سے اور کیوں آرہا ہے دوسرے طوفان کے معنی عربی میں DELUCE سیلاب کے ہیں اور طغیان آب کے۔ اس لئے صدائے طغیان آب ہونا چاہیئے پھر ایسے محض پر اردو بول چال کے لحاظ سے جادہ کا تلفظ (جادے) ہوگا لہٰذا دال نہلہ جو روی ہے اس کی۔ حرکت کو کسرہ ہے اور "موج بادہ" کی دال مفتوح ہے اس اختلاف کا نام مجریٰ یا غلو ہے اور عیوب قافیہ میں اس کا شمار ہے جبکہ روی متحرک ہو جائے تو روی سے پہلے کی حرکت جسے توجیہ کہتے اس کا احذاف جائز مانتے ہیں۔ یہ اس سے الگ چیز ہے۔

مزید برآں شراب کو پری کہتے ہیں اور عزائم اور عمل سے اسے شیشہ میں اتارتے ہیں۔ موج کی مناسبت سے لفظ نبض لائے لیکن نبض کا شیشہ میں پنہاں ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ اتنی خرابیاں ہوتے ہوئے میں اپنی ناسمجھی کی بنا پر بے معنی کیسے نہ کہوں حقیقتاً یا جو لوگ سمجھتے ہیں ان کے نزدیک بے معنی نہ ہوگا۔

## ناموزوں شعر

### رباعی

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ　　　دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں　　　سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

قلمی اور خود غالبؔ کے دیکھے ہوئے مطبوعہ نسخوں میں۔ رک رک کر بتکرار ہی ملتا ہے اور بول چال کا بھی تقاضا یہی ہے کہ بتکرار ہو۔ مگر تکرار کے ساتھ ایک رکن بر وزن (فع) یعنی ایک سبب خفیف وزن رباعی سے بڑھ جاتا ہے۔

اگر انھیں کی ایک دوسری رباعی کا یہ مصرع ذرا سے تغیر کے ساتھ یہاں لے آیا جائے تو یہ عیب جاتا رہتا ہے ؎

دل سخت نژند ہو گیا ہے غالبؔ

تو یہ عیب ناموزوں رفع ہو سکتا ہے۔

جناب نظم اپنی شرح میں مشورہ دیتے ہیں کہ جب غالبؔ کا ایسا اوزان عربیہ میں چوک گیا تو اس سے ظاہر ہے کہ یہ اوزان مناسب آب و ہوائے ہندوستان نہیں۔ اس لئے پنگل میں ہندوستانیوں کو کہنا چاہیئے۔

نسخہ مطبوعہ بدایوں میں ایک رکن حذف کر کے یہ رباعی چھپی ہے اور وزن رباعی میں لے آئے ہیں اور کہاں تک لکھوں۔ بس اتنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ زیادہ کو شرح میں دیکھئے۔

رُک کر بند ہونے کے کیا معنی ہوں گے۔ رکنا اور بند ہونا متحد المعنی اور مترادف المفاد ہے۔ اگر یوں ہوتا کہ۔ رکا اور بند ہو گیا ہے تو عطف کو تفسیر کا مانتے جب ایسا نہیں ہے تو پہلے یہ مصرع ناموزوں تھا اور اب بے معنی ہو گیا۔

۲۶ر جولائی ۱۹۴۷ء معادل ۶ر رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ یوم شنبہ۔

نوٹ: مجھے غالبؔ سے نہ کوئی خصومت ہے اور نہ عناد۔ اور نہ اس فعل سے اپنی شہرت چاہے وہ بدنامی ہی کے ساتھ ہو مقصود ہے۔ بلکہ دوسروں کی توجہ اس جانب بھی مبذول کرنا مطلوب ہے اگر کچھ صحیح اور بجا کہہ سکا ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بڑے بڑوں سے تسامح اور غلطی ہوتی ہے اور اتنا حصہ کلام غالبؔ کا قابل تتبع نہ ہوگا۔

---

# ذکر دیگر شروح دیوان اُردوئے

## حضرت غالب علیہ الرحمہ

سنتا ہوں کہ اب تک دیوان غالب کی تقریباً اٹھارہ شرحیں شایع ہوچکی ہیں جن میں سے معدودے چند میرے دیکھنے میں آئی ہیں۔ ان میں سے کسی کسی پر اپنی رائے کا اور دوسری شرحوں پر دوسروں کی رائے کا اظہار کروں گا۔ ان کے علاوہ اور بھی شرحیں ہوں گی مگر مجھے ان کا علم مطلق نہیں۔

۱۔ جناب زاد عمرہ اپنی مختصر شرح کے دیباچہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"وثوق صراحت از حضرت وآلہ دکھنی ہے جو درحقیقت بعض نوٹوں اور اشاروں کا مجموعہ ہے جن کی مدد سے غالباً وآلہ مرحوم کا ارادہ شرح لکھنے کا تھا۔ یہ اشارے اگرچہ نامکمل ہیں لیکن ان کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دیکھا میں نے ان کا نام تک نہ سنا تھا۔

۲۔ حضرت مجدد الوقت جناب شوکت میرٹھی کی شرح جس میں بعض اشعار کے سات سات معنی بیان کرکے داد تحقیق دی گئی ہے، لیکن راقم الحروف (یعنی جناب حسرتؔ) اپنے قصور فہم کے باعث ان دقیق مطالب کے سمجھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہا۔

جناب شوکت عدیم المثال قابل بزرگ تھے۔ کلام منظوم و منثور فارسی کی بھی انھوں نے شرحیں لکھی ہیں۔ ہر شرح میں ایسے ایسے نازک اور دقیق خیالات سے کام لیا ہے کہ ان کے ادراک سے نوع بشر عاجز ہے وہ اپنے خیال میں خاقانی انوری۔ عرفی اور نظیری وغیرہ سے بہتر کلام کہنے کے مدعی تھے (شادان)۔

۳۔ یادگار غالب مصنفہ جناب شمس العلما مولوی حالی صاحب یہ کوئی شرح نہیں ہے۔ بلکہ حضرت غالب کی لائف ہے۔ ان سے بہتر کوئی بھی غالب کی لائف لکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر آسان اور قریب الفہم اشعار کے معانی بیان کرنے میں وہ وہ باریکیاں اور نزاکتیں پیدا کی ہیں کہ ان تک دوسروں کا خیال پہنچنا دشوار ہے، لیکن دشوار اور بعید الفہم اشعار میں سے کسی ایک کو چھوا بھی نہیں۔ کیوں کہ شرح لکھنا مقصود نہیں اور مدح کرکے حق شاگردی ادا کرنا تھا۔ پھر نقصانات و مسامحات کیوں دکھاتے۔

۴۔ شرح دیوان غالب از مولوی سید علی حیدر صاحب نظم وحید رطباطبائی لکھنوی۔ یہ شرح سب سے بہتر ہے مگر راقم الحروف (حسرت) کو اس وقت ملی جبکہ دیوان کی شرح چھپ چکی تھی۔ تاہم قصائد غالب کی شرح میں اس سے بہت کچھ مدد ملی جس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

یہ پہلے اڈیشن کے دیباچہ کی عبارت ہے مگر دوسرے اڈیشنوں میں شرح لیں۔ دیوان میں بھی اس شرح کے حوالے ملتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ شرح اشعار دیوان میں بھی بعد ازاں مدد ملی۔

کچھ مسامحات حضرت غالب دکھانے کے بعد جناب حسرت تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا کی اس قسم کی بہت سی غلطیاں جناب نظم نے اپنی شرح میں دکھائی ہیں جن کا کچھ جواب نہیں ہو سکتا ہے۔

جناب حسرت کی شرح جناب نظم کو بہترین شرح کہنا بالکل بجا و درست ہے۔ اب تک اس سے بہتر تو کیا۔ اس کے برابر بھی کوئی شرح لکھی نہیں گئی۔ افادات مختلف سے پُر ہے اور کوئی شارح ایسا نہیں جو اس شرح کا منت پذیر نہ ہو۔ یہ شرح نہ ہوتی تو میرے ایسے بہت سے لوگ اشعار غالب کے سمجھنے سے محروم رہتے۔

۵۔ شرح مصنفہ حضرت حسرت موہانی۔ یہ شرح مختصر ہے۔ گویا فٹ نوٹس ہیں۔ اور وہ سمجھ داروں کے لیے لکھی گئی ہے نہ مجھ ایسے شعر نافہم کے لیے۔ بعض اشعار کے معنی جناب نظم سے الگ بھی لکھے ہیں اور اچھے ہیں۔ جن کو وہ قابل شرح سمجھتے ہیں انھیں اشعار کو اختیار کرتے ہیں۔ بہت سے اشعار چھوڑتے جاتے ہیں۔ میرے ایسے کے نزدیک ایسے اشعار بھی چھوٹے ہیں جو قابل شرح تھے۔

۶۔ مرآۃ الغالب۔ یہ شرح جناب سید وحید الدین صاحب بیخود دہلوی کی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ افادات جناب نظم کو چھوڑ کر مختصر عبارت میں بالفاظ دیگر نظم ہی کی شرح ہے۔

۷۔ مطالب غالب۔ یہ شرح جناب سہا کی ہے۔ جناب آسی اس شرح کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں کہ مصنف نے بے کار وقت ضائع کیا خالی بیٹھے تھے تو یہ شرح لکھ ماری۔ اس سے بہتر تھا کہ کچھ اور کام کیا ہوتا۔

۸۔ رموز غالب۔ مصنفہ احسان ابن دانش۔ یہ بزرگ کسی شعر کو چھوڑتے نہیں۔ پہلے شعر کے معنی چول کر طولانی ہیں اور اس میں اپنی طبیعت کی جولانی دکھائی ہے اس سے بحث کرتے کہ الفاظ شعر ان مطالب پر دال ہیں یا نہیں اس کو چھوڑ کر صرف دوسرے شعر کے جو معنی لکھے ہیں اس پر اکتفا کرتا ہوں۔

کرید کرید کر یا کھود کھود کر میری تنہائی اور سخت جانی کو نہ پوچھ۔ شب فراق میں شام سے صبح کرنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ البتہ شاعر نے شام کی سیاہی کو پہاڑ سے اور سپیدی سحر کو جوئے شیر سے تشبیہ

دی ہے۔ اور کمال شاعری کا اظہار کیا ہے یعنی فراق کی گھڑیاں گزرنی بمنزلہ جوئے شیر کے ہیں۔

تنہائی و شب فراق میں میری سخت جانی جو کاوش میرے ساتھ کر رہی ہے اس کاوش کی حالت اے محبوب یا اے ہمدم مجھ سے کچھ نہ پوچھ۔ (یعنی ایسی مصیبت کے ہوتے ہوئے مر کیوں نہیں جاتا) ایسی مصیبت، والی شام یا رات کا کاٹنا (اور مر جانا) اتنا ہی دشوار اور کٹھن ہے جتنا کوہ بے ستون کو کاٹ کر محل شیریں میں جوئے شیر کا لانا۔ دوسرا مصرع تمثیل دشواری میں ہے نہ تشبیہ جو کہا جائے کہ شام کو تشبیہ پہاڑ سے اور سحر کو جوئے شیر سے تشبیہ دی ہے۔ تمثیل میں مشبہ و مشبہ بہ الگ الگ نہیں ہوتے ہیں بلکہ حاصل کی حاصل سے تشبیہ ہوتی ہے۔

اے مخاطب میری تنہائی و سخت جانی کو کرید کرید کر نہ پوچھ یہ معنی نہیں کیوں کہ کاو کاو سخت جانی مضاف و مضاف الیہ ہے۔

اسی طرح سے اکثر اشعار کے معنی تحریر فرماتے ہیں۔ خدا یا ناظرین جانیں کہ معنی کہاں ہیں۔

۹۔ غالب نامہ۔ جناب شیخ محمد اکرم۔ ایم۔ اے۔ آئی۔ سی۔ ایس اس کے مصنف ہیں۔ یہ کوئی شرح نہیں ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک کا نام آثار غالب ہے۔ اس میں غالب کے کلام نثر اردو و فارسی کا انتخاب ہے اور دوسرے حصہ کا نام ارمغان غالب ہے اس میں کلام نظم فارسی و اردوئے غالب کا انتخاب ہے، خوبیاں کلام غالب کی دکھائی ہیں۔ تاریخی حالت کلام غالب کی اور اس کے انتخاب کی خوب تحقیق سے لکھی ہے مگر ان کے کلام کے پانچ ادوار جو قائم کئے ہیں وہ خیالی تو ہو سکتے ہیں وقوعی اس لئے نہیں ہو سکتے کہ دیوانوں کی ترتیب حروف تہجی سے ہوتی ہے۔ معلوم ہو سکتا کہ یہ غزل کس زمانہ میں کہی گئی۔ پھر ہر غزل میں تقریباً گذ مڈ ہتے اشعار بھی ملتے ہیں۔ ایسا کمتر ہے کہ پوری غزل گنجلک یا پوری صاف اور سادہ ہو۔ جیسے آج تک میر کے بہتر نشتر کی تعین نہ ہو سکی اسی طرح کلام غالب کو ادوار پر تقسیم کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے۔

۱۰۔ ڈاکٹر بجنوری نے بھی کلام غالب کے متعلق ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ وید اور دیوان اردو غالب ہندوستان کی الہامی کتابیں ہیں۔

اشعار غالب میں مسائل فلسفیانہ یورپ کو ٹھوستے ہیں جو غالب کے زمانہ میں ہندوستان میں نہیں آئے تھے اور غالب نے انھیں خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ مصداق اس مثل کے ہیں۔

التاویل بما لایرضیٰ قائلہ

۱۱۔ جناب آسی اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ جناب ناطق نے بھی جو ان کے استاد ہیں غالب کے دیوان

کی شرح لکھی ہے۔ اگر وہ مراد ہیں جن کو بلگرام سے بھی کچھ تعلق ہے تو مجھے بھی ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہے اور وہ خوش گو شاعر ہیں ضرور اچھی لکھی ہوگی۔ مگر وہ چھپی نہیں ہے اس لئے میرے دیکھنے میں کیسے آتی۔

۱۲۔ شرح حضرت بیخود موہانی ایم۔ اے مرحوم۔ ایک اخبار سرفراز لکھنؤ میں ایک غزل غالب کی شرح دیکھنے میں آئی تھی۔ جس کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے ؎

شبنم بگل لالہ نہ خالی ز ادا ہے

ان کو اپنی ہر بات پر خصوصاً شاعری پر بڑا ناز تھا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ کلام غالب کو ان کے سوا کوئی دوسرا سمجھ ہی نہ سکا۔ فارسی دانی کے بھی بڑے مدعی تھے۔ حالاں کہ زبان آموز کو بجز اہل زبان صرف الفاظ بر محل آتا ہی نہیں۔ منطق اور فلسفہ وغیرہ میں ارسطو و افلاطون سے بڑھ کر ہونا ممکن ہے۔ مگر غیر زبان عمر بھر نہیں آتی۔ اپنے ملک میں اندھوں میں کانا راجہ ہو سکتا ہے اور بس۔

۱۳۔ سنتا ہوں کسی حیدر آبادی نے صرف عیوب کلام غالب کے انگریزی زبان میں لکھے ہیں اور وہ چھپ بھی گئے ہیں اور کوئی صاحب رام پور میں اسی مبحث پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ جو ابھی تیار نہیں۔ میرے دیکھنے میں دونوں نہیں آئیں۔

۱۴۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے کسی پروفیسر نے بھی شرح لکھی ہے اور چھپی بھی ہے مگر میں نے نہیں دیکھی۔

۱۵۔ جناب مہر ایڈیٹر انقلاب لاہور نے بھی لاالف حضرت غالب صرف کلام غالب ہی سے لکھی ہے۔ یہ کوئی شرح نہیں ہے۔

۱۶۔ میں نے اسنی المطالب فی الشرح الدیوان الغالب صرف کلام غالب ہی سے لکھی ہے۔ نام کے لئے تو شرح ہے۔ مگر یہ کسی شمار میں نہیں۔ خون لگا کے خواہ مخواہ شہیدوں میں داخل ہوا ہوں۔ ورنہ مجذوب کی بڑ اور دیوانہ کی بکواس سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں۔

۱۷۔ شرح دیوان غالب از جناب آسی۔ یہ بزرگ بھی جناب بیخود موہانی سے کم نازاں نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ الفاظ ناز کمتر ملیں گے مگر ضمناً INDIRECTLY عبارت سے ایسا ہی مترشح ہوتا ہے۔ جناب نظم کی شرح سے خار کھاتے ہیں۔ ہمیشہ ان کی شرح پر منھ آتے ہیں اور منھ کی کھاتے ہیں۔ آسان اشعار کے معنی تو سبھی ٹھیک لکھ سکتے ہیں مصیبت ان کے اُلجھے ہوئے اشعار کے معنی کہنے میں ہوتی ہے۔ کوئی شعر معنی لکھنے سے چھوڑتے نہیں جناب شوکت میرٹھی کی طرح بعض اشعار کے چار چار معانی لکھتے ہیں۔ مگر سب خیالی ہیں۔ الفاظ ترکیب طرز ادا سے بالکل تمسک نہیں کرتے۔ دفع اعتراضات جناب

نظم میں سخت کوشاں رہتے ہیں جن کو جناب حسرت سراسر بجا و درست فرماتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے ہیں
جب بھی جناب نظم سے الگ راستہ اختیار کرتے ہیں ہمیشہ بھٹک جاتے ہیں۔ اب میں جناب مولوی عبدالحق صاحب
بی۔اے ایڈیٹر رسالہ اردو کی رائے کو ان کی شرح کی نسبت مختصر کر کے لکھے دیتا ہوں۔ ناظرین اسے ملاحظہ
فرمائیں۔ جناب موصوف نقاد مشہور اور مسلم ہیں۔

رائے جناب مولوی عبدالحق صاحب بر شرح جناب آسی عبدالباری صاحب آسی الدنی نے اپنی شرح میں
خاص بات پیدا کی ہے وہ سب سے نرالی ہے۔ فاضل شارح نے اس کتاب میں جودت طبع غیر معمولی جدت و
طباعی کا عجیب و غریب ثبوت دیا ہے۔ فاضل شارح نے ذوق سخن کے پردہ میں جو گل کھلائے ہیں وہ قابل داد
ہیں۔ نمونہ کے طور پر دو چار مثالیں لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دُنیا جل گیا

اس شعر میں نکتہ یہ ہے کہ جب دل جل گیا تو اب افسردگی کی آرزو ہے جلنے کے بعد ہی افسردگی پیدا ہوتی
ہے۔

ناقد : یہاں شارح نے جلنے کے وضعی معنی لیئے ہیں۔ جب جلنے کے بعد افسردگی لازم ہے
تو پھر آرزو کے کیا معنی۔ (حقیقت یہ ہے کہ جلنے کے معنی یہاں کڑھنے اور سخت رنجیدہ ہونے کے ہیں نہ سوختن
کے)۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا
ننگ وجود محض تناسب الفاظ کے لیئے ہے۔ باقی خیریت۔

ناقد۔ مرزا صاحب اگر زندہ ہوتے تو اس ذوق سخن کی ضرور داد دیتے۔ میں اس قدر فضائل سے
عاری اور رذائل سے پُر تھا کہ خود ہستی کو میری ذات سے عار آتی تھی۔ مرنے کے بعد یہ عیب مجھ سے دُور
ہوا اور ذات ہستی کو جو میرے ہونے سے ننگ لاحق تھا وہ داغ جاتا رہا۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
فرماتے ہیں کہ دو چار ہونے سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ کبھی اس کی کسی سے جنگ ہوتی۔

ناقد : واہ کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
یعنی ہم وہ آشفتہ سر تھے کہ کبھی اپنے سر و پا کا ہوش نہیں رہا اور یہ عادت کچھ آج نہیں بچپن ہی سے ایسی ہی تھی کہ

شوخی سے ہم نے مجنوں کے سر میں مارنے کو جب پتھر اُٹھایا تب اپنا سر یاد آیا۔ اور پھر وہ پتھر اپنے ہی سر میں مار لیا۔

**ناقد :** اپنے سر میں مار لینے کی ایک ہی رہی (یا کہی) اپنا سر یاد آیا یعنی ایک زمانہ ایسا بھی آنے والا ہے کہ مجنوں کی طرح اطفال ہم پر بھی پتھراؤ کریں گے۔

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں ۔۔۔ یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

اے ساقی دنیا میں شراب دینے میں خسّت سے کام نہ لے۔ اس سے تو ساقی کوثر کی شان میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے کیوں کہ اگر شراب بری چیز ہوتی تو ساقی کوثر کو یہ کام کیوں سپرد ہوتا۔

**ناقد :** کیا خوب شرح فرمائی ہے۔ فاضل شارح کے عجیب و غریب نکتے قابل داد ہوتے ہیں۔
جنت میں شراب کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کل کے لئے اُٹھا رکھنے اور بخل سے کام لینے کی ضرورت نہیں وہاں بھی خوب پینے کو ملے گی۔ تو یہاں بھی کیوں نہ خوب پلاؤ اور خسّت کیوں کرو۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ۔۔۔ ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

فرماتے ہیں کہ شرم ایک ادائے معشوقانہ ہے۔ کوئی نہ ہو تو خود ہی سے شرمانا چاہیئے۔ وہ اگرچہ شرمائے ہیں مگر حجاب سے بے حجاب ہونا بھی ایک امر خلاف شرم و ادائے معشوقانہ ہے۔

**ناقد :** یہاں چاہیئے کا لفظ خاص لطف رکھتا ہے اور دوسرے مصرع کی جو شرح فرمائی ہے وہ انھیں کا حق ہے۔
جناب نظم اس شعر کے یہ معنی لکھتے ہیں کہ اس غزل کے اکثر شعر تصوف میں ہیں۔ محبوب کا شرمانا اور سامنے نہ آنا یہ غمزہ معشوقانہ ہے۔ یہ ہم نے مانا کہ یہاں کوئی دوسرا نہیں اور اپنا غمزہ اپنے ہی ساتھ ہے لیکن جب غمزہ و ادا خود ایک طرح کی بے حیائی ہے تو اس کا حجاب کرنا عین بے حجابی ہوا (نظم)
اگر یوں بھی معنی کہے جائیں اور چل بیں بیٹھ جائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اپنے کے معنی یگانہ۔ اپنا چاہنے والا۔ عاشق۔ حجاب بمعنی شرم اور پردہ بے حجاب ناز اور نخرہ۔ اور ادائے معشوقانہ دکھانا خود دلیل ایک قسم کی بے حجابی کی ہے۔ یوں ہیں حجاب میں یعنی شرم کر کے۔
شرم چاہے وہ اپنے چاہنے والوں ہی سے ہو جب وہ ایک ادائے ناز ہے تو ضرور ایک قسم کی بے حجابی ہوتی۔ کیوں کہ اغیار اور بے تعلق لوگوں سے کوئی ناز اور نخرے نہیں کیا کرتا ہے لہٰذا یگانوں سے شرم کرنا اور حجاب میں رہنا جبکہ یہ شرم ایک ادائے ناز ہے تو بے حجابی نہ ہوگی اور کیا ہوگی۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ ۔۔۔ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس شعر میں غلطی سے تیز رو کی جگہ (راہ رو) لکھا گیا ہے اس سے شعر کی شرح ملاحظہ ہو۔ آخری جملہ قابل غور اور بہت پُر لطف ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں تلاش منزل مقصود میں سرگرداں اور دیوانہ ہو رہا ہوں۔ انتہا دیوانگی کی یہ ہے کہ اپنے راہبر کو بھی نہیں پہچانتا کہ کون مجھ کو میری منزل پر پہنچا دے گا اس دیوانگی میں جس راہرو کو تیز جاتا ہوا پاتا ہوں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی وہیں جا رہا ہے (جب راہرو کی تصحیح تیز رو سے کر دی تو اب لفظ راہرو کہاں سے لائے۔ اور تیز رو بنانے سے کیا خوبی بڑھالی) اور اسے بھی میری طرح جلد پہنچنے کی اضطرابی ہے۔ پس اسی خیال کی بنا پر اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں یہ معلوم کر کے کہ وہ کسی دوسری جگہ جا رہا ہے اور اس کی منزل اور ہے تو پلٹ آتا ہوں۔ کوئی اور تیز رو ملتا ہے پھر اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں یہ شعر گویا ایک تصویر دیوانگی ہے اور محاکات شاعری اسی کا نام۔

**ناقد:** بہت خوب۔

اس کے بعد فاضل شارح نے شاعری اور مصوری پر بحث فرمائی ہے اور دونوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اس کے ضمن میں فرماتے ہیں ان (مصوروں) کا یہ کمال مرئی اور مادی چیزوں تک منحصر اور محدود ہے۔ غیر مرئی چیزوں کی تصویر اگر مصور کھینچے گا اور وہ بھی ایسی کہ جس کے دیکھنے سے اس کی حالت پر پورا پورا عبور غیر ممکن ہے۔ اس سے میری مراد جذبات ہیں۔ یعنی فرض کر لیجئے کہ غصہ تمکنت غرور سادگی متانت اجڑتے کھنڈروں کے نقشے۔ ہرے بھرے باغوں کی سرسبزی اور رونق۔ بہتے ہوئے چشمے کی روانی وغیرہ کو ایک چابک دست مصور کھینچ سکے مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ غصہ۔ تمکنت، غرور سادگی کے وجوہات، بھیانک جگہ کے اسباب اور ان کے اجڑ جانے کے اوقات۔ دریا کی روانی کے ساتھ اس کے عمق وغیرہ کو کیوں کر دکھا سکتا ہے۔ (اس آخری جملہ میں جذبات کی کیا اچھی تشریح فرمائی ہے)۔

اس بحث میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ فردوسی افراسیاب کے غصہ اور غیرت۔ اس کے غرور تمکنت تکبر و دلیری۔ اپنے مقابلہ پر دنیا کو ذلیل سمجھنے اور زمانہ کے حیرت انگیز انقلاب کی یوں تصویر کھینچتا ہے۔

زشیر شتر خوردن و سوسمار | عرب را بجائے رسید ست کار
کہ تحت عجم را کنند آرزو | تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

اس شرح سے بالکل نئی بات معلوم ہوئی کہ یہ اشعار افراسیاب کے جذبات کا خاکہ کھینچتے ہیں۔

غالب خدا کرے کہ سوار سمند ناز | دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

اس شعر کی شرح میں تو فاضل شارح نے کمال ہی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں سوار سمند ناز سے مراد ناز نین

علی بہادر یا تو کسی کا نام ہے جو مصنف کے دوستوں میں ہیں۔ یا بہادر علی گہر (علی) کی صفت ہے جس سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔

غرض یہ شرح لطف سخن کے تمام اوصاف کے ساتھ سامان تفریح بھی۔

میرے نزدیک اشعار دوسرے شعراء فارسی گو اور اُردو گو کے جو مترادف المعنی والمضامین اشعار غالب کے ہیں اور مقابلہ میں جمع کئے ہیں۔ وہاں ایسے اشعار بھی لکھے ہیں جن کو اشعار غالب سے از روئے مضمون کوئی تعلق نہیں۔ صرف ایک یا دو لفظ شعر غالبؔ سے ملنے کی وجہ سے نقل کر دیئے ہیں۔

ان کے علاوہ بھی شرحیں ہوں گی مگر مجکو ان کا علم سمعی بھی نہیں ہے۔ باوجودیکہ اتنی ایک شرحیں ہیں مگر کلام غالب اب بھی محتاج شرح ہے کوئی شاعر باطبع سلیم دعالم ان شرحوں کو سامنے رکھ کر اور خذ ما صفیٰ ودع ما کدر پر عمل کر کے شرح لکھے تو اُمید ایک اچھی شرح ہو سکتی ہے۔

میں نے متعدد اشعار غالبؔ کی شرح جناب نظمؔ کی شرح سے الگ لکھی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ اچھی لکھی یا بری لکھی اور کثیر اشعار میں مسامحات جناب نظمؔ سے علیحدہ دکھائے ہیں۔ پھر بھی میں اپنی شرح کو انھیں کی شرح سمجھتا ہوں کیوں کہ انھیں کی شرح مجھے علیحدہ معنی کہنے پر راہبر ہوئی ہے ورنہ میں ایک شعر بھی ان کا سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتا ہوں۔ ۲۸ر جولائی ۱۹۴۷ء مطابق ۸ ر رمضان ۱۳۶۶ھ۔

---

# سوانح عمری حضرت غالب علیہ الرحمۃ

شمس العلماء جناب الطاف حسین حالی مرحوم نے اپنی کتاب یادگارِ غالب میں جو مرقع سوانح نگاری تھا با حسن وجوہ ادا کر دیا۔ اُن کے سوا اس مبحث میں کوئی قلم بھی اُٹھا نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ جو وسائل اُن کو حاصل تھے وہ کسی کو کب میسر تھے۔ لہٰذا اب جو کوئی اس بارے میں کچھ لکھے گا اسے لامحالہ اُن کی خوشہ چینی کرنا پڑیگی۔ جناب مہر البتہ اس کے مدعی ہیں کہ انھوں نے حضرت غالب کی لائف انھیں کی تصانیف سے لکھی ہے۔ مگر یادگارِ غالب سے بھی ضرور مدد لی ہوگی۔ بعض باتیں ایسی ہیں جو یادگارِ غالب کے سوا تصانیف غالب میں اُن کا ملنا قرین قیاس نہیں۔

اس لیئے جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ سب کا سب یادگارِ غالب کا انتخاب ہے۔ علاوہ عنوان مذہب غالب کے کہ اس میں میں نے اُن کے خالص شیعہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔

یادگارِ غالب کے ہوتے ہوئے نہ مجھے اور نہ کسی دوسرے کو اس مبحث پر کچھ لکھنے کی ضرورت تھی مگر اس لیئے لکھتا ہوں کہ ناظرین کو یادگارِ غالب کے اُٹھانے کی ضرورت نہ پڑے اور کچھ نہ کچھ مواد اسی شرح میں مل جائے۔

## نام و نسب و ولادت غالب

مرزا اسد اللہ خان غالب المعروف بمرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ۔ فارسی کلام میں غالب اور اُردو میں غالب و اسد دونوں تخلص سے کام لیتے ہیں۔

ان کے آباو اجداد ایبک (ماہ کامل) قوم کے ترک تھے۔ اُن کا سلسلہ نسب تور ابن فریدون تک پہنچتا ہے۔ (جس سے مُلک توران منسوب ہے۔ اور مشہور شہنشاہ افراسیاب اسی ملک کا شاہ تھا)۔
کیانیوں سے مغلوب ہو کر جس کا سہرا رستم اور اُس کی نسل کے سر تھا۔ تورانیوں کا جاہ و جلال جاتا رہا۔ مگر عہدِ اسلام میں سلجوقی خاندان کی سلطنت پھر ایران توران شام اور روم (ایشیائے کوچک) تک قائم ہوگئی۔ ان کے زوالِ سلطنت کے بعد اولادِ سلجوق جابجا منتشر ہوگئی۔ انھیں میں سے ترسم خان ایک امیر زادہ نے سمرقند میں سکونت اختیار کی۔

مرزا کے دادا شاہ عالم کے زمانہ میں سمرقند سے ہندوستان آئے وہ ترسم خاں کی اولاد میں سے تھے۔
ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں نے غالبؔ کے دادا کو شاہ عالم کے زمانہ میں ایک عمدہ منصب دلوایا۔ اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالہ کی تنخواہ میں مقرر کر دیا۔
اُن کے کئی بیٹوں میں سے دو عبداللہ بیگ خان عرف مرزا دولھا اور نصراللہ بیگ خان دو کے نام معلوم ہیں۔ عبداللہ خان کی شادی خواجہ غلام حسین خان کی بیٹی سے ہوئی۔
اُن کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک مرزا اسداللہ خان غالبؔ اور دوسرے مرزا یوسف خان جو ایامِ شباب میں مجنون ہوکر ۱۸۵۷ء میں مر گئے۔ جن کا مرثیہ غالبؔ نے کہا ہے۔
چوں کہ غالبؔ کے والد آگرہ میں اپنے سُسر کے ہاں بطور خانہ دامادی کے رہتے تھے اس لیئے ولادت حضرت غالبؔ شب ہشتم ماہ رجب سن بارہ سو بارہ ہجری میں آگرہ ہی میں ہوئی اور سن شعور تک بلکہ شادی ہو جانے کے بعد تک آگرہ ہی میں اُن کا قیام رہا۔ جو زمانہ زبانِ مادری سیکھنے کا ہے۔ اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلّی آنے جانے لگے تھے۔ (سات برس کا بچہ اکیلا سفر نہیں کیا کرتا ہے۔ مگر یہ نہ بتایا گیا کہ وہ دلّی کس کے ساتھ اور کیوں آتے جاتے تھے۔ ایسی صغر سنی میں)۔

## تعلیم

شیخ معظم اُس زمانہ میں آگرہ کے مشہور معلموں میں سے تھے اُن سے تعلیم پاتے رہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نظیر اکبرآبادی سے بھی تعلیم پائی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ عبدالصمد ایرانی سے دو سال تعلیم حاصل کی۔ مگر خود جناب غالبؔ فرماتے ہیں کہ سوا مبدا فیاض کے مجھے کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

باخذ فیض ز مبدا فزودم از اسلاف ۔۔۔ کہ بودہ ام قدرے دیر تر دران درگاہ
ظہور من بجہان در ہزار و بست و دو بست ۔۔۔ ظہور سعدی و خسرو بہ شش صد و پنجاہ

"ظہور سعدی و خسرو" میں ظہور سے مراد ان دونوں کی تاریخ پیدائش نہیں بلکہ بمعنی وجود ہے یا بمعنی شہرت۔ غالب نے جو اپنا ظہور ۱۲۲۰ھ میں بتایا ہے تو اس کے معنی شہرت کے نہیں ہو سکتے۔ آٹھ برس کا بچہ علی العموم کوئی شہرت حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر سن ولادت مراد لیں تو ان کی ولادت جو ۱۲۱۲ھ میں بتائی گئی ہے وہ غلط ہو جاتی ہے۔

عبد الصمد یا کسی کی شاگردی سے انکار غالب اور صرف مبداء فیاض سے فیض پانے کی تاویل صرف دو سال کی مدت میں جناب حالی یوں فرماتے ہیں کہ اس قلیل مدت کا عدم و وجود سب یکساں ہے۔

## تاہل اور شادی و اولاد

چوں کہ مرزا کے چچا نصراللہ بیگ کا رشتہ فخرالدولہ نواب لوہارو کے خاندان میں ان کی ہمشیر سے ہو چکا تھا۔ مرزا کی شادی بھی نواب فخرالدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش معروف کی بیٹی سے ہوئی۔ ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ کو ان کا عقد ہوا۔ چھ سات اولادیں ہوئیں مگر ایک بھی زندہ نہ رہی۔ ان کی بی بی کے بھانجے زین العابدین خان عارف کا جب انتقال ہو گیا تو ان کے دو بیٹوں باقر علی خان اور حسین علی خان میں سے چھوٹے بیٹے حسین علی خان کو اپنے سائے عاطفت میں لے لیا اور جب ان کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا تو باقر علی خان کو بھی اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ دونوں خوش فکر اور پرگو شاعر تھے۔ قرابت اور خوش گوئی کی وجہ سے دونوں کو اولاد سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ مرزا کی وفات کے بعد تھوڑے تھوڑے فاصلے سے دونوں جوان العمر مر گئے۔ عارف کی وفات پر ایک غزل بطور نوحہ بہت دردناک کہی ہے جو دیوان میں موجود ہے۔

## مداخل

جب سرکار انگریزی کا تسلط پورے طور سے ہندوستان پر ہو گیا۔ نواب فخرالدولہ احمد بخش خان لارڈ لیک کے لشکر میں شامل ہوئے انہوں نے غالب کے چچا مرزا نصراللہ بیگ کو سرکاری فوج میں بعہدہ رسالداری ملازم کرا دیا۔ ان کی ذات اور رسالہ کی تنخواہ میں دو پرگنے سونک اور سونسا نواح آگرہ میں مقرر تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے وارثوں کی پنشنیں فیروزپور جھرکہ کی ریاست سے ہو گئی سات سو روپے سالانہ مرزا کو سن ستاون تک ملتا رہا۔ فتح دہلی کے بعد تین برس تک قلعہ کے تعلقات کی وجہ سے پنشن بند رہی۔ جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہو گئی تو پھر پنشن جاری ہو گئی۔

نواب یوسف علی خان صاحب والی ریاست رام پور نے جب ان کی شاگردی اختیار کی تو ان کا سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو نواب کلب علی خان صاحب کے زمانہ تک ملتا رہا اور پچاس روپیہ ماہوار تاریخ تیموریہ کے لکھنے کے صلہ میں بہادر شاہ آخری بادشاہ دہلی ان کو دیتے تھے۔

فیروزپور کی پنشن بند ہو جانے پر سوپریم گورنمنٹ کے سامنے استغاثہ داخل کرنے کے لیے کلکتہ روانہ ہوئے۔ اس سفر کے سوا انہوں نے کوئی اور سفر قابلِ ذکر نہیں کیا۔ راستہ میں تین ماہ لکھنؤ میں ٹھہرے۔ لکھنؤ والے بہت خاطر مدارات سے پیش آئے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ کا زمانہ تھا اور روشن الدولہ وزیر تھے۔ وزیر سے ملاقات کرنے میں جو شرایط انھوں نے پیش کیے وہ وزیر نے منظور نہ کیے لہٰذا ملاقات نہ ہوئی۔ بنارس میں ٹھہرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ والے آؤ بھگت سے پیش آئے۔ مگر غالبؔ کے کلام پر اعتراضات بھی کیے۔ خوب مجادلہ رہا۔ مگر پنشن کے بارہ میں ناکام رہے۔

واپس آکر دہلی سے مدح نصیر الدین شاہ میں قصیدہ بھیجا پانچ ہزار صلہ کا حکم ہوا۔ اس کی اطلاع ناسخ نے دی کہ تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے دو ہزار واسطہ کو دے کہ جتنے جی چاہے بھیجدو۔ یہ سن کر غالبؔ نے پھر تحریک کی مگر بادشاہ کے انتقال کی خبر آگئی اور وہ دو ہزار بھی گاؤ گھپ ہو گئے۔ پھر مرزا نے سلطنت واجد علی شاہ کے زمانہ میں تحریک کی اور پانسو روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے مقرر ہو گیا۔

## اخلاق وعادات

مرزا مرنج و مرنجان شخص تھے۔ بڑے ظریف و خوش طبع بھی تھے۔ اُن کی صحبت سے ہر شخص محظوظ ہوتا تھا۔ ان کی باتوں سے روتا ہوا ہنس پڑتا تھا۔ لطائف کثیر ان کے یادگار میں درج ہیں۔ کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔ کبھی کسی کی ہجو نہیں کی۔ جناب حالیؔ کو لالہ بہاری لال مشتاقؔ دہلوی سے ایک قطعہ ملا تھا جو یادگار میں درج ہے جسے مشکل سے ہجو ملیح کہہ سکتے ہیں۔ اس میں بھی مذمت نہیں ہے۔ بلکہ صلہ نہ ملنے پر کہتے ہیں کہ مایوس نہ ہونا چاہیے۔ ممدوح نے دیبا دمشق سے مخمل روم سے۔ الماس معدن سے۔ سونا کان سے موتی عمان سے۔ لعل بدخشان سے۔ شمشیر اصفہان سے اور شال کشمیر سے اور گھوڑا عراق سے اور اونٹ بغداد سے مہیا کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

ہمیشہ پینس پر نکلتے تھے۔ اچھی غذا کھاتے تھے۔ آم بہت پسند کرتے تھے۔ لباس بھی اچھا پہنتے تھے۔ مگر مصارف زیادہ اور آمدنی ضرورت سے کم ہونے کی وجہ سے جن سے اُمید ملنے کی ہوتی تھی حسن طلب سے مانگنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔

۱۸۴۱ء میں جب سینٹ اسٹفنس کالج دہلی میں کھولا گیا تو لوگوں نے فارسی پروفیسری کے لیئے۔ مرزا۔ مومنؔ اور صہبائیؔ کے نام پیش کیئے سب سے پہلے ان کو بلایا گیا۔ چوں کہ مسٹر طامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند تنظیم کے لیئے برساتی تک لینے نہ آئے اس لیئے ملازمت سے انکار کر دیا اور صہبائیؔ معین ہوئے۔

مرزا شطرنج اور چوسر کچھ بد کے کھیلا کرتے تھے۔ اور شراب کے بہت عادی تھے اس شطرنج اور چوسر کی بدولت

کوتوال نے جو اُن سے دشمنی رکھتا تھا ایک مرتبہ جیل کرادی تھی نصف مدت کاٹنے کے بعد چھوٹے۔ چھ ماہ کی سزا ہوئی تھی۔ جیل میں دیوانی کے قیدیوں کی طرح رہتے تھے۔

ہمیشہ کرایہ کے یا مُفت کے مکان میں رہے۔ آزاد طبعی یا ناداری کی وجہ سے کبھی مکان خرید انہ بنوایا۔

جب کثرت امراض سے نشست و برخاست کی قوت نہ رہی تب بھی خطوط کے جوابات دیا کرتے تھے اور شاگردوں کے کلام کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ مگر لیٹے لیٹے

## بہادر شاہ کا شیعہ مشہور ہونا۔

ایک مرتبہ بہادر شاہ سخت بیمار ہو گئے۔ مرزا حیدر شکوہ ابن مرزا سلیمان شکوہ و برادر زادہ اکبر شاہ۔ ظفر شاہ کے مہمان تھے ان کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور ظفر شاہ اچھے ہو گئے جید رشکوہ نے ان کی صحت کے لیے درگاہ حضرت عباس لکھنؤ میں علم چڑھانے کی نذر مانی تھی۔ لکھنؤ پہنچ کر بادشاہ کو لکھا کہ میں نذر اُتارنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہوں۔ بہادر شاہ نے کچھ روپیہ بھیجا اور علم مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب المعروف بہ بڑے قبلہ وکعبہ کے ہاتھ سے علم چڑھایا گیا جس میں شاہی خاندان کے لوگ۔ امرا اور علماء سب شریک تھے۔ اس واقعہ کے بعد مشہور ہو گیا کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے۔ اس کے اطلاق اور تردید کے لیے حکیم احسن اللہ خان نے بادشاہ کے حکم سے جو مضامین حضرت غالب کو دیئے وہ غالب نے فارسی میں نظم کر دیئے۔ اس مثنوی کا نام شاید دَفعَ الباطل ہے۔ اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے ایک بات بھی نہیں لکھی تھی۔

مجتہد العصر موصوف نے مرزا کو خط لکھا کہ تم نے مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت ایسا ایسا لکھا ہے۔ مرزا نے جواب دیا کہ میں ملازم شاہی ہوں۔ شاہ کے اشارے سے جو حکیم احسن اللہ خان مضامین دیتے ہیں۔ میں اُن کو صرف نظم کر دیتا ہوں۔

## مسئلہ امتناع نظیر بشیر نذیرؐ

مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی مرزا کے بڑے گہرے دوست تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ خاتم النّبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے۔ اور جس طرح کہ خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا۔ ہے اسی طرح احمد مجتبیٰ کا بھی مثل پیدا نہیں کر سکتا۔

ان کے برخلاف مولینا اسمٰعیل شہید کی یہ رائے تھی کہ خاتم النّبیینؐ کا مثل بالذات ممکن اور ممتنع بالغیر ہے۔ ممتنع بالذات نہیں ہے۔ یعنی ان کا مثل پیدا نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے۔ نہ اس لیئے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں۔

مرزا سے فرمائش ہوئی کہ اس مسئلہ پر جو رائے مولینا فضل حق کی ہے۔ وہ فارسی نظم میں بیان کی جائے۔ مرزا نے پہلے عذر کیا کہ مسائل علمیہ کا نظم میں بیان کرنا مشکل ہے۔ مگر یہ عذر مقبول نہ ہوا اور مثنوی لکھ کر مولانا کو سنائی مولانا نے اس کی

بہت تعریف کی۔ مگر مسئلہ ختم نبوت پر جو رائے مولینا سے کسی قدر مختلف تھا بہت ناراض ہوئے۔ اور فرمایا کہ تم نے یہ کیا بکا ہے۔ اسے بالکل نکال ڈالو کہ" متعدد عالموں میں متعدد خاتم النبیین ہو سکتے ہیں" جو کچھ لکھا تھا اسے تو ویسا ہی رہنے دیا مگر اُن کی خاطر سے یہ اشعار اور بڑھا دیئے۔

| | |
|---|---|
| غالب این اندیشہ نپذیرم ہمے | خوردہ ہم بر خویش میگیرم ہمے |
| اے کہ ختم المرسلینش خواندہ | دانم از روئے یقینش خواندہ |
| این الف لامے کہ استغراق راست | حکم ناطق معنیٔ اطلاق راست |
| منشاءِ ایجاد ہر عالم یکے ست | گر دو صد عالم بود خاتم یکے ست |

اسی مضمون کو پھیلانے کے بعد اس مثنوی کو ان دو اشعار پر ختم کر دیا ہے۔

| | |
|---|---|
| منفرد اندر کمالِ ذاتی ست | لاجرم مثالش محال ذاتی ست |
| زین عقیدت بر نگردم والسلام | نامہ را در می نوردم والسلام |

## مطالعہ کتب

ایک آدمی کرایہ پر کتابیں لادیا کرتا تھا اسے دیکھ کر واپس کر دیتے تھے۔ کبھی کوئی کتاب خریدی نہیں۔

## قاطع برہان

جب مرزا دستنبو لکھ چکے تو انہوں نے برہان قاطع کا مطالعہ شروع کیا اور جو اعتراضات ذہن میں آئے اُن کو جمع کرتے رہے تو وہ ایک کتاب بن گئی۔ جس کا نام قاطع برہان رکھا۔ اور وہ ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔ پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ میں اضافہ مضامین و فوائد کے ساتھ دوبارہ چھپوایا اور اُس کا نام درفش کاویانی رکھا۔

مرزا رضا قلی ہدایت شیرازی اپنی فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں کہیں کہیں کسی نعت کے تحت میں لکھ دیتے ہیں۔ حق بجانب معترض است۔ اگرچہ غالب یا قاطع برہان کا نام نہیں لیتے ہیں۔

قاطع برہان کی تردید و تغلیط متعدد آدمیوں نے لکھی۔ اور ایک اعتراض بھی مجیبوں نے تسلیم نہیں کیا اور غالب کے اس فعل سے لوگ اتنا ناخوش ہوئے کہ خطوط میں غالب کو گالیاں لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔

**استعداد عربی، فارسی دانی،** نجوم و عروض و تصوف و تاریخ دانی عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ نہیں پڑھا تھا۔ مگر تحریر و تقریر و نظم سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عربی نہیں جانتے تھے۔

فارسی زبان اور اُس کے الفاظ اور محاورات کی تحقیق اور اہل زبان کے اسالیب بیان پر مرزا کو

اس قدر عبور تھا کہ خود اہل زبان میں بھی مستثنیٰ آدمیوں کو ایران کے مستند شعرا کی زبان پر اسی قدر عبور ہوگا۔
فن عروض میں بھی کافی دست گاہ معلوم ہوتی ہے۔ اکثر بڑے بڑے نامور شعرا کو دیکھا اور سُنا گیا کہ باوجود کمال شاعری اس فن سے محض ناآشنا ہوتے ہیں اور سیدھی سادی بحروں کے سوا ٹیڑھی بحروں میں نہیں کہہ سکتے ہیں۔ مگر مرزا نے فارسی اور اُردو دونوں میں بعض ٹیڑھی بحروں میں بھی اشعار کہے ہیں۔ لیکن ایک رباعی کے اس مصرع میں ؎

دم رُک رُک کر بند ہوگیا ہے غالب

چوک گئے۔ اور اس مطلع ؎

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے　　کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں ایطا کہہ گئے۔
علم شعر کی بابت کہا گیا ہے القریض اسفل العلوم یعنی کل علوم ادبی وغیرہ میں کچھ نہ کچھ بصیرت پیدا کرنے کے بعد شاعری کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ بعض اصطلاحات علم ہیئت (ASTRONOMY) جیسے محلق احتراق طالع وغیرہ جن کو اکثر شعرا اشعار میں صرف کیا کرتے ہیں انھوں نے بھی صرف کیے ہیں۔ لیکن علم نجوم (ASTROLOGY) یعنی جوتش جس سے نجومی احکام نکالا کرتے ہیں۔ اس کا جاننا اُن کی تحریرات سے پایا نہیں جاتا۔
تصوف جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ برائے شعر گفتن خوبست۔ ان کو خاص مناسبت تھی۔ کیوں کہ کتب تصوف اُن کے مطالعہ میں بہت رہی ہیں۔ مجھے سوا مسئلہ وحدت وجود کے کوئی دوسرا مسئلہ تصوف کا نہیں معلوم ہوتا۔ اور ایسے سب شعرا کہا کرتے ہیں۔ اور مسئلہ جبر بھی۔ پھر شعرا عشق حقیقی کو عشق مجازی کی صورت میں بمصداق شعر مولانا روم ؎

بہتر آں باشد کہ سرِّ دلبران　　گفتہ آید در حدیث دیگراں

بیان کیا کرتے ہیں۔ آدمی میں قوت انصراف ہونا چاہیے تو پھر وہ ہر شعر کو جس رنگ میں رنگنا چاہے رنگ سکتا ہے۔ چنانچہ کلام رندانہ حافظ شیرازی کو تصوف کے سانچہ میں ڈھال دیا۔ جیسے ؎

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید　　کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

یا ؎

مے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ　　ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

پھر کسی بنائی ہوئی اصطلاح کے پابند نہیں رہتے ہیں۔ جہاں پر جو بھی چاہے مراد لے لیتے ہیں۔ چنانچہ اسی دوسرے شعر میں۔ مے دو سالہ سے مراد قرآن شریف کیوں کہ اس کا نزول دو سال میں ہوا۔ اور چاردہ کے معنی چالیس سال۔ اس لیے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چالیس سال کی عمر میں مبعوث برسالت ہوئے مراد لینا تکلف اور

بدمزگی سے خالی نہیں۔

غزل کا شعر ہے معتقدات کے ظاہر کرنے سے شعر میں کیا لذت وحظ رہ گیا۔ برخلاف اس کے کہ جوانی میں بھرپور چودہ برس کی عمر والا محبوب اور شراب کہنہ دوسالہ معنی کیے جائیں تو کچھ لطف اور مزہ رندانہ مذاق والوں کو آبھی سکتا ہے۔

جس طرح حضرت غالبؔ کو اُن کی جودت طبع ۔ جدت پسندی اور مضامین آفرینی ایک نئے راستہ پر لے چلتی ہے اسی طرح میری کج طبعی و نافہمی لوگوں کے مسلمات کے خلاف ٹیڑھے راستہ پر لے جاکے مجھے گمراہ کردیتی ہے۔

جب وہ خاندان تیموریہ کی تاریخ یعنی مہر نیمروز لکھ رہے تھے تو لوگ ان کو مورخ سمجھ کے کچھ تاریخ کی نسبت سوال کرتے تھے ان کے جواب میں لکھتے ہیں۔ میں فن تاریخ ، مساحت اور سیاق سے اتنا بیگانہ ہوں کہ ان فنون کو کچھ بھی نہیں سکتا ہوں۔ کارپردازان دفتر شاہی خلاصہ حالات اُردو میں لکھ کر مجھے دے دیتے ہیں اُن کی فارسی بناکر ان کے حوالے کرتا ہوں۔ میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر اپنی استعداد کے موافق لکھ سکتا ہوں مورخ نہیں ہوں ؎

ماقصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم  از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

اعداد جمل سے کسی واقعہ کی تاریخ کہنے کی جب کوئی فرمائش کرتا تھا تو سخت پریشان ہوجاتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے اُردو دیوان میں مرزا جعفر کی شادی کی تاریخ عیسوی ۱۸۵۴ لفظ، محظوظ سے اور ہجری انشراح جشن جمشید سے ۱۲۷۰ نکالی ہے۔ تاریخ کی سب سے گھٹیا قسم یہی ہے کہ ایک دو لفظ میں ہو اور پورے مصرع میں نہ ہو۔ ان دو تاریخوں کے سوا تیسری کوئی تاریخ نہیں ہے۔

**اقرار عجز:** ایک مرتبہ مجتہد العصر جناب مولوی سید محمد صاحب لکھنوی نے ان سے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی بڑی مشکل سے تین بند لکھ کر بھیجے اور صاف صاف لکھ دیا کہ میں اس میدان کا مرد نہیں۔ مرثیہ میں کوئی بات پیدا کرنے کے لیے مجھے ایک دوسری عمر کی ضرورت ہے۔ مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔ اُن کا قول تھا کہ ہندوستان میں انیسؔ اور دبیرؔ جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

میرے نزدیک جناب انیسؔ اعلی اللہ مقامہ کی تعریف اُن کے مرتبہ سے کم ہے۔ وہ کون سی بات یا خوبی شاعری کی ہے جو ان کے مرثیے میں نہیں۔ چہرہ مرثیہ کا قصیدہ ہوتا ہے۔ رندانہ مضامین ساقی نامہ میں ہوتے ہیں۔ جذبات مادر و فرزند و برادر و ہمشیر و زن و شوہر۔ گھوڑے اور تلوار کی تعریف۔ سخاوت و شجاعت و صبر و استقلال۔ فراق کا الم وغیرہ سب ہی قسم کے مضامین اس میں پائے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کے سب سے بہتر شاعر ہیں۔

یہ بات میری سمعی ہے۔ اس کا کوئی ثبوت تاریخی میرے پاس نہیں کہ حضرت غالبؔ جناب انیسؔ کی نسبت

فرمایا کرتے تھے کہ ۔ او شاہے ست منتظم اور جناب مرزا دبیر کی نسبت اُن کا ارشاد تھا کہ اوشاہنشا ہے ست غیر منتظم ۔ یہ فیصلہ یا انتقاد جناب غالب کا ہو یا کسی دوسرے کا ہو۔ مجھے بہت پسند آیا۔ اور میرے نزدیک اس سے بہتر موازنہ نہیں ہو سکتا ہے۔

## مذہب

اس عنوان کو میں نے آخر میں اس لیے رکھا کہ مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ استدلال سے کام لینا تھا۔

جناب حالی مرحوم یادگار غالب میں تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر اُن کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا۔ اور جناب امیرؑ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بعد تمام امت سے افضل سمجھتے تھے۔

اُن کو اسلام کی حقیقت پر اعتقاد جازم تھا۔ اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے تمام عبادات و فرائض میں سے انھوں نے صرف دو چیزیں چُن لی تھیں ایک توحید وجودی اور دوسرے محبت اہلِ بیت نبویؐ اور انھیں کو وسیلۂ نجات جانتے تھے۔ حکیم امجد حسین گیاوی کا خیال ہے کہ جس طرح غیر مسلم کو روزہ و نماز مفید نہیں اسی طرح اعتقاد صحیح رکھنے والے کو عبادات کی ضرورت نہیں۔

ایک مرتبہ بہادر شاہ نے دربار میں کہا۔ ہم نے سُنا ہے کہ مرزا شیعی المذہب ہیں۔ اس کی اطلاع غالب کو ہوئی تو دو تین رباعیاں کہہ کر بادشاہ کو بھیجیں ایک ان میں سے یہ ہے۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری ۔۔۔ کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہوئے صوفی ۔۔۔ شیعی کیسے ہو ماورار النہری

ماوراالنہری یعنی ترکستانی متعصب سنی ہونے میں ضرب المثل ہیں یہاں تک کہ شیعہ ان کو ناصبی اور خارجی کہتے ہیں ۔ چوتھے مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ ماوراءالنہری شیعی یا رافضی کیسے ہو سکتا ہے۔

جناب غالب رافضی اور شیعہ کے فرق کو جانتے ہیں. مگر سُنی پڑھے لکھے بھی ان کے فرق کو کمتر جانتے ہیں اور عوام تو شیعہ کو رافضی ہی کہتے ہیں۔ جس کے جواب میں شیعہ کُل سنیوں کو خارجی کہتے ہیں۔ ورنہ ان کا کہنا صحیح ہے اور نہ اُن کا کہنا ۔

زید شہید کے کچھ لوگ طرف دار ہوئے اور سلطنت کے مقابلہ میں امداد کا وعدہ کیا مگر حکومت کے خوف سے وعدہ سے پھر گئے تو زید نے فرمایا رفضتم ۔ ان کی شہادت کے بعد اُن کی امامت کے قائل ہوئے اور سلسلہ بسلسلہ وہ امامت اس وقت امام یحییٰ پر منتہی ہوتی ہے جو ملک الیمن ہیں۔ اسی طرح کوفیوں نے حضرت امام

حسین علیہ السلام سے یزید کے مقابلہ میں اقرار امداد کیا تھا اور خطوط لکھ کر ان کو بلایا مگر پھر امداد نہ کی۔

مرزا کے آباؤاجداد کا وطن ماوراءالنہر تھا۔ جو مرزا کے مزاج اور طرز کلام سے نا آشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لیئے اپنا مذہب غلط بیان کیا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رباعیاں بادشاہ کے خوش کرنے اور اہل دربار کے ہنسانے کے لیئے کہی گئی تھیں۔ کیوں کہ دربار میں ایک متنفس ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعہ یا کم از کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔ مرزا اکثر مواقع پہ بادشاہ کے خوش کرنے کے لیئے اس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے۔

ایک روز سلطان نظام الدین (اولیا) قدس سرہ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا۔ مرزا نے اسی وقت یہ شعر نظم کرکے پڑھا ؎

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالبؔ

اگر یفعولون مالا یفعلون سے صرف نظر کرلیا جائے تو یہ رباعی ضرور غالبؔ کے سنی ہونے پر دال ہے مگر جناب حالیؔ خود ہی اس کی تاویل کرکے اسے کم زور کررہے ہیں۔

"مرزا کے جنازہ پر جبکہ دہلی دروازہ کے باہر نماز پڑھی گئی تو راقم (حالیؔ) اور عمائدین اور ممتاز لوگ شہر کے اہل سنت وامامیہ مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرہ بخشی محمود خان نے نواب ضیاءالدین احمد خان سے کہا کہ مرزا شیعہ تھے ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقہ کے موافق ان کی تجہیز و تکفین کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ ان کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہوسکتا تھا۔" (مردہ بدست زندہ)

اس بیان سے جناب حالیؔ ان کو تفضیلی بھی نہیں رکھنا چاہتے چہ جائیکہ شیعہ۔ بلکہ خالص سنی ان کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

شرطست کہ بہر ضبط آداب و رسوم خیزد بعد از نبی امام معصوم
زاجماع چہ گوئی بہ علی باز گرائے ہر جائے نشیں مہر باشد نہ نجوم

غالبؔ کی اس فارسی رباعی کی نسبت جناب حالیؔ تحریر فرماتے ہیں کہ یہ رباعی غالبؔ کے تفضیلی ہونے پر دال ہے نہ تشیع پر کیوں کہ شیعہ ماہ و مہر کے مقابلہ میں خلفاء ثلاثہ کو نجوم کا بھی مرتبہ نہیں دیتے ہیں۔

میں جناب حالیؔ کی نسبت ہرگز یہ گمان بھی نہیں کرسکتا ہوں کہ وہ اس رباعی کو نہیں سمجھتے ہیں۔

اہل تسنن ائمہ دوازدہ کو معصوم کب مانتے ہیں اور غالبؔ کہتے ہیں کہ بعد از نبی کسی معصوم کو ہونا چاہیے۔ سنی تو خلفاء ثلثہ کو بھی معصوم نہیں جانتے ہیں۔ پھر تیسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں کہ اجماع کا کیا ذکر کرتے ہو۔ یہ بھی سنیوں کا

عقیدہ ہے کہ خلافت کو اجماعی مانتے ہیں اور غالبؔ اس پر طعن کرتے ہیں کہ اجماع کو کیا کہتے پھرتے ہو علی کی طرف رجوع کرو۔

چوتھا مصرع اہل تسنن کی حدیث صحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم کی طرف تلمیح ہے (ترجمہ حدیث) میرے صحابہ مثل نجوم ہیں ان میں سے جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت یافتہ ہوگے۔ مہرو ماہ کے مقابلہ میں خلفا کو نجوم نہیں کہہ رہے ہیں۔ بلکہ لفظ نجوم سے اُس حدیث کی طرف اشارہ ہے جو سنیوں میں ہے

**امام معصوم**۔ اجماع پر طعن اور لفظ نجوم اس رباعی میں خاص توجہ کے لائق تھا۔ سُنی تو خلفاء ثلثہ کو بھی معصوم نہیں مانتے ہیں۔ بلکہ بعض نبی اسلام کے سوا دوسرے انبیا کو بھی معصوم نہیں کہتے ہیں۔ چنانچہ تخطیۃ الانبیا کتاب ہی لکھ ماری۔

حسن ظن سے کہہ سکتے ہیں کہ جناب حالؔی کے دماغ میں چوں کہ تفضیل حضرت علی بر خلفاء ثلاثہ بہ نسبت غالبؔ چکر لگا رہی تھی اور غالبؔ کو شیعہ ظاہر کرنا مقصود نہ تھا اس لیے اس رباعی سے اُن کے سُنی تفضیلی ہونے کو لکھ دیا۔ مگر میں اُن کو اس حدیث مذکور سے ناواقف نہیں مانتا ہوں اس لیے ابلہ فریبی سے تعبیر کرتا ہوں۔

جناب حسرتؔ اپنی شرح کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ غالبؔ حق پسند، غیر متعصب شخص تھے۔ چنانچہ اُن کے اصلی مذہب کی بابت کسی کو سوا اس کے کچھ نہ معلوم ہوا کہ اُن کو اہلِ بیت رسالت سے بے انتہا عشق تھا اور بس۔ غالباً مرزا شیعہ تفضیلیہ تھے۔ لیکن مولانا فخرالدین قدس سرہ کے خاندان کے مرید بھی تھے۔ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اُن کی تجہیز و تکفین کُل مراسم اہل سنت کے موافق ادا کیے۔ (اور شیعوں کو ان کی تمنا پر بھی نماز جنازہ پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ جناب حالؔی کا ارشاد ہے کہ اجازت دے دیتے تو اچھا تھا۔ غرض کہ جناب حسرتؔ اُن کو سُنی ہی کہنا چاہتے ہیں۔

جناب حسرتؔ کی اصطلاح شیعہ تفضیلیہ کو میں مطلق نہ سمجھ سکا۔ شیعہ تو خلفاء ثلاثہ کو ناحق اور غاصب تجویز کرتے ہیں۔ پھر شیعہ کے ساتھ لفظ تفضیل لگا کے انھوں نے کیا معنی رکھے ہیں۔

جناب حالؔی کے تتبع میں کل شارحین زیادہ سے زیادہ تفضیلی تجویز فرماتے ہیں۔ شیعہ کہنے پر کوئی تیار نہیں۔ جناب مہر ایڈیٹر انقلاب نے بھی تفضیلی لکھا ہے۔ بجز جناب آسیؔ کے کہ وہ ایک قصیدہ میں جو منقبت جناب امیر علیہ السلام میں جناب غالبؔ نے فرمایا ہے اس کے شعر ذیل

جانِ پناہا - دل و جانِ فیض رسانا شاہا وصیِ ختم رسل تو ہے بفتوائے یقیں

کے لفظ "وصی" سے ناخوش ہو کر فرماتے ہیں کہ یہی تو جھگڑا درمیان شیعہ اور سُنی ہے اور اب مرے مُردے اُکھیڑنے کا کیا فائدہ۔ اس لفظ وصی سے وہ شیعہ ہونا غالبؔ کا مانتے ہیں اور اظہار عقیدت بھی کرنے کو ناپسند فرماتے ہیں۔

کیا یہ شعر اُن کے اثنا عشری ہونے پر دال نہیں۔ پھر مدح خلفائے ثلثہ میں نظماً نثراً فارسی اور اُردو میں کبھی ایک حرف نہ کہا۔ صافی الاناء بترشح۔ کبھی تو اُن کے قلم سے سہواً ہی نکل جاتا مگر ایسا نہ ہوا۔
اب میں اُن کا ایک خط نقل کرتا ہوں جس کو جناب حالی نے یادگار غالب میں بھی لکھا ہے جس میں صاف صاف بلا تاویل اپنے مذہب کا اظہار فرماتے ہیں۔ وھو ھذا
غدر کے بعد سو روپے رام پور سے اور پچاس پنشن کے ملتے تھے۔ کثرت اخراجات کی وجہ سے تنگ آ کر بعضے ضروری خرچ بھی بند کر دیئے تھے حتیٰ کہ شراب بھی چھوڑ دی تھی نواب علاء الدین خان نے اپنے والد کے اشارہ سے اس کا سبب پوچھا ہے۔ اور مولوی حمزہ خان کی طرف سے بطورِ نصیحت مرزا صاحب کو یہ شعر حافظ کا بھیجا

چون پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو　　رندی و خراباتی در عہد شباب اولیٰ

س کا جواب اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

"بھائی کو سلام کہنا۔ اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو جا مارا۔ اُدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مُہری موجود۔ شہد لگاؤ اور چاٹو نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل بھیّی کے سر۔ بااین ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپیے آٹھ آنے کلکٹری کے۔ سو روپے رامپور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ سود سود ماہ بماہ لیا چاہیے۔ مول میں قسط اُس کو دینی پڑی۔ انکم ٹیکس جدا۔ چوکیدار جدا۔ سود جدا۔ مول جدا۔ بی بی جدا اور بچے جدا۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند۔ سوچا کہ کیا کروں۔ کہاں سے گنجائش نکالوں۔ قہر درویش بجان درویش صبح کی تبرید متروک۔ چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب اور گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیہ مہینہ بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید اور شراب کب تک نہ پیو گے۔ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے پوچھا نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے۔ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرض منقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا۔ خیر رہو۔ صبح کی تبرید رات کی شراب جاری ہو گئی۔

گوشت پورا آنے لگا۔ چوں کہ بھائی نے وجہ موقوفی پوچھی ہے اور بھائی بھی اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خان کو بعد سلام دعا کہنا۔

اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما ۔۔۔ ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم

دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔ ورنہ بیٹنے کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا۔ اور رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطے مارنا اور ہے۔ اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو ممکن اور واجب میں مشترک جانتے ہیں۔ وہ مشرک ہیں جو مسیلمہ کذاب کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں (یہ خلفاء ثلاثہ پر طعن ہے) کو ابوالائمہ (حضرت علی) کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں (علی کے برابر کسی کے ماننے والے کو دوزخی کہہ رہے ہیں۔ جو کسی دوسرے کو علی سے افضل مانے اُس کے لیے نہ معلوم کیا تجویز کریں گے) زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الاطاعۃ تھے۔ جناب محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ ختم المرسلین و رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے۔ (اس سے انکار خلافت اور وفات نبوی کے بعد بلا فاصلہ امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے۔ (اس سے انکار خلافت اور وفات نبوی کے بعد بلا فاصلہ امامت حضرت علی کا اظہار فرما رہے ہیں) اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی علیہ السلام ۔ع

بریں زیستم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت کو زندقہ اور مردود اور شراب کو حرام اور اپنے آپ کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تاکہ مشرکین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اُس میں جلیں۔ (یہ کھلم کھلا تبرٰی

نہیں ہے تو اور کیا ہے) سنو مولوی صاحب تم نے کئے قانوں میں شعر حافظ کا ؎

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو

یاد کیا۔ اور پھر پڑھتے ہو اُس کے سامنے کہ اُس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے مجموعہ نثر جدا گانہ۔ اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا اگر یہ ہے تو ہزاروں اشعار اس کے مخالف ہیں۔"

اتنا صاف عقیدہ تشیع ظاہر کرنے پر بھی نہ معلوم کیوں اُن کو شیعہ کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ شیعہ بھی شیعہ تبرائی ہیں۔ اگر یہی عقیدہ سُنّی کا ہو سکتا ہے تو دنیا میں سُنّی کا وجود ہی نہیں۔ کل مسلمان شیعہ ہی ہیں۔

مرنے سے کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ اور مرنے کے متمنی رہتے تھے۔ شہر میں وبا پھیلی۔ مجروح نے اس کے دفع ہونے کے بارے میں پوچھا تو جواب میں لکھتے ہیں "کیسی وبا۔ جب ستر برس کے بڈھے کو نہ مار سکی تو ایسی وبا پر تف ہے۔ پلنگ پر پڑے رہتے تھے غذا کم ہو گئی تھی چھ چھ سات سات دن اجابت نہ ہوتی تھی۔ مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ مرنے سے چند سال پیشتر اپنے مرنے کی تاریخ آپ (غالب بمرد) کہی تھی مرنے کے بعد متعدد لوگوں نے۔ آہ) کا اضافہ کر کے۔ آہ غالب بمرد۔ کہی۔ آخر کار ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کی دوسری تاریخ۔ اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں کو تہتر برس چار مہینے کی عمر میں دُنیا سے رحلت کی اور درگاہ نظام الدین اولیا میں اپنے خسر کی قبر کے پائین دفن کیے گئے۔

اگرچہ تاریخ کہنے سے بہت گھبراتے تھے مگر غدر کی تاریخ جو لکھی ہے اُس کا نام رستخیز بے جا تاریخی رکھا ہے جس سے ۱۲۷۷ھ نکلتے ہیں۔ اور سن غدر بارہ سو تہتر ہے۔ لفظ بیجا سے چار کا تخرجہ کر کے ۱۲۷۳ھ تاریخ نکلتی ہے۔ اس نام پر انھیں بڑا ناز تھا۔ اس میں شک نہیں کہ تخرجہ بہت اچھا ہے۔ تخرجہ کی خوبی یہی ہے کہ مطلب کو پورا کرے اور ضمناً اعداد تاریخ بھی پورے ہو جائیں۔

بوجہ پیری حافظہ میں کمی پیدا ہو گئی ہے اور نسیان عارض ہے یہ محل اس کے لکھنے کا نہ تھا۔

اسی طرح اپنی ایک تصنیف کے۔ ماہ نیم ماہ نام رکھنے پر بھی فخر کیا کرتے تھے۔

میں نے بھی جب اپنے گھر واقع بلگرام ضلع ہردوئی یو۔پی۔ کی ترمیم کی تو اُس کی تاریخ کہی جس میں اکتالیس عدد بڑھ گئے۔ اس کا تخرجہ کیا ہے۔ گو وہ اتنا پر لطف نہیں ہے۔

چہ طرب رفتن است چون مارا    گشت ترمیم دار شادانی

مکان کی ترمیم میں نے سن انیس سو چالیس میں کی۔ اور مصرعہ تاریخ سے ۱۹۸۱ء نکلتا ہے۔ اس میں سے "ما" کے اکتالیس اعداد کا تخرجہ کیا ہے۔

## تصانیف غالب

کلام اُردو نثر میں اُردوئے معلّیٰ۔ عود ہندی ان دونوں میں اُن کے خطوط ہیں۔ جو انھوں نے احباب، تلامذہ، امرا وغیرہ کو لکھے ہیں۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ موجودہ انشا پردازی اُردو کی بُنیاد انھیں کی رکھی ہوئی ہے اور ان سے اُن کی اُردو دانی کا پتہ لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح کی عبارت ہے جیسے دو شخص بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

کلامِ نظم اُردو۔ دیوان غزلیات چند قصائد۔ ایک آدھ مثنوی۔ قطعات و متفرق اشعار۔ رباعیات ہیں۔

## کلام نثر فارسی

سہ نثر جس میں پنج آہنگ ہے۔ اس میں فارسی زبان میں خطوط لوگوں کے نام ہیں۔ ایک خط صنعت مہملہ میں بھی لکھا ہے۔ صنعت منقوطہ میں بوجہ قلّت الفاظ کوئی لکھ ہی نہیں سکتا ہے اس لیے دو ایک شعر مشکل سے ملتے ہیں۔ دوسرے مہر نیمروز اس میں ترکوں کی تاریخ ہے۔ مواد دوسروں کا ہے عبارت ان کی ہے۔ کوشش کی ہے کہ عربی لفظ نہ آنے پائے۔ مگر دیباچہ میں عربی الفاظ ہیں۔ یہ نامکمل تاریخ ہمایوں تک ہے۔ تیسری دستنبو۔ چوتھی ماہ نیم ماہ لکھنے کا ارادہ تھا لیکن لکھ نہ سکے۔ رستخیز بیجا حالات غدر میں قاطع برہان۔ برہان قاطع پر اعتراضات۔ جب لوگوں نے اس کی بہت مخالفت اور لے دے کی اور غالب نے اُن کے جوابات دیئے تو پھر قاطع برہان اور جوابات کو یک جا کر کے اُس کا نام درفش کاویانی رکھا

کلام نظم فارسی ایک دیوان جس میں قصائد، غزلیات، مثنویات، قطعات رباعیات وغیرہ ہیں۔ اور کل کلام غالب چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ اس عنوان کے تحت میں نے اپنی یاد کے موافق بھی لکھ دیا ہے اُس میں غلط بیانی ہوگئی ہو تو کچھ بعید نہیں۔

گل رعنا اس میں انتخاب اُن کے کلام فارسی اور اُردو کا خود انھیں کا کیا ہوا ہے۔

**مرزا کے بعض شاگردوں کے نام:** زین العابدین خان ان کی بی بی کے بھانجے بہت خوش فکر اور پرگو شاعر تھے۔ ان کے مرنے پر مرزا نے ایک غزل بہت دردناک کہی ہے، جو دیوان اُردو میں موجود ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خان جو فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔

منشی ہرگوپال تفتہ اکبرآبادی جن کے ضخیم چار دیوان فارسی کے اُن کی یادگار ہیں۔

میر مہدی حسین مجروح جن کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اور جن کے نام عود ہندی میں متعدد خطوط ہیں۔

مرزا قربان علی بیگ سالک جن کا کلیات چھپ چکا ہے اور قابل دید ہے۔
شمس العلمار خواجہ الطاف حسین حالی جن کی تصنیفات مشہور ہیں اور انھیں کون نہیں جانتا ہے۔
نواب علار الدین خان علائی۔ کوئی شخص وحشت بھی شاید ان کے شاگرد تھے۔
نواب مصطفےٰ خان صاحب شیفتہ جن کا تذکرہ مشہور ہے اور بعد انتقال حکیم مومن خان غالبؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔

نواب سراج الدین خان ظفرؔ المعروف بہ اکبر ثانی و بہادر شاہ جنھوں نے بعد انتقال ذوق اپنا کلام غالبؔ کو دکھانا شروع کیا۔

ان کے شاگردوں کے تلامذہ میں سے کوئی ایسا نہ نکلا جو غالبؔ کے سلسلۂ شاعری کا نام باقی رکھ سکے۔
مورخہ ۳۱ر جولائی ۱۹۴۷ء مطابق ۱۲ر رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ یوم پنج شنبہ۔ یہ مطابقت تاریخ عیسوی و ہجری ٹھیک ہے پہلے جو تاریخ لکھی ہے اس میں ایک دن کا بل ہے۔ ۲۹ اور تیس کی رویت کی وجہ سے۔ مجھے علم نہ تھا کہ ۲۹ر کی رویت مانی گئی ہے بوجہ ابر ۲۹ر شعبان کو رامپور میں چاند دکھائی نہ دیا تھا۔

---

# شاد ان کی لائف

## نام ونسب وولادت

میرے جد امجد مولوی سید فدا حسین اعلی اللہ مقامہ نے میرا نام سید آل حسین رکھا تھا۔ لیکن جب میں قصباتی بورڈ اسکول اُردو میں داخل ہوا تو میں نے اولاد حسین نام لکھوایا۔ اقربا و اہل وطن آل حسین ہی سے مجھے یاد کرتے ہیں۔ اور اغیار اولاد حسین نام جانتے ہیں۔

میرے والد بزرگوار کا اسم گرامی سید تفضل حسین صاحب ابن سید فدا حسین صاحب ولد سید ذاکر حسین ابن سید غالب علی ولد سید شاکر علی نقوی بخاری بلگرامی ہے اور بتیس ۳۲ واسطوں سے سلسلۂ نسب جناب امام دہم علی نقی علیہ السلام کے فرزند جعفر تواب سے جا ملتا ہے۔ امام اور اُن کی اولاد سامرہ عراق میں سکونت رکھتے تھے۔ جعفر تواب کے بیٹے سید علی اصغر اُن کے فرزند سید عبد اللہ اُن کے پسر سید محمد اُن کے خلف الصدق سید محمود ان کے فرزند سید احمد اور ان کے بیٹے سید جعفر اور اُن کے بیٹے سید جلال بخاری ہیں۔ سید احمد بخارا میں وسید جلال ملتان میں آگئے، غالباً یہ زمانہ آخری صدی ششم تھا کہ میرے جد اعلیٰ بخارا میں آکر مقیم ہوئے۔ اور سید جلال بخاری وسط صدی ہفتم میں ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے شہر ملتان میں تشریف لائے اور بہاء الدین محمد زکریا رازی کے مرید اور اُن کے خلیفہ و جانشین ہوئے۔ پیر نے اوچھ ضلع ملتان میں جو اب ریاست بھاولپور میں شامل ہے قیام کا حکم دیا۔ وہیں انھوں نے شادی کرلی۔ غالباً یہ زمانہ سلطنت غیاث الدین بلبن کا تھا۔

سید جلال کے فرزند و خلیفہ سید احمد کبیر ہوئے۔ سید احمد کبیر کے دو بیٹے جہانیاں جہان گشت اور راجو قتال ہیں انہیں قتال بن سید احمد کبیر کی اولاد میں ہوں جو اپنے باپ کے جانشین تھے۔ دادا، باپ بیٹے تینوں کا مزار اوچھ میں ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

سید صغریٰ واسطی زیدی حسینی نے بلگرام کو ایک ہندو راجہ سے فتح کیا جس کی تاریخ خداداد ہے اور اس سے ۶۱۴ھ نکلتا ہے۔ مگر میرے جد بزرگ غالباً سید محمود المعروف بہ سید ددوا اوچھ سے بلگرام میں تشریف لائے اور ایک محلہ میں آباد ہوئے جس کا نام انھوں نے اوچھی منڈی رکھا اور اب اونچی منڈی کہلاتا ہے۔ غالباً یہ زمانہ سلطنت اورنگ زیب عالم گیر کا تھا اور گیارہویں صدی ہجری تھی۔

یہاں آکر سب نوکری پیشہ ہو گئے اور درویشی کو ترک کر دیا صرف میرے خاندان کے ایک بزرگ سید قاسم اسرار بخاری کا ذکر درویشان بلگرام میں اپنی کتاب مآثر الکرام میں آزاد فرماتے ہیں۔ جو اپنے مرید کے پاس قصبہ بادن پرگنہ بلگرام میں تشریف لے گئے۔ وہیں اُن کا انتقال ہو گیا اور وہیں اُن کا مزار ہے۔ آزاد کا زمانہ حیات بارہویں صدی ہجری ہے اور محمد شاہ رنگیلے کی سلطنت کا زمانہ تھا۔

سادات بلگرام تین قسم کے ہیں۔ ایک تو صغراوی جو واسطی زیدی حسینی ہیں انھیں کو اصلی باشندہ بلگرام کہنا زیبا ہے۔ یہ اور سادات بارہہ دو بھائیوں کی نسل سے ہیں۔ میدان پورہ ایک محلہ بلگرام کا اب بھی ہے جس میں اولاً بسے تھے جب پھیلے تو محلہ سید واڑہ اور سلہڑہ بھی آباد کیا۔ دوسرے سادات رضوی جو محلہ ملکنٹھ میں رہتے ہیں۔ تیسرے سادات نقوی جو میرا خاندان ہے۔ اور محلہ سید واڑہ میں رہتے ہیں۔

میرے آبا و اجداد نے جب بلگرام کو اپنا وطن بنا لیا۔ تو سادات صغراوی میں مناکحت و مصاہرت ہونے لگی۔ چنانچہ میرا ننھیال واسطی زیدی حسینی ہی ہے۔ میرے جد امجد مولوی سید فدا حسین صاحب مرحوم کے حقیقی ماموں میرے سگے نانا تھے جو سادات زیدی میں سے تھے۔ میرا موجودہ مکان جس کی میں نے بہت کچھ ترمیم کی ہے میرے نانا ہی کا ہے۔

میرے جد امجد نے شجرہ طیبہ کی تکمیل جو مصنفہ میر غلام علی آزاد ہے ۱۲۹۹ھ تک کے سادات صغراوی کے نسل کی فرمائی۔ اس کے بعد سے سید وصی الحسن المعروف بہ چودھری نے جو ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر ہیں ۱۹۴۴ء تک تکمیل فرما کے اس نسب نامہ کو چھپوایا۔

چوں کہ میرے جد امجد نے سادات نقوی کے نسب کی نسبت صرف اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ فلاں کی اتنی اولاد ذکور اور اناث میں تھی اور فلاں کی اولاد سے ان کی شادیاں ہوئیں اس لیے نہ معلوم ہو سکا کہ میرے اجداد میں کون عالم فاضل یا درویش یا منصب اعلیٰ پر فائز تھا۔

کوئی خاندان سادات بلگرام کا ایسا نہیں جس میں تعلق مناکحت سادات نقویہ سے نہ ہوا ہو۔ چنانچہ میری ایک پھوپھی سید غلام رضا کو بیاہی تھیں۔ جو سید ابو طاہر حسینی کی نسل سے تھے۔ اور سید اولاد حیدر فوق بلگرامی مصنف حالات چہاردہ معصومین میری دادی کی حقیقی بہن کی نسل سے تھے۔ میری بڑی پھوپھی کی بیٹی جن کے والد

سادات زیدی میں سے تھے اُن کی شادی سید دلدار حسین علم دار سے ہوئی جو بلگرام کے رؤسا میں تھے ۔ میرے دادا کے ایک بھائی کی لڑکی پیرزادہ سید محمد زاہد سجادہ نشین سے منسوب تھیں جو سُنی المذہب اور درویش تھے ۔

دادا کے ایک بھائی کی شادی مارہرہ کے خاندان سجادہ نشین میں ہوئی جو اصلاً سادات بلگرام سے ہیں اور اُن کی پوتی کی شادی سید حسین جنٹن بلگرامی ساکن محلہ سلطرہ سے ہوئی ۔ اور جشن سید غلام حسنین قدر بلگرامی کے قریبی رشتہ دار تھے ۔ میری ان بہن کے بیٹے سید علی اصغر ریاست حیدر آباد میں ایک صوبہ کے کمشنر ہیں ۔

ایک خاندان سادات صغراوی کا چودھریوں کا خاندان کہلاتا ہے یہ سب کے سب صاحب جائداد اور تعلقہ دار ہیں ۔ سید محمد جواد تعلقہ دار اور آنریری مجسٹریٹ کی والدہ صغرا بیگم میرے چچازاد بھائی سید الطاف حسین کے داماد ڈاکٹر سید جعفر حسین کی پھوپھی تھیں ۔

میرے جد امجد سید فدا حسین مرحوم بڑے عابد و زاہد اور فارسی دان تھے ۔ دو بجے رات سے اُٹھ کر حقہ بھر کے پیتے تھے اور ضروریات جسمانی سے فارغ ہو کے نماز فجر پڑھنے کے بعد تلاوت کلام مجید اور درود وظائف میں دس بجے دن تک مشغول رہتے تھے ۔ ایک سو ساٹھ مرتبہ تلاوت کلام پاک کر کے اُس کا ثواب اپنی اولاد کی ارواح اور بعض رؤسا بلگرام اور شناسا کو بخشا ۔

ان کی چار اولادیں ہوئیں ایک میری بڑی پھوپھی زینب فاطمہ بیگم دوسرے منشی سید تفضل حسین جو میرے والد ماجد تھے ۔ چالیس برس کی عمر میں کنٹھ مالے کے مرض سے بلگرام میں انتقال ہوا اور میدان عید گاہ کے قبرستان میں اپنے والد کی قبر سے قریب مدفون ہیں ۔ ان کی وفات کے وقت میری عمر بارہ سال کی تھی ۔ دوسرے فرزند سید تجمل حسین مرحوم تھے اور دوسری لڑکی زینب فاطمہ تھیں ۔

میرے والد کی شادی سیدہ مشرف النساء بیگم بنت سید رعایت محمد ابن سید ہاشم علی زیدی سے ۱۷ ماہ شعبان ۱۲۷۷ھ کو ہوئی ۔ ۱۵ ماہ رجب ۱۲۷۸ھ کو میری بڑی ہمشیر سیدہ آل فاطمہ بیگم کی ولادت بلگرام میں ہوئی ۔ اور بتاریخ شب بست و پنجم ماہ ذیقعدہ ۱۳۰۱ھ جناب مولوی محمد حسین صاحب مجتہد العصر ابن ملک العلما سید بندہ حسین صاحب مجتہد العصر ابن مولوی سید محمد صاحب المعروف بہ ۔ بڑے قبلہ و کعبہ ۔ ولد مولوی سید دلدار علی صاحب مجتہد العصر غفران مآب سے ہوئی ۔ یہ خاندان اجتہاد اصلاً باشندہ قصبہ نصیر آباد ضلع رائے بریلی یوپی کا ہے ۔ اور یہ بھی سادات نقویہ سبزواری ہیں ۔ لیکن جناب غفران مآب نواب سعادت علی خان شاہ اودھ کے زمانہ سے مقیم لکھنؤ ہیں ۔ اور لکھنؤ کے کل علماء شیعہ چاہے وہ مولوی حامد حسین صاحب ہوں یا مفتی میر عباس صاحب مرحومین اسی خاندان کے شاگرد تھے ۔ نواب سعادت علی خان نے چار گانوں ضلع رائے بریلی میں اور تین گانوں ضلع اوناؤ میں اور دو ہزار ماہوار کی پنشن جناب غفران مآب کی مقرر کی ۔ اور شیعوں کے فیصل قضایا کے لیے جج مولوی سید محمد صاحب ابن جناب غفران مآب تھے اور سنیوں کے لیے مولوی مفتی سعد اللہ

صاحب جج تھے جنھوں نے معیار الاشعار محقق طوسی کی شرح لکھی ہے۔

شاہان اودھ کی تاج پوشی مولوی سید محمد صاحب کے ہاتھوں سے ہوا کرتی تھی۔ وہ مواضعات کچھ کمی کے ساتھ اب تک میرے بھانجے اور بھانجیوں کے قبضہ میں ہیں۔

میری ان بڑی ہمشیر کے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ میرے بہنوئی جناب مولوی علن صاحب جن کا عرف تھا اور اسم گرامی مولوی سید محمد حسین تھا اور جناب جنت مکانی نواب حامد علی خان صاحب اُن کے مقلد تھے اور گھر بیٹھے دو سو روپیہ ماہوار اُن کو نواب صاحب موصوف عطا فرماتے تھے۔

سفر بتلاش معاش ڈپٹی علی بہادر صاحب بلگرامی کے پاس سیتاپور میں اور ڈپٹی سید رضا حسین صاحب بلگرامی کے پاس سہارنپور گیا۔ مگر ناکام رہا۔ جب میرے بھانجے ریاست رام پور سے کربلا بھیجے گئے تو انھوں نے کل اعزہ کو کربلا بلایا۔ تینوں بچیاں اور پانچ عورتیں میرے پاس رام پور میں تھیں۔ جو قافلہ لکھنؤ سے چلا ان کو لکھنؤ والے قافلہ سے مجھے ملادینا تھا۔ جس دن شام کو میں بمبئی پہنچا۔ اُسی دن صبح کو وہ قافلہ بمبئی سے روانہ ہو گیا۔ یہاں تک مجھے ان کو کربلا تک لے جانا پڑا۔

۱۹۰۷ء میں جب علن صاحب کا انتقال ہو گیا تو سرکار مرحوم نے سو روپیہ ماہوار اُن کے بڑے فرزند سید محمد کا وظیفہ کر کے اجتہاد کی سند حاصل کرنے کے لیئے عراق بھیج دیا۔ اور انھوں نے دو تین مجتہدین عراق سے اجازہ اجتہاد بھی حاصل کرلیا۔ چونکہ ان کی والدہ (میری ہمشیر) اور ان کے دوسرے بھائی اور بہنیں بھی کربلا میں ان کے ساتھ تھیں۔ ان کی بہن جو ان سے چھوٹی تھیں اور یہیں سے دق کی بیمار گئی تھیں تین مہینے بعد ہی ان بہن کا انتقال کربلا میں ہو گیا۔ اور ۱۹۱۰ء میں خود مولوی سید محمد المعروف بہ بڑے آغا کا بھی انتقال کربلا ہی میں ہوا۔ اور دونوں بھائی بہن امام حسین علیہ السلام کے روضہ مبارک کے ایک حجرہ میں دفن ہیں۔ دوسرے بیٹے مولوی سید دلدار علی[1] المعروف بہ منے آغا المتخلص راز اجتہادی فضل خدا سے زندہ ہیں اور بقیہ جائداد جناب غفران مآب پر قابض ہیں۔ ان کے بعد کی بہن جو جناب میر آغا صاحب مجتہد کے فرزند سید سبط محمد ہادی المعروف بہ مولوی کلن صاحب سے منسوب تھیں اُن کا انتقال بھی لکھنؤ میں ذات الصدر (نمونیہ) سے ہوا۔ دو لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ ایک کی شادی نواب مولوی سید اصغر حسین فاخر کے پوتے سید غیور حسین ایڈوکیٹ سے ہوئی جو بی اے ایل ایل بی ہیں ان سے دو لڑکے اور ایک لڑکی صغیر السن اس وقت ہے۔ نواب صاحب ملکہ جہان زوجہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے داماد اور جناب میر آغا صاحب مجتہد کے بھانجے تھے۔ اور دوسری لڑکی کی شادی سید سکندر[2] آغا نقوی سے ہوئی۔ ان کے بعد ایک بھانجی میری اور تھیں میری ہمشیر نے اُن کی شادی نہ کی[3]۔ آخری اور چھوٹے بھانجے میرے مولوی سید رضی تھے جن کی شادی دختر سید فرزند حسین صاحب ذاخر و ہمشیر مولوی للن

[1] - ان کا انتقال ۱۷ر جون ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ میں ہوا

[2] - ۳ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو راولپنڈی میں انتقال ہوا۔ [3] انھوں نے جون ۱۹۶۰ء میں روز عاشورہ انتقال کیا

صاحب مشہور واعظ سے ہوئی ۱۹۴۶ء میں سید رضی کا انتقال ہوگیا جبکہ عمر بیالیس سال کی تھی۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی ان کے انتقال کے ڈیڑھ ماہ بعد میری بڑی ہمشیر کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور امام باڑہ جناب غفران مآب میں دونوں دفن ہوئے۔

دوسری میری بہن سیدہ منظور النساء بیگم کہ وہ بھی مجھ سے بڑی تھیں ان کی شادی سید علی محمد سے ہوئی جو سادات ترمزی ساکن دائی پور ضلع فرخ آباد کے تھے بہت سی اولادیں ہوئیں جن میں سے صرف ایک لڑکی زندہ رہی جس کی شادی مولوی مفتے آغا آزاد اجتہادی سے ہوئی۔ ان کے بطن سے سید سکندر آغا نقوی جو ایف اے اور ادیب عالم امتحانات پنجاب یونیورسٹی پاس ہیں۔ اور فی الحال محکمہ سی آئی اے (C.I.A) میں ہیڈ کلرک ہیں اور تین سو چالیس تنخواہ پاتے ہیں پاکستان میں موجود ہیں۔ اس لڑکی کا بھی انتقال جوانی میں ہوگیا اور اسی امام باڑہ میں دفن ہیں۔ بڑی ہمشیر نے ۸۶ سال کی عمر پائی اور منجھلی ہمشیر کا انتقال چہتر برس کی عمر میں ہوا۔ اور میری والدہ معظمہ نے بھی ترسٹھ برس کی عمر میں لکھنؤ ہی میں انتقال فرمایا اور اسی امام باڑہ غفران مآب میں دفن ہیں۔ سن انتقال والدہ بھی ۱۲ رجب ۱۹۰۷ء ہے۔

میں اپنے والدین کی تیسری اولاد ہوں۔ اور میری ولادت آرہ ضلع شاہ جہان آباد صوبہ بہار میں ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۸۷ھ کو وہی چاندرات ہوگئی شب جمعہ کو ہوئی۔ کیوں کہ میرے جد امجد وہاں ریونیو ایجنٹ تھے اور اپنی چاروں اولادوں اور میری والدہ کے ساتھ وہیں قیام تھا۔

میری چھوٹی بہن معین الفاطمہ بھی آرہ ہی میں پیدا ہوئیں وہ مجھ سے ڈھائی برس چھوٹی تھیں ان کی شادی بارہ برس کی عمر میں جناب علن صاحب مجتہد کے چھوٹے بھائی مولوی سید رضا حسین صاحب پیش نماز سے ہوئی۔ اپنے والد کی عمر پائی۔ اختناق کا مرض پہلے سے تھا اس میں ٹائی فائڈ (تپ محرقہ) ہوگئی۔ میرے ساتھ رامپور میں رہتی تھیں اس لیے رامپور میں ۱۹۱۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اور مقابر مومنین رامپور میں دفن ہیں۔

میرے والد کے ایک بھائی سید تجمل حسین صاحب مرحوم بھی تھے۔ اُن کی شادی پہلے میری خالہ کی بیٹی سے ہوئی اُن کے انتقال کے بعد دوسری شادی سادات زیدی میں ہوئی۔ متعدد اولادوں میں دو فرزند سید ریاست حسین جن کا انتقال دق سے لکھنؤ میں ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ کئی اولادیں ہوئیں مگر سب نا کتخدا کم عمری میں مرگئیں۔ دوسری ایک لڑکی چچا کی جن کا نام امانت فاطمہ عرف سکینہ بیگم ہے وہ زندہ ہیں اور میری زوجہ ہیں۔ تیسرے سید الطاف حسین جن کے سات بچے ہوئے مگر تین لڑکیاں زندہ ہیں۔ بڑی لڑکی کی شادی سید ابراہیم احمد سے ہوئی اور ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے اور خود بہت بیمار ہے[1]۔ دوسری لڑکی کی شادی ڈاکٹر سید جعفر حسین ساکن باڑہی سے ہوئی اور پانچ اولادیں کم ہیں اس وقت

---

[1] پروفیسر صاحب مرحوم کے انتقال کے چند سال کے بعد لکھنؤ میں انتقال کیا اور امام باڑہ جناب غفران مآب میں دفن ہوئیں۔

ہیں۔ تیسری لڑکی کی شادی سید اقبال حسین رامپوری سے ہوئی۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا اس وقت ہے۔ میری کوئی اولاد زندہ نہ رہی۔ اور سید الطاف حسین کے کوئی اولاد ترینہ نہیں اس لیے سادات نقویہ بلگرام کا ہم دونوں پر خاتمہ ہے۔

## تربیت و تعلیم

فارسی میں اپنے دادا سے بلگرام میں پڑھتا رہا۔ گلستان بوستان اور یوسف زلیخا تک دادا ہی سے تعلیم پائی۔ اور میزان منشعب مولوی سید کرار علی عرف کنا میاں سے پڑھی۔ میر بہادر علی اور سید وارث علی صاحبان سے بھی کچھ پڑھا ہے اور جب اُردو مڈل کے درجات میں نام لکھایا تو پنڈت کامتا پرشاد اور کاشی پرشاد اور غلام حیدر آرشد سے بھی پڑھا جو قدر بلگرامی کے شاگرد تھے اور تاریخ کہنے میں اُن کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔

میرے والد ماجد مظفرپور صوبہ بہار کی تحصیل میں قرق امین تھے اُن کے انتقال کے بعد بہت عسرت سے بسر ہونے لگی۔ کیوں کہ کوئی جائداد۔ یا کھیت یا باغ آبائی نہ تھا۔ اونچی منڈی کے مکانات میں سے کچھ تو وقت ضرورت آرہ کوآت سے آگر بیچ ڈالے اور کچھ پر میرے پردادا کے ایک عزیزہ کی لونڈی کی اولاد کا قبضہ بڑے رئیس بلگرام نے کرا دیا۔ جس مکان کو بیچا گیا اس کا نام کالا محل تھا۔ اب وہ پتو بھاٹ کے ورثہ کے پاس ہے۔

جب میری بڑی ہمشیر کی لکھنؤ میں شادی ہوگئی تو ہمشیر میری کفالت کرنے لگیں اور میں نے لکھنؤ چرچ مشن اسکول میں انگریزی پڑھنا شروع کی۔ مگر مڈل اینگلو ورنا کیولر کا امتحان سنٹی نیل امریکن مشن ہائی اسکول سے ۱۸۹۰ء میں دیا اور سکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ جس طرح کہ اب ملازمت سرکاری کے لیے قید میٹرک کی ہے اُس وقت مڈل پاس کو بھی نوکری ملتی تھی۔

۱۸۹۱ء میں راجہ امیر حسن خاں صاحب نے مدرسہ عالیہ اسلامیہ کھولا۔ انٹرنس تک انگریزی کی تعلیم اس میں ہوتی تھی۔ اُردو مڈل بھی تھا۔ پنجاب کے امتحانات مولوی فاضل اور منشی فاضل کے درجات بھی کھولے گئے تھے۔ نویں درجہ کی تعلیم یہاں حاصل کی جسے اُس وقت دوسرا درجہ کہتے تھے۔ اور انٹرنس کے لیے پھر سنٹی نیل اسکول میں نام لکھایا۔ چھ مہینے تعلیم پانے کے بعد میٹرک کلاس کی فیس بارہ آنے سے تین روپیہ ہوگئی جس کا میں متحمل نہ ہو سکا تعلیم انگریزی ترک کرنا پڑی۔

اس زمانہ میں مرزا محمد ہادی صاحب رسوا جو بی اے پاس تھے اور تھیسس لکھنے کی وجہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی ملی تھی۔ اور فن ہیئت میں اپنے آپ نظیر تھے۔ زیچ تیار کی اور ربع مجیب بھی بنایا اس زمانہ میں اس اسکول میں ہیڈ اورینٹل ٹیچر تھے ان سے نصاب فارسی کی کتابیں مڈل اور انٹرنس میں پڑھیں۔

جناب رسوا بعد ازاں ریڈ کرسچین کالج لکھنؤ میں منطق کے لکچرار ہو گئے تھے پھر اس ملازمت کو ترک کر کے حیدر آباد دکن تشریف لے گئے اور صیغہ تصنیف و تالیف میں ملازم ہو گئے حتیٰ کہ وہیں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ عجیب وارفتہ مزاج (ABSENT MINDED) حکیمانہ دماغ کے آدمی تھے۔ کبھی مولوی ہوتے تھے اور کبھی رند۔ شاعر بھی اچھے تھے اور مرزا اوج سے تلمذ تھا۔

جب میں نے انگریزی چھوڑی تو پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات عربی و فارسی دینے کا خیال پیدا کیا۔ اس زمانے میں پنجاب کے امتحانات کے لیے سنٹر لکھنؤ بھی تھا اور ریڈ کرسچین کالج میں امتحانات ہوتے تھے۔ عربی امتحانات کے ختم ہونے پر فارسی کے امتحانات شروع ہو جاتے۔ اور ایک امتحان صرف انگریزی کا جس کا نام اسپیشل ٹسٹ اِن انگلش تھا۔ یہ بھی ہوا کرتا تھا اس کے پاس کرنے سے ہر امتحان عربی و فارسی کا ڈپلوما ملا کرتا تھا۔ اب بغیر اس امتحان کے ملتا ہے۔ پہلے ڈپلومے میں اس انگریزی امتحان کا ذکر ہوتا تھا اب نہیں۔

۱۸۹۵ء میں منشی اور اسپیشل ٹسٹ کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۹۶ء میں منشی عالم اور مولوی کا امتحان پاس کیا۔ اور قطبی تک عربی کی تعلیم اپنے بہنوئی جناب علن صاحب مجتہد العصر سے حاصل کی۔ اور منشی فاضل کے امتحان میں ایک بی اے کورس عربی بھی داخل نصاب تھا۔ جس کا حصہ نثر صرف مقامات بدیعی سے منتخب تھا اور حصہ نظم حماسہ اور متنبی سے۔ مقامات بدیعی کے چند مقامے مولوی سید ظہور حسین صاحب سے پڑھے جو اپنے وقت میں اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے۔ ۱۸۹۷ء میں یہ امتحان منشی فاضل پاس کیا۔

۱۸۹۲ء میں جناب مولوی سید ابو الحسن المعروف بہ جناب بچھن صاحب قبلہ مجتہد العصر کا انتقال ہو چکا تھا اور جناب علن صاحب قبلہ اپنے بھائی بچھن صاحب کی جگہ پر ٹرسٹی راجہ صاحب کے مدرسہ عالیہ مذکور کے ہوئے تو مجھے سہارنپور سے بلا کے چھٹے درجہ کا مدرس مقرر کر دیا۔ میں ڈپٹی سید رضا حسین بلگرامی کے پاس سہارنپور میں بتلاش ملازمت گیا ہوا تھا۔ اور مدرسہ عالیہ مذکور میں صرف انگریزی انٹرنس تک کی تعلیم رہ گئی تھی۔ بعدہ۔ انگریزی تعلیم بالکل موقوف ہو گئی۔ اور مدرسہ بلند باغ کی کوٹھی سے اٹھ کر جناب غفران مآب کے امام باڑہ میں آ گیا۔ تو مولوی فاضل کے درجہ کو مولوی ظہور حسین پڑھاتے اور فارسی کا مدرس مجھے بنایا گیا۔ میں جب منشی کے درجہ کو پڑھاتا تھا تو اپنے طلبہ کے ساتھ منشی کا امتحان دیا۔ اسی طرح منشی عالم اور منشی فاضل کا بھی۔ پھر یہ مدرسہ انگریزی مڈل کا بنا دیا گیا اب بھی ہائی اسکول ہے۔

نواب مولوی میر مہدی حسین صاحب مرحوم المتخلص بہ ماہر شاگرد جناب اسعد مرحوم کے بھائی کے ساتھ نواب ملکہ جہان (زوجہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ) کا عقد ہو گیا تھا ان سے دو لڑکیاں تھیں بھاوج اور بھائی کے مرنے کے بعد جناب ماہر ان لڑکیوں کے متولی ہوئے، ملکہ جہان نے کثیر رقم نقد اور جواہرات اور جائداد غیر منقولہ کاظمین کربلائے معلیٰ اور کانپور میں چھوڑی۔ ان میں سے ایک لڑکی کی شادی جناب ماہر نے اپنے بھانجے مولوی نواب سید اصغر حسین

صاحب فاخر کے ساتھ کردی جو نرہی محلہ لکھنؤ کے نواب کہلاتے تھے۔ جناب فاخر اپنے ماموں جان ماہر کے شاعری میں شاگرد تھے اور ان کے دو دیوان چھپ کر شایع ہو چکے ہیں۔

جناب ماہر نے مرثیہ گوئی میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ لکھنؤ میں ایک تیسرا گھر یا چوتھا گھر مرثیہ گوئی کا پیدا کر دیا۔ اگرچہ ماہر و فاخر خاندان اجتہاد کے افراد تھے مگر پیسہ ہو جانے کی وجہ سے ان دونوں کے نام کے ساتھ لفظ "نواب" بھی لگ گیا۔

جناب ماہر کا بھی دیوان غزلیات چھپا ہوا ہے۔ مراثی جو ان کی کائنات تھے، جب تک اُن کے بیٹے نواب سید نظیر حسین زندہ تھے اُن کے پاس تھے ان کے مرنے کے بعد وہ مراثی کیا ہوئے مجھے اس کا علم نہیں۔ اسی طرح کلام جناب بندہ کاظم صاحب جاوید جو پُر گو اور خوش گو شاعر تھے۔ (اور جناب ماہر کے بھانجے اور جناب خورشید میرے استاد کے شاگرد تھے) کا پتہ نہیں، غزلیات اور مراثی یہ بھی خوب کہتے تھے۔ ایسے ہی جناب سید محمد اصطفےٰ صاحب خورشید کا کلام بھی اُن کے فرزند بنے صاحب کے پاس اُن کی زندگی میں رہا۔ بنے صاحب کے مرنے کے بعد نہ معلوم کیا ہوا۔ جناب خورشید بھی غزل اور مرثیہ خوب کہتے تھے اور مرثیہ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ اور فن عروض کے بڑے ماہر تھے۔ جناب استادی۔ افادات۔ فن عروض میں کتاب چھپ کر شائع بھی ہو چکی تھی۔

نواب پیارے صاحب فرزند نواب اسد الدولہ علی نقی خان کے خاندان سے تھے اور نواب افضل محل زوجہ واجد علی شاہ آخری بادشاہ اودھ کی تھیں۔ نواب پیارے صاحب ان کے منیجر تھے۔ افضل محل صاحبہ نے لاکھوں روپیہ اور جواہر انھیں عطا کیا تھا۔ انھوں نے چندر نگر میں اپنا مکان بنالیا۔ اور جواہرات یہیں رکھے۔ اور نقد روپیہ فرانس میں ایک بنک میں رکھا۔

جناب ماہر نے ننھے مرزا صاحب سے جو نواب حامد علی خان ولی عہد واجد علی شاہ کے فرزند تھے مقدمہ مول لے کر نواب پیارے صاحب پر ڈیڑھ کروڑ کا دعویٰ دائر کیا۔ ہائی کورٹ کلکتہ اور لندن سے ان کی ڈگری ہوئی جناب ماہر نے تین لاکھ روپیہ اس مقدمہ میں صرف کیا۔ جب اجراء ڈگری فرانس میں چاہی تو وہاں سے جواب ملا کہ یہ ڈگری صرف ایک گواہ کا کام دے گی۔ از سر نو مقدمہ ہماری عدالت میں دائر کرو۔ اتنے میں گریٹ وار ہو گئی اور جناب ماہر کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے گھر کی حالت بگڑ گئی۔ اور اولاد ماہر کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

۱۸۹۷ء میں مجھے مختار خاص کر کے کلکتہ بھیجا۔ میں وکلا، ایڈوکیٹ اور بارسٹروں کو تیار کر کے اور گواہوں کو عدالت میں لے جاتا تھا۔ ایک سال تک یہ کام کلکتہ میں کیا۔

لکھنؤ واپس آکر ڈپٹی کمشنر کی کچہری میں ملازمت کی درخواست دی انھوں نے کینڈیڈیٹ بنا لیا۔ جب میں رامپور میں ملازم ہو کر آ گیا۔ اور میرے اپرینٹس ہونے کی باری آئی تو میں بُلایا گیا۔ کہہ دیا گیا وہ نہیں ہیں۔ پھر بھی میرا نام کئی سال،

تک امیدواروں میں لکھا رہا۔

جب میں ۱۹۰۴ء میں رامپور میں تھا۔ تو قونصل انگریزی مقیم ایران کے لیے ایک فارسی دان شخص کی اخباروں میں ضرورت (WANT) شائع ہوئی۔ میں نے بھی ایک درخواست بھیج دی۔ اُس پر میری تقرری کی منظوری لکھی تھی پھر اُسے کاٹ کر کسی دوسرے کا مقرر ہونا لکھا تھا۔

## ملازمت مشہور مدرسہ عالیہ رامپور۔

۱۸۹۹ء میں میرے بہنوئی نے ٹرسٹی شپ مدرسہ عالیہ راجہ محمود آباد سے استعفا دے دیا تو میں نے بھی اُن کے تتبع میں استعفا دے دیا۔ اور ٹیوشن پر بسر ہوتی تھی۔

میر مہدی حسین ماہر کے فرزند سید نظیر حسین نے ایک مرتبہ گھر سے ناراض ہوکر رامپور جانے کا ارادہ کیا۔ مرزا واجد علی بیگ بنارسی منصرم وسلا خانہ ریاست رامپور تھے اور ان کے شناسا اور ہم شہر تھے ان سے ملنا چاہا۔ میں ۱۹۰۰ء میں خالی تھا۔ اور وہ میرے شاگرد اور ہم صحبت بھی تھے مجھ سے ساتھ چلنے پر خواہش ظاہر کی میں اُن کے ساتھ رامپور آیا۔ ابوالحمید مولوی فرنگی صاحب اُستاد جناب جنت مکان کے مکان سے قریب ایک ہیجڑے کا مکان جو قبرستان میں تھا کرایہ پر لیا۔ وہ مرزا واجد علی کے گھر زیادہ آتے جاتے تھے۔ وہ میرے مذاق کے نہ تھے۔ میں مولوی فرنگی صاحب کے یہاں جا بیٹھتا تھا۔

مولوی فرنگی صاحب اس زمانہ میں مدرسہ عالیہ رامپور کے ڈائرکٹر تھے۔ شعبان کا مہینہ تھا اسی زمانہ میں سالانہ امتحان شاخ عربی درس نظامی اور شاخ فارسی کا ہوا کرتا تھا اب بھی درس نظامی کا امتحان سالانہ اسی ماہ میں ہو کرتا ہے۔ اور باؤس اگزامینیشن سے امتحان ہوتا تھا۔ انھیں معلوم ہوا تھا کہ میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات پاس ہوں اس لیے مجھے حکم دیا کہ تم درجہ اول فارسی کے سوالات کے پرچے بنادو اور اُن کے جوابات طلبہ بھی دیکھ کر نتیجہ تیار کردو میں نے تعمیل حکم کی۔

اس زمانہ میں عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر ریاست کے مدارالمہام تھے۔ اُن سے تحریک کر کے مدرسہ عالیہ میں منشی فاضل وغیرہ کے درجات کھولنے کی منظوری لے لی۔ میں رمضان میں نواب نظیر حسین صاحب کے ساتھ لکھنؤ واپس گیا۔

میرا پتہ لکھنؤ انھیں معلوم نہ تھا۔ میرا نام اور لکھنؤ لکھ کر خط ڈال دیا۔ اتفاقاً دیوان (دیوین) ضلع بارہ بنکی ہوتا ہوا مجھے لکھنؤ میں مل گیا۔ مجھے نوکری کی بابت لکھا تھا۔

میں نے منظوری کے ساتھ پہلی شرط یہ لکھی کہ کسی کو موقوف کر کے اس کی جگہ پر مجھے نہ رکھا جائے۔ دو شرطیں

اور تھیں وہ سب منظور ہوئیں اور مولوی فرخی نے پروانہ تقرر حاصل کر کے میرے پاس لکھنؤ میں بھیج دیا۔ درجہ اول مولوی فضل الرحمٰن صاحب پڑھاتے تھے جو اُس وقت فارسی کے کامل استاد سمجھے جاتے تھے۔

میں ۱۶ر فروری ۱۹۰۱ء کو مدرسہ عالیہ میں حاضر ہو گیا۔ میرے آنے پر مولوی صاحب موصوف نے استعفاء دے دیا۔ میں اپنے ساتھ اپنے شاگرد مولوی سید محمد تقی شاد ماں مرحوم کو بھی لایا۔ جن کو میں لکھنؤ ہی سے پڑھا رہا تھا۔ کرایہ سفران کا میں نے برداشت کیا اور چھ ماہ تک اپنے ساتھ رکھ کر کھلایا پلایا۔

میں نے یہاں آکر درجہ منشی فاضل کھلوایا اور مولوی فرخی صاحب سے تحریک کر کے درجہ منشی عالم کے کھلنے کی منظوری لی۔ اور شاد ماں مرحوم کو درجہ منشی عالم کا مدرس مقرر کرایا۔ پہلے کچھ پڑھے لکھے نہ تھے جب عالم کے نصاب کو مجھ سے گھر پر پڑھ لیتے تھے تب درجہ میں پڑھا سکتے تھے۔ شاعری بھی مجھ سے سیکھی۔

چوں کہ یوپی میں گورنمنٹ کی طرف سے امتحانات عربی و فارسی نہیں ہوتے تھے، اس لیے جوں ہی مدرسہ عالیہ سے پاس ہو کر نکلا وہ گورنمنٹی اور پبلک ایڈڈ اسکول میں ملازم ہو گیا۔ یوپی کا کوئی شہر یا ضلع کمتر ہوگا، جس میں مدرسہ عالیہ کے پاس شدہ امتحانات پنجاب یونیورسٹی ایک دو یا تین مدرس فارسی نہ ہوں۔

ایک مرتبہ اندور ملٹری اسکول میں ایک مدرس فارسی کی ضرورت ہوئی میں نے بھی درخواست دے دی اور میرے لیے پروانہ تقرر بھی آگیا۔ اس زمانہ میں مولوی سید نجم الحسن صاحب مجتہد مدرسہ عالیہ کے ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے صاحب زادہ مصطفیٰ علی خان صاحب سے کہہ کے مجھے جانے نہ دیا۔ یہ صاحب زادہ اس زمانہ میں کل سررشتہ تعلیم ریاست کے اعلیٰ آفیسر تھے۔

تئیس سال تک درجہ منشی فاضل کو پڑھاتا رہا۔ اسی سن میں پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں درجہ منشی فاضل کی مدرسی کے لیے ایک وانٹ شائع ہوئی۔ بہتر درخواستیں آئیں ان میں ایک میری بھی تھی۔ وائس پرنسپل خان بہادر مولوی محمد شفیع صاحب ایم اے کینٹب نے ان میں سے چار کو منتخب کیا۔ ایک حافظ محمود شیرانی جو اسلامیہ کالج لاہور میں پرشین لکچرر تھے۔ دوسرے مولوی محمد سبطین صاحب جو لدھیانہ انٹر کالج میں اب بھی پروفیسر ہیں۔ تیسرے مولوی عبدالعزیز اسیف میمن راجکوٹی۔ جو میرے شاگرد ہیں اور باضابطہ مدرسہ عالیہ رامپور کے درجہ منشی فاضل میں داخل ہو کر مجھ سے پڑھے ہیں اور منشی فاضل پنجاب کا امتحان فرسٹ میرٹ کے ساتھ پاس کیا ہے۔ اس وقت اورینٹل کالج میں ایڈیشنل مدرس تھے اُن کو اور نیز مجھے منتخب فرمایا مگر وولنر صاحب پرنسپل نے میرے لیے رپورٹ کی اور میرا تقرر ہو گیا۔ ۱۷ر ستمبر ۱۹۲۳ء کو میں نے چارج لے لیا۔ پندرہ سال میں نے وہاں ملازمت کی۔

جناب محمد شفیع صاحب ہر سال میٹرک کی زبان عربی یا فارسی کا ممتحن بنواتے رہے۔ اور کبھی ادیب فاضل کے کسی پرچہ کا ممتحن کر دیا۔ ایڈڈ ممبر آف سنڈیکیٹ بھی انھیں نے بنایا۔ پھر ایم اے فارسی کے پرچہ نثر کا لکچرر

کرا دیا۔

سینتالیس برس کی عمر میں اس کالج میں گیا تھا پچپن سالانہ کی قید سے مجھے صرف آٹھ سال ملازمت کرنا ہوتی مگر پرنسپل وولنز صاحب نے دو سال ملازمت کے بعد ہی۔ میری مدت ملازمت کو ساٹھ سال کی عمر تک کے لیئے کرا دیا۔ جب ساٹھ سال کی میری عمر ہو جانے کو تھی کہ وولنز صاحب کا انتقال ہو گیا اور مولوی محمد شفیع صاحب پرنسپل ہو گئے تو انھوں نے دو سال اور بالکل خلاف اصول اسپیشل کیس میں بڑھوائے اس توسیع کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا گیا کہ کوئی دوسرا اس سے تمسک نہیں کر سکتا ہے۔

وہاں سے جب میں ریٹائرڈ ہو کر یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء کو دوبارہ رامپور میں آ گیا تو یہاں آنے کے بعد بھی منشی فاضل کے چھٹے پرچہ یعنی مضمون کا ہیڈ اگزامنر۔ اور مولوی عالم کے چھٹے پرچے یعنی عربی کا پیپر سیٹر اور اگزامنر انھیں نے بنایا۔ میں ان کے احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا ہوں۔ تا زندہ ایم بندہ ایم۔

پرنسپل کے دفتر کے ہیڈ کلرک این این مترا کا بھی ممنون ہوں کہ جو کارروائی میرے بارے میں وہاں ہوتی تھی اُس کی وہ مجھے اطلاع دیتے تھے۔ جب انٹرویو کے لیے مجھے بُلایا گیا تو میرا ارادہ تھا کہ میں اپنی تصویر اور تالیفات بھیج دوں کہ اُن سے اندازہ کیا جائے۔ مگر ان بابو نے لکھا کہ ضرور آؤ کیوں کہ تمہارا کیس امید افزا ہے۔

اورینٹل کالج سے ریٹائر ہونے سے پہلے ۲۸ر اگست ۳۸ء کو شاد مان مرحوم کا انتقال ہو گیا تھا۔ مولوی للن صاحب کی تحریک سے مجھے یکم ستمبر کو تار کے ذریعہ سے بلایا گیا۔ اور میں ۵ر ستمبر کو کوہ منصوری پر اعلیٰ حضرت ہز ہائنس نواب سید رضا علی خان صاحب رئیس رامپور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حکم ہوا کہ بے چون وچرا چلے آؤ۔ میں نے ترک تعلقات لاہور کرنے کے لیے ایک ماہ کی اجازت مانگی جو عطا ہوئی۔ میں نے ۲ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو دوبارہ اپنی پہلی پوسٹ پرشین پروفیسری کا چارج لے لیا۔

میرے لاہور چلے جانے کے بعد پنجاب کے امتحان میں حدود کی قید اور داخلہ کی دقت کی وجہ سے مدرسہ عالیہ میں بجائے منشی فاضل وغیرہ کے الہ آباد کے امتحانات منشی اور کامل کی تعلیم ۱۹۲۶ء سے جاری ہو گئی تھی جو اب بھی ہے۔

دوبارہ آنے پر چونکہ میری عمر سرسٹھ ارسٹھ برس کی تھی اس لیے اعلیٰ حضرت نے مجھے قید عمر سے مستثنیٰ کر کے مرتے دم تک کے لیئے رکھا۔ جو تنخواہ مل رہی ہے اسے میں وظیفہ دعاگوئی سمجھتا ہوں۔ اب مجھے یہیں رہنا اور یہیں مرنا اور گڑنا ہے[۱]

---

[۱] ۱۹۴۸ء میں رامپور میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہیں۔

## تاہل

لکھنؤ کے چہاردہ سالہ قیام میں ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ مجھے کوئی وثیقہ دار عورت مل جاتی۔ کانپور کے ایک وکیل نے بھی اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے چاہی مگر اپنے دیہاتی خیال کی وجہ سے اس کی طرف راغب و مائل نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے حدیث میں ہے۔ النسب فی القربیٰ میرے چچا سید تجمل حسین صاحب مرحوم کی لڑکی کے ساتھ میری والدہ نے نسبت کر رکھی تھی جسے ٹھیکرے کی منگیتر کہتے ہیں۔ چوں کہ میری کوئی مستقل آمدنی نہ تھی اس لیے مناکحت میں تاخیر کر رہا تھا۔ جن نوکریوں کا میں نے ذکر ۱۹۰۰ء سے پہلے کا کیا ہے وہ کوئی اعتباری نہ تھیں۔ لیکن کہاں تک کسی کو منتظر رکھتا آخر کار مجبوراً ۱۹۰۰ء میں بلا ملازمت مستقل شادی کر ہی لی۔ اگرچہ اس زمانہ میں ٹیوشن پر بسراوقات تھی۔

لکھنؤ کے قیام اور جوانی کی وجہ سے شادی سے پہلے اپنی ہمشیر کی ایک ماما سے تعلق معلیان پیدا کر لیا وہ ذات کی کہاری تھیں اور واجد علی شاہ کے یہاں مٹیابرج میں نوکر رہ چکی تھیں، کبھی رنڈی بازی نہیں کی چاہے ناداری کی وجہ سے سمجھو اور چاہے اس لیئے کہ ادھر میلانِ طبع نہ تھا۔ ۱۸۹۳ء میں جب ہمشیر سے الگ رہتا تھا یہ تعلق پیدا ہوا۔

## اولاد

ممتوعہ بی بی سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اگرچہ ان کے پہلے شوہر سے ان کی ایک لڑکی تھی۔ منکوحہ بی بی سے ایک حمل تین ماہ کا اور دوسرا سات ماہ کا ساقط ہوا۔ تیسری حمل سے ایک لڑکی پورے دنوں کی ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئی اور دو سال کی عمر میں اُس کا انتقال ہوگیا۔ اس لڑکی کی پیدائش کے بعد ہی منتقلی کورس (حیض) بند ہوگیا اور قابلیت استقرار حمل ہی باقی نہ رہی۔ اولاد کی تمنا نہ تھی۔ اس لیے محض خواہش اولاد میں کوئی اور عورت نہ کی اگرچہ بعد میں اتنی استطاعت ہوگئی تھی کہ اور عورت کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا۔

زوجہ کی طرف سے میں بہت بدقسمت واقع ہوا ہوں ممتوعہ بی بی نقشہ کی درست اور نہایت سیاہ فام تھیں۔ جن کا انتقال ۱۹۲۹ء میں میری شادی شدہ بھانجی کے گھر ہوا۔ کیوں کہ وہ اپنی لڑکی کے غم میں دق کی بیمار ہوگئی تھیں۔ علاج کے لیئے میں نے لاہور سے انھیں لکھنؤ بھیج دیا تھا۔ امام باڑہ جناب عفران مآب میں دفن ہوئیں۔ میری راحت کی خواہاں دونوں ہوئیں۔

منکوحہ بی بی کی عمر اس وقت چھیاسٹھ سال کی ہے اور بقید حیات ہیں گلو کوما کا اُن کو مرض ہے۔ ایک

آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ دونوں کا آپریشن ہوا داہنی آنکھ میں بینائی نہ آئی۔ بائیں میں رمقے ہے۔ مگر اٹکل نہ ہونے کی وجہ سے مثل نابینا ہیں اور ان کو چلنا پھرنا بھی دشوار ہے۔ اور کوئی کام نہیں کرسکتی ہیں۔ جسین بالکل نہیں۔

ممتوعہ بی بی بدمزاج تھیں مگر مجھے راحت پہنچانے کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ منکوحہ بی بی بہت سیدھی اور کم عقل ہیں۔ ان کو زمانہ نوح میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اگرچہ یہ بھی میری راحت کا خیال رکھتی ہیں۔ مگر کم سمجھ ہونے کی وجہ سے ایک مدت دراز کے ساتھ ہونے کے ہوتے ہوئے میرے مزاج کو نہ سمجھ سکیں۔ اور بغیر کہے میری کسی خواہش کو پورا نہیں کرسکتی ہیں۔ دونوں کے ساتھ مجھے ساری عمر تحمل سے کام لینا پڑا۔

حتی الامکان اپنی ضروریات کو آپ پورا کرلیتا ہوں۔ اور جہاں تک ہوسکتا ہے کسی سے اپنا کام لینا پسند نہیں کرتا۔

## اخلاق وعادات

نہ مجھ میں کوئی بات ہے۔ جیسا کہ میری تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر فخر کس بات پر کروں ایک تھوڑی سی فارسی جانتا ہوں سو اس کا یہ حال ہے کہ غیر زبان کبھی کسی کو آیا ہی نہیں کرتی ہے خصوصاً جب کہ استاد اہل زبان بھی نہ ہو اور ملک میں قیام بھی نہ ہوا ہو۔ ہاں زبان آموزوں میں اندھوں میں کانا راجہ کا مرتبہ کسی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ یہی ادب و انشا پردازی ہی ایسی چیز ہے جو دو عمریں پاتے پر بھی ایک جاہل اہل زبان کے برابر کوئی نہیں ہوسکتا ہے۔ دیگر علوم وفنون میں بڑے بڑے علما وفضلاء سلف سے بڑھ جانا ممکن ہے۔ لیکن اللہ نے جو اخلاق وعادات حسنہ مجھ میں ودیعت از روئے فطرت رکھے اور عطا فرمائے ہیں ان کا ظاہر نہ کرنا ایک قسم کی ناشکری ہوگی اس لیے ان کا اظہار اظہار امتنان و تشکر ہوگا لہٰذا انھیں ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تعصب میرے پاس پھٹکنے نہیں پاتا ہے۔ ظاہر ہے جو دوسرے اہل مذاہب کے لیے بہشت میں جگہ تجویز کرتا ہو وہ کسی سے تعصب کیوں کرنے لگا۔

جس حالت میں رہا کبھی کسی سے دو پیسے بھی قرض نہیں لیے۔ مگر فضل خدا سے ایک وقت کا فاقہ بھی نہیں کرنا پڑا۔ سینتالیس سال ہونے کو ہیں کہ طلبا کو رامپور اور لاہور میں پڑھا رہا ہوں۔ اور تقریباً چھ سال ان سے پہلے لکھنؤ میں پڑھاتا رہا۔ علاوہ اپنے فرض منصبی کے گھر پر طلبہ کو پڑھایا اور کوئی صلہ قلیل یا کثیر کبھی کسی سے نہ لیا۔ البتہ لاہور میں صرف تین امرازادوں سے صلہ ملا ہے ایک سے ایک سال تک اور دو سے تین تین ماہ تک۔ علاوہ تعلیم نادار طلبہ کو پیسے بھی دیئے۔ ایک آدھ کو وظیفہ بھی اپنی استطاعت کے موافق دیتا رہا ہوں۔ بعضوں کو کھانا کھلاتا رہا۔ ان طلبہ یا کسی دوسرے نے مجھ سے رقم قلیل یا کثیر لی اور انھوں نے ادا نہ کی تو کبھی تقاضا بھی نہ کیا۔ ایسا روپیہ تقریباً تین سو ہوگا۔ رامپور کے طلبہ عید یا بقرعید میں کبھی حصہ تک نہیں بھیجتے اور مجھ سے مٹھائی کے خواہاں ہوتے ہیں۔

اعزہ کی اعانت مدت دراز سے ماہانہ کر رہا ہوں۔ اور بعض کو ساتھ رکھ کر برسوں سے اُن کا کفیل ہوں۔ جس کسی سے شناسائی ہوگئی۔ اس سے کبھی رنجش یا ملال نہ ہوا۔ تواضع وانکسار اپنا شعار ہے، خندہ پیشانی سے پیش آنا اپنا کار ہے۔ جو کام مجھ سے ہو سکتا ہے کبھی اس کے کرنے سے انکار نہیں کیا۔

جس کسی نے کسی قسم کی بدسلوکی کی انتقام کا خیال بھی باوجود قدرت کبھی نہ پیدا ہوا۔ شادمان مرحوم کی زوجہ کے لیے ہوم صاحب بہادر سے سفارش کی اور وہ وظیفہ پاتی ہیں۔

## شاعری

لکھنؤ کے قیام میں جب ۱۸۹۲ء میں انگریزی تعلیم ترک کی تو شاعری کی سوجھی۔ جناب سید محمد اصطفیٰ صاحب خورشید کو جو خاندان اجتہاد کے ایک معزز فرد اور جناب ماہر کے داماد تھے اُن کی شاگردی اختیار کی۔ اس سے پہلے ان کا ذکر آچکا ہے۔ وہ جناب سید محمد جعفر صاحب پدر سید بندہ کاظم صاحب جاوید کے شاگرد تھے اور خود جاوید کے استاد۔ اور انیسؔ آغا ہجو صاحب ہندی کے شاگرد تھے۔ جناب ہندی نواب عاشور علی خان برادر نواب سعادت علی خان شاہ اودھ کے شاگرد اور ان کے خاندانی تھے۔ عاشور علی خان کسی کے شاگرد نہ تھے میرا سلسلہ شاعری انھیں پر ختم ہو جاتا ہے۔

ساٹھ ستر سے زیادہ غزلیں نہیں کہیں۔ جناب ذوقؔ کی ایک غزل ؎

عہد پیری شباب کی باتیں  ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

پر تخمیس کی ہے۔ چوں کہ کلام حضرت غالبؔ بہت پسند تھا اس لیے زیادہ تر انھیں کی طرحوں میں بکا ہے۔ دس برس تک کبھی کبھی بکواس کرتا رہا۔ اس کے بعد سمجھ میں آگیا کہ میری فطرت شاعرانہ نہیں اس لیے اسے ترک کر دیا۔

اب تک لوگ، مکان، مسجد، شادی بیاہ اور اسم تاریخی کی مجھ سے خواہش کرتے ہیں اُن کی خاطر سے کچھ دماغ سوزی کر لیتا ہوں۔ تاریخیں کوئی تین چار سو کہی ہوں گی زیادہ تر صوری و معنوی ہیں۔ چوں کہ ان میں کوئی خوبی نہیں ہے اس لیے صرف ایک ہی کے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں جو برج نرائن چکبستؔ کی وفات پر انھیں کے ایک شعر کی کتر بیونت کر کے کہی تھی اور وہ صوری معنوی میں نہیں ہے۔ ان کا شعر ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترکیب  موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

جو مصرعے لگائے تھے وہ یاد نہیں اور میں نے اپنی بکواس کو جو جمع کیا تھا وہ میرے پاس نہیں رہا۔ اور تاریخیں تو کبھی جمع بھی نہیں کیں، جس نے فرمائش کی اسے کہہ کر دیدی۔ مصرع تاریخ جو یاد رہ گیا ہے یہ ہے:

"ہے حد مرگ عناصر کا پریشان ہونا"

حد کے معنی لغوی انتہا کے علاوہ اصطلاح منطق ہیں۔ تعریف کسی شئی کی وہ وصف ایسے معنی کو محیط ہو جو دوسری چیزوں سے اسے ممتاز کر دے۔ اوروں نے یوں بھی تعریف حد کی ہے کہ تعریف الشئی بالذات جیسے انسان کی تعریف حیوان ناطق کے ساتھ۔ چک بست کا شعر مذکور لکھنؤ میں بہت مشہور ہے اور بہت پسند کیا جاتا ہے۔

## خمخانہ جاوید

لالہ سری رام صاحب رئیس دہلی نے ایک ضخیم تذکرہ شعرا اردو گو کا کئی جلدوں میں شائع کیا ہے اور ابھی ناتمام ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کر گئے ہیں جس کے متولی یا کچھ اور جناب پنڈت برج موہن صاحب کیفی ساتریا مشہور انشا پرداز دہلی ہیں۔

اس خمخانہ کی تیسری یا چوتھی جلد میں میرا تذکرہ بھی ہے۔ لالہ صاحب کو جو کچھ کسی سے میرے حالات معلوم ہوئے ہیں وہ لکھ دیئے گئے ہیں۔ میرے ایک ننھیالی جد سید نظام الدین المتخلص بہ مدہ نائک ہندی کے شاعر تھے اور علم موسیقی میں نائک کا مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کا زمانہ حیات سلطنت عالم گیر کا ہے۔ اُن کے نام کے آگے لفظ (اولیا) بڑھا کر مجھے سیادت سے الگ کر دیا۔ پھر میری ایک غزل کے دو مطلع یہ تھے۔

سب اُس کی برشِ تیغ نظر کو دیکھتے ہیں ۔ یہ لوگ کیوں نہیں میرے جگر کو دیکھتے ہیں

غلط ہے یہ میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں ۔ سب اس بہانہ سے ان کی نظر کو دیکھتے ہیں

ان دونوں مطلعوں کا ایک ایک مصرع لے کر ایک مطلع یوں بنایا ؎

غلط ہے یہ مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں ۔ سب اُس کی برشِ تیغ نظر کو دیکھتے ہیں

یہ بھی لکھ دیا کہ شاداں کو اپنے اس مطلع پر بڑا ناز ہے۔ حالاں کہ فخر اور ناز کو اپنی عمر میں کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ اس کے بعد یہ بھی لکھ دیا کہ مطلع کے اچھے ہونے میں شک نہیں۔

پھر اسی غزل کا یہ تیسرا مطلع تھا۔

نگاہ لطف تمہاری جدھر کو دیکھتے ہیں ۔ تمہارے چاہنے والے ادھر کو دیکھتے ہیں

اس پر تحریر فرماتے ہیں کہ شاداں کا ایسا محقق اور ایطا کہے۔

میں نے پہلے تو اساتذہ کے اشعار ادھر اُدھر، کدھر، جدھر کے سند میں پیش کیے ہیں اور ان میں ایطاء نہ ہونے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اگر ایطاء ہے بھی تو ایطا خفی ہے جس کا جواز ہوا ہے۔ ایرانی آب اور گلاب کا قافیہ بلا تامل کرتے ہیں۔ مولوی جامی کی مخزن اسرار کا آخری شعر یہ ہے ؎

مُہر نہ خاتمہ این کتاب　　　شد رقم خاتمہ تم کتاب

یہ دونوں جگہ کتاب لائے۔ ان کا خیال ہے کہ جب الفاظ کے معنی غیر ہو جاتے ہیں چاہے وہ قوافی مرکب ہی کیوں نہ ہوں پھر ایطا رکیوں ہو قافیہ کی تعریف میں یہی قید ہے کہ لفظاً یا معناً اُن کا باہمد گر جدا ہونا لازم ہے۔

مرشد زادۂ آفاق عالی جناب ولی عہد بہادر کی شادی کے وقت ایک سہرا بھی کہا ہے جو غالب کے سہرے کی طرح میں ہے۔

اب میں چند اشعار اپنی غزلوں کے لکھ کر سنت تذکرہ نویسی کو پورا کرتا ہوں۔ میرے پاس جو میں نے لکھا ہے ان میں سے ایک شعر بھی نہیں۔ چالیس پچاس اشعار غزل کے زبانی یاد ہیں۔ سہرا البتہ میرے پاس ہے چونکہ حال میں کہا ہے۔

میرے استاد جناب خورشید ایک رسالہ 'انتخاب' نامی سن اٹھارہ سو نوے اور انیس سو کے درمیان میں نکالا کرتے تھے۔ اس میں اکثر میری غزلیں چھپی ہیں۔

اگرچہ غزل مذکور بائیس اشعار کی تھی۔ اُن میں مطلعوں کے علاوہ ذیل کے تین اشعار اور یاد آتے ہیں۔

یہ جانتے تو نہ خوگر ستم کے یوں ہوتے　　　ہم اپنی آہ میں اب کچھ اثر کو دیکھتے ہیں

بہت ہی تھوڑی ہے دنیا میں عمر دو دن کی　　　دل اپنا دیکھ کے شمع سحر کو دیکھتے ہیں

کہاں تو دامن سفاک اور کہاں یہ رنگ　　　ہم اس رسائی خون جگر کو دیکھتے ہیں

ذیل کے دو شعر بھی طرح غالبؔ کے ہیں ؎

شکوۂ ظلم وستم اور ستم ایجاد نہیں　　　گھٹ کے ارمان نکلتے ہیں یہ فریاد نہیں

سامنے جاتا ہوں کیا اُن سے شکایت میں کروں　　　اس قدر ظلم اٹھائے کہ مجھے یاد نہیں

"سامنے جاتا ہوں" کے الفاظ رکھ کر اپنے مہمل خیال میں یہ مطلب بھی نکالا ہے کہ اُن کی صورت دیکھ کر سب شکایتیں بھول جاؤں گا۔

ذیل کے اشعار بھی جناب غالبؔ ہی کی طرح میں ہیں :

میری اُن کی حالتیں فرقت میں یکساں ہوگئیں　　　یاں طبیعت بگڑی واں زلفیں پریشاں ہوگئیں

میری بزم تعزیت میں کونسا ہوگا بناؤ　　　جب ابھی سے آپ کی زلفیں پریشاں ہوگئیں

یہ غزل بھی اٹھارہ بیس اشعار سے کم نہ تھی مگر یہی دو شعر یاد آتے ہیں۔

جناب داغؔ مرحوم کا ایک شعر یہ ہے ؎

پوچھ لیتے ہیں یہی رسم ہے جلادوں میں　　　میرے قاتل نے نہ پوچھا تری حسرت کیا ہے

---

اس طرح میں غزل کہی تھی صرف دو تین شعر یاد آتے ہیں ؎

پھر مجھے وعدۂ خلافی کی شکایت کیا ہے
وہ تو واقف ہی نہیں ہیں شب فرقت کیا ہے

یوں تو کہتا ہوں کروں گا میں شکایت اُن سے
سامنے ہو تو ہو معلوم شکایت کیا ہے

ایک جگہ مجمع عشاق کا ہو جاتا ہے
حشر کہتے ہیں کسے اور قیامت کیا ہے

ایک غزل کا ایک شعر یہ بھی یاد آتا ہے ؎

نہیں ٹپکتے ہیں پیہم یہ خون کے قطرے
ہمارے حال پر روتا ہے تیرا خنجر بھی

ایک شعر یہ بھی ہے۔

وصل کی شب کسی کو تڑپانا
شرم جانے تری حیا جانے

زیادہ بک بک کر کے کیوں ناظرین میں الضجار اور تکدر پیدا کروں۔ یہی انتشار خاطر کے لیے کیا کم ہے:

سہرا عالی جناب مرشد زادۂ آفاق حضرت ولی عہد بہادر کے نام کا یہ ہے

لاریب ہیں ولی خدا مرتضیٰ علی

سہرا طرح غالب میں جو کہا تھا وہ یہ ہے: یہ ۱۹۴۶ء کی بکواس ہے۔

# سہرا

بولے اٹھتا ہے ولی عہد کے سر پر سہرا
میرے شہزادہ کا بیشک ہے سخنور سہرا

جب کہ باندھا گیا شہزادہ کے سر پر سہرا
حسن و خوبی کا اُسی کے ہی رہا سر سہرا

ہے بندھا آج ولی عہد کے سر جو سہرا
میرے سرکار کے اس کام کا تھا سر سہرا

پھر یوں جامہ میں سماتا نہیں رُخ پر سہرا
ہے سزاوار طرب اس سے بھی بڑھ کر سہرا

رخ روشن پہ تہ بازو گوہر سہرا
ماند کرتا ہے فروغ مہ و اختر سہرا

چہرہ گر چاند ہے، مجمع اختر سہرا
چرخ اطلس کے لیے ہو گیا زیور سہرا

لڑیاں گر تار شعاعی ہیں تو چہرہ خورشید
روئے زیبا پہ بندھا ہو گیا بہتر سہرا

منھ پہ چڑھتا ہے ولی عہد بہادر کے
رستم و زال سے جرأت میں ہے بڑھ کر سہرا

جب کھلا ہوتا ہے برقِ سفرِ طور اس کو کہو ہوتا ہے عقدِ ثریا پہ سمٹ کر سہرا
میرے نوشہ کے مقابل نہیں ابرِ نیساں ہے وہ گمرا ابرِ کرم بارشِ گوہر سہرا
پار ہو جائے گا مخلوق کا بیڑا اس وقت کشتیِ نوح کا بیشک ہے یہ لنگر سہرا
مہرِ شہرہ کے شب عقد چھپا مغرب میں کیوں نہ ہو نور میں ہے شمس سے بڑھ کر سہرا
تاج ہے روز کی چیز اور یہ نادر کم ہا ہے اس لیے لے گیا ہے تاج سے نمبر سہرا
آیۂ نورِ علیٰ نور ہے صادق اس پر روئے انور پہ ترے جو ہے منور سہرا
ہمسری کرتا ہے دولہا کے قدِ بالا کی اسے چھوٹا نہ کہو گرچہ ہے گز بھر سہرا
زلفِ نوشاہ کو نیسان کا بادل سمجھو ذات سے اپنی ہے یہ بارشِ گوہر سہرا
زورِ شہ تارِ بریشم کا معین ہے جب تو متحمل ہے گرانباری گوہر سہرا
سو ا ہر نفس انداز سے باہر ہے ضرور باندھا بہنوں نے جو نوشاہ کے سر پر سہرا
ہو مبارک تمہیں سرکار و جناب علیا یہ ولی عہد بہادر کا بصد فر سہرا
سایۂ رب میں ولیعہد پھلیں اور پھولیں ہو سعید ان کو یہ عقد اور یہ دلبر سہرا
طرحِ غالب میں قلم تم نے اٹھایا شاداں ان کے سہرے سے تو ممکن نہیں بہتر سہرا

کوئی شاعر نہیں شاداںؔ پہ تعجب کیا ہے
مدح ممدوح سے ہو جائے یہ بہتر سہرا

اب شاعری سے اتنا اور تعلق باقی ہے کہ کسی کتاب کی شرح لکھتے وقت اس کے اشعار کا ترجمہ اگر جی چاہتا ہے تو نظم میں کر دیتا ہوں وہ بھی پھُس پھُسے ۔

## مذہب

بانیانِ مذہب، پابندی کی علت، انسان کے ۔لئے اُس کی عقل کو قرار دیتے ہیں، اگر کوئی شخص فاتر العقل اور دیوانہ ہو جائے تو اس پر سے تعالیٰ فرائض ساقط ہو جاتے ہیں ۔
پہلا اصول ہر مذہب کا ذات اللہ ہے ۔ کنہ اور حقیقت نے ذاتِ الٰہی کے لئے کہتے ہیں کہ اس میں غور و فکر نہ کرو کیوں کہ یہ امر ما فوقِ عقلِ انسانی ہے ۔ پھر فرماتے ہیں کہ صفات عینِ ذات ہیں ۔ کوئی کہتا ہے نہ عین ہیں اور نہ غیر جیسے گلاب میں خوشبو ۔
مگر عقلِ انسانی کہتی ہے کہ صفات وجودِ خارجی نہیں رکھتے ہیں بلکہ کسی موصوف میں ہو کر پائے جاتے ہیں ۔

اور موصوف بالائے عقل ہے پھر مجھ ایسا آدمی کیسے سمجھے گا گی باتیں اسی کی فرع ہیں۔
لہٰذا میں اپنی سمجھ کے موافق کہہ سکتا ہوں کہ مذہب عقلی چیز نہیں۔ بلکہ مذہب نتیجہ تمدن کا نام ہے۔
چنانچہ گاؤں کے رہنے والے صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں یا ہندو۔ وہ نبی، ائمہ اور خلفاء کے نام تک نہیں جانتے ہیں۔
یہ بھی اہل مذہب کا قول ہے کہ جو شخص تحقیق مذاہب کرتے کرتے مرجاتے اور کسی فیصلہ اور نتیجہ تک نہ پہنچے وہ ناجی ہو سکتا ہے۔ میں اس پر اتنا اضافہ اور کرتا ہوں کہ اگر وہ فیصلہ غلط بھی نکالے تب بھی ناجی ہو سکتا ہے۔
کیوں کہ اللہ نے جو اسے عقل دی تھی اسے اس نے صرف کیا۔ اور اسی کی عقل باعث تکلیف تھی نہ اس کے لیے کسی دوسرے کی عقل۔ جو مجبور نہ ہو وہ عقلاً معذور رہوتا ہے۔ برخلاف مقلد کے کہ اگر وہ راہ راست پر نہ ہو تو اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے مجھے مولوی اختر علی صاحب تلہری کا یہ مقولہ پسند ہے کہ کفر تحقیقی ایمان تقلیدی سے بہتر ہے۔
دنیا میں زیادہ تر مذہب لوگوں کا آبائی ہوتا ہے بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کا مذہب تحقیقی ہو اصول مذہب کے ادلہ ایسے ہونا چاہئیں جو ایک جاہل بھی سمجھ سکے ۔ تسلسل وغیرہ کو ایک جاہل بچارہ کیا جانے۔
جب مذہب کو عقلی نہ کیا جائے۔ اور یومنون بالغیب پر اس کی بنیاد رکھی جائے تو پھر مجھے ذرا بھی اختلاف نہیں۔
اور وہ تمام باتیں مانتا ہوں جو مذہب والے مانتے ہیں۔
بلوغ سے پہلے سے نماز اور روزوں کا پابند تھا ایک سال کے روزے بلوغ سے پہلے رکھے۔ نماز فجر بھی عین جوانی میں پڑھتا تھا۔ سر پر پٹے تھے ان میں طہارت اور نجاست کے خیال سے تیل نہیں ڈالتا تھا۔ یہ حالت پچیس برس کی عمر تک رہی۔ پھر یہ چیزیں گنڈے دار ہو گئیں، کیوں کہ خیالات میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر یہ فرائض بالکل ترک ہو گئے۔ اپنے کو آثم و عاصی و جانی سمجھتا ہوں۔ اور محبت اہل بیت کو وسیلہ نجات قرار دیتا ہوں اور خدا کو عادل و غفور الرحیم مانتا ہوں۔
کیا عجب ہے کہ یہ رباعی میری میرے آڑے آئے۔

| | |
|---|---|
| بر چہرۂ دین ز خون زگائے کردی | از ذبح عظیم یادگارے کردی |
| فائز شدہ از تو بر شہادت احمدؐ | واللہ کہ اے حسینؑ کارے کردی |

اہل مذاہب دوسرے مذہب والے کو دوزخی جانتے ہیں۔ مگر میں ہر مذہب والے کو اگر وہ غرض تخلیق کو پورا کر رہا ہے تو ناجی سمجھتا ہوں۔ جو غلط راستہ پر چل رہا ہے وہ بیمار نادانی ہے اور قابل رحم۔ عقلی طور سے غرض تخلیق تعاون ہے اور تعاون پر بقائے انسانی ہے۔ کیوں کہ انسان بھی بعض حیوانات کی طرح اجتماعی زندگی بسر کرنے والا ہے۔

ایک دوسرے کی اعانت پر چاہے اختیاراً ہو یا اضطراراً اس کی بقا موقوف ہے۔

## خطاطی

میر احمد حسن صاحب حسینی ریاست رامپور کے کتب خانہ میں ملازم تھے مگر اصلاً باشندۂ لکھنؤ تھے اور پہلے میر عوض علی صاحب ملیح آبادی کی شان لکھتے تھے جو رامپور میں رائج ہے میر صاحب موصوف نواب کلب علی خان صاحب کے زمانہ میں ملیح آباد سے تشریف لائے تھے۔

میر احمد حسن صاحب نے ملازمت کتب خانہ کی وجہ سے۔ میر عماد خوشنویس کے قطعات پر شان میر عماد کی مشق کی اور اپنے وقت میں اس شان کے لکھنے والے ہندوستان بھر میں ایک تھے۔ میں نے شان میر عماد کو اُن سے کچھ جیسے سیکھا۔ عملاً تو خوشنویس نہیں ہوا مگر نگاہ سے کچھ اچھا بُرا دیکھ لیتا ہوں۔ جلی میں برائے نام بوخوشنویسی کی ہے خفی میں بالکل نہیں۔ صرف مالیقری لکھتا ہوں گھسیٹ یا شفیعہ لکھنا نہیں آتا ہے۔ میر احمد حسن صاحب مرحوم اپنے کلام نظم فارسی و اُردو میں مجھ سے مشورہ لیتے تھے۔

## تالیفات

میری تیس تالیفات چھپ چکے ہیں۔ وہ کتب نصاب پنجاب یونیورسٹی یا درسی کتابوں کی فرہنگیں، شرحیں مع مقدمہ ہائے بسیط و لائف مصنفین اور خلاصے ہیں اور تراجم ہیں، جیسے درہ نادرہ مع تصحیح و تحشی۔ فرہنگ کمل حاجی بابا۔ و مرزخسیس و وکلائے مرافعہ۔ ترجمہ دفتر سوم ابوالفضل و مقامات بدیعی۔ شرح بعض قصائد خاقانی و قاآنی ـ د فرہنگ دیوان فرخی وغیرہ۔ اور یہ شرح دیوان غالب الکیسویں ہے۔ فرہنگ تاریخ وصاف جلد اول بھی مطبوعہ ہے۔

آج کل کی اصطلاح کے موافق اوریجنل ایک بھی نہیں۔ مضامین رسالہ تہذیب رامپور، مخزن، اورینٹل کالج میگزین لاہور میں بکثرت چھپے ہیں۔ سب ادبی یا ادب ہی سے متعلق ہیں۔ مگر ان کو مضمون کہنا مضمون کی توہین کرنا ہے۔

ایک فرہنگ الفاظ جدید فارسی کی ۱۳۵۶ھ میں شروع کردی تھی اور بتیس ہزار الفاظ الف کے الف میں حتیٰ کر (ی) تک کے جمع کر لیے ہیں مگر ابھی الفابیٹکل آرڈر میں نہیں۔ ان کی انگریزی بھی لکھ لی ہے۔ اعراب اور ان کے مترادفات اُردو لکھنا باقی ہیں۔ اور بتیس ہزار کا مصالحہ اور مواد بھی متفرق پاس ہے مگر میں اب اس کی تکمیل بوجہ ضعف پیری نہیں کرسکتا ہوں۔ اور ارادہ تھا کہ اس کام کو اپنے بھانجے مولوی سید رضی بدقت اجتہادی المعروف بہ حسن اختر سپرد کروں گا۔ وہ چار سال تک طہران اور مشہد میں رہ چکے تھے۔ اور خود انھوں نے بھی کئی ہزار الفاظ جدید فارسی کے جمع کیے تھے۔ مگر افسوس کہ وہ مجھ سے پہلے ۱۹۴۶ء میں چل بسے اور مجھے داغ دے گئے۔ اب میرے مرنے کے بعد جس کسی کے ہاتھ

لگے گا اور وہ ادبی آدمی ہوگا تو اس کی تکمیل کرے گا۔ میں اسے نامکمل چھوڑتا ہوں۔

علاوہ تالیفات مطبوعہ جن کا ذکر اوپر ہوا۔ میرے پاس جو دو ڈھائی سو کتابیں ہیں اور اُن میں سے جتنی میں نے دیکھی ہوں کوئی ایسی نہیں جس کی میں نے تحشی اور تصحیح نہ کی ہو ان میں سے جناب قدر بلگرامی کی قواعد العروض بھی ہے کہ جس پر بکثرت میرے حواشی لکھے ہوئے ہیں۔ منطق الطیر اور قصائد ظہیر فاریابی وغیرہ کی بھی تصحیح و تحشی کی ہے۔ رقعات جو میرے پاس ہیں چاہے وہ عربی و فارسی و اُردو کے ہوں یا انگریزی کے میرے افادہ و اضافے سے خالی نہیں۔

## مقولات

مذہب سے الگ اپنی سمجھ کے موافق۔ روح کو نتیجہ ترکیب جسمانی کہتا ہوں۔ نطفۂ حیوانی جسے SPERM SEMEN کہتے ہیں وہ ایک جاندار جرثومہ ہے عورت کے خلیہ CELL ، فرنساوی CELLULE سے مل کر رحم زن میں پرورش پاتا رہتا ہے۔ طوراً بعد طور جیسے ترکیب بدلتی جاتی ہے احساسات میں بھی فرق پڑتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شکل انسانی قبول کر کے رحم مادر سے نکل کر جیسی جیسی ترقی جسمانی کرتا جاتا ہے احساسات و ادراکات میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہ دلیل اس امر کی ہے کہ ترکیب جسمانی کا نتیجہ روح ہے۔ ورنہ جب روح بسیط اور جسم سے کوئی الگ شئے اگر ہوتی تو ہر حالت جرثومہ مضغہ و جنین و طفل ہونے میں ادراکات و احساسات یکساں ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے گھڑی میں رقاص۔ کھڑی۔ فرسٹ وھیل، سکنڈ وھیل سنٹر وھیل کے ساتھ مین اسپرنگ لگا کر کوک بھر دی جائے تو اس میں ایک آواز ٹک ٹک کی پیدا ہو جاتی ہے مگر گھڑی بھر میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ جب کسی پرزے میں نقصان آ جاتا ہے تو وہ ٹک ٹک ندارد ہو جاتی ہے۔ یہی حال روح کا ہے۔

اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو کیا انسان کو عبث پیدا کیا ہے۔ نہیں جیسے دیگر حیوانات و نباتات کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں یا اُن سے کوئی کام لیا جاتا ہے انسان بھی بقائے حیات کے لیئے تعاون کا کام کرتا ہے۔

مذہب نتیجہ تمدن کا نام ہے۔ جس مقام کا جتنا تمدن کم ہوتا ہے اتنا ہی مذہب دھندلا ہوتا ہے۔ ایک قسم جنون کی دیوانگی مذہب بھی ہے۔ اطبانے اسے نہ لکھا۔ یہ قسم لاعلاج ہے۔

اللہ نام علت العلل کا ہے۔ جس کا جو جی چاہے اس کا نام رکھ لے۔ مذہب جسے اللہ بناتا ہے وہ بھی براسہ نہیں بلکہ بالواسطہ خالق ہے۔ مواد میں قوت حرکت ہے۔ حرکت کی وجہ اتصال مواد ہوتا ہے اور چیزیں بنتی ہیں۔

اصل و حقیقت اشیا بعد تحلیل ایک ہی ہے۔ اسی کا نام وحدت وجود ہے۔ مثال کے طور پر زمین کی قوت نامیہ کو لے لو جب اس کا تعلق آم امرود۔ انگور اور رطب سے ہوتا ہے تو شیون مختلفہ دکھائی دیتے ہیں۔ جس پر کل یوم ھو فی شان دال ہے۔ ورنہ جو چیز ہے وہ قوت نامیہ ہے اسی لئے صوفی

لاموجود الا اللہ کہتے ہیں۔ میرے نزدیک صوفی اور مٹیریلسٹ کا نقطہ نظر ایک ہے۔ صوفی اُس پر مذہب کا رنگ چڑھا دیتے ہیں۔ کسی سے کسی قسم کی امید نہ رکھو اس صورت میں اگر کسی سے نیکی سرزد ہوگی تو شکر کا موقع ہاتھ آئے گا ورنہ شکایت کا۔

اللہ کو حکیم علی الاطلاق مانتے ہیں اور براسہ خالق کہیں تو جو اجسام صحیح و بے عیب و درست ہوں وہ تو حکیم کے بنائے ہوں گے۔ اور جو کانے اپاہج لنڈے پیدا ہوتے ہیں اُن کو کس نے بنایا۔ عالم ذر میں ارواح کی تخلیق چاہے کن فیکون سے ہوئی ہو مگر اب تو تدریجاً بنتے دیکھتے ہیں۔ سب سے سوءظن رکھو۔ اگر کسی سے دیانت یا انصاف عمل میں آئے آپ بھی

جو خود اچھے ہوتے ہیں۔ اُن کی نظر دوسروں کی بُرائی اور عیب پر نہیں پڑتی ہے اگر پڑتی بھی ہے تو مجبور فطرت سمجھ کر درگزر کرتے ہیں۔

ظالم ہونے سے مظلوم ہونا بہتر دونوں جہان میں ہے۔ ایک وقت میں دوانے برگ ممکن ہے ایک خیال پر چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا اکثروں کا قائم رہنا دشوار ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

آخری منازلِ حیات طے کر رہا ہوں۔ بواسیر خونی اور بادی اٹھارہ برس کی عمر سے ہے۔ حرکت قلب کا ایک سکنڈ کے لیئے بڑھنا اور پھر درست ہو جانا یہ بھی پندرہ بیس سال سے ہے۔ دس بارہ ماہ سے فتق (ہرنیا) بھی ہوگیا ہے۔ کٹریکٹ بھی ۲۵۔۲۶ سال سے ہے مگر ابھی چار اُنگل کے فاصلہ سے لکھ پڑھ لیتا ہوں۔ بائیں گردہ یا حوالی گردہ میں بعض اوقات خفیف سا درد رہتا ہے۔ تین چار ماہ سے ذیابیطس کے بھی آثار پائے جاتے ہیں۔ بائیں چڈھے میں داد ہے۔ اسباب مرگ مہیا ہو رہے ہیں۔ لادیستا خر دن ساعتم کا انتظار ہے۔

## بعض اسمائے تلامذہ

ڈاکٹر شیخ وجاہت حسین صاحب عندلیب شادانی لکچرر ڈھاکہ یونیورسٹی انھوں نے مدرسہ عالیہ رامپور کے درجہ منشی فاضل میں مجھ سے تعلیم پائی۔ بہت ذہین ہیں۔ علاوہ تھیسس کے جو ڈاکٹری حاصل کرنے کے لیئے لندن میں لکھا تھا بکثرت مضامین اور نظمیں اُن کی مختلف رسالوں میں شائع ہوا کرتی ہیں۔ جدت پسند شاعر بھی ہیں۔

مولوی عبدالعزیز میمن اسیف راجکوٹی عرف لکچرر علیگڈھ یونیورسٹی انھوں نے بھی باضابطہ درجہ منشی فاضل مدرسہ عالیہ میں داخل ہو کر پڑھا ہے۔ اور منشی فاضل اور مولوی فاضل دونوں میں فرسٹ میرٹ پر پاس ہوئے ہیں۔ مشن کالج پشاور اور اورینٹل کالج لاہور میں لکچرر رہ چکے ہیں۔ عربی کے بڑے ادیب ہیں۔ مشکل سے اقرار شاگردی کرتے ہیں۔ باوجودیکہ

حل المعضلات شرح معمیات حدایق البلاغہ میں ان کی تقریظ بھی ۱۹۱۱ء میں چھپی ہے۔ اور اس میں مجھے اُستاد کہا ہے۔

**مرزا محمّد ہادی عزیز لکھنوی** نے مجھ سے پڑھا بھی ہے اور شاعری بھی میری ہی شاگردی میں شروع کی۔ گل کدہ جو ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے اس میں اتنا لکھا ہے کہ عزیز نے درہ نادرہ اولاد حسین سے پڑھا۔ میرے نام کے ساتھ نہ میرا تخلص شادان ہے اور نہ لفظ بلگرامی۔ جب رامپور آنے لگا تو انھیں مولوی علی نقی صفی لکھنوی کے سپرد کر آیا تھا۔ مگر اُن کی شاگردی کے منکر تھے۔ میری شاگردی کا اقرار دو چار آدمیوں میں کر لیتے تھے۔ آخر عمر میں اپنا کلیات نظر ثانی کے لیے میرے پاس رامپور میں بھیج دیا تھا اور تمنا کی تھی کہ بعد تصحیح اسے میں سید میر آغا اشہر کے پاس جھانسی بھیجدوں۔ قریب نصف میں نے دیکھ بھی لیا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ میں نے پھر اسے اپنے پاس سے محصول ڈاک ادا کر کے اشہر کو بھیج دیا۔ اشہر کے پاس بھیجنے سے اُن کی غرض یہ تھی کہ وہ اس پر مقدمہ لکھیں گے۔ ان کے انتقال ہو جانے کی وجہ سے شاید انھوں نے مقدمہ نہیں لکھا۔ اس کلیات کے مدعی عزیز کے بہنوئی اور بیٹے ہوئے۔ جناب اشہر نے مولانا سید ناصر حسین صاحب مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دیا کہ جو مستحق ہو اسے دیدیں۔ سنتا ہوں کہ اب کتب خانہ ریاست محمود آباد میں ہے۔

آخر میں رباعیات کہنے کا شوق ہوا تھا۔ اور اصلاح کے لیے میرے پاس بھیجا کرتے تھے آخری قسط اب تک میرے پاس پڑی ہے۔

**سید محمد نقی شادمان** لکھنوی یہ کوئی امتحان پاس نہ تھے اور ان پر علاوہ تعلیم امداد زر کے بھی احسانات میرے تھے۔ یہ سب سے زیادہ ناخلف چار ناخلفوں میں تھے۔ اقرار شاگردی تو در کنار جب ان کا جی چاہتا تھا کسی سے مجھے اپنا شاگرد کہہ دیتے تھے۔ میری شرح قصائد خاقانی سے اختلاف اپنی شرح میں فرماتے ہیں۔ اس میں کوئی ہرج نہیں۔ میں معصوم نہیں ہوں جو غلطی نہ کروں۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی ہے۔ میرے لاہور چلے جانے کے بعد میری جگہ پر مدرسہ عالیہ رامپور میں ہو گئے تھے۔ مدرس درجہ عالم تو میں نے ہی بنوایا تھا۔

**شمس العلما مولوی تاجور صاحب** نجیب آبادی فاضل دیوبند پروفیسر اُردو دیال سنگھ کالج لاہور نے مجھ سے سفرنامہ ناصر الدین شاہ قاچار ایران پڑھا ہے۔ ممکن ہے کہ اب اقرار نہ ہو۔

**عبد الباقی** امروہوی یہ پہلے اودے پور کالج میں پروفیسر تھے اب لاہور میں ایک ادارہ کھول رکھا ہے اور ٹیوشن بھی کرتے ہیں۔ بعض اپنی تالیفات میں مجھے اُستاد کہا ہے مگر یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ میں شادان سے کیا پتلا موتا ہوں۔

**سید فرزند علی** رامپوری اُردو لیکچرر مشن کالج لاہور تعلیم یافتہ مدرسہ عالیہ رامپور۔

**غلام ناصر خاں** رامپوری منشی فاضل بی اے۔ ایس ای وی۔ ٹیچر آف گورنمنٹ ماڈل اسکول لاہور۔

**مولوی سید باقر علی خاں** لکھنوی نجفی لندنی فاضلین۔ گورنمنٹ انٹر کالج امرتسر۔

**مولوی سید محمد صاحب** دہلوی فاضلین مشہور واعظ۔

**مولوی افضال الحق صاحب** فرزند مولوی فضل حق صاحب رامپوری مشہور منطقی۔

**مولوی امجد علی خاں صاحب** رامپوری منشی فاضل، جج ہائی کورٹ رامپور۔

**محمد علی خاں صاحب** آنر پیش کار اسٹیٹ کونسل رامپور۔

**آقا بید ار بخت خاں** ایم اے۔ ایم او ایل پرنسپل دار العلوم الستہ شرقیہ لاہور مدت دراز سے یہ ادارہ کھول رکھا ہے۔ کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ سنتا ہوں کہ اب ہائی تعلیم انگریزی کی بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے ایم اے اور منشی فاضل دونوں درجوں میں مجھ سے پڑھا ہے۔

**مرزا محمد باقر سلمانی** نبیرہ جناب محمد حسین صاحب آزاد دہلوی انھوں نے بھی ایم اے میں مجھ سے تعلیم پائی۔

یوپی میں کوئی ضلع کمتر ہوگا جہاں گورنمنٹ اور پبلک اسکولوں میں میرے شاگرد ایک یا دو یا تین نہ ہوں۔ سینکڑوں میں سے ان چند کے نام لکھ دئے۔ رامپور کے محکموں میں بھی بہت سے ملازم ہیں۔ اور پنجاب کے اسکولوں میں بھی۔

**مولوی فقیہ الدین رامپوری**۔ عدالتہائے رامپور کے مشہور وکیل مرحوم۔

**ڈاکٹر محمد باقر** انھوں نے بھی ایم اے میں مجھ سے پڑھا۔ اردو میں لندن سے ڈاکٹر ہو کے آئے۔ اورنٹیل کالج لاہور میں میری جگہ پر پروفیسر ہیں۔ زمانہ جنگ میں فوجی ملازمت کر کے کسی اچھے عہدہ پر چلے گئے تھے۔

**سید ابن حسن صاحب جارچوی** ایم اے۔ ایم او ایل۔ انھوں نے بھی ایم اے کلاس میں مجھ سے پڑھا ہے۔ جامع ملیہ دہلی میں کام کر چکے ہیں کراچی میں بھی رہے ہیں۔ کیا کام کرتے تھے معلوم نہیں۔ اب ریاست محمود آباد (اودھ) میں کسی ممتاز عہدہ پر ہیں۔ اور مولوی سید عباس حسین صاحب مرحوم کے عزیز ہیں۔ جو علیگڈھ یونیورسٹی میں سر سید احمد خاں مرحوم کے زمانہ سے عربی اور شیعہ دینیات کے پروفیسر تھے۔

**مرزا محمد ہادی صاحب واثق** رامپوری۔ باغبان پورہ لاہور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں ملازم ہیں۔ ٹرینڈ ہیں اور صاحب تصانیف۔

**سید منیر آغا صاحب** ناشہیر لکھنوی ایم اے۔ درجہ منشی فاضل رامپور میں مجھ سے پڑھا ہے۔ جھانسی انٹر کالج گورنمنٹ میں پروفیسر ہیں۔ شاعری میں جناب رشید کے شاگرد ہیں۔ صاحب تصانیف ہیں۔

سید دلدار علی صاحب المعروف بہ نبن میاں رامپوری۔ اجلاس ہمایوں رامپور میں سکرٹری ہیں۔

## نوٹ

شاید یہ لکھنا بھول گیا کہ مولوی محمد عابد صاحب المعروف بہ مولوی بلاقی و اکبر خان گھڑی ساز ہر دو بلگرامی کو جفر کی دھت تھی ان کی وجہ سے مجھے بھی اس میں کچھ توجہ کرنا پڑی۔ بقاعدہ ملیاوح ملین جفر کے وسیلہ سے ایک سوال حل بھی کیا ہے جو میری ایک کتاب جفر مطبوعہ بمبئی کے سادے اوراق پر لکھا ہوا ہے۔ لیکن مجھے یہ علم گھسیٹ گھساٹ اور کھینچ کھانچ سے زیادہ نہ معلوم ہوا۔ اس لیئے اس میں آگے کو انہماک نہ رکھا۔

الناس عدو لما جهلوا

اگر اس بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں تو یہ نوٹ بے کار ہے۔ نسیان کا عارضہ ہے۔ بات یاد نہیں رہتی ہے۔ اس وجہ سے عنوانات بھی غیر منظم ہیں۔ لکھتے لکھتے جو بات یاد آئی گو وہ اس کا محل نہ تھا لکھ دی۔ میرے لیئے دوبارہ منظم اور مرتب کرکے لکھنا دشوار بلکہ محال ہے پہلی تحریر سے بہت کچھ اختلاف ہو جاتا ہے کہاں تک بکرات صاف کرتا رہوں۔

۶ اگست ۱۹۴۷ء معادل ۱۸ ررمضان المبارک ۱۳۶۶ھ

---

# پچھلے پالک کے بارے میں

جناب علامہ سید اولاد حسین شاداں بلگرامی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے بلگرام آیا کرتے تھے۔ ایک سال جب وہ حسب معمول بلگرام تشریف لائے تو ان کے ساتھ تقریباً چھ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ ہم نے ان سے عرض کیا یہ لڑکا کون ہے تو انھوں نے فرمایا کہ تمہاری دادی نے اس لڑکے کو پال لیا ہے۔ پھر جب ہم اندر دادی کے پاس سلام کو گئے تو انھوں نے کہا کہ تمہارے دادا کا ایک شاگرد ہے جو اکثر آتا رہتا ہے۔ اس نے کہا کہ ایک لڑکا ہے اس کے ماں باپ دونوں کا انتقال ہوگیا ہے اگر آپ اس کو پالنا چاہیں تو میں لے آتا ہوں ورنہ میں اس کو کسی اور کو دے دوں گا یا پھر یتیم خانہ میں داخل کرادوں گا۔ تمہارے دادے نے ہم سے پوچھا تو ہم نے رضامندی ظاہر کردی۔ دوسرے دن وہ اس لڑکے کو لے کر آگیا۔ ہم نے سوچا کہ یہ لڑکا گھر کے اور باہر کے کام کیا کرے گا۔

کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ اس کو کسی اُردو اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ ہم جب بھی دادا مرحوم کے پاس گئے تو ہم نے کبھی اس لڑکے کی طرف توجہ نہ دی البتہ کسی کام کے سلسلے میں اس کا نام "اصغر" لیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے دادا سے پوچھا کیا آپ اس کو پڑھاتے ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ اس کا ذہن ہی اس قابل نہیں البتہ یہ لڑائی جھگڑا بہت کرتا ہے۔

علامہ کے انتقال کے بعد مئی ۱۹۴۸ء میں جب میں کراچی سے رامپور اپنی دادی (بیگم شاداں بلگرامی) کے پاس تعزیت کے لئے گیا تو یہ لڑکا بھی موجود تھا اس وقت اس کی شادی ہوچکی تھی۔ اس نے ہم سے کہا کہ میں بھی پاکستان آنا چاہتا ہوں آپ ہماری مدد کریں۔ پھر دادی نے بھی فرمایا کہ تم سے جو ہوسکے اس کی مدد کرنا۔ ہم نے حامی بھرلی۔ ہمارے کراچی واپس آنے کے بعد یہ لڑکا بھی مع اپنی بیوی کے ہمارے

پاس آگیا۔ ہم نے اس کو اپنے سرکاری کوارٹر کا ایک باہری کمرہ رہائش کے لیئے دے دیا۔ تقریباً ایک سال تک میں ان کی کفالت کرتا رہا۔ اس کے بعد اس کو پی۔ ڈبلو۔ ڈی میں کلرکی مل گئی اور جلد ہی المونیم کا ایک چھوٹا سا کوارٹر الاٹ ہوگیا اور وہ اس میں منتقل ہوگیا۔ اس وقت اس نے اپنا نام سید اصغر علی بتایا تھا۔ چند سال کے بعد اس کو جیکب لائن میں ایک دوسرا پختہ کوارٹر الاٹ ہوگیا۔

شاداں صاحب کے انتقال کے آٹھ سال کے بعد ۱۹۵۶ء میں جب میں لکھنؤ گیا تو دادی صاحبہ (بیگم شاداں بلگرامی) کی عیادت کو بھی جوہری محلہ میں گیا۔ وہ سخت علیل تھیں اور بستر میں لیٹی تھیں۔ ہم ان کے پاس بیٹھ گئے۔ انھوں نے سب کی خیریت پوچھی اور کہا کہ کیا اصغر زندہ ہے۔ اس موئے نے جب سے گیا ہے دو پیسہ کا ایک کارڈ بھی نہ بھیجا (اس زمانہ میں ڈاک کا کارڈ دو پیسہ کا اور لفافہ ایک آنے کا تھا) اگر کسی اچھے اور شریف خاندان کا ہوتا تو ایسا نہ کرتا۔ ہم نے اس کو گٹر سے نکال کے انسان بنایا۔ اس کو پڑھایا لکھایا۔ اس کی شادی کی اور وہ ایسا احسان فراموش نکلا۔ تم اس سے ہوشیار رہنا۔ جب وہ ہمارا نہ ہوا تو اور کس کا ہوگا۔ ہم نے واپس آکر اپنی دادی کے تاثرات سے اس کو آگاہ کیا تو اس نے " اونہہ " کہہ کے گردن ہلا دی جیسے کوئی بات نہیں۔

نکوی با بداں کردن چناں است　　　　که بد کردن بجائے نیک مرداں

ایک دن یہ ہمارے پاس پریشان حال آیا اور کہا کہ ہمارے لڑکے اختر کو پولیس پکڑ لے گئی اور حوالات میں بند کر دیا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ سامنے کے کوارٹر والوں نے اپنی لڑکی سے ہمارے لڑکے کے زنا بالجبر کا الزام لگایا اور مقدمہ کر دیا۔ ہم بہت پریشان ہیں۔ آپ ہماری مدد کریں۔ ہم نے کہا کہ جب سے تم کراچی آئے ہو ہم نے تمہاری ہر طرح اور ہر وقت مدد کی لیکن یہ معاملہ سنگین ہے اس میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد ایک دن وہ ہم سے مبلغ پانچ سو روپیہ مانگ کر لے گیا۔ ہم کو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ یہ رقم لے کر متعلقہ مجسٹریٹ کے پاس اس کے گھر پر گیا اور یہ رقم اس کو اپنے لڑکے کے الزام کے بری کرنے کے لیئے بطور رشوت پیش کی۔ اس مجسٹریٹ نے اس کو ڈانٹ کر نکال دیا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس نے ہم کو اسلام آباد لکھا کہ اس کے لڑکے کو سات سال کی سزا ہوگئی۔

جب اس نے ہم کو اسلام آباد خط لکھا تو وہ اصغر علی شیعہ ہو چکا تھا۔ اب سنا ہے کہ وہ سید اصغر علی شادانی ہوگیا ہے۔ حالاں کہ شاداں مرحوم سے اس نے ایک حرف بھی نہ پڑھا اور نہ اس کے پاس اردو یا فارسی کی کوئی سند ہے یہ دماغی فتور اس وقت آیا جب اس کے لڑکے کمانے لگے اس طرح وہ اپنے پالنے والے

اور محسن کی تضحیک کا مرتکب ہوگا۔ اگر خود فریبی کا یہی عالم رہا تو بہت جلد یہ علامہ بھی بن جائے گا۔ ع
نام زنگین نہند کافور

چونکہ شاد اِن مرحوم کی کوئی صلبی اولاد نہ تھی اس لیئے ان کی سعادت مند معنوی اولاد نے اپنے استاد کے نام کی بقا کی خاطر اپنے کو ان سے نسبت دی تھی لیکن یہ سب علمی لحاظ سے بہت قابل اور صاحب تصانیف تھے جس سے استاد کی تبحر علمی عیاں ہو سکے۔ ان میں ایک سید محمد ایوب کوکب شادانی جن کی تصنیف کی ہوئی بہت سی کتابیں ہیں اور دو بڑے مشہور، ادیب، شاعر اور نقاد جناب ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی مرحوم سابق لکچرار فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی تھے۔ انھوں نے اپنے محترم استاد کی محبت میں "شادانی" اپنے خاندانی نام کا لاحقہ بنالیا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

غالبؔ

# شرحِ دیوانِ اُردوئے غالب — علیہ الرحمہ

## ردیف الف

تعداد غزل

شمار اشعار غزل اول

اشعار ۔ پانچ

پانچ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقش بمعنی تصویر۔ معنی وضعی دو یا زیادہ رنگوں سے رنگنا اور زینت دینا۔ شوخی، طراری، بیباکی، بے شرمی، چنچل پنا، تحریر جزائری کہتے ہیں: بیان المعنی بالکنایہ ۔ تقریر بیان المعنی بالعبارۃ۔ کاغذ کارغ مبدل کاگ اس کے معنی کوا چنانچہ ہندی میں بھی کاگا کوے کو کہتے ہیں۔ اور دال (د) نسبت کے لیے ہے یعنی منسوب بکلاغ وزاغ۔ کاغذ کے تختہ کو ہلانے سے آواز کوے کی بولی کی ایسی نکلتی ہے۔ فریادی بایار فاعلی۔ دادخواہ ومظلوم کاغذ در آخر ذال معجمہ معرب کاغد بدال مہلہ کا ہے۔ اس کی جمع کواغد لاتے ہیں عربی میں طرس بکسر اول اور قرطاس کہتے ہیں۔

کاغذ کی ایجاد سے پہلے ہندوستان میں بھوج پتر کی چھال پر اور مصر میں پیپرائی درخت کی چھال پر لکھا کرتے تھے اسی وجہ سے انگریزی میں پیپر PAPER کاغذ کو کہتے ہیں۔ سب سے پہلے چین میں روئی سے سپید رنگ کا کاغذ بنا۔ بیسویں ہجری میں سمرقند میں اس کا رواج ہوا۔ علی بن محمد فارسی صاحب تاریخ عرب لکھتے ہیں کہ پچاسی ہجری میں جب سمرقند بزمانہ حکومت عبدالملک بن مروان خلیفہ اموی فتح ہوا تو یوسف بن عمر نے کاغذ بنانا سیکھا۔ اور مکہ آکر اس کی صنعت سکھائی۔ اس سے پہلے پوست آہو پر لکھا کرتے تھے۔ لیکن میکائیل کشمیری نے اٹھاسی ہجری میں اس وقت کے لحاظ سے عمدہ کاغذ بنانے کی تعلیم مکہ والوں کو دی۔ ایشیا میں خان بالیغ (چینی) سمرقندی اور شامی وکشمیری کاغذ مشہور ہیں۔

مسعود سعد کے شعر ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ؎

آن زاغ نگر کہ بر ہوا میکاغد ۔۔۔ یک نیمہ اش از مراد نیمے کاغد

کاغیدن مصدر بھی تھا بمعنی آواز کردن زاغ۔ اور یہ شعر ابلق کوّے کی تشبیہ میں ہے کاغذ سپید اور روشنائی سیاہ سے ا
کوّے کو تشبیہ دی ہے کاغذی پیرہن ۔ پیرہن کاغذی ۔ کاغذی جامہ ۔ جامۂ کاغذین ۔ صاحب بہار عجم ٹیک چند بہار
ہیں ۔ جامۂ کاغذ کہ فریادیان پوشند در قدیم رسم بودہ ۔

مرزا رضا قلی ہدایت شیرازی اپنی فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں تحریر فرماتے ہیں کہ وقتے در شہرے مقرر کردہ بو
کہ ہر کہ ظلمے از حکام برسد جامہ از کاغذ پوشیدہ بپائے علمے کہ از جانب باشاہ در میدان خاصہ نصب کردہ بودند و آنرا علم دا
میگفتند برود تا بعد تحقیق حال رفع ظلم بشود ۔ حافظ شیراز ؎

کاغذین جامہ بخونناب بشویم کہ فلک ۔۔۔ رہنمونیم بپائے علم داد نکرد

بابا فغانی ؎

ز خوبان داد میخواہم فغانی مہربانی کو ۔۔۔ کہ سازد کاغذین پیراہن از طومار افسوں ہم

کمال اسمٰعیل ؎

کاغذین جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد ۔۔۔ زادۂ خاطر من تا بدہی داد مرا

لہٰذا جناب نظم طباطبائی کا اپنی شرح میں یہ لکھنا کہ ۔

" ایران میں یہ رسم تھی کہ داد خواہ کپڑے کاغذ کے پہن کر حاکم کے سامنے جایا کرتا
تھا ۔ میں نے نہ کہیں دیکھا اور نہ سُنا صحیح نہیں میر ممنون اور مومن خاں بھی کاغذی جامہ
نظم کیا ہے ۔"

مصنف علیہ الرحمہ اپنے اس مطلع حمدیہ کے معانی اپنی کتاب عود ہندی میں خود یوں تحریر فرماتے ہیں کہ ۔

" ہستی دنیوی چوں کہ مبدء حقیقی سے دور ہو جانے کا باعث ہوئی ۔ لہٰذا تصویر
انسانی باوجودیکہ اس کی ہستی محض اعتباری ہے مگر وہ بھی اپنے مبدء سے جدا ہو کر رنج و
ملال میں گرفتار رہے ۔ اور کاغذ کا لباس پہن کر فریاد کرتی ہے اور داد خواہ ہوتی ہے ۔"

جناب نظم فرماتے ہیں جب تک کوئی ایسا لفظ نہ ہو جس سے فنا فی اللہ ہونے کا شوق اور ہستی اعتباری سے
نفرت ظاہر ہو اس وقت تک اسے با معنی نہیں کہہ سکتے ۔

خود مصنف مبدء حقیقی سے دُور ہو جانے پر رنج و ملال میں تصویر کا گرفتار ہونا اپنی طرف سے ملا کر معنی کہہ رہے ہیں
مگر شعر کے الفاظ اس پر دال نہیں ۔ شوخی تحریر سے یہ مطلب پورا نہیں ہوتا ۔

جناب غالب مولانا رومؒ کے دو اشعار ذیل کے مفہوم کو ادا کرنا چاہتے ہیں ؂

بشنو از نے چوں حکایت میکند　　　از جدائیہا شکایت میکند

از نیستان تا مرا ببریدہ اند　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مگر اضافی شعر اس مطلب کے لیے کافی نہ ہوئے۔

اس مطلب کے پورا کرنے کے لیے پہلے مصرع کی ترمیم کرتا ہوں۔ میں شاعر نہیں ہوں اس لیے میرے نظم کیے ہوئے مصرعے پھس پھسے ہوں گے۔ کوئی مشاق شاعر ان کے مفہوم کو عمدہ اور چست الفاظ میں نظم کر دے گا تو شعر غالب معنی ہو سکتا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کے ہجر غم تاثیر کا

نقش فریادی ہے کس کی دوری دل گیر کا

نقش فریادی ہے کس کے ہجر دامن گیر کا

نقش فریادی ہے کس ہستی غم تاثیر کا

نقش فریادی ہے کس کی فرقت دلگیر کا

کوئی شاعر جان بوجھ کے بے معنے نہیں کہا کرتا ہے۔ مفہوم اس کے ذہن اور خیال میں چکر لگاتا ہوتا ہے بعد نظم وہ سمجھ لیتا ہے کہ مطلب ادا ہوگیا۔ مگر بعض اوقات الفاظ موجودہ تظلم کفایت نہیں کرتے ہیں۔

اگرچہ نقش کے لحاظ سے لفظ تحریر اور مبدء کو معشوق حقیقی مان کر لفظ شوخی متناسب الفاظ ہیں مگر معنی میں یہی "شوخی تحریر" کو ہرج پیدا کر رہی ہے۔

عالم ارواح میں روحوں کو قربت الٰہی کا مرتبہ حاصل تھا۔ لیکن جب جسم کے ساتھ اس دنیا میں اُن کا ظہور بصورت انسانی ہوا تو اپنے مبدء سے جدائی کا ملال ہے اور اس معشوق حقیقی کی مفارقت ایسی شاق ہے کہ تصویر انسانی کہ جس کی ہستی محض اعتباری ہے پھر بھی اس فراق کی فریاد کے لیے ہر تصویر کا جامہ کاغذی ہے۔

کاوکاو سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ　　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

غالب پر فارسیت اس قدر غالب ہے کہ اُن کے بہت سے اشعار ایک آدھ لفظ بدل دینے سے وہ اشعار فارسی کے ہو جاتے ہیں۔ یہ شعر بھی ایسا ہی ہے ؂

کاوکاو سخت جانیہائے تنہائی مپرس　　　صبح کردن شام را چون جوئے شیر آوردن است

کاوکاو کاویدن سے دو صیغہائے امر ملا کر اسم مترادف کاوش بنا ہے بمعنی (کرید) مگر اردو میں ثقیل ہے۔ کاوش ہوتا تو اچھا تھا۔

مگر　　　سخت جانی کی جو کاوش ہجر میں ہے کچھ نہ پوچھ

جوئے شیر - یہ قصّہ مشہور ہے کہ کوہ بیستون کو کاٹ کے جوئے شیر قصرِ شیریں میں لانے کے لیے فرہاد کو مقرر کیا گیا تھا۔ چونکہ یہ کام نہایت سخت اور دشوار تھا اس لیے جوئے شیر آوردن بمعنی دشوار و مشکل ہے۔ شعرا تشبیب نورِ صبح کو جوئے شیر کہتے ہیں۔

تنہائی کی سخت جانی کو کوہ بیستون سے۔ اور شبِ فراق کے کاٹنے کو کوہ بیستون کو کاٹ کے جوئے شیر لانے کے ساتھ استعارہ کیا ہے۔ اور وجہ جامع دشواری ہے۔ یا تمثیل ہے یعنی شب ہجر کا کاٹنا اُتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ کوہ بیستون کا کاٹنا اور جوئے شیر لانا۔

شبِ فراق میں سخت جانی کی کاوش کو کچھ نہ پوچھو۔ شبِ فراق کا کاٹنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ کوہ بیستون کاٹ کے جوئے شیر لانا۔

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیئے  سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

جذبہ بکون ذال معجمہ کشش شوق عزالدین بن جماعہ کہتے ہیں وہ محبت جو اکثر موجب قتل ہوتی ہے۔ اور دیدار محبوب سے اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ برخلاف عشق کہ اس میں بعد دیدار تسکین ہو جاتی ہے (از فرائد اللغۃ فی الفروق) — اختیار قابو۔ قدرت شمشیر شم ناخن۔ شیر درندہ معروف۔ چوں کہ ناخن شیر سے خمیدگی اور چاک کرنے میں تلوار مشابہ ہوتی ہے اس لیے سیف کا نام ہے۔ دم نفس۔ سانس۔ مناسب سینہ۔ (تیزی۔ تندی۔ باڑھ۔ مناسب شمشیر دونوں معنوں سے یہاں کام لیا ہے۔ شوق سے مراد شوق قتل۔ اگر اس کی جگہ قتل ہی پڑھیں تو محذوف ملنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

میرا شوق قتل جو میرے اختیار سے باہر ہے۔ دیکھنے کے قابل ہے کہ جس کی کشش سے دم شمشیر سینۂ شمشیر سے باہر کھنچ آیا ہے  ع

کھنچ کے باہر سینہ سے آیا ہے دم شمشیر کا

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے  مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

آگہی مخفف آگاہی۔ بیداری۔ وقوف دام شنیدن سننے کا جال۔ مصادر فارسیہ اُردو میں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ حالاں کہ "دام سماعت" بھی موزوں تھا مگر مصنف کو فارسی کے ساتھ اس قدر شغف ہے کہ وہ فارسی ہی کو پسند فرماتے ہیں۔ مدعا جس کا دعویٰ کیا گیا ہو مستعمل بمعنی مطلب و مفہوم عنقا۔ بفتح عین مہملہ۔ عنق بمعنی گردن سے مؤنث کا صیغہ ہے بمعنی دراز گردن۔ اس کا صیغہ مذکر اعنق ہے۔ ایک فرضی و خیالی پرندہ جس کی گردن لانبی تجویز کرتے ہیں۔ اور معلوم الاسم و معدوم الجسم سے اس کی تعبیر کرتے ہیں۔ انگریزی میں اسے (PHOENIX) فونکس کہتے ہیں۔ سلیمان نے ترجمہ میں

عنقا۔ ہما۔ ققنس اور سیمرغ سب ہی الفاظ لکھ ڈالے۔ عالم بفتح لام کُل مخلوق۔ دنیا۔ عالم تقریر جس طرح دنیا نے اخبار بولتے ہیں۔ تقریر۔ کلام کرنا۔ بولنا۔ بات کرنا۔ یہ معنی منجد اور فرائد الدریہ میں نہ ملے مگر اُردو اور فارسی میں کلام زبانی کے معنوں میں مقابل تحریر مستعمل ہے۔

شخص آگاہ و بیدار مغز کا کیا ذکر خود ذات آگاہی (مبالغۃً) بھی ہمارے مفہوم کے طائر کے پھانسنے کے لیے سماعت کا جال بچھائے مگر وہ ہمارے مدعا اور مطلب کو ہرگز سمجھ نہیں سکتی۔ کیوں کہ ہماری تقریر کا مفہوم معدوم اور ناپدید ہے۔ یعنی پُر از اسرار عشق ہے۔ اور وہ اعلیٰ مضامین ہیں جو ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ (یا مجذوب کی بڑ ہیں)۔

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا　　　موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

بس کہ۔ حسب۔ فقط۔ وقطع کی۔ اور کاف بیان ہے۔ مگر مستعمل بمعنی چونکہ غالبؔ تخلص مصنف بطور التفات یا تبخایر اعتباری آیا ہے اور "اے" حرف ندا محذوف ہے آتشِ زیر پا۔ بمعنی مضطرب و بے قرار موئے آتش دیدہ بال آگ میں پڑ کے بل کھا کے کمزور ہو جاتا ہے۔ زنجیر بفتح اول عربی سلسلہ۔

اے غالبؔ چونکہ میں قیدی عشق ہو کر بھی آتش زیر پا (مضطرب، و بیقرار) ہوں اس لیے میری زنجیر کی ہر کڑی موئے آتش دیدہ کی طرح بل کھا کے کمزور ہو گئی ہے۔ یعنی علایق وقیود حیات میرے آزادہ روی کو مانع نہیں۔

---

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ　　　مبارک باد اسدؔ غمخوار جانِ دردمند آیا　　　غ

جرح زخم ڈالنا۔ جراحت زخم تحفہ بضم ہدیہ۔ شی ذخر۔ عین جسے کوئی آدمی از روئے نکوئی ولطف کسی کو دے۔ (مادہ تحت۔ صرف باب افعال سے اتحاف آتا ہے) الماس رسالہ کاوہ جو پہلے برلن دار السلطنت المان (جرمنی) سے نکلتا تھا اس میں لکھا تھا کہ لفظ یونانی آداماس اس کا ماخذ ہے۔ اور یہ لفظ مدت دراز سے مشرق زمین منتقل ہو کر آیا ہے۔ چنانچہ زبان پہلوی میں الماس و الماست بمعنی (ہیرا) یونانی میں آداماس اور فارسی میں ماس کہتے ہیں۔ عربوں نے الف ولام النجم (بمعنی ثریا کی طرح) لازم کر کے معرب کر لیا ہے۔ جواہرات میں یہ سب سے زیادہ قیمت کا ہے۔ ہر جوہر کو کاٹ دیتا ہے۔ مخزن الادویہ میں سرخ، سپید اور سیاہ اس کے رنگ لکھے ہیں۔ سپید رنگ والا اعلیٰ قسم کا سمجھا جاتا ہے۔ گولکنڈہ (دکھن) میں اس کی کان تھی۔ مشہور کوہ نور ہیرا جو شاہ انگلینڈ کے تاج میں لگا ہے۔ ہندوستان کی پیداوار ہے۔ دنیا بھر میں بہترین ہیرا ہے۔ رنجیت سنگھ والی پنجاب سے انگریزوں کو ملا۔

کہتے ہیں کہ ہیرے کی کنی احشاء کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

ارمغان بفتح اول وسوم رہ آورد۔ سوغات جو مسافر باہر سے اپنے وطن والوں کے لیے لائے۔ ہدیہ عربی میں یائے مشدّد مفتوح کے ساتھ ہے۔ اُردو اور فارسی میں دال ساکن اور یائے مفتوح غیر مشدد کے ساتھ مستعمل ہے۔ پیش کش ہدیہ۔ صیغہ مؤنث ھَدِیّۃ کا ہے وہ تحفہ یا نعمت جو دلہن کے ساتھ کی جائے یا بھیجی جائے۔ غم خوار مراد عشق۔ رنجیدہ۔ وہ شخص جو دوسروں کی تکلیف کو دیکھ کر کڑھے۔ متحمل غم۔ غم عربی میں بتشدید میم الکرب والحزن۔ میں جو غم خوار اور غم دوست ہوں تو عشق بھی اپنے ساتھ زخم۔ الماس داغ جگر میرے لیے بطور تحفہ و ارمغان و پیش کش و ہدیہ لایا ہے اے اسدؔ تم کو مبارک ہو۔ اور اگر غم خوار سے ناصح مراد لیں تو مبارک باد بطور طعن و طنز ہوگا۔

جناب حسرتؔ نے اس شعر کو اس غزل کے ساتھ جس کا پہلا مصرع ؎

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا

سہو الخیال سے ملا دیا۔ حالاں کہ اس غزل کے قوافی مشکل اور دل وغیرہ ہیں۔ اور پسند آیا ردیف ہے۔ اور اس شعر میں پسند۔ درد مند۔ گزند قوافی ہیں اور صرف آیا ردیف ہے۔ اور یہ شعر منفرد ہے۔

چوں کہ مجھ میں قابلیت جناب غالبؔ کے اشعار کے سمجھنے اور اُن کی شرح لکھنے کی نہیں ہے اس لیے لغات کی طرف مجبوراً مائل ہو کر طول لاطائل پر عمل پڑا۔ آخر کچھ تو تنوع ہونا چاہیے۔ اگرچہ فاضلوں کو اس کی ضرورت نہیں مگر مبتدیوں کے افادہ سے شاید خالی نہ ہو اگر میں تشریح الفاظ صحیح کر سکا ہوں گا۔

دوسری بات اس شرح میں یہ پائی جائیگی کہ ہر شعر مشکل کے معنی شرح جناب حسرتؔ اور جناب نظم طبا طبائی سے نقل کر دیئے ہیں۔ میرے لکھے ہوئے معانی تو کوئی التفات کے قابل نہیں۔ ان بزرگ ہستیوں کے لکھے ہوئے مضامین سے ناظرین صحیح مفہوم شعر کا حاصل کر سکیں گے۔ گویا یہ شرح تین شرحوں کا مجموعہ ہے۔ مشکل اشعار کی شرح کے لیے اُن دونوں بزرگوں کی شرح دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ مجھ ایسے شخص کے واسطے جو خون لگا کے شہیدوں میں داخل ہو رہا ہے۔ اتنی بات بھی بہت ہے۔ میری حیثیت شارح کی نہیں ہے بلکہ صرف ناقل ہوں۔ اگر معانی اشعار لکھنے میں ان بزرگوں سے اختلاف بھی ہوا ہے تو وہ معانی مختلف بھی انہیں کے ہیں۔ کیوں کہ انھیں کے لکھے معانی نے ان مختلف معانی لکھنے کی طرف میری رہبری کی ہے۔ اگر ان دونوں کی شرح میرے پاس نہ ہوتی تو میں قلم بھی نہ اُٹھا سکتا۔

---

صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا ۔۔۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

قیس باشندۂ نجد عاشق لیلیٰ قبیلہ عامر کا تھا۔ زمانہ جاہلیت کے شعرا میں سے ہے۔ اس کا دیوان عربی چھپا ہوا موجود

ہے۔ بہت مدت ہوئی جب کسی نے علی گڑھ منتھلی میں لیلیٰ مجنوں کو فرضی اشخاص ثابت کیا تھا۔ اور دیوان کو ایک اور شاعر کا بتایا تھا بر روئے کار آمدن کنایہ از ظاہر شدن ۔ فارسی کا محاورہ ہے اردو میں عام فہم نہیں صحرا، مؤنث اصحروہ زمین فراخ جس کا رنگ سرخی مائل بھگ میلا ہو اور وہاں گھانس بھی نہ ہو۔ فضا، میدان وسیع جس میں درخت نہ ہوں۔ فلا، وہ میدان جہاں پانی نہ ہو۔ یعنی بیابان تیہا، وھیما، وہ چٹیل میدان جس میں راستہ نہ ملے۔ بیدا، جس میدان میں راہ گیر ہلاک ہو جائے۔ تنگ چشمی۔ و تنگی چشم بخل و حسد و امساک مگر مصنف نے بمعنی کوتاہ نظری استعمال کیا ہے۔ و تنگ خیالی نظم فرمایا ہے۔ حسُود بفتح صیغہ مبالغہ بڑا حسد کرنے والا حسد کسی کی نعمت کو دیکھ کر اُس سے زوال نعمت چاہنا بغیر اس کے کہ وہ نعمت اس کو نہ ملے۔ برخلاف رشک و غبطہ کہ کسی صاحب نعمت کو اپنے لیے اس نعمت کا خواہاں ہونا بلا اس کے کہ اس غیر سے زوال نعمت کا خواہش نہ ہو۔ مگر ترجمہ الاّ۔ استثنا، رشک و گمان یقین و تحقیق و تمنا کے محل مستعمل ہوتا ہے۔

اس میدان عشق میں مجنوں کے سوا کسی اور نے قدم نہ رکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحراء عشق میں وہی تنگی ہے جو تنگی چشم حاسد میں ہوتی ہے جبھی تو اس میدان میں کسی دوسرے کو جگہ نہ ملی یعنی عشق صادق صرف مجنوں تھا۔

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی پریشانی سویدا، نقطہ سیاہ بر قلب سرمایہ راس المال دود دخان دھواں ۔ وہ بخار جس میں اجزا، ناریہ زیادہ ہوں۔ اور بخار بھاپ جس میں اجزا، مائیہ زیادہ ہوتے ہیں۔ اور سردی پاکر پانی بن جاتی ہے۔ داغ سیاہ دھبا اس کی صفت میں آتش بار اور سوزاں لاتے ہیں۔ اور دود کی صفت میں پریشان ۔ داغ سے مراد داغ دل۔

جناب حسرت نے سویدا، کو داغ سے اور آشفتگی کو دود سے تشبیہ دی ہے۔ مقصود شاعر یہ ہے کہ جس طرح دھویں سے داغ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح آشفتہ خاطری اور پریشانی کے دود سے دل میں داغ سویدا، کی صورت قائم ہوئی ہے۔

جناب مولانا سید علی حیدر صاحب نظم و حید رطباطبائی۔ داغ سویدا، دل سے ہمیشہ دود آہ اُٹھ اُٹھ کر پھیلا کرتا ہے اس سے ظاہر ہوا کہ دل کی خلقت آشفتگی سے ہے۔ معنوی تعقید اس شعر میں یہ ہو گئی ہے کہ پریشانی آہ کی جگہ آشفتگی کہہ گئے ہیں۔ غرض یہ تھی کہ سویدا، دل سے دود پریشان اُٹھا کرتا ہے۔ اور اُس کا سرمایہ و حاصل جو کچھ ہے یہی دود آہ ہے جو ایک پریشان چیز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ نقش سویدا، خدا نے محض پریشانی ہی سے

ہے۔ اور یہ داغ دودِ آہ سے پیدا ہوا ہے۔ جبھی تو اس سے ہمیشہ دھواں اٹھا کرتا ہے اور پہلے جب میں آہیں کیا کرتا تھا تو داغ آتش بارِ عشق سے دودِ آہ منتشر و پریشان ہوا کرتا تھا لیکن جب سے کہ میں نے ضبطِ آہ سے کام لیا ہے تو اُس دودِ آہ نے مجتمع ہو کر صورت سویدا، دل کی پیدا کر لی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ سرمایہ و اصل سویدا، دل کی دودِ آہ ہی ہے۔ اگر مصرعِ اول یوں ہو جائے ع

آشفتگی سے نقش سویدا ہوا درست

اگرچہ آشفتگی دودِ آہ چاہیئے تھی۔ بود صباحت زیادہ ہو سکتی ہے۔ ضبطِ فغاں سے نقش سویدا ہوا درست۔ جب باعث وجود سویدا ہے ضبطِ آہ ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ　　جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

خواب۔ نوم = روح چوں کہ معطل نہیں رہ سکتی۔ اس لیے سونے میں جبکہ حواس ظاہری معطل ہوتے ہیں اور کوئی اطلاع روح کو نہیں پہنچا سکتے تو قوت واہمہ خزانہ حافظہ سے کچھ محسوسات اخذ کر کے حس مشترک پر عرض کرتی ہے۔ تو خواب دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواب محسوسات سے باہر نہیں ہوتا ہے۔ اگر ایسا خواب ہو کہ جس کا وجود بنایا جاتا ہو مثلاً اڑتا ہوا انسان۔ تو اس کے اجزا محسوس ہیں۔ انسان اور اڑنا۔ جن اشیا یا اشخاص کا تصور خزانہ حافظہ میں نہیں ہوتا ہے ان کو خواب میں بھی کوئی نہیں دیکھتا۔ مثلاً ابراہیم زرتشت و جہادیو وغیرہ کا خیال مسلمانوں کے حافظہ میں نہیں ہے تو ایک مسلمان ان کو خواب میں بھی نہیں دیکھتا۔ لہٰذا رویاء صادقہ جس حیثیت سے مانا جاتا ہے وہ کوئی شئے نہیں۔ اگر کوئی امر خواب میں دیکھنے کے مطابق وقوع پذیر بھی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح انسان تجربہ کار جاگتے میں کسی امر آئندہ کی خبر دیتا ہے اور اسی طرح واقع بھی ہوتا ہے۔ یہی قوت انسانی سونے میں بھی کام کر رہی ہے۔ انگریزی میں خواب کو [illegible] کہتے ہیں' خیال منجد میں بکسر اول اور فرائد اللغۃ میں بفتح اول مرقوم ہے اگر طباعت کی غلطی نہ ہو۔ کسی چیز میں نفس خیر کرنا۔ عبد القاہر جرجانی کہتے ہیں۔ وہ قوۃ تحفظ جو صور محسوسہ کے سامنے نہ ہونے پر بھی ان کو یاد رکھتی ہے۔ جن کا ادراک قوت حس مشترک نے کیا تھا۔ یہ خزانہ حس مشترک کا ہے اور حافظہ خزانہ وہم کا ہے۔ پانچ حواس باطنی میں سے ایک حس ہے اور حواس خمسۂ باطنی۔ واہمہ۔ حافظہ۔ متخیلہ۔ متفکرہ و حس مشترک ہیں زیان و سود نقصان و نفع۔ دو متضاد کے ذکر سے کبھی کلیۃ مقصود ہوتی ہے۔ جیسے ایسی آگ لگی کہ خشک و تر سب جل کر رہ گیا۔ یعنی سب کچھ جل کے رہ گیا۔ کچھ باقی نہ رہا۔ سو کے جاگنے کے بعد خواب کی باتیں کالعدم ہوتی ہیں۔ شئے معدوم مفید مضر کیا ہو۔ آنکھ کھلنا سونے سے جاگنا۔ غفلت سے چونکنا متنبہ ہونا۔

یہ کہاں تھی میری قسمت جو وصال یار ہوتا۔ ہاں رات کو خواب میں تم سے ارتباط و اختلاط کی باتیں ہو رہی تھیں

مگر جب آنکھ کھل گئی تو کچھ بھی نہ تھا۔ یعنی ہمارے اور تمہارے وصال اور عیش و اختلاط کو جو ایک مدت قلیل کے لیے تھا۔ اس کو بھی اتنا زمانہ گزر گیا کہ اب وہ بمنزلہ خواب و خیال کے ہے جس طرح خواب کی باتیں جاگنے کے بعد اپنا کوئی اثر نہیں رکھتی ہیں اسی طرح اب ان عیش کی باتوں کا بھی کوئی اثر باقی نہیں ہے۔ شاداں بلگرامی ؂

مدتیں اتنی تری فرقت میں اے جان ہوگئیں　　وصل کی باتیں ہمیں خواب پریشاں ہوگئیں

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز　　لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

غم حزن و کرب غم دل دل کے نہ رہنے کا غم اس کو مکتب کے ساتھ استعارہ کرنے میں (وجہ جامع) میں نہ معلوم کرسکا۔ ہنوز بفتح اول تاکنون۔ تا حال اب تک سبق لینا درس گرفتن۔ سبق پڑھنا۔ اور عبرت حاصل کرنا۔ اور سبق پڑھنا سبق کا رٹنا اور اس کا یاد کرنا۔ یہ محل سبق پڑھنا کہنے کا ہے یعنی اس کا رٹنا اور یاد کرنا۔

اگرچہ دل دیئے ہوئے مدت گذر چکی ہے مگر اب تک اُس کی یاد میں آمد نامہ پڑھنے والے بچوں کی طرح رفت گیا (یعنی دل چلا گیا) بود تھا۔ (یعنی دل پہلے ہمارے پاس تھا۔ مگر اب نہیں ہے) اُس کی یاد میں رٹا کرتا ہوں۔ قافیہ بود۔ اور۔ ردیف تھا میں صنعت ترجمۃ اللفظ پیدا ہوگئی ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی　　ورنہ میں ہر لباس میں ننگ وجود تھا

ڈھانپا سے ڈھانکا فصیح ہے عیب نقیصہ برہنگی از فضائل ننگ عار۔ جس فعل سے شرم آئے۔ برہنگی از فضائل کے داغ کے عیب کو کفن نے چھپایا یعنی مرنے کے بعد میرے عیوب پر پردہ پڑا۔ ورنہ میں ہر رنگ میں ذات ہستی کے لیے باعث عار تھا۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد　　سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

تیشہ بر۔ کلہاڑی۔ کدال AXE کوہکن لقب فرہاد کیوں کہ فرمایش شیریں سے اس نے کوہ بیستوں کو کاٹا تھا۔ سرگشتہ جس کا دماغ چکر کھاتا ہو۔ دوران سر والا مستعمل بمعنی حیران و پریشان خمار۔ نشہ اُتر جانے سے جو بے کیفی، بدمزگی اور بے چینی شرابی کو لاحق ہوتی ہے اور وہ شراب پی لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ رسوم و قیود کی بے لطفی و بدمزگی کی وجہ سے انھیں خمار سے تشبیہ دی ہے۔

میرے نزدیک لفظ عمار کو اس محل پر کوئی مناسبت نہیں ہے اس لیے مصرع یوں ہوتا تو اچھا تھا ___ ع

کس درجہ پائے بند رسوم و قیود تھا

رسوم جمع رسم وہ فعل جس میں کوئی بات عقل کی نہ پائی جائے ___ قیود : جمع قید - پابندی رواج دنیوی مراد ہے - اگر قافیہ نہ مجبور کرتا تو اس محل پر لفظ رواج اچھا تھا -

جناب غالبؔ فرہاد پر طعن و طنز فرماتے ہیں - کہتے ہیں کہ اگر وہ عاشق ہوتا تو اسے مرنے کے لیے آلات و اسباب مرگ سے کام لینے کی ضرورت نہ ہوتی ، کیوں کہ یہ امر جنون عشق و آزادہ روی کے خلاف ہے - مگر وہ تو رسم و راہ دنیوی کا پابند تھا جبھی تو شیریں کی جھوٹی خبر مرگ ایک بڑھیا کے سنانے سے تیشہ سر پر مار کے مرا -

___ ___

غ

کہتے ہو نہ دیں گے دل ہم نے گر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

تین چار غزلیں جناب غالبؔ نے ایسے بحور میں کہی ہیں جو ہندوستانیوں کی طبیعت پر موزوں نہیں یہ غزل بھی ایسی ہی بحر میں ہے - میں ان کی بحریں لکھتا ہوں مگر فضول کیوں کہ اکثر شعراء ہند اُن سے بلکہ عروض و قافیہ کے فن ہی سے ناواقف ہوتے ہیں وہ اسے دیکھیں گے بھی نہیں مگر شاید کسی کا دل اس بحر میں نظم کرنے کو چاہے تو وہ ان اوزان سے ناپ ناپ کے کچھ رکھ لے -

یہ غزل بحر ہزج میں ہے اس کا سالم وزن آٹھ مرتبہ مفاعیلن ہے مگر اس غزل کی بحر ہزج مثمن اشتر ہے - خلیل احمد واضع علم عروض عربی ہزج مثمن کو ناموزوں بتاتے ہیں - اسی وجہ سے عربی میں مثمن کے اشعار متقدمین میں نہیں پائے جاتے -

میرے ننہالی دُور کے رشتہ دار سید غلام حسنین قدر بلگرامی اپنی بے نظیر کتاب قواعد العروض میں اس کا نام ہزج اشتر مکفوف مقبوض مجبق رکھتے ہیں - کیوں کہ شتر مرکب خرم و قبض سے ہے اور خرم کو وہ صدر و ابتدا سے مخصوص قرار دیتے ہیں - اس لیے اسے حشویوں میں لانا نہیں چاہیے اور اس میں رکن سوم بھی اشتر ہوتا ہے اور خرم کی تعریف یوں لکھتے ہیں :

وہ رکن سباعی جو بیت کے اول رکن میں واقع ہو اور پہلا جزو اس کا وتد مجموع ہو اور اس رکن میں سبب ثقیل بھی نہ ہو ( اس قید سے رکن مفاعلتن کو الگ کرنا چاہتے ہیں ) تو اس وتد مجموع میں سے پہلے متحرک کے حذف کرنیکو

خرم کہتے ہیں۔ تعریف میں ان قیود کے بڑھانے سے خرم رکن مفاعیلن سے خاص ہو جاتا ہے۔ جس طرح ثلم رکن فعولن سے مخصوص ہے۔ بلحاظ ارکان سوالم۔ ورنہ مفاعلن مقبوض میں وہ خود خرم لا رہے ہیں۔

چوں کہ رکن سوم بھی اس کا اشتر ہے اور وہ اسے اشتر کہنا نہیں چاہتے، لہٰذا رکن دوم مفاعیلن میں پہلے کف لاتے ہیں تو مفاعیل بضم لام ہوتا ہے پھر رکن سوم مفاعیلن میں قبض کرنے سے مفاعلن ہو جاتا ہے تو رکن دوم و سوم مفاعیلُ مفاعلن ہوگیا۔ لہٰذا تین متحرک متوالی (ل۔ م۔ ف) جمع ہوگئے بیچ والے متحرک میم کو تجبیق سے ساکن کیا تو مفاعیلم فاعلن موافق وزن مانوس مفاعیلن فاعلن ہوگیا۔ اور پورا وزن اب فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن ہوگا جبکہ رکن اول مفاعیلن میں قبض سے مفاعلن اور خرم سے فاعلن بھی بنالیا جائے۔

اگرچہ محقق طوسی علیہ الرحمہ اور خلیل ابن احمد زحاف خرم کو مخصوص صدر و ابتدا سے کرتے ہیں مگر ابوالحسن اخفش جو اس فن میں مرتبہ اجتہاد رکھتے ہیں اور بحر متدارک کے موجد ہیں وہ خرم کو عامۃ الورود مانتے ہیں۔

دوسری تاویل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ بحر ہزج مثمن اشتر مسمط چہار گوشہ ہے اس مثمن کو دو مربع کرکے رکن دوم اور ششم کو بمنزلہ عروض وضرب اور رکن پنجم و ہفتم کو بمنزلہ صدر و ابتدا مان کے احکام عروض وضرب وصدر و ابتدا اُن پر جاری کرتے ہیں۔ چنانچہ رکن دوم وششم و چہارم میں قوافی غیر از قافیہ غزل یا قصیدہ اور لاتے ہیں اور ارکان دوم وششم میں تسبیغ و اذالہ بھی لاتے ہیں حالاں کہ تسبیغ و اذالہ و قوافی کا محل عروض وضرب ہی ہے۔ اور یہ عمل کلام شعرا میں کثیر الوقوع ہے جو محتاج سند نہیں۔

تقطیع = کہتے ہو۔ فاعلن =' ند یں گے ہم = مفاعیلن = دل اگر = فاعلن = پڑا پایا = مفاعیلن

اس دل کی دوسری بحر مقتضب مثمن مطوی بھی ہوسکتی ہے بروزن فاعلات۔ مفعولن چار بار یا بحر سالم کا وزن مفعولات مستفعلن چار بار ہے۔ مفعولات میں طی کرنے سے مفعلات بروزن فاعلاتُ اور مستفعلن میں طے کرنے سے مستعلن پھر تسکین لانے سے مستفعلن بسکون عین بروزن مفعولن ہوتا ہے۔

تقطیع کہتے ہو نہ فاعلاتُ۔ دیں گے ہم مفعولن۔ دل اگر پ فاعلات ڑا پایا مفعولن۔ یہ غزل ذو بحرین ہے۔

حافظ شیرازی فرماتے ہیں

از درم در آمدست ؛ تازنم بشادی دست     روشنی بماپیوست ؛ راستی بمہ مانی

تقطیع از درم فاعلن۔ در امدست مفاعیلان ؛ تازنم فاعلن بشادی' دست مفاعیلان۔ مست دست۔ پیوست تین قوافی غیر قافیہ اصل غزل (مانی) حشو میں موجود ہیں اور ساتھ ہی تسبیغ درمیانی بھی ہے۔

مدعا پایا ہم بات سمجھ گئے۔ ہمارا مطلب حاصل ہوگیا۔

تم جو یہ کہتے ہو کہ اگر تیرا دل ہم کو کہیں پڑا مل گیا (یعنی بلا سعی مفت میں ہاتھ لگ گیا) تو ہم تجھے نہ دیں گے۔

تمہارے اس کہنے سے ظاہر ہے کہ دل پہلے ہی سے تمہارے پاس ہے۔ مجھے تم صرف دھچڑیا تے ہو (جواب عاشق) دل ہمارے قبضہ میں ہے کہاں جسے ہم کھوئیں اسے تو ہم پہلے ہی تمہاری نذر کر چکے۔ تمہارے ایسا کہنے سے کہ تیرا دل اگر پڑا مل گیا تو ہم واپس نہ کریں گے ہم تمہارا مطلب سمجھ گئے کہ وہ تمہارے ہی پاس ہے۔ اور یہی ہم بھی چاہتے ہیں لہٰذا ہمارا مدعا بھی پورا ہوگیا۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

عشق افراط حب کا نام ہے اور عشقہ سے مشتق ہے جسے فارسی میں عشق پیچہ اور اُردو میں اکاس بیل اور انبر بیل کہتے ہیں۔ (سنسکرت میں اکاس اور انبر آسمان کو کہتے ہیں۔ یعنی اس کی بیل کے سوت کو اگر پھیلاؤ تو آسمان تک پہنچے) سوت کی طرح ہوتی ہے۔ اکثر ببول کے درخت پر پھیلتی ہے اس میں جڑ اور پتے نہیں ہوتے جس درخت پر چھا جاتی ہے مانع جذب ہوا ہونے سے وہ درخت خشک ہو جاتا ہے اسی طرح جس شخص کو عشق لاحق ہو وہ بھی زرد خشک نحیف و نزار ہو جاتا ہے۔ ارسطو کہتے ہیں کہ عشق بے وقوفوں کو ہوا کرتا ہے کیوں کہ افراط و تفریط میں وہی مبتلا ہوتا ہے جس کے دماغ کا توازن ٹھیک نہ ہو۔ عاشق خود بھی اپنے آپ کو دیوانہ کہا کرتے ہیں۔ طبیعت وہ قوت نفسانی جو مبدا و حرکت و سکون بلا ارادہ صاحب طبع ہوتی ہے۔ اس کا اطلاق تدبیر بدن کی وجہ سے خود نفس اور صورت نوعیہ پر بھی ہوتا ہے۔ درد کی دوا عشق کو اس لیئے کہا کہ اس کے ہوتے ہوئے دنیا کے تمام جھگڑوں سے نجات مل جاتی ہے۔ درد بے دوا مرض لاعلاج۔ مراد عشق۔

مصرع ثانی میں چار الفاظ مقطع اور چار الفاظ موصل بہ دو حرف ہیں زندگی بغیر عشق ایک درد تھی عشق کے ہونے سے زندگی میں لطف و مزہ پیدا ہوگیا۔ اگرچہ عشق حیات بے کیف کی دوا ہے مگر خود مرض لاعلاج ہے۔

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم　　آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

دوست مصدر قدیم دوسانیدن سے مشتق ہے جس کے معنی چسنیدن کے ہیں۔ چوں کہ دو دوست اکثر باہم رہتے ہیں اس لیے بمعنی رفیق و محب و متحد و متفق ہے دشمن دو عدد معروف وشمان بمعنی عدد و معاند و ضد سے مرکب ہے۔ اور دو عدد ایک دوسرے کی ضد و مخالف ہوتے ہیں اس لیے عدو کو دشمن کہتے ہیں۔ اور دشمن سے یہاں مراد محبوب ہے جو عاشق کے ساتھ بعداوت پیش آتا ہے اور اس کا کوئی مطلب پورا نہیں کرتا۔ اعتماد اتکال۔ بھروسا RELIANCE معلوم بمعنی نفی۔

دل جو یار ستمگار کا دوست ہے اُس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ جو آہ دل سے نکلتی ہے اس کا کبھی

اثر نہ دیکھا اور جو نالہ دل نے کیا وہ نارسا اور بے تاثیر ہی رہا جب دل دوستِ دشمن ہے تو اُس کی آہیں اور نالے مؤثر کیوں ہونے لگے۔

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

سادگی بے نقش ونگار ہونا۔ ڈاڑھی مونچھ کا نہ ہونا۔ اندیشہ و فکر سے خالی ہونا۔ نادانی بھولا پن۔ اَلّھڑ پنا۔ پُرکار جو اپنے کام میں بڑا ہوشیار ہو۔ حُسن جمال۔ تناسب اعضاء۔ حسن دراصل خوبی تالیف کا نام ہے۔ اگر اعضاء جسمانی میں ہو تو حسن صورت ہے اور اگر خط و خال اور نقل ___ اشیاء میں ہو تو مصوّری ہے۔ اور اگر خطوط اور لکیروں میں ہو تو خطاطی (خوشنویسی) ہے۔ اور اگر آواز و صوت میں ہو تو موسیقی ہے الفاظ میں ہو تو شاعری ہے۔

علاوہ موسیقی باقی چاروں چیزوں کا اثر ناظرین کے مسلمات اور خیالات روی پر موقوف ہے کیوں کہ خوبی و خوب صورتی کسی شے کی ممالک اور اقوام کے مسلمات کے تحت میں ہے۔ یورپ۔ افریقہ۔ ایران ___ ہندوستان کا معیارِ حسن علٰحدہ علٰحدہ ہے۔ ایک کے نزدیک جو حسین ہے وہی دوسرے کے خیال میں حسین نہیں۔ اس وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ حسن و قبح اشیاء عقلی چیز نہیں حتیٰ حسن صدق و قبح کذب کو بھی عقلی نہیں کہہ سکتے ورنہ دنیا بھر کے عقلاان کی اچھائی اور برائی پر متفق ہوتے۔

یورپ والے ڈپلومیسی، پالیسی، پروپگنڈا جو دوسرا نام کذب کا ہیں نہایت اعلیٰ چیز تجویز کرتے ہیں۔ حضرت سعدی بھی دروغ مصلحت آمیز کو راستی فتنہ انگیزی سے بہتر فرماتے ہیں۔ شریعت میں بھی الحرب خُدعۃ آیا ہے۔ مکرو فریب بھی جھوٹ ہی ہے۔

شاعری میں بات کے مفہوم سمجھنے کی بھی ضرورت ہے برخلاف موسیقی کہ اُس کے آہنگ (سُر) بغیر سمجھے بھی انسان تو انسان حیوان پر بھی اثر پیدا کرتے ہیں۔

موسیقی سے امراض کا علاج بھی ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی اعلیٰ درجہ کا واقف موسیقی اور مزاج دان انسان ہو تو موسیقی کے سروں کی تالیف ایک جماعت کثیر پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ مثلاً ایسے نغمے اور راگ کوئی ماہر گائے جو حزن و ملال انگیز ہوں تو ایک جماعت کثیر کے منھ پر اداسی چھا جاتی ہے۔ اسی طرح مسرت خیز سروں سے بشاشی چہروں پر آجاتی ہے۔ ایسی چیز کو حرام سمجھنا بد مذاقی پر دال ہے قرآن میں موسیقی کا ذکر نہیں۔ صوفیہ میں موسیقی رائج ہے۔ میلاد اور مجالسِ عزا میں موسیقی سے سوزخوانی میں کام لیا جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی آواز سُر سے خالی نہیں۔ قرأتِ قرآن میں بھی لحن و نغمے نکلتے ہیں۔ تغافل عدم حضور الشی فی البال اور وہ سہو سے اَعَمّ ہے جرأت اقدام و ہجوم۔ بمعنی دلیری و ہمت مستعمل جرأت آزما عاشقوں کی دلیری و ہمت کو آزمانے والا۔

حسین جو عشاق کے حق میں تغافل اور اہمال سے کام لیتے ہیں وہ حقیقۃً عاشق کا دل دیکھتے ہیں اور اس کی جرأت و ہمت کو آزماتے ہیں۔ تاکہ آزمائش میں معلوم کریں کہ ہم کو بھولا بھالا سمجھ کے کون گستاخ ہو جاتا ہے اور کون کہاں تک صبر و استقلال سے کام لیتا ہے۔ لہٰذا یہ سلوک ان کا ظاہر میں بھولے پن اور لاپروائی پر محمول ہوتا ہے۔ مگر اصل میں بڑی پُرکاری اور ہوشیاری ان حسینوں کی ہے۔

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل　　　خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

غنچہ جمع کردن و گرد آوری نمودن۔ چوں کہ کلی کی پنکھڑیاں مجتمع ہوتی ہیں اس لیے کلی کو غنچہ کہتے ہیں (برہان) یا گنجیدن سے مشتق ہے چوں کہ کلی میں ہوا سمائی ہوتی ہے۔ اس لیے اسے گنجہ کہا پھر غنچہ کثرت استعمال سے ہوگیا خون کیا ہوا مقتول و خون آلود۔ غنچہ کی طرح شگوفہ بھی شگفتن سے مشتق ہے منھ کھلی کلی۔
پھر بہار آگئی اور غنچے کھلنے لگے ۔ عاشق کہتا ہے کہ یہ غنچے غنچے نہیں ہیں بلکہ یہ میرا کھویا ہوا دل خون آلود ہے۔

حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی　　　ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

پہلے مصرع میں معلوم پر جو دوسرا رکن ہے تسبیغ درمیانی ہے کیوں کہ بحر مسمط چہار گوشہ ہے باوجودیکہ محل تسبیغ عروض و ضرب ہے یعنی حرف تفسیر ہے (مراد لیتا ہے۔ قصد کرتا ہے۔) مجھے حرف تفسیر کی ضرورت نہ معلوم ہوئی کس بات کی تفسیر کر رہا ہے۔ اس لیے مثل اس کے ہونا چاہیے۔

حال دل نہیں معلوم۔ اتنا جانتے ہیں ہم　　　بارہا پانے کے لئے بارہا گم ہونا بھی چاہیے

وہ اس شعر سے پایا نہیں جاتا۔ زبردستی کی یہ تاویل کریں کہ میرے پاس سے جا کر تمہاری تلاش میں آوارہ گرد ہے جب کبھی تم اس کی تلاش کرتے ہو تو وہ تمہیں مل جاتا ہے۔ مگر ہم بارہا ڈھونڈتے ہیں ہمیں نہیں ملتا۔ مجھ سے نفرت اور تم سے اس کو رغبت ہے۔ ڈھونڈا اور پایا کا مفعول یہ دل ہے۔ مصرع ثانی بھی یوں بدل دیا جائے ع

ہم نے جا بجا ڈھونڈا تم نے جا بجا پایا

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا　　　آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

شور۔ نمک۔ مزہ الفاظ متناسب ہیں۔ زخم پر نمک موذی ہوتا ہے آپ کا لفظ طنزاً ہے۔ آپ ضمیر باتعظیم ہے اس کے ساتھ تم لکھنو میں نہیں بولتے آں۔ سے کوئی پوچھے تو تم نے کیا مزہ پایا۔ مگر دلی میں آپ بیٹھو اب بھی بولا جاتا

ہے۔ مزہ لذت۔ ذائقہ۔ لطف۔ طعم اس لیئے ہائے مختفی والے الفاظ سے شاعرانِ اُردو گود (ہ) کو بنا پر تلفظ الف قرار دے کر الف والے الفاظ کے ساتھ قافیہ کر لیتے ہیں جیسے اسی غزل میں الف حرف روی کر کے بارہا۔ ہوا۔ مدعا کے ساتھ قافیہ لائے ہیں۔ لیکن ایسی صورت میں واؤ عطف یا کسرہ اضافی سے معطوف ومعطوف علیہ یا صفت موصوف نہ بنانا چاہیئے۔ فارسی والے ہاء مختفی کو نہ روی قرار دیتے ہیں اور نہ قافیہ کرتے ہیں۔

ناصح نے ترک عشق کی نصیحت کر کے میرے زخم پر نمک چھڑکا اور ایذاء دی۔ ترک عشق ہم سے ممکن نہیں پھر ان سے کوئی پوچھے کہ ان کو ہمیں ایذار دینے میں کیا مزہ ملا۔

---

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا ‌‌ ‌ آتش خاموش کے مانند گویا جل گیا ‌ غ

محاباۃ فروگذاشت۔ مرؤۃ۔ لحاظ۔ نگہداشت (منجد وغیاث) اُردو بے دھڑک معنی ہیں۔ ایرانی جن الفاظ عربیہ کے آخر میں لام کلمہ کے جگہ ہمزہ ہو یعنی مہموز اللام ہو تو اس کے وزن مفاعلۃ میں سے (ۃ) کو حذف کر دیتے ہیں۔ جیسے مدارات سے مدارا اور مکافات سے مکافا آتش خاموش دبی ہوئی یا بجھی ہوئی آگ۔

سوزش آتش عشق سے میرا دل جل کے رہ گیا جس طرح دبی ہوئی آگ رفتہ رفتہ خاکستر ہو جاتی ہے۔ ضبط آہ آتش بار سے یہ نتیجہ نکلا۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ مانند کا لفظ اُردو بول چال میں نہیں مگر شعرا نظم کرتے ہیں۔

دل میں ذوق وصل و یادِ یار تک باقی نہیں ‌ ‌ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

شوق میں دیدار یار سے اضافہ ہوتا ہے۔ اور اکثر باعث ہلاکت ہوتا ہے۔ ذوق قوۃ ادراک طعم۔ مزہ ولطف کے معنی میں مستعمل ہے۔ مترادف شوق بھی جانتے ہیں۔ آگ سے مراد آتشِ عشق گھر سے مراد دل۔

خانۂ دل میں آتشِ عشق ایسی لگی کہ خانۂ دل میں مزۂ وصل اور یادِ محبوب تک باقی نہ رہی۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا ‌ ‌ میری آہ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عدم بفتحتین وہ شے جس کا وجود نہ پایا جائے۔ اور فقد عدم الشی بعد الوجود اور یہ عدم سے اخص ہے۔ پرے اُدھر۔ دور۔ لکھنؤ میں اب نہیں بولتے۔ دہلی میں اب بھی رائج ہے۔ عنقا ایک پرندہ معلوم الاسم ومعدوم الجسم۔ سلیمان حییم اپنی لغت ENGLISH INTO PERSIAN میں فونکس کا ترجمہ عنقا۔ ققنس۔ سیمرغ موسیقار وہما کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک الفاظ مترادف ہیں۔ لہٰذا ققنس اور موسیقار اس کے معنی کہے جائیں تو مناسبت بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ موسیقار کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ جوان ہو کے مستی کی حالت میں لکڑیاں جمع کرتا ہے۔ اس کی چونچ میں سوراخ ہوتے ہیں دم بھر کے ان سے جھاگ نکالتا ہے۔ جب دیپک کے سُر نکالتا ہے تو لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ اس آگ میں جل بھن کے رہ جاتا ہے۔ بال۔ بازو۔ پر۔ غافل منادی (اے) حرف ندا محذوف۔ خطاب محبوب سے ہے یا عام خطاب ہے۔ نظم کے مصنف کی غرض یہ ہے کہ میرے نیستی اور فنا اس حد کو پہنچی ہے کہ اب میں عدم میں بھی نہیں ہوں بلکہ اس سے بھی آگے نکل گیا ہوں۔ ورنہ جب تک میں عدم میں تھا اس وقت تک میری آہ آتشین سے عنقا کے شہپر تک جل گئے تھے۔ عنقا جب معدوم ہے تو وہ بھی عدم میں ہوا اور ایک ہی میدان میں آہ آتشین و بال عنقا کا اجتماع ہوا۔ اسی سبب سے آہ سے شہپر عنقا جل گیا کہا۔ لیکن غالب کا یہ کہنا کہ میں عدم سے بھی باہر ہوں اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ میں نہ موجود ہوں اور نہ معدوم ہوں نقیضین مجھ سے مرتفع ہیں۔ شاید ایسی ہی اشعار کی وجہ سے دلّی والے کہا کرتے تھے کہ غالب شعر بے معنی کہا کرتے ہیں۔ جبھی تو ان کو کہنا پڑا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا  گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی۔

جناب حسرتؔ۔ اپنی نیستی کا حال بمبالغہ بیان کرتا ہے کہ پہلے جب میں عالم فنا میں تھا تو بارہا میری آہ آتشیں سے بازوئے عنقا جل گیا کہ وہ بھی عدم میں تھا۔ لیکن میں اب تو اس درجہ سے بھی پرے ہوں۔

عدم سے بھی پرے ہونے کو اچھا مان لیا کہ نیستی میں مبالغہ کیا ہے مگر عنقا جو آپ معدوم ہے اس کو موجود فرض کر کے اس کے بازو جلانا تصنع لاطائل کے سوا اور کیا ہے۔ غرض یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ اور یہ میری ہی فہم کا قصور ہے۔

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں  کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

عرض کرنا پیش کرنا۔ بیان کرنا۔ بیان کرنا چھوڑ کے جناب غالب نے عرض کرنا یہاں بھی اور دو ایک جگہ اور بھی صرف جوہر کی مناسبت سے کہا ہے۔ اسی وجہ سے جناب حسرت نے بھی لکھ دیا کہ عرض اور جوہر میں رعایت لفظی ہے۔ حالاں کہ عرض مقابل جوہر بفتحتین ہے۔ اور یہاں عرض بسکون ثانی نظم میں ہے۔ صرف توہم عرض مقابل جوہر

کی طرف ہو سکتا ہے۔

حضرت امیر خسروؒ نے ایک جوہر اور نو اعراض کو جنہیں مقولات عشرہ کہتے ہیں اس شعر میں جمع کر دیا ہے ؎

روئے دراز نیکو دیدم بشہر امروز　　　　با خواستہ نشستہ از کر دخویش فیروز

نو اعراض یہ ہیں :

کم وکیف و این متیٰ۔ ملک وجدہ۔ وضع۔ فعل اضافہ وانفعال ۔ انفعال اضافہ ۔ جوہر قائم بالذات اور وہ پانچ ہیں جن کو میں نے نظم کر دیا ہے ؎

ہیئت جوہر منقسم بر پنج قسم　　　　صورت ونفس وہیولیٰ عقل وجسم

عرض بفتحتین جو قائم بالغیر ہو۔ اعراض کو بھی میں نے نظم کیا ہے ؎

کم وکیف واین و ملک وضع داں بے قیل وقال

پس اضافہ ہم متیٰ وفعل بعدش انفعال

## مقولات عشرہ　　TEN CATEGORIES

جواہر (جمعش) جوہر　SUBSTANCE　(معرب گوہر عربی میں اس کا مترادف نہیں ہے)

اعراض (جمعش) عَرَض (بفتحتین)　ACCIDENT

اعراض تسعہ　NINE ACCIDENTS

| | | | |
|---|---|---|---|
| کیف | 2. QUALITY | کم | 1. QUANTITY |
| اَین | 4. PLACE | اضافہ | 3. RELATION |
| وضع | 6. COLLOCATION | متی | 5. TIME |
| فعل | 8. ACTION | ملک وجدہ | 7. POSSESSION |
| | | انفعال | 9. PASSION |

مجھے اس شعر میں لفظ "کہاں" اچھا نہ معلوم ہوا۔ اس لیے یوں بناتا ہوں ؎

جوہر اندیشہ کی گرمی بیان میں کیا کروں۔

کیا اس میں عظمت وفخامت کے لیے ہے۔ جوہر اندیشہ کی گرمی آتش عشق کے جوہر خیال کی حرارت (جوہر اُردو میں بمعنی ہیرے۔ ست۔ خلاصہ بھی مستعمل ہے) وحشت ضد اُنس بمعنی نفرت وگریز۔ وحدت وخلوت وتنہائی وخوف کے معانی بھی اُردو میں ہیں۔ جنگلی ہونا۔ رام نہ ہونا ضد اہلی ہونا۔

گرمی جوہر خیال عشق میں کیا بیان کروں محض خیال وحشت و صحرا نوردی آیا تھا کہ صحرا میں آگ لگ گئی۔ اگر صحرا نوردی عمل میں بھی آئی ہوتی تو نہ معلوم کیا حال ہوتا۔ صحرا، اصحر کا صیغہ مونث ہے۔ وہ دشت کہ جس کی مٹی کا رنگ بھگ میلا سرخ ہو۔

دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار　　　اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

داغ نشان۔ دھبا۔ مگر شعرا بمعنی زخم و نشان زخم و زخم خون آلودہ یا سوزش استعمال کرتے ہیں اسی وجہ سے چراغان کے ساتھ استعارہ کیا ہے چراغان یا مداوان کی طرح چراغ کا مزید علیہ ہے۔ جمع نہیں ہے۔ بہت سے چراغ جو کسی خوشی میں یا کسی معزز کی آمد پر جلائے جاتے ہیں
بدل اضافت ہوتا ہے تو اس میں بھی فاصل لے آتے ہیں۔ جیسے

شیخ سعدی ؎

کمان را نشد ناوک اندر حریر

کمان را ناوک مضاف و مضاف الیہ اور نشد درمیان میں فاصل واقع ہوا ہے۔ پہلے مصرع کی ادبی تحقید بھی یوں دور ہوسکتی ہے ؎

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھکو داغوں کی بہار

دل تو تجھے پہلے ہی دے چکے اگر وہ میرے پاس ہوتا تو داغ ہائے دل کی تجھ کو بہار دکھاتا کہ کیسے کیسے پھول کھلے ہیں۔ لیکن اب تو دل جو اس بہار کا باعث تھا وہی نہیں رہا تو ایسی حالت میں کیا کرسکتا ہوں مجبور ہوں۔ اور اس باغ پر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔

میں ہوں اور افسردگی آرزو غالب کہ دل　　　دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

افسردگی پژمردگی۔ دل گرفتگی۔ اداسی۔ بدمزگی۔ تپاک اضطراب۔ بے قراری کسی کی تکلیف دیکھ کر بے چینی۔ اردو میں لطف۔ مہربانی۔ جوش۔ تپ اور الف و کاف کلمہ اتصاف سے مرکب ہے۔ اور تعجب نہیں کہ یہ حروف نسبت ہوں کیوں کہ فارسی میں حروف نسبت کثیر ہیں۔ جیسے گلشن گلشن میں (نگ) ہوشنگ میں (اد) آباد میں۔ دل جلنا۔ دل کو رنج پہنچنا کسی شخص یا بات پر دل جلنا غصہ آنا۔ افسردگی اور دل جلنا میں صنعت تضاد ہے۔ لکھنؤ میں طرز مذکر اور رسم مونث ہے اور دلی میں اس کے برعکس دنیا دُنوٰ سے مونث کا صیغہ ہے قریب کی چیز۔ ادنیٰ صیغہ افعل التفضیل اس کا مذکر ہے۔ اہل دنیا کا طرز تپاک ظاہری اور منافقت باطنی دیکھ کر دل جل بھن کے رہ گیا۔ لہٰذا اس کی تمنا ہے کہ

ان سے بدمزگی ہی رہے تو اچھا ہے۔

شمار سُبحہ مرغوب بُت مشکل پسند آیا　　　تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا　　　ردیف

ردیف (آیا) کی جگہ دونوں مصرعوں میں اگر (آمد) لے آؤ تو پورا شعر فارسی کا ہو جائیگا۔
سُبحہ بالضم تسبیح مرغوب آیا فارسی مرغوب آمد کا ترجمہ ہے اردو میں مرغوب ہونا بولتے ہیں۔ مشکل پسند صفت بت ہے —" شمار سُبحہ پسند آیا" اگرچہ مطلوب نہیں۔ جناب غالب کو اسی کا دھوکا ہو گیا جو مرغوب آیا کہہ گئے۔ مشکل پسند صفت میں بُت کے اس لئے کہا کہ سو دل ایک مٹھی میں لینا کار دشوار ہے۔ مرغوب وہ شے جس کو لینے کی طرف رغبت اور طمع ہو "پسندیدہ" لفظ "پسند" کے ساتھ صنعت ترجمتہ اللفظ ہے۔ پسند کے ساتھ ہونا اور آنا دونوں مصدر مستعمل ہیں تماشا شی سے باب تفاعل کا مصدر ہے مگر عربی میں اس باب سے دیکھا نہیں گیا کسی کے ساتھ چلنا معنی ہیں۔ فارسی اور اُردو میں بمعنی (دیدن) مستعمل ہے۔ خصوصاً ایسی چیز کا دیکھنا جس کے دیکھنے سے مسرت و فرحت و تعجب پیدا ہو۔ بیک کف مٹھی بھر۔ اظہار مقدار و تعداد کے لیئے لائے ہیں۔ بُت۔ اور صنم مورتی۔ مورت۔ محبوب کے لیئے علم ہو گئے ہیں۔ اُن کے حسین ہونے کی وجہ ہے۔ کیوں کہ بُت انسانی صنعت ہے جتنا ہی چاہے حسین بنالی جائے زبان حال فارسی میں بمعنی مجسمہ STATUE بھی مستعمل ہے۔ تسبیح میں سو دانے ہوتے ہیں اس لیئے (بیک کف بردن صد دل) کہا۔ بت کا فر اور اس کا تسبیح چھینا اسی ضرورت سے فرمایا۔ ورنہ اس کے ہاتھ میں مالا ہونا چاہیئے تھا۔
محبوب مشکل پسند کو تسبیح کا چھینا اس لیئے پسند ہوا کہ وہ چاہتا ہے بیک وقت سو سو دل اُس کی مٹھی (قبضہ) میں ہوں۔ دانہائے تسبیح سے گویا دل کو تشبیہ دی ہے۔

بفیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے　　　کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

فیض و عطا و بخشش۔ جود و وہب۔ سیلاب کثیر و مطلق جیسا کہ اس جملہ میں ہے — (اعطا لا غیضاً من فیض (بہت میں سے اسے تھوڑا سا دیا) بیدلی۔ بیدل۔ عاشق۔ دلدادہ۔ آخر میں یائے مصدری۔ دنیا کی کسی چیز کی طرف راغب نہ ہونا۔ جاوید۔ بیائے معروف۔ پایندہ و دائم و قائم۔ و عالم آخرت کیوں کہ وہاں دوامًا قیام رہے گا۔ کشایش۔ کشود کار۔ کسی مشکل کا حل ہونا۔ حصول مطلب عُقدۂ مشکل وہ گرہ جو کھل نہ سکے۔ نومیدی جاوید کو عقدۂ مشکل کہا ہے۔ مشکل اور آسان میں صنعت مطابقت و تضاد ہے۔ بجائے نومیدی۔ محرومی بھی کہہ سکتے ہیں۔

بیدلی کے فیض نے ہم کو ہر شئے سے بے نیاز کر دیا ہے لہٰذا نا امیدی دائمی بھی ہمارے لیے آسان ہو گئی ہے۔ اور اس کا تحمل ہم کو دشوار نہ رہا۔ خود کشود کار کو ہمارا یہ عقدۂ (مشکل یعنی نا امیدی جاوید پسند ہے۔ لہٰذا حصول مطلب کیوں ہونے لگا جس کی ہم کو پروا بھی نہیں۔

ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل — کہ انداز بخون غلتیدنِ بسمل پسند آیا

ہوا علاوہ معنی عنصر معروف آرزو وئے نفس۔ اس کی جمع اہوا ہے۔ محبت۔ اشتیاق۔ رغبت۔ میل۔ احساس شدید ہیجان احساسات۔ خواہش۔ آئینہ۔ مرأة۔ سنجل (مرر MIRROR) کہتے ہیں کہ آئین بمعنی زینت اور ہائے نسبت سے مرکب ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ سکندر کی فرمائش سے ارسطو یا حکیم بلیناس نے پہلے پہل لوہے سے بنایا اس لیئے اس کی اصل آہنہ تھی۔ اسکندریہ ساحل پر ایک بڑا اور اونچا پھاٹک بنا کے اسے نصب کیا تھا تاکہ فرنگستانی دریائی لٹیرے جب کشتیوں پر آئیں تو ان کا عکس اس آئینہ میں پڑے اور نگہبانان ساحل آمادہ و تیار ہو جائیں۔ غلتیدن مگر اس کا املاء طاء مطبیقہ سے رائج ہو گیا ہے شاید صحیح نہ ہو۔ لوٹنا بسمل بسملہ سے مشتق ہے اور وہ بسم اللہ کا مصدر جعلی ہے۔ چوں کہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اللہ اکبر پڑھتے ہیں اس لیئے مذبوح۔ مقتول۔ کشتہ اور سر بریدہ کے معنی ہیں۔ شعراء ادھ مرے کے لیئے نیم بسمل بھی لاتے ہیں۔ بسملہ کی طرح حوقلہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ سے اور طلبق طال اللہ بقاء سے بنا لیا ہے۔ پہلے مصرع کے آخر سے (ہے) محذوف ہے۔ یعنی معشوق ستم گار کو سیر گل کی آرزو کا ہونا اس کی بے مہری کی دلیل بین ہے۔ کیوں کہ بسملوں کو خون میں لوٹتے ہوئے دیکھنا اس کو پسند ہے۔ گلہائے سرخ کو بسمل بخون غلطیدہ سے تشبیہ دی ہے۔

---

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

ہر رنگ (میں محذوف) بہر حال۔ بہر طور۔ ہر طرح سے (رنگ) طرز۔ روش۔ سیرت (برہان) رقیب۔ حارس۔ نگہبان۔ محافظ۔ منتظر۔ ایک محبوب کے دو عاشق ایک دوسرے کے رقیب کہلاتے ہیں کیوں کہ ایک دوسرے کے افعال و حرکات کی دیکھ بھال اور تاک جھانک رکھتے ہیں۔ لزوماً بمعنی دشمن عریان عریۃ و عریا سے صیغہ اسم فاعل ہے بمعنی برہنہ (از لباس) نکلا ظاہر ہوا۔ دکھائی دیا۔ پایا گیا ؎

شوق ہر طرح عدوئے سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کی صورت میں بھی عریاں نکلا

شوق ہر حالت میں دشمن ساز و ساماں ہی ہے چنانچہ اُس کی تصویر تک برہنہ از لباس ہوتی ہے پھر اور چیزوں کا کیا ذکر۔

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب　　　تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

بہت اچھا شعر ہے۔

داد دینا۔ انصاف کرنا۔ فریاد رس ہونا۔ حق ادا کرنا۔ یہاں مراد تنگی دور کرنا۔ یارب۔ کلمۂ استعجاب و افسوس پر افشاں۔ پر پھٹ پھٹاتا ہوا۔ پر ٹکراتا ہوا۔ جناب نظم سراسیمہ و پریشان اور گھبرایا ہوا معنی کہتے ہیں۔

جناب حسرت نے بھی مصنف کے معنی عود ہندی سے جو نقل کیئے ہیں اس میں بھی لفظ سراسیمہ لکھا ہے۔ تنگی۔ انقباض گھٹن ضد فراخی و کشادگی۔ تیر عربی سہم۔ سنسکرت بان۔ اس کے چار جزو ہوتے ہیں۔ پیکان۔ (لوہا) نے (بانس) پر جو سوفار سے قریب دونوں جانب لگے ہوتے ہیں۔ تاکہ تیر سیدھا جائے اور لہرائے نہیں (افشاندن جھاڑنا۔ چھڑکنا)۔ سوفار پچھلا حصہ تیر کا جو تیر چلاتے وقت زہ پر رہتا ہے۔

اس قدر دل میں تنگی تھی کہ زخم تیر سے بھی اس میں فراخی نہ پیدا ہوئی۔ فراخی و کشادگی تو درکنار خود تیر کے پر بوجہ تنگی دل جھڑ گئے۔ یا۔ وہ مضطرب و پریشان نکلا۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل　　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بو فارسی میں اچھے اور بری دونوں بو کے لیے مستعمل ہے۔ امتیاز کے لیئے خوش اور بد بڑھا لیتے ہیں۔ اُردو میں مطلق بو بد بو ہی کے لیے بولا جاتا ہے۔ محفل حفل سے اسم ظرف مکان جس کے معنی جمع ہونے کے ہیں۔ اُردو میں ہر بزم نشاط کو کہتے ہیں۔ اور مجلس جلوس سے ظرف جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں یعنی جائے نشست۔ لیکن شیعیوں میں بزم عزائے امام حسین علیہ السّلام کے لیئے خاص ہے۔ سو کو شعراء لکھنؤ نے نہ معلوم کیوں ترک کیا۔ بہت نرم اور اچھا لفظ ہے (ترجمہ ذ) عربی) فارسی میں حروف جزا نہیں ہوتے ہیں۔ خوبی میں مشہور شعر ہے۔

تیری بزم سے کوئی شئے نکل کے جانا نہیں چاہتی حتیٰ کہ بوئے دل و نالہ عشاق و دود شمع بزم میں سے جو بھی تیری محفل سے نکلتا ہے وہ پریشان ہی نکلتا ہے۔

دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذت درد　　　کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

مائدہ = دستار خوان پراز طعام۔ دخوان جس پر طعام ہو یا نہ ہو۔ لب و دندان حسب استعداد و قابلیت یاران۔ (حسرت) صاحب فرائد اللغۃ فی الفروق لکھتے ہیں کہ حزن شدت ہم و غم کا۔ اور حسرت شدت ندامت کا نام ہے۔ مگر استعمال اس لفظ کا اُس آرزو کے ساتھ ہے جو پوری نہ ہوئی ہو۔ کام مقصد و مطلب۔ تالو۔ اور مجازاً دہن۔ ان آخری دو معانی کی وجہ سے مائدہ لذت۔ اور لب و دندان کے ساتھ ایہام تناسب ہے۔

ہمارا دل حسرت زدہ و مایوس دستار خوان پُر از طعام لذت درد ہے۔ ہمارے ہمدم اور ہم نشینوں نے اپنی اپنی استعداد کے موافق اُس سے استفادہ و استلذاذ کیا۔ ورنہ اس میں تو لذت درد کی کچھ کمی نہ تھی جتنا جو چاہتا لے سکتا تھا۔ اپنی ذات ہیں درد کثیر اور اس سے لذت یاب ہونے کا بیان ہے۔

اے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند  سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

اے کی منادی ہمت ہے اور نو آموز فنا ایک صفت مقدم اور دشوار پسند دوسری صفت اس کے بعد ہے۔ یا۔ نو آموز سے اپنی ذات مراد ہے بوجہ تازہ مبتلائے عشق کے۔ فنا ہمت جس میں بہت فنا و نیست ہونے کی ہو۔ دشوار پسند اپنے آپ کو نیست و نابود کر دینا سخت مشکل کام ہے۔ یہ کام فنا ہو جانا۔ اس ترکیب سے ندا اور منادی میں فصل جاتا رہتا ہے اور دونوں صفات بھی متصل ہو جاتے ہیں۔ نو آموز نوسکھیا۔ اناڑی۔ بترکیب منعولی نہ فاعلی۔

اے غالب اگرچہ تو نوسکھیا ہے مگر دشوار پسند ہے فنا ہو جانے کی ہمت رکھتا ہے۔ اب یہ بڑی مشکل آپڑی کہ یہ دشوار کار فنا بھی تیرے لیئے معمولی اور آسان ہی نکلا۔ بوجہ عشق کامل خطرات میں پڑنے کو معمولی بات سمجھتا ہے۔ اس لیے اسے بوجہ دشوار پسندی کوئی مرحلہ جو فنا سے بھی زیادہ ہو اس کا خواہاں ہے۔ کیوں کہ جان دینا جو سب کے لیئے دشوار کام تھا وہ بھی اسے بوجہ ہمت عالی آسان معلوم ہوا۔

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالب  آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

ع  آہ قطرہ جسے سمجھے تھے وہ طوفان نکلا

اس طرح (نہ نکلا) کا تنافر بھی دور ہو جاتا ہے۔ طوفان السیل المغرق۔ ہوائے تند و تیز۔ طغیان آب۔ جوش و خروش دریا۔

اے غالب دل میں گریہ ہیجان اور شورش میں ہے۔ میں اسے ضبط کر رہا تھا لیکن جوش اور ہیجان جنون سے اس کے ضبط پر مجھے اب قدرت نہ رہی تو وہ اُبل پڑا۔ بحالت ضبط جسے میں معمولی ایک قطرہ سمجھے ہوئے تھا افسوس کہ اس کے ظاہر ہونے سے معلوم ہوا کہ وہ تو ایک طوفان ہے جس نے سارے عالم کو غرق کر دیا۔ دوسرا مصرع یوں بھی ہو سکتا ہے ؎

میں جسے قطرہ سمجھتا تھا وہ طوفان نکلا

---

غ دھمکی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

مرگیا۔ مین سے (ین) حذف ہونے کے بعد (مر) کے میم سے جل کرتنا فر پیدا ہوگیا۔ غالب کے کلام میں یہ بات بکثرت ہے۔ وہ اس کی ادنی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ جہاں آسانی سے یہ تنافر دور ہو سکتا ہے اسے بھی رہنے دیتے ہیں۔ (مین) کی جگہ (سے) لا سکتے تھے۔ باب سزاوار۔ شایستہ۔ مناسب۔ درخور۔ نبرد جنگ و جدال نبرد پیشہ جنگجو۔ دلاور مرد شجاع۔ بہادر۔ ظاہر ہے کہ ایسے الفاظ کے معانی لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں مگر میری شرح طالب علموں کے لیئے ہے نہ فاضلوں کے لیئے۔ دھمکی ڈراوا۔

جو سزاوار مقابلہ و جنگ مصائب عشق نہیں وہ تو صرف دھمکی میں مرجاتا ہے۔ کیوں کہ عشق جس کا پیشہ ہی جنگ ہے وہ تو اپنے مقابلہ میں خواہان شجاع ہوتا ہے۔ عشق تھڑدلوں کا کام نہیں۔ اس کے مقابلہ کے لیئے رستم کا کلیجہ درکار ہے۔

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا اُڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

کھٹکا دل میں خیال کسی ناگوار ناپسندیدہ شے کے وقوع کا۔ ڈر۔ خوف۔ حزن۔ بیم۔ اڑنا۔ خون نہ رہنے کی وجہ سے حالت نزع میں مرنے والے کے چہرہ کا رنگ زرد پڑجاتا ہے۔ رنگ کے نہ رہنے کے واسطے رنگ کے ساتھ اُڑنا مصدر کا استعمال ہے۔ عربی کی مثل ہے الصفرۃ للوجل۔ والحمرۃ للخجل۔ خوف زدہ کے چہرہ کا رنگ زرد اور شرمندہ کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔

مردنی چھا جانے میں تو سبھی کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ مگر میرا رنگ زندگی ہی میں خوف مرگ کی وجہ سے پہلے ہی سے زرد تھا کہ بعد از موت فراق یار میں تا حشر کیا گذرے گی۔ عشق میں بھی چہرہ کا رنگ زرد پڑجاتا ہے۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں  مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

تالیف ۔ ادھر اُدھر سے لے کے کتاب کا جمع کر دینا۔ نسخہ ۔ وہ کتاب جو کسی کتاب سے نقل کی جائے کتاب منقول۔ وفا ۔ وعدہ وعہد کا پورا کرنا۔ راستی فعل میں اور صدق راستی قول میں مجموعہ مسائل مختلفہ کی کتاب ۔ کشکول ۔ فرد فرد منتشر۔ غیر مرتب ۔

جس وقت کہ کتاب خیال کے اوراق منتشر اور غیر مرتب تھے ۔ یعنی زمانہ کو دکی تھا اسی وقت سے کتاب وفا داری کی تالیف کی مجھ میں قوت تھی ۔ یعنی طفلی سے عاشق وفادار ہوں ۔

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خون ہے اب  اس رہ گذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

اس رہگذر میں دل سے لے کر جگر تک کی راہ میں ساحل کنارہ بحر گرد ہونا ۔ بے حقیقہ و بے وقعت ہونا۔ خون ۔ عربی دم اُردو لہو۔ فارسی میں بمعنی غم وغصہ واندوہ بھی مستعمل ہے ۔ رہگذر ۔ گذرگاہ ۔ راستہ ۔ راہ ۔

دل سے لے کر جگر تک جو اب ساحل بحر خون ہو رہا ہے کبھی (زمانہ وصال میں) اسی راستہ میں وہ شگفتگی اور بہار تھی کہ جس کے آگے جلوۂ گل کی کوئی حقیقت نہ تھی ۔ اب زمانہ ہجر میں افسردگی و پژمردگی کے سوا اور کیا رکھا ہے ۔

جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہ عشق کی  دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

کشمکش ۔ گومگو کی طرح کشیدن کے امر ونہی سے مرکب ہے بمعنی کشاکش وغم والم بسیار کوئی اب اس کی جگہ پر کہیں بھی بولتے ہیں ۔ وہی وہ ضمیر اور ہی حرف تخصیص سے مرکب ہے ۔ اسی طرح ، جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے ۔ اندوہ ۔ گرفتگی گلو۔ انقباض خاطر۔ غم والم۔ مترادف غصہ یعنی گریہ گلوگیر۔

دل اگر گیا بھی پھر بھی دل کا درد نہ گیا (کیوں کہ دل کا جانا تو خود ایک درد ہے) دل کے جانے سے چاہیئے تھا کہ اندوہ عشق سے چھوٹ جاتے مگر وہ تو اسی طرح موجود ہے ۔ تھوڑی تعقید کے ساتھ یہ مصرع یوں ہو سکتا ہے ؎

جاتی کہیں ہے کش مکش اندوہ عشق کی

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے  زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

جیلب ۔ مائل بالطبع بطرف شئی ملذ ۔ مُحِبّ و محبوب دونوں کے معنی ہیں ۔ احبۃ ۔ احبّا ر و احباب اس کی جمع ہے ۔ بیابان ۔ مزید علیہ بے آب کا ہے وہ صحرا جہاں پانی میسر نہ ہو ۔
دیوانۂ آوارہ گرد و صحرانورد سمجھ کے دوستوں نے قید میں رکھا شاید علاج وحشت ہو جائے مگر زندان میں ہو کر بھی خیال صحرانوردی نہ گیا ۔ خیال کا علاج کوئی کیسے کرتا ۔

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے     حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

خدا غالب کی مغفرت کرے عجب طرح کا آزاد آدمی تھا کہ مرنے کے بعد بھی اُس کی لاش بے کفن ہے ۔

---

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہوا     ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہوا

دہر ۔ مدت طویل حتیٰ کہ ایک ہزار سال تسلی ۔ کشف و ازالہ ہم ۔ اطمینان خاطر ۔ تسکین دل ۔ وفیٰ اتمام وعدہ و محافظت عہد و پیمان ۔ لفظ نقش کا فائدہ میں نہ سمجھا (کار یا فعل کفایت کرتا ہے) ۔
محبوب سے وفاداری کر کے بھی طمانیت قلب نہ حاصل ہوئی ۔ جس سے ظاہر ہے کہ لفظ وفا ایک بے معنی لفظ ہے جیسے نپولین محال کو بے معنی کہا کرتے تھے ۔ اور ناممکن کو لغت سے نکال ڈالنے کو کہتے تھے ۔

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا     یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہوا

سبزہ ۔ عنفوان شباب میں گوری جلد کے نیچے ڈاڑھی مونچھ کے بال جب نکلنے کو ہوتے ہیں تو جلد سبز دکھائی دیتی ہے ۔ اور زمرد (پنّا) بھی سبز رنگ کا ایک قیمتی جوہر ہے اس لیے سبزہ خط کو زمرد سے استعارہ کیا زمرد بتوالی ضمہ مع رار مشدد مگر اہلِ فارس تخفیف را بھی نظم کرتے ہیں ۔ نورتن میں اس کا شمار ہے ۔ یہ بھی خیال ہے کہ سانپ کو زمرد دکھانے سے وہ اندھا ہو جاتا ہے ۔ ہندوستان میں کہتے ہیں کہ حاملہ عورت کو بھی دیکھ کر اندھا ہو جاتا ہے ۔ افعی ۔ مونث اُفعُوان بڑی خبیث بے پھن کی ناگنی ۔ کاکل ۔ طرّہ مانگ کے پاس کے بال ۔ اس کے بعد زلف ۔ اُس کے بعد کاکل اُس کے بعد گیسو کان کے پیچھے کے بال ۔ گدی کے بال جعد ۔ لکھنؤ میں مؤنث ہے ۔ دہلی میں مذکر ہوگا ۔ دم ۔ نفس ۔ نخوت ۔ فریب ۔ افسون ۔ پھنکار سرکش متمرد ۔ نافرمان ۔ سر پر ہونے کی وجہ سے تناسب ظاہر ہے ۔ معنوی خوبی لفظ (دم) کی نہ معلوم ہوئی ۔ صرف "حریف افعی" کافی ہے ۔
معشوق کا سبزۂ خط نہ معلوم کس طرح کا زمرد ہے کہ اس کی تاثیر افعی کاکل پر ذرا بھی نہ ہوئی اس کی

خوبی و دل فریبی کو نہ گھٹا سکا۔ اس کے دل پھانسنے کو نہ روک سکا۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں　　وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہوا

وفاداری میں بھی اندوہ اس لیئے کہا کہ وفا پر بھی کوئی اثر معشوق پر نہیں ہوتا ہے اس لیئے محبوب کو لفظ ستم گر سے یاد کیا ہے۔ ان کے مرنے پر اس کا راضی نہ ہونا اس بنا پر ہے کہ اس کی بدنامی ہوتی۔ اور وہ عاشق کا غم سے چھٹکارا کب چاہتا ہے۔ اندوہ جفا سامنے کا لفظ تھا، مگر غالبؔ سیدھا سادہ کب کہنا چاہتے ہیں۔ اپنی مجبوری۔ لاچاری وفاداری کا اظہار ہے۔ اور باوجود جور و جفا مرضی محبوب کا خواہاں رہنا اس شعر کی خوبیوں میں سے ہے۔

دل گذرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی　　گر نفس جادۂ سر منزل تقوی نہوا

تقوی۔ وہ خصلت طاعۃ جس کی وجہ سے عقوبت سے نجات ملے۔ امیرالمومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

> "ترک اصرار علی المعصیۃ والاغترار علی الطاعۃ جس کی وجہ سے نجات از نار و قیام بدار القرار ہو۔ نام ہے منتہی الطاعات۔ پرہیزگاری اور متقی وہ صفت مدح ہے جس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو مستحق ثواب ہو۔"

ایرانی جن الفاظ کے آخر میں الف مقصورہ ہوتا ہے اس کا یائے ماقبل مکسور کے ساتھ بھی تلفظ کرتے ہیں جیسے مینی عیسی۔ دینی دنیا۔ لیلی لیلی وغیرہ۔ نَفَس بالتحریک۔ دم۔ سانس۔ خون۔ تار۔ رشتہ۔ خط۔ جادہ اس کے تشبیہات میں سے ہے۔ جادۂ سر منزل جناب نظم و حسرت دونوں بزرگ جادہ کو باضافہ اور سر کو بلا اضافہ پڑھتے ہیں۔ میرے نزدیک بظاہر جادہ پر اضافہ نہ ہو مگر باطناً ہو۔ اور (سر) پر اضافہ ظاہر میں ہو۔

اہل ایران الفاظ ذوات الہاء سے اضافہ حذف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ نظامی اشعار حمد سکندر نامہ میں فرماتے ہیں ؎

توئی کآفریدی زیک قطرہ آب　　گہر ہائے روشن تر از آفتاب

یعنی قطرۂ آب۔

مجھے اس محل پر استعمال لفظ "نفس" کی خوبی نہ معلوم ہوئی۔ جو یقیناً میری سمجھ کا قصور ہے۔ بایں ہمہ

اس مصرع کو اس طرح تجویز کرتا ہوں ؎

گر نفس راہبر منزل تقویٰ نہ ہوا

سر منزل ۔ منزل کی ابتدا اور اس کا آغاز ۔

حاصل شعر یہ ہے کہ اگر زہد و ورع و طاعات و تقویٰ و پرہیزگاری کی طرف طبیعت مائل نہیں اور اس پر عمل نہیں ہو سکتا ہے تو رندی ہی سہی ۔ معطلی بحت اچھی نہیں ۔

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی ۔۔۔ گوش منت کش گلبانگ تسلی نہوا

گلبانگ ۔ آواز خوش و بلند ۔ آواز بلبل ؎ میں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی خوش ہوں کہ کبھی کوئی امید پورے ہونے کی تو تم سے امید نہیں تم وعدۂ وصال بھی نہیں کرتے ہو میں اس پر بھی راضی ہوں ۔ کیوں کہ کسی کا احسان لینا تو درکنار میں نے کبھی تم سے یا کسی اور سے ایسی بات بھی نہیں سنی جو موجب تسلی خاطر ہو ۔ تم اگر وعدہ بھی کرتے ہو تو اس کا ایفاء تو تم سے ہوتا نہیں اور مجھے مفت مفت میں احسان مند ہونا پڑتا ۔ حالاں کہ احسان کسی کا مجھے پسند نہیں وعدہ ۔ کسی خوبی کا امیدوار کرنا ۔ خوشخبری ۔ مژدہ ۔ وعدہ خیر اور وعید خبر انداز ۔ ڈراوا ۔ دھمکی ۔ وعدۂ شر ۔

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجیے ۔۔۔ ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہوا

میں ایسا حرمان نصیب ہوں کہ میری بد ترین تمنا بھی پوری نہیں ہوتی چنانچہ مرنا چاہا وہ بھی ممکن نہ ہوا ۔ پھر اپنی محرومی قسمت کی شکایت کس سے کروں ۔ تم ایسی سنتے نہیں اور میرا تکالیف میں مبتلا رہنا ہی چاہتے ہو محرومی ۔ عدم حصول مدعا ۔ حرمان سے محروم مفعول کا صیغہ ہے اس میں یائے مصدری ملائی ہے ۔ امتناع و ممانعت ۔ قسمت ۔ النصیب من الخیر ۔ جمع قسم ۔ مقدر ۔ حصہ ۔ بہرہ ۔ شکایت ۔ شکویٰ ۔ شکو ۔ شکاۃ ۔ شکاوۃ و شکیۃ کسی سے دادرسی چاہنا ۔ کسی کے سلوک بد کی اطلاع دینا ۔

مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالبؔ ۔۔۔ ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہوا

صدمہ ۔ دفع و ضرب جسم ۔ دھکا ۔ مصیبت پہنچانا ۔ الم و رنج دینا ۔ حریف ۔ ہم پیشہ ۔ مقابل ۔ یہاں مراد متحمل ۔ عیسیٰ ۔ عبرانی یسوع سے ماخوذ ہے JESUS مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ کے نفس و دم سے مردے زندہ ہو جاتے تھے ۔ اور مریض صحت پاتے تھے ۔ حتیٰ کہ اکمہ و ابرص بھی شفایاب ہوتے تھے ۔

میں ایسا کم زور و ناتواں ہوں کہ (نفس عیسوی جس میں قوت احیاء تھی) ان کے لب ہلانے کے صدمہ سے بجائے صحت یاب ہونے کے میں مر گیا اور حرکت لب عیسوی کے صدمہ کا بھی متحمل نہ ہوا۔ کم زوری کا مبالغہ کے ساتھ اظہار ہے۔

---

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا ‏ ‏ ‏ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا ‏ ‏ ‏ ۱۲ج

رُضوان = بالکسر و بالضم خوشنودی ضد سخط و کراہت۔ ایرانی بمعنی موکل و دربان و داروغہ بہشت بھی لاتے ہیں۔ باغ بہشت = باغ رضوان = جنت۔ عربی میں جنت بھی ۔ بمعنی باغ ہے۔ باغ خوشنودی۔ یعنی بہشت بے خود بے ہوش = جو آپے میں نہ ہو۔ طاق نسیان = لفظی معنی کسی چیز کو طاق پر رکھ کے بھول جانا۔ نسیان کو استعارہ طاق کے ساتھ کیا ہے کسی چیز کو اس طرح ترک کرنا کہ اُس کی یاد بھی باقی نہ رہے۔ ستایش گر مداح۔ ستایش ستودن سے حاصل مصدر اور گر علامت فاعل زاہد تارک الدنیا۔ پرہیزگار اس قدر = بہت زیادہ۔ گل دستہ = پھول پتی اور شاخہائے نازک سے مرکب ایک زینت کی چیز باغ بہشت کو تحقیراً گلدستہ کہا ہے۔

زاہد جس باغ بہشت کا بہت زیادہ مداح ہے وہ ہم عاشقوں کا از یاد رفتہ گلدستہ ہے۔ ہم تو کے خواہاں ہیں جو بندگانِ تعیش اور بندگان شکم کو مبارک رہے۔

بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا ‏ ‏ ‏ کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

بیداد = بے انصافی۔ ظلم۔ کاوش کرید۔ کاویدن کا حاصل مصدر۔ مژگان جمع مژہ۔ واحد اور جمع دونوں میں مستعمل ہے۔ خار۔ سوزن اور تیر سے تشبیہہ دیتے اور استعارہ کرتے ہیں۔ مرجان = سمندر کے کیڑے اپنے لعاب دہن سے بناتے ہیں اور یہ اُن کا گھر ہے۔ پہلے لوگوں نے اسے شجر مانا تھا بعد ازاں اُس پر حجریت غالب ہو جانا کہتے تھے اس لیئے اسے جماد اور نبات کے درمیان برزخ بتاتے تھے۔ جس طرح کھجور کو برزخ درمیان نبات و حیوان۔ اور ہاتھی۔ گھوڑا اور بندر کو برزخ بین عالمی الحیوان والانسان کہتے تھے۔ جاپان کے سمندر میں کورل آئی لینڈ مشہور ہیں (CORAL ISLAND)۔ آنسو جو پلکوں پر ٹھہر جاتے ہیں پلک ان کے بیچ میں ہوتی ہے گویا بدھے ہوئے موتی ہوتے ہیں جن کو تسبیح کے دانوں کے ساتھ پوری پوری تشبیہہ ہے۔

یار کی سوزن مژگاں کے تصوّر نے دل میں کاوش کر کے دل کا خون کر ڈالا ہے لہٰذا جو اشک خون نکلتا ہے وہ مونگے کی تسبیح کے دانوں کی طرح ہے۔

نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو لیا جو دانت میں تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

سطوت ۔ حملہ و غلبہ و قہر و جبروت ۔ مستعمل بمعنی رعب اور داب دانتوں میں تنکا دبانا پہلے اظہار عجز و مغلوبی کے لیئے دانتوں میں تنکا لیا کرتے تھے جس طرح اب سپید جھنڈیاں بلند کرتے ہیں ۔ ریشہ ۔ درخت کی جڑ کے مہین سوت جو زمین سے جذب مادہ کرتے ہیں اور اس سے درخت کی پرورش ہوتی ہے نیستان ۔ نے بانس ۔ ستان ظرف مکانی ۔ سنسکرت میں استھان کے بھی یہی معنی ہیں یعنی جا و مقام ۔ مشہور ہے کہ شیر نیستان میں رہتا ہے اور نے سے بانسری بناتے ہیں ۔ جس سے نالے اور نغمے نکلتے ہیں ۔

رعب قاتل بھی مجھے نالے کرنے سے روک نہ سکا ۔ اظہار عجز کے لیئے جو تنکا میں نے دانتوں میں لیا وہ نے زار کے لیئے ریشہ بن گیا جس سے نیستان کی پرورش ہوتی ہے ۔ یعنی میرے نالے اور بڑھ گئے جن پر اسے رحم نہ آیا بلکہ تنگ آکر مجھے جلد قتل کر ڈالا اور یہی مقصود بھی تھا ۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانہ نے مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

سرو چراغان ۔ چہل چراغ ۔ اور ایک آتش بازی جو درخت سرو سے مشابہ ہوتی ہے ۔ جب اس میں آگ دیتے ہیں تو شاخیں جھول پڑتی ہیں ۔ اور ان میں چراغ ایسے روشن ہو جاتے ہیں جب مادہ آتش گیر ختم ہونے کو ہوتا ہے تو پٹاخے (پڑاقے) دراصل (پٹاکا) کی ایسی آواز دے کر بجھ جاتے ہیں ۔

میرا داغ دل ایک ایسا تخم ہے جس سے ہزاروں سرو چراغاں اگتے ہیں ۔ اگر جیتا رہا اور تم سے ملنے کا موقع ملا تو پھر تم کو اس سرو چراغاں کا تماشا دکھاؤں گا تاکہ تم میری سوزشِ داغ کو دیکھو اور عبرت حاصل کر کے کچھ رحم کرو ۔ یا پھر تفریح و مسرت حاصل کرو کہ اس سرو چراغاں کے بانی ہم ہی ہیں ۔ شعرا داغ میں سوزش و آتش بازی تجویز کرتے ہیں ۔

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

جن الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی ہو اور بول چال میں اس سے ماقبل کسرہ تلفظ میں آتا ہو تو کچھ عرصہ سے اس کا املا (ے) سے کر دیا ہے ۔ میں اس سے متفق نہیں ۔ کیا ہائے مختفی کسرۂ ماقبل کو مانع ہے یا متعذر التلفظ

ہے۔ جب ایسا نہیں تو (ہ) کو (ے) کر کے جمع کے صیغوں کے ساتھ کیوں التباس پیدا کیا جائے۔ املاء مختار کے تتبع سے اس شعر میں (رخانے)، اور (جلوے) لکھنا چاہیئے تھا مگر میں نے خانہ اور جلوہ ہی لکھا ــــ ہاں الف والے الفاظ میں ایسے محل پہ الف کو (ے) بنائے بغیر چارہ نہیں جیسے (اعلے) کی غلطی۔

اسی طرح جناب غالب نے (ذال معجمہ) فارسی کا حرف نہ خیال کر کے فارسی کے ذال والے الفاظ سے ذال کو نکال کے اُس کی جگہ (زار معجمہ) لکھنا شروع کیا۔ پھر شمس العلما حالی اور علامہ شبلی نے بھی اسے مان لیا حتی کہ اب یہ املاء عام ہوگیا۔

مرزا رضا قلی ہدایت شیرازی صاحب فرہنگ انجمن آرائے ناصری بھی فارسی میں وجود ذال کے قائل نہیں۔ مگر آپ ہی اپنے لغت میں نمایش پنجم "در بیان گاف فارسی با ذال معجمہ" ایک عنوان قائم کر کے گذار۔ گذاردن۔ گذاشتن۔ گذر۔ گذرنامہ۔ گذشت۔ گذارہ ذال معجمہ ہی سے لکھتے ہیں نہ معلوم کیوں۔

اگلے زمانہ کی قلمی کتابیں جیسے درۃ الاخبار تتمہ صوان الحکمہ مطبوعہ لاہور دیکھو تو ذال معجمہ والے الفاظ کا کیا ذکر۔ بکثرت دال مہملہ پر بھی نقطہ لگا ہوا پایا جائے گا۔ سُنتا ہوں کہ زردشتی فارسی کا حرف ذال معجمہ ہے۔ بالفرض اگر نہیں بھی ہے۔ تب بھی ایرانیوں نے اپنی زبان میں لے لیا ہے اور اس کے لیئے قاعدہ بھی بنایا ہے۔ خود ہدایت نے بھی اشعار ذیل کو نقل کیا ہے اور اشعار کو نصیر الدین طوسی سے منسوب کیا ہے حالاں کہ یہ اشعار نصیر الدین نامیہ کے ہیں :

آنانکہ بفارسی سخن میرانند ۔۔۔ در معرض دال ذال را بنشانند

ما قبل وے ار ساکن جز وائے بود ۔۔۔ دال است وگرنہ ذال معجم خوانند

اور اس قاعدہ کا عمل بھی اُن میں جاری تھا اور ہے۔ انوری متقدمین میں فرماتے ہیں :

دست بسخا چون ید بیضا بنمود ۔۔۔ از جود تو در جہان جہانے افزود

کس چون تو سخی نبود و نے خواہد بود ۔۔۔ گو قافیہ دال شو زہی عالم جود

بنا بر قاعدہ مذکور بنمود۔ افزود۔ بود چوں کہ الفاظ فارسیہ ہیں لہٰذا ہر ایک کے آخر میں دال معجمہ ہے اور جوں کہ لفظ عربی ہے اس پر وہ قاعدہ جاری نہیں ہو سکتا ہے اس لیئے چوتھے مصرعے میں عذر کیا۔ اور جب عذر پیش کیا جائے تو پھر عیب عیب نہیں رہتا۔

شرف الدین علی یزدی اپنی کتاب حلل مطرز میں اس قاعدہ دال اور ذال کو یوں نظم فرماتے ہیں :

در زبانِ فارسی فرق میان دال و ذال ۔۔۔ با تو گویم زانکہ نزدیک افاضل مبہم است

پیش از و در لفظ مفرد گر صحیح ساکن ست ۔۔۔ دال باشد ورنہ ذال معجم ست

متاخرین میں خاتم الشعرا جناب ابوالقاسم مرزا حبیب قاآنی اپنے ایک مسمط کے بند میں فرماتے ہیں۔ جس کے سب قوافی فارسی ہیں اور اس کا مطلع یہ ہے ؎

شاہے کہ تا بتخت خلاف مکان گزید — بدخواہ پشت دست زغم ناگہان گزید

دو قافیے عربی الفاظ کے لا رہے ہیں ان کے دالات ذال نہیں ہو سکتے تھے تو عذر کرتے ہیں۔

ہل من مزید گوید ہر دم جحیم از انک — خواہد زجسم دشمن او ہر زمان مزید

گو خود دو بارہ قافیہ شو دال در جحیم — با خصم او بپایہ شود تو امان یزید

ہم ہندوستانیوں کو فارسی الفاظ کے املے میں کسی قسم کے تصرف کا حق کب حاصل ہے۔ خصوصاً اتنے ایک استدلالات قویہ کے ہوتے ہوئے انکار وجود ذال معجمہ فارسی میں محض ہٹ دھرمی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصلاً فارسی میں ذال معجمہ نہیں مگر داخل ضرور کرلیا گیا۔ ہاں اگر اس کے معنی میں تصرف کر لیا ہو تو جی چاہے تو املا بھی بدل دو۔ کیوں کہ پھر یہ لفظ اردو کا ہو گا بہتر تب بھی یہی ہو گا کہ املا نہ بدلا جائے تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ یہ لفظ فلاں زبان کا ہے۔ شبنم لفظی ترجمہ رات کی تری۔ DEW بخارات فضائی جو سردی پا کے قطرات آب کی شکل میں گھاس اور پھولوں پر صبح تک باقی رہتے ہیں (اردو) اوس ستان زار کی طرح ظرف مکان کے لیے آتا ہے۔ پرتو۔ بفتح تار قرشت انعکاس نور۔ شعاع روشنائی۔ نقشہ۔ صورت مراد حالت۔ کیفیت آئینہ خانہ شیش محل۔

تیرے جلوہ نے خانۂ آئینہ کی وہ حالت کر دی جو شعاع آفتاب سے شبنم کی ہوتی ہے۔ یعنی تیرے چہرہ منور کے مقابلہ میں آئینہ کی چمک دمک ماند پڑ گئی۔ زیادہ منور شئے کے سامنے کم روشنی والی چیز دھندلی ہو جاتی ہے۔ جسے کالمعدوم سمجھو۔ اور شبنم تو آفتاب کے سامنے فنا ہی ہو جاتی ہے۔ یعنی پھر بھاپ ہو کر اڑ جاتی ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

تعمیر۔ عمارت بنانا۔ آبادی۔ مضمر۔ پوشیدہ خرابی ویرانگی ضد تعمیر ہیولیٰ مادہ صاحب غیاث اس کی حقیقت (ہیئت اولیٰ) بتاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یونانی زبان کا لفظ ہے۔

انگریزی MATTER ہر مادی چیز کی اصل۔ وہ ایک جوہر ہے جو صورت جسمیہ کے لیے محل ہوتا ہے اور صورت جسمیہ حال ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے کسی شئے کا وجود پایا جاتا ہے۔ الگ الگ وجود ظاہری نہیں رکھتے ہیں۔ لفظ صورت ہیولیٰ کی مناسبت سے لائے ہیں۔ خون گرم۔ سعی و کوشش۔ حرکت اور

رگڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ دہقان دہگان کا معرب ہے۔ اس کی جمع دہاقین لاتے ہیں۔ کاشت کار ۔ دیہاتی ۔ برق ۔ چمک ۔ کوندھا ۔ بجلی جب تک یہ بادل میں چمکتی ہے اور جب گر پڑے تو صاعقہ کہتے ہیں۔ برق LIGHTNING اور THUNDER BOLT صاعقہ ۔ تیرے از برق THUNDER فارسی تندر ، رعد ۔ گرج ۔

ہمارے وجود اور ہستی کی فطرت میں نیستی اور فنا مضمر ہے ( الوجود بین العدمین عدمٔ ۔ لدو اللموت وابنو اللخراب ۔ دوسرا مصرع بطور تمثیل ہے۔ کاشت کار کی سعی و کوشش گویا مادہ برق خرمن ہوتی جاتی ہے۔ جو خرمن کو جلا کے خاک کر دیتی ہے۔ جتنی وہ سعی بہبودی کرتا ہے اتنی ہی خرابی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ محنت و کوشش باعث تلت یا فنا قوت فعلیہ ( انرجی ) ہوتی ہے اور حرارت عزیزی کا انحطاط و انتقار باعث ضعف یا فنا ہوتا ہے۔ برق خرمن = فنا کے لیے استعارہ مشہور ہے۔

**اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر　　　مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا**

تماشا کن کا بنا بر عادت ترجمہ کر ڈالا بمعنی ( دیکھیں ) اُردو میں یہ معنی نہیں۔ بازی اور کھیل دکھا معنی ہیں۔ ( کر ) کی جگہ ( دیکھ ) ہی ہوتا ۔ یا ۔ " ذرا دیکھو " ہوتا تو اُردو کی بول چال ہوتی ۔ مدار = انحصار ۔ دار و مدار ۔ دربان = محافظ در ۔ بان کلمہ حفاظت ۔ گھاس کھودنا = کار فضول کرنا معطل رہنا ۔ یہاں معنی وضعی مراد ہیں۔

میں جنون میں صحرا بصحرا یا تلاش یار میں کوچہ بکوچہ مارا مارا پھرتا ہوں۔ گھر کی دیکھ بھال کون کرے۔ لہٰذا گھر میں گھاس اُگ آئی ہے۔ اور دربان اُس گھاس کو کھودا کرتا ہے۔ گھر کی ویرانی کا بیان ہے۔ استطاعت درباں ہوتے ہوئے گھاس کھودنے کا کام مزدور سے کیوں نہ لیا ۔ بہر حال مصرع ثانی مجھے اچھا نہ معلوم ہوا۔

**خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں　　　چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا**

آرزوئے خون گشتہ = وہ آرزو جو پوری نہ ہوئی ہو۔ اور گھٹ گھٹ کے دل کی دل ہی میں رہی ہو۔ چراغ مردہ = مترادف چراغ کشتہ ۔ بجھا ہوا یا ٹمٹماتا چراغ جسے چراغ موشی یا کور کہتے ہیں۔ گور غریباں = مفلسوں اور محتاجوں کا قبرستان ۔ غریب عربی و فارسی میں بمعنی مسافر و عجیب و نادر مستعمل ہے ۔ محتاج اور مفلس کے معنی نہیں اُردو میں یہ معنی البتہ ہیں۔ اور زبان حال فارسی میں بھی محتاج و مفلس کے معنی پر بولتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ قبرستان مسافران راہ عدم معنی کہیں۔ مگر چراغ مردہ یہی چاہتا ہے کہ غریب اس محل پر بمعنی محتاج و مفلس ہو۔ لہٰذا بنا بر مسلمات گور اور غریباں میں اضافہ فارسی نہ ہونا چاہیئے کیوں کہ اس معنی سے غریب اُردو کا لفظ ہوا۔ مگر میرا ذاتی خیال ہے کہ الفاظ عربی و فارسی میں جب تصرف معنوی ہو تو عطف و اضافہ فارسی لانے میں میرے نزدیک کچھ

ہرج نہیں۔ نہ کانوں کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ بے زبانی کے لئے خموشی لازم ہے اس لئے دونوں کا حاصل ایک ہے۔ زبان = زبانہ شعلہ شمع و چراغ کو بھی کہتے ہیں۔ اور خموش بجھے ہوئے چراغ کی صفت میں لاتے ہیں۔ لہٰذا یہ الفاظ باہم دگر متناسب ہیں۔ اپنی ذات اور دل کو آرزوئے کشتہ کا گورستان کہا ہے۔

میں چپ ہوں کیوں کہ کسی آرزو کے پورا ہونے کی تم سے امید نہیں۔ مگر اس خموشی میں بھی لاکھوں مُردہ آرزوئیں مدفون ہیں۔ گویا میں بے زبان کسی غریب کی قبر کا چراغ مردہ ہوں۔ قبرستان کو وادی خموشان بھی کہتے ہیں۔ دوسرا مصرع تمثیل ہے۔ اور شعر برا نہیں۔

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے　　　دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

ہنوز = بفتح اول۔ تاحال۔ تاکنون۔ اب تک۔ اب بھی۔ ابھی۔ اس کی جگہ (ابھی) بھی وزن میں آتا ہے۔ افسردہ = کمھلایا ہوا۔ اُداس۔ اک = خفیف سا۔ اک پرتو نقش خیال یار = خیال یار کے نقش کا خفیف سا عکس۔ حجرہ = غرفہ (منجد) چھوٹی کوٹھری۔ نقش خیال یار تو بوجہ حسن یوسف اور اپنے دل افسردہ کو حجرہ زندان یوسف سے استعارہ کیا ہے۔ پرتو اور نقش میں سے ایک لفظ مطلب پورا کر رہا ہے۔ پھر اس پر "اک" بھی لگا ہوا ہے۔ (تصویر خیالی یار کا خفیف سا عکس) اس کے مٹنے کا خیال ہی کیوں پیدا ہوا جناب نظم فرماتے ہیں کہ افسردگی اس کا باعث ہے۔

اگرچہ تم سے مفارقت میں ایک زمانہ دراز گذر گیا مگر ؎

مرے دل سے ترا نقش خیالی مٹ نہیں سکتا　　　دل تنگ اپنا اب بھی حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کے آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ　　　سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

کیا اس شعر سے معشوق بازاری شہوت پرست نہیں معلوم ہوتا۔ عاشق کے جلانے اور کڑھانے کی صرف یہی ایک تدبیر بیان ہے۔ گو یہ بیان بھی کنایۃً ہے مگر پھر بھی عریانی سے خالی نہیں۔ مصرع اچھا ضرور ہے۔ پہلے مصرع میں "بغل میں سونا" عریاں بنا رہا ہے۔ مثال کے طور پر اگر مصرع اول یوں ہوتا تو کچھ پردہ پڑ جاتا ؎

کسی کی آرزو شاید ہوئی ہے تم سے پوری آج

آپ = کلمہ تعظیم طعناً ہے۔

آج تم کسی غیر کی بغل میں ضرور سوئی ہو ورنہ سبب کیا ہے جو تم میرے خواب میں مسکراتے ہوئے میرے جلانے کے لئے آئے ہو۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا        قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

لہو پانی ہونا = رونا ۔ پہلا خیال یہ ہے کہ بحالت غم دل سے خون جوش کھا کر آنکھوں میں پہنچتا ہے اور مستحیل ہو کر بصورت اشک آنکھوں سے نکل جاتا ہے اسی کا نام گریہ ہے ۔ اب خیال یہ ہے کہ بحالت غم و غصہ معدہ سے بخارات اُٹھ کر دماغ تک پہنچتے ہیں ۔ اور سر سے متصل ہوائے سرد کی ٹھنڈک پاکر پانی ہو کے آنکھوں سے نکل جاتے ہیں ۔ قیامت ہے = بڑے غضب کی بات ہے ۔ دوسروں کو تکلیف جان اور رنج دہ تمہارا رونا ہے ۔

جناب حسرت ۔ معلوم نہیں کہ تیری جفا سے کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا جس کی ندامت کے باعث سے تیری آنکھیں سرشک آلود ہیں ۔ یا یہ کہ تیرے رونے سے کون کون رو دیا ہوگا ۔

جناب نظم ۔ تیری آنکھوں میں آنسو دیکھنے کی کس کو تاب ہے ۔ اور اشارہ اس بات کی طرف بھی کیا ہے کہ مژگان معشوق جو ہمیشہ دل و جگر عشاق میں کھٹکا کرتی ہے اُس کا آنسو وہی آنسو ہے جو عشاق کے دل میں پیدا ہو کر آنکھوں کی طرف جایا چاہتے تھے ۔ یعنی تیری پلکوں پر جو آنسو ہیں وہ تیرے دل سے نکلے ہوئے نہیں ہیں بلکہ یہ آنسو وہی ہیں جو عشاق کے دل و جگر میں پیدا ہوئے تھے ۔ اور تیری مژہ پر آنسو کا ہونا علامت ہے کہ عشاق کا لہو پانی ایک ہوگیا ۔

جناب نظم نے تو عجیب و غریب معانی لکھے جنھیں میں تو سمجھ نہ سکا ۔

معشوق کے رونے کی علت نہ شعر میں ہے اور نہ جناب حسرت دل چسپ تاویل کر سکے ۔ میری سمجھ میں تو علت کچھ آئی ہی نہیں ۔ شاید ناز معشوقانہ ہو ۔

تمہارا ناز معشوقانہ دکھانے میں بھی رونا عاشقوں کے دلوں پر غضب اور قیامت ڈھاتا ہے اور کسی طرح ان کو گوارا نہیں ۔ تمہاری چشم سرشک آلود دیکھ کر اُن کا لہو پانی ہو جاتا ہے ۔

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ        کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

جادہ بتشدید دال مہملہ مگر اہل فارس بالتخفیف استعمال کرتے ہیں بمعنی معظم الطریق جادہ اور راہ میں اضافت خاص کی طرف عام کے ہے ۔ شیرازہ وہ بندش جس سے اجزاء کتاب منظم و مرتب ہو جاتے راہ فنا کو کتاب عالم کے اجزاء پریشان کا شیرازہ کہا ہے ۔

اے غالبؔ میں فنا کو کسی وقت بھی نہیں بھولتا ہر وقت پیش نظر ہے ۔ کیوں کہ فنا ہو کر ہی دنیا کے جھگڑوں

پیش کردہ
خلیق انجم

سے نجات مل سکتی ہے۔ اور اسی سے پریشانی دُور ہوتی ہے۔

---

نہ ہوگا اک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

ذوق مزہ۔ لطف۔ ذایقہ۔ اس سے مراد مزۂ بادیہ نوردی۔ یک بیاں = اظہار مقدار کے لیئے ہے۔ ماندگی = خستگی۔ تھکن۔ حباب = پانی کا بُلا (بُلبُلہ)۔ حبُّ الْمزن عربی ہے۔ صاحب غیاث حبّ آب سے اس کی ترکیب بتاتے ہیں۔ یہ ترکیب تو اس وقت ہوتی جب فارسی کا لفظ ہوتا۔ اسی طرح حیدر کی ترکیب بھی (حیّ۔ حیہ) سانپ اور در۔ دریدن سے امر کا صیغہ مان کر اسم فاعل ترکیبی بتاتے ہیں اور درندۂ اژدر معنی بتلاتے ہیں۔ حالاں کہ حیدر عربی میں شیر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

انا الذی سمتنی اُمّی حیدرہ ضرغام آجام ولیث قسورہ

نقش قدم کو حباب اور رفتار کو موج سے استعارہ کیا ہے۔ رفتار اور موج میں وجہ جامع تو حرکت ہوسکتی ہے۔ مگر نقش قدم اور حباب میں وجہ شبہ نہ معلوم ہوئی۔ شاید پاؤں کی اُنگلیوں کے سرے کے نشانات کو حباب سے تشبیہ دی ہو جن کی شکل حباب سے ملتی ہے۔ یا۔ قدم کے آگے بڑھنے کو موج کے ساتھ حباب کے بڑھنے سے تشبیہ ہے۔

جس طرح حباب امواج کے ساتھ حرکت میں رہتا ہے اسی طرح ذوق بیاباں نوردی میں مجھے بھی کبھی سکون نہیں۔ اور اس کے ذوق میں کمی نہیں آتی۔ یک بیاباں ماندگی سے کثرت ماندگی مراد ہے۔ اور یک بیابان کو پیمانہ قرار دیا ہے۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے کہ موج بوئے گُل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

محبت بفتح میم دوستی۔ حب سے مصدر میمی ہے۔ چمن = چمیدن سے چم صیغہ امر و حاصل مصدر بھی۔ اور نون نسبت سے مرکب ہے جیسے انجمن میں نون نسبت ہے۔ خرام سے منسوب یعنی ٹہلنے کی جگہ۔ ناک میں دم آنا = عاجز اور پریشان ہونا۔ کسی چیز سے بیزار ہونا اور اس سے اُکتا جانا۔ کسی چیز کے سونگھنے میں سانس اندر کو لے جاتی ہے۔ اور دم بمعنی نفس بھی ہے۔ اس محاورہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ صرف لفظ موج کی خوبی میں نہ سمجھ سکا " البتہ " اس کی جگہ بے تکلف آسکتا ہے۔ بے دماغی = تنفر۔ بیزاری۔ یہ لفظ بھی اس محل پر مناسب ہے کیونکہ قوت شامّہ کا دماغ سے تعلق ہے۔

اب عشق میں ناکام رہنے اور تمناؤں کے پورا نہ ہونے سے وہ بے دماغی حاصل ہے کہ بوئے گل سے بھی تنفر پیدا ہوتا ہے۔

پادری ہنری کوس لاتفس جامع فرائد اللغۃ فی الفرق شیخ عز الدین بن جماعہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ حب موجب ہلاکت نہیں ہوتی ہے۔ برخلاف عشق کہ موجب ہلاکت ہے۔

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی ۔۔۔ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

رہن = مراد پابند ناگزیر مجبور۔ لاچار۔ برق سے مراد عشق حاصل پیداوار مراد ہستی (و۔ اور) دونوں مصرعوں میں استعمار کے لیئے ہے۔

از سر تا پا تو پابند عشق ہوں مگر از روئے فطرت زندگی و وجود سے الفت رکھنے پر بھی مجبور اور لاچار ہوں۔ یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ آتش (عشق) پرست بھی ہوں اور حاصل (وجود۔ ہستی) کا افسوس بھی ہے۔ عشق تو وہ برق ہے جو خرمن ہستی کو جلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لفظ عبادت کی خوبی نہ معلوم ہوئی۔ شاید اس بات کو مان لیا ہے کہ معبود عابد کو دوست رکھتا ہے ؎

تعلق برق سے رکھتا ہوں اور افسوس حاصل کا

جبکہ (اور) برائے عطف ہو۔

جناب حسرت فرماتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ میں موت کا طلب گار ہوں اور اپنی ایسی زندگی پر افسوس بھی کرتا ہوں جس پر موت کو ترجیح ہے۔ بطور استفہام پڑھنے سے طالب فنا معنی ہوتے ہیں۔

طالب فنا معنی کہنے کو۔ ناگزیر الفت ہستی۔ اور۔ لفظ افسوس مانع آتے ہیں۔

پہلے مصرع سے (ہوں) محذوف ہے۔ لانا چاہیں تو یوں آ بھی سکتا ہے ؎

سراپا رہن عشق و ناگزیر حب ہستی ہوں

اگر دونوں مصرعوں کو بطور استفہام انکاری پڑھو تو معنی طالب فنا کے ہوتے ہیں۔ یعنی سراپا پابند عشق ہو کر الفت ہستی کا مجبور رہوں یہ ہو نہیں سکتا۔ کوئی عبادت برق کرے اور حاصل کا افسوس بھی کرے یہ تو بے کار کی بات ہے۔ یعنی میں عشق کر کے خود طلب گار فنا ہوں۔ لفظ ناگزیر بطرز بیان فارسی ہے۔ اُردو کے لحاظ سے "دوستدار" اس کی جگہ صاف اور سیدھا لفظ ہے۔ مگر غالبؔ تو ٹیڑھے ہی چلتے ہیں۔ (واو۔ اور) کو استبعاد کا مان کے۔ یا شعر کو بطور استفہام پڑھ کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ مگر جناب حسرتؔ بغیر اس کے بھی یہی معنی کہنا چاہتے ہیں۔

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی　　جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

ظرف قابلیت و استعداد و ہمت خمار ۔ نشۂ اُتر جانے سے جو بے کیفی مے خوار میں پیدا ہوتی ہے۔
دریا بحر ۔ سمندر ۔ مراد فیاض ۔ خمیازہ ۔ خم ۔ کجی ۔ یازہ یازیدن سے حاصل مصدر جس کے معنی دست دراز کردن
کے ہیں ۔ انگڑائی میں جسم اور ہاتھ ٹیڑھے بیڑھے ہو جاتے ہیں۔ ساحل ۔ کنارۂ دریا جو کج دراج ہوتا ہے۔ اور بقدر
وسعت بحر ساحل بھی وسیع ہوتا ہے۔ اسی کجی کی وجہ سے خمیازہ ساحل کہا ہے ۔ تشنہ کام ۔ مشتاق ۔ آرزومند ۔
ساحل خشک ہوتا ہے اس کے مناسبت سے اسے لائے۔

اے ساقی اگر تیری ہمت شراب پلانے میں وسعت بقدر دریا رکھتی ہے تو میرا حوصلۂ فراخ بھی ظرفیت
ساحل رکھتا ہے جو سمندر ایسی شئے کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور مجھ میں بے کیفی تشنہ کامی بھی اُسی کے اندازہ کے موافق ہے۔
لہٰذا شراب بھی ایسی تشنگی بجھانے کے لیے کثیر چاہیئے اور میں اُس کے پی لینے میں ہیٹا نہیں ہوں ۔ یعنی عشق صادق
میں چوں کہ میرا مرتبہ بڑھا ہوا ہے اس لیئے سزاوار لطف و کرم بھی بہت زیادہ ہوں۔

---

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا　　غ

نوا ۔ ہر نغمہ و آہنگ ۔ بارہ مقامات موسیقی میں سے ایک مقام (راگ) کا نام ۔ راز ۔ سرِ حقیقت ۔
یاں ۔ دنیا میں ۔ حجاب ۔ پردہ ۔ مانع ۔ آڑ ۔ پردہ ۔ ہر مقام (راگ) کی پستی و بلندی سے ایک ایک پردہ نکلتا
ہے ۔ بارہ راگ اور چوبیس پردے مل کے چھتیس ہوتے ہیں ۔ ہندی راگ مالا میں بھی چھ راگ ۔ اور ہر راگ کی
چھ راگنیاں ان کا مجموعہ بھی چھتیس ہوتا ہے۔

تشریح الفاظ میں جو میں طول دے رہا ہوں اس کو حل مطلب شعر میں دخل نہیں ہے مگر میں بصیرۃ للطلاب
لکھ رہا ہوں ۔ اور یہ وجہ بھی ہے کہ میں معانی میں دوسرے شارحین کے مقابلہ میں کوئی جدت نہ کر سکا اور اُن کے
مقابلہ میں آخر کسی قسم کا تنوع تو ہونا چاہیے ۔ مجبوراً یہی پہلو اختیار کرنا پڑا ۔ دوسرے شراح اس طرح سے تشریح
الفاظ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں ۔ اگر میں صحیح تشریح کر سکا ہوں تو شاید یہ بھی افادہ و افاضہ سے خالی نہ ہو۔
ناظرین میری اس بے اعتدالی کو معاف فرمائیں گے۔

بین اور ستار کی سندریوں کو بھی پردہ کہتے ہیں ساز ۔ ہر باجہ۔

اے مخاطب دنیا میں جو چیز تیرے لیئے حقیقت وحدت پر پردہ اور حجاب کا کام کر رہی ہے اُس سے حقیقتہً

ساز کے پردوں کی طرح نغمہائے راز نکل رہے ہیں۔ ان من شئی الا یسبح بحمدہٖ مگر تو ہی ان نغموں کا محرم نہیں ہے اس لیئے تجھے یہ چیزیں حجاب اور پردہ دکھائی دیتی ہیں۔ ؎

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے　　یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

صبح۔ وقت بعد الفجر جس میں سپیدی نور سیاہی شب پر غالب ہوتی ہے۔ سحر صبح سے کسی قدر پہلے کا وقت۔ آخر شب۔ فجر پو پھٹنے کا وقت۔ سپیدی صبح بہا سرخی شمس کی نمود۔ اور صباح اول ساعات نہار۔ وقت صبح ہی اکثر پھول کھلتے ہیں۔ اور نسیم سحری چلتی ہے جو موجب شگفتگی گل ہوتی ہے۔ رنگ شکستہ = اُڑا ہوا رنگ۔ رنگ زرد۔

کسی پر عاشق ہو جانے کی وجہ سے جو رنگ چہرۂ محبوب اُڑا تو اور بھی نکھر گیا۔ اور نظارہ کے لیئے اُس نے صبح بہار کا مرتبہ پیدا کرلیا۔ لہٰذا یہ ناز کے پھولوں کے کھلنے کا وقت ہے تاکہ عشاق اُس کا نظارہ کر کے لطف اُٹھائیں۔

نظیری نے معشوق کے عاشق ہو جانے میں ایک غزل کہہ ڈالی جس کا مطلع یہ ہے ؎

چشمش بر اہے میرود مژگان نمناکش نگر　　در سینہ دارد آتشے پیراہن چاکش نگر

دامے کہ زلف انداختہ در گردن سیمینش بین　　خونے کہ مژگان ریختہ بر دامن پاکش نگر

دل بردہ در دل باختن معشوق عاشق پیشہ بین　　بگرفتہ در انداختن بازوے چالاکش نگر

یہ تیسرا شعر کیا خوب کہا ہے۔

رنگ شکستہ عاشق نے نظارہ صبح بہار کی حالت وکیفیت پائی ہے آؤ اور دیکھو اور ناز و فخر سے کام لو کہ یہ سب تمہارے ہی تو کرتوت ہیں۔ زمانہ بہار میں پھول زرد۔ سُرخ بلکہ کبھی رنگ کے ہوتے ہیں۔ سبز رنگ کا پھول صرف گل داؤدی کا دیکھا گیا ہے۔

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں　　طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

صرفہ ایرانی بمعنی فائدہ استعمال کرتے ہیں۔ اُردو و عربی میں یہ معنی نہیں۔ بردن مصدر اس کے ساتھ لاتے ہیں۔ مین میرا = میں سے (ین) گر کر میرا ہو جاتا ہے جو تنافرسے خالی نہیں۔ اگرچہ کسی شاعر کا کلام ایسی باتوں سے خالی نہیں ملتا ہے۔ پھر بھی اس سے اگر احتراز کیا جائے تو اس کے بہتر ہونے میں شک

بھی نہیں ۔ مگر غالبؔ اس کی ادنیٰ پروا بھی نہیں کرتے اور بے تکلف کہہ جاتے ہیں ۔ اگرچہ اس مصرع سے
تھوڑے سے تقدم و تاخر الفاظ سے یہ عیب دُور ہو سکتا تھا ؎

ہے ضبط آہ میں مرا صرفہ وگرنہ میں

طعمہ = رزق ۔ قوت ۔ غذا نفس سے مراد نفس آتش بار ۔

آہ کے ضبط کرنے میں میرا فائدہ ہے ۔ بصورت دیگر ایک ہی آہ آتش بار میں فنا ہو کر رہ جاؤں ۔ اپنے ضعف و ناتوانی اور آتش عشق کا بیان ہے ۔ ضبط کرنے سے میری اور محبوب دونوں کی بدنامی نہیں ہوتی ہے ۔ میرے تحمل کو بٹا نہیں لگتا ہے ۔ اور ان کے ظلم کا اظہار نہیں ہوتا ہے ۔

ہیں بسکہ جوش بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شیشہ باز = مجیل و مکار و دغا باز و شعبدہ باز ۔ اگلے زمانہ میں ساقی کا یہ کمال تھا کہ جام پُر از مے سر پر رکھ کے اور رقص کرتے ہوئے اسے اُچھال کر پھر سر پر روک ۔ بزم میں مے خواروں کے سامنے پیش کیا کرتا تھا ۔ گوشۂ بساط کی خوبی کچھ سمجھ میں نہ آئی ؎

ہے گوشہ گوشہ بزم کا سر شیشہ باز کا

بہار کے اثر سے شیشوں میں نشو و نما ہونے کا ذکر غنی بھی فرماتے ہیں ۔

وقت آنست کنوں کز اثر جوش نشاط
مے تکنجد بصراحی و صراحی بہ بغل

بہار کا زمانہ ہے ۔ جوش مے سے شیشے اُچھل رہے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بزم نشاط کا ہر گوشۂ بساط سر شیشہ باز ہے ۔

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

کرے ہے ۔ متروک ہو گیا ۔ اب کرتا ہے بولتے ہیں ۔ تقاضا = مطالبہ ۔ کوئی بات پوری کرانا چاہنا ۔ قرض ادا کرنے کی خواہش کرنا ۔ (تمام کرنا ۔ پورا کرنا ۔ ادا کرنا) گرہ نیم باز = جو گرہ آدھی کھلی ہو ۔ دل منقبض و گرفتہ مراد ہے ناخن پہ قرض = اس لیئے کہا کہ جتنا ناخنوں کو گرہ دل کھولنا چاہیئے تھا اوتنا نہ کھلا اس لیئے دل ناخنوں سے کاوش کا تقاضا کرتا ہے تاکہ کاوش کرکے پورے طور سے دل میں کشایش پیدا کر دیں ۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

تم ہو اور نظر تیز سے غیر کی طرف تمہارا دیکھنا ہے۔ میں ہوں اور تمہاری مژہ دراز کے نشتروں کا چبھتے رہنا ہے۔

نظر تیز تیز۔ غالب نے گہری اور غور والی نظر کے معنی لیئے ہیں حالاں کہ نظر تند و غضب آلود کے معنی ہیں۔ (اُردو میں)۔

جناب نظم پہلے مصرع میں "ہائے" کلمہ افسوس بھی تجویز فرماتے ہیں۔ اس صورت میں صفت اور موصوف میں فصل ہوا جاتا ہے جو اچھا نہیں۔ اور اضافت کی کمی پڑتی ہے۔

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ  سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

میرا سینہ جو گہر ہائے راز کا دفینہ تھا اسے کاوش غم ہجر نے لوٹ لیا۔ یعنی ہجر کے باعث وہ اسرار و رموز اب بیان نہیں کرسکتا۔

---

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھُلا  رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھُلا

دروازہ کا کھُلا ہونا یا رکھنا اس گھر کا آباد رہنا۔ اور در بند ہونا گھر کا غیر آباد ہونا۔ یارب اس در کو کھُلا رکھیو دعا ہے۔

بزم ظفر شاہ اکبر ثانی میں میرے اور دوسرے شعرا کے اشعار پڑھے جارہے ہیں۔ یہ بزم یا بارگاہ شاہی جو دُر ہائے مضامین کا گنجینہ۔ یا۔ فیض و عطا کا جواہر خانہ ہے اس خزانہ کا دروازہ اے اللہ ہمیشہ کے لیئے کھُلا رکھ یعنی آباد رکھ تاکہ فیض جاری رہے اور مشاعرہ ہوتا رہے۔

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھُلا  اس تکلف سے کہ گویا بت کدہ کا در کھُلا

رخشندہ۔ تابان و روشن۔ تکلف۔ اُردو میں زیبایش و آرایش۔ بتکدہ۔ معتقدین اپنی حتی الوسع مندر کی زینت کیا کرتے ہیں۔ رات کے وقت کے ستاروں کا سماں دکھایا ہے۔

یہ دونوں مطلع قصیدہ کے معلوم ہوتے ہیں انتخاب کے وقت باقی اشعار نکال ڈالے ہوں گے یا زیادہ کہے ہی نہ ہوں گے۔ ان اشعار کے مضامین سے ظاہر ہے کہ یہ اشعار غزل کے نہیں۔

---

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب     آستین میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

فریب دھوکا۔ دشنہ۔ خنجر نشتر بالکسر آلۂ فصد۔ جنون کا علاج فصد کھولنا بھی ہے۔ دوست سے مراد معشوق۔

جناب نظم دوست سے یاران منافق دنیا مراد لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

"دنیا کی دوستی ایسی ہے کہ ظاہر و باطن یکساں نہیں ہوتا ہے۔ ہاتھ میں نشتر کھلا ہوا ہونا اظہار غم خواری کے لیئے ہے یعنی فصد اور علاج کا قصد ظاہر کرتا ہے اور آستین میں خنجر چھپائے ہوئے ہیں یعنے چھریاں مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں"۔

معنی تو یہی ہوں گے مگر دوست سے مراد معشوق ہونا چاہیے۔

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں گو نہ پاؤں اُس کا بھید     پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

کھلنا = بے تکلف ہونا۔

وہ مجھ سے بے تکلف کیوں ہو گیا اگرچہ ہمیشہ بیزار اور الگ تھلگ رہتا تھا۔ گو اس کا سبب میں نہ سمجھ سکوں اور اُس کا راز نہ معلوم کر سکوں مگر میرے لیئے یہی بات کیا کم ہے کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہو کے باتیں کرتا ہے۔ اور اس میں ضرور کوئی راز پنہاں ہے۔ مجھے تو اس کی بھی امید نہ تھی۔ شعر خوب ہے۔

ہے خیال حُسن میں حُسن عمل کا سا خیال     خلد کا اِک در ہے میری گور کے اندر کھلا

خیال حُسن = تصور جمال یار۔ حُسن عمل = طاعات و عبادات۔ مذہبی خیال ہے کہ منکر و نکیر کے سوالات کے جوابات دے کر جو شخص مردہ پاس ہو جاتا ہے تو اس کی قبر میں ایک کھڑکی بہشت کی کھول دیتے ہیں ۔ اور حشر تک بہشت کی ٹھنڈی ہوائیں کھاتا رہتا ہے۔ تعجب نہیں کہ بیان زبان و حالت حالی کا ہو۔ معشوق کی صفت میں مینو چہر (بہشت چہرہ) لاتے ہیں۔ بعد مرگ تصور چہرۂ نگار سے گویا دروازۂ بہشت عاشق کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ خلد = ہمیشہ رہنے کی جگہ۔ آٹھ بہشتوں میں سے ایک بہشت۔ باقی سات بلا لحاظ ترتیب حسب ذیل ہیں: یا یہ درجات و طبقات بہشت کے نام ہیں۔ اور بہشت ایک ہی ہے ۔ دار النعیم۔ دار القرار۔ جنت الماوٰی۔ جنت عدن۔ دار السلام۔ فردوس۔ اعلیٰ علیین جسے فارسی میں بہشت بریں کہتے ہیں اور یہی اعلیٰ درجہ یا طبقہ بہشت کا ہے۔ اسی طرح دوزخ کے بھی سات درجات تجویز کرتے ہیں۔ لظیٰ۔ حُطمہ۔ جہنم۔ جحیم۔ ہاویہ۔ سعیر۔ سقر۔ دوسرے لفظ خیال کی جگہ پہلے مصرع میں اگر

(اثر) ہو تو شاید بیجا نہ ہو۔

مرنے کے بعد قبر میں بھی جو تصور اس نگار مینو چہر کے روئے بہشت آئین کا ہے تو گویا اعمال حسنہ والے لوگوں کی طرح میری قبر میں ایک دروازہ بہشت کا کھلا ہوا ہے۔

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منھ پر کھلا　　منھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

کھلنا = زیبا و حسین معلوم ہونا۔ عالم = کیفیت۔ حالت۔ بناؤ۔ نکھار۔ زیبائی۔ نقاب = بکسر پہلے مختلف فیہ تھا۔ اب لکھنؤ میں ناسخ کے زمانہ سے مؤنث بولتے ہیں۔ وہ روپوش جو ناک تک رہے اور جو منھ کو چھپائے اسے مثام کہتے ہیں۔

پہلے ردیف کو مکرر اور ہم معنی مانتے تھے۔ بعد میں ہم معنی کی قید اٹھا کر معنی میں تنوع پیدا کر کے حسن میں اضافہ کر دیا۔ جیسا کہ اسی شعر میں ہے۔

اگرچہ نقاب میں اس کا چہرہ چھپا ہوا ہے چھپے ہونے پر بھی حسن کا وہ عالم ہے کہ کبھی کسی نے دیکھا نہ ہوگا۔ اس شوخ کے منھ پر زلف سے بڑھ کے نقاب اپنا حسن دکھا رہی ہے۔

جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا　　در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا

عرصہ بمعنی مدت عربی و فارسی میں نہیں۔ اردو والوں کا تصرف ہے۔ لیکن نعمت خان عالی نے وقائع عالم گیری میں بمعنی مدت باندھا ہے؎

تو ان بعرصۂ چل روز یا دو ماہ رسید

جو لوگ لفظ عربی میں تصرف معنوی کی وجہ سے املا بھی بدلنا چاہتے ہیں جیسے مصالحہ کو مسالا لکھتے ہیں انھیں چاہئے کہ عرصہ کو بھی (ارسا) لکھا کریں مگر اس کا املا نہیں بدلتے نہ معلوم کیوں۔

اگرچہ عربی میں مصالحہ بمعنی توابل نہیں مگر اس کے مادہ کے صیغوں کے استعمال سے بوئے توابل آتی ہے۔ جیسے الملح یطالح الطعام نمک کھانے کو درست اور بامزہ کر دیتا ہے۔ یہ شعر خلاف عادت بہت صاف اور سادہ ہے۔

پہلے اپنے در پہ مجھے قیام کرنے کی اجازت دی۔ مگر جتنی دیر میں میں اپنا بستر کھولوں وہ اپنی رائے سے ہٹ گیا۔ شاید تلون مزاجی یار دکھانا مقصود ہے۔

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول　　آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھُلا

پہلے مصرع میں صنعت سوال و جواب ہے ۔ "ہے بلاؤں کا نزول" پہلے جزو سوال "کیوں اندھیری ہے" کا جواب ہے ۔ بلا = مصیبت جو جسم کو گھلا دے ۔ آزمایش ۔ جانچ ۔ امتحان خواہ خیر میں ہو یا شر میں نزول = اوپر سے نیچے اُترنا مترادف ہبوط، مگر ہبوط مطلق نقل مکانی کو کہتے ہیں ۔ شبِ غم = شبِ ہجر ۔ اندھیری تاریکی و سیاہی اگرچہ اسم صفت ہے مگر بطور صفت بھی مستعمل ہے ۔ جیسے اندھیری رات ۔

آج شبِ ہجر ہے اور عرش سے بلاؤں کا نزول ہو رہا ہے ۔ اس ہیبت ناک منظر سے ڈر کے دنیا کی طرف سے ستاروں نے آنکھ پھیر لی ہے ۔ یا ۔ اس ہنگامہ کا تماشا دیکھنے کے لیئے ستارے جو کرسی (فلک ہشتم پر ہیں) عرش ہی کی طرف (فلک نہم) آنکھ لگائے ہوئے ہیں تو پھر شبِ ہجر شبِ دیجور کیوں نہ ہو) نظام بطلیموسی میں سبعہ سیارہ کے سوا تمام ستاروں کو فلک ہشتم پر مانتے ہیں اور عرش کو سادہ جانتے ہیں ۔

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال　　نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھُلا

غربت = مسافرت ۔ حوادث جمع حادثہ ۔ نو پیدا ۔ نائبہ ۔ مصیبت خط ۔ عربی و فارسی میں بمعنی مکتوب LETTER نہیں ۔ اس کا کھلا ہوا ۔ یا کونہ پھٹا ہونا ہندوستان میں علامت خبر مرگ سمجھتے ہیں ۔ وطن = منزل و محل اقامہ انسان مولد ہو یا نہ ہو ۔ اُردو میں زیادہ تر مولد کے معنی میں استعمال کرتے ہیں ۔

جب حادثات کا یہ حال ہے کہ وطن سے قاصد اکثر کھُلا خط لاتا ہے تو مسافرت میں خوشی کہاں سے میسر ہو ۔ مسافرت خود ہی عذاب دوزخ سے کم نہیں ۔

اُس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند　　واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبد بے در کھُلا

اُمت　قوم ۔ وہ گروہ جو کسی پیغمبر کا پیرو ہو ۔ گنبد = ہر مدور عمارت ۔ گنبد بے در کنایہ از آسمان ۔ باوجودیکہ حکمار یونان افلاک میں خرق و التیام نہیں مانتے مگر شب معراج میں جناب رسالت مآب صلعم انھیں عبور کر گئے ۔ اور دنیٰ فتدلیٰ کے اوج تک پہنچے ۔

معراج کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں :

۱ ۔ از اول تا آخر جسمانی اس کے قائل اہل تشیع ہیں ۔

۲۔ از ابتدا ر تا انتہا روحانی اس کی قائل حضرت عائشہ ہیں۔
۳۔ کچھ جسمانی اور کچھ روحانی۔ اہل سنن بستر نبوی سے مقام رفرف تک جسمانی اور اس سے آگے روحانی
مانتے ہیں اگر میں نے غلط نہیں سنا ہے۔ بند اور کھلا میں صنعت تضاد ہے۔

میں اس شہنشاہ رسالت کی اُمت میں ہوں جس کے واسطے شب معراج میں آسمان کے دروازے کھل گئے پھر میرے کام کیسے بند رہ سکتے ہیں اُن کی بدولت میری سب حاجتیں پوری ہوں گی۔

---

۱۷غ
شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا  شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

اگر اسے ایک غزل مانا جائے تو پندرہ اشعار ہیں۔ مگر اس صورت میں مطلع ذیل ؎

نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا  تھا سپند بزم وصل غیر گو بیتاب تھا

کو اوپر والے مطلع سے قریب ہونا چاہیئے بنا بر دستور اہل ہند۔
اور اگر ایرانی رواج کا لحاظ کیا جائے تو آٹھ شعر اس میں اور سات شعر دوسری غزل کے ہوں گے۔ ایرانی غزل اور قصیدہ میں دو مطلعے نہیں کہتے ہیں۔ اگر کہتے ہیں تو دوسرا قصیدہ یا غزل قرار دیتے ہیں۔ جیساکہ دیوان میں دوسرا مطلع الگ کر کے لکھا ہے اور چھ اشعار اس کے ساتھ ہیں۔ اس لیئے اس زمین میں یہ دو غزلہ ہے۔
زہرہ۔ تلخہ۔ مرارہ۔ پتا۔ جگر پر ایک چھوٹی سی تھیلی جس میں صفرا رہتا ہے اور یہ تھیلی جگر (کلیجی) سے چپکی ہوتی ہے۔ زہرہ آب ہونا = پتا ڈر کے مارے پانی پانی ہو جانا۔ اُمنگ اور جوش کا دب جانا۔ خوف کھانا۔ گرداب = گرد (گول) اور آب سے مرکب ہے۔ بھنور۔ لہٰذا اہل ہند کے نزدیک ان دونوں مصرعوں کے قوافی میں ایطا ہے۔ ایرانی ان میں ایطا نہ کہیں گے۔ ان کے نزدیک گرداب کے معنی بھنور کے ہیں۔ تو تکرار قافیہ نہ رہی۔ جامی کی مثنوی تحفۃ الاحرار کا یہ آخری شعر ہے ؎

مُہر بنہ خاتمۂ ایں کتاب  شد رقم خاتمہ ختم الکتاب

شعلہ جوالہ گولائی میں چکر کاٹنے والا شعلہ جیساکہ آتش بازی کی چرخی میں اُس کے چھوٹنے کے وقت ہوتا ہے۔ وجہ شبہ حرکت دوری ہے۔

شب فراق میں حرارت غم اور برق سوز دل سے ڈر کے مارے ابر کا پتا خود ہی پانی پانی ہو گیا وہ میری سوزشِ غم کو کیا بجھا سکتا تھا۔ اسے تو میری حرارت غم سے اپنے فنا ہو جانے کا خود خوف تھا۔ بلکہ ابر آب گردیدہ

میں جو گرداب پڑ رہے تھے وہ میری حرارت غم کے اثر سے خود ہی شعلہ جوالہ ہو رہے تھے۔

وان کرم کو عذر بارش تھا عنان گیر خرام　　　گریہ سے یاں پنبۂ بالش کف سیلاب تھا

کرم سے مراد معشوق کا عاشق کے گھر آنا ہے بالش = تکیہ۔ بالیدن سے حاصل مصدر چونکہ اُس سے سر اونچا ہو جاتا ہے۔ سیلاب = سیل آب کثیر۔ ایرانیوں نے آب اور بڑھالیا۔ بہیا۔ رَو۔

محبوب کو میرے پاس آکر کرم فرمانے میں عذر بارش تھا اور اُن کے نہ آنے سے میرے گریہ کثیر کے سیلاب نے تکیہ کی روئی کو کف (جھاگ) بنا دیا تھا۔

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال　　　یاں ہجوم اشک میں تار نگہ نایاب تھا

موتی پرونا = ہر تار مو میں موتی پرونا علاوہ ہر ہفت = ایک زینت تھی۔ چنانچہ ہندی میں صفت معشوق میں "بال بال گج موتی پرودئے" بولتے ہیں۔ تار نگہ کی جگہ تار مژہ بھی پڑھ سکتے ہیں کیوں کہ آنسو پلکوں پر ٹھہرے ہوئے ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں جیسے موتی پرو دیئے ہوں۔ اس سے واقعیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ نایاب = مراد پوشیدہ و مفقود۔

وہاں اُن کو اپنی زینت کی پڑی تھی۔ اور یہاں کثرتِ گریہ سے تار نگہ یا تار مژہ ہی دکھائی نہ دیتا تھا۔

جلوۂ گُل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو　　　یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

آب جو کے بعد (کو۔ یا۔ میں) محذوف ہے۔ جب خونیں آنکھوں سے بہ رہے ہیں تری خود ہی موجود ہے مگر یہ کہیں تر صفت کاشفہ ہے۔ یہ شعر اس طرح صاف ہو جاتا ہے ؎

آب جو میں جلوۂ گُل سے چراغاں تھا وہاں　　　اور یہاں جاری مری آنکھوں سے خوں ناب تھا

ناب = خالص۔ نہ حرف نفی اور آب سے مرکب ہے۔ جس چیز رقیق میں آمیزش آب نہ ہو وہ خالص ہوتی ہے۔

وہ کنارہ نہر چمن میں میز کرسی۔ گُل دستے و ساغر و صراحی لگائے بیٹھے تھے اور مصروف عیش و نشاط تھے۔ اور گلوں کا عکس آب جو میں پڑ کر چراغاں کا سماں دکھا رہا تھا۔ اور یہاں میں اپنے بیت الاحزان میں خون کے آنسو بہا رہا تھا میرے لیئے یہ چراغاں تھا۔

یاں سر پرشور بیتابی سے تھا دیوار جو　　　واں وہ فرق ناز محو بالش کمخواب تھا

پرشور = درہم وبرہم پرواز ۔ فریاد و غوغا۔ دیوار بجو بانے دیوار تاکہ دیوار سے ٹکرا کے سر پھوڑ ڈالے ۔محو مراد منہمک و مشغول ۔کمخاب ۔بکسر و بفتح اول نیز۔ جامۂ منقش ۔الوان و یک رنگ تیز (برہان) مجھے نہ معلوم کیوں کر معلوم ہوا کہ کم بمعنی نفی و خواب ۔ بمعنی روبیاں سے مرکب ہے ۔ایک قیمتی ریشمی کپڑا جس میں رو یاں نہ ہو ۔کمخابہ تخفیف (ب) بھی ہے ۔ فرق مانگ مجازاً بمعنی سر۔

یہاں میں بحالت اضطراب و بے قراری سر پھوڑنے کے لئے تیار تھا ۔وہاں وہ کمخاب کے تکیہ پر سر رکھے راحت سے آرام کر رہے تھے ۔ (بجائے بیتابی ۔بیخوابی بھی پڑھ سکتے ہیں)۔

کم خاب میں لفظ خاب الفاظ متناسب محل میں سے ہے ۔

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بیخودی    جلوۂ گل واں بساطِ صحبت احباب تھا

نفس سے مراد نفس آتش بار ہے ۔ جلوۂ گل کا فرش ہونا میں نہ سمجھا ۔گلوں کا فرش ہوتا ہے ۔

سے    واں گلوں کا فرش بہر صحبت احباب تھا

یہاں نفس آتش بار بزم بے خودی کی شمع روشن کر رہا تھا وہاں فرش گل تھا اور صحبت احباب تھی ۔

فرش سے تا عرش واں طوفان تھا موج رنگ کا    یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

عرش بمعنی تخت نواں آسمان اس کے مقابلہ میں فرش کے معنی زمین کے ہوتے ہیں ۔ باب = عربی کی طرح فارسی میں مصادر کے باب نہیں ہوتے ہیں ۔بتکلف شایستہ و سزا وار معنی کہہ لو ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بے خیالی میں باب کہہ گئے ۔ رنگ = رنگ رلیاں ۔عیش و نشاط ۔ طوفان = مراد کثرت اسی کی مناسبت سے (موج) لائے ۔

اُن کے ہاں رنگ اور عیش کی کثرت اور بہتات تھی ۔اور میرے یہاں جلتے رہنے کے سوا اور کون سی بات تھی ۔

ناگہاں اس رنگ سے خوننابہ ٹپکانے لگا    دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا

پہلے کہہ چکے ہیں ؎

یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

لہذا یہ شعر نتیجہ اس مسلسل کا نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے حاصل اور نتیجہ اشعار قرار دینا تھا تو چوتھا شعر نہ ہونا چاہیے۔

جناب شبلی شعر العجم میں فرماتے ہیں کہ فارسی اور اردو میں غزل مسلسل اشعار کی نہیں ہوتی ہے۔ مگر یہ غزل تو مضمون واحد میں ہے۔ اور آگے بھی ایک دو غزلیں اور ایسی ہی آئیں گی۔ فارسی میں بھی وجود اس کا کمتر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ نظیری کی وہ غزل جس میں معشوق کے عاشق ہو جانے کا ذکر ہے۔ اسی بیان میں مسلسل ہے اور میں نے اس کے تین شعر نقل بھی کیئے ہیں۔

اول تو یہ کوئی نقصان کی بات نہیں۔ مسلسل مضامین کے لیئے انھوں نے واسوخت۔ شہر آشوب مثنوی۔ قصیدہ کی تشبیب اور مدح کو قرار دیا ہے۔ پھر غزل مسلسل نہیں کہتے تو اس میں ہرج کیا ہے۔ دوسرے غزل مسلسل مضامین کی ہندوستانیوں کی طبیعت پر کسی قدر ناگوار ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی غزل میں۔ یاں یہ تھا۔ اور واں یہ تھا۔ طبع سامع کو کچھ پسند نہیں آتا۔

اپنا یہ رنگ اور ان کا یہ ڈھنگ دیکھ کر دل جو ہمیشہ کاوش ناخن سے لذت اور لطف اٹھایا کرتا تھا یکایک آنکھوں سے خون خالص بہانے لگا۔

اگلی غزل اسی وضع و قافیہ میں ہے۔ ایرانیوں کے تتبع سے دوسرا مطلع کہہ کر دوسری غزل قرار دیا ہے۔ حالاں کہ آگے ایک غزل میں دو مطلعے برابر برابر کہے ہیں۔ ہندوستانی شعرا متعدد مطلعے کہنا خوبی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ دیگر اشعار سے مطلع کہنے میں کسی قدر دقت پیش آتی ہے۔

جناب نظم اور حسرت دونوں بزرگ " اس رنگ میں " اس کا اشارہ اس غزل آیندہ کے لیئے تجویز فرماتے ہیں۔

دو مطلعے برابر والی غزل۔ کے یہ ہیں ؎

| | |
|---|---|
| پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا | بخون غلتیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا |
| نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا | بمہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا |

---

نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا
تھا سپند بزم وصل غیر گو بیتاب تھا ۔ ع غ

سپند حرمل ۔ کالا دانہ ۔ نظر بد سے بچنے کے لیئے کسی شخص پر سے کالا دانہ مٹھی میں لے کر اتار کے آگ میں ڈال دیتے ہیں۔ اس کے دانے چٹخ چٹخ کے آگ سے باہر آپڑتے ہیں اسی وجہ سے دل بیتاب کو کالے دانے سے تشبیہہ دی ہے۔

رات کو نالۂ دل میں اثر مفقود تھا۔ گو وہ بیتاب تھا مگر بزم وصل غیر کی نظر بد سے بچنے کے لیئے سپند کا کام کر رہا تھا۔ اس کی بیتابی میرے مقصود کے خلاف تھی۔ یا۔ یہ کہ بزم وصل غیر کو دیکھ کر یا تش کر سپند کی طرح جل رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نالہ میں تاثیر نہ تھی۔ اگر تاثیر ہوتی تو بزم وصل غیر ہی کیوں ہونے پاتی۔

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے      خانۂ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

مقدم قدم سے مصدر میمی ہے۔ آنا۔ کیا نشاط = بہت خوشی۔ کیا کے معنی بہت۔ آہنگ = طرز روش۔ ارادہ۔ قاعدہ۔ قانون۔ اور بمعنی سُر اور الاپ مناسب ساز۔ آمد = صاف اور سیدھا سادہ لفظ تھا۔ اور مقدم رعب اور داب والا لفظ ہے۔

چوں کہ میں اپنی خانہ ویرانی اور خرابی کا خواہاں ہوں اس لیئے آمد سیلاب سے میرا دل بہت خوش اور نشاط پذیر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خانہ عاشق (میرا گھر) صدائے سیلاب کا ساز ہے، جو نشاط پیدا کر رہا ہے۔
مصرع ثانی یوں ہو جائے تو خوبی بڑھ جاتی ہے ؎

خانہ عاشق مگر آہنگِ ساز آب تھا

سازِ آب ترجمہ جلترنگ۔ سولہ پیالے چینی کے ہوتے ہیں جن میں کم اور زیادہ پانی ڈال کر تربوں اور پردوں کا کام لیتے ہیں۔ اور دو لکڑیوں سے بجا کر ان سے راگ اور راگنیوں کی گتیں نکالتے ہیں۔ پہلے میں آہنگ یعنی ارادہ اور دوسرے میں بمعنی سُر اور الاپ ہوگا۔

نازش ایام خاکستر نشینی کیا کہوں      پہلوئے اندیشہ وقف بستر سنجاب تھا

سنجاب بالکسر ایک جانور جو ہے سے بڑا جس کی کھال سے پوستین سیاہ بناتے ہیں۔
میں اپنی خاک نشینی کے زمانہ کے ناز کا کیا ذکر کروں۔ کسی کا احسان مند نہ تھا قناعت تھی لہٰذا اپنے خیال میں گویا بستر سنجاب پر لیٹا تھا اور اس میں راحت اور مزہ حاصل تھا۔

کچھ نکی اپنے جنون نارسا نے ورنہ یاں      ذرہ ذرہ روکش خورشید عالمتاب تھا

روکش = حریف و مقابل۔ شرمندہ کرنے والا۔ جنون نارسا = عشق ناتمام و ناقص۔
میرے جنون ناتمام کے بنائے کچھ نہ بنی (کوئی خوبی پیدا نہ کر سکا) یعنی نہ خود کامل بن سکا اور نہ معشوق ہی پر اثر ڈال سکا۔ ورنہ اس میدان عشق میں دیکھو کہ ہر ایک ذرہ اس جہاں کا اکتساب نور کر کے مقابل آفتاب

عالمتاب ہو رہا ہے مگر میں ہوں کہ ہر طرح کی خوبی سے محروم ہوں۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے　　کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا　　انتظار صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

جناب نظم ان دو اشعار کو قطعہ بند تجویز فرماتے ہیں۔ اس کی وجہ مجھے نہ معلوم ہوئی۔ مہر و وفا ہونے اور انتظار صید میں رہنے میں کیا تلازم ہے۔ دوسرے شعر کو اگر لفظ "کل" سے شروع کیا ہوتا تو کچھ ربط بھی ہوتا۔

دیدۂ بیخواب جس طرح کھلا رہتا ہے جال کے خانے بھی کھلے ہوتے ہیں۔

آج تجھے اپنے گرفتاران عشق کی کیوں پروا نہیں۔ کل تک تو ان کے ساتھ رحم و کرم سے پیش آتا تھا۔ کیا کسی نے ان کی طرف سے تجھے منحرف کر دیا ہے یا ان سے تونے کوئی بیوفائی دیکھی ہے۔ آخر وجہ کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ فارسی میں کوئی کتاب ہے جس میں ایک باب "مہر و وفا" کا بھی ہے اگر یہ صحیح ہے تو شعر میں ایک خوبی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

اُس زمانہ کو بھی ذرا یاد کر دکہ تمہارے دام زلف کا ہر حلقہ کسی صید دل کے انتظار میں چشم بیخواب کی طرح کھلا رہتا تھا۔ اب جھوٹے عاشقوں کی کثرت کی وجہ سے عاشق صادق سے بے التفاتی کر رہے ہو۔ میرا ایسا عاشق صادق و وفادار نہ پاؤ گے۔

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگر نہ دیکھتے　　اُس کے سیل گریہ میں گردوں کف سیلاب تھا

گردون۔ گردش دوری کرنے کی وجہ سے آسمان کو کہتے ہیں۔

اگر میں نہ روکتا تو غالبؔ کے گریہ کثیر کے سیلاب میں آسمان بمنزلہ کف (جھاگ پھین) ہوتا۔

---

اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب　　خون جگر ودیعت مژگان یار تھا　　　باغ

ودیعت۔ نئے سپرد کردہ شدہ۔ امانت۔ متدین و امین آدمی جب کسی کی امانت واپس کرتا ہے تو ایک ایک چیز دکھا کے اور گنا کے دیتا ہے۔ حساب دینا پڑا یعنی نشتر مژگان یار نے جتنا خون دل و جگر کا کیا تھا وہ گویا مژگانِ یار کی امانت تھا اسے گریہ خونیں کے ذریعہ سے ایک ایک قطرہ کا شمار کر کے انھیں دکھا کر واپس کر دیا۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو　　توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

یک شہر آرزو۔ اس سے اظہار کثرت آرزو مقصود ہے۔ تمثال دار۔ تصویر دار۔ جب آئینہ سالم ہو تو ایک ہی تصویر و شبیہ و عکس اس میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ٹوٹنے پر جتنے ٹکڑے ہوں ہر ٹکڑے میں ایک تصویر دکھائی دیتی ہے۔ آئینہ مراد آئینہ دل۔ تمثال۔ تصویر یا مجسمہ کسی جاندار کا۔ اور صورت عام ہے چاہے جاندار کی ہو یا بیجان کی۔

آئینہ دل کے ٹوٹنے سے آرزو کی کثرت کا اظہار ہو گیا۔ ان کل آرزوؤں کے پورا نہ ہونے کا ماتم ہے۔ یا یہ کہ ان تمام آرزوؤں کا خون ہو گیا اس لیئے ان کا ماتم ہے۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں　　جاں دادۂ ہوائے سر رہگذار تھا

نعش۔ سریر المیت مجازاً بمعنی میت فارسی میں لاشہ ہر حیوان کے مردہ کو کہتے ہیں۔ اردو میں ہائے ہوز حذف کر کے لاش بولتے ہیں۔ ہوا۔ محبت و خواہش۔ سر رہگذار۔ گذرگاہ محبوب۔ در۔ بر۔ سر۔ فرا۔ فرو۔ ہی بعض اوقات حسن کلام کے لیئے بھی آتے ہیں۔ اور معنوں میں انھیں دخل نہیں ہوتا ہے۔ جاندادہ۔ مرا ہوا۔ مردہ۔ عاشق۔

اس قسم کے چند اشعار کے معانی جناب نظم نے نہ لکھے تو جناب آسی اس کو نقصان کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ اور اپنے ہر شعر کے معانی لکھنے پر نازاں ہیں۔ کوئی بتائے کہ اس شعر کے معنی لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ شعر خود اپنے آپ معنی ہے۔

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال　　ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا

موج کی شکل کبھی میں شمشیر سے مشابہ ہوتی ہے۔ تیغ۔ مبتدل تیز۔ سراب۔ پانی کا دھوکا۔ ریگ اس پر ہوا کی وجہ سے لہریں۔ کچھ ٹھونٹ چھوٹے درختوں کے ان پر جالا اور شبنم اسی مجموعہ کا نام سراب ہے۔ وفاد کا استعارہ سراب دشت سے اس لیئے کیا کہ جس طرح سراب لا حاصل چیز ہے اسی طرح وفاداری سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ دشت وفا کا ہر ذرہ تیغ آبدار کے جوہر کی طرح تھا جس سے تیغ میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔

استعارات کو حذف کر کے حاصل شعر یہ ہے کہ جتنی وفاداری کی اتنی ہی اس سے سوا نقصان کے کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا۔ بلکہ نقصان پہنچا۔

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو۔ پر اب　　　دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

دوسروں کی طرح ہم بھی غمِ عشق کو معمولی بات اور کم اور آسان چیز سمجھے ہوئے تھے۔ بعد از تجربہ معلوم ہوا کہ کم ہونے پر بھی دنیا بھر کے غم کے برابر ہے۔ ہوئے۔ ماضی بمعنی مصدر ہے۔

بھی سے ظاہر ہے کہ دوسروں کے کم جاننے کو بھی بیان کر رہے ہیں۔ اور اس کے ذکر کا میں فائدہ نہ سمجھ سکا۔ شاید اس کے ذکر سے یہ غرض ہو کہ میرے تجربہ کرنے کے بعد سب کا سمجھنا غلط نکلا۔ اس جھگڑے کو یوں پاک کہا جا سکتا ہے ؎

کم جانتے تھے پہلے غمِ عشق ہم۔ پر اب

---

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　　آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا　　　غ

انسان۔ مراد انسان شریف النفس جیسا کہ اس آیت میں ہے ماخلقت الجن والانس اور جن سے مراد شریر النفس پھر دو متضاد کے ذکر سے کلیت مراد ہے یعنی سب کو۔ آدم۔ آدمت بمعنی گندم گونی سے مشتق ہے۔ انسان۔ اُنس سے بعض کے نزدیک نسیان سے مشتق ہے چونکہ انسان میں دونوں مادے موجود ہیں۔ اور بشر آدمی۔ باعتبار اس کے بادی بشرہ ہونے کے کہتے ہیں۔

چوں کہ ہر کام کا آسان ہونا دشوار ہے اس لئے آدمی کو بھی شریف النفس ہونا اور مرتبہ کمالِ انسانیت پر پہنچنا دشوار ہے۔

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانہ کی　　　در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

خرابی۔ ویرانی۔ کاشانہ۔ خانہ محقر۔ ٹپکنا۔ نمایاں اور واضح ہونا۔ گریہ اور کاشانہ کے مناسب لفظ ہے۔ در و دیوار سے ٹپکنا بہت نمایاں ہونا۔ در و دیوار مناسب کاشانہ۔ خرابی اور بیابان باہم الفاظ متناسب ہیں۔

سیلاب گریہ میرے جھونپڑے کو ویران کرنا چاہتا ہے۔ جس کے علامات در و دیوار سے نمایاں ہیں۔

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو　　　آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

حیرت سے مراد حیرت محمودہ ہے جس کی نسبت جناب رسالت مآب صلعم فرماتے ہیں اللّٰھم زدنی حیرۃ فیک ذات الٰہی کے بارے میں حیرت اور عجز یہی عین عرفان ہے العجز عین الادراک ادراک اس پر دال ہے۔ شعر اچھا ہے۔

شوق دیدار یار میں ایسا دیوانہ ہو رہا ہوں کہ دل بے اختیارانہ اُس کی گلی میں کھینچ لے جاتا ہے اور وہاں پہنچ کے حیران ہو کے رہ جاتا ہوں کہ این یہ ہم کہاں آئے۔ اور کیوں آئے اُن سے تو کسی قسم کی بھلائی کی امید نہیں۔

اگر معرفت کا شعر تجویز کیا جائے تو یہ معنی ہوں گے۔ شوق عرفان میں توجہ الی اللہ کرتا ہوں۔ اُس کی ذات چونکہ تصور انسانی سے بالاتر ہے جب کچھ ہاتھ نہیں آتا تو حیران ہو کے رہ جاتا ہوں۔ اور میرا وہ شوق حد دیوانگی سے باہر نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ معرفت ذات محال ہے۔

جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے      جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

تشبیہ آئینہ چشم کے ساتھ مشہور ہے۔ جوہر کو تمنا مژگاں ہونے کی اس لیئے کہا تاکہ پوری پوری آنکھ بن جائے۔

چونکہ جلوۂ یار مقتضی تماشا ہے اس لیے چشم آئینہ کے جوہر پلکیں ہو جانا چاہتے ہیں تاکہ پوری آنکھ بن کر اس کا جلوہ دیکھ سکے۔ کیونکہ جلوہ دیکھنے کے قابل ہے۔ حتیٰ کہ بے جان اور غیر ذوی العقول چیزیں بھی اُس کے دیدار کی مشتاق ہیں " چاہے ہے " کی جگہ اب چاہتا ہے۔ بولتے ہیں۔

عشرت قتلگہ اہلِ تمنا مت پوچھ      عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

اہل تمنا = عشاق جن کو آرزو شہید ہونے کی ہے۔ شمشیر کو بوجہ خمیدگی ہلال سے تشبیہ دیتے ہیں اس لیے ہلال کو شمشیر سے۔ عید = عود سے مشتق ہے چوں کہ ہر سال پلٹ پلٹ کے آتی ہے۔ ہلال عید اس لیئے نہ کہا کہ ذہن ادھر منتقل ہو جاتا ہے۔ یا مصرع میں گنجایش نہ تھی۔ ہونا لفظ ہلال کی بہتر ضرور ہے۔ عشرت = عربی میں تصاحب اور تخالط کے معنی ہیں اور بمعنی زندگانی خوش و خوشی مستعمل ہے۔

میدان قتل میں قتل ہو جانے کی خوشی عشاق کو کچھ نہ پوچھو کہ کس حد کی ہے۔ قتل کے لیئے تلوار کا برہنہ ہونا ان کے لیئے نظارہ ہلال عید ہے۔ اسی طرح سہی دیدار قاتل تو ہوگا۔

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط      تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

نشاط = چستی۔ پھرتی۔ خوشی جو مطلوب کے حاصل ہونے سے ہوتی ہے۔ جوش۔ امنگ۔ گلستان ہونا =

باغ باغ ہونے کی جگہ پر لائے ہیں۔ بضرورت قافیہ۔ مگر اچھا نہیں۔
ہم تو مر گئے۔ اور اپنے ساتھ داغ تمنائے نشاط لے گئے۔ کیوں کہ کبھی نشاط حاصل ہی نہ ہوئی۔ اب تم کو رنگ رلیوں کے ساتھ باغ باغ ہونا مبارک رہے۔ رنگ۔ خوبی و خوشی۔

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا      لذت ریش جگر غرق نمک داں ہونا

دل کے ٹکڑوں کی خوشی تمناؤں کے زخم اٹھانے میں یعنی ان کے نہ پورا ہونے میں ہے۔ اور زخم جگر کو مزہ نمک دان میں ڈوبے رہنے ہی سے ملتا ہے۔ یعنی ہم غم دوست ہیں۔ اور ہم کو مزہ درد و غم ہی میں آتا ہے۔ راحت کے جویا نہیں۔ (ہے۔ دونوں مصرعوں سے محذوف ہے)۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ      ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اُس نے مجھے قتل کرنے کے بعد ہی جفا سے توبہ کرلی کہ اب کسی پر جفا نہ کیا کریں گے۔ جس سے اب میں کیا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ اس توبہ کا نفع تو اغیار کو پہنچے گا۔ یہ ندامت اُن کی بعد از مرگ بھی چین اور تسلی کے ساتھ مجھے قبر میں نہ رہنے دے گی۔ لفظ زود پشیمان بطور طنز ہے مگر اس محل پر شعر کی جان اور نگینہ ہے۔

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب      جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

حیف۔ عربی میں بمعنی ظلم اور فارسی میں بمعنی افسوس مستعمل ہے۔ اس کے ساتھ (پر) ضرور بولتے ہیں۔ اور (ہے) بھی ساتھ ہوتا ہے۔ پھر لفظ قسمت کی تکرار بھی ہے جو یوں دور ہو سکتی ہے ؎
حیف اُس چار گرہ کپڑے پہ ہے لے غالب
اس چار گرہ کپڑے پر افسوس ہے جو عاشق دیوانہ کے گریبان میں صرف ہو۔ کیوں کہ عاشق جنون میں اس کی دھجیاں اڑائے گا۔ یا معشوق کی شوخی سے اس کے پرزے پرزے ہو جائیں گے۔

---

بیغ
۵

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا      تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

رستخیز۔ بفتح اول و ثالث بعد اشباع رستاخیز۔ رست صیغہ ماضی از رستن بمعنی نجات پانا۔ اور خیز خاستن سے امر۔ اٹھنا۔ ماضی اور امر مل کے حاصل مصدر۔ جیسے گفتگو۔ بمعنی قیامت چونکہ قیامت میں مردے

قبروں سے اُٹھیں گے اور بعد حساب وکتاب نجات اور خلاصی پائیں گے اس لیئے بمعنی قیامت ہے۔ محیط۔ چوں کہ سمندر خشکی کو گھیرے ہے اس لیئے اس کا اطلاق بحر پر ہوتا ہے۔ بجائے بادہ میرے خیال میں جام بہتر ہے۔ اور محیط کے معنی جام کے کنارہ والا خط یا سرا کہتے ہیں کہ شراب۔ جمشید کے زمانہ میں ایجاد ہوئی۔ اور جام میں تلی سے لے کر کنارہ جام تک سات خط تھے۔ ہر شخص کے ظرف کے موافق اُن خطوط تک ناپ ناپ کے شراب دی جاتی تھی۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ خط جور۔ جام کے سرے کا خط۔

۲۔ خط بغداد۔ اس کے بعد کا خط۔ بعض اسے اول بتاتے ہیں۔

۳۔ خط بصرہ۔ تیسرا خط۔ ۴۔ خط ازرق ۵۔ خط اشک ۶۔ خط کاسہ گرد۔

۷۔ خط فرد دینہ۔ جام کی تلی کے پاس کا خط۔ ان اسماء کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ اسماء بعد میں رکھے گئے ہیں۔ چار نام عربی الفاظ کے اور تین فارسی الفاظ کے ہیں۔ جمشید کے زمانہ کے یہ الفاظ نہیں۔ خمیازہ۔ شاید میں اسے لکھ چکا ہوں۔ خم بمعنی کجی۔ اور یازہ یا زیدن سے مشتق بمعنی دست دراز کردن۔ انگڑائی لینے میں ہاتھ اور تنہ جسم ٹیڑھا میڑھا ہو جاتا ہے۔ خطوط جام کو انگڑائی میں پھیلے ہوئے ہاتھوں سے تشبیہ دی ہے۔ صورت خانہ۔ تصویر گھر۔ خمار میں جیسی بے کیفی ہوتی ہے ویسی ہی بے لطفی انتظار آمد ساقی میں ہر شئے کو ہو رہی تھی۔

جناب حسرت سلمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے۔ شوق سے مراد شوق آمد ساقی رستخیز اندازہ مثل قیامت محیط بادہ = خط ساغر۔ مطلب یہ ہے کہ شوق آمد ساقی کے خمار میں وہ جوش تھا کہ مے خانہ کی ہر شئے حتیٰ کہ شراب بھی خمیازہ کش ہو رہی تھی۔ اس طرح خمیازہ کی کیفیت کا ایک صورت خانہ پیش نظر تھا۔ حاصل یہ ہے کہ آمد ساقی کی ہر شئے مشتاق اور منتظر تھی (شراب کا خمیازہ کش ہونا میں نہ سمجھا)۔

جناب نظم اعلیٰ اللہ مقامہ فرماتے ہیں کہ میرے شوق نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور شوق میں بے لطفی اور بے مزگی جو تھی اس کو خمار سے تشبیہ دی۔ اور کہتا ہے کہ یہاں سے لے کر دریائے بادہ تک میرے خمیازہ کا صورت خانہ بنا ہوا تھا۔ یعنی میں نے خمار میں اتنی لمبی لمبی انگڑائیاں لیں جن کی درازی محیط بادہ تک پہنچی۔ غرض مصنف کی یہ ہے کہ انگڑائی لینے میں جو ہاتھ پاؤں پھیلتے ہیں وہ گویا شراب کو ڈھونڈتے ہیں۔

دریائے بادہ کسے کہا اس کی صراحت نہ ہوئی۔

اس قدر کھینچ کھانچ کے بعد اگر کچھ معنی پیدا بھی ہوئے ہوں تو بھی ان میں کیا خوبی نکلتی ہے۔ غزل کے اشعار کو ایسا ہونا چاہیے کہ ان کے سنتے ہی سامع پر ان کا اثر ہو۔ بالفرض اگر بعد دقت اور غور بلیغ بات اچھی بھی نکل آئے تب بھی اس کا حظ اور مزہ جاتا رہتا ہے۔

اسی قسم کے اشعار کی وجہ سے اُن کے ہم عصر غالب کو بے معنی گو کہا کرتے تھے۔ چنانچہ جناب حالی شمس العلماء مغفور اپنی کتاب یادگار غالب میں تحریر فرماتے ہیں:

"سنا گیا ہے کہ اہل دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پرشوکت اور شاندار معلوم ہوتی تھیں مگر معنی ندارد۔ گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔"

ایک دفعہ مولوی عبد القادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے مرزا سے کسی موقع پر کہا کہ آپ کا ایک اُردو شعر سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے ؎

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال ‏ ‏ پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سن کے سخت حیران ہوئے۔ اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔ مولوی عبد القادر نے ازراہِ مزاح کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے۔ اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرایہ میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں کہنا پڑا۔ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ‏ ‏ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

جناب حالی فرماتے ہیں کہ ایسے اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیئے ہوں گے۔

ایسے اشعار کے بے معنی کہنے سے غالب کی تنقیص نہیں ہوتی ہے۔ اُن کا تخیل بہت بلند ہے۔ دو مصرعے اس کے متحمل نہیں ہوتے۔ شاعر کے ذہن میں کوئی مفہوم چکر لگاتا ہوتا ہے اس لیئے وہ سمجھتا ہے کہ مفہوم ادا ہو گیا۔ مگر دوسروں کے لیئے وہ الفاظ ناکافی ہوتے ہیں۔ اُن کے اعلیٰ درجہ کے اشعار صاف اور سادہ جن کی کثرت ہے ایسے اشعار سے معافی دلانے کے لیئے قوی ضامن ہیں۔

جناب حالی نے ان کے دیوان کی کوئی شرح نہیں لکھی ہے۔ مگر ان کے اشعار صاف اور خوب کے معانی بتاتے میں اعلیٰ درجہ کے نکات اور باریکیاں دکھائی ہیں جو ہر شارح اور ناظر کے دماغ میں نہیں آسکتی ہیں۔ مگر ان اشعار مشکلہ میں سے ایک کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ کیونکہ ان کو تو مداحی کر کے حق شاگردی ادا کرنا ہے۔ اور ایسے اشعار قابل مدح تو کیا معنی نبھانا ہی ان میں دشوار تھا۔

شوق آمد ساقی کے انتظار میں جو بے لطفی اور بے مزگی رات کو مے کشوں میں پیدا ہو رہی تھی وہ قیامت خیز تھی۔ خطوط جام خالی کو خطوط نہ سمجھو، بلکہ خمار شوق ساقی میں مے خواروں کے انگڑائیاں لینے میں ہاتھ پھیلے ہوئے

ہیں۔ یعنی ساقی کے نہ آنے سے بے لطفی ہو رہی تھی۔

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھُلا　　جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

یک قدم وحشت۔ وحشت کثیر ہیں سے تھوڑی سی۔ دو عالم دشت سے وسعت دشت مقصود ہے۔ امکان ۔ جس کا عدم و وجود یکساں ہو۔ کل موجودات علاوہ ذات باری کھُلا واضح اور آشکارا ہوا۔ مناسب دفتر معنی وضعی کے ساتھ۔ دفتر۔ بڑی اور ضخیم کتاب۔ جادہ بتشدد دال مگر مستعمل تخفیف شاہراہ۔ لیکن مستعمل بمعنی پگڈنڈی۔ دو عالم۔ دشت یعنی دنیا وعقبیٰ جو بمنزلہ ویرانہ ہیں۔

دونوں عالم جو ویرانہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس دشت ویران ہیں میں نے ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ یہ حقیقت اس کتاب موجودات کے سبق کی مجھ پر واضح ہوگئی کہ یہ شاہراہ دو عالم دشت میرے ایک قدم نفرت دنیوی کے آگے کوئی چیز نہیں۔ جس طرح شیرازہ کتاب اوراق متفرق واجزاء کتاب کو اکٹھا کر دیتا ہے میں بھی ایک قدم میں دونوں کو ملا سکتا ہوں اور دونوں کو عبور کرکے مقصود سے ہمکنار ہو سکتا ہوں۔

مانع وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے　　خانہ مجنوں صحرا گرد بے دروازہ تھا

وحشت خرامی۔ خرام بحالت وحشت مقصود شاعر نہیں بلکہ مقام وحشت ناک میں چلنا مطلوب شاعر ہے۔ مبالغۃً صحرا کو عین وحشت مان لیا۔ (زید عدل کی طرح)۔ یا۔ وحشت خرام وہ جگہ وحشت ناک جس میں خرام کریں یعنی دشت وصحرا۔ دیگر شارحین کی طرح لیلیٰ کو وحشی بنانا مجھے اچھا نہ معلوم ہوا۔ اس لئے یہ تاویلیں کر رہا ہوں۔ نہیں کہہ سکتا کہ بات بن سکی یا نہیں۔ بہرحال یہ ترکیب ٹیڑھی ہے۔

صحرا میں مجنوں کے پاس جانے کے لیے لیلیٰ کو مانع کون سی بات تھی کیوں کہ مجنوں کا گھر (یعنی صحرا) اس میں تو کوئی دروازہ نہیں ہے۔ مجنوں صحرا نورد تو دیوانہ ہے اگر وہ لیلیٰ کے پاس نہ آسکا تو نہ آسکا۔ مگر لیلیٰ معشوق ہو کے ایسی مہربانی کیوں کرنے لگی۔

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن　　دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تھا

استغنا۔ غنی سے باب استفعال کا صیغہ ہے۔ عدم احتیاج۔ لاپروائی۔ غازہ۔ گلگونہ۔ سرخاب۔ ہر ہفت کی سات چیزوں میں سے یہ دو بھی ہیں یعنی حنا اور غازہ۔ باقی پانچ یہ ہیں۔ سفیداب۔ وسمہ۔ زرک (زر افشاں)۔ سرمہ۔ غالیہ یا خال۔

حسن کو ہر چیز سے مستغنی کہتے ہیں مگر دیکھتے ہیں تو باوجود استغنا دست و پا محتاج حنا اور رخسار حاجت مند غازہ زیبایش کے بڑھاتے میں ہیں۔ کیا اس سے استغنائے حسن کی رسوائی نہیں ہوتی ہے۔

نالۂ دل نے دیئے اوراق لختِ دل بباد　　یادگارِ نالہ ایک دیوان بے شیرازہ تھا

بباد دادن ۔ برباد اور تباہ اور منتشر کر دینا فارسی کا محاورہ ہے بنا بر عادت اسی کا ترجمہ کر ڈالا حالانکہ یوں ادا کر سکتے تھے۔ ؎

نالۂ دل نے کیئے اوراق لختِ دل تباہ

(بباد) محض اس لیئے کہا کہ نالہ و آہ اوراق ہوا میں مل جاتے ہیں۔ یادگار نالہ مراد دل۔

پارہائے دل کے اوراق نالوں نے سب منتشر اور تباہ کر دیئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دل ایک دیوان بے شیرازہ تھا۔ اگر شیرازہ ہوتا تو اس کے اوراق یعنی لختِ دل کیوں برباد اور تباہ ہوتے۔

---

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا　　زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

غم خواری ۔ کسی کے غم کو دیکھ کے خود غمگین ہونا اور اس کے دفع کی کوشش کرنا ۔ کیا ۔ پہلے مصرع میں تحقیر کے لیئے ہے۔ یعنی ان کی سعی کیا چیز ہوگی اور دوسرے میں استفہام انکاری ہے یعنی ناخن ضرور بڑھ آئیں گے۔

دوست غم خوار ہو کر میرے زخموں کا علاج مرہم پٹی اور ناخن کٹوانے سے بے کار کر رہے ہیں جب تک کہ زخم اچھے ہوں اس وقت تک ناخن ضرور بڑھ جائیں گے اور میں پھر سینہ خراشی کر کے زخم ڈال لوں گا۔ نہ یہ جنون عشق جائے گا ورنہ سینہ خراشی کر کے زخم پیدا کر لینا چھٹے گا۔

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک　　ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

آپ کی لاپروائی اور عدم توجہ حد سے آگے بڑھ گئی۔ ہم کہاں تک اپنا حال دل کہتے رہیں اور آپ توجہ سے نہ سن کر یہی فرماتے رہیں کہ کیا کہا۔ کیا کہا۔

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ　　کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

حضرت ناصح (خیر خواہ) جو میرے پاس تشریف لا رہے ہیں بخوشی تشریف لائیں میں اُن کی تعظیم کے لیئے دیدہ و دل کا فرش بچھا دوں گا مگر کوئی مجھے اتنا تو سمجھا دے کہ آخر وہ مجھے کیا سمجھائیں گے۔ ان کی کیا فہمایش سے میں ترک عشق کر سکتا ہوں۔

لکھنؤ میں سمجھا دو کی جگہ، سمجھا دے بولتے ہیں۔ دلی میں آپ بیٹھو اب بھی بولا جاتا ہے۔ مصرع ثانی اگر یوں ہو جائے تو پورا پورا بول چال کے موافق ہو جائے۔ ؎

پر کوئی اتنا تو سمجھا دے وہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں　　　عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

؎ قتل کرنے میں مرے اب عذر وہ لائیں گے کیا

میں اپنی جان سے بیزار ہوں اور تحمل تکالیف عشق حد سے متجاوز ہو گیا۔ یا۔ مجھے ان کے ہاتھ سے قتل ہونے کا اس درجہ شوق ہے کہ تلوار اور کفن اپنے ساتھ لے کر ان کے پاس جا رہا ہوں۔ اب تو ان کو میرے قتل کرنے میں کوئی عذر باقی نہ رہنا چاہیے۔

گر کیا ناصح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی　　　یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خیر خواہوں نے گھر مجھے باندھ کے رکھا ہے اچھا یوں ہی سہی میں اس پر بھی راضی ہوں، مگر اس قید کرنے سے کیا جنون عشق کے انداز مجھ سے چھوٹ سکتے ہیں۔ پورا شعر ٹھیک بول چال کے موافق ہے۔ اس کی نظم و نثر سب یکساں ہے۔ ساری غزل کی غزل لاجواب ہے۔ ایسے ہی اشعار کی وجہ سے غالب غالب ہیں۔ نہ اُن چیستانوں کی وجہ سے۔ چاہے وہ کتنی ہی کاوش سے کہے گئے ہوں۔

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں　　　ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

زنجیر کا ذکر اس لیئے ہے کہ زلف کو زنجیر کے ساتھ استعارہ کرتے ہیں۔ خانہ زاد کا لفظ اس محل پر بالکل نیا ہے۔ جس گھر میں کوئی پیدا ہوا ہو اس گھر سے الفت ہوتی ہے۔ اور اس کا چھوٹنا ناگوار ہوتا ہے۔

ہم تو زلف کے خانہ زاد ہیں (عاشق اپنا دل زلفِ یار میں پھنسا ہوا مانتے ہیں) پھر زنجیروں میں بندھے ہونے سے گریز کیوں کرنے لگے۔ اور جب پابند وفا ہیں تو قید خانہ سے گھبرانے کیوں لگے۔ اگر زندان کی قید نہ ہوتی تو وفاداری کی پابندی تو بہر طور رہتی ہی ہے۔ اور ہم اس کے عادی ہیں۔

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم اُلفت اسد　　ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

قحط بالفتح احتباس مطر۔ خشک سالی۔ معمورہ = آبادی۔ اس معمورہ سے مراد دہلی۔
اب دلّی میں غم اُلفت کا کال ہے اور ہم غم عشق کو دوست رکھتے ہیں پھر دلّی میں رہیں تو مگر کھائیں گے کیا۔

---

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصال یار ہوتا　　اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

یہی کو ذرا زور دے کے پڑھو افسوس اور درد کے لہجہ میں (بہت خوب شعر ہے)۔
ایسی تو ہماری قسمت تھی ہی نہیں جو وصال یار میسر ہوتا۔ ہاں اگر اور زندگی بھی ہوتی تو یہی انتظار رہتا۔ لہٰذا مرجانا ہی اچھا ہوا۔ کہ سب جھگڑوں سے نجات مل گئی۔

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

جان = سمجھ لے۔ جان لے۔ بعض شارحین کی رائے ہے کہ معشوق کے بھی معنی ہو سکتے ہیں، مگر حرف ندا (اے) محذوف ماننا ہوگا اور (یہ) معنی معشوق کہنے کو مانع ہے۔
تیرے وعدہ وصال کو اگر سچا سمجھتے تو شادی مرگ ہو جاتے۔ جیتے رہنا دلیل اس کی ہے کہ میں نے تیرے وعدہ کو جھوٹ سمجھا اور اس پر اعتبار نہیں کیا۔ کیوں کہ تم ایفاء وعدہ تو کبھی کیا ہی نہیں کرتے ہو۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا　　کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

بودا = کمزور۔ اور بمعنی بزدل۔ استوار بالضم مرکب از (است) بالفتح بمعنی استخوان (ہڈی) و تخم میوہ۔ اور یہ دونوں چیزیں سخت ہوتی ہیں۔ اور (وار) بمعنی مانند و مثل و نظیر ہے یعنی میں مثل استخوان و تخم میوہ۔ جو چیز سخت ہوتی ہے وہ مضبوط ہوا کرتی ہے اس لئے بمعنی مضبوط و مستحکم ہے۔ اور ضمہ الف کثرت استعمال سے ہو گیا۔
تم ایسے نازک ہو کہ تمہاری ہر چیز میں نزاکت ہے حتیٰ کہ جو عہد تمہارا ہوتا ہے وہ بھی کمزور ہوتا ہے۔ یہی وجہ کمزوری ہے کہ تم اس عہد کو توڑ کے اس سے پھر جاتے ہو اگر تمہارا عہد مستحکم ہوتا تو تمہارا ایسا نازک ڈسے کیسے

توڑ سکتا۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

تیر نیم کش۔ وہ تیر جو چلّہ تو پورے طور سے کھینچ کے نہ چلایا گیا ہو۔ ایسا تیر نشانہ کو توڑ کے پار نہیں ہوتا ہے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ جیسی مجھے اس کی قدر ہے کوئی دوسرا کیا جانے۔ چوں کہ دل کو اس تیر نے چھیدا ہے تو جو حالت دل کی ہو رہی ہے اسے دل ہی خوب جانتا ہے۔ یہ جملہ بہت خوب ہے۔ خلش = چبھن۔

تیرا تیر جو دل میں چبھ کے رہ گیا ہے اگر محبوب پورے طور سے چلّہ کھینچ کر میرے دل پر لگاتا اور دل کے پار ہو جاتا تو مجھ ایذا دوست کو اس کی خلش کی لذت کہاں سے حاصل ہوتی۔ تیرے تیر کی جگہ میرے دل ہی میں ہونا مجھے پسند ہے۔

یہ شعر شہرت عامہ رکھتا ہے اور زبان زد خلائق ہے۔ جو اور تو کے ایسے الفاظ دو حرفی جن کے آخر میں واو مجہول ہو ان کا نظم میں سے حذف کر دینا ہی فصیح ہے مگر آگے لفظ جگر ہے تو اس جگہ واو کے حذف ہونے سے دو جیم (ججگر) مل جانے سے تنافر پیدا ہو گیا۔ شعر کی خوبی کے آگے ایسا عیب معمولی بات ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

غم گسار۔ میں گسار گساردن سے امر کا صیغہ ہے۔ اور گساردن کمعنی خوردن بھی ہے۔ اسم اور امر مل کرے گسار کی طرح اسم فاعل بن گیا۔ غم کھانے والا۔ مصرع ثانی کو تمنا کے لہجہ میں پڑھو۔

ناصحوں کی نصیحت ترک عشق کو تو میں دوستی نہیں سمجھتا ہوں یہ تو مجھ سے ممکن نہیں۔ میری دوستی تو اس میں ہے کہ میری غم گساری کرکے مجھ پر اس کے مہربان ہو جانے کی کوئی تدبیر کرتے اگر چارہ سازی ناممکن تھی تو غم گساری ہی کرتے۔ یوں تو یہ غزل بھی ساری کی ساری خوب ہے مگر مجھ کو مطلع اور یہ شعر "ترے تیرِ نیم کش والے" شعر سے زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

رگ سنگ۔ ہر شئے کی ترکیب ریشوں سے ہے اس لیئے شعرا رگ سنگ و رگ ابر وغیرہ کہا کرتے ہیں۔ کوئی چیز حرارت سے خالی نہیں انتفاء اسی حرارت کا اس شئے کے زوال کا باعث ہوتا ہے۔ حکماء یورپ کہتے ہیں کہ ہر ذرہ کائنات برقی کی قوت موجبہ و سالبہ سے مرکب ہے۔ موجبہ مرکز میں ہوتی ہے اور سالبہ اس کے گرد

چکر لگاتی رہتی ہے۔ وہ اظہار عظمت وکثرت کے لیئے ہے۔ تھنبتا غالب کے تصحیح کردہ دیوان میں اسی طرح ہے اور پہلے یہی املا تھا۔ میں نے زمانہ حال کے موافق تھمتا لکھ دیا۔

جیسے لوگ غم عشق جانتے ہیں اگر پتھر کے شراروں کی جگہ یہ غم ان میں پایا جاتا تو پتھروں سے چنگاریاں نکلنے کی جگہ ان کی رگوں سے اتنا خون ٹپکتا کہ کبھی نہ رکتا۔ یہ غم وہ غم ہے کہ پتھر ایسی سخت چیز بھی اس کا تحمل نہ کرسکتا اور خون ہو کے بہ جاتا۔

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے　　غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

جاں گسل = جاں شکن ۔ گسل صیغہ امر از گسلیدن بمعنی گسیختن وشکستن اسم وامر مل کر اسم فاعل ۔

دل جذباتی ہے نہ پابند عقل پھر اس کے ہوتے ہوئے غم عشق سے بچنا محال ہے اگرچہ غم عشق جان لیوا ہے۔ چونکہ دنیا محل آلام ہے بالفرض اگر غم عشق نہ ہوتا تو اور بہت سے غم زمانہ ہوتے اس سے تو ایک غم عشق ہی بہتر ہے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا　　نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

مرنا جان سے گذر جانا۔ اور عشق کرنا۔ جنازہ بکسر اول مشہور بفتح تابوت جس میں مردہ کو رکھ کر قبرستان میں لے جاتے ہیں۔

مر کے ہماری رسوائی ہوئی کیوں کہ لوگ کہتے ہیں کہ بار غم عشق نہ اُٹھا سکا۔ یا ایسا تھا ویسا تھا۔ اس رسوائی سے تو بہتر تھا کہ ڈوب مرے ہوتے۔ نہ جنازہ اُٹھانے کی ضرورت ہوتی اور نہ مزار بنانے کی۔ لوگوں کو جب اطلاع ہی نہ ہوتی تو رسوائی کیوں ہوتی۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بُری بلا ہے　　مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

میں کسی کو کیا بتاؤں۔ شب ہجر عجب مصیبت کی رات ہے جس کو میں ہی جانتا ہوں دوسرا کیا جانے۔ اس مصیبت سے ان کے سوا اور کون چھڑا سکتا ہے۔ اس کی تکالیف سے تو مرجانا کہیں آسان ہے اگر ایک بار ہوتا۔ مگر جب کچھ امید بندھتی ہے تو جی اُٹھتا ہوں۔ اور مایوسی وناامیدی کے خیالات مستولی ہوتے ہیں تو مر جاتا ہوں۔ غرض نہ مرتے ہیں اور نہ جیتے ہیں سسکتے رہتے ہیں۔ بہت اچھا شعر ہے۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یگانہ = یک اور (انہ) سے مرکب ہے جو حرف نسبت ہے۔ بے نظیر۔ بیمثال۔ یکتا۔ یک اور (تا) حرف اظہار عدد سے مرکب ہے بمعنی واحد و منفرد۔ و بے مثال۔ دوئی = ثنویت۔ دو ہونا۔ وحدت کا ضد و مقابل۔ دو چار ہونا = ملنا۔ ملاقات کرنا۔ سامنا ہونا۔ چار آنکھیں ہونا۔ (اس آخری محاورہ کی بات کو لیئے ہوئے دو چار ہونا بھی ہے)۔ یکتا۔ دوئی اور دو چار میں صنعت سیاقۃ الاعداد ہے۔ کہیں = دنیا و عقبیٰ۔

یکتا و یگانہ کا نہ دکھائی دینا۔ اور متعدد کا دکھائی دینا میری سمجھ میں نہ آیا۔

جناب حسرت نے اسے خالی چھوڑا۔ جناب نظم نے (دو چار ہونے کے معنی مل جانا بتانے پر اکتفا کی میرے نزدیک اس طرح ہوتا تو کوئی بات ہوتی ؎

اسے کون دیکھ سکتا کہ وہ جسم سے بری ہے  اگر اس کے جسم ہوتا تو کہیں دو چار ہوتا

شیعہ اثنا عشری اور سنیوں میں معتزلی نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں دیدار الٰہی کے قائل نہیں۔ موسیٰ کے سوال ارنی کا جواب لن ترانی سے دیا ہے اور لن نفی تاکید کے لیئے آتا ہے۔

پرانے علم ہیئت کے لحاظ سے آفتاب و مہتاب ایک ایک ہیں مگر دکھائی دیتے ہیں۔ جن و فرشتے بکثرت ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب  تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ایسے اعلیٰ درجہ کے مسائل تصوف اور پھر ان کا بیان کرنے والا غالب کا ایسا شخص اس نے ان مسائل میں چار چاند لگا دیئے۔ اگر غالب شراب خوار نہ ہوتا تو ایسے مسائل اس طرح بیان کرنے پر ہم اسے ولی سمجھتے۔ متکلم اور غالب میں تغایر اعتباری یا اعنات ہے۔ بحر اس غزل کی رمل مثمن مشکول ہے ایک رکن مشکول اور ایک سالم بروزن فعلات فاعلاتن چار بار۔

---

سوغ ۱۲

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا  نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

ہوس = مطلوب میں زیادتی چاہنا۔ نشاط = چستی پھرتی۔ جوش امنگ۔ مرنا = عشق کرنا۔

محبوب سے مقاصد و مرادات پورا کرانے میں کیسے کیسے تدابیر جوش اور امنگ کے ساتھ امید حصول میں اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ کبھی کوچہ گردی یار ہے۔ تو کبھی نامہ و پیغام ہے۔ کبھی معشوق سے خوشامد کرنا ہے تو کبھی لوگوں سے سفارش کرانا ہے۔ کبھی وفا سے پیش آنا کبھی اس کے مظالم برداشت کرنا۔ اگر عشق کر کے اس قسم کی باتیں نہ کرنا پڑتیں تو

زندگی ہی بے لطف ہوتی ہے۔ عشق ہی سے زندگی بامزہ ہے۔

جناب حالیؔ مرحوم فرماتے ہیں کہ اس شعر میں نیا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ (حقیقت) ہے۔ کیوں کہ دنیا میں چہل پہل اسی یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنا تھوڑا ہے۔ اور جب فرصت قلیل ہوتی ہے تو انسان ہر کام کو سرگرمی سے انجام دیتا ہے۔

موت کا یقین تو اب تک سب کو ہے مگر یقین مرگ کے ہوتے ہوئے کون کام دنیا اور آخرت کا کیا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے تو سبھی غافل ہیں۔ ہاں حرص وطمع کے تحت میں کچھ کر لیا کرتے ہیں۔ شاید جناب حالیؔ نے اپنے اوپر دوسروں کا قیاس کیا۔

جناب حسرتؔ نے یادگار کے حوالہ سے اسی مطلب کو ادا فرمایا ہے۔

جناب نظمؔ مرحوم کا ارشاد ہے کہ رقیب بلہوس (بوالہوس) کو ہوس نشاط کار اور وصل نگار حاصل ہے۔ اب ہمارے جینے کا کیا مزہ رہا۔ مصنف کی اصطلاح میں ہوس محبت رقیب کا نام ہے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ دنیا میں انسان کو ہوا و ہوس سے رہائی نہیں۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو اس طرح کے جینے میں کچھ مزہ نہ تھا۔ یعنی حاصل زندگانی مرنا ہے۔

جناب نظمؔ کی شعر فہمی اور علمی تبحر کا کیا کہنا ہے۔ اُن کی شرح سے بہتر اب تک کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ مگر انسان ہے۔ اس شعر کے مفہوم کو واضح نہ کر سکے۔ ان کے معانی سے ربط بین المصرعین نہ پیدا ہوا۔ اس کے معنی یہ نہیں جو میں نے لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ بہر طور اس مطلع کی خوبی میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا　　　کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

تجاہل - جانتے ہوئے نادان بنا۔ بہ تتبع اہل ہند دوسرا مطلع ہے۔

اے محبوب سراپا ناز ہم اپنا دکھ کہیں گے۔ اور شکوے بیان کریں گے تم ان کو سن کے کہاں تک یہ کہتے رہو گے ہاں کیا کہا کیا کہا۔ آخر اس نادان بننے سے تمہارا مدعا کیا ہے۔ کچھ تو کہو کہ ہم بھی کچھ سمجھیں۔

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں　　　شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

شکایت رنگین - گلہ دوستانہ نہ معاندانہ - (شکایت اور گلہ میں صنعت ترجمۃ اللفظ ہے) شکایہ اخبار تظلم وسوء عمل - گلہ وشکوہ۔

تمہاری نوازش ہائے بے محل غیروں پر دیکھتا ہوں اس پر اگر میں دوستانہ گلہ کروں تو تم کیوں بگڑو اور اُلٹے

مجھ سے گلہ کرو۔

نگاہ بے محابا چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکین آزما کیا

محاباۃ۔ از مادہ حبو باب مفاعلۃ کا صیغہ ہے۔ اہل ایران اس قسم کے الفاظ سے (ۃ) حذف کر دیتے ہیں اور محابا بولتے ہیں۔ جیسے مداراۃ سے مدارا۔ اور مکافات سے مکافا۔ معترض ہونا۔ (اعتراض) ممانعت۔ اُردو میں روک ٹوک کے معنی ہیں بے محابا۔ بے دھڑک۔ بے تکلف۔ بغیر ممانعت۔ تمکین۔ ثبات و قرار و استقلال و مکنت و قدرت و وقار و ضبط و صبر مُراد اور معنی ہیں۔

میری خواہش یہ ہے کہ میری طرف بے تکلفی اور بے حجابی سے دیکھو۔ ایسے تغافل سے کیوں کام لیتے ہو جو میرے ثبات و قرار میں مخل ہو۔ اور تمہاری غفلت شعاری سے میں استقلال و تحمل و ضبط و صبر سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ ایسی بے التفاتی تمکین آزما کیوں ہے۔

فروغ شعلۂ خس اک نفس ہے ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

ناموس۔ لفظ یونانی ہے Vouos عربی میں دخیل ہے۔ نوامیس جمع ہے۔ بمعنی عزت و آبرو مستعمل ہے۔ معنی وضعی راز دان۔ پاس۔ حفاظت لحاظ۔ فروغ۔ مبدل فروز جیسے تیغ مبدل تیز۔ تابش۔ روشنی۔ شعاع۔ چمک۔ (ہر دو بضم اول)۔

اغیار و رقیب تو بوالہوس ہیں۔ وہ وفاداری کی عزت و آبرو کا پاس کیا رکھ سکتے ہیں۔ ان کی وفاداری اگر ہے بھی تو تھوڑی دیر کی ہے۔ جیسے تنکوں کے شعلے کہ وہ ایک سکنڈ کے لیئے روشنی دے کر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔

نفس موج محیط بیخودی ہے تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

بیخودی۔ مدہوشی و مستی۔

جو سانس ہے وہ بحر بیخودی کی موج ہے۔ پھر ساقی کے تغافل کا گلہ کیا کریں۔ یعنی ہم اپنے آپ مست نشۂ عشق ہو رہے ہیں پھر اگر ساقی ہمیں شراب پلانے میں غفلت کرتا ہے تو شکوہ کس بات کا۔ بیخودی تو یوں ہی حاصل ہے۔ پھر تحصیل حاصل کا کیا فائدہ۔

دماغ عطر پیراہن نہیں ہے غم آوارگی ہائے صبا کیا

عطر = خوشبو - پیراہن - کُرتہ - قمیص (بکسر اول) یہ لفظ پیراستن کی کچھ بو دیتا ہے - مگر پوری ترکیب میں نہیں بتا سکتا - صبا = ہوائے مشرقی - پُروائی -

ہم اپنے غموں میں آپ مبتلا ہیں - ہم کو پیراہن محبوب کی خوشبو سونگھنے کا دماغ کہاں - پھر اگر صبا خوشبوے پیراہن یار نہیں لاتی ہے - اور ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی ہے تو ہم کو اس کی کیا پروا اور شکایت کس بات کی -

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　　ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

قطرہ = قطرے اسم ہے جس کے معنی ٹپکنے کے ہیں - ہم اس کے ہیں = اس سے - "ہمہ از دست" کی بو آتی ہے - حالاں کہ سازِ انا البحر کہنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہمہ اوست" کہنا چاہتے ہیں جس طرح منصور نے انا الحق کہا تھا - اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو یہ شعر مثل اس کے ہونا چاہیے - لفظ "دل" کا فائدہ میں نہ سمجھ سکا -

ہر اک قطرہ ہے یاں سازِ انا البحر　　　وہی ہم ہیں ہمارا پوچھنا کیا

یا مصرع ثانی یوں ہو ؎

ہیں عین حق ہمارا پوچھنا کیا

وہی = یعنی عین ذات الٰہی - ہمارا پوچھنا کیا = یعنی ہم بہت بڑی چیز ہیں -

دنیا کا ہر ایک قطرہ نغمہ وحدت و عینیت گا رہا ہے - لہٰذا ہم بھی عین وجود مطلق ہیں - دیکھنے میں شیون مختلف آتے ہیں مگر بعد از تحصیل سوا حقیقت مطلقہ کے اور کچھ باقی نہیں رہتا - جس طرح قطرہ بحر میں مل کر عین بحر ہو جاتا ہے -

محابا کیا ہے میں ضامن اِدھر دیکھ　　　شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

محابا = ترس - خوف - ڈر - محابا کیا = اُردو میں اس محل پر اس طرح نہیں بولتے - ڈر ہی کیا ہے - خوف کس بات کا - اِدھر دیکھ = ہماری طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھ - محل تنبیہ میں بھی یہ فقرہ بولا جاتا ہے ؎

میں ضامن ہوں بلا خوف اس طرف دیکھ -

بغیر کسی ڈر اور خوف کے میری طرف دیکھ - اور تیغ نگاہ سے مجھے قتل کر دے - میرا ذمہ کہ تجھے دیت (خونبہا) دینا پڑے گا - شہید تیغ نگاہ یار کا تو خونبہا نہیں ہوا کرتا ہے -

سُن اے غارت گر جنسِ وفا سُن　　　شکست قیمت دِل کی صدا کیا

دیوان غالب اُردو نسخہ عرشی صفحہ ۱۱۹ انجمن ترقی اُردو
شہر علیگڑھ

اس دیوان کو ایک ایسی چیز دستیاب ہوتی ہے جو پہلے کسی نسخہ کو میسر نہیں یعنی مرزا غالب مرحوم و مغفور کی ایک صحیح اور مستند عکسی تصویر، اس تصویر کے لئے میں اپنے ذی علم دوست لالہ سری رام صاحب ایم اے دہلوی مؤلف خمخانۂ جاوید کا ممنون ہوں۔ ان کے عم بزرگوار رائے بہادر پیارے لال صاحب آشوب فرنگی باشی جو مرزا غالب مرحوم کے عزیز ترین دوستوں اور مدّاحوں میں تھے۔ یہ عکسی تصویر رائے صاحب ممدوح کو مرزا غالب مرحوم نے خود دی تھی اور رائے صاحب سے بطور ایک قابل قدر یادگار کے لالہ سری رام مرحوم کے پاس پہنچی تھی۔

سن ۔ اس لفظ کی تکرار تاکید اور تنبیہ کے لیئے ہے ۔ کیا ۔ تحقیر کے لیے ہے ۔ شکست قیمت ۔ کسی چیز کے نرخ اور بھاؤ کا گھٹ جانا ۔ جنس اور شکست قیمت اور شاید غارت گر بھی الفاظ متناسب ہیں ۔ مگر میں صرف لفظ "قیمت" کچھ نہ سمجھا ۔

حقیقت نفس الامری تو یہی ہے کہ میں کلام غالب کے سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتا ہوں ۔ مگر جرأت بے جا تو دیکھو کہ شرح لکھنے بیٹھا ہوں خواہ وہ کسی کی خاطر سے سہی ۔

اے یار جفا کار تو نے میرا دل توڑا جو سرمایہ وفا تھا ۔ اور توڑنے کے بعد اس سے انکار (توڑا تو توڑا) یہ کہہ کر کہ اگر توڑا ہوتا تو اس کے ٹوٹنے سے آواز نکلتی ۔ اے پیارے دل کے ٹوٹنے میں کہیں آواز بھی نکلا کرتی ہے ۔ (قافیہ صدا مصیبت ڈال رہا ہے ۔)

دوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ دل کے ٹوٹنے میں کہیں آواز بھی نکلا کرتی ہے جو تم اس کے نہ توڑنے پر استدلال کرتے ہو ۔ اگر آواز ہوتی تو تمہاری بدنامی ہوتی اچھا اگر نہیں توڑا ہے تو اب توڑ کے اپنی خواہش پوری کر لو ۔ قیمت کے معنی قدر لیں تو کچھ معنی ہوتے ہیں ۔

شکست شیشۂ دل سے حیا کیا ؎

وہ اتنا صاف کہنا پسند نہیں کرتے ہیں ۔

جناب حسرت فرماتے ہیں کہ شکست قیمت کی کوئی صدا نہیں ہوتی ہے ۔ پس اے غارت گر اسے نہ توڑ ، کیوں کہ اس کی آواز شکست سے کوئی سامعہ نوازی بھی نہیں ہوتی ہے ۔ صدا کیا ۔ یعنی اس کی صدائے شکست کوئی چیز نہیں ۔

جناب نظم کا ارشاد ہے ۔ معشوق کہتا ہے کہ ہمیں شکست دل کی خبر نہیں اگر ٹوٹا ہوتا تو آواز آتی ۔ عاشق جواب میں کہتا ہے کہ دل کے ٹوٹنے میں کہیں آواز نکلتی ہے ۔ دوسرا پہلو اس بندش میں یہ نکلتا ہے کہ شکست دل کی صدا تجھے اچھی معلوم ہوتی ہے تو دل شکنے کیے جا اور سنے جا ۔ بھلا دل کی اور صدائے شکست ۔ دل کی کیا حقیقت ہے جو تو تامل کرے ۔ مصنف نے شکست دل کو شکست قیمت دل سے تعبیر کیا اور اس کے مناسب جنس اور غارت لائے ۔

ان کے لکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ قیمت کو وہ زائد تصور کرتے ہیں ۔ اور جناب حسرت بھی معنی میں اس لفظ کو نہیں کھپاتے ۔ مختصر یہ ہے کہ میں اور یہ دونوں بزرگ شعر کو جامہ معنی نہ پہنا سکے ؎

شکست قیمت عاشق بھلا کیا ‏ شکست قیمت دل ۔ ہے بھلا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں ‏ یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

اے قاتل یہ وعدۂ صبر آزما کیوں کیا کرتا ہے کہ جسے کبھی پورا نہیں کرتا اور اے کافر یہ فتنۂ طاقت ربا۔ کیوں برپا کیا کرتا ہے جس کا ہمیں تحمل نہیں ہے۔ اس معنی سے۔ یہ وعدہ اور فتنہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ تعقید ناگوار ہے۔ جناب حسرت فرماتے ہیں قاتل اور صبر آزما دونوں صفات وعدہ کے ہیں۔ اسی طرح کافر اور طاقت ربا مقدم و موخر دونوں صفتیں فتنہ کی ہیں۔ یہ صورت پہلی صورت سے اچھی ہے۔ جناب نظم فتنۂ طاقت ربا اسی وعدہ صبر آزما کو فرماتے ہیں۔

بلائے جان ہے غالبؔ اُس کی ہر بات     عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

کیا حرف عطف ہے جس نے معطوف و معطوف علیہ میں بیان مساوات کے لیے لائے ہیں اُس کی چاہے عبارت ہو چاہے اشارہ چاہے ادا ہو سب آفت جان ہیں۔

---

درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا     پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

درخور سزاوار ہمارا ایسا کوئی پیدا نہ ہوا اس سے انسان کی مدح اور قدح دونوں نکلتی ہے۔ یہاں قدح پر قرینہ زیادہ دال ہے کیوں کہ درخور قہر و غضب پہلے مصرع میں ہے۔
جب قہر و غضب اور عتاب و عذاب معشوق حقیقی یا مجازی کے ہمیں سزاوار ہیں تو پھر ہمارا یہ کہنا کیا غلط ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا۔ موالید ثلاثہ میں سے صرف انسان ہی مستحق عذاب و ثواب ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم     اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

بندگی و عبودیت۔ عبادت۔ غلامی۔ میں مرضی مولا پر چلنا پڑتا ہے مگر ہم ایسے آزادہ رو اور خوددار آدمی ہیں کہ اگر کعبہ میں عبادت کے لیے جاتے ہیں اور دروازہ کھلا نہیں پاتے ہیں تو اُلٹے پاؤں پلٹ آتے ہیں۔ اور انتظار دروازہ کھلنے کا نہیں کرتے پھر ہم کسی کے سامنے سر کیوں جھکانے لگے۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا     سامنے کوئی بُتِ آئینہ سیما نہ ہوا

سامنے ہونا۔ مقابل ہونا۔ سیما۔ علامت۔ وجاہت مجاز آپیشانی اور سجدہ کا گھٹا سب تیری یکتا اور بے نظیر ہونے کا دعویٰ مانتے ہیں اسی وجہ سے کوئی بت چمک دار پیشانی والا تیرے مقابلہ میں نہ آیا۔

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں : تیرا بیمار برا کیا ہے جو اچھا نہ ہوا

معشوق ناز اور نخرہ کی وجہ سے پورے طور سے آنکھ کھول کے کسی کی طرف نہیں دیکھتے اور بیمار کی آنکھ پر بوجہ ضعف پپوٹے پڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے معشوق کی چشم نیم باز کو چشم بیمار سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور عاشق مرض عشق کا بیمار ہوتا ہے۔

غالبؔ فرماتے ہیں کہ معشوق کی آنکھ بیمار اور عاشق مرض عشق کا بیمار یہ ہم نام ہونے کا فخر تمہاری آنکھ کے ساتھ اس کے لیے کیا کم ہے۔ پھر ؎

برا ہے ترا بیمار گر اچھا نہ ہوا

بُرا اور اچھا میں صنعت تضاد ہے۔

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ جو لب تک نہ گیا خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

وہ نالہ جو لب تک نہ آئے وہ تو سینہ کا داغ ہے۔ جس طرح خاک میں مل جاتا ہے، جو قطرہ کہ دریا تک نہ پہنچے۔ اور اپنے مرکز سے نہ مل جائے۔ زمین پر جو قطرہ کسی رقیق شے کا گرتا ہے وہ خشک یا جذب ہو جانے تک زمین پر ایک داغ معلوم ہوتا ہے۔ خوبی قطرہ کی یہی ہے کہ اپنے مرکز دریا سے جا ملے۔ اسی طرح نالہ کی خوبی یہ ہے کہ لب تک آئے معشوق پر اثر کرے۔

نام کا ہے مرے وہ دکھ جو کسی کو نہ ملا کام کا ہے مرے وہ فتنہ جو برپا نہ ہوا

کہ دریا نہ ہوا۔ کہ برپا نہ ہوا۔ دیوان میں ہے۔ غالبؔ اس محل پر (کہ) ہی کہتے ہیں میرے قلم سے جو نکل گیا جو حرف موصول ہے۔ (اس سے اوپر والے شعر میں کہ دریا نہ ہوا) ہے۔

جو رنج و الم کبھی کسی کو نہ پہنچا ہو وہ میری قسمت کا ہے یا مجھے پہنچتا ہے۔ اور جو فتنہ کبھی وقوع میں نہ آیا ہو میں اس کا خواہاں ہوں تاکہ محبوب کو معلوم تو ہو کہ میں مشکلات اور مصائب کو کیسا جھیلتا ہوں اور وفاداری میں کیسا مستقل ہوں۔

ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونناب حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

لوگ زبانی کہتے ہیں مجھے تحقیق نہیں کہ بیربل کی خاطر سے اکبر جو ایک بے تعصب شہنشاہ تھے مہابھارت

اور رامائین کے قصے بہت دل چسپی سے سُنا کرتے تھے۔ تو اُن کی طرف سے توجہ اکبر کو پھیرنے کے لیے فیضی اور بقولے ملا دو پیازہ نے داستان امیر حمزہ۔ حمزہ عم رسول صلعم اور عمر و عیار کے نام پر گڑھی اور جھوٹ کے پُل باندھے پھر اُس کے بعد میر احمد علی صاحب داستان گو لکھنوی نے بے حد اضافہ کر دیا۔ پھر نول کشور نے پہلے محمد حسین جاہ سے اس کے بعد احمد حسین قمر سے لکھوا کے پشتارہ کے پشتارے چھاپ دیئے۔

اگرچہ سارا قصہ سراسر جھوٹ ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ادب اُردو حاصل کرنے کے لیے بہترین کتاب ہے۔ ہر طرح کے محاورات و مصطلحات اس میں ملتے ہیں۔

ناظرین کہیں گے کہ یہ بے کار کی بکواس سے شرح کو طول دینا ہے۔ یہ صحیح ہے مگر طلاب کے معلومات میں اضافہ کرنے سے شاید خالی نہ ہو۔

عشق کی داستان غم انگیز سن کے اگر سامعین کی آنکھوں سے اور ہر بن موسے خون خالص کے آنسو نہ ٹپکیں تو وہ افسانہ عشق کیا ہے وہ تو داستان امیر حمزہ ہوگی جسے لوگ تفریح طبع کے لیے اور امرا نیند آنے کے لیے سُنا کرتے ہیں۔

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دجلہ بکسر دال مہلہ دجال سے مشتق ہے جس کے معنی سرگین کے ہیں جس سے پانس اور کھاد کا کام لیتے ہیں اور اصلاح زمین کرتے ہیں تاکہ زمین میں اس سے قوت پیدا ہو اور پیداوار اچھی ہو۔ دجلہ کا پانی زمین عراق کو قوت پہنچاتا ہے اس لیے اس کا نام دجلہ رکھا۔ نہر فرات سے مقام قومین مل کر بصرہ سے آگے خلیج فارس میں گرتا ہے۔ مسیپی۔ امازان۔ نیل۔ سندھ اور گنگا کے بعد یا اس سے مقدم بڑائی میں ایک دریا ہے۔ اصطلاح جغرافیہ میں دریا کے بڑے ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کتنی دور تک بہ کے گیا ہے۔ پاٹ اور گہرائی سے دریا کی بڑائی نہیں شمار کرتے ہیں۔ میں نہ سمجھ سکا کہ "بحر" کے ہوتے ہوئے لفظ دجلہ جو ایک خاص نہر کا نام ہے کس خصوصیت کی بنا پر اختیار کیا ہے۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ عارف بصیر اور حکیم کو کُل جزو میں نہ دکھائی دے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر دیدۂ بینا کیا ہوا لڑکوں کا کھیل اور تماشا ہوا۔ نظر عارف تو بڑی چیز ہے۔

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے　　دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

غالبؔ کی تعزیر و تعذیب لوگوں کے لیے تماشا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا اگر اس کے پُرزے اُڑائے جاتے تو لوگ اس سے عبرت حاصل کرتے۔ خیر یہ تماشا دیکھنے ہم بھی گئے تھے مگر اتفاقاً کسی وجہ سے اس کے پرزے (ٹکڑے) نہ کیئے گئے۔ ے

۵ دیکھنے ہم بھی گئے پر یہ تماشا نہ ہوا

---

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں کہ ہے سرپنجۂ مژگان آہو پشت خار اپنا ۶غ/۱

جنون جولان ۔ وہ شخص جو بحالت جنوں مارا مارا پھرے۔ پشت خار ۔ ایک لوہے یا پیتل کا پنجہ جس میں خمیدہ انگلیاں بنی ہوتی ہیں اور وہ ایک ڈنڈی میں لگا ہوا ہے۔ درویش اپنے پاس رکھتے ہیں۔ تاج ۔ تہ بند۔ گیروا یا نیلا بستر۔ سونٹا گنٹھے وغیرہ کے ساتھ فقیری باتوں میں سے ایک چیز پشت خار بھی ہے۔ اس سے پیٹھ کھجلاتے ہیں۔ بے سروپا بے سروسامان۔ آہو ۔ ہرن۔ وحشی جانور ہے۔ صحرا میں ہوتا ہے اور جنون کی وجہ سے یہ بھی صحرا نورد ہیں۔ پیتل یا لوہے کا پشت خار میسر نہیں تو سرپنجۂ مژگان آہو کا پشت خار بنا یا۔

اپنی بے سروسامانی اور صحرا نوردی کا بیان ہے۔ اس لکھنے کے بعد معنی شعر لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کیا ایک لفظ جنون سے اس شعر کو غزل کا شعر کہہ سکتے ہیں۔

---

پے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا بخوں غلتیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا ۲۰غ/۸

غلتیدن ۔ لوٹنا۔ لتھڑ جانا۔ رنگ ۔ تینتیس معانی ہیں سے اس محل کے مناسب مکر وحیلہ و دغا۔ عار اور بدی ہیں۔ نارسائی ۔ شناسائی یا مقصود تک نہ پہنچنا۔ پارسائی ۔ زہد و پرہیزگاری و دوری از معاصی و ذمائم۔ بخون غلتیدہ آلودہ بخون۔ ناپاک۔ خون کو اہل شرع نجس مانتے ہیں۔

جناب حسرتؔ فرماتے ہیں :

"بخشش الٰہی کی نذر کے واسطے ہمارے پاس صرف شرم نارسائی کا تحفہ ہے۔ اور دوسرا مصرع تشریح تحفہ میں ہے۔ یعنی ہمارے پاس اس دعویٰ پارسائی کا تحفہ ہے جو سو رنگ سے خون میں غلتیدہ ہے۔ یعنی جس کا خون ہو چکا ہے۔"

جناب نظمؔ فرماتے ہیں :

"کریم کو نذر دینے کے لیئے میری شرم وندامت اس دعویٰ پارسائی کا تحفہ لے کے چلی ہے جس کا سو گنا ہوں کے ہاتھ سے خون ہو چکا ہے۔ شرم نارسائی

کا تحفہ اسم ہے۔ (ہے) کا۔ اور دوسرا مصرع سارا خبر ہے (پئے نذر کرم) تحفہ دینے کی علت اور غایت ہے۔ نارسائی کے معنی درگاہ کریم سے تقرب نہ ہونا اور اس سے دُور رہنا ہیں "

اب میری بھی سن لیجیے۔ درگاہ کریم میں اعمال حسنہ نہ ہونے اور عدم معرفت کی خجلت اور شرمندگی و پشیمانی کا تحفہ لے کر جا رہا ہوں۔ چوں کہ وہ کریم ہے اس لیے مقبول ہونے اور بخشش کا یقین کامل ہے۔ لہٰذا عیب و عار و مکر و فریب و بدی میں مبتلا اور آلودہ ہو کر بھی مجھے دعویٰ پارسائی کا ہے۔ کیوں کہ بعد از معافی خطا و گناہ عدم گناہ کے مثل ہے۔ پھر دعویٰ پارسائی کیوں نہ ہو۔

نہ ہو حُسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا　　　بمُہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

حُسن تماشا دوست۔ وہ حسن جو اپنا تماشا کرانا دوسروں کو پسند کرتا ہو۔ دونوں مصرعے استفہام ہیں پہلا اقراری اور دوسرا انکاری۔

جو حُسن کہ اغیار کو اپنا تماشا دکھانا پسند کرتا ہو وہ کیا رسوائی بے وفائی نہ ہوگا یعنی ضرور رسوا ہوگا۔ وفاداری کے تو یہ معنی تھے کہ ہم کو اپنے حُسن کا تماشا دکھاتے نہ اغیار کو جس حُسن پر سو نظریں اغیار کی پڑیں تو گویا سو مہریں اُس کے پارسا ہونے کی کیا لگ جائیں گی یعنی نہیں لگیں گی۔ تو پھر کیا اس حُسن کو دعویٰ پارسائی کا ہو سکتا ہے۔ (نہیں ہو سکتا)۔

یا حسن مقتضی اسی امر کا ہے کہ دیکھا اور دکھایا جائے اس لیے اغیار کی بھی نظریں اس کی پارسائی کے ثبوت پر بمنزلہ مہر تصدیق ہوں گی۔

پہلے معانی کے ساتھ مصرع ثانی بطور طعن و طنز ہو سکتا ہے۔ یعنی جی ہاں ہم کو بھی معلوم ہے کہ اغیار کی نظریں اس کے دعویٰ پارسائی کی تصدیق پر مہریں ہیں۔ حاصل اس کا بھی وہی ہے جو استفہام انکاری سے تھا۔ یعنی اغیار کی نظر بھی پڑنے سے پارسائی کا دعویٰ غلط ہے۔

زکوٰۃ حُسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا　　　چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

زکوٰۃ۔ اس کا مصدر زکی" و زکاء" ہے جس کے معنی ظاہر ہونا۔ بڑھنا۔ درستی و اصلاح ہیں سال بھر صرف کرنے کے بعد جو رقم ذخیرہ رہے اس میں سے ہر چالیس پر ایک روپیہ زکات کا نکالنا فرض ہے۔ فرائض فروعی میں سے ایک فرض بینش حاصل مصدر بمعنی بینائی و بصارت و بصیرت۔ مگر اس کا مصدر دیدن اور ماضی دید من غیر لفظ ہے۔ اُردو میں بھی جانا مصدر کا ماضی (گیا) من غیر لفظ ہے۔ عربی میں ذو کی جمع اولو من غیر لفظ ہے۔ جلوۂ بینش۔ بینائی کے لیے

بمنزلہ تجلی ۔ اسی کی مناسبت سے مہر آسا کہا۔ کاسۂ گدائی ۔ کشکول فقرا۔ حسن میں نور تجویز کرتے ہیں۔
اے بصیرت کے لیے بمنزلہ تجلی طور اپنے سرمایۂ حسن سے زکوٰۃ ہم کو بھی دے یعنی دیدار سے کامیاب کرتا کہ اس فقیر کے گھر کا چراغ آفتاب کی طرح اس کا کاسۂ گدائی ہو جائے۔
سورج دن کی چیز ہے۔ ذکر چراغ چاہتا ہے کہ بجائے۔ مہر آسا۔ ماہ آسا ہو۔ یا اس میں کوئی ایسی بات ہے جو میرے ذہن میں نہیں آتی۔
کاسۂ گدائی سے استعارۂ دل۔ اور زکوٰۃ سے زکوٰۃ عرفان مراد ہو سکتی ہے۔ جناب نظم ان استعارات کے ساتھ معنی تحریر فرماتے ہیں کہ اے جلوۂ بینش میرے کشکول دل کو زکات عرفان دے کر روشن کردے کہ اس فقیر کے لیے وہ چراغ ہو جائے اور آفتاب کی طرح شبِ تار جہالت کو دن کردے۔

نہ مارا جان کر بے جرم۔ قاتل تیری گردن پر    رہا مانندِ خون بے گنہ حق آشنائی کا

اے قاتل تو نے مجھے بے جرم سمجھ کر قتل نہ کیا۔ حالاں کہ آشنائی اور دوستی کا مقتضیٰ یہ تھا کہ تو مجھے قتل کر دیتا تاکہ مصائب عشق سے نجات مل جاتی۔ لہٰذا جس طرح کہ بے گنہ اور بے خطا کا خون گردن قاتل پر باقی رہتا ہے اسی طرح حق آشنائی نہ ادا ہونے سے اس کی ذمہ داری تمہارے ذمہ باقی رہ گئی۔

تمنائے زبان محوِ سپاس بے زبانی ہے    مٹا جس سے تقاضیٰ شکوہ بے دست و پائی کا

سپاس سہ تین اور پاس (حفاظت) سے مرکب ہے یعنی اقرار باللسان۔ وتصدیق بالجنان۔ وعمل بالارکان سے شکر منعم ادا کرنا۔ بے دست وپائی عاجزی۔ لاچارگی۔
زبان سے جو تمنا معشوق کے سامنے پیش کی جاتی یا شکایت کی جاتی وہ کام بے زبانی اور خموشی سے پورا ہو گیا۔ کیوں کہ ہماری لاچاری اور خموشی پر اسے رحم آگیا۔ اور اس نے ہماری تمنا پوری کردی۔ اور ہمیں زبان سے کچھ کہنا نہ پڑا۔ لہٰذا زبان خموشی کی شکر گذار ہے۔ اور محبوب سے شکوہ وشکایت کا بھی موقع نہ رہا۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے    چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نکہت۔ ریح النغم بکاف فارسی لفظ عربی ہے۔ پنجابی کاتبوں نے گاف سے لکھنا شروع کیا یہاں تک کہ یوپی کے کاتبوں میں بعض گاف فارسی سے لکھنے لگے۔ مستعمل بمعنی خوشبو۔ خوشبوئے گل اور میرا نفس معطر ایک ہی چیز ہے۔ اسی وجہ سے چمن کی زینت اور بہار میری ہی نغمہ سرائی اور رنگین نوائی سے ہے۔ یا فصل بہار نے مجھے رنگین نوا بنا دیا ہے۔

دہانِ مہر بت بے غارہ جو زنجیر رسوائی　　عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

بیغارہ ۔ بفتح بار موحدہ سرزنش وطعنہ ۔ دہن ۔ محبوب کو خوردی میں حلقہ میم اور معدوم بھی تجویز کرتے ہیں۔ خوردی میں حلقہ زنجیر سے تعبیر کیا ہے ۔ پھر اسی کو عدم بھی کہا ہے ۔ بت بیغارہ جو مراد دوسرے محبوب جو شاعر کے معشوق پر بے وفائی کا طعنہ کر رہے ہیں ۔ چوں کہ ہر حسین طعنہ زن ہے لہٰذا ان سب کے دہن خورد کے حلقوں سے ایک زنجیر بنائی ۔ یا تسلسل ذکر طعنہ رسوائی سے زنجیر تیار کی ۔ اور اس زنجیر رسوائی میں اپنے محبوب کو گرفتار بنایا ہے ۔

حسین بے وفا تو ہوتے ہی ہیں مگر تم سب سے زیادہ بے وفا ہو کہ دوسرے حسین بھی تم کو بے وفا مانتے ہیں اور بتسلسل تمہاری بے وفائی کا ذکر ان کے منہ پر جاری ہے ۔ چوں کہ دہن حسینان کو معدوم بھی مانتے ہیں اس لیے تمہاری رسوائی بے وفائی کا چرچا گویا عدم تک پہنچا ہوا ہے یا تمہاری بے وفائی سے جو مر کر عدم میں گئے ہیں وہ بھی عدم میں تمہاری بے وفائی کا چرچا کرتے ہیں۔ کتنی ہی جدت مضمون اس شعر میں صرف کی گئی ہو پھر بھی الجھن سے خالی نہیں ۔ چوں کہ اس کا مطلب پیدا کرنے میں دماغ سوزی سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے اس کا لطف مفقود ہو جاتا ہے ۔ اس کے آگے غالب کے اشعار سمجھنے والے جانیں ۔

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے　　کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

اے محبوب کبھی مجھ کو اتنا موقع دے کہ جو ستم تیری جدائی میں مجھ پر گذر رہے ہیں ۔ تیرے پاس آکر انھیں تجھ سے بیان کروں اس کی تمنا اور حسرت مجھ کو ہے ۔ اور وہ اتنے کثیر ہیں کہ تحریر میں نہیں آسکتے ۔ اس لیے اے غالب خط کو طول نہ دو اور اتنا لکھ دو کہ مجھے حسرت ہے کہ تمہارے سے فراق کے ستم میں تم سے بیان کروں ۔

---

گر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائے گا　　بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

طرز ادا اس شعر کا یوں چاہتا ہے : اگر ایسا نہ ہوا ۔ یا ۔ نہ ہو گا ۔ تو یہ ہو گا یا ایسا ہو گا یا ہو جائے گا ۔ دونوں ردیفوں کو چسپاں کر کے مجھ سے اس شعر کی نثر نہ بن سکی ۔ پھر داغ مہ کے مہر دہاں ہونے کی علت بھی نہ سمجھ میں آئی ۔ اور اس کا داغ کیسے مہر دہان بنے گا ۔ معانی محسنات پر مقدم ہوتے ہیں ۔ شب ۔ ماہ ۔ داغ الفاظ متناسب ضرور ہیں مہر دہان ہونا منہ پر مہر لگی ہونا چپ اور خاموش ہونے کے معنی ہیں لفظ تکلف کے صرف کی خوبی بھی نہ معلوم ہوئی ۔ ہاں اس میں سے (ت) نکالنے کے بعد کلف باقی رہتا ہے جو ماہ کے مناسب ہے ۔

تو یقیناً داغ دل مہر دہان ہو جائے گا

اگر غم شب فرقت مجھ سے نہ بیان ہوا یا نہ ہو سکا تو بے تکلف یہ سمجھنا چاہیے کہ داغ مہ میرے منھ پر مہر خموشی ہو گیا تھا یا ہو گیا ہے۔ کہاں داغ مہ اور کہاں ان کے منھ پر اس کا مہر خموشی ہونا۔

جناب حسرتؔ اور جناب نظمؔ دونوں نے اس کے صیغے بدل کے معانی لکھے ہیں۔

زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب  پرتو مہتاب سیل خانماں ہو جائے گا

پتوں کے پانی ہونے اور چاندنی کے سیلاب ہو جانے میں کیا تلازم ہے۔ یہ شعر یوں ہوتا تو مفہوم پورا ہوتا۔

پتہ ہر شے کا جو شام ہجر میں ہوتا ہے آب  پرتو مہتاب سیل خانماں ہو جائے گا

یا اس طرح ہو ؎

پتہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب  زہرۂ مہتاب سیل خانماں ہو جائے گا

مہتاب = چاندنی اور بمعنی ماہ مجاز۔ خان و مان۔ گھر اور سامان۔

ہیبت شام ہجر سے اگر پتے یوں ہی پانی ہوتے رہے تو دیکھنا چاندنی بھی گھر اور اس کے سامان کو تباہ کرنے والا سیل ہو جائے گی۔ چاندنی کو سیلاب سے تشبیہہ نئی ہے۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر  ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

محبوب جب سو رہا ہے ہو سکتا ہے کہ اضطراب شوق میں میں اُس کے پاؤں کا بوسہ لے تو لوں (لیکن اگر وہ جاگ اٹھا) تو ایسی باتوں سے وہ بدگمان ہو کر پاس بھی پھٹکنے نہ دے گا۔ اور مجھ پر بوالہوسی کا گمان کرے گا۔ مجھے یہ شعر اپنے مفہوم کی وجہ سے پسند نہ آیا۔ مگر میری پسندیدگی اور ناپسندیدگی کیا حیثیت رکھتی ہے۔ غالبؔ کے کلام سے رغبت عامہ ہونے کی وجہ سے میرا ایسا لکھنا اپنے آپ کو مطعون کرانا ہے۔ مگر اپنے نزدیک جس بات کو سچا سمجھا اس کے چھپانے کو پسند نہ کیا۔

جناب حسرتؔ سلمہ اللہ تعالیٰ۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس شعر کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جب وہ میرے خواب میں آئے تو میں اس کے پاؤں کا بوسہ لے لوں تو وہ بدگمان ہو کر خواب میں بھی آنا چھوڑ دے گا۔ پہلا مطلب صاف تھا، لہٰذا اسے نہ لکھا۔

کسی کا کسی کو خواب میں دکھائی دینا۔ دکھائی دینے والے کا فعل اختیاری نہیں بلکہ خواب دیکھنے والے کے حواس باطنی قوت واہمہ۔ خزانہ خیال اور حس مشترک کے کرتوت ہیں۔ محبوب کو علم ہی کیسے ہوگا جو وہ خواب میں بھی آنا چھوڑ دے گا اور بدگمان ہو جائے گا۔ لیکن کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعر ہے کوئی مسائل منطقہ یا فلسفہ نہیں جو ہر جہت سے چولیں بٹھائی جائیں۔ شعر میں ایسی باتوں کو دخل کیا۔

دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحاں ہو جائے گا

پہلے مصرع میں کوئی بات لائق تفسیر نہیں جو "یعنی" حرف تفسیر لایا جائے ہاں مصرع ثانی نہ معلوم ہونے کی علت ہے اس لیے کاف علت یا کاف بیان ہونا چاہیے۔

اس طرح سے کہ یہ سب سے پہلے نذر امتحاں ہو جائے گا

جناب غالب نے کئی جگہ ۔ یعنی

کہ یہ پہلے ہی سے نذر امتحاں ہو جائے گا

اسی طرح صرف کیا ہے۔ شعر خوب ہے شاید ان کے زمانہ میں اسی طرح بولتے تھے۔

ہم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ دل کو ہم وفاداری یار میں صرف کریں گے مگر یہ کیا معلوم تھا کہ یہ دل یار کے امتحان لینے ہی میں ختم ہو جائے گا۔ یا۔ اسی کا ہو کے رہ جائے گا۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

سب تجھے دل سے چاہتے ہیں تو اگر مجھ سے راضی ہو گیا تو تمام عالم مجھ پر مہربان ہو جائے گا۔ کیوں کہ سب تمہاری رضا کے جویا رہتے ہیں۔ اک ۔ عظمت کے لیے ہے۔ اور تحقیر کے لیے بھی آتا ہے۔ گویا لغات اضداد میں سے ہے۔ (دوست کا دوست دوست ہوتا ہے)۔

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

اگر تیری نگاہ خشم آلود کے ڈر سے میں ضبط آہ کرتا رہا تو شعلہ (آہ سوزاں) خس میں (مجھ نحیف و زار میں) اس طرح نہاں ہو جائے گا جیسے خون رگوں میں پنہاں ہے۔ اور مجھے جلا کے خاک سیاہ کر دے گا۔ غضب کا استعارہ آتش کے ساتھ۔ اور آہ کی صفت میں سوزاں لاتے ہیں۔

جناب حسرت تشبیہ اس کے عکس میں مان کے ارشاد فرماتے ہیں کہ تمہارے عتاب کے خوف سے خون رگ میں اس طرح نہاں ہو جائے گا جیسے شعلہ خس میں ہوتا ہے۔

خون تو رگ میں نہاں ہوتا ہی ہے۔ شاید سہو الخیال ہے یا کاتب کی کارستانی ۔ جناب نظم کا ارشاد ہے کہ اس کی نظر عتاب اگر یوں ہی ضبط نالہ و آہ کا اشارہ کرتی رہی تو اس کے ڈر سے تعجب نہیں کہ شعلہ خس میں چھپ رہے جیسے کہ خون رگ میں پنہاں ہے۔

ان بزرگ کے معانی سے معلوم ہوا کہ منشاء معنی جناب حسرت انہیں کے معانی ہیں دور ایہ ہو جانے سے مجھے بالضرور یہ سمجھنا چاہیے کہ میرا خیال غلط ہے۔

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر ہر گُلِ تر ایک چشم خون فشاں ہو جائے گا

اے مخاطب مجھے باغ میں نہ لے جا ورنہ میرا حال پر ملال دیکھ کر گُل جنھیں کوئی احساس نہیں وہ بھی چشم خوں فشاں ہو جائیں گے۔ تری اور سرخی گُل کی وجہ سے گُل کا چشم خونفشاں ہونا کہا ہے۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

تیرے مظالم کا دنیا میں تو کوئی انصاف کرنے والا ہے نہیں سب تم پر مرتے ہیں اور تمہاری ہاں میں ہاں ملانے والے ہیں۔ مگر یہ امید ضرور ہے کہ حشر میں انصاف ہوگا۔ لیکن اگر انصاف وہاں بھی نہ ہوا تو میری بدنصیبی پر افسوس ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ میاں بھی تمہارے حسن پر ریجھ جائیں اور انصاف نہ کریں۔ شعر خوب ہے۔ ؎

حشر میں داورِ محشر بھی ہو تیری ہی طرف اے ستم گر اسے تائید خدا کہتے ہیں

فائدہ کیا سوچ۔ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

ناداں ۔ الحمق۔ جو اچھے اور بُرے میں تمیز نہ کر سکے۔ مراد محبوب۔ دوسرا مصرع ضرب المثل ہے۔ "ناداں کی دوستی جی کا زیان۔"

اے اسدؔ تم تو دانا ہو۔ ایسے ناداں کی دوستی کرنے سے بجز نقصان جان اور کیا ملے گا۔

---

درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا وبخ ۱۰

مرض عشق کا میں نے علاج نہ کیا، کیوں کہ میں اس سے صحت کا خواہاں نہیں۔ اگر دوا کرتا تو دوا کا احسان مجھ پر ہوتا اور میں کسی کا ممنون احسان ہونا چاہتا نہیں۔ لہٰذا اس مرض سے اگر مجھے صحت نہیں ہے تو برا کیا ہے۔ مجھے تو درد عشق کا مریض رہنا ہی پسند ہے۔ اچھا۔ اور برا باہم صنعت تضاد رکھتے ہیں۔

مرض عشق سے صحت یاب نہ ہونے میں دو خوبیاں ہیں۔ ایک تو اس سے صحت مطلوب نہیں تو یہ بات حاصل ہوئی۔ دوسرے دوا کا احسان مند نہ ہونا پڑا۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو  اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

دستور ہے کہ دو متخاصمین اپنا کوئی جھگڑا پیش کر کے آپس میں کچھ فیصلہ چاہتے ہیں۔ تو چند لوگوں کو جن سے انصاف کی امید ہوتی ہے اکٹھا کر لیتے ہیں۔ مگر ہم جو گلے اور شکوے تم سے کرنے والے ہیں تو تم نے رقیبوں کو جمع کیا ہے۔ جو ہمارے حریف ہیں۔ ہمارا گلہ کرنا ان کے لیے تماشا ہوگا اور ہماری تکلیفوں کو سن کے خوش ہوں گے۔ ان سے امید انصاف کہاں۔ جناب نظم معشوق کا گلہ کرنا فرماتے ہیں۔ نہ عاشق کا۔

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں  تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

ہم تمہارے ہی ہاتھ سے قتل ہو کر تکالیف سے نجات چاہتے ہیں۔ جب تمہیں نے ستمگر اور ظالم ہوتے ہوئے قتل نہ کر کے ہماری اس آرزو کو پورا نہ کیا تو اور کسی سے ہم اپنی قسمت آزمانے کہاں جائیں۔ دوسروں سے ہم کو کیا امید ہو سکتی ہے۔ غرض کہ تم ایسے ظالم ہو کہ قتل کر کے بھی میرا چھٹکارا غموں سے تم نہیں چاہتے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب  گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

شیریں اور مزہ الفاظ متناسب ہیں۔
رقیب جسے عشق صادق نہیں مانتے وہ گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوا یہ امر اس کے (محبوب کے) غایت شیریں لب ہونے پر دال ہے۔ اور رقیب کو بے حیا اور ذلیل آدمی دکھانا ہے۔

ہے خبر گرم ان کے آنے کی  آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جب کوئی مہمان کسی کے گھر آتا ہے تو میزبان حسب حیثیت اس مہمان کی خاطر داری اور مدارات میں ساز و سامان مہیا کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج ان کے آنے کی خبر وثوق کے ساتھ ہے، مگر آج ہی ہمارے گھر میں بوریا تک نہیں۔
(اپنی ناداری اور مفلسی کا اظہار ہے۔ مگر (ہی) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تھا اگر اس کی جگہ (بھی) ہوتو دائمی مفلسی کا اظہار رہتا ہے۔ یہ اور گالیوں والا شعر مجھے اچھا نہ معلوم ہوا۔ غالب کے مرتبہ سے پست ہیں۔ وقت انتخاب انھیں بھی نکال دیا ہوتا۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

بندگی۔ عبودیت۔ بندگی کو نمرود کی خدائی سے تعبیر کرنا نئی بات ہے۔ وہ اشارہ بندگی کی طرف ہے۔ نمرود۔ حضرت ابراہیم کے زمانہ کا بادشاہ جس نے ان کو آگ میں ڈلوا دیا تھا اور دعویٰ خدائی کرتا تھا۔ بندگی، چاہے معشوق حقیقی کی مانو یا مجازی کی۔

میری عبودیت کیا نمرود کی خدائی تھی جو بندگی سے سوا نقصان کے مجھے فائدہ نہ پہنچا جس طرح نمرود کو خدائی سے فائدہ نہ پہنچا۔ معشوق حقیقی مراد ہو تو اس کے استغنا کی وجہ سے اور معشوق مجازی مراد ہو تو اس کے غرور حسن سے کچھ نفع نہ ملا۔

جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہم نے جو اس پر یا اس کو جان دی تو یہ جان اسی کی تو عطیہ تھی یہ کون سا بڑا کام ہم سے سرزد ہوا۔ سچ پوچھو تو ہم اپنی ذمہ داری کو ادا نہ کر سکے۔ پہلے حق کے معنی سچ کے ہیں۔ اور خود سچ بھی پڑھ سکتے ہیں جیسے سچ تو یہ ہے کہ...

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما　　کام گر رک گیا روا نہ ہوا

زخم کا دب جانا، اس کا اچھا ہو جانا یا کم ہو جانا۔ پہلی بول چال کے موافق تھنبا بجائے تھما۔ چھپا ہے۔ جب کوئی کام رک جاتا تو اس کا اتمام اور اجرا نہیں ہوتا۔ مگر ہمارے زخم (عشق۔ یا۔ دل) کے دب جانے پر بھی اس سے لہو جاری ہے۔ اور اگر دوسرا مصرع بطور استفہام پڑھیں تو یہ معنی ہوں گے۔ اگر کوئی کام رک جائے تو کیا اس کا اجرا نہیں ہوتا یعنی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے زخم کو دیکھو کہ دب جانے پر بھی اس سے خون جاری ہے۔

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے　　لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

محبوب ہمارا دل لیتے ہی چلتا ہوا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کے دل داری کی باتیں بھی نہ کیں۔ یہ تو دلستانی نہ ہوئی بلکہ ایک قسم کی رہزنی ہے۔

قافیہ معمولہ پہلے ردیف کو مستقل اور ایک ہی معنوں میں مانتے تھے اس لیے قافیہ معمولہ کو عیب سمجھتے تھے۔ جب سے ردیف کو مختلف معنی میں استعمال کرنے لگے تو قافیہ معمولہ حسن اور صنعت میں شامل ہو گیا۔ ردیف و قافیہ میں قطع و برید کر کے ردیف و قافیہ قرار دیتے ہیں تو ایسے قافیہ کو معمولہ کہتے ہیں۔ اسی غزل میں۔ روا۔ ادا۔ بھلا۔ قافیہ ہے اور

نہ ہوا۔ ردیف مگر اس شعر میں روانہ۔ اور ہوا۔ ہے۔ روانہ کے (روا) کو قافیہ بنایا۔ اور اس کا (نہ) لے کر ہوا میں شامل کر کے ردیف بنائی۔ اسی طرح گلستان کا۔ بیابان کا کے ساتھ۔ جھانکا اور ٹانکا اگر قافیہ لایا جائے تو یہ بھی قافیہ معمولہ ہوگا۔ اردو شاعری میں اسے ہنر سمجھا جاتا ہے اور اس کا شمار صنائع لفظیہ میں ہے۔

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں  آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

جناب نظم فرماتے ہیں کہ ساری غزل پڑھنے کے بعد یہ کہنا کہ آج غالب غزل سرا نہ ہوا۔ شاید اس کے یہ معنے ہوں کہ طرح میں کچھ پڑھیے۔ طرح میں تو کچھ پڑھا نہیں۔

---

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا  گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اضطراب۔ از مادہ ضرب بمعنی تحرک و تموج۔ و اختلال و تردد و ارتیاب۔

دل میں تنگی۔ دل کو وسیع اور فراخ مانتے ہیں۔ کہ اس میں خیال اور معانی ایسی وسیع چیز کی گنجائش ہوتی ہے۔ مگر میرا شوق اتنا کثیر ہے کہ دل کی تنگی کا میرے شوق کو گلہ ہے۔ اس دل تنگ میں وہ شوق مفرط ہو کر اپنے جوش و خروش کو نہیں دکھا سکتا تو گویا اضطراب سمندر کا موتی ایسی چھوٹی چیز میں سمایا ہوا ہے اور مٹ کے رہ گیا ہے۔ دل تنگ کو خورد دی موتی سے اور شوق کثیر کو اضطراب دریا سے مثال دی ہے۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب  مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

پاسخ۔ جواب۔ مکتوب۔ نامہ و خط۔ خامہ فرسا۔ بجائے خامہ فرسائی کہا۔ قلم چلاتے اور گھستے رہنا۔ اور واؤ استبعاد کے معنی میں ہے۔ کبھی مبالغہ کے لیے بھی آتا ہے جیسے ایک تو کڑوا کریلا اور چڑھا نیم۔ اس کے ساتھ "اس پر" ملانے سے مزید براں معنے ہوتے ہیں۔

یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم میرے خط کا جواب دو یہ تم سے بہت بعید ہے۔ مگر کیا کروں کہ میں خامہ فرسائی کرنے پر مجبور رہوں خصوصاً تمہارے ساتھ خط و کتابت میں۔

حنائے پائے خزاں ہے اگر بہار ہے بھی  دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

حنا و عربی میں بتشدید نون۔ مہندی۔ بہار۔ کہتے ہیں (بہ) بمعنی خوبی و بہبودی (رہے) بصورت موجود رہے

کی (ہ) خارج ہے اور مصرع ناموزوں اور آر آوردن کے صیغہ امر سے مرکب ہے۔ یعنی خوبی لانے والی کثرت استعمال سے (ب) پرفتحہ ہو گیا ہار ہوز تقطیع سے خارج ہو گیا۔ فصل ربیع میں گل بوٹے پھل کثرت سے پیدا ہوتے ہیں جس سے خوبی اور رنگینی زمانہ کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی رنگینی کی وجہ سے اسے حنائے تعبیر کیا۔ ہے اور مہندی کا رنگ ہاتھ پاؤں سے بہت جلد اڑ جاتا ہے۔ اگر بہار ہے بھی۔یا۔ بہار اگر ہے یہی پڑھیں دونوں صورتوں میں (ہے) کی ہائے ہوز خلاف اصول خارج ہے۔ غالب ایسے شخص سے یہ مسامحہ بہت تعجب خیز ہے۔ جناب نظم نے بہار اگر ہے یہی اپنی شرح میں لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ غالب نے ہرگز (بہار ہے یہی) نہ کہا ہوگا۔

درس غالب مطبوعہ لاہور میں بھی (بہار اگر ہے بھی) چھپا ہوا ہے۔

اگر بہار کا وجود مان بھی لیا جائے۔ (جب چار دن کے لئے ہے تو بمنزلہ عدم ہے) تو وہ خزاں کے پاؤں کے لیے بمنزلہ مہندی (حنا) کے ہے جو جلدی مٹ جائے گی۔ اور پھر وہی خزاں ہی خزاں ہے۔ اسی طرح عیش و سرور دنیا بھی مہندی کے رنگ کی طرح کم بقا ہے۔ اور دنیا محل آلام ہے بفحوائے۔

" چار دن کی چاندنی پھر وہی اندھیرا پاکھ "

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

خندہ ہائے بیجا۔ پھولوں کی ہنسی (شگفتگی) کو خندۂ بے جا سے اس لیے تعبیر کیا کہ وہ کم بقا بھی ہے اور دنیا محل سرور بھی نہیں۔

اے ہمدمو! غم فراق کے ہوتے ہوئے مجھے سیر باغ پر مجبور نہ کرو۔ میں تو آپ غم فرقت میں ایڑی چوٹی سے گرفتار ہوں۔ غم کے ہوتے ہوئے مجھے تفریح کیا ہوگی۔ مبتلائے غم ہو کر ان کے خندہ بے جا کے دیکھنے کا دماغ مجھ میں کہاں ہے۔ نہیں کی جگہ اگر کہاں پڑھیں تو محاورہ پورا ہو جائے گا۔

ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں — کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا

اب تک معرفت و شناسائی حسن حقیقی سے محروم ہوں باوجودیکہ مدت دراز سے میرا ہر بن مو جو ایک چشم حقیقت بین ہے اسے دقت نظری کے ساتھ دیکھ رہا ہے اور غور کر رہا ہے پھر بھی حقیقت حسن حقیقی اب تک نہ معلوم کر سکا۔ یعنی مصنوعات کو دیکھ کر بھی حقیقت صانع نہیں کھلتی۔

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے — ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

ایسے محل پر تقاضا کی جگہ اُردو میں تقاضے بولتے ہیں۔ مگر فارسی ان پر ایسی غالب ہے کہ اُن کو امتیاز فارسی و اُردو باقی نہیں رہا۔

ان کے ناز و ادا میرا دل مانگتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے ہی ان کو دل دے دیا (ایسے دل پھینک واقع ہوئے ہیں) حسن تقاضا کرتا ہم اس کے متحمل کب تھے۔ ہم تو اور عشق میں صادق ہیں۔

نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے     مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

گریہ کو خرج اور حسرت کو جمع و دخل سے تعبیر کیا ہے۔ پھر حسرت کثیر کو دریا۔ اور گریہ کو صرف قلیل بتایا ہے۔

یہ نہ کہو کہ گریہ میرا موافق اندازہ حسرت ہے۔ میں تو اس سے کہیں زیادہ گریہ کا خواہاں ہوں جتنی کہ حسرت گریہ ہے اتنا گریہ کہاں ہے۔ میں ہی آمد (حسرت گریہ) اور اس کے خرج (گریہ) کو جانتا ہوں دوسرا کیا جانے۔

خرج بمعنی دخل و صرف بجیم عربی ہے۔ بجیم فارسی کو اُردو کہہ سکتے ہیں۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں یاد اُس کو اسدؔ     جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

کار فرما ۔ حاکم۔ کام لینے والا۔ متقابل کارکن۔ مراد محبوب جو سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔

فلک کے ظالمانہ حرکات دیکھ کر مجھے اپنا یار ستم گار یاد آتا ہے۔ کیوں کہ فلک کے ستم اس محبوب کی جفاؤں سے ملتے جلتے ہیں۔ جناب حسرت فرماتے ہیں۔ فلک کو دیکھ کر مجھے وہ یاد آتا ہے کیوں کہ جو کچھ ستم فلک کرتا ہے اسی کے حکم سے تو کرتا ہے۔

---

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا     خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

حیرت میں سکوت و جمود ہوتا ہے اس لیے قطرات مے بحالت حیرت منجمد ہو کر مرجان یا یاقوت کے دانے بن گئے۔

نفس پرور کے معنی انجماد و گرفتگی و بستگی مجھے نہیں معلوم۔ میرے نزدیک جمود آور۔ فسردہ تر۔ یا گرفتہ تر یا مثل اس کے کوئی لفظ ہونا چاہیے تھا۔ مگر میرا علم و عدم علم سب ایک حیثیت رکھتا ہے۔

جام مے جب لب یار سے قریب آیا تو اس کے حسن کو دیکھ کر قطرات مے بوجہ حیرت منجمد ہو کر دانہائے مرجان یا یاقوت بن گئے۔ اور خطوط جام نے رشتۂ گوہر کا کام دیا۔

شاعر کو چاہیے کہ شعر کہنے کے بعد اس کے مفہوم کی تصویر خیالی آنکھیں بند کر کے اپنے سامنے لائے اور دیکھے کہ وہ تصویر کیا دلچسپی اور حسن پیدا کر رہی ہے اس شعر کی تصویر خیالی ایک تصویر تسبیح یاقوت کی پیش کرتی ہے۔ اس سے اس

شعر میں حسن پیدا ہوا یا نہیں اسے ناظرین جانیں۔

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا　　غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

چوں کہ میرے عشق صادق پر اسے اعتماد کامل ہے لہٰذا غیر بھی اگر آہیں کرتا ہے تو وہ خفا مجھ پر ہوتا ہے کیوں کہ وہ خوب جانتا ہے کہ آہیں کرنے والا میرے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ذرا اس عشق صادق کے اُلٹے اثر کو دیکھو کہ وہ میری خانہ خرابی کا باعث ہوتا ہے۔

---

جب بتقریب سفر یار نے محمل باندھا　　تپش شوق نے ہر ذرہ پر اک دل باندھا

تپش شوق۔ شوق کی وجہ سے اضطراب دلی اور ذروں کی جھلملاہٹ میں وجہ شبہ حرکت ہے۔ جب محبوب نے سفر کے لیے محمل کو اونٹ پر رکھا (کسا) تو اضطراب شوق میں ہم نے بھی راستہ کے ہر ذرہ پر ساتھ جانے کے لیے ایک دل باندھ دیا۔ کثرت شوق دکھانے کے لیے دل کو بھی کثیر بنا لیا۔

اہل بینش نے بحیرت کدۂ شوخی ناز　　جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

ناز کی شوخیوں سے حیران ہو کر اہل بصیرت نے جوہر آئینہ فولادی کو طوطی بسمل کہہ ڈالا۔ آئینہ پہلے فولادی ہی بنا کرتا تھا۔ فولادی آئینہ ہی میں جوہر ہوتے ہیں اور شیشہ کے آئینہ میں جلا ہوتی ہے جوہر نہیں ہوتے۔ اور ایرانیوں کے نزدیک سبز۔ سیاہ۔ نیلا۔ اودا سب ایک ہے اسی وجہ سے آسمان کو کبود۔ نیلا۔ سبز۔ سیاہ جو جی چاہتا ہے کہہ لیتے ہیں۔ لوہے کا رنگ سی وجہ سے سبز ملتے ہیں۔ اور طوطا اور طوطی میں بھی فرق نہ کر کے ایک کے صفات دوسرے پر عائد کر دیتے ہیں۔ جوہر فولاد یں دھوپ چھاؤں اور دریائی (دارائی) کپڑے کی طرح لہریں کسی رخ سے کسی طرف اور دوسرے رخ سے دوسری طرف دکھائی دیتی ہیں اس کو مذبوح کی تڑپ سے اور سبز رنگ جوہروں کا ہونے کی وجہ سے طوطی بسمل سے تشبیہ دی ہے۔

معشوق کے سامنے وقت زینت جو آئینہ ہے تو آئینہ کے جوہر اس کی شوخی ناز سے طوطی بسمل کی طرح تڑپ رہے ہیں س لیے اس کی شوخی ناز سے متحیر ہو کر اہل بصیرت انھیں طوطی بسمل سے تشبیہ دیتے ہیں۔

جناب حسرت فرماتے ہیں کہ اس شعر میں ایک نازک اشارہ اس امر کی جانب بھی ہے کہ ناز یار کی شوخی نے حیرت کو ضطراب سے بدل دیا۔

یاس و امید نے اک عَربدہ میداں مانگا عجزِ ہمت نے طلسم دل سائل باندھا

عربدہ ۔ بفتح عربی میں سنئ الخلق ہونا ۔ الشدید من کل شئی ۔ فارسی میں جنگ اور جھگڑے کے معنی میں مستعمل ہے ۔ عربدہ میدان ۔ بترکیب قلب میدان عربدہ ۔ میدان وسیع برائے جنگ مراد ہے ۔ طلسم بکسر اول و بفتح ثانی یونانی کا لفظ ہے ۔ ساحر و عزائم خوان کچھ خطوط ہندسے اور کلمات و اسمار بے معنی کا تعویذ کاغذ سے بنا کے دفع موذی کے لیئے دیتے ہیں ۔ اشیاء نفیسہ کو محفوظ رکھنے کے لیئے حکما ان پر طلسم باندھتے تھے تاکہ کوئی ان پر قبضہ نہ کر سکے اور ایک لوح تیار کرتے تھے اس میں فتح طلسم کی ترکیبیں لکھ کر اسے بھی محفوظ کر دیتے تھے بجز طلسم کشائے معین اسے کوئی فتح نہ کر سکتا تھا ۔ داستان ہوش ربا پڑھنے والے اس زٹل سے خوب واقف ہیں ۔ جو نہیں جانتے ہیں وہ اسی شعر کو سمجھ لیں یہ بھی طلسم سے کم نہیں ہے ۔ سائل ۔ کوئی سوال کرنے والا ۔ بامراد عاشق ۔

جناب حسرت دل کو ایک طلسم اور یاس و امید کو جنگ گاہ قرار دے کر فرماتے ہیں ۔

" اس طلسم دل کی بانی پست ہمتی ہے جو اکثر محرک سوال ہوا کرتی ہے اور اس میں امید قبول اور رد سوال دیا سمین جنگ ہوا کرتی ہے ۔

جناب نظم ۔ یاس و امید میں سے ہر ایک اپنا اپنا غلبہ چاہتا ہے اس لیئے ان میں عربدہ بازی کا میدان گرم ہے ۔ اور یہ طلسم یاس و امید دل سائل کی پست ہمتی کا بنایا ہوا ہے ۔ حاصل یہ ہے کہ جو ہمت بلند نہیں رکھتا ہے وہ یاس و امید میں مبتلا رہتا ہے ۔

دل سائل ایک طلسم ہے ۔ بوجہ پست ہمتی یہ دل سائل ہوا کرتا ہے ۔ اس طلسمی جنگ گاہ یعنی دل سائل میں یاس اور امید دونوں برسر جنگ و مخاصمت ہوتے ہیں ۔ کبھی امید بندھتی ہے تو یاس مغلوب ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس ۔ خود سوال دلیل پست ہمتی ہے ۔ عالی ہمت اس طلسم رد و قبول میں پھنسا نہیں کرتے بقول عرفی ؎

ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

نہ بندھے تشنگی شوق کے مضموں غالب گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

دریا کے معنی فارسی میں بحر اور سمندر ہیں ۔ نہ جو و نہر ۔ ساحل کو اس کے خشک ہونے کی وجہ سے اسے تشنہ کہا کرتے ہیں ۔ کھولنے اور باندھنے میں صنعت طباق ہے ۔ دل کھول کے ۔ اعلیٰ پیمانہ پر کسی کام کو انجام دینا ۔ اس میں مبالغہ سے کام لینا ۔ جس طرح تشنگی شوق استعارۃً ہے ۔ اسی طرح دریا بھی استعارۃً ہوتا تو اچھا تھا ۔ ساحل باندھنا ۔ ساحل بنانا یا ساحل کہنا ۔ سچ تو یہ ہے کہ ردیف کے معانی میں نہیں کہہ سکتا ۔

اگرچہ حصول مطلب میں مبالغہ سے کام لے کر تدابیر کے سمندر کا کل پانی پی کر اسے ساحل کی طرح خشک کر دیا یعنی کوئی تدبیر حصول مطلب میں اٹھا نہ رکھی لیکن پھر بھی تشنگی شوق کی بات کو کامل طور سے میں ادا نہ کر سکا۔ یعنی افراط شوق بیان سے باہر ہے۔

---

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں　　گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

یار کی بزم نشاط سے مجھ ایسا مے خوار بالکل تشنہ کام آئے یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔ اگر میں نے توبہ کر رکھی تھی تو ساقی کے لیے شراب پلا دینے میں مانع کونسا امر تھا۔ شراب دی تو ہوتی۔ میں اس کے ہاتھ سے شراب پا کر توبہ توڑ نہ ڈالتا۔

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں　　وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

دل اپنی جگہ پر اور جگر اپنی جگہ پر سکون اور اطمینان کے ساتھ تھے مگر اب دونوں تیر عشق کے گھائل ہیں اور دونوں ایک حالت میں گرفتار ہیں۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں　　جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

جب رشتہ بے گرہ تھا یعنی عشق نہ تھا۔ گرہ: مشکلات عشق ناخن تدبیر حل کنندۂ مشکلات۔
عشق نے درماندہ و عاجز کر رکھا ہے ایسے میں کوئی تدبیر ہو سکے تو جانوں۔ جب مشکلات عشق درپیش نہ تھے تو ہر طرح کی مشکلات کے حل کر لینے کی تدابیر میرے پاس تھیں۔

---

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا　　بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ہمارے گھر کو سیلاب گریہ نے ڈھا کر ویران کر دیا۔ بالفرض اگر ہم نہ روتے تب بھی ویران ہوتا، کیوں کہ ہم تو صحرا نورد ہوتے اور گھر ڈھنڈار پڑا ہوتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ اب جہاں سمندر ہے۔ اگر یہ سمندر کا پانی نہ رہے تو یہی بیاباں ہوگا۔ چنانچہ دنیا میں جہاں کہیں دشت و صحرا ہے یہاں کسی زمانہ میں سمندر رہی تھا۔ شرح مطبوعہ میں میں نے جو لکھا اسے غلط سمجھنا چاہیے۔

تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے     کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

تنگیٔ دل کا میں شکوہ کیا کروں۔ کیوں کہ یہ دل وہ کافر ہے اگر اس میں وسعت اور فراخی ہوتی تو انتشار اور پریشانی سے خالی نہ ہوتا۔

بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے     کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

ورع۔ بفتح اول وثانی وسکون ثانی نیز۔ گناہ سے دوری اور شبہات معاصی سے بچت۔
ایک مدت دراز تک زہد وتقویٰ کرنے سے بہشت میں گھسنے تو دیتا۔ کاش در یار کا دربان داروغہ بہشت ہوتا۔ مگر یہ دربان یار باوجود اطاعت ووفا یار کے پاس تو جانے ہی نہیں دیتا ہے۔ بزم یار کو بہشت اور رضوان کو دربان دل دار کہنا مقصود ہے۔

مطلع

نہ تھا کچھ تو خدا تھا۔ کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا     ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جب موجودات نہ تھے تب بھی خدا تھا کیوں کہ ازلی ہے۔ کسی موجود کا وجود نہ ہوتا تب بھی خدا ہوتا۔ مطلع نہ رہے گا لیکن دوسرا ٹکڑا اس طرح ہوتا ؎

کچھ نہ ہوگا تو خدا ہوگا

تاکہ پہلے ٹکڑے سے جس طرح ازلی ہونے کو کہا ہے اسی طرح اس ٹکڑے سے ابدی ہونا ظاہر ہو۔ ورنہ دونوں مصرعے مترادف ہوتے ہیں۔ میری ہستی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اگر میں نہ ہوتا تو اس میں کیا ہرج تھا۔
دوسرے معنی مصرع ثانی یہ ہیں کہ اگر میں نہ ہوتا تو عین ذات ہوتا۔ اس صورت میں کیا برائے استفہام ہے۔ اور جواب پہلے مصرع میں "خدا ہوتا" موجود ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں:

"یہ شعر مذاق تصوف میں ہے۔ یعنی جب میں نہ تھا تو خدا تھا۔ اور کچھ ہو کر اپنے مبدء سے مغایر ہو گیا۔ اور اس مبداء فیاض سے جدا ہونا میرے حق میں برا ہوا۔"

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا     نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

سر کٹ جانے کے بعد شاعر کہتا ہے کہ جب غم نے مجھے بے حس کر رکھا تھا تو پھر سر کٹ جانے کی مجھے کیا پروا۔ اگر بالفرض سر نہ کٹتا تو بوجہ غم زانو پر دھرا ہوتا۔ اس سے تو کٹ جانا ہی بہتر ہوا کہ غم سے نجات مل گئی۔

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

اگرچہ غالب کو مرے ہوئے مدت ہو چکی ہے مگر وہ اب بھی مجھے یاد آتا ہے۔ کیوں کہ جو بات بھی اس کے سامنے کہو وہ یہی کہہ دیا کرتا تھا کہ یہ بات اگر یوں ہوتی تو اس میں کیا ہرج تھا یا۔ اگر یوں ہوا تو کیا اور کسی اور طرح ہو تو کیا۔ ہر بات میں تکرم نکالا کرتا تھا۔ دنیا کی راحت و رنج سب کوئی چیز نہیں اس صورت میں (کیا) تحقیر کے لیے ہوگا۔

---

اک ذرۂ زمین نہیں بے کار باغ کا یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

فتیلہ۔ فتل سے اسم ہے جس کے معنی بٹنے کے ہیں۔ بتی بٹی ہوتی تھی اس لیے یہ نام رکھا۔ اُردو میں آکر پلیتا ہو گیا۔ بتی مرہم یا روغن میں لتھیڑ کے زخم کے اندر بھی اسے اندمال کے لیے رکھتے ہیں۔ اور چراغ میں بھی کام آتی ہے۔ جادہ کے معنی میں لکھ چکا ہوں کہ (منجد) میں شاہراہ کے ہیں، مگر پگڈنڈی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یہاں روشن چمن مراد ہے۔ زمانہ بہار کے بیان میں یہ شعر ہے۔

اس زمانہ بہار میں زمین باغ کا ایک ذرہ بھی بے کار نہیں ہے۔ چنانچہ چمن کی روشیں بھی داغ (زخم) لالہ کے لیے فتیلہ دوا کا کام کر رہی ہیں۔ اور اگر استعارۃً لالہ کو چراغ مانیں تو یہ روشیں اس کے لیے بتی ہوتی ہیں۔ چراغ بتی کے بغیر روشن نہیں ہوتا ہے۔

بے مے کسے ہے طاقت آشوب آگہی کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا

آشوب آشفتن سے صیغہ امر مگر مستعمل بمعنی حاصل مصدر۔ صیغہ ماضی بھی بمعنی حاصل مصدر مستعمل ہوتا ہے۔ جیسے گفت بمعنی کلام۔ اور آمد بمعنی مجئ (آ ۔ ائ) آگہی۔ بیداری۔ ہوشیاری۔ خط بر چیزے کشیدن اسے باطل کر دینا۔ آشوب۔ فتنہ۔ شورش۔ پریشانی۔ ایاغ، پیالہ۔ جام۔ اس میں (میشر) کی طرح سات خط ہونے کا ذکر آ چکا ہے۔

بغیر شراب پئے ہنگامہ و فتنۂ ہوشیاری کے برداشت کی طاقت ہم میں کہاں، الہٰذا ہمارے عجز ہمت نے اس ہوشیاری پر خط بطلان پھیر دیا ہے۔ یہ خط جام نہیں بلکہ ہوشیاری پر خط بطلان کھینچا ہوا ہے۔ جتنی عقل زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی مواخذہ زیادہ ہوتا ہے۔ مدہوش اور دیوانہ مرفوع القلم ہوتا ہے جبھی تو ہم مست مے عشق رہتے ہیں۔ اور ہوشیاری کو بے کار بنا دیا ہے۔

## کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

بلبل ۔ طائر مشہور ۔ اس کی جمع بلابل ۔ عربی عندلیب بھی ہے ۔ فارسی میں اسماء صفتی چشیاہنگ ۔ مرغ سحر خواں ۔ ہزار داستان وغیرہ ہیں ۔ کاروبار ۔ معاملات و افعال دبمعنی کشت وثمر ۔ خندہ سے مراد تضحیک ۔ کسی کی ہنسی اڑانا ۔ عشق چوں کہ افراط محبت کا نام ہے اور افراط و تفریط میں وہی مبتلا ہوتا ہے جس کے دماغ کا توازن درست نہ ہو لہٰذا اسے خلل دماغ کا کہنا ٹھیک ہے ۔ خلل ، رخنہ ۔ نقصان ۔

پھولوں کی ہنسی حقیقتہً بلبل کے افعال نالہ و فریاد وغیرہ پر تضحیک ہے ۔ کیوں کہ کسی سے عشق کرنا دماغ کی خرابی پر دال ہے ۔ اسے جو اختیار کرے وہ دیوانہ ہے اور دیوانہ کی لوگ ہنسی اڑاتے ہیں ۔

## تریاکی قدیم ہوں دودِ چراغ کا — تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے

تازہ ۔ جدید ۔ نو ۔ نیا ۔ قدیم کا ضد معناً اور کہن کا لفظاً ۔ نشہ ۔ بفتح اول و ثالث سکر و مستی ۔ عربی میں نشو ۔ نشوہ بھر سے حرکت اول ۔ و نشّی بتشدید ثانی مفتوح صحیح ہے ۔ اور نشہ بفتحین غلط بتاتے ہیں ۔ مگر اُردو بول چال میں زبانوں پر یہی آخری صورت ہے ۔ تریاک اسی کا معرب تریاق ہے ۔ ہر دوائے دافع زہر ( پادزہر ) زبان حال فارسی میں افیون ( افیم ) کو کہتے ہیں اور تریاکی افیونی کو مگر یہاں مطلق نشہ باز کے معنی میں ہے ۔ قدیم ، کہنہ ۔ جناب حالی لکھتے ہیں کہ گیارہ برس کی عمر سے غالب نے اُردو میں شعر کہنا شروع کیا ۔ دود ۔ دودہ چراغ کا دھواں جس سے روشنائی بناتے تھے ۔ اور بمعنی جر ۔ مرکب ۔ مداد ۔ روشنائی بھی مستعمل ہے ۔

شعر گوئی کا نشہ مجھے نیا نہیں ہے ۔ میں تو روشنائی کا نشہ باز پرانا ہوں ۔ طفلی سے راتوں کو چراغ کی روشنی میں اشعار کہہ کر لکھا کرتا ہوں ۔

## پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا — سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے

عدو بفتح اول وضم ثانی و واو مشدد مگر فارسی اور اُردو میں تخفیف واو خصم و دشمن ضد صدیق ۔ آزاد ۔ بے قید ۔ مجرد ۔ نجات یافتہ ۔ وخلاص یافتہ ۔ فراغ کسی امر سے خالی ہونا ۔ ضد شغل ۔

متعدد مرتبہ ہم نے قید عشق سے آزادی حاصل کی مگر کیا کریں اس جذباتی دل سے مجبور ہیں ۔ یہ تو فراغت اور سکون کا دشمن ہے کبھی اطمینان کے ساتھ بیٹھنے ہی نہیں دیتا ۔ اور پھر گرفتار عشق کر دیتا ہے ۔

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار　　　یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

چشم چمیدن سے بمعنی حاصل مصدر اس کا قلب بعض چشم ہے۔ چوں کہ ڈھیلا آنکھ کا خانہ چشم میں حرکت کرتا ہے اس لیے یہ نام ہوا خراب ویرانہ۔ اور بمعنی مست میں ایہام تناسب غبار۔ آنکھ میں پڑ کے آنکھ کو تکلیف دہ ہوتا ہے۔ موج کو غبار کہنے میں وجہ شبہ نہ معلوم ہوئی۔ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چشم میں خون کا نہ ہونا ایسا ہی تکلیف دہ ہے جیسا کہ غبار آنکھوں کو تکلیف دیتا ہے۔ موج کا لفظ مناسب شراب ہے۔ سراغ - پتہ۔ کھوج۔ نشان قدم۔ اس لفظ کو صاحب فرہنگ انجمن آرا و برہان دونوں نے اپنے اپنے لغات میں نہ لکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کا لفظ نہیں شاید ترکی ہے۔ کسی کے سراغ کا خراب ہونا۔ یہ کوئی اردو کا فقرہ نہیں معلوم ہوتا۔ کسی چیز کے سراغ لگانے پر مٹا ہونا البتہ بولتے ہیں۔ خراب و ویران و غیر آباد۔ دست۔

میکدۂ چشم میں اشک خونیں کی شراب نہیں ہے۔ سوزِ غم نے سب کو جلا کے رکھ دیا۔ لہٰذا یہ میکدۂ چشم جستجوئے مے میں مٹا ہوا اور ویران ہو رہا ہے اور ہر نگاہ چشم میں غبار کا کام کر رہی ہے۔ ؎

بے خونِ دل ہے چشم میں ہر اک نگہ غبار

(میں سے (ین) گر کے چشم میں موج کے تین میم اکٹھا ہو کر تنافر پیدا ہو گیا۔ (ممموج)۔

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل　　　ابرِ بہار خم کدہ کس کے دماغ کا

بساط عربی میں فرش و وسعت و فراخی کے معنی ہیں۔ بمعنی بضاعت و سرمایہ و قدرت و مجال اہل ہند کا تصرف ہے۔ لہٰذا مانے ہوئے اصول کے موافق عطف و اضافہ فارسی اس پر ہونا چاہیے۔ پہلے مصرع میں (ہے) اور دوسرے میں (ہے۔ یا ہوگا) محذوف ہے۔ نشاط اور بساط میں تجنیس خطی ہے۔

جناب نظم۔ جب شگفتگی باغ سے تجھے نشاط پیدا ہوتی ہے تو خیال کرتا ہے کہ ابرِ بہار جس نے ساغر کو شراب رنگ و بو سے لبریز کر دیا ہے کس کے دماغ کا خمکدہ ہوا یعنی ابرِ بہار بھی تیرے ہی دماغ میں نشہ پیدا کرنے کے لیے ایک خمکدہ ہے۔

جناب حسرت۔ ابرِ بہار میری مستی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے سرورِ دل کا باعث تیرے حسن کا شگفتہ باغ ہے۔ اس کے سوا اور کوئی شے میری مستی کی موجب نہیں ہو سکتی۔

تیرے حسن کا باغ شگفتہ میرے دل کے لیے سرمایۂ وسعت نشاط ہے۔ پھر ابرِ بہار میرے دماغ کے لیے خمکدۂ مستی آور کب ہو سکتا ہے۔ اور اس سے مجھے عیش و نشاط کب حاصل ہو سکتا ہے۔

---

وہ مری چین جبیں سے غم پنہاں سمجھا　　　　راز مکتوب بہ بیربطی عنوان سمجھا

چین جبین ۔ پیشانی کی شکنیں جو بحالت غم یا غضب ماتھے پر نمایاں ہوتی ہیں (بہ) بسبب یا بیان کا ہے۔ راز مکتوب ۔ مراد غم پنہانی ۔ عنوان ۔ نقش کتاب و دیباچہ کتاب و خط۔ عنوان الشئ ظاہر کسی چیز کا جو باطن پر دال ہے۔ بیربطی عنوان سے جس طرح پریشانی خاطر کاتب کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح میری چین جبین سے وہ میرے غم پنہانی کو سمجھ گیا۔

میرے چین جبین سے وہ میرے غم دلی کو سمجھ گیا۔ گویا راز خط (غم پنہانی) کو باوجود (یا بسبب) عدم ارتباط عنوان (چین جبین) ہی سے سمجھ گیا۔ الفاظ تو غیر ہیں مگر حاصل دونوں مصرعوں کا ایک ہی سا ہے۔

---

۸

اک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز　　　　چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

الف بر سینہ کشیدن ولایت میں رسم ہے کہ قلندر۔ ماتمی۔ اور عشاق شکل الف سینہ پر کھینچتے رہتے ہیں ٹیک چند بہار نے کئی شعر شعراء فارس کے اس محاورہ کی سند میں بہار عجم میں لکھے ہیں۔ آئینہ سے مراد دل ہو سکتا ہے نہ سینہ۔ جب تک یہ پورا محاورہ اس محل پر نظم نہ ہوا سے اس محل میں کیسے دخل دیں۔ محسن تاثیر سے

الف ہا میکشد بر سینہ ہر دم　　　　دل از دنبالہ چشم سیاہ ہے

اس شعر سے سینہ خراشی کے معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ شعر غالب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فعل سے صفائے قلب مقصود ہوتی ہے۔ الف علامت وحدت ہے۔ شاید اس سے اظہار یگانگی خدا مطلوب ہوتا ہے۔ آہ کا بھی استعارہ الف سے کرتے ہیں۔ برہان اور انجمن آرا میں یہ محاورہ نہیں ہے۔

میر اسماعیل ہے تحقیق نہیں کہ صیقل گروں کی اصطلاح ہے اک الف در و الف صیقل یعنی کپڑے میں کرنڈ لے کر آئینہ یا تلوار کو اس سے رگڑتے ہیں۔ جس سے سیدھے خطوط بشکل الف سے اس آئینہ اور تلوار پر جلا آتی جاتی ہے۔ متعدد مرتبہ اس عمل سے پورے آئینہ یا تلوار پر جلا آجاتی ہے پھر یہ لکیریں سب یکساں ہو جاتی ہیں۔

اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو یہ محاورہ یہاں پر خوب چسپاں ہوتا ہے۔

جب سے کہ مجھے گریبان کا شعور ہوا ہے میں برابر گریبان چاک کیا کرتا ہوں۔ (چاک گریبان میں بھی شکل الف پائی جاتی ہے) جو بشکل الف بر سینہ ہے یا بصورت خطوط جلا ہے۔ بس اتنی مدت کے اس عمل سے آئینہ دل میں ایک الف سے زیادہ جلا نہ پیدا ہوئی اور پورے طور سے صفائے قلب نہ حاصل ہوئی۔

گری بمعنی گلو اور بان کلمہ حفاظت سے گریبان مرکب ہے وہ حصہ اچکن یا شیروانی کا جس میں کاج اور بٹن ہوتے ہیں۔

اور اس حصہ کو بھی کہتے ہیں جو گلے سے لپٹا ہوتا ہے جسے کالر کہتے ہیں۔

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

گرفتاری بمعنی انقباض و گرفتگی لائے ہیں۔ یہ کہاں تک صحیح ہے ناظرین جانیں۔ زنداں کی مناسبت سے اسے اختیار کیا۔
اور شرح کے معنی کھولنے کے ہیں اس لیے بھی گرفتاری کے مناسب ہے۔
انقباض و گرفتگی خاطر کے اسباب کی تشریح کچھ نہ پوچھو (اس کا باعث خود دل اور عدم توجہ یار ہے) دل اس گرفتگی و
بستگی سے اتنا تنگ ہوا کہ میں اسے کال کوٹھری سمجھا۔

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

قطرہ عرق (بار ختنی والے) الفاظ سے ایرانی اضافہ کو حذف کر دیتے ہیں دراصل قطرۂ عرق ہے۔
جناب حسرت۔ معشوق اپنی بدگمانی کی وجہ سے چلنے میں یہ سمجھا کہ جو قطرے پسینہ کے منھ پر آئیں گے وہ دیدہ حیرانِ
عاشق ہوں گے لہٰذا وہ مصروف خرام نہ ہوا۔
(اسے) کی وجہ سے یہ معنی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا "کہ ہو" "اسے" کی جگہ ہونا چاہیے۔ جناب نظم اپنی بدگمانی کی وجہ سے
میں نے نہ چاہا کہ وہ سرگرم خرام ہو۔ کیوں کہ میں یہ سمجھا کہ جو قطرۂ عرق اس کے رخ پہ رفتار میں آئے گا وہ خود بمنزلہ دیدۂ حیران
عاشق ہوگا اور میرا رقیب ٹھہرے گا۔ کیوں کہ دیدار یار کر رہا ہوگا جو مجھے حاصل نہیں۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا نبض خس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا

عجز کو خس سے اور بدخوئی کو شعلہ سوزاں سے استعارہ کیا ہے۔ تپش۔ اضطراب و حرکت سریع بوجہ حرارت غضب
اس (تنکے) کو نبض باریک وخفی سے تعبیر کیا جو ضعف اور عجز پر دال ہے۔
اپنی عاجزی اور پست ہمتی سے میں یہ سمجھا کہ وہ ضرور تند خو اور بدمزاج ہوگا۔ گویا رگ خس (عاجزی) سے بدخوئی
شعلہ سوزاں) یعنی آتش مزاجی کو سمجھ گیا۔ حاصل شعر کی خوبی میں کچھ نہ سمجھا۔ استعارات تو ہیں۔ غضب اور تند خوئی کو آتش اور
نبض ضعیف کو خس کے ساتھ استعارہ کرنے میں کوئی جدت بھی نہیں۔
(ایسا سمجھنے سے پھر کیا ہوا۔ اس کا کچھ پتا نہیں)۔ "لہٰذا اس سے احتراز کیا" اپنی طرف سے بڑھاؤ تو کچھ نتیجہ خیز
بات ہو۔

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ہر قدم سایہ کو اپنے میں شبستاں سمجھا

شبستان ۔ وہ مقام جہاں رات بسر کریں ۔
سفرِ عشق کے راستے دشوار گذار اور کٹھن تھے ۔ چلتے چلتے اور تکالیف اٹھاتے اٹھاتے تھکن اور کمزوری لاحق ہوئی ۔ تو ایک قدم چلنا دشوار ہوگیا ۔ آخر کار آرام لینے کے لیے ہر ہر قدم پر اپنے سایہ کو شبستان سمجھا اور تھک کے بیٹھ گیا ۔ غایت مجبوری ۔ لاچاری مایوسی و ناامیدی و دشواری راہ کا اظہار ہے ۔

تھا گریزاں مژہ یار سے دل تادمِ مرگ دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

مژہ یار کو پیکان قضا کہا ۔ اور قضا وہ حکم الٰہی ہے جو کسی طرح نہیں ٹلتا ۔ دل مرتے دم تک اس کے تیر مژگان سے گریزاں رہا ۔ پیکان قضا کو اس نے کوئی معمولی چیز سمجھا تھا ۔ اسے کوئی بھی ٹال سکتا ہے ۔ آخر کار وہی تیر اس کی ہلاکت کا باعث ہوا ۔

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

کسی کو دل دینا اس پر عاشق اور فریفتہ ہونا ۔ کافر کو سخت دل اور مسلمان کو رحیم مانتے ہیں ۔ (ہر شخص اپنے منھ میاں مٹھو بنا کرتا ہے ) ۔ جان بمعنی روح بھی ہے اس معنی سے دل کے ساتھ ایہام تناسب ہے ۔
اے اسدؔ تم نے اس کو وفادار سمجھ کے اسے اپنا دل دیا بڑی غلطی کی کہ جو کافر یعنی ستم گار کو مسلمان یعنی رحم دل سمجھا ۔

---

ہیغ

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا

تشنۂ چیزے آمدن ، اس چیز کا مشتاق ہونا فارسی کا محاورہ ہے ۔ اردو میں تشنہ اور مشتاق ہونا بولتے ہیں اور بھوکا اور پیاسا ہونا بھی کہتے ہیں ۔ یا ۔ دل جگر بعد حذف واوعطف بمعنی دل و جگر فاعل اور تشنۂ فریاد آیا فعل یعنی مسند و مسند الیہ ۔ یا ۔ جگر تشنہ بمعنی مشتاق و آرزو مند صفت دل ۔ اس صورت میں دل کا استعارہ ایک شخص سے ہوگا ۔ تشنگی بوجہ حرارت جگر ہوتی ہے ۔ جگر اگرچہ صاحب احساس نہیں مگر شعرا معاملات دل میں جگر کو بھی شریک کر لیتے ہیں ۔
اس وقت تک ضبط سے کام لے رہا تھا ۔ لیکن اب پھر دل و جگر خواہان فریاد ہیں ، کیوں کہ ضبط اب قوت سے باہر ہوگیا ہے ۔ لہٰذا دیدۂ تر یاد آتا ہے تاکہ رو کے بھڑاس نکال لیں اور غم میں کچھ کمی ہوجائے ۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز      پھر ترا وقت سفر یاد آیا

دم لینا۔ سکون ہونا۔ قیامت سے مراد اضطراب و بے قراری جو رخصت ہونے سے محبوب کے پیدا ہوئی۔
تم گئے تو اضطراب میں کچھ کمی ہوئی تھی مگر ساتھ ہی وقت سحر تمہارا رخصت ہونا یاد آ گیا تو اس نے پھر قیامت برپا کر دی۔ اگر کسی پہلے سفر کا یاد آنا مراد لیں تو کچھ سکون ہونے کی علت کیا ہوگی۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس پر ایک مدت گذر جانے کی وجہ سے سکون ہو گیا تھا۔

سادگی ہائے تمنا یعنی      پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

یعنی پھر ویسا ہی ہے جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ (دیکھو) اچھا خاصہ لفظ سامنے کا ہے مگر سیدھے راستہ پر چلنا اُن کو کب پسند آتا ہے۔ نیرنگ نظر۔ کرشمے۔ اور عجائب کاری نظر کی۔ مراد عیش و نشاط و اختلاط و ارتباط سابقہ۔ یا۔ معشوق کا ترچھی اور خشم آلود نگاہ سے دیکھنا جس میں عاشق کو لطف اور مزہ آتا ہے۔ سادگی۔ بھولاپن۔ سادگی تمنا اس لیے کہا کہ اب ان باتوں کی ان سے امید نہیں

عذر واماندگی اے حسرت دل      نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

واماندگی عاجزی۔ حسرت وہ آرزو جو پوری نہ ہوئی ہو۔ یا کوئی فعل جس کا ارتکاب ابھی نہیں ہوا ہے۔ نالہ کرتا تھا۔ (تھا) کی جگہ (یہ۔ تو۔ یا کہ) ہو تو اچھا ہے۔ پہلے مصرع میں کوئی فعل نہیں ہے۔ اس لیے دل کی جگہ (سُن) ہو جائے تو اچھا ہے۔
میری واماندگی و عاجزی کا عذر اے حسرت نالہ سن لے۔ نالہ میں ضرور کرتا، مگر اسی وقت جگر یاد آگیا کہ وہ اپنی ناتوانی کی وجہ سے تحمل نالہ نہیں کر سکتا ہے۔ اس لیے نالہ کرنے سے باز رہا۔ وہ تو نالہ کرتے ہی شق ہو جاتا۔

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی      کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

تیری گذرگاہ اور گلی مجھے کیوں یاد آئی اور میں وہاں کیوں گیا۔ کیوں کہ وہاں پہنچ کر بھی تم تک رسائی نہ ہوئی اور تمہارا دیدار میسر نہ آیا۔ اور کوئی مطلب نہ پورا ہوا۔ اگر تیرا رہ گذر نہ یاد آتا تو بحالت موجودہ خوار بے یار و مددگار زندگی تو بہر صورت کٹ ہی جاتی۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

بہشت میں اگر تیرا گھر مجھے یاد آیا اور میں نے وہاں اس کا ذکر کیا تو داروغہ بہشت سے سخت جنگ ہوگی وہ بہشت کو اچھا کہے گا اور میں تیرے گھر کو۔

آہ وہ جرأت فریاد کہاں　　دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

ے اس میں وہ جرأت فریاد کہاں

جگر بمعنی دلیری و جگرداری بھی آتا ہے۔

مدت ہوئی کہ جگر کا خون ہو چکا ہے۔ اس میں جو ہمت و جرأت تھی وہ دل میں کہاں ہے۔ یہ بے چارہ تو خود مصیبت کا مارا ہے۔ اس سے وہ کام ہو ہی نہیں سکتا جو میں چاہتا ہوں لہٰذا جرأت والے کام کرنے کے وقت جگر یاد آتا ہے۔

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال　　دل گم گشتہ مگر یاد آیا

بالضرور اپنا دل گم گشتہ ہم کو یاد آیا ہے جب تو تیرے کوچہ کا خیال پیدا ہوا ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کو پہلے مصرع کا طرز ادا تحقیر و عظمت ویرانی دونوں پر دال ہو سکتا ہے۔ یہ غزل رمل مسدس مخبون محذوف میں ہے۔ بروزن فعلاتن فعلاتن فعلن۔ پہلا رکن سالم بھی لا سکتے ہیں۔ پہلے مصرع کے لفظ اول ویرانی کی (ی) تقطیع سے خارج ہے۔ حالاں کہ فارسی اور عربی الفاظ سے (د۔ا۔ی) کا گرانا نادرست مانا ہے۔ اور غالب خود بھی اس کے پابند معلوم ہوتے ہیں، کیوں کہ یہاں اور ایک شعر میں اور (ی) حذف ہوئی ہے اور بس۔ تقطیع یوں ہے کُئی ویرا فعلاتن نی س ویرا فعلاتن نی ہے فعلن۔ اور دوسرے مصرع کا پہلا رکن فاعلاتن سالم ہے۔ اگر ویرانی کی (ی) حذف نہ کریں تو وزن مصرع اول فاعلاتن فاعلاتن فعلن ہوتا ہے اس وزن سے بناء خبن کی ٹوٹتی ہے۔ مسدس مخبون میں کم از کم دو رکن مخبون ضرور ہونا چاہئیں۔ کوئی لہجہ بدل کے تحقیر اور تفخیم دونوں کے لیے آتا ہے۔ یہاں میرے نزدیک تحقیر کے لیے ہے۔

جناب حسرت فرماتے ہیں دشت ویرانی میں گھر سے مشابہ ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں یہاں دشت ویرانی کی ہیں مبالغہ اس لیے کیا کہ گھر کی ویرانی میں زیادتی لازم آئے یعنی دشت میں ویرانی ایسی دیکھی جیسی بعینہ میرے گھر میں تھی۔ تشبیہ معکوس ہے۔

جناب حالی تشبیہ نہیں مانتے۔ فرماتے ہیں کہ دشت کو دیکھ کے ڈر لگا تو گھر یاد آیا کہ یہاں سے بھاگو۔

ہم اپنے جنوں کی وجہ سے صحرا نوردی کو آئے۔ مگر دشت کو جو دیکھا تو اس کی ویرانی کچھ نہ نکلی اس سے تو ہمارا گھر ہی کہیں ویران ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

جناب حسرت۔ اپنا سر یاد آیا۔ کہ کبھی بر بنائے شوریدہ سری اسی طرح نشانۂ سنگ طفلاں ہوگا۔ یا یہ کہ مجنوں کے بجائے اپنے ہی سر میں پتھر مار لیا۔

جناب نظم۔ یعنی پتھر اپنے ہی سر میں مار لیا۔

بمقتضائے طفلی میں نے اور بچوں کی طرح مجنوں پر ڈھیلا بازی کرنے کے لیے پتھر اٹھایا تھا کہ مجھے اپنا سر یاد آیا کہ ایک زمانہ آنے والا ہے کہ تم بھی مجنوں کی طرح دیوانے ہو جاؤ گے اور بچے تم پر پتھراؤ کریں گے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے پتھر ہاتھ سے پھینک دیا اور مجنوں کے سر پر نہ مارا۔

---

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

کوئی سے مراد زینت و آرایش یا رقیب۔ عناں گیر۔ مانع۔ روکنے والا۔

تمہیں یہاں آنے میں تاخیر ہوئی تو ضرور زینت و آرایش باعث تاخیر ہوئی یا رقیب روک رہا تھا۔

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

شائبہ = آمیزش بھیدی = خوبیٔ تقدیر = تشنیعاً بجائے بدقسمتی لائے ہیں۔

تم سے اپنی بربادی اور تباہی کا شکوہ کیا کریں ہماری تقدیر ہی میں یوں ہی لکھا تھا۔ پھر تم سے گلہ کیا۔

کچھ کا لفظ بتا رہا ہے کہ زیادہ خطاوار معشوق ہی ہے۔ لہٰذا شکوہ بے جا کیوں ہوگا۔ مگر یہ کہیں کہ تم سے اگر گلہ کریں تو تم رفع گلہ کرنے کے نہیں لہٰذا تم سے شکوہ بے جا ہے۔ اگرچہ بدقسمتی کی شرکت بربادی میں تھوڑی ہے پھر بھی الزام ہم اسی کے سر لگاتے ہیں ؎ صرف تم سے ہمیں بے جا ہے تباہی کا گلہ ؛ پہلا مصرع یوں ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا

تم مجھے بھول گئے ہو تو پتا بتلا دوں　　کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

فتراک۔ شکار بند۔ نخچیر۔ صید۔ شکار۔
تم اور تیرے میں شتر گربہ کہتے ہیں۔ اس لیئے یوں ہو ؎

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں

تیرے شکار بند سے بندھا ہوا شکار جو کبھی تھا میں تیرا وہی شکار ہوں۔

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد　　ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

تطابق ازمنہ کے لیئے چاہیئے ہے کہ پہلے مصرع میں (ہے) کی جگہ (تھی) ہو۔
قید خانہ میں ہو کر بھی تیری زلف کی یاد بھولا نہ تھا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ زنجیر کے وزن کی بھی تکلیف تھی زلف کی قید میں یہ بات نہ تھی بلکہ زلف کی گرفتاری میں دل کو فرحت تھی۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ زنجیر کی سبکی اس لیئے بیان کی تاکہ گرانباری زلف لزوماً ظاہر ہو۔ زنجیر کی سبکی نہیں بلکہ گرانباری کا ذکر ہے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا　　بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

لب یہ لفظ بے ضرورت معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تقریر میں کام دیتا ہے تو زبان سب سے زیادہ آلہ کلام ہے۔
؎　　بات بھی کرتے کہ میں تشنۂ تقریر بھی تھا
تشنہ اور پیاسہ بمعنی مشتاق ہے اور لب تشنہ بمعنی عطشان THIRSTY ہی ہے۔ بجلی کوند جانا۔ کسی کام کا ہوتے ہی فوراً ختم ہو جانا۔
وہ آئے اور جھلک دکھا کر فوراً چلتے بنے۔ یہ آنا کیا ہوا۔ آئے تھے تو بیٹھتے اور کچھ باتیں بھی کرتے۔ کیوں کہ میں تقریر کا بھی مشتاق تھا۔

یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی　　گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

ردیف چاہتی ہے کہ (بیٹھتا) ہو ؎
گر بگڑ بیٹھتا میں لائق تعزیر بھی تھا　　یا

یوسف اُن کو کہوں اور کچھ نہ کہیں خیر ہوئی　　　گر بگڑ بیٹھتے میں لائق تعزیر بھی تھا

میں نے اس کو یوسف کہا اور وہ خفا نہ ہوا خیر ہو گئی۔ اگر وہ بگڑ بیٹھتا تو میں بالضرور سزاوار سزا و عتاب تھا۔ کیوں کہ وہ تو حسن میں یوسف سے بڑھ کے ہے۔ میرے یوسف کہنے سے اس کی تحقیر ہوئی۔

چونکہ حضرت یوسف مصر میں بیچے گئے تھے اس لیے جناب ناظم۔ یوسف کہنے کو غلام کہنے کے ساتھ تعبیر فرماتے ہیں۔ یعنی گویا میں نے اسے غلام کہا اور وہ خفا نہ ہوا۔ خیر ہو گئی۔

دیکھ کر غیر کو کیوں ہو نہ کلیجا ٹھنڈا　　　نالے کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

غیر نالے جو کرتا تھا وہ سب بے اثر تھے۔ پھر اس کو اس حالت میں دیکھ کر میرا کلیجا کیوں نہ ٹھنڈا ہو۔

ولے۔ اُردو میں اس کی جگہ پر۔ مگر۔ لیکن۔ بولتے ہیں۔ اور مگر موزوں بھی ہے۔ کلیجا ٹھنڈا ہونا۔ دل خوش ہونا۔ آتش غم و غضب کا بجھ جانا۔

پیشہ میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام　　　ہمیں آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

نام رکھنا۔ بُرا کہنا۔ آشفتہ سر۔ پریشان دماغ۔ مراد عاشق۔ جواں میر۔ جوانا مرگ۔ جوانی میں مرجانے والا۔ بنا بر الکاسب حبیب اللہ پیشہ کوئی بھی ہو معیوب نہیں بلکہ اچھی چیز ہے۔ لہٰذا فرہاد کو برا نہ کہنا چاہیے۔ وہ جوانا مرگ بھی ہمیں عاشقوں کے زمرہ میں تھا۔

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی　　　آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو کیوں ساتویں نمبر کے شعر میں کو کا (دال) گر کر (دکیوں) اور اس شعر میں۔ مرنے کو کھڑے میں دال گر کر (دگھڑے) میں تنافر ہے۔ اور ایسے تنافر کی کلام غالب میں کوئی انتہا نہیں۔ کھڑے۔ تیار۔ آمادہ۔ آیا کی جگہ آتا بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ترکش۔ تیردان۔ جعبہ تیر۔

ہم تو بہر طور مرنے پر آمادہ تھے اگر ان کو پاس آکر تلوار سے قتل کرنے میں عار و ننگ آتی تھی تو ان کے ترکش میں کوئی تیر بھی ضرور ہوگا دور ہی سے تیر مار کے ہلاک کر دیا ہوتا۔ تاکہ غم سے نجات مل جاتی اور مرتبہ شہادت پاتے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　　آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

فرشتہ سین مہملہ کے ساتھ بمعنی فرستادہ تھا۔ کیوں کہ اللہ میاں کے ڈاکیے اور قاصد ہیں کثرت استعمال سے مہملہ معجمہ

ہو گیا۔ مسلمانوں کا تشبیہاً خیال ہے کہ کرام کاتبین دو فرشتے ہیں کہ ایک ان میں سے ہر انسان کے داہنے شانہ پر چڑھا رہتا ہے اُس کے پاس ایک رجسٹر ہے اس میں وہ انسان کے اعمال حسنہ کو لکھا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ نیت خیر کو بغیر ارتکاب بھی لکھ لیتا ہے۔ اللہ کے رحیم ہونے کی وجہ سے۔ اور بائیں شانہ پر دوسرا لدا رہتا ہے اس کے پاس بھی رجسٹر ہے۔ اور وہ اعمال سیئہ لکھا کرتا ہے۔ بعد ارتکاب بھی لکھنے میں تاخیر کرتا رہتا ہے کہ شاید توبہ کرلے تو پھر نہ لکھے۔

جناب غالبؔ بطور ظرافت و خوش طبعی فرماتے ہیں کہ محض کرام کاتبین کے لکھنے پر انسانوں سے ناحق محاسبہ و مواخذہ کیا جاتا ہے۔ ان کے لکھتے وقت ہمارا کوئی طرف دار آدمی ہوتا اور اس کی تصدیق و گواہی ہوتی تو ہم سے بازپرس ٹھیک تھی۔ اب تو ان فرشتوں کے جو دل میں آیا وہ لکھ لیا۔ صرف ان کے لکھ لینے پر پکڑ دھکڑ تو کوئی انصاف کی بات نہیں۔ بھی "دم تحریر ہمارا بھی کوئی آدمی موجود تھا" مگر کیا کرتے ردیف مانع تھی۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ  سُنتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

ریختہ ۔ عمارت کا مصالحہ۔ اینٹ۔ چونا۔ روڑی۔ کنکریٹ۔ سرخی۔ پزاوہ کی راکھ وغیرہ۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ریختہ ریختن سے ڈھلے ہونے کے معنی ہیں بعض چیزیں جیسے گھڑیال، علی گنج، سوان کا حقہ چند دھات ملا کے ڈھالتے ہیں زبان اُردو بھی چند زبانوں کے میل سے ڈھلی ہے۔ زبان اُردو کو اس وجہ سے کہتے ہیں کہ بہت سی زبانوں سے مل کر بنی ہے جیس BASE اس کا سنسکرت ہے اور سنسکرت کی پراکرتیں خصوصاً برج بھاشا۔ کیوں کہ مصادر و افعال و حروف عاطفہ وغیرہ سب سنسکرت کے ہیں۔ جب ہندوستان مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ تو عربی و فارسی و ترکی کے بھی الفاظ اس میں ہل گئے۔ اور اب انگریزی حکومت کے اثر سے انگریزی کے بہت سے الفاظ ہل گئے اور ملتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض الفاظ کا بدل ہماری زبان میں ہے ہی نہیں جیسے بوتل۔ لالٹین۔ گلاس وغیرہ۔ یہ الفاظ ایسے ملے کہ ان پر اب پردیسی ہونے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اوستاد۔ استاد۔ استاذ۔ استا تغسیر کتاب ژند و پاژند۔ اور الف و دال نسبت جیسے آباد میں۔ یعنی اوستا سے نسبت رکھنے والا یعنی عالم اب معلم کو کہتے ہیں۔ عربوں نے دال مہملہ کو معجمہ کر کے معرب کر لیا ہے۔ اور اساتذہ جمع لاتے ہیں۔ اگر دیدۂ تحقیق سے دیکھا جائے تو بذال معجمہ بھی فارسی ہی ہے، کیوں کہ حرف علت (والے) مدہ کے بعد دال مہملہ فارسی میں معجمہ ہی ہوتی ہے۔ انکار ذال معجمہ فارسی سے میرے نزدیک غلط ہے۔ میرؔ تقی میرؔ آصف الدولہ شاہ اودھ کے زمانہ کے مشہور اور مسلم استاد غزل گوئی کے تھے جن کے چھ دیوان نول کشور نے چھاپ دیئے ہیں۔

معانی لکھنے کی ضرورت نہیں شعر صاف اور سادہ ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی نثر لکھے دیتا ہوں تاکہ جناب آسیؔ کا ایسا آدمی یہ نہ کہے کہ سب اشعار کے معانی نہ لکھے۔ وہ شرح جناب نظمؔ پر جہاں اور اعتراضات کرتے ہیں یہ بھی ان کا اعتراض ہے کہ سب اشعار کے معانی نہ لکھے گو ادروں سے کمتر چھوڑے ہیں۔ حالاں کہ جن کو چھوڑا ہے وہ اسی شعر

کی طرح محتاجِ معنی لکھنے کے نہ تھے۔

اے غالبؔ تمہیں اُردو شاعری کے استاد نہیں ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے پیشتر کے زمانہ میں جناب میر تقی میرؔ بھی استاد ہو چکے ہیں۔

اگرچہ اس شعر میں استادی میرؔ کا ذکر ہے۔ مگر (کوئی) کے لفظ سے ناشناسائی مترشح ہے۔ اور ان کی تحقیر بھی ہوتی ہے اور ان کی شہرت میں بٹا لگتا ہے۔ لہٰذا مصرع یوں ہو ؎

کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کبھی میرؔ بھی تھا

سنتے ہیں ہو یا کہتے ہیں ہو۔ ان کی استادی مانی ہوئی میں ضعف پیدا ہوتا ہے۔

اس بکواس میں تشریح الفاظ میں میرا طول لاطائل دینا اس بنا پر ہے کہ میں اس شرح کو مبتدیوں کے لیئے لکھ رہا ہوں، کیوں کہ فضلا و کملا و ظہرہ کسی کی شرح کے محتاج نہیں دوسری بات یہ ہے کہ حضرت غالبؔ کے اشعار مشکلہ کے معانی سمجھنے سے میں قاصر ہوں میری میری ان میں نہیں چلتی تو کچھ کیا کرتا۔ الفاظ کی طرف جھک پڑا۔ اور شاید وہ بھی قابل اعتماد ہو یا نہ ہو۔

---

لبِ خشک در تشنگی مردگان کا     زیارت کدہ ہوں دلِ آزردگان کا

جو لوگ آرزو شوق اور تمنا میں مر گئے ہیں میں ان کا لب خشک (ہوں) جو محذوف ہے۔ اور دل آزردہ عشاق کا زیارت گاہ ہوں۔ یعنی میں ان سب سے زیادہ حصول مدعا کا متمنی ہوں۔

صرف (کا) کے ہونے سے پہلے مصرع کو کیا اُردو زبان کا کہہ سکتے ہیں؟ دونوں (کا) کی جگہ (را) اور ہوں کی جگہ (ام) لاؤ تو پورا فارسی ہو جائے گا۔

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی     میں دل ہوں فریب وفا خوردگان کا

پہلا مصرع یہ بھی اردو کا نہیں۔ اُردو میں اس محل پر ہمہ تن بولتے ہیں نہ ہمہ۔

فریب وفا خوردگان، وہ لوگ جنھوں نے معشوق کو وفادار سمجھا اور دھوکا کھایا۔ جو دھوکا کھائے ہوئے ہے اسے تو امیدوار ہونا چاہیے نہ مایوس و ناامید۔ یہ شعر سے نکلتا نہیں کہ "اب سمجھ گئے"۔

اس سے کسی قسم کی بہبودی کی امید نہیں۔ مزید برآں بدگمانی بھی ہے کہ رقیبوں سے ملتا ہوگا اور ان کی آرزوؤں کو پورا کرتا ہوگا۔ گویا میں دل اُن لوگوں کا ہوں جنھوں نے اس کو وفادار سمجھنے میں دھوکا کھایا ہے وہ تو

وفادار نہیں ہے۔

---

ابخ

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا     اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

ظلم وضع الشئ علی غیر محلہٖ۔ شریعت والے تصرف ملک غیر میں کہتے ہیں۔
میں یہ سمجھے ہوا تھا کہ تو میرا دوست نہیں بلکہ دشمن ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ تو کسی کا بھی دوست نہیں۔ کیونکہ اغیار پر تو وہ مظالم ڈھاتا ہے جو کبھی تو نے مجھ پر بھی نہ کیے تھے۔ (ستمگر) منادی اور (اے) حرف ندا محذوف۔
دوست پرانے مصدر دوسیدن سے مشتق ہے۔ جس کے معنی چسپیدن اور ملصق شدن کے ہیں۔ دو محب ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ تر رہتے ہیں اس لیے محب کو دوست کہتے ہیں۔
جناب حسرت فرماتے ہیں کہ ظاہری مطلب تو اس شعر کا یہ ہے کہ تو دوست کسی کا نہیں۔ اور تیرا جور بھی مجھ پر ہی نہیں بلکہ اوروں پر بھی ہے اور مجھ سے زیادہ ہے۔ لیکن حقیقت میں غالب ایک نہایت نازک مطلب ادا کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو ظلم مجھ پر ہوا وہ تو اوروں پر کر رہا ہے۔ مجھے چوں کہ شرکت اغیار کسی صورت سے گوارا نہیں ہے اس لیے تیرا ظلم نہ کرنا بھی گویا مجھ پر ایک ظلم عظیم ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ میرے متعلق تیرا ترک جور بربنائے دوستی نہیں ہے۔
اگر اس عبارت میں تصرف کاتب نہیں ہے تو اسے میں بالکل نہ سمجھ سکا۔ اور جملوں کا کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا۔ ظلم نہ کرنا تو شعر میں نہیں بلکہ شعر یہ کہتا۔ ہے کہ مجھ پر تو ظلم ہے ہی۔ مگر اوروں پر مجھ سے زیادہ اور نئے نئے ظلم کرتا ہے اس سے شرکت ظلم میں اغیار سے بھی انکار ہے۔
غالب صاف صاف تو کہہ رہے ہیں کہ تو اوروں پر وہ ظلم کر رہا ہے جو تو نے مجھ پر بھی نہ کیے تھے۔ مغایرت ظلم تو واضح طور سے ہے شرکت ظلم کس جملے یا لفظ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہاں مطلق ظلم میں شرکت ضروری ہوئی۔ پھر ترک جور پر کون سا لفظ دال ہے۔ (نہ ہوا تھا) اس ظلم کی نسبت فرما رہے ہیں جو اوروں پہ ہو رہے ہیں اور ان پر نہ ہوتے تھے۔ پھر ترک جور کو اگر مان لیا جائے تو یوں بھی شرکت جور نہ ہوئی۔ جس طرح غالب کے اشعار نہیں سمجھ سکتا اسی طرح یہ نازک بات بھی سمجھ میں نہ آئی۔ نازک تو بہر طور نازک ہی ہوگی۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے     خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

نخشب۔ سمرقند سے قریب ایک شہر جس کو کش اور شہر سبز بھی کہتے تھے اس میں عطا بن مقنع مشہور بہ مقنع حکیم نے ازروئے نیرنجات ایک چاند بنایا تھا جس کی روشنی بارہ چودہ میل تک پہنچتی تھی اور ایک کنوئیں میں غروب

ہو جاتا تھا۔ اور اسی سے طلوع ہوتا تھا۔ اس بیان سے ماہ فلک سے اس کا ناقص ہونا ظاہر ہے۔ ہنوز کی جگہ ابھی موزوں بھی ہے مگر وہ الفاظ فارسیہ کا استعمال اُردو کے الفاظ سے بہتر سمجھتے تھے۔

ماہِ نخشب کی طرح دست قضا نے آفتاب کو ناقص ہی چھوڑ دیا۔ وہ ابھی تمہارے چہرہ منور کے برابر تابانی میں نہ ہونے پایا تھا۔ یعنی تمہارا چہرہ آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

آنکھوں میں جگہ پانا۔ عزیز و مقتدر ہونا۔ ہمت کے موافق توفیق الٰہی بھی شامل حال ہوتی ہے۔

قطرہ اشک ہو یا قطرہ ابر نیساں بہر صورت دونوں قطرے ہیں۔ قطرۂ اشک نے اپنی عالی ہمتی سے آنکھوں میں جگہ پائی۔ اور قطرۂ آب نیساں ۔۔۔تی بن کے رہ گیا اور غرق دریا رہتا ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

قد فتنہ زائے یار کو دیکھ کر مجھے ہنگامہ و شورِ محشر کا اعتقاد کامل ہو گیا۔

قد یار کو حشر اور قیامت سے استعارہ کرتے اور تشبیہ دیا کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ لکھنؤ میں حضرت داغ کی اس زمین میں ؎

میرے قاتل نے نہ پوچھا تیری حسرت کیا ہے

یہ مصرع طرح دیا گیا ؎

حشر کہتے ہیں کسے اور قیامت کیا ہے

میرے استاد جناب مولوی سید محمد اصطفےٰ صاحب خورشید لکھنوی نے اس مصرع طرح پر اپنی جگہ یہ مصرع لگایا ؎

نام یہ بھی ہیں شب ہجر و قد جاناں کے

اور میں نے اپنی جگہ یہ مصرع لگایا ؎

اک جگہ مجمع عشاق کا ہو جانا ہے حشر کہتے ہیں کسے اور قیامت کیا ہے

تو استاد نے اپنا شعر غزل سے نکال ڈالا۔ یہ اتفاق ہے۔ اُن پر فوقیت کا اظہار نہیں۔ معاذ اللہ۔

جب تک کہ میں نے فتنہ انگیزی و ہنگامہ آرائی قد یار کی نہ دیکھی تھی اس وقت تک میں فتنہ محشر کا قائل نہ تھا۔ مگر جب آنکھوں سے دیکھ لیا تو مان لیا کہ ضرور حشر میں ایسا ہی فتنہ ہو گا۔ اس بیان سے قد یار کی فتنہ انگیزی کو فتنہ حشر کے مساوی دکھانا مقصود ہے۔

بیں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں          یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

میں اپنی سادگی اور بھولے پن سے معشوق کے آزردہ ہونے سے بھی خوش ہوں۔ کیوں کہ سبق شوق ابھی مکرر نہ ہوا تھا تاکہ مکرر ہو کے استحکام ہو جائے۔ جس طرح سبق دوہرانے تہرانے سے خوب پختہ ہو جاتا ہے۔ یعنی بجائے کیوں کہ۔ یا۔ اب تک استعمال کیا ہے ایسے حروف کی جگہ غالب نے اکثر یعنی استعمال کیا ہے۔ اور جو کی جگہ (کہ) زیادہ کہا ہے۔ اس وقت کی یہی بولی ہوگی۔

معشوق کی ناراضی سے خوش ہونا تو سادہ پن پر دال ہے۔ مگر شوق میں استحکام چاہنا یہ تو پختہ کاری کا فعل ہے۔ سادگی کے تحت میں یہ دو ضد فعل کیسے آئیں۔ صرف ناراضی محبوبہ پر خوش ہونے کو سادگی پر محمول کیا ہے۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک          میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

تر دامن بمعنی عاصی وگنہگار فارسی میں ہے۔ مصرع ثانی سے اسی لفظ کو پیدا کیا ہے۔

میں ایسا دلدادہ عصیاں وگناہ ہوں کہ سارا سمندر عصیاں کا خشک ہوگیا مگر میرا ایک گوشہ دامن بھی تر نہ ہوا۔ عمر بھر مرتکب معاصی ہونے سے بھی سیری معاصی سے نہیں۔ اتنے ایک گناہ کرنے کے بعد تو اجتناب از معاصی ہوتا۔

جاری تھی اسد داغِ جگر سے مری تحصیل          آتش کدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

تحصیل کا لفظ بمناسبت جاگیر لائے۔ فارسی میں جلتے گیر بمعنی قیام پذیر بھی ہے۔ سمندر۔ یونانی زبان کا لفظ ہے۔ انگلیسی میں SALAMANDER سالامندر کہتے ہیں ایک چرپایہ کہتے ہیں کہ مدت دراز تک آگ کے سلگتے رہنے سے یہ آتش کدوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اردو میں سلو سانپ اور بجر کیٹ شاید یہی ہے۔ بعض اہل لغت نے فارسی کا لفظ جان کے سام بمعنی آتش۔ اور اندر بمعنی اندرون سے مرکب بتایا ہے۔ شاید ایسا ہی ہو۔ داغ جگر کو بوجہ سوزش آتش کدہ اور آہ سوزاں کو تحصیل سے اور اپنی ذات کو بوجہ آتش عشق سمندر سے تعبیر کر کے اپنے آپ کو سمندر پر ترجیح دی ہے۔

میری تحصیل وصول آہ سوزاں سے اس وقت سے جاری ہے کہ سمندر بھی آتش کدہ میں پیدا نہ ہوا تھا یعنی میں عاشق سوختہ جگر ازل سے ہوں۔

---

شب کو وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا — رشتہ ہر شمع خار کسوت فانوس تھا

ناموس ۔ عفت و عصمت و آبرو و قانون الٰہی خار در پیراہن ۔ کسک در شلوار ۔ سنگریزہ در موزہ سب کے معنی ایذار رسان کے ہیں۔ رشتۂ شمع ۔ وہ تاگا جو شمع کے موم کے اندر ہوتا اور شعلہ آتش وہی قبول کرتا ہے۔ اس کو خار کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ کسوت ۔ لباس و جامہ ۔ یہاں وہ مہین کپڑا مراد ہے جو لوہے کی تاروں پر تنا ہوتا ہے اور اسے چراغ یا شمع پر ڈھک دیتے ہیں تاکہ شمع ہوا سے نہ بجھے گویا اگلے زمانہ کا گلوب ہے ۔ زبان حال فارسی میں لالٹین کو کہتے ہیں ۔ (فانوس) ۔

جب وہ رات کے وقت اپنی عصمت کی وجہ سے خلوت (تنہائی) میں محفل خلوت کو روشن کر رہے تھے تو رشتۂ شمع ۔ شمع کے لیئے خار پیراہن ہو رہا تھا اور وہ بے چین تھی ۔ کیوں کہ اس کے چہرۂ منور کے سامنے شمع ماند پڑ گئی تھی ۔ یا پروانے جو عاشق شمع ہیں وہ بجائے شمع ان کے چہرۂ روشن کی طرف جاتے تھے ۔ تو شمع کو تکلیف کیوں نہ ہوتی ۔ مصنف حیات الحیوان دمیری کہتے ہیں کہ پروانہ شعلہ شمع یا چراغ کو ایک روزن سمجھتا ہے جو روشنی کی طرف رہنما ہے ۔ لہٰذا اس روزن میں سے گذرنا چاہتا ہے اور شعلہ سے جل جاتا ہے ۔ شاعروں نے عاشق شمع بنا دیا ۔

مجلس اور خلوت دو متضاد چیزیں ہیں ۔ غالب نے خلوت کو مجلس کہا ۔ شاید صرف افردگی میں تشبیہ ہے ۔ جناب حسرت فرماتے ہیں کہ اس کی محفل خلوت میں نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے شمع کی عجیب حالت تھی ۔ (اندھیرے میں کیوں بیٹھا تھا ۔) ۔

مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا — کس قدر یارب ہلاک حسرت پابوس تھا

یارب ۔ کلمہ تعجب و حیرت ۔ کس قدر ۔ بہت زیادہ کوسوں کی وجہ سے یا کس قدر کی وجہ سے کوسوں لائے ۔ کوسوں ۔ بہت دور تک ۔ ڈیڑھ میل کا ایک کوس یا اس سے کچھ کم و زیادہ ۔

میں اس کو (پیرو زآرڈر) بقائے الفاظ کے ساتھ نثر میں نہ لا سکا ۔ جزا محذوف مان کے بھی مجھ سے نثر نہیں بنتی ۔ مشہد عاشق سے دور تک جو مہندی اُگی ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عاشق کی کتنی زیادہ حسرت پابوسی میں ہلاکت ہوئی ہے ۔ کوسوں حنا کا اُگنا اس لیے کہا کہ شاید کسی جگہ کی مہندی اس کے پاؤں تک پہنچ جائے ۔ اور "بوسہ بہ پیغام" کی طرح ان کی حسرت پابوسی پوری ہو ۔ وہ بھی بعد مرگ ہی سہی ۔

حاصل الفت نہ دیکھا جز شکست آرزو — دل بدل پیوستہ گویا اک لب افسوس تھا

محبت کا حاصل یہی دیکھا کہ آرزوؤں کا خون ہوتا ہے۔ دل عاشق جو دل معشوق سے پیوستہ اور ملا ہے وہ گویا دولب افسوس ہیں کہ کیوں الفت کی۔

کیا کہوں بیماری غم کی فراغت کا بیان　　　جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا

کیموس۔ یونانی زبان کا لفظ ہے χυμός انگلیسی CHYME

اصطلاح طب میں ہضم جگر کا نام ہے۔ بذریعہ حرارت جگر سے غذا کا رس مستحیل بخون ہو جاتا ہے۔ بیان کے ساتھ اُردو میں (کرنا) مصدر بولتے ہیں نہ کہنا۔ جو کہ جو کچھ۔ یعنی جو کچھ کھایا وہ بغیر کیموس خون بن گیا۔ (اور خون کھانا۔ غم و غصہ کھانا۔) کیوں کہ خون تو پہلے ہی ہے۔

غم عشق کی فراغت کا بیان کیا کروں۔ خون دل (غم عشق) کھانے میں کیموس کا احسان نہ اٹھانا پڑا۔

---

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے　　　صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اپنا سا منھ لے کے رہ جانا۔ شرمندہ و خجل و خفیف ہونا۔ صاحب مراد معشوق۔ کلمہ تعظیم طعناً ہے۔ کتنا = بہت زیادہ۔ دل نہ دینا۔ عاشق نہ ہونا۔

آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر اپنے اوپر آپ عاشق ہو گئے۔ جب تک اپنی صورت حسین و جمیل نہ دیکھی تھی تو بڑا غرور تھا کہ ہم تو کسی پر عاشق ہوتے ہی نہیں۔ اب بتاؤ یہ کیا ہوا وہ سارا غرور دھرا رہ گیا۔ اس سے تعریف حُسن یار مقصود ہے۔ بہت اچھا شعر ہے۔

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے　　　اُس کی خطا نہیں تھی یہ میرا قصور تھا

قاصد را گردن مزن۔ فارسی کا محاورہ ہے۔ اس میں را بدل اضافہ ہے یعنی گردنِ قاصد۔ اس فارسی کے (را) ترجمہ اُردو میں (کی) ہوگا۔ مگر غالب نے (کو) ترجمہ کیا۔ اُردو میں بھی کسی کی گردن مارنا بولتے ہیں نہ کسی کو گردن مارنا۔ فارسی میں گردن زدن ایک مصدر مرکب مانیں تو فارسی کا ترجمہ کسی کو قتل کرنا ہوگا۔ مگر اُردو کی بول چال (کی) ہی کے ساتھ ہے۔ جب لفظ گردن رہے اور معنی قتل کرنا ہو جائے تو (کو) ٹھیک ہوگا۔ جناب غالب پر فارسی اس قدر غالب ہے کہ ان میں امتیاز فارسی و اُردو باقی نہیں رہا اپنے ہاتھ سے بظاہر حشو معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اتنا کہنا کفایت کرتا ہے کہ قاصد کو قتل نہ کیجیے۔ مگر ان الفاظ کے لانے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے ہاتھ سے قتل ہونے کی آرزو تو مجھے ہے۔

میں نے اضطراب شوق میں اپنی حالت زار خط میں لکھ کر اس کے ہاتھ بھیجی تھی وہ تو صرف ایلچی ہے۔ وایلچی را زوالے نباشد۔ مقولہ مشہور ہے۔ اس لیئے اس کی تو کوئی خطا نہیں۔ اگر خطا ہے تو میری ہے نہ اس کی لہٰذا اپنے ہاتھ سے مجھے قتل کیجیے۔

غالب کے جو اشعار اچھے ہیں وہ لاجواب ہیں۔ اور اس چھوٹے سے دیوان میں ان کی تعداد خوش گو شعرا کے ضخیم دیوانوں سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ ان اشعار کی وجہ سے اردو شاعری غزل گوئی میں ان کو اول درجہ دیتا ہوں۔ اور غالب پرست ہوں سان اچھے اشعار کے مقابلہ میں اُن کے تسامحات کثیر کو بھی وقعت نہیں دیتا ہوں۔ جو عیوب کہ دکھا رہا ہوں وہ بنا پر تنقیص و تہجین نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب میری ہی غلط فہمی ہو اور یہ عیوب ہی نہ ہوں۔

بہر طور انتقادی شرح لکھنے والے کا فرض ہے کہ محاسن کے ساتھ معایب بھی دکھائے، مگر اظہار محاسن دوستانہ اور اظہار معائب معاندانہ نہ ہو۔ جناب شمس العلما حالی مرحوم اگر صرف خوبی کلام غالب دکھاتے ہیں تو حق بجانب ہیں کیونکہ غالب اُن کے استاد ہیں۔ اگر کہیں کچھ عیب دکھانا چاہتے ہیں تو اس کی تاویل کر کے اسے خفیف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یادگار غالب میں چند اشعار دقیق المعانی بعید الفہم لکھ کر ارشاد فرماتے ہیں کہ تم ان کو چاہے مہمل اور بے معنی کہو مگر اس میں شک نہیں کہ بہت دماغ سوزی اور جگر کاوی سے کہے گئے ہوں گے۔

یوروپین اثر سے جتنے سب ہیں کہ ریویو انتقادی ہو۔ مگر جب دیکھا یہی دیکھا کہ اب بھی جو مصنف کسی کو اپنا ہیرو (پہلوان داستان) قرار دیتا ہے تو یہی کرتا ہے کہ اگلے لوگوں کی طرح تقریظ ہی ہوتی ہے نہ انتقاد۔ مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

چوں کہ مجھے غالب کا کلام پسند ہے۔ اس لیئے جب کبھی تک بندی کرتا تھا تو زیادہ تر انھیں کی طرحوں میں بکواس کرتا تھا۔ چنانچہ اس طرح میں نے بھی کچھ کہا تھا۔ صرف ایک مطلع یاد ہے۔

اکلام کا سبب یہ دل ناصبور تھا      میری نہ کچھ خطا نہ تمہارا قصور تھا

سر مشق غالب کے کلام کو بنایا تھا۔ جب سے یہ سمجھ میں آگیا کہ میری فطرت شاعرانہ نہیں نظم کرنا چھوڑ دیا۔ اور میرے پاس اب ایک شعر بھی نہیں۔ چالیس پچاس جو یاد رہ گئے ہیں وہ تو حافظہ میں ہیں اور بس۔ ساٹھ اور ستر کے درمیان غزلیں کہیں ہوں گی۔

---

۶۳ع    عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا      جس دل پہ ناز تھا مجھے۔ وہ دل نہیں رہا

نیازمندی = عشق کے اظہار کے قابل اب میں نہیں رہا۔ کیوں کہ تکالیف اور صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے اب دل نیا

وہ قوت ہی نہ رہی جو بے وفائی و بے اعتنائی اور بے رخی تمہاری برداشت کرسکوں۔ حالاں کہ اس کے پہلے اسی دل پر مجھے ناز تھا کہ ہر تکلیف کے عمل کی قوت اس میں تھی۔ اب پہلا سا دل ہی نہیں ہے۔ شعر بہت اچھا ہے۔

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیئے ہوئے　　ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

داغ حسرت ہستی۔ حالت حیات میں کسی قسم کی خوبی نہ حاصل ہونے کو داغ حسرت ہستی کہا ہے۔ شمع کشتہ۔ بجھی ہوئی شمع۔ محفل۔ جمع ہونے کی جگہ۔ محفل دنیا مراد ہے۔ بجھی ہوئی شمع سے نامراد زندگی مراد ہے۔ بجھی ہوئی شمع محفل کے کام کی نہیں ہوتی ہے۔ اس تشریح کے بعد معنی لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر۔ کہ میں　　شایان دست و بازوے قاتل نہیں رہا

ایسا لاغر و نحیف ہو رہا ہوں کہ قاتل کا دست و بازوے قوی میرے قتل پر بھی راضی ہوگا۔ کیوں کہ صید زبوں کو شکاری بھی نہیں پوچھتا۔ لہٰذا اب مرنے کی کوئی دوسری تدبیر نکالنا چاہیئے۔ یعنی زہر کھا کے مرجانا چاہیئے تاکہ تکالیف موجودہ سے نجات مل جائے۔

بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے　　یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

شش جہت۔ فارسی نام خاور مشرق۔ باختر مغرب (برین، شمال) فرودین، جنوب) بالا و زیر) مراد اہل شش جہت آئینہ مراد دنیا۔ جس میں حقیقت ذات نمایاں ہے مگر چشم حقیقت بیں ہونا چاہیے۔
ناقص و کامل دونوں کے لیئے اس آئینہ دنیا یا معرفت وشناسائی کا دروازہ کھلا ہوا ہے کسی کے لیئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ حجاب نہیں۔ سب اس میں حقیقت کو دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے آئینہ ہر کس و ناکس کے منھ دیکھنے کے لیئے ہوتا ہے۔ باوجود غایت وضوح ہر شخص دریافت حقیقت میں حیران ہے۔ اگر استعارات نہ ہوں تو شعر کا حاصل کچھ نہ ہوگا۔

وا کر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن　　غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

شوق نے بند نقاب حسن کھول دیئے ہیں۔ اب دیدار میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ بجز نگاہ عاشق کہ وہ بوجہ کثرت ضیاء چہرۂ یار اسے دیکھ نہیں سکتی جیسے حضرت موسیٰ نہ دیکھ سکے۔

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار ۔۔۔ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اگرچہ میں زمانہ کے مظالم و مکروہات میں مبتلا رہا مگر تم کو کسی حالت میں نہیں بھولا۔

دل سے ہوائے کشت وفا مٹ گئی کہ واں ۔۔۔ حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

حاصل پیداوار مناسب کشت۔ حاصل ثانی بمعنی موجود۔ ہوا۔ آرزو۔ تمنا۔ محبت۔ واں۔ مخفف وہاں مراد کشت وفا۔

تم سے اب وفا کی امید نہیں رہی۔ یا۔ میں نے اب وفاداری سے ہاتھ اٹھالیا۔ کیوں کہ وفا کرنے سے سوا حسرت موجودہ کے اور کیا ہاتھ آیا۔

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ ۔۔۔ جس دل پہ ناز تھا مجھے۔ وہ دل نہیں رہا

جب پہلا سا دل اب نہیں رہا جس میں طاقت برداشت ستم تھی اور مجھے اس پر ناز تھا تو ستم ہائے عشق کا اب تحمل کیسے کروں۔ ورنہ مظالم عشق سے میں ذرا بھی نہیں ڈرتا۔ تکرار مصرع ثانی مطلع اور مقطع میں شاید اس وجہ سے ہے کہ یہی مصرع طرح ہے اور اس پر دو مصرعے لگائے ہیں۔

---

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص ہے ۔۔۔ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا ۔۔۔ ۵ بیخ

رشک۔ مترادف غبطہ۔ مقابل حسد۔ کسی کی کوئی خوبی دیکھ کر اس کا متمنی ہونا بغیر اس کے کہ خوبی کا زوال اس سے چاہا جائے۔ حیف۔ عربی میں بمعنی ظلم وستم۔ مگر فارسی اور اردو میں بمعنی افسوس مستعمل ہے۔ ایک ہی زبان میں جب کسی لفظ کے معنی وضعی سے انحراف ہوتا ہے تو معنی وضعی اور اصطلاحی میں علاقہ کوئی ہونا ضروری ہے۔ مثلاً مجاز یا لزوم وغیرہ۔ مگر دوسری زبان میں جانے کے لیئے کسی علاقہ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اخلاص۔ فرع صدق ہے اور اس کا تابع ہے۔ صدق اصل ہے اور اسے تقدم حاصل ہے۔ اور اخلاص بعد از دخول فی العمل حاصل ہوتا ہے۔ پہلے مصرع سے (ہے) محذوف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حیف نکال کے (ہے) لگادیں۔ اصل میں (اخلاص حیف) ہے۔ میں نے (ہے) کردیا۔

معشوق کا اخلاق غیر کے ساتھ ہونے پر رشک کو افسوس ہوتا ہے۔ مگر عقل کہتی ہے وہ تو بڑا بے مہر ہے وہ بھلا کس کا آشنا ہوسکتا ہے۔ غیر ہو یا کوئی اور۔

ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے　　　گردشِ مجنوں بچشمک ہائے لیلیٰ آشنا

چشمک ۔ ایماء واشارہ چشم ۔ اُردو میں رنجش اور آزردگی خفیف کے معنی ہیں ۔ نیرنگ ۔ طلسم والقلاب وگردش وسحر وافسوں وخاکہ تصویر۔ بعض اوقات ایرانی شعرا بھی ایسے استعارات کر لیتے ہیں کہ میرے ایسے کم استعداد آدمی کو وجہ شبہ پیدا کرنے میں سخت دقت پیش آتی ہے اور استعارہ میں علاقہ تشبیہ ہی کا ہوتا ہے ۔ نیرنگ کو مے خانہ کے ساتھ استعارہ کرنے میں وجہ جامع (وجہ شبہ) مجھے نہ معلوم ہوئی ۔ ساغر۔گردش ۔چشمک الفاظ متناسب ضرور ہیں ، دوسروں کا مبلغ میں کہاں سے لاؤں ۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ لفظ ساغر سے گردش ٹپک رہی ہے ۔ مگر میرے بنائے مے خانہ نہ بنا ۔

جناب غالبؔ کے طرز ادا کے خلاف یہ صاف اور سادہ مصرع یوں ہو سکتا ہے ؎

ذرہ ذرہ اس جہاں کا عالم نیرنگ ہے

اس عالم پُر انقلاب ونیرنگ کا ہر ایک ذرہ ساغر مے خانہ نیرنگ ہے ۔ یعنی پابند گردش وانقلاب ہے ۔ اسی طرح مجنوں کا مارا مارا پھرنا ایماء واشارہ چشم لیلیٰ کا آشنا اور پابند ہے ۔ جس طرح وہ چاہتی ہے پھراتی رہتی ہے ۔

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز　　　ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

صاحبان عجز کے ناز وافتخار کا سامان پیدا کرنے والا شوق ہے ۔ چنانچہ ذرہ کو دیکھو صحرائے وسیع سے نسبت رکھنے کی وجہ سے صحرا کی ایسی دسترس اور قدرت اس کو حاصل ہے ۔ کیوں کہ ذرہ صحرا ہی کا تو جزو ہے ۔ اور قطرہ کو سمندر کی نسبت سے یعنی اس سے آشنائی اور تعلق رکھنے کی وجہ سے عین دریا ہو رہا ہے ۔ دریا ۔ قطرہ ۔ آشنا یعنی شناور باہم الفاظ متناسب ہیں جسے فن بدیع میں صنعت مراعاۃ النظیر اور اُردو میں ضلع اور جگت کہتے ہیں ۔

معنی تصوف یہ ہو سکتے ہیں کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے ۔ اگر وہ شوق اور عاجزی کو کام میں لائے تو ترقی کرتے کرتے اپنے مبدء سے مل کر عینیت کا مرتبہ حاصل کر سکتا ہے ۔

میں اور اِک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے　　　عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

میں ہوں (محذوف) اور آفت کا پرکالا یہ دل وحشی ہے جو عافیت وآرام کا دشمن ہے اور آوارہ گردی کا آشنا سا ہے ۔

دشمن ۔ صاحب غیاث دشت بمعنی زشت (سنسکرت میں ڈشٹ کے بھی یہی معنی ہیں) اور نام بمعنی اسم سے مرکب ہے یعنی زشت دید نام ۔ مرزا رضا قلی ہدایت شیرازی فرماتے ہیں کہ دو عدد معروف اور شمان بمعنی ضد سے مرکب ہے۔ دو ضد آپس میں مخالف ہوتے ہیں. اس لیئے عدو کو دشمن کہتے ہیں ۔ جناب حسرت فرماتے ہیں کہ میں ہوں اور یہ دل وحشی میں (اور) حرف عطف برائے ملازمت ہے ۔

شکوہ سنج رشک ہم دیگر نہ رہنا چاہیئے میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

ہمیں اور تمہیں رشک کی وجہ سے ایک دوسرے کا شاکی نہ ہونا چاہیے ۔ ہمارا سر بوجہ غم واندوہ ہمیشہ آئینہ زانو پر دھرا رہتا ہے ۔ اور تم برائے زینت آئینہ زانو پر رکھے رہتے ہو ۔ دونوں آئینہ سے کام لے رہے ہیں ۔ پھر ایک کو دوسرے پر رشک کیوں ہو اور کوئی کسی کی شکایت کیوں کرے ۔ آئینہ زانو ۔ فقرا زانو پر سر رکھ کر مراقبہ میں دھیان گیان سے کام لیتے ہیں ۔ اور ان کو اس حالت میں انکشافات ہوتے رہتے ہیں ۔

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسدؔ سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

تمثال = مجسمہ STATUE ۔ سنگ سے سر مارنا ۔ اردو کا محاورہ پتھر سے سر مارنا ہے ۔ نہایت سعی و کوشش کرنا ۔ محاورہ میں تغیر الفاظ مترادف سے بھی اچھا نہیں ۔
فرہاد صرف مجسمہ ساز شیریں تھا ۔ اگر عاشق صادق ہوتا تو ناممکن تھا کہ سعی بلیغ کے بعد معشوق ہاتھ نہ آئے ۔
(ہووے) اب متروک ہے ۔ ہو یا ہوئے بولتے ہیں ۔

---

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا ۱۸۶۴ء

اس غزل کی بحر مقتضب مثمن مطوی مسکن ہے بروزن فاعلات مفعولن چار بار اور بحر مسمط چہار گوشہ ہے ۔ اس میں رکن دوم و چہارم و ششم میں تین قوافی غیر از قوافی غزل و قصیدہ لانا بھلا معلوم ہوتا ہے ۔ دوسری بحر اس غزل کی ہزج اشتر بھی ہو سکتی ہے ۔ تب وزن اس کا فاعلن مفاعیلن چار بار ہوگا ۔ اور اس وزن سے بھی مسمط ہے ۔ جناب قدر بلگرامی حشو میں اذالہ و تسبیغ کے قائل نہیں اس لیئے اس کا نام ہزج اشتر مکفوف مقبوض مجبق اتنا لمبا چوڑا نام رکھتے ہیں میرے نزدیک اس کی ضرورت نہیں ۔ اس سے پہلے بھی ایک غزل اس بحر میں آچکی ہے ۔ غرضکہ یہ غزل ذوبحرین ہے ۔

معشوق پری تمثال کا حسن بے نظیر اور مزید برآں مجھ ایسے قادر الکلام کا حسن بیان ۔ پھر کیا تھا۔ جو میرا راز داں اور ہمدم تھا وہ بھی اس پر عاشق ہو کے میرا رقیب بن گیا۔

مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب　　　آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحان اپنا

پیتے ۔ طرز ادا یوں چاہتا ہے کہ وہ بزم غیر میں بہت سی شراب کیوں پی گئے اگر آج ہی ان کو اپنا امتحان منظور نہ ہوتا۔ اور یہ طرز ادا یہ نہیں ۔ اس لئے یہ مصرع مثل اس کے ہونا چاہیے ؎

مے بہت سی اُس نے پی بزم غیر میں یارب　　　آج ہی ہوا منظور اُس کو امتحان اپنا

یا یہ میری کج فہمی اور غلط فہمی ہے۔
یا اللہ بزم غیر میں وہ اتنی شراب پی گئے کہ مدہوش ہو گئے اور اغیار کو اپنی تمنا پوری کرنے کا موقع مل گیا۔ آج ہی اُن کو اپنے تحمل شراب کی آزمائش مقصود ہوئی کاش جب میرے یہاں آتے اور یہاں اپنی آزمائش تحمل کرتے تو مجھے کوئی اچھا موقع ملتا۔
جناب نظم ۔ "پیتے" کے ساتھ معنی بنانے کی یوں سعی فرماتے ہیں کہ ۔ بھلا وہ بزم غیر میں بہت سی شراب کیوں پیتے یہ میری بدقسمتی ہے کہ آج جب وہ میرے گھر آئے تو بہت سی شراب پی گئے ۔ (اور مدہوش ہو گئے ۔ اور مجھے بات چیت کا بھی موقع نہ ملا۔)۔

جناب حسرت (پیتے) اور پی اور پی گئے سے کچھ تعرض نہیں فرماتے ہیں۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　　عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

عرش ۔ تخت ۔ نظام بطلیموسی میں نواں آسمان جسے محدد جہات اور نجوم سے خالی مانتے ہیں ۔ اس لئے اسے چرخ اطلس کہتے ہیں۔ اطلس پہلے پہل سادہ بغیر گل بوٹے کے ایجاد ہوئی تھی۔ کاش کے ۔ حرف تمنا و ترجی۔ منظر ۔ نظر سے اسم ظرف ۔ اونچا مقام جہاں سے اس سے نیچی کی چیزیں دیکھ سکیں ۔ جھروکا۔ بالا خانہ۔
انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کا پایہ عرش سے بھی بلند ہے۔ اس لئے جناب غالب فرماتے ہیں کہ اگر ہمارا مکان عرش سے نیچے ہوتا تو ہم ایک منظر عالی عرش سے بھی بلند بنا کے اپنے مرتبہ کو دیکھ لیتے ۔ مگر ہمارا مکان اور مرتبہ تو عرش سے بھی اونچا ہے۔ اس سے اونچا مقام کہاں سے لائیں جس پر چڑھ کے اپنے مرتبہ اور حقیقت کو دیکھیں اور اس کو سمجھ کے اس کے موافق کاربند ہوں۔ سعدی ؎

بشناس قدر خویش کہ پاکیزہ گوہری

اپنا مرتبہ نہ سمجھنے کی وجہ سے اپنے مرتبہ سے گرے ہوئے افعال ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔
عرش سے ادھر اپنا مکان ہونے کی تمنا اس لیئے کہ اس سے ایک مقصد اعلیٰ حاصل ہونے کی امید ہوتی ہے۔
جناب حسرت نے اس شعر کو آسان سمجھ کر اس پر کچھ نہ لکھا۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے　　　بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

چونکہ پاسبان دربار ہمارا آشنا سا ہے اس لیے وہ ہمیں دھکے دے کے نکالے برا بھلا کہے ہم اسے ہنسی میں ٹالتے رہیں گے کہ یہ تو ہمارا پرانا ملاقاتی ہے اور ہمارا اور اس کا یہی برتاؤ رہتا ہے۔ مگر دربار سے ٹلیں گے نہیں۔ شاید اس تہتک میں وہ نکل آئیں اور ان کا دیدار میسر ہو جائے۔

درد دل لکھوں کب تک جا کے اُن کو دکھلادوں　　　انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

جاؤں اُن کو دکھلادوں کے درمیان۔ اور۔ کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا "جاؤں اور دکھلادوں۔ یا۔ جا کے ان کو دکھلادوں"۔ وزن میں آجاتا ہے۔
قلم کی خونچکانی اور انگلیوں کے زخمی ہونے کو مضمون کے درد انگیز ہونے کی وجہ سے کہا ہے۔
میری داستان غم طویل ہے۔ میں اسے لکھوں کہاں تک خود ہی جا کے انھیں دکھا کیوں نہ دوں کہ لکھتے لکھتے انگلیاں زخمی ہو گئی ہیں۔ اور داستان درد انگیز ہونے سے قلم سے خون ٹپک رہا ہے۔

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا　　　ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا

میرے سجدہ کے نشانوں کو اپنے لیئے ننگ اور عار سمجھ کے سنگ آستانہ کو آپ نے بے کار بدلا۔ میں اتنی سجدہ ریزی کرتا کہ سنگ آستانہ خود ہی گھس کے رہ جاتا اور فنا ہو جاتا۔
اپنا آستان کے ساتھ بادنا بے ملایست ہے جیسے کوئی اپنے موطن کو اپنا فلاں شہر کہتا ہے۔ اور اگر (اپنا) سے مراد معشوق کا ہو تو اس تاویل کی ضرورت نہیں۔

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو　　　دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

غمازی شکایت۔ تمامی۔ چغل خوری۔ یہ شعر معقد ہے دوسرے مصرع کے ساتھ۔

معشوق کی شکایت اور شکوہ میں ہم نے اپنے رقیب کو بھی ہم زبان بنالیا ہے۔ تاکہ اس کے سامنے ہماری چغلی نہ کھا سکے۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے　　بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

آس۔ چکی۔ رخی۔ مان بمعنی مانند و مشابہ سے مرکب ہے۔ چوں کہ چکی کی طرح فلک بھی گردش دوری کرتا ہے۔

یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ فلک دانا اور اہل ہنر کا دشمن ہے۔
جب سبب و علت دشمنی فلک دانائی اور کسی کمال میں یکتائی اور بے نظیری مانی ہوئی بات ہے اور ہم میں یہ دونوں صفتیں ہیں نہیں پھر یہ فلک ہمارے ساتھ دشمنی کیوں برتتا ہے اور ہمیں تکالیف کیوں پہنچاتا ہے۔

غزل ۷۴ ———————— اشعار ۲

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے　　کہ رہے چشم خریدار پہ احسان میرا

خریدار سے مراد ناظرین کلام غالبؔ۔ احسان۔ ایسی بھلائی جس سے دوسرے کو فائدہ پہنچے میرے کلام سے فیض یاب ہونا عام ہے کسی کی خصوصیت نہیں جس کا جی چاہے اس سرمہ مفت سے اپنی آنکھوں کو نور پہنچائے۔ اس کی قیمت یہی ہے کہ ناظرین پر میرے فیض کا احسان قائم رہے۔

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم　　تیرے چہرہ سے عیاں ہو غم پنہاں میرا

رخصت۔ اجازت۔
مجھے نالہ کرنے کی اجازت دے تاکہ دل کی بھڑاس نکل جائے۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ضبط نالہ سے میری حالت ایسی زار ہو کہ اسے دیکھ کر باوجود ظالم ہونے کے تمہیں بھی رنج پیدا ہو اور اس کا اظہار تمہارے چہرہ سے ہو۔

غزل ———————— اشعار ۵

غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں　　بے شانۂ صبا نہیں طرۂ گیاہ کا

گیاہ ترگھانس۔ اور کاہ خشک گھانس۔ گیا۔ گوا۔ بادشا بغیر ہائے ہوز بھی صحیح ہیں۔
دنیا میں کوئی گھانس تک ایسی نہیں جو لطف و کرم الٰہی سے آراستہ اور زیبا نہ ہو۔ چشم حقیقت بین ہونا چاہیئے۔ مگر غافل لوگ اپنے اوپر فخر و ناز کے لئے خود آرائی سے کام لیا کرتے ہیں۔ ورنہ اللہ نے حسب ضرورت ان کو بھی زیبا ہی بنایا

ہے خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ کرم الٰہی کو دیکھو کہ صبا کی کنگھی زلف گیاہ کو سنوارتی رہتی ہے۔

**بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ     صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا**

بزم قدح ۔ محفل مے خواری۔ رنگ ۔ خوبی و خوشی و خوش حالی۔ نخچیر کے بھی معنی ہیں۔ یہاں عیش مراد ہے۔ صید از دام جستہ ۔ وہ شکار جو جال سے چھوٹ گیا ہو۔ ایسا بے تحاشا بے ارادہ منھ اٹھا کے کسی طرف بھاگ نکلتا ہے۔ دام گاہ ۔ شکار گاہ یہاں مراد دنیا۔ لفظی معنی جال کی جگہ۔

بزم نشاط و شراب سے عیش کی تمنا نہ رکھ۔ کیوں کہ دنیا کا عیش تو صید از دام جستہ ہے اور ایسا بھاگا ہے کہ اس کا دنیا بھر میں پتا نہیں۔ یعنی دنیا محل عیش نہیں الدنیا سجنٌ۔

**رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے     شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا**

شرمندگی و ندامت کی وجہ سے اگر ہمارے منھ سے کوئی عذر گناہ نہیں نکلتا ہے تو یہ کچھ انوکھی بات نہیں مگر رحمت الٰہی سے قوی امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے گناہ کو ضرور معاف کر دے گی۔ کیوں کہ ندامت خود بھی باعث ا نابت ہوتی ہے۔

**مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے     پر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا**

اس خیال سے کہ ہم اس کے ہاتھ سے قتل ہوں گے اور مرتبہ شہادت پائیں گے۔ ہمارا دامن نگاہ گویا پر از گل ہو رہا ہے۔ جو دلیل اس بات کی ہے کہ میں قتل گاہ کی طرف بڑی خوشی کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اس کے ہاتھ سے قتل ہوں گا۔ دیدار ہوگا۔ تکالیف سے نجات ملے گی۔ زخم کو بوجہ سرخی گل سے تشبیہ دیتے ہیں۔

**جان در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسدؔ     پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا**

اسدؔ کو تمنا ہے کہ تم اس کو ایک نگاہ غیظ سے دیکھ لو تا کہ وہ جل کے خاک ہو جائے اور تکالیف سے نجات حل جائے۔ تم سے انصاف کی خواہش میں اس نے اپنا وکیل پروانہ کو بنایا ہے۔ کیوں کہ جل مرنے کے قانون کو وہ بہتر جانتا ہے لہٰذا ہمارے مقدمہ کی پیروی اس سے بہتر کون کر سکتا ہے۔

---

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا　　کہتے ہیں ہم تجھ کو منھ دکھلائیں کیا

باز آئیں کی جگہ باز آئے کا محل ہے۔ اس صورت سے مطلع نہیں رہتا ہے مگر غالب نے باز آئیں۔ باز آئیں گے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

ظلم کرنے سے وہ باز آئے۔ (ہاتھ اٹھایا۔ ترک ظلم کیا) مگر کیا خاک باز آئے۔ اب کہتے ہیں کہ مجھے اپنے مظالم سے سخت ندامت ہے۔ اتنے ایک ظلم کرنے پر ہم تم کو اپنا منھ کیا دکھائیں۔ یہ اُن کا منھ نہ دکھانا چاہے ندامت ہی سے کیوں نہ ہو میرے اوپر کیا کم ستم ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

دنیا محل انقلاب ہے یہاں کسی چیز کو ثبات و قیام و قرار نہیں اس لئے آئندہ ہمارے لئے کوئی بہبودی ہی ہوگی کیوں کہ رنج کے بعد راحت ہی کا مرتبہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

لاگ ہو تو ہم اسے سمجھیں لگاؤ　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ۔ دشمنی وعداوت۔ لگاؤ۔ لگاوٹ۔ اختلاط۔ رغبت۔ میل۔

اگر وہ ہمارے ساتھ دشمنی ہی سے پیش آئیں تو ہم اس کو بھی لگاوٹ اور ناز معشوقانہ سمجھیں کہ کسی طرح سے ہی توجہ تو ہماری طرف ہوئی۔ مگر جب نہ لگاؤ ہو اور نہ لاگ بلکہ محض بے تعلق ہو تو پھر ان کو دوست سمجھنے میں دھوکا کیوں کھائیں۔

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ　　یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

ہم کی جگہ خود بھی پڑھ سکتے ہیں۔

قاصد کو روانہ کرکے ہم بھی بدگمانی کی وجہ سے اس کے ساتھ ہو لئے۔ یا اللہ کیا اپنا خط خود ہم کو پہنچانا پڑے گا۔ یارب کلمہ استعجاب ہے۔ ساتھ ساتھ ہو لینے کی علت اضطراب شوق ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جواب پر اطلاع جلدی سے ہو جائے۔ انسان کو موافق تمنا کام ہو جانے کا خیال زیادہ رہتا ہے ناکامی کا گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے موافق خواہش جواب ملنے کی اطلاع قاصد کے ساتھ جانے پر فوراً ہوگی اور قاصد کے واپس آنے کا انتظار نہ کرنا پڑے گا۔

موجِ غم سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

کیا۔ تحقیر کے لئے ہے۔ کسی چیز کا سر سے گذر جانا اس کا انتہا کو پہنچ جانا۔
مصائب کی چاہے انتہا ہی نہ رہے مگر جب در یار پر دھونی رمائی ہے تو پھر اب یہاں سے اُٹھ کے کہیں اور کیا جائیں۔ اب ہم سے در یار کب چھوٹ سکتا ہے۔

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

زندگی بھر تو تکالیف سے اُکتا کے موت کا راستہ دیکھتے رہے۔ دیکھیں اب مرنے کے بعد وہ محبوب کیا دکھاتا ہے۔ قیامت میں بھی وہ مجھے ملتا ہے یا نہیں۔ ان مصائب کا کچھ تو صلہ ملنا ضروری ہے۔ یا۔ دکھلائیں کا فاعل خدا۔ دکھلائیں کیا۔ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جنازہ میں شریک ہوتے ہیں یا نہیں۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کوئی بتلاؤ دلّی میں اب بھی اسی طرح بولتے ہیں۔ لکھنؤ میں (کوئی بتلا دے) کہتے ہیں ؎
یہ تو بتلا دے کوئی بتلائیں کیا
جان بوجھ کر انجان بن کے پوچھتے ہیں کہ غالبؔ کون ہے۔ کیا وہ سچ مچ ہم کو بھول گئے ہیں ہرگز نہیں۔ پھر کوئی اتنا تو بتلا دے کہ ہم ان کو بتلائیں کیا۔ سوتے کو تو جگاتے ہیں جاگتے کو کوئی کیا جگائے۔

---

پوچ

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

لطافت۔ پاکیزگی۔ صفا ضد کثافت۔ کثافت۔ غلظ۔ زنگار۔ وہ مصالحہ جو آئینہ کی پشت پر لگاتے ہیں اور اس کی وجہ سے عکس شے دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کا رنگ سبز مانتے ہیں۔ صبا کو آئینہ سے اور چمن کو زنگار سے استعارہ کیا ہے۔ تمثیل ہی سے مثل لہ پیدا کیا ہے ورنہ یہ بات کوئی مسلم امر نہیں کہ لطافت بغیر کثافت نہیں ہوتی۔
آئینہ بادِ بہاری کے لیئے جب چمن زنگار کا کام کرتا ہے تب لطافت و خوبی اور صفائی اس میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح بغیر زحمت اٹھائے مرادات پورے نہیں ہوتے۔

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل　　جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

سمندر کے جوش کا مقابل ساحل خود دار ہو کر بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جہاں ساقی حسین و کریم ہو۔ وہاں کوئی اپنے ہوشیار رہنے کا دعویٰ کرے یہ بالکل غلط ہے۔ اس کی فیاضی شراب دینے میں اور اس کا حسن ضرور مدہوش کر دے گا۔ جیسے ساحل بحالت طغیانی دریا مستغرق ہو جاتا ہے۔

---

ابجد　عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

عشرۃ مخالطت و مصاحبتہ۔ فارسی والے زندگانی خوش کے معنی میں لاتے ہیں۔ جناب مولوی علی میاں صاحب کامل لکھنوی بجائے عشرت (ہستی) تجویز فرماتے تھے۔ بظاہر فنا کے مقابلہ میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لفظ عشرت میں کچھ زیادتی کے ساتھ معنی ہستی موجود ہیں جو ہستی میں نہیں۔ کیوں کہ عشرت کے معنی خوش زندگانی گردن کے ہیں۔

قطرہ جزو دریا ہے مگر کل سے مل کر بڑی چیز ہو جاتا ہے گو اس کی ذات باقی نہیں رہتی لیکن یہ فنا اس کے لئے عشرت کا باعث ہے۔ اسی طرح درد جب حد سے گذر جائے تو صاحب درد فنا ہو جائے گا۔ جس کو فنا فی المحبوب سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں۔ عاشق کے لیئے اس سے بڑھ کے اور کون مرتبہ ہو سکتا ہے۔ مزید برآں ہر قسم کے آلام سے نجات مل جاتی ہے۔ اور مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد　　تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

قفل ابجد۔ ایک قفل (تالا) ہوتا ہے جس میں چند پھرکیاں ایک ڈنڈی میں پروئی ہوتی ہیں (گھومتی ہوئی) اور ہر پھرکی پر ایک حرف ابجد کندہ ہوتا ہے۔ اور بائیں پہلو کی چھیپ پر ایک لکیر کندہ ہوتی ہے۔ لفظ مخصوص کے حروف والی پھرکیاں جب گھما کے اس لکیر کی سیدھ میں لے آتے ہیں تو قفل کھل جاتا ہے اور جب پھرکیوں کو گھما کے اس لفظ کو بگاڑ دیا جائے یعنی وہ ترتیب حروف باقی نہ رہے تو قفل بند جاتا ہے۔ بات کا بنّا تدبیر کارا ست آنا۔ مقصود حاصل ہونا۔ ذکر قفل ابجد میں یہ محاورہ خوب صرف ہوا ہے۔

جب تدبیریں بڑی اور تم سے ملاقات ہوئی تو تم سے ملتے ہی فوراً جدائی بھی ہو گئی۔ گویا میری قسمت میں یوں ہی لکھا تھا کہ بات کے بنتے ہی تم سے جدائی ہو جائے۔ جس طرح قفل ابجد میں لفظ معین واضع کے بنتے ہی وہ کھل جاتا ہے اور اس کے دونوں ٹکڑے الگ ہو جاتے ہیں۔

دل ہوا کش مکش چارہ زحمت میں تمام　　　　مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

اس عقدہ سے مراد رفع زحمت دل ہے۔ بعض اوقات گتھی سلجھانے اور گرہ کھولنے میں اس گرہ کا تاگا تار تار ہو جاتا ہے اور گرہ ہی ندارد ہو جاتی ہے۔

دل کی زحمت دور کرنے کے تدابیر کی کھینچا تانی میں دل ہی کا وارا نیارا ہو گیا۔ ایسا تکالیف عشق سے نحیف و زار ہو رہا تھا۔ اس رگڑو جھگڑ میں عقدۂ دل بجائے اس کے کہ کھلے خود گرہ ہی گھس بس کے رہ گئی۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　　　اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

اللہ اللہ کلمہ تعجب اور حسرت دونوں ہو سکتا ہے۔

مہربانی و لطف و کرم تو درکنار ایسی بے تعلقی تم نے اختیار کی ہے کہ جفا کرنے سے بھی ہاتھ اٹھالیا ہے۔ اہل وفا کا اتنا دشمن بھی کوئی ہو جایا کرتا ہے۔

یہ شعر زائد الوصف ہے۔ اور ایسے اشعار کی تعداد ان کے چھوٹے سے دیوان میں اتنی ہے کہ دوسروں کے ضخیم دیوانوں میں بھی شاید نہ ملے کتنے ہی بے معنی اشعار کہیں اور زبان و عروض و محاورات و الفاظ کی غلطیاں کریں سب قابل معافی ہیں اور خدائے سخن کہے جانے کے سزاوار۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا　　　　باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دم سرد ٹھنڈی سانس۔ آہ بے تاثیر۔ جس طرح دم گرم بمعنی آہ باثیر ہے۔ باور یقین پانی گریہ کو اور ہوا آہ سرد کو کہا ہے۔ پانی ہوا میں اور ہوا پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

کمزوری سے اب آنسو تک نہیں نکلتے ایسی خشکی پیدا ہو گئی ہے یا خون جسم میں نہیں رہا ہے بجائے گریہ ٹھنڈی سانسیں بھرا کرتا ہوں۔ اس سے مجھے اس مسئلہ کا یقین ہو گیا کہ پانی مبدل ہوا ہو جایا کرتا ہے۔

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال　　　　ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا

گوشت سے کہیں ناخن جُدا ہوتا ہے اردو کی مثل ہے۔ دو عزیز قریب میں جب رنجش کے بعد صلح ہو جائے تو اس مثل کو بولتے ہیں۔ پہلے مصرع کی تمثیل ہے۔

جس طرح گوشت سے ناخن جُدا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تیری مہندی لگی اُنگلی کا تصور میرے دل سے نہیں مٹ

سکتا۔ کہنا تو یہ مقصود ہے۔ مگر" ہوگیا" صیغہ ماضی کی وجہ سے یہ معنی ہوتے ہیں کہ جس طرح گوشت سے ناخن جدا ہو جائے اسی طرح تیرے انگشت حنائی کے خیال کا دل سے مٹنا ہوا۔ تمثیل ہیں تشبیہہ حاصل کی حاصل کے ساتھ ہوتی ہے۔ مشبہ اور مشبہ بہ کی جستجو عبث ہے۔ ؎

دل سے مٹتا نہیں انگشت حنائی کا خیال　　　کیسے ہو گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا

ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا　　　روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا

روتے روتے مر جانا میرا تیرے فراق میں میری فرحت ونشاط کا باعث ہے کیوں کہ سخت عذاب سے نجات مل گئی۔ اس کی مثال ٹھیک اس طرح ہے جیسے ابر بہاری برس کر کھل جاتا ہے اور اس حالت میں سیر چمن زیادہ موجب فرح ونشاط ہوتی ہے۔ تشبیہ میں ندرت وجدت ہے۔

گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچہ کی ہوس　　　کیوں ہے گرد رہ جولان صبا ہو جانا

خوشبوئے گل کو بھی تیرے کوچہ میں جانے کی ہوس ہے تاکہ تیری زلف مشکیں سے اور زیادہ کسب خوشبو کر سکے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیوں گردش صبا کے راستہ کی گرد بنتی ہے۔ تاکہ بوساطت صبا تیرے کوچہ تک پہنچے اور تجھ تک اس کی رسائی ہو اگر ہوا نہ ہو تو خوشبو کہیں سے کہیں نہیں جا سکتی۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ ردیف محاورہ سے گری ہوئی ہے۔

ان کا مقصود یہ ہے کہ اس طرح ہونا چاہیے ۔۔ " پھر کیوں نکہت گل گرد رہ جولاں صبا ہو جاتی ہے" میرا خیال یہ ہے کہ اس کی نثر اگر یوں بنائی جائے۔ " پھر نکہت گل کا گرد رہ جولاں صبا ہو جانا کیوں ہے اگر اس کو اس کے کوچہ کی ہوس نہیں ہے۔

تا کہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل　　　دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

آئینۂ فولادی برسات کی سیلن سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ اور زنگ کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ ہوائے صیقل شوق جلا یا۔ وہ ہوا جو صیقل کا کام دے رہی ہے۔

ایرانیوں اور عربوں کے نزدیک اودا نیلا۔ سبز۔ کبود۔ سیاہ سب ایک ہے اسی وجہ سے یہ سب صفات میں آسمان کے لاتے ہیں۔ پانی۔ شیشہ اور لوہے کا رنگ بھی اسی وجہ سے سبز کہتے ہیں۔

میں نے بزرگان قوم کا دو املوں میں تتبع نہیں کیا۔ ایک ذال معجمہ میں۔ جناب غالب کو پہلے اس کے بعد

جناب حالی و جناب شبلی کو یہ خیال اچھا معلوم ہوا کہ دال معجمہ فارسی کا حرف سین اس لیئے جن الفاظ فارسیہ میں ذال تھا انھوں نے اسے (ز) سے لکھنا شروع کیا حتیٰ کہ ذال کا املا زے سے عام ہوگیا۔ میں اس پر بحث اس سے پہلے کرچکا ہوں کہ ذال کا وجود فارسی میں ہے۔ اور اس کو استدلال کے ساتھ ثابت بھی کرچکا ہوں۔

دوسرے الفاظ ذوات الہار کو ایک خاص محل پر (ے) سے لکھنا۔ آج کل آئینہ میں منھ دیکھا کو "آئینے میں لکھتے ہیں۔ کیا ہار ہوز ماقبل کے کسرہ کو مانع ہے یا متعذر التلفظ ہے۔ جب ایسا نہیں تو آئینہ لکھو اور بول چال کے موافق کسرہ ما قبل سے تلفظ کرو ایرانی اپنے لہجہ میں گفتہ کو گفتہ ہی بولتے ہیں۔ پھر کیوں (ے) سے لکھ کر صیغہ جمع سے التباس پیدا کیا جائے۔ ہاں الفاظ ذوات الف میں ایسے محل پر الف کو (ے) بنائے بغیر چارہ نہیں ہوتا کیوں کہ الف سے پہلے کسرہ متعذر التلفظ ہے۔ لہٰذا " املے میں غلطی نہ کرو " (ے) ہی سے لکھنا پڑے گا۔

اے غافل ہوائے جلا پرواز کی کرامت کو زمانہ بارش میں دیکھ کہ اپنے فضل وکرم سے آئینہ کو باوجود جماد ہونے کے کیسا سر سبز کردیتی ہے۔ چوں کہ میں اس شعر کو سمجھ نہیں سکتا اس لیئے دونوں بزرگوں کے معانی لکھے دیتا ہوں۔

جناب نظم ۔ برسات میں آئینہ فولاد پر زنگ آجاتا ہے وہ گویا کہ سبزہ ہے جسے ہوائے صیقل نے پیدا کیا ہے۔ ہوا بمعنی خواہش وشوق ہے۔ حاصل یہ کہ شوق وہ چیز ہے کہ فولاد پر بھی اثر کرتا ہے۔

جناب حسرت بھی اسی مطلب کو بالفاظ دیگر یوں تحریر فرماتے ہیں۔

آئینہ فولادی جو برسات میں سبز ہوجاتا ہے۔ ہوائے صیقل یعنی خواہش صیقل سے آئینہ کا سبز ہوجانا ہوا ہے۔ گویا آئینہ اعجاز ہوا سے سبز ہوگیا۔ اگرچہ اس ہوا سے ہوائے صیقل یعنی خواہش صیقل ہی مراد کیوں نہ ہو۔ مقصود شاعر یہ ہے کہ آج کل اعجاز ہوا یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ ہوا بمعنی خواہش میں بھی وہی تاثیر اور اعجاز پیدا ہوگیا ہے جو اصلی ہوا میں ہوتا ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالبؔ　　　چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

اے غالب جلوۂ گل تماشے کا ذوق پیدا کر رہا ہے کیوں کہ باغ میں طرح طرح کے رنگین پھول کھل رہے ہیں ۔ اس نیرنگی عالم کو چشم حقیقت بین کو کھول کے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ۲۲ر اگست ۱۹۴۶ء مطابق ۲۴ر رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ

چھوٹی بڑی غزلیں ۵۱　　　تعداد اشعار ۳۰۵

---

## غزل ۵۲ ردیف الباء الموحدة شمار اشعار ۱۲

۱۲ غ ۱ پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

باز شد وقت شود بال کشا موجِ شراب بدہد بلبلہ را (بال۔ دست۔ پائے۔ زور) شنا موجِ شراب

یا پہلا مصرع یوں ہو ؎

وقت آں شد کہ شود بال کشا موجِ شراب

پہلے مصرع میں بال بمعنی بازو اور دوسرے میں بال بمعنی دل لفظ عربی ہوگا۔ اور اگر دست رکھیں تو بمعنی قوت و قدرت و جرأت و ہمت ہوگا اور پورا شعر ادنیٰ تصرف سے فارسی کا ہو جائے گا۔ بلبلہ = صراحی۔

بال کشادن = اُڑنا۔ بطِ مے = صراحی شراب بصورت بط۔ شنا = سباحت۔ پیرنا۔ دل و دست = دونوں بمعنی جرأت و ہمت۔ قوت و قدرت۔ پھر ہوا وقت = یعنی بہار آئی۔ شنا = پیرنا۔ چوں کہ شناوری میں پاؤں زیادہ کام دیتے ہیں اس لیئے اُردو میں پیرنا بولتے ہیں۔ مگر دلی میں تیرنا کہتے ہیں۔ اُترانا کا مترادف کسی چیز کا سطح آب پر بہتے پھرنا۔ ترنا کے بھی یہی معنی ہیں۔ اسی سے تیرنا بھی مشتق ہے۔ چوں کہ اُردو میں تیرنے کے معنی۔ ترکیوتر کا غٹ غٹا کے مادہ کے پیچھے بجالت مستی چلنا اور مادہ کا ایک خاص انداز کے ساتھ اس کے آگے چلنا معنی ہیں اس لیئے اہل لکھنؤ پیرنے کو تیرنا نہیں کہتے۔ جوش شراب کو بال کشائی اور حرکت امواج شراب کو شناوری کے ساتھ استعارہ کیا ہے۔ یا۔ بال کشائی سے مراد ساغر کا گردش میں آنا ہے۔

پھر فصل بہار آگئی اور شراب جوش مار رہی ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ موج شراب صراحی مے (بطِ مے) کو اگر قدرت و قوت شناوری عطا کردے۔ یعنی صراحی گردش میں آئے۔

جو ہوا غرقۂ مے بخت سا رکھتا ہے سر سے گذرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

آنکہ شد غرقۂ مے بخت رسا نیدارد بگذرد از سر شد بالِ ہما موجِ شراب

گذر بمعنی گذشتن ــ ہے بفارسی دری بمعنی ہست ہے (برہان اور انجمن آرا دیکھو) یا شد پڑھو اس مصرع

کا وزن فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان ہونا چاہیئے تھا مگر دوسرا رکن فعلاتن بوجہ زحاف تسکین اوسط مفعولن ہوگا۔

یہ پوری غزل تشبیب بہاریہ کسی قصیدہ کی معلوم ہوتی ہے۔ غزل نہیں ہے۔ اور پہلا مصرع مطلع کا مصرع طرح معلوم ہوتا ہے جبھی تو مطلع اور مقطع دونوں میں ہے۔ اس مصرع طرح پر دو مصرعے لگائے۔ اس سے پہلے بھی ایک غزل میں ایسا ہی کیا ہے۔

ھما ایک خیالی پرندہ جس کی نسبت گمان کرتے ہیں کہ جس کے سر پر اُس کا سایہ پڑ جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں PHOENIX اور BIRD OF PARADISE کہتے ہیں۔ سلیمان حئیم ایرانی نے اپنی لغت (انگلش انٹو پرشین) میں (فونکس) کا مترادف۔ ہما۔ موسیقار۔ ققنس۔ سیمرغ سب کو لکھ دیا۔ جب وہمی اور خیالی چیز ہے تو یوں بھی سہی۔ یا۔ انگریزی میں ان کے لیئے مترادفات نہیں۔ اور کیوں ہوں۔ ایشیائی خیال پرندہ ہے سر سے پانی اونچا ہونا کسی بات کا حد سے گذر جانا۔ بھی کا زور (فورس) یہ ہے کہ پانی جب سر سے گذر جائے تو موجب ہلاکت ہوتا ہے مگر نشۂ سرسے گذرنے پر بھی بخت مندی میں سایہ بال ہما کی تاثیر رکھتا ہے۔ اس کے بعد مطلب لکھنے کی کیا ضرورت رہی۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ ارباب چمن　　　سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب

مت۔ بجائے حرف نفی (نہ) کہنے میں شعرا کی مت پلٹ گئی۔ نہ معلوم کیوں۔ حالاں کہ بول چال میں اب بھی ہے۔ سیہ مستی = بدمستی۔ ارباب چمن = چمن کی سیر کرنے والے لوگ۔ یا گل بوٹے۔ تاک۔ انگور کی بیل VINE درختوں کے جھومنے کو سیہ مستی سے تعبیر کیا ہے۔ ارباب چمن کی بدمستی کا حال کچھ نہ پوچھو۔ یہاں تو تاک کے سایہ میں سے جو ہوا گذرتی ہے وہ موج شراب کا اثر رکھتی ہے۔ سایہ اور سیہ میں صنعت ہے۔

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے۔ اگر　　　موج ہستی کو کرے فیض ہوا موج شراب

موج ہستی۔ بوجہ حرکت انقلابی ہستی کا استعارہ موج سے کیا۔ سچ پوچھو تو یہ کچھ نہیں محض ردیف کی خاطر سے موج ہستی کہنا پڑا۔ برسات۔ ہندی کا لفظ ہے۔ مگر فارسی میں بھی نظم کرنے لگے۔ برشکال بھی فارسی نہیں ہے (برکھا) گڑھ لیا ہے۔ ہندوستان میں اس کا زمانہ ۱۵ ارجون سے ۱۵ اکتوبر تک ہے۔ اور یہاں کا زمانہ بہاریہ موسم ہے۔ اگرچہ ۱۵ فروری سے بھی بسنت (بہار) مانتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں جوت۔ حمل۔ ثور میں جب آفتاب ہوتا ہے تو بہار ہوتی ہے۔ یعنی فروری۔ مارچ اپریل بہار کے مہینے ہیں۔ ماہ فروردیں شباب بہار کا مہینا ہے۔
برسات کا موسم وہ نشو ونما پیدا کرنے والا ہے جس نے مزبلوں تک کو چمن بنا دیا ہے، لہٰذا کوئی تعجب

کی بات نہیں اگر امواج ہستی میں بھی اس زمانہ کی ہوا کے فیض سے امواج شراب کی سی مستی اور نشاط آوری پیدا ہو جائے۔

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو       موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

چار موج ۔ وہ موجیں جو ہر چار سمت سے اُٹھیں۔ اور ان چاروں کو مصرع ثانی میں بیان کر دیا ہے۔ شفق = وہ سرخی جو اُفق آسمان پر شام اور صبح کو بوجہ انعکاس اشعۂ سرخ آفتاب مغرب اور مشرق کی جانب دکھائی دیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ آفتاب کی شعاعیں سات رنگ میں ہیں۔ مگر اصلی نیلی۔ سرخ اور زرد ہی ہیں انھیں کے اختلاط و اختلاف کیفیت میں دوسرے رنگ پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً نیلا اور زرد ملانے سے سبز رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ نیلا اور سرخ مل کے اودا طرب: نشاط۔ خوشی۔ صبا۔ ہوائے مشرقی جس سے پھولوں کا کھلنا مانتے ہیں۔ نسیم سحری کی طرح۔
اس فصل بہار میں ہر چہار طرف سے چار امواج نشاط کا جوش ہے۔ دوسرا مصرع چار امواج کے بیان میں ہے۔ ان چاروں چیزوں سے تفریح ہوتی ہیں اور دیدہ فریب ہیں۔

جس قدر روح نباتی ہے جگر تشنۂ ناز       دے ہے تسکین بدم آب بقا موج شراب

روح نباتی یعنی نفس نباتی ۔عالم نباتات۔ مراد ۔ قوت نامیہ ۔ جو علاوہ جمادات، نباتات اور حیوانات میں باعث نشو و نما ہوتی ہے۔ تشنہ ۔ پیاسا۔ جگر تشنہ مشتاق ۔ لفظ تسکین۔ متناسب تشنہ (ب) معیت کے معنی میں ہے۔ ناز مراد جھومنا۔ اکڑنا۔ خرام ناز۔ دم ۔ گھونٹ۔ آب بقا۔ آب حیات ۔ دم آب بقا سے مراد بارش کے پانی کا گھونٹ یا شراب۔
جس قدر عالم نباتات مشتاق ناز اور زیبائش کا ہے اتنی ہی موج شراب آب حیات کے گھونٹوں سے اس کے اشتیاق کی پیاس کو تسکین دیتی رہتی ہے۔

بسکہ دوڑے ہے رگ تاک میں خوں ہو ہو کر       شہ پر رنگ سے ہے بال کشا موج شراب

خون ۔ عربی دم اردو لہو فارسی الفاظ کے نون بعد مد کے اعلان کو نادرست مطلقاً سمجھتے ہیں اور اردو میں عطف و اضافہ فارسی کے ساتھ۔ مگر بلا ترکیب اُردو میں بعد حرف مدہ نون کا اعلان بہ نسبت اخفا عمومیت کے ساتھ افصح ہے۔
شہپر ۔ پرندوں کے بازوؤں کے اگلے چار پر جن کو عربی میں قوادم کہتے ہیں ان کے بعد کے چھ پر خوافی کہلاتے ہیں۔ ان دسوں کو اُردو میں دسو کا کہتے ہیں۔ تاک = انگور کی بیل حیوانی کھاد (یعنی خون مچھلی) سے خوب پھیلتی ہے۔ جس طرح خون کی تولید سے جسم حیوانی۔ رنگ ۔ سرخی شراب۔ رنگ کا استعارہ شہپر کے ساتھ کرنے میں وجہ شبہ (وجہ جامع)

میں نہ سمجھ سکا ایسے استعارات شعراء فارس بھی کیا کرتے ہیں۔ میں نہ سمجھ سکوں یہ میری نافہمی ہے کسی پر کیا الزام۔

شراب چوں کہ رگ تاک میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔ تو گویا نشہ پر رنگ سے موج شراب پرواز کر رہا ہے۔ تاثیر سرایت شراب کو رگ تاک میں پرواز کے ساتھ بوجہ حرکت تشبیہ دی ہے۔

شراب اپنے رنگ میں خون سے مشابہ ہوتی ہے اور خون دوران میں رہتا ہے۔ خون ہی سے شہپروں کی بھی پرورش ہوتی ہے۔

چوں کہ مجھ میں نازک خیالی نہیں اس لئے جس تشبیہ میں وجہ شبہ ادنیٰ ملابست ہوتی ہے وہ بھی پریشان کر دیتی ہے۔ اس میں شاعر کا کیا قصور۔

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب

چراغاں۔ جمع چراغ نہیں۔ کثیر روشنی جو کسی معزز کی آمد پر کی جاتی ہے۔ موجہ گل اور چراغاں میں وجہ شبہ اسی طرح سرخی ہے جس طرح شراب اور گل میں شراب کو گل کہا ہے۔ زبس۔ اردو میں غریب ہے اس سے "از بس کہ" غنیمت ہوتا ہے۔

چوں کہ تصور میں موج شراب جلوہ نما ہے۔ لہٰذا راہ خیال میں موجۂ گل سے چراغاں ہو رہا ہے۔ ردیف کی مجبوری ہے ورنہ اکثر اشعار میں موج کا لفظ زیادہ پڑتا ہے۔ صرف لفظ شراب کفایت کرتا ہے۔ "بس" کی جگہ (مے) لا سکتے ہیں۔ مگر دو (میم) تبع ہجیں گے۔ غالب اس کی پروا نہیں کرتے ہیں۔

نشہ کے پردہ میں ہے محوِ تماشائے دماغ بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

سر خیال اس کے ساتھ خیال اور دماغ الفاظ متناسب ہیں۔ کیوں کہ سر بمعنی راس HEAD بھی ہے۔

چوں کہ شراب کو نشو و نما کا خیال ہے کہ اس زمانہ بہار میں کس کس چیز میں بالیدگی پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا نشہ بن کر دماغوں میں چڑھ گئی۔ تاکہ دیکھے بہار نے فضاء دماغ میں اپنا کیا اثر دکھلایا ہے۔ اس لئے اس فضاء دماغ کی سیر میں محو تماشا ہے۔

ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں یعنی سب حسین و زیبا ہیں۔ یا ایک رنگ اور ڈھنگ کے ہیں طوفانی کیفیت

فصل ۔ فصل بہار کی کیفیت کا جوش جن میں ہے ۔یعنی گل بوٹے اور تازہ اُگا ہوا سبزہ۔
اس فصل بہار کے جوش نشاط و طرب کی وجہ سے سبزہ سے لے کر موج شراب تک سب کے سب عجب
عالم حسن و زیبایش پر ہے۔

شرح ہنگامہ ہستی ہے زہے موسم گل ۔۔۔ رہبر قطرہ بدریا ہے خوشا موج شراب

زہے ۔ کلمہ تحسین ۔ خوشا ۔ کلمہ خوش اور الف بمعنی است ہے ۔ یہ بھی کلمہ تحسین ہے۔ کیا کہنا ہے ۔
سبحان اللہ۔

شرح ہنگامۂ ہستی ست زہے موسم گل ۔۔۔ رہبر قطرہ بدریاست خوشا موج شراب

یہ موسم گل عالم ہستی کے چہل پہل کی تشریح کرتا ہے۔ یعنی جس طرح اس بہار کو قیام نہیں اسی طرح عالم ہستی کو ثبات
نہیں آخر میں فنا ہوتا ہے۔ اور بعد از فنا مبدء اور منبع سے مل جاتا ہے (وإليه ترجعون) جس طرح قطرہ دریا
سے مل کر عین دریا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس موج شراب کا کیا کہنا ہے کہ بے خود و فنا کر کے اصل سے ملا دیتی ہے۔

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ ۔۔۔ پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

دیکھ صیغہ امر یا ۔ دیکھ کر۔
اس بہار کو دیکھ کر اے اسدؔ میرے ہوش اڑے جاتے ہیں۔ اس زور کی بہار ہے ۔ایسی بہار میں ضرور
صراحی و ساغر و مے سے کام لینے کا وقت ہے۔

---

غزل ۱ **باب التاء القرشت** شمار اشعار ۳

وغ۳ افسوس کہ دیدان کا کیا رزق فلک نے جن لوگوں کی تھی درخور عقد گہر انگشت

دیدان جمع الجمع دوده وجمع دوده دود۔ کیڑے مکوڑے۔ صدف (سیپی) بھی ایک کیڑا ہے گھونگے (حلزون) کی قسم کا۔ یہ لفظ اُردو میں بہت غریب ہے۔

جناب حسرت دندان (اسنان) مترادف (دانت) تجویز فرما کر لکھتے ہیں، جن لوگوں کی انگلیاں سلک گہُر کی سزاوار تھیں افسوس کہ فلک نے انھیں دانتوں کا رزق بنا دیا۔ یعنی افسوس کہ وہ لوگ انگشت حیرت بدندان ہیں۔ دندان کے رزق ہونے کی تعبیر انگشت حیرت بدندان سے نہ معلوم کیسے ہوسکتی ہے۔ پھر مرے ہوؤں کا متحیر ہونا یہ بات ہی کیا ہوئی۔ خود شاعر تو دانتوں یا کیڑوں کا رزق بنانے کا فاعل فلک کو قرار دیتے ہیں۔ اور جناب حسرت متحیر ہونے کے (یعنی رزق دندان ہونے کے) فاعل لوگ قرار دیتے ہیں۔

جن لوگوں کی اُنگلیاں سزاوار سلک گہر تھیں افسوس کہ فلک نے ان اُنگلیوں کو کیڑوں کا رزق کر دیا۔ مرنے کے بعد قبر میں لاش کے سڑنے کے بعد کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور کیڑے گوشت پوست ایک مدت میں کھا جاتے ہیں۔ ہڈیاں بھی ایک وقت میں چونا ہو جاتی ہیں۔

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت

ہندوستان میں دستور ہے کہ کسی دوست یا عزیز کے سفر کرتے وقت بطور نشانی و یادگار کوئی چیز خصوصاً چھلّا یا انگوٹھی مسافر کو دیتے ہیں تاکہ جس وقت اس پر نظر پڑے مسافر کو چھلا دینے والے کی یاد تازہ ہو جائے۔

وقت سفر مجھے اپنی خالی انگلی (یا شوخی سے انگوٹھا) اس نے دکھا دی۔ اس کا یہ خالی انگلی دکھا دینا نشانی اور یادگاری کے لیئے مجھے کافی ہے۔ الفاظ موجودہ کے ساتھ نثر اس شعر کی یوں ہوتی ہے کہ وقت سفر خالی انگلی دکھا کے مجھے چھلّے کا نہ دینا تیری نشانی کے لیئے کافی ہے۔

یہ فعل محبوب کا چونچلے یا شوخی ہی سے کیوں نہ ہو شعر کو متانت سے گرا دیتا ہے اور شعر میں چھچھور اپن پیدا

کر دیتا ہے۔

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخن گرم　　تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

سخن گرم۔ کلام پُر تاثیر۔ گرم متناسب سوزش۔ گرم چیز چھوئی نہیں جاتی انگشت برحرف کے نہادن اُس کے کلام پر اعتراض کرنا۔ سوزش۔ آتشِ عشق کی جلن۔

سوزِ عشق سے پُر دل و دماغ کو جلا کر میں اشعار اس لیئے کہتا ہوں کہ ان کی گرما گرمی کی وجہ سے کوئی ان کو ہاتھ بھی نہ لگا سکے۔ نہ ان پر اعتراض کر سکے اور نہ ان کے ایسے اشعار کہہ سکے۔

---

غزل ۲　　اشعار ۴

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت　　پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

حضرت۔ پہلو۔ قرب۔ سن۔ مکان حضوری۔ اور جناب بمعنی صحن و اطراف۔ مگر یہ دونوں کلمے بجائے کلمات تعظیم اُردو و فارسی میں مستعمل ہیں۔ سلامت۔ بریت و نجات از عیوب و آفات۔ بطور دعا زندگی مستعمل ہے۔ مرنا ہے یعنی ضروری اور لازمی ہے۔

اگر کوئی قیامت تک (جیسے مجردات) بھی زندہ رہے تب بھی اسے ایک روز مرنا لازم ہے۔ (موت بھی منجملہ امراض ہے۔ ممکن ہے کہ انسان کو اس کے علاج پر کسی وقت کامیابی ہو جائے۔ شریعت بھی بہشت اور دوزخ میں اسی جسم کے ساتھ حیات ابدی بتاتی ہے)۔

جگر کو مرے عشق خونناب مشرب　　لکھے ہے "خداوند نعمت سلامت"

خونناب مشرب۔ جس کا خون خالص پیتے رہنا طرز و طریق ہو۔ یہ صفت عشق ہے۔ مشرب۔ پانی پینے کی جگہ گھاٹ۔ خداوند نعمت۔ مالک اور آقا نعمتوں کا۔ جس سے نعم ملتے ہوں۔ جو پرورش کرتا ہو۔

عشق جس کا کام خون خالص پیتے رہنا ہے وہ میرے جگر کے ساتھ مخاطبہ "خداوند نعمت سلامت" سے کرتا ہے

علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں　　مبارک مبارک سلامت سلامت

رغم۔ بینی کے بخاک مالیدن چونکہ یہ فعل اُس کی ذلت اور تحقیر کا باعث ہوتا ہے اس لیئے علی الرغم بمعنی برخلاف ہے۔

شہید وفا ہونا عاشق صادق کے لیے تمغائے امتیاز ہے۔ رقیب سے یہ فعل کب سرزد ہو سکتا ہے۔ لہٰذا برخلاف دشمن یہ مرتبہ شہادت مجھے کو مبارک اور سلامت رہے۔

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی    تماشائے نیرنگ صورت سلامت

اگر معنی و باطن و حقیقت کے جاننے کا سامان نہیں ہے تو نہ سہی مشاہدہ نیرنگی انقلاب عالم کے دیکھنے سے بھی فاعل و جاعل تک ذہن کو رسائی ہو سکتی ہے۔ چاہے کنہ و حقیقت نہ معلوم ہو سکے۔ انقیاد و خضوع و اقرار بالحق تو کم از کم حاصل ہوتا ہی ہے۔

غزل ۳   شعر ا

۵۰غ ۱   مندگئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ    یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

آنکھیں مندگئیں۔ آنکھیں بند ہو گئیں دونوں کے معانی مر گئے۔ بالیں۔ بالیدن سے بال حاصل مصدر و صیغہ امر۔ اور (ین) نسبت سے مرکب ہے۔ بڑھنا اور اونچا ہونا بالیدن کے معنی ہیں۔ بالیں تکیہ کو اس لیئے کہتے ہیں کہ اس سے سر اونچا ہو جاتا ہے اور سرہانے کے بھی معنی ہیں۔

حالت نزع میں تھا ان کے دیکھنے کے لیئے بہ کوشش آنکھیں کھولنا چاہتا تھا مگر جان ہی نکل گئی لوگ اُسے میرے پاس لائے تو مگر ایسے وقت میں جس سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

اس غزل کا یہ ایک ہی شعر ہے۔ چوں کہ اسی مضمون کا ایک شعر ردیف سین مہملہ میں بھی ہے اس لیئے اسے بھی نکال ڈالنا چاہیئے تھا۔ اور وہ شعر یہ ہے۔

مندگئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے    خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

غزل ۴   اشعار ۱۱

۵۱غ ۱۱   آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست    دود شمع کشتہ تھا شاید خط رخسار دوست

خط لحیہ۔ ریش۔ ڈاڑھی۔ بازار کا سرد ہونا۔ کساد بازاری۔ عدم رواج بازار۔ گرم بازاری کا۔ ضد۔ بازار۔ (بادابا) بمعنی سالن۔ اور (زار) کثرت کے لیئے۔ جہاں سالن کثرت سے ہو۔ پھر ہر چیز کی دوکانیں۔

بازار حسن دوست میں داڑھی نکل آنے سے سرد بازاری پیدا ہو گئی ہے یعنی حسن میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ گویا خط دوست بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہے۔ جس طرح شمع کے بجھنے سے نور شمع مفقود ہو جاتا ہے اسی طرح فروغ رخسار یار

ڈاڑھی کے نکلنے سے جاتا رہا۔ تشبیہ میں جدت تو ہے مگر لطف و دلچسپی نہیں۔

اے دل ناعاقبت اندیش ضبط شوق کر　　　　کون لاسکتا ہے تاب جلوۂ دیدار دوست

ناعاقبت اندیش یا عاقبت نیندیش ۔ وہ شخص جو انجام کو نہ سوچے ۔ اشارہ واقعہ طور کی طرف ہے کہ حضرت موسیٰ باوجود پیغمبر اولی العزم ہونے کے جلوہ یار کا تحمل نہ کر سکے چنانچہ خرّ موسیٰ صعقا اُس پر دال ہے تو پھر اے دل تو کیسے تاب لاسکتا ہے۔

اے دل غیر انجام بین ذرا ضبط شوق کر جلوۂ دیدار دوست کی تاب کون لاسکتا ہے۔ پھر تو کیسے متحمل ہوگا جب حضرت موسیٰ نہ برداشت کر سکے۔

خانہ ویران سازی حیرت تماشا کیجئے　　　　صورت نقش قدم ہوں رفتہ رفتار دوست

رفتہ از خود رفتہ ۔ وارفتہ ۔ نقش قدم کو بوجہ قیام ۔ برجا و سکون و سکوت متحیر ۔ اور جلد مٹ جانے کے لحاظ سے فانی کہتے ہیں۔ رفتۂ رفتار از خود رفتہ و بے خود و عاشق و شیدائے خرام ۔ تماشا کردن ۔ دیکھنا۔ خانہ ویران سازی ۔ گھر کا اُجاڑ دینا۔ حیرت ۔ خوش خرامی یار سے جو تحیر پیدا ہوا۔ نقش قدم سے تشبیہ صرف تحیر میں ہے۔

خوش خرامی یار پر مثل نقش قدم حیرت زدہ اور مٹا ہوا ہوں۔ اس حیرت نے مجھ کو برباد پایمال اور خانہ ویران کر دیا۔

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے　　　　کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

بیمار ۔ بیم خوف ۔ آر ۔ آوردن سے امر ۔ اسم و امر مل کر اسم فاعل ۔ بنا ۔ خوف لانے والا۔ مرض والے کو خوف مرگ ہوتا ہے اس لئے مریض کو بیمار کہتے ہیں۔

رقیب کو جو خوبیاں معشوق سے حاصل ہیں اس کا رشک ۔ مجھے مارے ڈالتا ہے۔ اگرچہ بیمار عشق یار ہوں مگر موت کا باعث رشک غیر ہے۔

چشم ما روشن کہ اُس بے درد کا دل شاد ہے　　　　دیدۂ پرخون ہمارا ساغر سرشار دوست

چشم ما روشن و دل ما شاد ۔ فارسی کا مشہور مقولہ ہے۔ کسی کی تکلیف سے بھی اگر کسی کو فرحت ہو مگر اس کی خاطر عزیز بھی ہو تو اس مثل کو اس محل پر بولتے ہیں۔

جناب سید علی محمد صاحب عارف مرحوم نے اپنی آنکھ ڈاکٹر انڈرسن سول سرجن لکھنوی سے بنوائی تو اس واقعہ کی تاریخ ایک قطعہ میں خود کہی جس کے قوافی انڈرسن۔ گلشن وغیرہ تھے۔ مصرع تاریخ یہ فرمایا۔ جناب عارف حضرت انیس کے فرزند جناب نفیس کے نواسے تھے ؎

دل ماشاد و چشم ماروشن

اس مصرع سے ۱۳۲۶ھ نکلتا ہے۔ بہت خوب اور برمحل تاریخ ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ مصرع ثانی کے آخر سے (ہے) محذوف ہے۔

جناب حسرت بھی اس کی تائید میں فرماتے ہیں کہ مصرع ثانی سے (ہے) کا محذوف ہونا نہایت ناگوار ہے۔

یہ کمی اس طرح پوری ہو جاتی ہے ؎

دیدۂ پر خون ہے اپنا ساغر سرشار دوست

یہ ترمیم میری ہے۔ مگر شرح مطبوعہ میں میں نے اس کی نسبت جناب حسرت کی طرف کر دی اس وقت جو دیکھا تو وہ صرف اعتراض کرتے ہیں جس کو میں نے اوپر لکھا ہے۔ اصلاح نہیں فرماتے ہیں۔

ہمارا دیدۂ پر اشک خونیں اُن (دوست) کے لئے اتنا ہی نشاط آور ہے کہ جتنا کسی کے لئے ایک ساغر لبریز مے ہو۔ جب وہ اس سے خوش ہیں تو ہم بھی خوش ہیں۔ کیوں کہ ہم ہمیشہ ان کی خوشنودی کے خواہاں رہتے ہیں۔ اس شعر کے تمام الفاظ باہم نہایت متناسب ہیں۔

## قطعہ

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوار دوست

تا کہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعف دماغ
سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخی گفتار دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجیے سپاس لذت آزار دوست

سر کرنا۔ شروع کرنا فارسی سرکردن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں سر کرنا فیر کرنے کے معنی میں ہے۔
میں تو ہجر یار کی تکلیف میں خود گرفتار ہوں۔ اور وہ میرے جلانے کے لیے اس طرح پرسش حال کرتا ہے جیسے کوئی ہمارا گہرا دوست ہے۔ اور کوئی غم خوار دوست اپنے دوست کی پرسش ہمدردی میں کرے۔
اس پرسش سے اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ہم پر رعب جمائے اور یہ جتائے کہ اس کی دربار یار میں رسائی ہے اور معشوق اس کے کہنے میں ہے۔ اور ہم سے وعدۂ دیدار دلدار بھی کرتا ہے جیسے اس سے ملا ہی تو دے گا۔
جب میں اپنا شکوہ کم زوری دماغ اس سے بیان کرتا ہوں (کہ مجھے ایسی جھوٹی باتوں کے سننے کا دماغ کہاں تو وہ جھٹ ذکر زلف عنبر بار نگار چھیڑ دیتا ہے۔ مشک و عنبر مقوی دماغ ہیں۔ وہ اگر مجھے چپکے چپکے روتے دیکھ پاتا ہے تو ہنس کے (تضحیکاً) شوخی گفتار دوست کا ذکر کرنے لگتا ہے۔
ان باتوں کے بعد اب کوئی بتائے کہ میں اس کے ظلم مہربانی نما کی شکایت کروں۔ یا میں محبوب کے لذت بخش آزار کا شکریہ ادا کروں اور اس کی تعریف کروں۔

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ ہے ردیف شعر میں غالبؔ ز بس تکرار دوست

غالب تخلص تو ہے ہی۔ مگر زیادہ تر کے معنی بھی کہہ سکتے ہیں۔
مجھے اے غالبؔ اپنی یہ غزل دل سے بھاتی ہے۔ اس لیئے کہ اس غزل کی ردیف میں بار بار لفظ دوست آرہا ہے۔ اور دوست سے رغبت کسے نہیں ہوتی۔
جناب نظمؔ نے اس شعر کے ذیل میں کچھ افادہ فرمایا ہے۔ طلاب کی بصیرت کے لیئے پہلے اسے نقل کرتا ہوں اس کے بعد اپنے خیال کا بھی اظہار کروں گا۔
فرماتے ہیں جو لفظ آخر شعر میں بعد قافیہ مکرر آئے اسے ردیف کہتے ہیں۔ قافیوں میں باہم دگر تشابہ اور ردیف میں تکرار ہوتی ہے۔ اور قافیہ رکن شعر ہے۔ اور ردیف مستحسنات میں سے ہے۔ عرب۔ فارس اور ہند میں تعریف شعر یوں کرتے ہیں " کلام موزوں مقفیٰ " اور اہل منطق کلام مخیل کو شعر کہتے ہیں خواہ وزن و قافیہ نہ ہو۔ شعرا کی اصطلاح میں۔ ہر کلام موزوں باقافیہ شعر ہے خواہ تخیل نہ ہو۔ وجہ اختلاف کی یہ ہے کہ منطق یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئی۔ اور یونانیوں میں شعر کے لیئے قافیہ ضروری نہ تھا۔ اگر تخیل میں وزن ہے تو اسے شعر سمجھے اور جو وزن نہ ہوا تو قضیہ شعریہ کہتے تھے۔ ہند و ایران کے شعرا وزن بے قافیہ کو نثر مرجز کہتے ہیں۔ ختم کلامہ
پہلے ردیف کو مکرر از روے لفظ و معنی ہر دو مانتے تھے۔ اس کے بعد صرف تکرار لفظی رہ گئی۔ اور قافیہ معمول کو پہلے معیوب جانتے تھے اور اب ہنر۔

ردیف اور رباعی ایرانیوں کی ایجاد ہے۔ قافیہ تحقق نفس شعر کے لئے نہیں بلکہ مستحسنات میں سے ہے۔ قافیہ کی تعیین بغیر دو اشعار کے نہیں ہوتی۔ ایک ہی شعر جسے فرد کہتے ہیں سامنے آئے۔ تو نہیں کہہ سکتے کہ شاعر کو قافیہ بنانا کس لفظ کو مقصود ہے اس لئے تعریف شعر جناب محقق الطوسی علیہ الرحمہ بہت خوب ہے۔ "کلام موزوں مخیل"۔ مثلاً یہ مصرع ؎

شمار سبحہ مرغوب بہت مشکل پسند آیا

مرغوب مشکل۔ پسند میں سے ہر ایک کو قافیہ قرار دے سکتے ہیں۔

عربی اور اس کے تتبع میں فارسی اور اردو کی کتابوں میں قید قصد بھی لگاتے ہیں۔ تاکہ قرآن کو شعر سے پرے رکھیں۔ کیوں کہ قرآن میں رسالت مآب صلعم کے بارے میں وما علمناہ الشعر وماینبغی لہٗ آیا ہے۔ اور قصد اور عمد کا جھگڑا پیدا کر کے نہ معلوم کیا کچھ کہہ ڈالتے ہیں۔ اگر قرآن میں کلام موزوں مخیل ہے تو اس کے شعر ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ سے کوئی فعل بلا قصد و عمد سرزد ہو سکتا ہے جب کہ ہم سے نہیں ہوتا۔ اس صورت میں اللہ مرید نہیں رہتا۔

میرے نزدیک اگر قرآن میں شعر ماننا مقصود نہیں تو اس پر استدلال یوں ہو سکتا ہے کہ ایک مصرع پر اطلاق شعر نہیں کرتے۔ دو مصرعے جن آیات سے پیش کرتے ہیں ان میں آیت کی قطع برید کر لیتے ہیں۔ پوری ایک یا دو آیتوں سے کوئی شعر قرآن میں مجھے نہیں ملا۔ قطع و برید کر کے تو ہر کلام نثر سے اشعار پیدا کیے جا سکتے ہیں۔

حضرت شمس الدین فقیر دہلوی علیہ الرحمہ۔ نے اپنی کتاب حدایق البلاغہ میں قید قصد کے استدلال میں سخت دھوکا کھایا ہے اور ان کی وجہ سے دوسرے مخالطہ میں پڑ جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہ ملے گا جس سے عمر بھر میں کلام نظم اس کے منھ سے بلا قصد اضطرارا نہ نکل جاتا ہو۔ اس سے لازم آیا کہ ہر فرد بشر کو ہم شاعر کہیں اور یہ بات ظاہر البطلان ہے۔

میر صاحب سے یہ سوال ہو سکتا ہے کہ بحث تو شعر کے بارے میں ہے نہ شاعر کے۔ اگر وہ کلام بلاقصد کلام مفید و موزوں و مخیل ہے تو شعر نہ کہیں گے اور کیا کہیں گے جب کہ ہم کو علم قصداً اور بلا قصد کا بھی نہ ہو۔ ہاں وہ قائل اگر اس کا مثل اسی قافیہ اور ردیف میں نہیں کہہ سکتا تو وہ یقیناً شاعر نہیں۔ لہٰذا ثابت ہے کہ قید قصد و قافیہ شعر میں مہمل اور فضول ہے۔

کلام موزوں مخیل سے بہتر تعریف شعر نہیں ہو سکتی۔ یوروپ والوں نے جو شعر کی تعریف میں دقت نظری سے نزاکتیں پیدا کی ہیں۔ یا۔ انقباض و انبساط کی قید بڑھاتے ہیں یہ تعریف شعر میں داخل نہیں۔ ان کو محسنات اور تاثیر

شعر میں شمار کر سکتے ہیں۔

اہل منطق جب وزن کو ذاتیات شعر میں داخل نہیں کرتے تو پھر مابہ الامتیاز درمیان نظم و نثر کیا شے ہوگی۔ اگر محض اصطلاح ان کی ہے تو کوئی اعتراض نہیں لامشاھد فی الاصطلاح مگر نظم اور نثر میں افتراق وزن اور غیر وزن ہی سے ہوتا ہے۔ تخیل تو ہر کلام مفید میں اچھی ہو یا بری ضرور ہوا کرتی ہے اس کے لیئے وزن ضروری نہیں۔

وزن بے قافیہ والی عبارت کو نثر مرجز کہتے ہیں سب۔ سے پہلے دھوکا حضرت غالبؔ کو ہوا۔ چنانچہ انہوں نے ایک خط ہی نثر مرجز میں لکھ ڈالا۔ اور نثر مرجز کو اقسام نثر میں داخل کرنے کی غلطی اگلے لوگوں سے ہوئی۔ یہ کوئی قسم نثر نہیں ہے بلکہ مرجز ایک صنعت ہے جو نظم و نثر دونوں میں صرف کی جاسکتی ہے۔

اہل فن نے نثر مرجز کی تعریف یوں لکھی نثر مرجز آنست کہ وزن دارد و قافیہ ندارد۔ جناب غالبؔ وزن سے وزن بحر سمجھے حالاں کہ وزن حرفی یا وزن عرضی مراد ہے۔ جیسے سالک و ناصر و قابل وغیرہ سب بلحاظ وزن صرفی بروزن فاعل ہیں اور بلحاظ وزن عروضی بروزن فعلن ہیں اور آپس میں قافیہ نہیں۔ وزن بحر سے اسے تعلق نہیں۔

## مثال نثر مرجز

نثر میں یہ لکھتے ہیں۔ خیال ناظم بے تعلق قامت ذکر یائے ناموزونست۔ و قیاس ناشر بے تمسک کاکل مومیائے نامربوط۔ (خیال۔ قیاس) (ناظم۔ ناشر) (بے تعلق۔ بے تمسک) (قامت۔ کاکل) (دلربائے۔ مومیائے) (ناموزوں۔ نامربوط) سب باہم دگر ہم وزن بوزن صرفی یا عرضی ہیں۔ مگر وزن بحر اور قافیہ دونوں جملوں میں نہیں۔ یہ وزن تعریف نثر مرجز میں مقصود ہے۔ اور بس۔

چوں کہ مرجز ایک صنعت ہے لہٰذا نظم میں بھی آسکتی ہے۔ حضرت خاقانی اپنے ایک قصیدہ میں فرماتے ہیں۔

## مثال صنعت مرجز در نظم

رشک نظم من خورد حسان ثابت را جگر   دست نثر من زند سحبان وائل را قفا

وزن بحر رمل مثمن محذوف بروزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔ اور صنعت مرجز کے وزن میں (رشک۔ دست) (نظم۔ نثر) خورد۔ زند (سحبان۔ حسان) (ثابت۔ وائل)۔ جگر۔ قفا۔ یہ سب الفاظ ہیں۔ یعنی وزن صرفی و عروضی ان میں پایا جاتا ہے۔ جیسے رشکِ۔ دستِ بروزن فعلُ ہیں۔ اور نظمِ۔ نثرِ بھی بروزن فعلُ۔ (خورد۔ زند) بروزن فَعَلُ۔ ایسے اوزان کے ساتھ ہم وزن تو ہیں مگر نہ وزن بحر ہے اور نہ باہم قافیہ۔

جناب۔ غالب کے بعد شمس العلما جناب۔ حالی نے اپنے استاد کا تتبع کر کے بلینک ورس اور نثر مرجز کو ایک چیز سمجھا اور جناب نظم بھی اس مغالطہ میں پھنس گئے۔ حالاں کہ اوزان ان الفاظ کے اور ہیں اور وزن بحر قصیدہ اور ہے —

افلاطون کا مقولہ ہے اذا ثنی ثلث۔ جس کام کو دو مرتبہ کیا ہے تیسری مرتبہ بھی ضرور کرو تاکہ اس میں استحکام پیدا ہو جائے۔ غالب و حالی و نظم کی ایسی قابل قدر ہستیاں جب نثر مرجز میں وزن بحر ملانتے ہیں۔ تو یہ فیصلہ گویا متفقہ ہو چکا۔ میرے ترہات ان کے فیصلہ کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھتے ہیں خصوصاً مخالفت میں۔ میرے اختلاف کا نتیجہ سوا مطعون ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

# باب جیم ابجد

غزل ۱ اشعار ۳

گلشن میں بند و بست بنوع دگر ہے آج ۔۔۔ قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

گلشن۔ گل اور کلمہ (شن) نسبت ہے مثل (رشن) مرکب ہے۔ یہ میں لکھ چکا ہوں کہ کلمات نسبت فارسی میں کثیر ہیں۔ جیسے (اد۔ نگ۔ شن۔ ن وغیرہ)۔ بنوع دگر یعنی گھر والے بھی گھسنے نہیں پاتے۔ بہت بڑا آدمی جب مہمان آتا ہے تو سوا اعلی منصب والوں کے اوروں کو اجازت دخول نہیں ہوتی ہے۔ حلقۂ بیرون در۔ باہر والے دروازے کے پٹ پر ایک گتل لوہے کا جڑا ہوتا ہے اور اس کے پاس ایک زنجیر۔ آنے والا اس زنجیر سے اس حلقہ آہن کو کھٹ کھٹاتا ہے۔ اس کو دق الباب کہتے ہیں۔ چوں کہ یہ حلقہ گھر سے باہر ہوتا ہے۔ اس لیئے جو شخص کہ باہر ہو اس کو حلقہ بیرون در سے تشبیہ دیتے ہیں۔ قمری اور فاختہ کے گلے میں ایک سیاہ حلقہ ہوتا ہے اسے حلقہ بیرون در کہہ کر خود قمری کا بیرون باغ رہنا تجویز کیا ہے۔

آج گلستان میں محبوب آیا ہوا ہے یا آنے والا ہے۔ اس لیئے باغ کے رہنے والوں کی بھی ممانعت ہے جن میں قمری بھی ہے وہ بھی حلقہ بیرون در کی طرح پھاٹک سے باہر ہے اس کو بھی باغ میں آنے کی اجازت نہیں۔ تو پھر بے چارہ عاشق کی وہاں رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ ۔۔۔ تار نفس کمند شکار اثر ہے آج

فغان بضم نالہ و فریاد۔ مگر بلند تراز نالہ۔ ایرانیوں کے لہجہ میں بکسر اول ہے اور افغان کا مخفف ہے۔ صاحب بہار عجم کہتے ہیں بمعنی ناقوس تھا کیوں کہ فغ بمعنی بت جیسے فغفور میں اور (ان) نسبت کا مگر معنی ناقوس اس سے مہجور ہو کر صرف آواز بلند ناقوس سے مشابہت کی وجہ سے نالہ بلند کے معنی رہ گئے۔ چوں کہ افغان میں (ف) ساکن ہے لہٰذا اذا حرکت حرکت با لکسرہ کی بنا بر فغان کو بالکسر ہی ہونا چاہیے۔ مگر زبانوں پر بالضم ہی ہے۔

تارنفس شکار اثر کے لئے آج کام دام کا کر رہے ہیں مگر تاثیر فغان کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر تار نفس کے ساتھ ایک ٹکڑا دل کا باہر نکل آتا ہے۔ لیکن اثر فغاں محبوب پر ذرا بھی نہیں۔ ان دونوں اشعار کا تخیل چاہے کتنا ہی بلند ہو۔ مگر ان دونوں اشعار میں دل کشی مطلق نہیں۔

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل　　سیلاب گریہ در پے دیوار و در ہے آج

اے آرام و سکون یہاں سے نکل جاؤ اور اے انتظام و درستی حالات یہاں سے چل دو کیوں کہ گریہ کا سیلاب کثیر آج در و دیوار کے ڈھا دینے پر آمادہ ہے۔

آرام و عافیت و انتظام فراق یار میں کہاں جبھی تو رونا آ رہا ہے۔ جو چیز ہے ہی نہیں وہ کنارہ کیا کرے۔

---

غزل ۲　شعرا

لو ہم مریض عشق کے تیمار دار ہیں　　اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

تیمار دار، جو مریض کی دیکھ بھال اور خدمت کرے۔ تیمار۔ غم۔ خدمت۔ محافظت۔ تیمار دار۔ غم خوار۔ محافظ۔ خدمت گذار۔ جناب حسرت و نظم دونوں نے بیمار دار اختیار کیا ہے۔ یہ بھی تقریباً تیمار دار کا مترادف ہے۔

جناب حسرت نے جس طرح غزل ؎

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا

میں شعر ذیل ؎

جراحت تحفہ الماس ارمغان داغ جگر ہدیہ　　مبارک باد اسد غم خوار جان درد مند آیا

ملا دیا تھا اسی طرح اس شعر کو بھی اس غزل میں ملا دیا جس کی ردیف "آج" ہے۔ حالاں کہ آج والی غزل کے قوافی در اور اثر ہیں۔ اور آج ردیف ہے۔ اور اس شعر متفرد میں علاج قافیہ اور ردیف ندارد۔ وہ سہواً آج اور علاج کو قافیہ سمجھ گئے۔ چوں کہ اس شعر کا ثانی نہیں ہے اس لئے "مسیحا" کو بھی اور "کیا" کو بھی قافیہ ٹھہرا سکتے ہیں

اور باقی کو ردیف۔ مسیحا۔ ایرانی بجائے مسیح لاتے ہیں۔ اور جی چاہتا ہے تو الف کو ندا کا بھی ٹھہرا لیتے ہیں۔ کیا علاج یعنی حضرت مسیح کا بھی علاج کچھ مفید نہ ہوگا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ ان کی کیا سزا۔

اے ناصحین اچھا ہم مریض عشق کے تیماردار بنتے ہیں۔ اگر اس کا علاج حضرت مسیح بھی نہ کر سکے تو پھر کیا تدبیر کی جائے گی یا ان کو کیا سزا ملے گی۔ غرض کہ مرض عشق کو لاعلاج کہنا مقصود ہے۔

---

# ردیف جیم فارسی

## آج کل کے جدت پسند اس کا نام چیم رکھنا چاہتے ہیں

غزل ۱ — اشعار ۶

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ　　اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ　　۵۸غ ۶

انتظار کھینچنا۔ فارسی محاورہ انتظار کشیدن کا ترجمہ ہے مگر کرنے کے ساتھ اردو میں زیادہ اور کھینچنے کے ساتھ کم تر بولتے ہیں۔ انجمن و بزم میں لوگوں کا مجمع ہوتا ہے اس لیے بطور معنی لازمی بمعنی کثیر لاتے ہیں۔ شراب و مے و ساغر کشیدن شراب پینے کے معنی میں فارسی ہی کا محاورہ ہے اردو میں "پینا" کے ساتھ بولتے ہیں۔

کوئی سانس بھی آرزو ہائے کثیر سے خالی نہ ہو۔ اگر شراب میسر نہیں تو انتظار ساغر کر۔

جناب حسرت۔ نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ یعنی ترک آرزو نہ کر۔ اگر شراب نہیں ہے تو انتظار ساغر ہی سہی۔ بہر حال ترک آرزو نہ کر۔

جناب نظم۔ اگر شراب کھینچنے کو نہیں ملتی تو اس کا انتظار ہی کھینچ۔ دونوں بزرگوں نے مصرع ثانی کی تشریح نہ فرمائی اس کے الفاظ نثر کر کے رکھ دیئے۔

انتظار ساغر کھینچ کا کیا مطلب ہوگا۔ جب شراب میسر نہیں تو خالی ساغر اگر مل بھی جائے تو اسے لے کر کیا کریں گے۔ اگر ساغر کھینچ کے معنی ساغر پی کہیں تو پییں، کیا خاک شراب تو میسر نہیں ہے۔ پھر لفظ انتظار ساغر پینے کے معنی کو مانع ہے۔ بہر طور دونوں نے سلجھایا نہیں اور میں عاجز۔ بغیر استعارات مجھ سے معنی نہیں بنتے۔ مثلاً اگر شراب وصال یار میسر نہیں تو انتظار ساغر دیدار نگار ہی کر۔ بہر طور آرزوؤں سے خالی مزہ۔ یا مثل اس کے کوئی اور بہتر استعارات ہوں اسے کلام غالب کے سمجھنے والے جانیں۔ میں نے تو جوا ڈال دیا ہے۔

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ          برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

گرمی = مستعدی۔ تیزی۔ محنت شاقہ۔ آئینہ = مراد دل۔ پہلے مصرع میں چار اضافتیں ہیں۔ ماہرین تین کی اجازت دیتے ہیں وہ بھی بکراہت ورنہ دو۔ ایک اضافہ بہتر ہے۔ آئینہ = سے مراد آئینۂ فولادی کیوں کہ جوہر اسی میں ہوتے ہیں۔

معشوق کا دیدار حاصل کرنے میں جس سعی تلاش اور مستعدی و انہماک سے کام لے رہا ہوں اسے کچھ نہ پوچھو کیوں کہ وہ بیان سے باہر ہے۔ میرے دل کے آئینہ میں بجائے جوہر خلش حصول مراد کے کانٹے چبھ رہے ہیں ان کانٹوں کو نکال۔ واو عطف درمیان سعی و تلاش اس ثقل کو دور کرتا ہے۔

جناب حسرت و نظم دونوں حسرت دیدار کا آئینہ تجویز فرماتے ہیں۔ اور جوہروں کے بدلے اس آئینہ حسرت دیدار میں خار قرار دیتے ہیں۔ جناب حسرت یہ بھی فرماتے ہیں کہ زیادہ تلاش اور دوڑ دھوپ میں سائل کے پاؤں میں کانٹے گڑ جایا کرتے ہیں۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ حسرت دیدار کے آئینہ میں جو کانٹے بجائے جوہر ہیں وہ تگاپوے و جستجوئے حسرت دیدار میں گڑ رہے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل          کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

اشارہ = ایما۔ حکم۔ ناز = یہاں مراد احسان ناز کھینچنا بھی اردو نہیں ناز کشیدن کا ترجمہ ہے۔

اے دل تو جو بستر پر پڑے پڑے انتظار آمد یار کر رہا ہے یہ تیرا راحت طلبی کے لیئے صرف ایک بہانہ ہے۔ ورنہ تجھے کس نے حکم دیا ہے کہ تو احسان بستر اٹھائے۔ وصال یار کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔ یا جان کیوں نہیں دے دیتا۔ وہ تو آنے کے نہیں۔

جناب حسرت کا ارشاد ہے کہ حاصل یہ ہے کہ اے دل تیری راحت کے لیئے میل خواب اور ناز کشی کے بجائے انتظار یار کافی ہے۔

تری طرف ہے بحسرت نظارۂ نرگس          بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

ساغر کھینچ = پھر وہی ساغر کشیدن کا ترجمہ ہے اردو میں ساغر پینا بولتے ہیں۔

جناب حسرت بکوری دل و چشم رقیب یعنی علی الرغم عدو۔ خلاف خواہش نرگس جو تجھے بے تکلف مصروف

ے نوشی دیکھنا چاہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نرگس تیری طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہی ہے اس لئے تجھ کو چاہیئے کہ تو باغ میں اس طرح بے تکلف شراب نوشی میں مشغول نہ ہو۔ نرگس کو اس کی نگاہ حسرت کی وجہ سے اپنا رقیب قرار دیا۔

جناب نظم۔ نرگس جو حسرت تیری طرف دیکھ رہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تو شراب کیوں نہیں پیتا۔ کاسے کو رقیب کور دل و کور چشم سے ڈرتا ہے۔ یہ دونوں باتیں نرگس کی دو صفتوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی آنکھ بے نور ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے ساغر سے مشابہت ہے۔

نرگس سے مراد نرگس عبہر ہے نہ شہلا۔ جس کی بیچ کی کٹوری کی پتیاں زرد رنگ کی اور ان کے گرد سفید پتیاں ہوتی ہیں۔ ان سپید کو شیشہ کے ساغر اور آن زرد کو شراب (وہسکی) سے تشبیہ دیتے ہیں۔ (ب) بمعنی برائے۔ یا بیاد۔ کسی کی یاد میں شراب پیتے ہیں جسے انگریزی میں TO TOAST کہتے ہیں۔ اور زبان حال فارسی میں تُست کردن مفرس کرلیا ہے۔ رقیب سے مراد۔ غیر۔ دشمن۔ عدو۔ نرگس حسرت کے ساتھ محبوب کا منھ تک رہی ہے کہ یہ ہمارا جام شراب کیوں نہیں پیتا۔ اس لیئے تمنا کرتی ہے۔ کہ بیاد کوری دل چشم عدو ہمارا ساغر پی لے۔ (یعنی دشمن کو دل اور چشم دونوں کا اندھا کر دے۔)

## بہ نیم غمزہ ادا کر حق ودیعت ناز　　　نیام پردۂ زخم جگر سے خنجر کھینچ

ودیعت = امانت۔ ودیعت ناز = خنجر ناز جو جگر میں چھپا ہوا ہے اور بطور امانت رکھا ہے اس پر نکال ڈالنے کا تصرف نہیں کیا ہے۔ زخم جگر کو نیام خنجر ناز سے استعارہ کیا ہے۔ ودیعت = کسی چیز کا کسی ایسے شخص کے پاس رکھنا کہ وہ سزاوار تصرف ہو بوجہ حفاظت ساتھ ہی ملک مالک بھی باقی رہے۔ اس میں اور امانت میں فرق یہ ہے کہ استحفاظ بالقصد کو ودیعت کہتے ہیں۔ اور امانت وہ ہے جو کسی کے ہاتھ بلا قصد لگے۔ جیسے گرا پڑا مال۔ اور تعریفات سید شریف میں ودیعت اس امانت کا نام ہے، جو حفاظت کے لیئے کسی کے پاس رکھی جائے۔ غمزہ = ادائے چشم محبوب جو اشارہ یا خوب آنکھ کھول کر نہ دیکھنے میں پائی جاتی ہے۔ ناز = استغنا، معشوق جو شوق عاشق کے برانگیختہ کرنے کے لیئے معشوق سے ظہور میں آئے۔ تیرے ناز جو میرے جگر میں بطور امانت ہیں اور خنجر کی طرح چبھتے رہتے ہیں اور زخم جگر اس کے لیئے بمنزلہ نیام ہے۔ سامنے آکر غمزہ ہائے چشم سے اس خنجر کو نکال کر اور آرزوئے دیدار پوری کر۔ اس امانت داری کا حق یوں ہی ادا ہو سکتا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ خنجر کو الف اور ہمزہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ لفظ نیام سے الف خوب صورت خنجر ہے اسے نکال ڈالیں تو "نیم" رہ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے نیم غمزہ کہا۔

مجھے "پردہ" کا لفظ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشیں پنہاں　　　　بروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

صہبا شراب سرخ رنگ انگوری۔ آتشیں۔ بوجہ سرخی رنگ وحرقت یہ لفظ لائے۔ صہبائے آتشیں مراد شراب عشق۔ قدح۔ بڑا پیالہ مراد دل۔ سفرہ بضم دسترخوان اور عربی میں بمعنی طعام مسافر۔ اُردو میں دہن مقعد کو کہتے ہیں اس معانی کی کراہت سے بچنے کے لیے بفتح بمعنی دستارخوان بولتے ہیں۔ لفظ عربی ہے اور اس کی جمع سُفَر لاتے ہیں۔ قدح بفتحیں پانی پینے کا ظرف۔ صاحب لغت منجد کہتے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے دونوں کے لئے بولتے ہیں۔ ظرف خالی کو قدح اور پر از شراب کو کاس کہتے ہیں۔ سمندر۔ ایک چوپایہ جو آگ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی تشریح گذر چکی۔ برسفرہ کباب۔ یا۔ طعام کشیدن فارسی کا محاورہ ہے۔ دسترخوان پر کھانا رکھنا۔ اُردو کا یہ محاورہ نہیں۔ رکھنا بولتے ہیں۔ لگانا اور چننا بھی مستعمل ہے۔

میرے جام دل میں شراب آتشیں عشق بھری ہوئی ہے۔ لہٰذا دل سمندر کے کباب بھی دستارخوان پر لگانا چاہئیں۔ اس مضمون نے کیا لطف پیدا کیا۔

---

# ردیف دال مہملہ

غزل ۱　　　　　　　　　　　　　　　اشعار ۹

۵ب غ　حُسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد　　　　بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

اہل جفا مراد معشوق۔ کشاکش کش مکش۔ چھینا جھپٹی۔

میرے مرجانے سے معشوق کو غمزہ سے کام لینے کی ضرورت نہ رہی۔ کیوں کہ میرے بعد اس کا اُٹھانے والا کوئی نہ رہا

المختصر اب وہ یار جفاکار ستم شعار آرام سے ہے۔

اہل جفا۔ کل معشوق۔ اور اگر اہل بمعنی سزاوار کہیں تو محبوب مخصوص بھی مراد ہو سکتا ہے۔ مگر (ہیں) کی وجہ سے کل حسین مراد ہیں۔

حضرت میر کی غزل بھی اس طرح میں ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

کے سجادہ نشین قیس ہوا میرے بعد | نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا | ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

منصب ۔ جائے نصب ۔ عہدہ ۔ شیفتگی ۔ عشق و مدہوشی و دیوانہ مزاجی و ولہ و تحیر ۔ معزولی ۔ بیکاری ۔
میرے بعد جب عہدہ عشق کا کوئی سزاوار نہ رہا تو ناز و ادائے معشوق بھی بے کار ہو گئے ۔ کیوں کہ میں ہی اُن ناز و
ادا کا متحمل ہوا کرتا تھا ۔

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے | شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

شمع ۔ موم مجازاً موم یا چربی یا کافوری بتی کیوں کہ شمع انھیں چیزوں سے بنتی ہے ۔ شمع جب بجھتی ہے (کشتہ ہوتی
ہے کہ وہی اس کے لیے موت ہے) تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے ۔ اسی طرح میرے مرنے کے بعد شعلہ عشق بھی
سیہ پوش میری سوگواری میں ہوا ۔ کیوں کہ اس کے لیے اب کوئی محل قیام نہ رہا ۔ عاشق صادق میں ہی تھا ۔

خون ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی | اُن کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

یعنی ۔ ویسا ہی ہے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں (میرا) صاف اور سادہ لفظ موجود تھا ۔
حسینوں کی حالت پر میرا دل قبر میں بھی سراسر خون ہو رہا ہے ۔ کیوں کہ میرے مرنے کے بعد اُن کو اپنے
ناخون رنگنے کے لیئے مہندی کی ضرورت پڑی ۔ ورنہ میری زندگی میں میرے خون کی مہندی لگایا کرتے تھے ۔

در خور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا | نگہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

در خور ۔ سزاوار مناسب فارسیت کی وجہ سے لائے ورنہ (لائق) صاف اور سادہ لفظ موجود تھا ۔
عرض ۔ پیش کرنا ۔ مراد بیان ۔ جوہر کے ساتھ کئی جگہ یہ لفظ لائے ہیں ۔ بلکہ جوہر اسی کی وجہ سے صرف کیا ۔ ورنہ اس کی
ضرورت نہ تھی ۔ حالاں کہ عرض بمعنی بیان بسکون ثانی ہے ۔ اور بمقابل جوہر بفتحتین ہے ۔ ہاں ایک توہم عرض مقابل
جوہر کی طرف عرض اور جوہر کے جاننے والے کو ضرور پیدا ہو جاتا ہے ۔ جوہر بیداد سے مراد نگاہ سرمگیں ناز کیونکہ
دل عاشق پر ایسی نگاہ ظلم ڈھاتی ہے ۔ سرمہ ۔ کحل ایران میں کاجل نہیں ہوتا جو آنکھ کو بہ نسبت سرمہ زیادہ حسین
بنا دیتا ہے ۔ کیوں کہ کاجل کی اتنی گہری سیاہی سرمہ میں نہیں ہوتی ۔ اسی وجہ سے گوری کی آنکھ کا کاجل ہند میں مشہور ہے ۔
میرے فضولیات کو ناظرین معاف فرمائیں گے ۔ جا این مجملہ اعراض تسعہ ایک عرض بھی ہے ۔

جوہر بیداد کو اپنے تئیں دکھانے کو کوئی جگہ نہ رہی۔ کیوں کہ میں ہی اس نگاہ سرمگیں کی بیداد برداشت کیا کرتا تھا۔ لہٰذا میرے مرنے کے بعد نگہ ناز حسینان سرمہ سے خفا ہے اور وہ یہ زینت و آرائش نہیں کرتی۔ لزوماً یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ حسینان جہاں میرے سوگ میں ہیں۔

ہے جنوں اہل جنوں کے لیئے آغوش وداع　　چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

جنون کا آغوش وداع کے ساتھ استعارہ کرنے میں وجہ شبہ نہ معلوم ہوئی۔ مگر یہ کہ کہیں جنون کو ایک شخص قرار دے کر اس کے لیے آغوش تجویز کی۔

اہل جنون کے لیئے جنون خود آغوش وداع ہے یعنی اُن سے رخصت ہو رہا ہے۔ گویا گریبان اور چاک گریبان میں جدائی ہو رہی ہے۔ (کیوں کہ سزاوار جنوں صرف میری ذات تھی) حالانکہ جنون اور اہل جنون میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میرے بعد گریبان کا چاک کرنے والا کوئی نہ رہا صرف میں تھا۔

کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق　　ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد

صلا کھانے کے لیے بلانا۔ "میں صلا" کی جگہ۔ "یہ صدا" صاف ہے۔ یا "کی صلا" ہو۔ "میں صلا" اچھا نہیں۔ صلا مطلق صدا کو بھی کہتے ہیں۔

میرے بعد ساقی بار بار آواز لگاتا ہے کہ شراب مردافگن عشق کا کون حریف ہوتا ہے ایک میں تھا سو نہ رہا۔ تو بولے کون۔

جناب، حالیؔ یادگار غالب میں اس شعر کے یہ معنی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"کون ہوتا ہے اسے ایک مرتبہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے۔ جب کوئی اس شراب مردافگن عشق کے لیئے پر آمادہ نہیں ملتا ہے۔ تو پھر کون ہوتا ہے"

کہ پھر ساقی مایوسی کے لہجہ میں اس جملہ کو دوہراتا ہے۔ کون ہوتا ہے یعنی کوئی نہیں ہوتا ہے۔

جناب نظمؔ فرماتے ہیں کہ اس شعر کے معنی میں لوگوں نے زیادہ تدقیق کی ہے۔ مگر وہ جادۂ مستقیم سے خارج ہے۔ لیکن خروج از استقامت کی وجہ نہ تھی۔ یہ اشارہ معنی خالی کی طرف ہے۔

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی　　کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

یہ شعر یوں بھی ہو سکتا ہے ؎

مرگیا غم سے پر اتنا نہیں دنیا میں کوئی — جو کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

معنی شعر غالب: مجھے دنیا میں کوئی اتنا نہیں دکھائی دیتا جو میرے مرنے کے بعد مہر و وفا کو پرسا دے کہ تمہارا پوچھنے والا نہ رہا۔ یعنی مرنے سے پہلے یہ غم مجھے مارے ڈالتا ہے۔

میں نے جو ترمیم کی ہے اس کے معنی:

میں تو مرگیا۔ اور میرے ساتھ وجود مہر و وفا بھی نہ رہا۔ کیوں کہ ان کا انحصار میری ذات پر موقوف تھا۔ مگر اب کوئی اتنا بھی دکھائی نہیں دیتا کہ مہر و وفا کی کوئی تعزیت کرے اور سوگ رکھے۔ (عامل مہر و وفا ہونا تو درکنار) کہ جو ضمنا سوگ عاشق یا وفا کا بھی ہوگا۔

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالبؔ — کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

سیلاب بلا۔ مصائب کا سیلاب۔ یا عشق ہی کو سیلاب بلا کہا ہے۔

میرے مرنے کے بعد عشق کا پوچھنے والا کوئی نہ رہا۔ اس کی بے کسی اور کس مپرسی پر مجھے رونا آتا ہے کہ اب میرے مرنے کے بعد یہ سیلاب بلا (عشق) کہاں ٹھکانے لگے گا۔

---

# ردیف الراء القرشت

اشعار ۱۰

غزل ۱

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار — نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار — بیغ ۱

اگر میرے اور محبوب کے درمیان در و دیوار حائل ہیں تو ہوا کریں۔ مجھے کیا پروا ہے میری نگاہ شوق کی پرواز کے لیئے یہ تو بال و پر کا کام کرتے ہیں۔ شوق کے ہوتے کوئی چیز مانع نہیں ہوسکتی۔

وفور اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ — کہ ہوگئے مرے دیوار و در در و دیوار

دیوار و در در و دیوار ہو گئے در ڈھو ہوکر دیوار بن گیا۔ اور دیوار گر کے در ہوگئی یعنی کسی کے لیئے مانع آمد و رفت نہ رہی۔ کیوں کہ کثرت سیلاب اشک نے دونوں کو ڈھا دیا۔

کاشانہ ۔ خانہ کوچک و محقر۔ جھونپڑا۔ کلبہ HUT و COTTAGE ۔

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نوید مقدم یار　　　گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

نوید بضم مژدہ ۔ خوش خبری۔ مقدم ۔ مصدر میمی از قدم ۔ آمد

مژدۂ آمد یار سن کر اس کی پیشوائی کے لیئے چند قدم در و دیوار آگے بڑھ گئے ہیں تو اب ہمارے ہاں سایہ کہاں سے آئے۔ ویرانی خانہ کا بیان ہے۔ اور کاف علت یا بیان کا ہے۔

ہوئی ہے کس قدر ارزانی مے جلوہ　　　کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر در و دیوار

ارزانی ۔ بہتات ۔ کثرت ۔ سستا ہونا ۔ ضد گرانی ۔ در و دیوار ۔ مراد ہر کس و ناکس ۔ تم نے مے جلوہ کو کس قدر سستا کر دیا ہے کہ در و دیوار تک مست ہو ہو کر گھوم رہے ہیں۔

جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ　　　کہ ہیں دکان متاع نظر در و دیوار

متاع ۔ ہر وہ شئے جو احتیاج دنیوی میں مفید ہو۔ امتعہ جمع و امتیع جمع الجمع ۔ سودا ۔ بمعنی خرید و فروخت و تجارت ترکی ہے ۔ مصنف فرہنگ انجمن آرا سوداگر کو فارسی مان کر سود بضم بمعنی نفع اور گر علامت فاعلی سے اسے مرکب فرماتے ہیں ۔ مگر الف درمیان میں کیسا ہے اس سے تعرض نہیں کرتے۔

اگر تجھے منتظرین (عشاق) کے انتظار کے سودے اور مال کی خریداری منظور ہے اور اس کا اندازہ لگانا چاہتے ہو تو آؤ۔ نظر کے مال و متاع کی دکان در و دیوار پر لگی ہوئی ہے ۔ شدت و کثرت انتظار دکھانا منظور ہے۔

درپہ ۔ نظر انتظار کی دکان کا لگنا تو ٹھیک ہے ۔ مگر دیوار پر دکان نظر انتظار کے معنی میں نہ سمجھا کیا ہوائی جہاز یا اوڑن کھٹولے سے آئیں گے ۔ قاصد چوں کہ آدمی اور کبوتر دونوں کو مانتے ہیں ۔ اس لیئے قاصد کے ساتھ در و دیوار کا ذکر مناسب ہوتا ہے ۔

جو آر ہا مرے ہمسایہ میں ۔ تو سایہ سے　　　ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

جب وہ میرے ہمسایہ میں آکر بسا تو میرے گھر کے در و دیوار اس کے گھر کے در و دیوار پر بوساطت سایہ قربان اور نثار ہو رہے ہیں۔

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

آنکھوں میں۔ نگاہ میں۔ نظر میں کسی کا کھٹکنا۔ اس چیز کا ناگوار طبع ہونا۔ بن بمعنی بغیر اب متروک ہے۔

بغیر تمہارے مجھے اپنے گھر کی آبادی پھوٹی آنکھوں نہیں بھاتی۔ میں ہمیشہ در و دیوار دیکھ کر رو دیا کرتا ہوں کہ یہ آباد گھر تمہارے نہ ہونے سے ویران کیوں نہیں ہو جاتا۔

نہ پوچھ بیخودی عیش مقدم سیلاب کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

سیلاب کی آمد کی خوشی میں جو مجھے بے خودی ہو رہی ہے (اپنے آپے سے باہر ہوں) اسے کچھ نہ پوچھو بیان سے باہر ہے۔ حتیٰ کہ فرط نشاط سے کل در و دیوار رقص کر رہے ہیں۔ بہت اچھا ہو گا کہ سیلاب آ کر ان کو ڈھا دے۔ دیواروں کے متزلزل اور جنبان ہونے کو رقص کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ اور رقص سے تفریح ہوا کرتی ہے۔

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانہ میں حریف راز محبت مگر در و دیوار

اے غالب کسی اور سے اپنا راز نہ کہہ کیوں کہ راز محبت کا حریف و قابل اعتماد سوا در و دیوار کے اور کوئی نہیں۔ اگر کہنا ہی ہے تو در و دیوار سے کہہ۔ وہ ناطق و گویا نہیں اس لئے افشا نہیں کر سکتے۔ ان سے کہنا نہ کہنے کے برابر ہے۔ عقلا نے تاکید اخفاء راز میں کہا ہے کہ تنہائی میں بھی راز منھ سے نہ نکالو۔ کیوں کہ دیوار ہم گوش دارد۔

ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

جب بھی میں نے گریہ شدید کے ساتھ رونے کا سامان کیا تو ہمیشہ میرے پاؤں پر در و دیوار خوشامد میں گر پڑے کہ خدا کے لئے نہ رونا۔ ادھر تم روئے اور ہمارا وجود ندارد ہوا۔ صرف سامان گریہ ہی دیکھ کر

در و دیوار گر پڑتے ہیں۔
اس ٹیڑھی ردیف میں کوئی بھی اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہے۔

---

غزل ۲ اشعار ۹

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

پہلے مصرع میں ردیف کو حشو اور زائد ہی کہہ سکتے ہیں۔
جب تیرے در پر میں نے اپنا گھر بنا لیا۔ یعنی دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ کیا اب بھی تو بغیر بتائے میرے گھر کو نہ جانے گا اور پتا (پتہ) بتانے کی ضرورت ہوگی۔

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر

جب میں بولنے پر قادر نہیں اتنا کمزور ہو گیا ہوں تو کہتے ہیں کہ کوئی کسی کے دل کی بات کو بغیر کہے کیسے جانے۔ اور مجھ میں طاقت کلام نہیں پھر کہوں کیسے۔ یہ ان کی شوخی اور ڈھٹائی ہے ورنہ وہ میری حالت سے بخوبی واقف ہیں۔

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

جہان۔ بکسر جیم اسم حالیہ جستن کا ہے۔ چونکہ دنیا کو زمان سے خاص تعلق ہے اور زمان کو قیام نہیں اسی طرح جہان کو قیام نہیں اس لیئے دنیا کو جہان کہتے ہیں۔ اور کسرہ فتحہ سے بوجہ کثرت استعمال بدل گیا۔ جناب حسرت نے لیوے اور جناب نظم نے کہوے اختیار کیا ہے اب دونوں متروک ہیں ان کی جگہ (کہے۔ یا۔ لے) بولتے ہیں۔ چونکہ ردیف میں "کہے" خود ہی ہے۔ اور بولتے نام لینا ہی ہیں۔ میرا معاملہ ایسے سے آپڑا ہے کہ دنیا میں جو شخص اس کا نام لیتا ہے تو نام کے ساتھ ستم گر بھی لگا لیتا ہے پھر ستم گر سے کسی بھلائی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

جی میں ہی لکھنو میں جی ہی میں بولتے ہیں یعنی (ہی) حرف تخصیص اسم کے ساتھ لگاتے ہیں نہ میں کے بعد۔

ہمارے دل میں اس کے طرف کی کوئی برائی نہیں ہے ورنہ چاہے جان بھی جاتی رہتی۔ تب بھی بغیر صاف صاف کہے ہم نہ رہتے۔ کیوں کہ ہم سچے ہیں اور لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ مگر ہم تو ان کی کسی بری بات کو بھی دل میں نہیں رکھتے ہیں۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا　　　چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

کافر بکسر فا عربی میں ہے مگر ایرانی بفتح فا بولتے ہیں اور اثرا ور دلبرا ور نظر وغیرہ کے قوافی میں لاتے ہیں اور اہل ہند بھی ایرانیوں کا تتبع کرتے ہیں۔ چھوڑنے کی تکراریوں دور ہو سکتی ہے ؎

چاہے رہے نہ لاک۔ مجھے کافر کہے بغیر

مخلوق مجھے کافر ہی کیوں نہ کہے میں اس بت کافر کی پرستش کبھی نہیں چھوڑ سکتا یہ فخر میرے لیئے کیا کم ہے کہ اس کی صفت کفر میں میرے شرکت ہوتی ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ مگر گفتگو میں کام　　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

اگرچہ ہمارا مقصد ذکر ناز و غمزہ ہوتا ہے۔ مگر گفتگو میں ان کی تعبیر دشنہ و خنجر سے کیئے بغیر کام نہیں چلتا کیونکہ ناز و غمزہ میں تاثیر دشنہ و خنجر کی ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مشاہدۂ حق = دیدار الٰہی۔ مستی الستی۔ بنتی نہیں = کام درست نہیں ہوتا۔

چاہے مے عرفان ہی کا ذکر کیوں نہ ہو۔ مگر بغیر ذکر بادہ و ساغر کام نہیں بنتا۔ کیوں کہ مشاہدہ حق کی مستی ایک امر عقلی ہے جس سے ہر شخص حظ نہیں اٹھا سکتا۔ اس لیئے اس کو مے و ساغر سے تعبیر کرنا پڑتا ہے تاکہ حظ حاصل ہو، کیوں کہ حسی چیزوں کی تشبیہ سے جو لذت ملتی ہے وہ عقلی سے نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ عرفان میں مزہ شراب کا ہے۔

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات　　　سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

شعر بے مزہ ہے۔ اور کچھ لکھنے کا بھی محتاج نہیں۔

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض　　ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

حضور ظفر شاہ اکبر ثانی آخری بادشاہ دہلی از شاہان تیموریہ۔
اے غالبؔ بار بار اپنا حال ظفر شاہ کی خدمت میں کہنے کی تجھے ضرورت نہیں کیوں کہ وہ تیرا سب حال بغیر کہے جانتے ہیں۔

---

اشعار ۱۲

غزل ۲

کیوں جل گیا نہ تاب رُخِ یار دیکھ کر　　جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر　　۱۲/۲غ

جلنا = ناخوش اور رنجیدہ ہونا۔ بے حد کڑھنا۔
مجھے اپنے تحمل دیدار سے جلن آتی ہے۔ حالاں کہ جلوۂ یار حقیقی سے کوہِ طور اور شجرہ مبارک جل کے رہ گیا تھا۔ اس جلوۂ اور اس جلوہ میں مغایرت اور دوئی نہیں ہے لہٰذا مجھے بھی تابش چہرہ یار سے جل جانا چاہیے تھا۔ ضمناً کوہ طور کے مقابلہ میں اپنے تحمل کا اظہار ہے۔ گو بظاہر تحمل سے اظہار کراہت کر رہے ہیں۔ کیونکہ جل جانا مطلوب ہے۔

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے　　سرگرم نالہائے شرر بار دیکھ کر

دنیا کے لوگ مجھے آتش پرست کہتے ہیں۔ اس لیے کہ جس طرح آتش پرست پرستش آتش میں اپنے عقیدت و ارادت کے ساتھ انہماک رکھتا ہے میں بھی اپنے شوق و ذوق اور آتش عشق سے مستعد و آمادہ نالہائے آتش بار رہتا ہوں۔ مصرع ثانی یوں بھی ہو سکتا ہے ؎

سرگرم آتش رخ دلدار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا　　رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

بے سبب آزار = وہ شخص جو کسی کو بلا وجہ ستائے۔ جفا کا عام ہونا = جس جفا سے عاشق صادق اور غیر صادق یعنی رقیب بھی نہ بچے۔ بے سبب سے مراد عشق صادق کا نہ ہونا۔
تمہارے سلوک بے جا سے سچے عشق کی کیا عزت رہ گئی۔ جب تم بوالہوسوں پر بھی عاشق صادق کی طرح

جفا کرتے ہو۔ معشوق کو امتیاز نہ کرنے والا اور ظالم دکھانا مقصود ہے۔ رکتا ہوں۔ عاشقانہ سلوک سے۔

آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

قاتل ہاتھ میں تلوار لیے میرے قتل کو آرہا ہے۔ مگر میں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر جوش رشک سے بغیر قتل کیے یوں ہی مرا جاتا ہوں کہ تلوار کو تو اس سے قربت حاصل ہے اور مجھے نہیں۔

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

مینا = سبز شیشہ کی صراحی۔ خون خلق تو گردن مینا پر ثابت ہوا اور لرزتی موج مے ہے۔ یہ کیوں۔ موج مے میں رقیق ہونے کی وجہ سے جو حرکت ہے اس کو لرزنے کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ صراحی اور مے میں ظرف و مظروف کا علاقہ ہے اس لیئے دونوں کو متحد مان کے موج مے کا فعل گویا صراحی کا فعل ہے۔
یہ تاویلات اپنے مجھے خود رکیک معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیئے مصرع ثانی میرے نزدیک یوں ہونا چاہیے ؎

لرزے ہے موج مے سے وہ رفتار دیکھ کر

(سے) کے معنی ذریعہ و وساطت۔ اس معنی میں (سے) خود غالبؔ نے اسی دیوان میں کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ (وہ) کا مرجع مینا ہے۔ (تری) نہ ہونے سے معنی میں خلل نہیں واقع ہوتا ہے۔
صراحی کی گردن پر ایک عالم کا خون ثابت ہو چکا ہے کہ وہی سارے عالم کے قتل ہونے کا باعث ہے۔ اسی وجہ سے صراحی بذریعہ و وساطت امواج شراب کانپتی اور لرزتی ہے۔ کیوں کہ اسی کی شراب پینے سے معشوق کی رفتار مستانہ ہوئی اور عالم اس کی رفتار مستانہ کو دیکھ کر مرنے لگا۔ لہٰذا اسے مواخذہ سے ڈر ہے۔ اگر اس مینا کی شراب معشوق نہ پیتا نہ اس کی چال مستانہ ہوتی اور نہ لوگ مرتے۔

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

کسی چیز سے ہاتھ کھینچنا = اسے ترک کر دینا۔ ہاتھ اٹھانے کے بھی یہی معنی ہیں۔
مجھے حسرت اور افسوس ہے کہ یار نے جور و جفا سے بھی ہاتھ اٹھالیا۔ جب اس نے دیکھا کہ مجھے اس کے ستانے میں بھی مزہ آتا ہے۔ یہ خود ایک نئے قسم کا ظلم ہے۔ بہر طور وہ میری کسی حسرت کو پورا کرنا نہیں چاہتا۔

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ          لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

جب کوئی ایسا شخص جس میں شعر فہمی کا مادہ ہو اور صاحب کمال ہوا ور وہ میرے کلام کا خریدار اور خواہاں ہو تو متاع سخن کے ساتھ ہم خود اس کے ہاتھ بک جاتے ہیں۔ اور بندہ بے درم ہو جاتے ہیں۔ میرے کلام کے سمجھنے والے ہی کم ہیں۔ اور جو میرے کلام کو سمجھے۔ اس کی سلیم الطبعی اور معیار بلند کی دلیل ہے۔ عیار۔ بکسر عین۔ کھرا پن۔

زنار باندھ سبحہ صد دانہ توڑ ڈال          رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

زنار۔ جنیو ایک بٹا ہوا تاگا ہوتا ہے جسے ہندو اور زردشتی گلے میں آڑا پہنے ہوتے ہیں۔ ہموار اور سیدھا اور صاف ہوتا ہے۔ برخلاف تسبیح کے دانوں کے نشیب و فراز کی وجہ سے ناہموار ہوتی ہے۔
رندمشرب شعرا اور شیخ و واعظ و ناصح میں ایک دوسرے کے مخالف رہنا شعرا کا مسلّمہ مسئلہ ہے۔ اس لیئے شعرا واعظین و زہاد کی دھجیاں اڑایا کرتے ہیں۔ اور ان کے لوازم کی تحقیر و تذلیل کیا کرتے ہیں اور ان پر طعن مارا کرتے ہیں۔
جنیو جو نشان کفر ہے مگر ہموار ہے۔ برخلاف تسبیح اگرچہ اشعار علامت اسلام ہے مگر سو دانوں کی وجہ سے ناہموار۔ غالبؔ فرماتے ہیں جنیو کو اختیار کرو تسبیح کو توڑ کے پھینک دو۔ کیوں کہ راہ گیر و مسافر ہموار راہ کو دیکھ کر اختیار کرتا ہے۔ تسبیح کے راستہ میں تو سو جگہ ٹھوکریں کھانے کا مظنہ ہوتا ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں          جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

جناب نظم فرماتے ہیں کہ "ان" کے لفظ سے مخاطب کو زیادہ تر متوجہ کرلیا۔ اگر اس کی جگہ "کیا" کہتے تو یہ لطف نہ پیدا ہوتا۔ میرے نزدیک۔ کیا۔ بھی کچھ کم لطف نہیں پیدا کرتا ہے۔
اس شعر ذیل میں "یہ" - اسم اشارہ بھی بڑا لطف دے رہا ہے

صحبت وعظ تو تا دیر رہے گی واعظ          یہ ہے مے خانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

اسی طرح ضمیر۔ ان۔ اس شعر میں ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید          جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

لہجہ بدل بدل کے۔ ان۔ کے پڑھنے سے کبھی افسوس اور کبھی حیرت اور کبھی تعجب وغیرہ کے معانی کثیرہ اس سے نکلتے ہیں۔

اسی طرح حافظ کے اس شعر میں "تو" ہے۔

کہ سر بکوہ و بیابان تو دادۂ مارا

میں کی جگہ "دل" بھی شاید بے جا نہ ہو۔ مصرع ثانی میں اگرچہ "جی" موجود ہے۔

نوٹ: فن بلاغت جاننے والوں کے ڈر سے میں نے ان ضمائر اور اشارات کے ساتھ لفظ "بلیغ" نہ صرف کیا کیوں کہ وہ فرماتے ہیں کہ بلیغ کلام اور متکلم کی صفت میں لاتے ہیں نہ کلمہ کی۔ حالاں کہ۔ کنایہ خود کلمہ ہے جس کی صفت میں یہ مقولہ مشہور ہے الکنایۃ ابلغ من التصریح۔ کیوں کہ بدیع ایک جزو فن بلاغت کا ہے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابلغ بلاغت سے افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ نہ بلوغ سے اس محل پر جس کے معنیٰ رسا کے ہیں۔ واللہ یعلم بالصواب۔ کم از کم اردو میں تو کلمہ کی صفت میں ضرور بولتے ہیں۔

جس قسم کے آبلے میرے پاؤں میں ہیں ان سے میں اُکتا گیا تھا۔ اس راہ دشوار گذار عشق کو پر خار دیکھ کر میرا دل خوش ہوا۔ کیوں کہ ان کانٹوں کے چبھنے سے آبلے پھوٹیں گے اور کچھ راحت و تسکین ہو گی۔ یا یہ کہ ایذا دوست ہونے کی وجہ سے خلش خار اور مزہ دے گی۔

کیا بدگمان ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے   طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

کیا بدگمان = بہت بدگمان۔ "کیوں بدگمان" بھی کہہ سکتے ہیں۔ زنگار کا رنگ سبز مانتے ہیں اور طوطی کا رنگ بھی سبز ہی کہتے ہیں۔ طوطے اور طوطی میں امتیاز نہ کر کے ایک کے صفات دوسرے کے سر لگا دیتے ہیں۔ دونوں پرندے ایران میں نہیں ہوتے ہیں۔

اب جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کو اس شعر غالب سے کوئی تعلق نہیں۔

طوطی کو جب بولیاں سکھانا چاہتے ہیں تو طوطی کا پنجرا آئینہ کے سامنے والے رخ پر رکھتے ہیں اور سبق آموز آئینہ کی پشت پر ہوتا ہے۔ یہ معلم کیلے کا پتہ منھ میں رکھ کر سیٹی کی یا کوئی اور آواز اس پتے کے ذریعے سے نکالتا ہے۔ طوطی جو اپنا ہی عکس آئینہ میں دیکھتی ہے تو وہ سمجھتی ہے کہ میری ہم جنس یہ دوسری طوطی بول رہی ہے کچھ دنوں میں اس معلم کی آواز کی نقل سنتے سنتے اُتارنے لگتی ہے۔ اسی بات کو جناب بلبل شیراز اپنے شعر ذیل میں نظم فرما رہے ہیں

در پس آینہ طوطی صفتم داشتہ اند   انچہ استاد ازل گفت ہمان میگویم

پیش و پس کا اعتبار کسی شے کی نسبت سے ہوتا ہے۔ معلم کے لحاظ سے طوطی آینہ کے پیچھے ہے اور طوطی کے لحاظ سے معلم آینہ کے پیچھے ہے۔ اور آینہ کے لحاظ سے طوطی آینہ کے سامنے اور معلم اس کے پشت پر

ہے۔ جیسے ساکنین دنیائے عتیق کے لحاظ سے جو سمت ان کی مشرق کہلاتی ہے وہی سکان دنیائے جدید کے لحاظ سے مغرب ہے۔ شعرِ حافظ میں لفظ پس اسی اعتبار سے ہے۔ پیش نہیں کہا۔

طوطی بول چال میں مؤنث اور طوطا مذکر ہے۔ مگر ایک محاورہ میں "آج کل اُن کا طوطی بول رہا ہے" مذکر ہی بولتے ہیں۔ لکھنؤ میں لفظ بازار مؤنث ہے۔ مگر ایک محلہ کا نام راجہ کا بازار ہے۔ اس نام میں تذکیر ہی کے ساتھ بولتے ہیں۔

میرے آینہ میں زنگار کو دیکھ کر وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ طوطی ہے اور میں طوطی سے الفت رکھتا ہوں اور مجھ سے بدگمان ہوتا ہے کہ میرے سوا کسی اور سے الفت کے کیا معنی۔

میرے نزدیک یہ شعر بد مذاق ہے۔ جناب حسرتؔ اس بدمذاقی کو یوں رفع فرماتے ہیں کہ میرے دل کی افسردگی، یاس اور محرومی کے سبب سے ہے۔ لیکن وہ بدگمان یہ سمجھتا ہے کہ اس افسردگی اور تنک جوشی کا باعث یہ ہے کہ میں کسی دوسرے سے محبت کرتا ہوں۔

کسی دوسرے سے مراد اگر طوطی ہی ہے تو بدمذاقی نہ گئی اور کوئی دوسرا محبوب مراد ہے تو زنگار سے محبوب کا کسی طرح استعارہ نہیں ہو سکتا۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر     دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اہل لکھنؤ مصدر کی تذکیر و تانیث کے قائل نہیں بہ مناسبت اسم۔ اسم چاہے مذکر ہو اور چاہے مؤنث مصدر کو اس کی اصلی حالت میں لاتے ہیں۔ برخلاف اہل دہلی کہ وہ اسم اگر مؤنث ہو تو مصدر کو بھی مؤنث لاتے ہیں جیسے کہ اسی شعر میں "برق گرنی تھی"۔ اور اسم مذکر ہو تو مصدر کو اپنی اصلی حالت میں رکھتے ہیں یعنی مذکر لاتے ہیں۔

اسی طرح اہل لکھنؤ جس اسم کی جمع (ات ۔ یا ۔ ت) سے ہو تو اس کے ساتھ فعل مذکر ہی لاتے ہیں چاہے اسم واحد مؤنث ہو یا مذکر۔ جیسے تکلیف اور آفت دونوں مؤنث ہیں مگر تکلیفات ہوئے۔ اور آفات نازل ہوئے۔ مگر دلی میں اسم واحد اگر مؤنث ہے تو فعل بحالت جمع بھی مؤنث بولیں گے۔ اور اگر اسم واحد مذکر ہے تو فعل مذکر لائیں گے۔ عربی میں مطلق جمع حکم تانیث میں ہوتی ہے۔

برقِ تجلی کو ہم پر گرنا چاہئیے تھا نہ طور پر کہ جل کے خاک ہو گیا اور تحمل جلوہ نہ کر سکا، کیوں کہ اس کا ظرف اتنا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مے خوار کو اس کے ظرف اور تحمل کے موافق شراب ناپ ناپ کے دیتے ہیں۔ جامِ جمشید میں جو سات خط تھے وہ اسی غرض کے پورا کرنے کے لیئے پیمانے تھے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ برق تجلی کو شراب سے اور طور کو مے خوار تنگ ظرف سے تشبیہ دی ہے۔
میرے نزدیک دوسرا مصرع تمثیل ہے تشبیہ نہیں۔ تمثیل میں مشبہ اور مشبہ بہ الگ الگ نہیں قرار دیئے جاتے بلکہ حاصل کی حاصل کے ساتھ تشبیہ ہوتی ہے۔
ظرف = قابلیت و استعداد۔ مگر قدح۔ شراب اور مے خوار اس کے ساتھ بمعنی اناء (برتن) باہم ایہام تناسب رکھتے ہیں۔

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا　　یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

وہ اس جگہ کثیر المعنی ہے۔ اور شعر محتاج شرح نہیں۔

---

غزل ۴　　اشعار ۸

۲ / ۸　لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر　　میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خار بیاباں پر

دل لرزنا۔ اپنے یا اپنے کسی محبوب کے ضرر کے تصور سے دل کا کانپنا اور ہل جانا۔ شبنم۔ حرارت آفتاب سے بھاپ بن کے اُڑ جاتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے۔
میں وہ شبنم ہوں جو نوک خار پر ہوا اور خار بھی بیابان کا۔ میرے فنا اور خشک کرنے میں مہر درخشاں کو زحمت ہوگی یہ کانٹے اس کے چبھیں گے۔ اس کے اس ضرر پر میرا دل کانپتا ہے اس کی وجہ نہ معلوم ہوئی کہ آفتاب سے کیا خصوصیت ہے جو اس کے ضرر پر دل کانپتا ہے۔ اگر مہر درخشاں سے آفتاب ہی مراد لینا مقصود ہے تو دل لرزنے کو نکال کے مصرع یوں بنا دیا جائے ؎

دریغ آتا ہے مجھ کو زحمت مہر درخشاں

دونوں بزرگوں نے آفتاب کی زحمت پر دل لرزنے کی وجہ نہ ظاہر کی۔ اور نہ شعر ہی میں کوئی وجہ ہے۔
خار = غم عشق۔ مہر درخشاں = کنایہ از محبوب۔ قطرۂ شبنم = اپنی ذات حقیر و ناچیز نے اس سے گریہ کی طرف بھی خیال جاتا ہے۔
میں وہ حقیر و ناچیز قطرہ شبنم ہوں جسے خارِ غم عشق خود فنا کرتا ہے محبوب کو میرے فنا کرنے میں زحمت ہوگی اس کی اس زحمت پر میرا دل کانپ اٹھتا ہے۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی　　سپیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

یاں ۔ زنداں ۔ سپیدی ۔ آنکھ کے ڈھیلے کا سپید حصہ ۔ اور اردو میں چونے کی قلعی ۔
POTIPHER (پوٹیفر) شوہر زلیخا نے حضرت یوسف کو تہمت زلیخائی کے سبب سے جیل خانہ میں بھیج دیا تھا۔ غم فراق یوسف میں بسبب گریہ سیاہ پتلی چشم یعقوب کی بہ گئی تھی ۔ آیت قرآنی اس پر دال ہے فابیضت عینا ہ ۔ چوں کہ زندان میں یعقوب کی آنکھیں یوسف کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں اس کو سپیدی پھرنے سے تعبیر کیا ہے ۔ اور بادنائے ملابست خانہ آرائی کی نسبت یوسف کی طرف کی۔
حضرت یوسف جب زندان سے باہر تھے تو اپنے حسن لاثانی سے خانہ آرائی کرتے تھے اب زندان میں ہیں تو سپیدی دیدۂ یعقوب سے زندان میں قلعی ہو کر زندان کی زینت ہو رہی ہے ۔ اور اس میں حسن یوسف کے شریک ہونے سے ڈبل زینت ہو گئی۔

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانہ سے　　کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

درس بے خودی سے تعلیم فنا پانے والا اس وقت سے ہوں جس وقت مجنوں طفل مکتب تھا اور دیوار مکتب پر (لا) لکھا کرتا تھا ۔ یعنی میں اس سے بڑھ کے تعلیم فنا و بے خودی میں ہوں ۔ مبتدی بچے دیوار پر جو پڑھتے ہیں کوئلے وغیرہ سے لکھ دیا کرتے ہیں ۔ بجائے الف بے لام الف اس لئے اختیار کیا کہ اس سے " لا " بنتا ہے جو حرف نفی ہے اور فنا پر دال ۔ مزید برآں لام والف میں اتحاد قلبی بھی ہے ۔

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے　　بہم گر صلح کرتے پارہائے دل نمک داں پر

پارہائے دل اگر باہم مل کر صلح کر کے نمک دان سے نمک چھڑک لینے پر راضی ہو جاتے تو مجھے مرہم کی جستجو سے کس قدر فراغت حاصل ہو جاتی ۔ کیوں کہ نمک اور مشک زخم کو بڑھا دیتا ہے اور زخم کے بڑھنے سے ہلاکت ہوتی ہے ۔ لہٰذا ہلاک ہو کر سب جھگڑوں سے چھٹکارا مل جاتا ۔ یا نمک سے ایذا بڑھ جاتی اور میں ایذار دوست ہوں جب میری مراد پوری ہو جاتی تو فراغت بھی ہو جاتی۔

نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا　　کہ پشت چشم سے جس کے نہ ہووے مُہر عنواں پر

اقلیم ۔ یونانی زبان کا لفظ ہے ۔ ولایت ۔ صوبہ ۔ ضلع ۔ کرۂ ارض کو سات اقلیموں پر پہلے تقسیم کیا گیا تھا۔

اور اب پانچ پر۔ طومار = دفتر۔ جلد بزرگ ۔ دنبالۂ امضاء۔ پہلے مختلف خطوط کو جوڑ کے ایک لمبی چٹ بنا کے چونگے اور مٹھے کی شکل میں لپیٹ کر رکھ لیتے تھے جب طالب علم کو تعلیم سے فراغت ہو جاتی تھی تو اسے طلبۂ فارغ (SCROLL ، TOME) کو پڑھاتے تھے۔ تاکہ مختلف ڈھنگ کے خطوں کی پڑھنے کی قابلیت اس میں پیدا ہو جائے۔ مہر = احکام شاہی کے پروانوں پر مہر شاہی عنوان پروانہ پر ہوتی تھی ۔ پشت چشم = نگاہ پھیرلینا۔ تغافل غض بصر۔

ملک الفت میں حسینوں کے ناز کا کوئی دفتر اور طومار ایسا نہیں جس کے عنوان پر مہر غض بصر و تغافل اور نگاہ پھیر لینے کی نہ لگی ہو یعنی ناز کے ساتھ تغافل و چشم پوشی نہ کرتے ہوں۔ کیوں کہ یہ امور لوازم حسن سے ہیں ۔

مہر بیضاوی شکل کی مشابہ بچشم بھی ہوتی ہے جب اسے لگا لیتے ہیں تو اس کا وہ رخ جدھر نام کندہ ہوتا ہے اوپر کر کے رکھتے ہیں اور لگاتے وقت نیچے ہوتا ہے اس کو نگاہ پھیر لینے کے ساتھ تعبیر کیا ہے ۔

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا    کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستان پر

شفق = وقت صبح و شام افق مشرقی و مغربی پر انعکاس اشعۂ سرخ آفتاب کا نام ہے ۔ ابر = فرقت سے شب فرقت مراد لیں تو یہ لفظ تاریکی بڑھانے میں کچھ کام دیتا ہے ۔ ورنہ حشو ہے ۔ فضول سمجھ کے ترمیم یوں ہو سکتی ہے ؎

شفق شام جدائی کا تجھے دیکھا تو یاد آیا

گریہ کا بھی ذکر شعر میں نہیں جو یہ لفظ ابر کام دیتا ۔ سرخی گلہائے گلستاں کو شفق سے مناسبت ہے ۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ "اب" اس شعر میں کثیر المعنی ہے :

۱۔ پہلے بھولا ہوا تھا ۔

۲۔ معشوق کو دیکھ کر ایسی محویت ہوئی کہ سب کچھ بھول گیا ۔

۳۔ کچھ شکایات تکلیف ہجر کی تھیں کہ یہ بات اب یاد آگئی ۔

سرخی شفق یا سرخی گل تیرے ہجر میں نہ تھی بلکہ ؎

آتش برس رہی تھی فرقت میں گلستان پر

یہ بات اب مجھے یاد آگئی ۔

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

پرواز - ہوائے تند و خاک کی مناسبت سے پرواز لائے۔
خیال یا اعتقاد ہے کہ مردے قیامت میں زندہ ہو کر قبر سے اُٹھیں گے۔ لیکن اس کے شہیدوں میں اس کے ناز سے مرنے کے بعد بھی اٹھانے کے شوق میں سوائے قوت پرواز اور باقی کیا رہا ہے۔ پھر قیامت کیا خاک اسے زندہ کرے گی۔ ہاں جسمانی حیثیت سے صرف ایک خاک رہ گئی ہے قیامت اس کے لیے آندھی کا کام کرکے اس کو بھی برباد کردے گی۔
جناب حسرت۔ قیامت گویا ایک ہوائے تند ہوگی جو اس کے شہیدوں کی خاک کو (جو پہلے ہی سے شوق ناز میں اڑ رہی ہے) کچھ اور پریشان کردے گی۔
جناب نظم۔ قیامت ان کو کیا زندہ کرے گی ہاں جلوۂ ناز کے شوق میں ان کی خاک جو اُڑ رہی ہے اُس کے لیے قیامت ایک ہوائے تند ہوگی جو شوق ناز کی پرواز میں اور معین ہوگی۔ یا۔ عکس لو تو یہ معنی ہوں گے کہ جب ہوائے تند چلی اس نے قیامت کا کام کیا ان کی خاک شوق دیدار میں اڑنے لگی۔

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

جناب حسرت۔ اگر ناصح نے ہم پر شدت کی تو ہم اپنا گریبان چاک کر ڈالیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ناصح کی سخت گیری کا عوض کس طرح لینا چاہتا ہے جس میں مجبوری کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔
جناب نظم۔ کیا گریبان پھاڑنے سے تسکین نہ ہوگی۔ دونوں بزرگ اس شعر کے بے حد مداح ہیں۔
ناصح نے اگر ترک عشق کی نصیحت میں شدت سے کام لیا تو کچھ ہرج نہیں اور اس سے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ ماننا نہ ماننا تو ہمارا کام ہے۔ اپنے گریبان پر تو ہم کو اختیار ہے اسے چاک کرکے ناصح کو اور زیادہ اپنا جوشِ جنون دکھادیں گے۔ اس فعل سے تو وہ ہمیں روک نہیں سکتا۔ مگر ترک عشق ہم سے ہونا ناممکن ہے۔ میں نے یہ معنی لکھ کر اس شعر کو اس کے مرتبہ سے گرادیا مگر میری پست خیالی کا کیا علاج۔

غزل ۵ اشعار ۱۱

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارہ میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور

لفظ نشان کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ان کی کوئی بات شوخی ہیکڑ اور فریب سے خالی نہیں ہوتی ہے۔ مگر قافیہ مجبور کر رہا ہے ۔ ؎

ہر بات میں اس شوخ کی ہے چونکہ نشان اور
کرتا ہے محبت تو گذرتا ہے گماں اور

نشان اور = مخالفت۔ ظلم۔ تلون مزاجی۔ گمان اور = فریب چالاکی۔
چوں کہ ان کی ہر بات میں جعل فریب ہوا کرتا ہے اس لیئے اگر وہ سچی محبت بھی کریں تب بھی بدظنی کی وجہ سے ان پر گمان فریب ہی کا ہوتا ہے۔
جناب حسرت ۔ یہ گمان ہوتا ہے کہ اظہار محبت سے ہماری فریفتگی کو معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ بعد یقین عشق ناز معشوقانہ سے کام لیں گے۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

وہ تو میری بات کبھی نہ سمجھیں گے۔ اے اللہ اگر تو مجھ کو ایک اور زبان سمجھا سکنے کی نہیں دیتا ہے تو انھیں کو ایک سمجھ جانے والا دل عطا کر۔
جناب حالی فرماتے ہیں گو یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے۔ مگر ضمناً ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔
مذہب تو ایک ایسی چیز ہے ہی جس میں علی العموم کورانہ تقلید ہوا ہی کرتی ہے۔ مگر انسان کی ذات بھی عجیب ذات ہے کہ وہ دوسری چیزوں میں بھی چاہے ان میں فرق رات اور دن کا ہو اس کو ان کے حق و باطل میں امتیاز کرنا دشوار بلکہ محال ہوتا ہے۔ اس کا مصداق کلام غالب اور شرح نظم کلام غالب ہے۔ حالانکہ غالب کے اس کلام کے علاوہ جو بے پناہ اور بے نظیر ہے اس کو بھی بے معنی کہنے پر سمجھ دار لوگ بھی تیار نہیں۔ اسی طرح شرح نظم دیوان غالب بعض مسامحات کے علاوہ بے مثل اور بے نظیر شرح ہے۔ اگرچہ غالب کے کلام پر اعتراض بجا بھی کرتے ہیں اور تحریف کی بھی کوئی حد نہیں رکھتے مگر اس سے ناخوش ہیں۔ حالاں کہ اس سے بہتر تو کیا اس کے برابر بھی اب تک کوئی شرح نہیں نکلی اور سب شارحین اس کے خوشہ چین ہیں۔

ابروسے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کمان اور

پیوند۔ تعلق مقرر بالضرور پہلے اس معنی میں بولتے تھے اب نہیں بولتے۔
اس کے نگہ ناز کے تیر کو کمان ابروسے کوئی تعلق نہیں۔ نگہ تیر تو ضرور ہے مگر اس کی کمان خود اس کی خوبی اور دلربائی ہے نہ ابرو کی کمان۔ سب شعرا ابرو ہی کو کمان کہا کرتے ہیں غالبؔ کی جدت پسندی نے اس معمولی بات کو پسند نہ کیا اور نئی کمان بنائی۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے لے آئیں گے بازار سے جاکر دل وجان اور

تمہارے مظالم سے ہر ایک کو دل وجان دو بھر ہیں۔ لہٰذا دل وجان کی ارزانی ہورہی ہے۔ اگر ہمارے دل جان لے کے تم انھیں برباد وتباہ کردو گے تو ہمیں کیا پروا ہے۔ جس وقت بھی ہم اٹھے اور بازار گئے جتنے دل چاہیں گے مول تو مول مفت لے آئیں گے۔

تم سلامت ہو تو کیا غم ہمیں جس وقت اُٹھے ہم بازار گئے اور لے آئے دل وجان اور

ہرچند سبک دست ہوئے بت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گران اور

بت شکنی۔ خواہشات کو مارنا۔ نفس امارہ کا زیر کرنا۔ سنگ راہ۔ مانع رفتار۔ ہم۔ انانیت۔ وجود۔ ہستی۔
سبک دست۔ مشاق۔
باوجودیکہ خواہشات کے مارنے اور نفس امارہ کے زیر کرنے میں ہم بڑے مشاق ہوگئے ہیں۔ پھر بھی جب تک کہ ہمارا وجود ہے یہ خود راہ معرفت میں مانع رفتار ہے۔ اپنی ہستی کو فنا کرکے ہی وصال دائمی پاسکتے ہیں۔

ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشان اور

خون جگر شدت سے جوش ماررہا ہے جس کے بہانے کے لیئے یہ دو آنکھیں کافی نہیں اگر خون خالص بہانے والی اور آنکھیں بھی ہوتیں تو دل کھول کے اور جی بھر کے رولیتا۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہرچند سر اُڑ جائے جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

جلاد کو۔ اس سے (جلاد سے) فصیح ہے۔ پہلے (سے) کی جگہ (کو) بولتے تھے۔ مرتا ہوں = فریفتہ ہوں۔

عاشق ہوں ۔ بہت پسند ہے ۔ ہاں اور = اور ضرب لگائے جا ۔

مجھ کو اس کا جلا دے برابر ہے کہے جانا نہایت مرغوب ہے کہ "ہاں اور ضربیں لگائے جا" اس پسندیدگی کے آگے مجھے جان کے جانے کی ذرا بھی پروا نہیں ۔

ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور　　　　لوگوں کو ہے خورشید جہانتاب کا دھوکا

یہ آفتاب جو روزانہ مشرق سے نکلتا رہتا ہے لوگ اس کو آفتاب دنیا سمجھے ہوئے ہیں اور دھوکے میں پڑے ہیں ۔ بلکہ میں اپنے کثیر داغ پنہاں میں سے روزانہ ایک نیا داغ اہل عالم کو دکھاتا ہوں ۔ اپنے داغہائے عشق کی سوزش اور تابش کا مثل سوزش و تابش آفتاب ظاہر کرنا مقصود ہے ۔

کرتا ۔ جو نہ مرتا ۔ کوئی دن آہ وفغاں اور　　　　لیتا ۔ نہ اگر دل تمہیں دیتا ۔ کوئی دم چین

اگر میں نے تجھے دل نہ دیا ہوتا تو کچھ دیر کے لیئے چین مل جاتا ۔ مگر دل دینے کے بعد چین کہاں اور اگر مر نہ گیا ہوتا تو کچھ دن اور آہ و فغاں کرنا پڑتی ۔

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور　　　　پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

نالے = ندی نالے ۔ جو لے وجہر پہلا مصرع تمثیل ہے ۔ اور = بہت زیادہ (برائے تفصیل) قاعدہ ہے کہ جب ندی نالے کے بہاؤ کے سامنے کوئی چیز روانی آب کے لیئے حائل اور مانع ہو تو پانی اونچا ہوتے ہوتے اس حائل پر سے گذر جاتا ہے ۔ اسی طرح جب میری طبیعت میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو اس میں اور زیادہ روانی ہو جاتی ہے ۔ تمثیل سے استدلال شاعرانہ ہے نہ منطقی ۔

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور　　　　ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

اس میں کیا شک ہے کہ غالب معمولی اور پایمال مضامین بھی اگر کہتے ہیں تو اس پر نئے ڈھنگ سے مصرع لگا کر اس مضمون کو نیا کر دیتے ہیں اور اپنا بنا لیتے ہیں ۔

---

غزل ۶ اشعار ۲

۵ب غ ۲ صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر  تغیر آب برجاماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

صفائے حیرت ۔ کے کیا معنی ہوئے۔ ادھر دونوں بزرگوں نے توجہ نہ کی۔ شرح جناب نظم کے کاتب نے تو (صفائی) لکھ کر اور بھی گورکھ دھندا بنایا۔ میرے نزدیک ۔ صفا و حیرت واو عطف کے ساتھ ہونا چاہیے۔ حوض تالاب وغیرہ کا پانی پہلے صاف ہوتا ہے۔ پھر دیر تک قیام کے بعد پانی کا رنگ سبز یا سیاہی مائل ہو جاتا ہے اس کے بعد اس پر کائی جم جاتی ہے۔ فارسی میں کائی کو جل مذغ ۔ جامۂ غوک ۔ اور عربی میں طحلب اور خرء الضفادع اور انگریزی میں GREEN MOSS کہتے ہیں۔ حیرت ۔ مطالب خفیہ میں تعارض ادلہ سے پیدا ہوتی ہے اور نفس کسی جانب جزم سے عاجز آجاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مذمومہ جس کی تعریف لکھی گئی دوسری محمودہ جس کی نسبت حضرت رسالت پناہی صلعم فرماتے ہیں اللھم زدنی حیرۃ فیک ۔ حیرت آئینہ = بوجہ جمود و سکون وقیام آئینہ کا حیرت کے ساتھ استعارہ کرتے ہیں۔ حیرت میں بھی آدمی ساکت و صاف وغیر متحرک ہو کے رہ جاتا ہے۔ آب برجاماندہ = آب راکد۔ بندھا اور غیر جاری پانی ۔ رنگ ۔ کے تنتیس معانی میں سے بدقت ۔ عیب و عار۔ بدضد خوب اور ژندہ (گدڑی) گھسیٹ گھساٹ کے معنی بنتے ہیں۔ مگر غالب نے کائی کے معنی لئے ہیں۔ تغیر = بدل جانا۔ پہلے حالت کا باقی نہ رہنا۔ صفا و حیرت کے درمیان واو بمعنی (مع) ہے۔

آئینہ کی حیرت اور صفائی اس کے زنگ لگ جانے کا باعث ہوتی ہے۔ جیسے بندھا پانی (آب ایستادہ) پہلے تو صاف ہوتا ہے پھر اس پر کائی جم جاتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حیرت مذمومہ کے دیر تک رہنے سے صفائے باطن کدورت سے بدل جاتی ہے لہٰذا جلد سے جلد نفس کو تخلیہ رذایل و تحلیہ فضائل اور حصول معرفت حقیقی پر سعی بلیغ کرنا چاہیئے اس شعر کو غزلیت سے کیا تعلق۔ ناصحانہ و واعظانہ شعر کہہ سکتے ہیں۔

نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی  ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

تدبیر = علاج۔ داغ پلنگ ۔ چیتے کی کھال کے ٹپے ۔ زمرد کا رنگ سبز ہوتا ہے اور چیتے کے ٹپے سیاہ یہ میں لکھ چکا ہوں کہ سبز۔ سیاہ ۔ نیلا ۔ اودا ایرانیوں کے نزدیک ایک ہے اس لئے جام زمردین کو داغ پلنگ سے تشبیہ دی۔

میری وحشت کا علاج سامان عیش و نشاط سے بھی نہ ہو سکا۔ چنانچہ جام زمردین جو جاہ و مناصب

والوں کے سوا اور کسی کو میسّر نہیں اور شراب جو نشاط آور ہے وہ بھی میری وحشت کو دُور نہ کر سکی بلکہ جامِ زمردین نے اور وحشت بڑھا دی کیوں کہ اس نے میرے حق میں داغ پلنگ کا کام کیا ۔ پلنگ ایک وحشی اور مہیب ناک درندہ ہے جسے دیکھ کر وحشت اور بڑھتی ہے ۔

---

غزل ۷ اشعار ۶

ہیخ

جنوں کی دست گیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

دستگیری ۔ امداد و اعانت ۔ عریانی ۔ برہنگی گردن ۔ ذمّہ ۔

جنوں کی امداد کون کر سکتا ہے اگر برہنگی نہ ہو۔ اے گریباں چاک دامانی و چاک گریبانی کا حق میری گردن پر ثابت ہے کہ ان سے عریانی اور امداد جنون ہوئی ۔ وہ جنون ہی کیا جس میں لباس کی دھجیاں نہ اُڑیں ۔

جیسا کہ چھپا ہے اس میں گریباں کو منادی اور اے کو محذوف مانے بغیر چارہ نہیں ۔ لیکن گریبان کے ساتھ تخاطب اس محل پر مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا ۔ اگرچہ دونوں بزرگ تخاطب ہی سے معنی لکھ رہے ہیں ۔ لیکن میں نقل اس کے چاہتا ہوں ؎

ہوا ثابت حق چاک گریباں میری گردن پر

یا ؎

حق دست جنوں ثابت ہوا ہے میری گردن پر

یعنی دست جنوں نے لباس یا گریبان چاک کر کے برہنگی پیدا کی اور اس طرح جنون کی امداد ہو گئی ۔ کیوں کہ جنون مقتضی عریانی ہے ۔ یا ۔ چاک گریبانی سے برہنگی ہوئی الخ

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر

نیرنگ ۔ طلسم و شعبدہ ۔ بیتابی ۔ بیقراری اضطراب ۔ بال ۔ بازو ۔ یہ میں لکھ چکا ہوں کہ مصادر فارسی اُردو میں ناگوار طبع ہوتے ہیں مگر پہلے لوگ استعمال کرتے تھے ۔ دل ۔ سے مراد دل سوختہ یا دل صد پارہ ۔

جناب نظم پہلے مصرع میں (ہے) محذوف اور باندھے کا فاعل دل مانتے ہیں ۔ کاغذ میں آگ لگا دینے

سے بہت جلد کاغذ میں آگ دوڑ جاتی ہے اور سیکڑوں ذرات روشنی کے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان کو ہزار آئینہ کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔

طلسم بیتابی مثل کاغذ آتش زدہ دل سوختہ یا صد پارہ کے ہزاروں آئینے ایک تپش کے بازو پر باندھتا ہے۔ جب ہزار آئینۂ دل ہوں گے تو ہزاروں دل سوختہ تڑپتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ کثرت اضطراب کا بیان ہے۔ تیرنگ (طلسم) کی مناسبت سے باندھنا لائے۔

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے　　　متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

جو عیش کہ گردش آسمانی سے جاتا رہا ہم اس کی واپسی کی فلک سے بہت زیادہ متقاضی ہیں۔ گویا ہم لوٹے ہوئے مال کو لٹیرے پر قرض سمجھے ہوئے ہیں۔ لٹیروں سے جیسے لوٹا ہوا مال واپس مل سکتا ہے۔ تمنائے عیش رفتہ میں عقل کھو بیٹھے۔ کیا کیا = بہت زیادہ۔

ہم اور وہ بے سبب آزار۔ آشنا دشمن کہ رکھتا ہے　　　شعاع مہر سے تہمت نگہ کی چشم روزن پر

بے سبب آزار = بلا وجہ ستانے والا۔ آشنا دشمن = شناسا کا دشمن۔ یہ دونوں صفات (وہ) کے ہیں۔ ہم ہیں اور وہ ان کے ایسے شخص سے سابقہ پڑا ہے۔

ہمارا ایسے شخص سے معاملہ آپڑا ہے جو بلا وجہ ستانے والا اور آشنا کا دشمن ہے۔ روزنوں سے جو شعاعیں کہ آتی ہیں وہ مجھ پر یہ تہمت اور الزام لگاتا ہے کہ تو مجھے روزن سے جھانکتا ہے۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا　　　فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اگر تو اپنی حقیقت معلوم کرنے کا مشتاق ہے تو اپنے آپ کو فنا فی المحبوب کر دے تو تجھے اپنی حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ تو عین ذات محبوب ہے۔ دیکھ خار و خاشاک کا فروغ طالع بھٹی میں پڑنے پر موقوف ہے۔ کیوں کہ بھٹی میں پڑ کر ذات شعلہ بن کر خود فنا ہو جاتا ہے۔ خار و خاشاک نہیں رہتا۔

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے　　　کہ مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

کس = استفہام کے لیے نہیں ہے بلکہ استعجاب کے لیے ہے۔ شعر بہت اچھا ہے۔

نہ معلوم وہ کون سی ادائے محبوب ہے جس پر اسد مٹا ہوا ہے۔ اور کہتا ہے کہ تم تیغ ناز سے کام لیے جاؤ اگر

دونوں عالم کے لوگ قتل ہو جائیں گے تو سب کے خون کا ذمّہ ہم اپنی گردن پر لے لیں گے اور تم پر آنچ نہ آنے دیں گے۔

---

غزل ۸          شعر ا

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں      تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

خوبان۔ فارسی کی جمع بلا عطف واضافہ یا صفت و موصوف اُردو میں مخل فصاحت ہے۔ قافیہ رقیب مجھے اچھا نہ معلوم ہوا۔ اگرچہ عاشق کے رقیب تو ہیں۔ مگر عاشق کا تو وہ بھی محبوب ہوگا۔ اس لیے "حبیب" ہونا چاہیے۔ آخر بفتح خا افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔

تم ایسے حسین ہو کہ دنیا کے دوسرے حسین بھی بکثرت تم پر عاشق ہیں۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی میرے ہاتھ لگ جائیگا جو میرا محبوب ہوگا اور تمہارا ایسا ظالم نہ ہوگا۔ اسی مصلحت سے میں تمہارے مظالم برداشت کر رہا ہوں۔ اس بات کے کہنے میں میں لگی لپٹی سے کام نہیں لیتا ہوں۔ صاف صاف کہہ رہا ہوں۔

---

غزل ۹          اشعار ۱۱

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور      تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

یہ غزل زین العابدین خان عارفؔ کے مرثیہ میں ہے، جو غالبؔ کی بیوی کے بھانجے اور خوش فکر شاعر تھے۔ جوانی میں مر گئے۔

مرثیہ کے بین میں مردہ کو زندہ فرض کر کے اس سے تخاطب کرتے ہیں۔ مرثیہ دردانگیز ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت غالبؔ۔ عارفؔ مرحوم کو بہت دوست رکھتے تھے۔

تم مجھے دنیا میں چھوڑ کے اپنے ساتھ لیے بغیر چل دیئے۔ اب اکیلے گئے ہو تو کچھ دن اور میرے آنے کا انتظار کرو اور جب تک میں آؤں اکیلے ہی رہو۔

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھِسے گا      ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

پتھر۔ سنگ۔ حجر۔ دہلی میں بتقدیم ہا برتا۔ اسی طرح گھڑنا بتقدیم ہا بر راء ہندی بولتے ہیں۔ اس سے

مراد لوح قبر اور در سے مراد قبر ہے۔ ناصیہ۔ پیشانی۔ جبین۔ ماتھا۔
میری زندگی بھی کم ہے۔ اور یہ باقی زندگی تیرے سنگ آستانہ در (قبر) پر ناصیہ فرسائی میں گذرے گی۔
یعنی تیری لوح مزار سے سر ٹکراتا رہوں گا۔ بالفرض اگر سنگ مزار نہ گھسا تو میرا سر ہی نہ رہے اور وہی مٹ جائے گا۔

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں  ماناکہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

کل آئے ہو یعنی تمہاری عمر ابھی بہت کم ہے۔
ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ اس کم سنی میں مرنا کیسا۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ ہمیشہ کوئی زندہ نہیں رہتا ہے بجز حق لایموت کے۔ مگر کچھ دن اور تو جیتے ہوتے۔
گویا عارف زندہ ہیں اور ان کے سفر کرتے وقت ان سے یہ مکالمہ ہو رہا ہے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے  کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

کیا خوب۔ یہ تم نے خوب کہی (طعن ہے)
مرتے وقت تم کہتے ہو کہ اب قیامت میں ملاقات ہوگی۔ یہ تو تم نے عجیب بات کہی۔ میرے لیے یہی دن تو قیامت کا ہے بلکہ اس سے بڑھ کے کیوں کہ اس دن میں تو تم سے مفارقت ہو رہی ہے اور قیامت میں تو ملاقات ہوگی۔

ہاں اے فلک پیر جوان تھا ابھی عارف  کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ہاں۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ محل (کیوں) کا ہے نہ (ہاں) کا۔ چوں کہ غالب فارسی کے دلدادہ ہیں اور فارسی کے الفاظ و تراکیب و محاورات کو اُردو پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے (ہاں) کو کلمہ تنبیہ فارسی کا مان لو۔ جس کے معنے دیکھ۔ سُن۔ آگاہ ہو ہیں۔ پیر و جوان میں صنعت مطابقت و تکافو و تضاد ہے۔
دیکھ اے فلک پیر عارف تو ابھی جوان تھا۔ اگر وہ ابھی نہ مرتا تو تیرا کیا نقصان تھا۔

تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے  پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

چودھویں رات کا چاند تو رفتہ رفتہ گھٹتے گھٹتے چھپتا ہے پھر تم کیوں ایک دم روپوش ہوگئے۔

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے　　کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

داد و ستد ۔ لین دین ۔ ملک الموت ۔ بفتحین فرشتہ موت ۔ عزرائیل ۔ استعارۃً ان کو ہادم اللذات بھی کہتے ہیں ۔

یہ مانا کہ جان اللہ کی امانت ہے ۔ کچھ دن اور عزرائیل کو تقاضا کرنے دیا ہوتا ۔ تم لین دین کے ایسے کھرے بھی نہ تھے جو تم نے فوراً امانت (جان) ملک الموت کو واپس کر دی ۔

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی　　بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

یہ مانا کہ مجھ سے تم نفرت رکھتے تھے اور نیّر سے تمہاری لڑائی تھی تو ہم دونوں کی پروا نہ کر کے اپنے بچوں کا تو کچھ دن اور تماشا دیکھا ہوتا ۔ نیّر حضرت غالبؔ کے شاگرد تھے اور ان سے غالبؔ کچھ خصوصیت رکھتے تھے جو عارفؔ کو ناگوار تھی ۔ عارفؔ کے مرنے کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے حسین علی خان کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا اور حقیقی اولاد سے زیادہ ان کو چاہتے تھے ۔ نیّر نواب ضیاء الدین احمد خان کا تخلص فارسی کلام میں اور رخشاں اردو کے کلام میں ہے ۔ غالبؔ کی زوجہ ان کی بھتیجی تھیں ۔

گذری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش　　کرنا تھا جواں مرگ گذارا کوئی دن اور

(نہ) استفہام انکاری کے لیے ہے یعنی گذری ۔
جتنی مدت تم زندہ رہے باوجود مجھ سے نفرت ، اور نیّر سے لڑائی ہونے کے اچھے یا برے طور سے وہ دن گذر گئے لہٰذا اب بھی اے جوان مرگ کچھ دن اور تمہیں زندہ رہنا چاہیے تھا تاکہ مجھے تمہاری موت کا تو غم نہ اٹھانا پڑتا اور میں تمہارے سامنے مر جاتا ۔

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ　　قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

تم لوگ جو یہ کہتے ہو کہ عارفؔ کی اسی عزیز ذات کے مر جانے پر اے غالبؔ تم کیوں نہ مر گئے ۔ تم لوگ بڑے نادان ہو ۔ جیتے اس لیے ہیں کہ اور کچھ دن اپنے مرنے کی تمنا کرتے رہیں اور عارفؔ کو روتے رہیں ۔ یہ ہمارے مقدر میں لکھا ہوا ہے ۔ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے ۔

---

# ردیف زائے معجمہ

غزل ۱ اشعار ۳

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز

جیب کفن = کو صبح سے اور۔ داغ عشق = کو بوجہ سوزش مہر سے استعارہ کیا ہے۔
مرنے کے بعد بھی مجھے عشق سے فارغ اے مخاطب نہ جان۔ اب بھی جیب کفن صبح کی طرح چاک ہے۔ اور داغ عشق مہر تاباں کی طرح درخشاں اور سوزاں ہے۔

ہے ناز مفلساں زرِ از دست رفتہ پر ہوں گل فروش شوخی داغ کہن ہنوز

مفلس = مادہ فلس اور باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور فلس کے معنی مال کے ہیں اور ایک تانبے کا سکہ (پیسہ) چاہیے تھا کہ مفلس کے معنی مال دار اور پیسے والے کے ہوتے مگر باب افعال کا ایک خاصہ سلب ماخذ بھی ہے جس کی وجہ سے مفلس کے معنی نادار اور غریب کے ہیں۔ فروختن کے معنی خوبی ظاہر کرنے کے بھی ہیں۔ جیسے خود فروش اپنی تعریف کرنے والا۔ آبا فروش اپنے باپ دادا کی تعریف کرنے والا۔ دوست فروش اپنے دوستوں کی تعریف کرنے والا۔ گل سے استعارۃً داغ مراد ہے۔ گل فروش = داغ کہنہ کی خوبیوں کا اظہار کرنے والا۔
زر از دست رفتہ = جو مال کسی طرح کسی کے قبضہ سے نکل چکا ہو۔ داغ کو اشرفی سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔
میں اپنے داغ کہن عشق کی شوخی کا مدح خواں اب تک ہوں باوجودیکہ عدم حصول مراد سے افسردگی اور مایوسی نے گھیر لیا ہے۔ جیسے کوئی مفلس کہ پہلے امیر ہو اور اپنی پہلی دولت رفتہ پر فخر و ناز کرتا ہے۔

مے خانہ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز

معشوق ستم گر شراب کے خمار سے اب تک انگڑائیاں لے رہا ہے۔ پہلے جب مے خانہ جگر میں شراب خون تھی تو اسے وہ پیا کرتا تھا۔ اب تو میرے جگر میں خون ذرا بھی نہیں پھر کس طرح اس کا خمار اتاروں۔ مے خون تو

در کنار یہاں جگر میں اب خاک تک نہیں ۔ (یاے میخانہ جگر میں ذرا بھی نہیں)۔

---

غزل ۲

اشعار ۵

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز باغ

جناب نظم ۔ جو مطلب و مقصد کہ شدنی نہیں اس کی طلب میں تو دعا و نیاز کچھ بکار آمد نہیں ہوتا تو پھر اب ہم ایسی ہی دعا مانگیں گے جو تحصیل حاصل ہو۔ مثلاً اپنی درازی عمر کی دعا تو قبول نہ ہوگی تو پھر ہم درازی عمر خضر کی دعا کرتے ہیں۔ بس اسی کو قبول کرے۔ (جو بات کہ حاصل ہے اس کا قبول کرنا کیا)۔

جناب حسرت ۔ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں تو عجز و نیاز نے کچھ کام نہ دیا ناچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو۔ یعنی ایسی چیز مانگیں گے جو پہلے ہی سے دی جا چکی ہو۔ (یادگار غالب) خدا سے از راہ طعن و شوخی کہتا ہے کہ اور کوئی دعا تو قبول نہ ہوئی اسی کو قبول کر ۱۲ (یادگار غالب)

یہ وہی معنی ہیں جو جناب نظم نے لکھے ہیں۔ یادگار غالب میں باوجود تلاش مجھے نہ ملے۔ اس شعر کے پہلے مصرع کو شکایت ظفر شاہ میں اور دوسرے کو دعائے خضر سلطان میں مانا جائے۔

یہ شعر میری سمجھ سے باہر ہے۔ خضر سلطان سراج الدین ظفر شاہ اکبر ثانی کے ایک بیٹے کا نام ہے۔ شاید یہ معنی ہوں کہ معشوق سے تمنائے وصال یا کوئی اور مقصد عاجزی اور نیاز مندی کے ساتھ بھی پیش کرنے سے بھی یہ مطلب مشکل تو کسی طرح حل نہیں ہو سکتا، لہٰذا ہم خضر سلطان کی درازی عمر کی دعا کرتے ہیں۔ (اے اللہ اسے قبول (لطف یہ ہے کہ خضر علیہ السلام کی عمر دراز ہے) یہ دعا تو کوئی امر دشوار نہیں ضرور قبول ہوگی۔ یا پہلا مصرع بھی شکایت ظفر میں ہے۔

نہ ہو بہرزہ بیابان نورد وہم وجود ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

مسئلہ وحدت وجود۔ ہمہ اوست۔ ولا موجود بغیر اللہ کو کہہ رہے ہیں کہ تو جو ہستی اشیاء وہمی کے بیابان میں ہرزہ گردی کرتا رہتا ہے یعنی سوائے ہستی ذات الٰہی کے اور کسی چیز کے لیے ہستی قرار دیتا ہے یہ تیرا کار فضول ہے۔ یہ تیری راہ تصور میں پستی و بلندی ہے جس سے ہزاروں ٹھوکریں کھائے گا اور منزل مقصود نہ ہاتھ آئے گی۔ سیدھا راستہ یہی ہے کہ بجز وجود واجب دیگر اشیاء کو شئوں مختلفہ سمجھ اور کسی دوسری شئے کو ہست نہ مان۔

وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں  کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

جلوہ تماشا = بترکیب۔ قلب یعنی تماشائے جلوۂ حسن یار ۔یا۔ یا مختفی پر سے اضافت کا حذف دستور اہل ایران ہے۔ جیسے نظامی سکندر نامہ میں کہتے ہیں ؎

توئی کافریدی زیک قطرہ آب

اے قطرۂ آب۔ اسی طرح جلوۂ تماشا یعنی وصال ایک تماشے کا سامنے آنا ہے۔ یا۔ وصال جلوہ۔ بترکیب مضاف و مضاف الیہ۔ یعنی جلوۂ یار سے مل جانا یعنی وصال جلوۂ یار کا میسر ہونا۔ پرداز = بدال مہملہ جلا و صیقل۔

معشوق سے وصال ہونا تو ایک تماشے کا ظاہر ہونا ضرور ہے۔ مگر یہاں اتنا دماغ کہاں کہ انتظار کے آئینہ کو ہم جلا دیتے رہے ہیں۔ وہ نہ معلوم کب میسر ہو۔ اس سے پہلے ہی ہم کیوں نہ فنانی المحبوب ہو جائیں۔ اور اس وقت کا انتظار کیوں کریں۔ اور انتظار کا تحمل کب ہے۔

ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست  گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

ہوا = خواہش، آرزو یعنی عنصر متناسب ذرہ۔ آفتاب سے مراد ذات معشوق ۔یا۔ رخسارو چہرۂ یار۔

عاشق کا ہر ذرہ جسمانی چہرۂ یار کا پرستش گذار ہے۔ مرجانے اور خاک ہو جانے پر بھی خواہش جلوۂ ناز یار نہ گئی۔

نہ پوچھ وسعت مے خانۂ جنون غالبؔ  جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

خاک انداز = ایک لانبے بانس میں سوپ کی شکل کا ایک ظرف آہنی لگا ہوتا ہے جس سے کوڑا اور خاک دور پھینک دیتے ہیں۔ ایک = تنکیر کے لیے ہے اور اس سے تحقیر مقصود ہے۔ کاسۂ گردوں۔ چوں کہ فلک محیط کرہ زمین ہے اس لیے اسے آلۂ خاک انداز کہا ہے۔ یعنی مے خانۂ جنون میں وہ وسعت و فراخی ہے کہ کاسۂ آسمان کاسۂ مے کے لائق نہیں بلکہ اس مے خانہ کے لیے آلۂ خاک انداز ہونے کا سزاوار ہے۔

جنون کا استعارہ مے خانہ کے ساتھ بہت تاویل بعید کو وجہ شبہ میں چاہتا ہے۔ ایک لفظ

جنون سے چاہے غزل کا شعر کہہ لو۔

---

غزل ۳ اشعار ۲

وسعت سعی کرم دیکھ کہ سرتاسر خاک گذرے ہے آبلہ پا ابر گہر بار ہنوز ا۔غ ۱

ابر کو آبلہ پا بوجہ قطرات، بارش اور بسبب کرم گہر بار کہا ہے۔
ابر کی فراخی حوصلہ کرم اور سخاوت کرنے میں دیکھو کہ باوجود آبلہ پا ہونے کے بغیر سوال کل زمین پر گہر باری کرنے کے لیے خود دوڑتا پھرتا ہے۔ اس شعر کو غزل سے کیا تعلق۔ مگر شعرا نے سب قسم کے مضامین غزل میں کہنا اختیار کر لیا ہے اس لیئے انہوں نے بھی کہا۔

یک قلم کاغذ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت نقش پا میں ہے تب گرمی رفتار ہنوز

یک قلم = سرتاسر۔ با۔ بالکل۔ کاغذ۔ صفحہ اور نقش کی رعایت لفظی کے لیئے لائے ہیں۔ لفظ ہنوز کچھ چسپاں نہیں ہوتا جب تک کہ پہلے کسی بات کا ذکر نہ ہو۔ ورنہ کہنا اتنا کافی ہوتا ہے کہ میری گرمی رفتار کی حرارت کا یہ اثر ہے کہ صفحہ دشت مثل کاغذ آتش زدہ ہو رہا ہے۔ (شعر صاف ہے) اگرچہ صفحہ دشت کو کاغذ آتش زدہ بنا دیا لیکن نقش پا میں گرمی رفتار اب بھی باقی ہے۔
جناب حسرت نے وثوق صراحت شرح والہ دیکھنے سے یہ معنی لکھے ہیں کہ ہمارے نقش قدم میں گرمی رفتار کا بخار ہنوز باقی ہے۔ جس سے صفحہ دشت یکسر کاغذ آتش زدہ کے مانند جل رہا ہے۔

---

غزل ۴ اشعار ۳

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز ا۔غ ۲

وہ بت تو میرا عین ایمان ہے اور ایمان پر جان قربان کر دی جاتی ہے پھر میں اپنی جان کو اس سے عزیز کیسے کردوں۔ مذہب عشق میں تو یہ فعل کفر ہے۔

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے　　　ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تیرا تیر (مطلق۔ یا تیر نگاہ) دل کو توڑ کے پار تو ہو گیا۔ مگر دل سے اس کی محبت دور نہ ہوئی اسی کا خیال بندھا رہتا ہے۔ دیکھنے کی بات ہے کہ تیرے تیر کا پیکان۔ مجھے کس قدر عزیز ہے۔ پہلے مصرع میں تیر کا ذکر اور دوسرے میں پیکان کا قافیہ کی مجبوری سے فرمار ہے ہیں۔ دل سے نکلا یعنی پیکان تیر نکلا۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ　　　واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جناب نظم نے (لائے) اختیار کیا ہے۔ جناب نظم و حسرت آسمان سمجھ کے معنی نہیں لکھتے مگر (واقعہ سخت) کی تشریح مبتدیوں کے لیے چاہیے۔ عشق۔ فرقت۔ قتل۔ تحمل مصائب مراد ہیں۔
عشق کے مصائب کے برداشت کیئے بغیر چارہ نہیں۔ کیوں کہ ترک عشق نا ممکن ہے۔ مگر ساتھ ہی جان بھی عزیز ہے۔ اس کا فدا دینا بھی کوئی آسان کام نہیں۔

---

غزل ۵　　　　　　اشعار ۱۰

ابیاغ　نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نہ تو نغمۂ طرب کا گل ہوں اور نہ باجے کا پردہ ہوں۔ میں تو ہمہ تن درد و آزار ہوں اور اپنی مصیبت میں گرفتار۔
نغمہ کا استعارہ گل کے ساتھ مجھے اچھا نہ معلوم ہوا۔ بجائے اس کے گل عیش شاید بہتر ہو۔ گل نغمہ اور پردۂ ساز کا حاصل بھی تقریباً ایک ہے۔

تو اور آرائش خم کاکل　　　میں اور اندیشہائے دور و دراز

اندیشہائے دور و دراز کہ میرے رقیبوں سے زینت کر کے ملو گے۔ یا۔ اس زینت کو دیکھ کر اور عاشق بن بیٹھیں گے۔ یا مجھ پر یہ زینت اور ستم ڈھائیگی۔
تم کو ہر وقت آرائش خم کاکل کی فکر رہتی ہے کہ اوروں کو پھانسو۔ اور میں اس آرائش سے نہ معلوم کن کن افکار میں مبتلا رہتا ہوں۔

لافِ تمکین فریب سادہ دلی    ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

لاف = شیخی اور فخر دروغ۔ تمکین فریب = استقلال و تحمل کا دھوکا دینے والی۔ جناب نظم (سادہ دلی) کو منادی اور اے حرف ندا محذوف تجویز فرماتے ہیں۔

ہمارا بھولا پن استقلال و تحمل کے دھوکے کے فخر میں مبتلا رکھتا ہے۔ حالاں کہ ہمارے سینہ میں وہ وہ راز ہائے سینہ گداز ہیں کہ جن کا ضبط کرنا محال ہے۔ اور ان کا بصورت آہ و فغان ظاہر ہو جانا لازم ہے۔ یا۔ استقلال کا دعویٰ سادہ دلی کو محض دھوکا دینا ہے۔ (لاف تمکین) مبتدا۔ اور فریب سادہ دلی خبر ہے۔

ہوں گرفتارِ الفت صیاد    ورنہ باقی ہے قوت پرواز

محبوب کی محبت نے مجھے پھانس رکھا ہے۔ ورنہ ابھی قوت رہائی و آزادی مجھ میں باقی ہے۔

وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے    ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز

یہ کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں کہ غالب پر فارسیت اس قدر غالب ہے کہ ان کو امتیاز اردو اور فارسی میں باقی نہیں رہا۔ جہاں اردو کے محاورات آسانی سے بلا تکلف آسکتے ہیں وہاں بھی فارسی کے محاورہ کا اردو ترجمہ کر کے نظم فرماتے ہیں۔ چنانچہ۔ از کسے ناز کشیدن فارسی کا محاورہ ہے اس کا ترجمہ اس ستم گر سے ناز کھینچوں نظم فرمایا۔ حالاں کہ اردو کی بول چال کے موافق بسہولت یوں نظم ہوتا ہے ؎

وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر کے    ناز اٹھاؤں بجائے حسرت ناز

اب تک تو اس بات کی حسرت ہے کہ وہ ستم گر ہمارے ساتھ ناز سے پیش آئے۔ مگر تمنا اس بات کی رکھتے ہیں کہ خدا وہ دن لائے کہ وہ ہمارے ساتھ ناز کریں اور ہم انھیں بطیب خاطر اٹھائیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں اس جملہ میں "کہ اس ستم گر سے ناز کھینچوں" سے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مگر سے کا تعلق حسرت کے ساتھ ہے۔ یعنی جس طرح اس ستم گر سے حسرت ناز کھینچ رہا ہوں وہ بھی دن آئے کہ اسی طرح ناز کھینچوں۔ اور (سے) اس شعر میں معنی سبب کے لیے ہے۔ بلکہ دراصل ناز از ستم گر ہے۔ اور بجائے اضافہ ہے۔ یا ظروف از فقرہ کی طرح از براے بیاں ہے۔ پہلی صورت ٹھیک ہے۔

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خون    جس سے مژگان ہوئی نہ ہو گل باز

مژگان واحد کی جگہ پر بھی مستعمل ہے اور پلک پر قیاس کر کے مؤنث ہے۔ مگر زبان اُردو میں یہ لفظ مستعمل نہیں۔ اور مژہ کی جمع بھی ہے۔ اس صورت میں لکھنؤ کی بول چال کے موافق فعل جمع مذکر ہونا چاہیے۔ اور دلی کے لحاظ سے فعل مؤنث جیسا کہ شعر میں ہے۔ گل بازی = ہندوستان میں گیندے کا زیادہ تر اور گلاب کا پھول کم تر دو شخص لے کر آمنے سامنے کچھ فاصلے سے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک شخص اسے اُچھال کر تھپلی دے کر مقابل تک پہنچاتا ہے اور مقابل اس کو اسی طرح واپس کرتا ہے اور دونوں کی کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ ہم سے زمین پر نہ گرنے پائے۔ قطرۂ خون کو بوجہ سُرخی گل سے تشبیہ اور قطرہ خون کے پلکوں پر سے ٹپکنے میں گل بازی سے تشبیہ دی ہے۔ قافیہ گل باز کہنا مقصود ہوا۔ ورنہ خون کے آنسو رونے کی تشبیہ ایک کھیل کی چیز سے جس سے تفریح حاصل کرتے ہیں کچھ اچھی نہ معلوم ہوئی۔

ایک قطرۂ خون بھی میرے دل میں ایسا نہیں جسے پلکوں نے گل بازی میں صرف نہ کر دیا ہو۔ کثرت گریہ خونیں کا اظہار مقصود ہے۔

**اے ترا غمزہ یک قلم انگیز　　　اے ترا ظلم سر بسر انداز**

انگیز = بمعنی انگیزندہ اسم فاعل استعمال کیا ہے حالاں کہ اسم اور امر مل کے اسم فاعل بنتا ہے یا انگیزندہ اسم فاعل سماعی ہے۔

اے محبوب۔ تیرا غمزہ ہمہ تن برانگیختہ کرنے والا جذبات عشاق کا ہے۔ اور اے ظالم تیرا ستم بھی بالکل ناز و ادا کی طرح محبوب عشاق ہے۔

**تو ہوا جلوہ گر۔ مبارک ہو　　　ریزش سجدۂ جبین نیاز**

تم میرے پاس آ گئے۔ لہٰذا میری نیازمندی کی پیشانی کے سجدے تم کو مبارک ہوں۔

**مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا　　　میں غریب اور تو غریب نواز**

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس شعر میں (غضب نہ ہوا) کثیر المعنی ہے۔ اور بلاغت کے دس قاعدوں میں سے اس میں ایجاز بھی ہے۔ معنی زائد یہ ہیں کہ معشوق اس سے بات کرنا امر بے جا اور اپنی کسر شان سمجھتا تھا۔ عاشق کے دل میں اس کی بے اعتنائی اور تغافل کے شکوے بھرے تھے۔ اس کے بات کر لینے سے کچھ امید بندھی۔ اور شکووں کا اظہار اس لیے نہیں کرتا کہ کہیں پھر خفا نہ ہو جائے۔ اگر بجائے غضب (مہربانی کی)

(مرا خیال کیا) تو یہ معانی اس سے نہ پیدا ہوتے۔ لفظ غضب کے ساتھ یہ شعر مقام فہمایش میں ہے۔ اگر غضب کے بدلے (مہربانی کی۔ یا۔ مرا خیال کیا) کہتے تو مقام شکر میں ہوتا۔

غریب = یہاں مفلس اور نادار کے معنی میں ہے۔ اُردو میں اس کے یہی معنی ہیں۔ عربی اور فارسی میں بمعنی مسافر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مخاطبہ ظفر شاہ سے ہو۔ لفظ غریب اسی معنی کو چاہتا ہے۔

اسداللہ خان تمام ہوا      اے دریغا وہ رند شاہد باز

دریغا میں الف مدصوت کے لیئے ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں ندبہ اور نوحہ ہے۔ اور ندبہ مقام انشا میں ہے۔ تنہا حرف ندا لانا اور منادیٰ کو محذوف کرنا محاورہ ہے۔ لیکن اہل نحو ایسے مقام پر دریغ کو منادیٰ کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔

اسداللہ خان مر گئے۔ افسوس وہ بڑے رند اور عشق باز تھے۔

---

# ردیف سین مہملہ

غزل ۱      اشعار ۷

مژدہ اے شوق اسیری کہ نظر آتا ہے      دام خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس

پرندوں کے پکڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ جال لگا کے ایک پرندے کو پنجرہ میں بند کرکے رکھ دیتے ہیں جس قسم کے طائر شکار کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بولنے سے اس کے ہم جنس پرندے جال میں آتے ہیں اور پھنس جاتے ہیں۔ جناب حسرت ام سے دوسرا دام خالی مراد لیتے ہیں۔

اے شوق اسیری تجھے خوش خبری سُناتا ہوں کہ جال لگا ہے اور اس میں کوئی طائر پھنسا بھی نہیں ہے اور ال کے پاس ایک پرندہ پنجرہ میں بند بھی دکھائی دیتا ہے، لہٰذا جا اور اپنے آپ کو پھنسا کے صیاد سے قربت حاصل ۔ صیاد (محبوب) سے دور رہ کر اگر آزادی بھی ہو اس سے تو گرفتار دام اُلفت ہو کر قربت اچھی ہے۔

جگر تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا　　　جوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے پاس

جگر تسلی نہ ہوا = یہاں مصدر بمعنی اسم فاعل (تسلی) ہے۔ اردو کی بول چال کے خلاف مگر فارسی اور عربی میں مستعمل ہے۔ قولہ تعالیٰ ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین ای ہادیا۔ اور فارسی میں صائب فرماتے ہیں ؎

اے کزا اسلام بگفتار تسلی شدہ　　　کہ خدمت مردم چہ کم از زنار است

زید عدل کی طرح مبالغہ ہے۔

باوجودیکہ ہم نے ہر کانٹے دار درخت کے پاس اپنے پاؤں کے آبلوں سے خون کی ندی بہائی پھر بھی ہمارے جگر کو جو بیحد مشتاق آزار ہے ذرا بھی تسلی نہ ہوئی وہ اس سے بھی زیادہ خواست گار ایذا ہے۔

مند گئیں کھولتے کھولتے آنکھیں ہے ہے　　　خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

کھولتے کھولتے سے انتظار آمد یار کا اظہار مقصود ہے۔

وقت نزع باوجود ضعف چھپان پڑے ہوئے تھے مگر تمہاری آمد کے انتظار میں بار بار آنکھیں کھولتا تھا تاکہ وقت آخر ہی تم کو دیکھ لوں مگر افسوس کہ تمہارے آنے سے پہلے جان نکل گئی تب تم عاشق بیمار کے پاس آئے (خوب وقت آئے) سے معشوق پر طعن کرنا مقصود ہے ؎

کھولتے کھولتے آنکھیں مری جب بند ہوئیں

مند گئیں ٹھیٹ ہندی باقی الفاظ شعر کے ساتھ جوڑ نہیں کھاتا۔ بند ہو گئیں ہوتا تو اچھا تھا۔ اسی طرح مولوی علی میاں صاحب کامل لکھنوی کے اس شعر میں ؎

رسیوں کو کھا گیا فرزند عمران کا عصا　　　شعبدہ پھر شعبدہ اعجاز پھر اعجاز تھا

" رسیوں " ہے کہ عورتیں سانپ کو کہتی ہیں۔ کہاں باقی الفاظ پر شان و شوکت اور کہاں رسیاں۔ اسی طرح اس شعر میں مند گئیں ہے۔

میں بھی رک رک کے نہ مرتا۔ جو زباں کے بدلے　　　دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غم خوار کے پاس

میرے ناصح اور غم خوار جو مجھے عشق کی وجہ سے شماتت اور ملامت کرتے ہیں اور ترک عشق کا مشورہ دیتے ہیں جو مجھ سے ممکن نہیں یہ باتیں ان کی میرے لیے کند چھری کا کام کرتی ہیں۔ اس کے بجائے اگر ایک تیز خنجر ان کے

پاس ہوتا اور وہ مجھے اک دم ذبح کر دیتے تو اس سے بہتر تھا۔

دہن شیریں میں جا بیٹھئے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہو جیئے خوبان دل آزار کے پاس

بیٹھنے اور کھڑے ہونے میں صنعت لکانو ہے

دہن شیر میں جا بیٹھ دیکن اے دل
نہ کھڑا ہو کبھی خوبان دلِ آزار کے پاس

یہ حسینان دنیا ایسے دل آزار ہیں کہ ان کے پاس پھٹکنا بھی نہ چاہیے۔ ان کے پاس جانے سے تو شیر کے منہ میں چلا جانا کہیں بہتر ہے۔ یہ تو جلا جلا کے مارتے ہیں۔

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

تمہیں دیکھ کر تمہارے آب رخ سے چوں کہ چمن میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے گلہائے چمن افراط نمود شوق میں تمہاری پگڑی تک خود بخود پہنچ جاتے ہیں (زینت کے لیے پھول پگڑی میں لگاتے ہیں)۔

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس شعر میں (وہ) ان معنوں کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ معشوق جس سے خطاب ہے وہ اس واقعہ سے ناواقف نہیں جبھی تو یہ اسے یاد دلاتا ہے۔ اور (آکر) کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس وحشی کا یہ دستور تھا۔

غالب وحشی تیری دیوار سے سر پھوڑ کے مر گیا۔ افسوس ہے۔ مگر اس کا تیری دیوار کے پاس آ کے بیٹھنا اب بھی یاد آتا ہے۔

---

# ردیف شین معجمہ

غزل ۱ اشعار ۲

ص ۲۹۶ غ ۲
نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے لگادے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

جوہر آئینۂ فولادی = کو استعارۃً خس کہا ہے۔ طراوت = تری و تازگی۔ تر اور گیلی چیز آگ نہیں قبول کرتی ہے۔ روئے نگار = محبوب کے چہرہ کو آتش ناک و تاب ناک تجویز کرتے ہیں۔ اور ہری گھانس تر ہوتی ہے۔ اگر تمہاری ڈاڑھی کے سبزہ سے جوہر آئینہ جو بمنزلۂ خس ہے تری نہ حاصل کرے تو خس جوہر آئینہ میں تمہارے روئے تابناک سے آگ لگ جائے۔

فروغ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکل عاشق نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

فروغ حسن = کو آتش کے ساتھ اور عاشق کو شمع کے ساتھ اور رشتہ شمع کو خار کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ مصرع ثانی تمثیل ہے۔

حل ہونا = ایک مصدر مرکب ہے۔ اور حل ہوتی ہے۔ صیغہ حال ہے جس کا فاعل مشکل ہے۔ نثر اس مصرع کی یوں ہوئی کہ فروغ حسن محبوب سے مشکل عاشق حل ہوتی ہے۔ پا = اُردو میں بلا عطف و اضافہ کیسا ناگوار سمع ہے۔

فروغ حُسن دل داری سے عاشق کی مشکل حل ہوتی ہے۔ جس طرح شمع کا شعلہ جب تک کہ پائے شمع سے خار رشتہ نہ نکالے تو وہ نکل نہیں سکتا۔

---

# ردیف عین مہملہ

غزل ۱ — شعر ۱

مہغ ۱

جادۂ رہ۔ خور کو وقت شام ہے تار شعاع　　چرخ وا کرتا ہے ماہ نو سے آغوش وداع

جادۂ رہ = جادہ شاہراہ۔ مشہور معنی پگ ڈنڈی۔ اضافہ خاص کی طرف عام۔ خور = (رپا) کی طرح اُردو میں بلا عطف واضافہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لفظ مہر اس سے زیادہ مانوس لفظ اُردو میں ہے ؎

جادہ راہِ مہر وقت شام ہے تار شعاع

وقت شام آفتاب کے لیئے تار شعاع جادہ راہ ہے۔ چوں کہ آفتاب رخصت ہو رہا ہے اس لیئے آسمان ہلال سے آغوش ملنے کے لیئے برائے رخصت مہر کھولے ہوئے ہے۔ اس مطلع کو غزل سے کیا تعلق۔ کسی قصیدہ کا مطلع ہو سکتا ہے۔

---

غزل ۱ — اشعار ۷

رخ نگار سے ہے سوز جاودانی شمع　　ہوئی ہے آتش گل آب زندگانی شمع　　مہغ

سوز جاودانی = شمع کا جلتے رہنا ہی اُس کی زندگی ہے۔ یہ حسن تعلیل یا ادعائے شاعرانہ ہے کہ شمع کا جلنا رخ روشن محبوب کی وجہ سے ہے۔ آتش گل سے مراد رخسار تابان محبوب ہے۔ اور گل شمع کے جلے ہوئے سیاہ تاگے کو بھی کہتے ہیں یہ معنی بطرف خوبی ہیں۔ آب زندگانی = آب حیات۔ آب و آتش = میں صنعت ہے۔ سوز۔ شمع۔ آتش الفاظ متناسب ہیں۔

شمع کا روشن رہنا چہرۂ تابناک دل دار کی وجہ سے ہے۔ رخسار تاباں نگار شمع کے لیئے آب حیات کا کام کر رہا ہے۔ شمع کا جلتے رہنا ہی اس کی زندگی ہے اور بجھنا موت ہے۔

زبان اہل زبان میں ہے مرگ خاموشی　　یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

روشن ہونا = واضح اور ظاہر ہونا فارسی کا محاورہ ہے نہ اُردو کا۔ رو = بمعنی چہرہ اور شن کلمہ نسبت سے مرکب ہے جیسے گلشن میں۔ جسم انسانی میں سب سے زیادہ نمایاں چہرہ ہوتا ہے اس لیے بمعنی ظاہر ہے۔ خاموشی = بجھ جانا شمع و چراغ کا۔ بجھی ہوئی شمع کو کشتہ یا مردہ کہتے ہیں۔ اور خموشی بمعنی سکوت بھی ہے۔

زبان ۔ خاموشی ۔ بزم ۔ روشن ۔ شمع میں مراعاۃ النظیر اور ابہام تناسب ہے۔ اہلِ زبان خاموشی شمع کی تعبیر اس کی موت کے ساتھ کرتے ہیں۔ بزم میں یہ بات بزبانِ شمع واضح ہوگئی۔ اسی طرح عاشق کا آہ و فغاں نہ کرنا یا شکوہ و شکایت سے باز رہنا اس کے لئے بمنزلہ مرگ ہے۔

کرے ہے صرف بایماء شعلہ قصہ تمام　　بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیٔ شمع

قصہ تمام = مرجانا ۔ اہل فنا ۔ صوفی ۔ فسانہ خوانی ۔ زبان حال سے اپنے سوز پنہانی کا اظہار ۔ قصہ تمام کے ساتھ فسانہ خوانی الفاظ متناسب ہیں ہے۔

شمع اپنی سوزش باطنی کے ایماء سے اہل تصوف کی طرح شعلہ عشق سے اپنے آپ کو فنا فی الذات کر دیتی ہے۔ شمع جلتے جلتے سب جل جاتی ہے۔ اسے فنا کہا۔

غم اس کو حسرت پروانہ کا ہے اے شعلہ　　ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع

چوں کہ کوئی حسرت پروانہ کی شمع سے پوری نہیں ہوتی ہے وہ اس سے پہلے ہی جل مرتا ہے۔ اس کا غم شمع کو ہے اور اس غم نے اسے ناتوان و ضعیف کر دیا ہے جس کا اظہار شعلہ کی لرزش اور تھرتھرانے سے ہو رہا ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ شعلہ سے خطاب اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ان کی رائے کے موافق یہ شعر یوں ہو سکتا ہے ؎

غم اس کو حسرت پروانہ کا یقینی ہے

یا ؎

ضرور حسرت پروانہ کا ہے غم اس کو　　عیاں ہے لرزش شعلہ سے ناتوانیٔ شمع

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے　　بجلوہ ریزی باد و بہ پرفشانیٔ شمع

اہتزاز = جنبش جسم بحالت خوشی ۔ نشاط (بہ) جلوہ ریزی اور پرفشانی پر قسم یا تشبیہ کے لئے ہے۔ پرفشانی = بمعنی اضطراب و بے قراری ۔ مگر شمع کے ساتھ کوئی لفظی مناسبت نہیں ہے۔ اضطراب سے مراد شمع کا

جھلملانا ہے۔ اگر گل فشانی ہو تو لفظ گل مناسب شمع ہوگا۔

تیرا تصور ہی روح میں نشاط پیدا کر دیتا ہے۔ اور بھڑکا دیتا ہے۔ قسم ہے ہوا کے چلنے اور قسم ہے شمع کے جھلملانے کی۔ یا جیسے ہوا چلتی ہے اور جیسے شمع جھلملاتی ہے۔ مصرع ثانی یوں ہو ؂

مثال جلوہ باد اور گلفشانی شمع

تو صاف ہو جاتا ہے یا پر فشانی ہی ہو۔ جیسے ہوا کے چلنے سے شمع کی لو میں جنبش پیدا ہوتی ہے۔

نشاط داغ غم عشق کی بہار نہ پوچھ　　شگفتگی ہے شہید گل خزانی شمع

غم عشق کے داغ سے جو نشاط حاصل ہے اس کی بہار حد توصیف سے باہر ہے۔ داغ غم عشق اگرچہ گل خزاں رسیدہ ہے۔ مگر خود شگفتگی اس پر مٹی ہوئی اور نثار ہے۔

جلے ہے دیکھ کے بالیں یار پر مجھ کو　　نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بدگمانی شمع

میں جو سرہانے یار کے پہنچا تو شمع مجھے بالیں پر دیکھ کے جلی کہ یہ جگہ تو میرے لیے مخصوص ہے۔ لیکن میرے دل پر داغ لگ گیا اور بدگمانی پیدا ہوئی کہ شاید شمع بھی عاشق محبوب ہے۔

---

# ردیف الفاء

غزل ۱　　　　اشعار ۲

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش　　مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

وداع ہوش = ہوش کا باقی رکھنا یا رخصت کر دینا انسان کا فعل اختیاری نہیں۔ حیف = عربی میں بمعنی ظلم اور فارسی میں بمعنی افسوس مستعمل ہے۔ مجبور جبر سے صیغہ مفعول ہے اس کی مناسبت سے لفظ اختیار لائے۔ ہوش کا وداع کرنا = بے ہوش یا دیوانہ ہو جانا۔

رقیب کے ڈر کے مارے ہم بے ہوش یا دیوانے بھی نہیں ہو سکتے، کیوں کہ ہمارا راز عشق وہ فاش کر دے گا۔ اس لیے کہ ہماری بے ہوشی اور دیوانگی سے ہمارا عاشق ہونا سمجھ لے گا۔ اور ہم کو افشار راز محبت منظور نہیں اے

اختیار افسوس ہے ہماری بے اختیاری و مجبوری پر کہ ہم کتنے لاچار ہیں۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے　　　اے ناتمامی نفس شعلہ بار حیف

ہمارا دل اس بات پر جلتا ہے کہ ہم اک دم کیوں نہ جل کے رہ گئے کہ قصہ تمام ہو جاتا۔ ہم کو اپنے نفس شعلہ بار کی ناتمامی پر افسوس آتا ہے۔

---

# ردیف کاف عربی

غزل ۱　　　　اشعار ۸

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک　　　کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک　　وبع

بچوں کو کسی کی پروا کب ہوتی ہے وہ تو اپنی تفریح کے لیے دیوانہ کو ڈھیلے مار اکرتے ہیں۔ اگر ان کو ذرا بھی پروا ہوتی تو مجھ ایسے ایذا دوست پر پتھر اؤ کرنے کی جگہ میرے زخموں پر نمک چھڑکتے۔ ورنہ ان کے پتھروں ہی میں نمک ہوتا کہ وہ میرے زخموں کو بڑھا دیتا اور مجھے لطف و مزہ آتا۔

گرد راہ یار ہے سامان ناز زخم دل　　　ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

کس قدر = عظمت کے لیے ہے اور جناب نظم تحقیر کے لیے بھی مانتے ہیں۔ محل۔ اور طرز ادا۔ اور لفظ ورنہ تحقیر کے معنی سے ابا رکرتا ہے۔

میرے زخم دل میں تو گرد راہ یار بھری ہے اور میرے زخم دل کو اسی پر ناز ہے۔ ورنہ دنیا میں تو نمک بکثرت پیدا ہوتا ہے جتنا جی چاہتا زخم دل میں بھر لیتے۔ مگر نمک میں گرد راہ یار کی بات کہاں۔

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو　　　نالہ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

ہو جیو اب متروک ہے۔ لف ونشر غیر مرتب کر کے مصرع یوں ہو سکتا ہے ؎

ہو مبارک تجھ کو اور مجھ کو بھی ارزانی رہے

ارزانی = ضد گرانی۔ بخشش۔ مفت۔

چوں کہ میں عاشق ہوں اور عاشق ہمیشہ تکالیف میں رہتے ہیں اور تکالیف کو پسند کرتے ہیں اس لیئے مجھے نالہ بلبل کا ڈر نصیب رہے۔ اور تم محبوب حسین ہو اور حسین ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں لہٰذا خندۂ گل کا مزہ اور لطف تمہیں مبارک ہو اور ہمیشہ ہنستے اور خوش رہو۔

شور جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج　　　گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

شور = جوش و خروش و نمکینی و بمعنی شہرت۔ آخری معنی کے سوا اور معانی صفات دریا کے ہوتے ہیں

جولاں = گھوڑا دوڑانا۔

سمندر کے کنارہ آج کس شہسوار کے گھوڑا دوڑانے کا شور تھا کہ ساحل سے گھوڑا دوڑانے میں جو گرد اُٹھی اس نے موج دریا کے زخم پر نمک کا کام کیا۔ یعنی دریا کو بے چین کر دیا کہ کاش ہم ساحل کی طرح خشک ہوتے اور محبوب اپنا گھوڑا ہماری زمین پر دوڑاتا۔ زخم موجہ دریا پر نمک چھڑکنے کی تاویل کرتا ہے۔ جو جس کی سمجھ میں آتا ہے ویسی وہ تاویل کرتا ہے۔ سمندر کا پانی نمکین ہوتا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ : دریا کے کنارہ معشوق کے گھوڑے کو جولان کرنا ایسا پر شور تھا کہ گرد ساحل کو نمک بنا دیا۔ زور و شور دریا کے صفات میں سے ہے۔ یہ صفت اس کے جولان میں دیکھ کر موج کے زخم میں نمک لگنے لگا یعنی رشک سے۔

جناب حسرت۔ توسن یار کے جولان پر شور کے اثر سے گرد ساحل نمک بن کر موج دریا کے زخم رشک پر نمک افشانی کر رہی ہے۔

رشک یہ کہ دریا کے جوش و خروش کی اس کے مقابلہ میں کچھ ہستی تیز تر ہے میں یہی نہیں سمجھا کہ زخم موجہ دریا کہاں سے آیا۔ اور کس سبب سے اُس کا زخم ہے۔

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ　　　یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

سبحان اللہ اُس محبوب کا کیا کہنا۔ ہے کہ جہاں وہ نمک دیکھتا ہے مجھے یاد کرتا ہے۔ یہ اس کا یاد کرنا میرے زخم جگر کی داد دیتا ہے۔ واہ واہ = بطور طعن ہے۔ اور معشوق کی شوخی کا بیان ہے۔

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے　　　دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

دل جو ابھی زخمی نہیں وہ خواہان زخم ہے اور اعضائے جسمانی جو مجروح ہو چکے ہیں وہ طلب گار نمک ہیں۔

ان کی خواہش پوری کیئے ہوئے بغیر چلے جانا نہایت افسوس کے لائق بات ہے۔ دل کی خواہش بھی پوری کرنا چاہیئے۔

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیر درد　　　زخم مثل خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک

منت کھینچنا = پھر وہی فارسی محاورہ منت کشیدن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں منت اُٹھانا بولتے ہیں۔ (احسان اٹھانے کے قیاس پر)۔ توفیر = زیادتی۔ زخم کے دونوں لب (کنارے الگ ہونے کی وجہ سے اس کا خندہ کے ساتھ استعارہ کرتے ہیں)۔ خندۂ قاتل = محبوب کی ہنسی نمکین اور مزہ دار معلوم ہوتی ہے۔

قتل ہو کر درد میں اضافہ کرنے کے لیئے رقیب کا احسان اس سے سفارش کرا کے کیوں اُٹھاؤں وہ تو بڑی خوشی سے اس بارے میں سفارش کر دے گا۔ کیوں کہ اس میں اُس کے دل کی خوشی ہے۔ وہ قاتل جو چرکے لگا رہا ہے اور اس سے زخم پیدا ہو رہے ہیں ان زخموں سے ہمیں خندۂ قاتل کا ایسا مزہ مل رہا ہے کیوں کہ قاتل کا منشا پورا ہو رہا ہے۔

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں　　　زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

وجد = استغنا و حب شدید۔ (جوش مراد ہے) فرط کے ہوتے ہوئے ٹیڑھا ہی لفظ اختیار کیا۔ میں = جو مصرع ثانی میں ہے اس کی (تو تو) جگہ صاف تھا (اگرچہ تو تو (تُ تو) میں تنافر ہے) غالب اور مخاطب میں صرف تغایر اعتباری ہے ورنہ مراد دونوں سے ایک ذات ہے۔ اور ممکن ہے کہ تنافر سے احتراز کیا ہو۔ اگرچہ ایسا تنافر ان کے کلام میں حد سے متجاوز ہے اس لیئے (میں) لانا پسند کیا۔ عورتوں میں یہ بات مشہور ہے کہ نمک اگر گر پڑے اور اسے نہ اُٹھایا جائے تو قیامت میں اسے پلکوں سے اٹھانا پڑے گا۔

اے غالب تجھے اپنے وہ دن بھی یاد ہیں کہ تو ایذا، دوستی کی وجہ سے اگر نمک گر پڑتا تھا تو تو اسے پلکوں سے جوش و افراط ذوق میں بہت رغبت اور عزت کے ساتھ اٹھا کے پھر زخم میں رکھ لیتا تھا۔ مگر اب افسردگی و مایوسی۔ اور ناتوانی کی وجہ سے پہلے کی ایسی بات تجھ میں باقی نہ رہی۔

---

غزل ۲　　　اشعار ۷

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک　　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

جناب نظم ردیف میں ہوتے (تائے فوقانی) اور جناب حسرت نون کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ہوتے تائے مثنا فوقانی بھی بمعنی مصدر ہے۔ اور دونوں طرح بولتے ہیں۔ یہی جھگڑا اترے بیائے مجہول اور بیائے معروف میں ہے۔

جناب نظم (سر ہونا) کے معنی سمجھ جانے کے لکھتے ہیں۔ اور سر کے نیچے زیر بھی لگا ہے۔ اور بیشک اُردو میں یہ محاورہ بکسر سین ہی ہے پھر اثر اور خبر وغیرہ کے ساتھ قافیہ کیسے ہو۔

سر ہونے (بکسر سین) کے دوسرے معنی پیچھے پڑ جانے کے ہیں۔ تیسرے معنی کسی سے اُلجھ پڑنے کے ہیں۔ اگرچہ فارسی کا لفظ سر بفتح سین ہے مگر اُردو میں بہت جگہ بکسر سین ہی ہو گیا ہے۔ مثلاً بکری کی سری۔ اگر اسے بفتح پڑھیں تو کانوں کو سخت ناگوار ہوتا ہے۔

جناب حسرت نے اس غزل کے صرف ساتویں شعر کے معنی لکھے۔ اور جناب نظم فرماتے ہیں۔ جب تک تیری زلف میرے حال سے باخبر ہو میرا کام تمام ہو جائے گا۔

دل زلفوں میں پھنسا ہوا شاعر کہا کرتے ہیں۔ اگر شعر میں کہیں ذکر دل کا ہوتا تو کہہ سکتے تھے کہ زلف سے امید اعانت دل کی جو تو بے جا نہیں۔ یہاں تو محل اس کا ہے کہ مصرع ثانی یوں ہو ؎

کون جیتا ہے تمہیں میری خبر ہونے تک

اس شعر کے الفاظ۔ زلف اور سر ہونے کی وجہ سے ہیں اس مثل الغریق یتشبث بالحشیش کا مصداق ہو رہا ہوں۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارتا ہوں مگر ساحل مقصود ہاتھ نہیں آتا دل کا لفظ شعر بھر میں نہیں جو لفظ زلف کام دے۔ زلف اور سر الفاظ متناسب ضرور ہیں مجبور ہو کے مصرع ثانی کی ترمیم یوں کرتا ہوں ؎

کون جیتا ہے

بہر صورت خبر۔ نظر۔ اثر کے ساتھ سر کا۔ اور سر ہونے کے معنی بنانے سے میں عاجز ہوں۔ اور جن اشعار کے معانی کہنے سے میں نے اظہار عجز کیا ہے پھر بھی انل سٹ کچھ معنی لکھ دیئے ہیں، مگر یہاں (زلف کے سر ہونے) کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں۔ تینوں معنی میں سے کسی کے ساتھ میں ربط نہیں دے سکتا ہوں۔

## تیری زلف کے سر ہونے تک یا زلف کے تیرے سر ہونے تک

سر ہونے کے معنی اگر یہ کہے جائیں کہ تم ابھی کم سن ہو اور تمہارے سر پر ابھی چھوٹے چھوٹے بال مینڈھیاں گوندھنے کے لائق ہیں۔ جب تک عالم شباب میں تمہاری زلفیں بڑھیں۔ اور تمہیں عاشق صادق و کاذب میں امتیاز پیدا ہو اس وقت تک ہم زندہ ہی کب رہیں گے۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ　　　دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

دنیا محل حوادث ہے کوئی منٹ خطرہ سے خالی نہیں۔ مقصد میں کامیاب ہونے کے لیئے نہ معلوم کیا کیا مصائب برداشت کرنا پڑیں گے۔ اس مطلب کو تمثیلاً ادا کیا ہے۔ مصرع ثانی تمثیل ہے ع٥

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب　　　دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

عاشقی میں اگر کوئی کام بنتا بھی ہے تو اس میں دیر لگتی ہے۔ اور تمنا حصول مطلوب کے لیئے بے چین ہے۔ اور جلدی کرتی ہے۔ جب تک کہ جگر خون کے بہہ جائے اس وقت تک دل کو کیسے راضی کروں۔
رنگ کا لفظ خون کی مناسبت سے لائے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے۔ لیکن　　　خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یہ ہم مانتے ہیں کہ ہمارا حال زار یا حالتِ نزع کو سن کر تم غفلت سے کام نہ لوگے۔ مگر جب تک کہ تمہیں خبر ہو کیونکہ ہمارا حال تم سے کہنے والا کون ہے۔ اس وقت تک تو مرنا کیسا ہم خاک بھی ہو جائیں گے۔

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　　میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

پرتو آفتاب کی طرح تمہاری ذات ہے اور میں مثل شبنم ہوں۔ تیری ایک نظر عنایت سے میری ہستی قائم نہیں رہ سکتی جس طرح پرتو آفتاب سے شبنم فنا ہو جاتی ہے۔

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل　　　گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

اے غافل فرصت حیات دنیوی ایک لمحہ سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ ہنگامۂ بزم دنیوی کی خود مدت بقا بہت قلیل ہے۔ جیسے پتنگا چنگاری سے چٹخ کے الگ ہوتے ہی بجھ جاتا ہے۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

خود ہستی ہی موجب غم و ملال ہے۔ اس ملال کا علاج موت کے سوا اور کوئی نہیں۔ مر ہی کے اس سے نجات مل سکتی ہے۔ شمع کو دیکھو کہ ہر طرح رات بھر جلتی ہی رہتی ہے۔ صبح کے وقت جب بجھتی (مرتی ہے) ہے تب ہی

جلنے سے چھٹکارا ملتا ہے۔

## ردیف کاف فارسی

غزل ۱ — اشعار ۲

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

جب دعا کے قبول ہو جانے کا یقین ہے تو کوئی دعا نہ مانگو۔ اگر مانگو بھی تو صرف دلِ بے مدعا اور کچھ نہ مانگو۔ جب دلِ بے مدعا حاصل ہو گا تو ظاہر ہے پھر کسی بات کے لیئے دعائیں کی جائے گی۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہزاروں، لاکھوں حسرتیں زندگی میں ہماری پوری نہیں ہوتیں۔ جس طرح ہمارے گناہوں کا کوئی شمار نہیں اسی طرح ہماری بے شمار آرزوئیں بھی تھیں جو پوری نہ ہوئیں۔ لہٰذا اے اللہ قیامت میں ہم سے گناہوں کا حساب طلب نہ کر کہ ان کے حساب سے ہم کو اپنی حسرتوں کا شمار یاد آتا ہے۔ اور غم تازہ ہو جاتا ہے۔

## ردیف لام

غزل ۱ — اشعار ۹

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

وفاداری گل کے دھوکے پر بلبل کس قدر مٹی ہوئی ہے۔ حالاں کہ گل کو خود ہی ثبات و قیام نہیں تو پھر وہ اس چند روزہ زندگی میں وفا کیا کرے۔ اور معشوق بھی کہیں وفادار ہوتے ہیں۔ بلبل کے ان خیالات پر گلوں کو ہنسی آتی ہے۔

آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف — ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

نسیم ہوا، نرم جو درخت کو نہ ہلا سکے۔ تنسیم باب تفعیل سے اس کے معنی آزاد کرنے کے اور زندہ کرنے کے بھی ہیں۔ اور تنسیم باب تفعل سے بمعنی معطر کردن بھی ہے۔ ہوا، حُبّ و عشق و شوق۔

خزاں کا زمانہ ہے گُل کی پنکھڑیاں سب بکھر گئی ہیں۔ جن کو حلقہ دام شکستہ سے تشبیہ دی ہے۔ نسیم جو پھولوں کے کھلانے کے شوق میں گرفتار تھی۔ اب اسے کھلانے کی ضرورت نہ رہی اور وہ آزاد ہے لہٰذا اسے اپنی آزادی مبارک ہو۔ مگر ہم تو کسی وقت آزاد نہیں ہو سکتے۔ حالاں کہ آزادی بڑی چیز ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ۔ ہوائے گُل بمعنی شوق گُل ہے۔ گُل شگفتہ کو حلقہ شکستہ دام سے تشبیہ دی ہے اور نسیم سے خوشبو مراد ہے۔ جو گُل کے حلقے دام شوق کو توڑ کر آزاد ہو جاتی ہے۔ یعنی بوئے گُل کو آزادی مبارک ہو کہ سب پھول شگفتہ ہو گئے۔

ٹوٹے پڑے کی تعبیر مجھے شگفتگی گُل کے ساتھ اچھی نہ معلوم ہوئی چاہیے اس کی تشبیہ حلقہ دام شکستہ ہی سے کیوں نہ ہو۔

جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا     اے وائے نالۂ لب خونیں نوائے گُل

نوا۔ نغمہ و آہنگ و نالہ۔

جو ہے وہ گُل کی رنگینی کے دھوکے میں اس پر فریفتہ اور اپنے لیئے تفریح کا ایک آلہ سمجھتا ہے۔ حالاں کہ گریۂ خونیں اپنی بے ثباتی پر کر رہا ہے۔ نہایت افسوس کے لائق یہ امر ہے کہ اس کا گریہ خونیں لوگوں کی تفریح کا باعث ہو۔

خوش حال اس حریف سیہ مست کا کہ جو     رکھتا ہو مثل سایہ گُل سر بپائے گُل

سیہ مست = محبوب کو گُل سے۔ اور عاشق کو سایہ گُل سے تشبیہ ہے۔

اس مے خوار بدمست کا کیا کہنا ہے کہ جس کو اتنا موقع ملے کہ وہ معشوق کے پاؤں پر سر رکھے ہوئے اپنا عرض حال کر رہا ہو۔ سایہ گُل گُل سے نیچے ہوتا ہے۔ اتنی مناسبت سے گُل کے پاؤں پڑنے کو کہا۔

عاشق کو حریف (ہم پیشہ) معشوق اس کی محفل مے خواری میں شریک ہونے کی وجہ سے کہا۔

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیئے بہار     میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل

ایجاد کرتی ہے = پیدا کرتی ہے۔ اسے = مشار الیہ گُل۔ نفس بفتحتین دم۔ سانس۔ پٹ و نسیم الہوا (از منجد)۔ نفس عطر سا = معطر بشیں گُل کی۔

فصل بہار گُل کو تیرے ہی لیئے پیدا کرتی ہے۔ تاکہ تو اسے دستار یا جیب میں لگائے یا اس کا ہار پہنے۔ یا بستر پر بچھائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گُل میرا رقیب کامیاب ہے کہ اس کو تجھ سے قربت حاصل ہے۔ اور میں محروم۔

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے　　مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل

افسردگی خاطر و مایوسی کی وجہ سے میری صراحی شراب سے خالی پڑی ہے۔ اور دل میں سیر و تفریح باغ کا بھی خیال نہیں۔ لہٰذا مجھے ہوائے فصل بہار سے شرمندگی حاصل ہے کہ اس زمانہ عیش و نشاط میں بھی میں راغب عیش و نشاط نہیں۔

جناب نظم کا ارشاد ہے کہ یہ شعر ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ یعنی میرا شراب پینا اور باغوں کی سیر کرنا لوگ برا سمجھتے ہیں مگر ایسا نہ کروں تو مجھے بادِ بہار سے شرمندگی ہوتی ہے۔

سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کے　　خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل

سَطوت = عربی میں حملہ اور قہر کے معنی ہیں مگر فارسی اور اردو میں رعب و داب کے معنی ہیں۔ غیور = بفتح اول مبالغہ کا صیغہ ہے۔ بڑا غیرت والا۔ اور غیرت کے معنی حمیّت کی وجہ سے نامرغوب سے انکار۔ اور شراکت غیر سے کسی کام میں کراہت۔ خون = مجازاً بمعنی غم و اندوہ و تکلیف۔ سرخی گُل کی وجہ سے خون مناسب اور لفظ رنگ بھی ہے۔ الفاظ جلوہ اور ادا کے صرف کی خوبی کو میں نہ سمجھ سکا۔

محبوب کے حُسن غیرت مند کے رُعب سے رنگِ گُل جو باعث مسرت ہوتا ہے میری نگاہ میں خون معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کا حُسن غیور کب چاہتا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسری چیز سے بھی اس کا عاشق رغبت کرے۔

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک　　بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل

بے اختیار = کوئی ہنگامہ یا تماشا ہو لوگ فرطِ شوق میں اس کے دیکھنے کے لیئے بے تحاشا بھاگتے اور دوڑتے چلے جاتے ہیں۔

اے محبوب تمہارا جلوہ احساس نہ رکھنے والی چیزوں کو بھی دل سے بھاتا ہے۔ مگر تم ایسے خود دار ہو کہ جلوہ گر کہاں ہوتے ہو۔ محض تمہارے جلوہ کے دھوکے میں پھول کے پیچھے پھول تمہارے دیدار کے لیئے آج تک

دوڑے چلے آتے ہیں۔ مگر تم کسی کو کب ملتے ہو۔ حاصل یہ ہے کہ گل بلبل کے خود محبوب ہیں مگر تم وہ حسین ہو کہ حسینانِ جہاں بھی تمہارے دیدار کے مشتاق ہیں۔

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو　　جس کا خیال ہے گُلِ جَیبِ قبائے گُل

اس سے ہم آغوشی آرزو ہے = فارسی ۔" با او ہم آغوشی آرزو دارم " کا ترجمہ ہے ورنہ اُردو میں یوں بولتے ہیں ۔" اس سے ہم آغوشی کی آرزو رکھتا ہوں۔

اے غالب میں اس سے ہم آغوش ہونے کی تمنا رکھتا ہوں جس کا خیال قبائے گل کے لیئے مثلِ گُل زینت جیبِ گُل ہے۔ مصرعِ ثانی کے وہی معنی ہیں کہ حسین بھی تمہارے حُسن پر فریفتہ ہیں۔ آسی لکھتے ہیں کہ آغوشی کی (ی) دبتی ہے اور ایرانی اسے جائز سمجھتے ہیں۔ نہ (ی) دبتی ہے اور نہ ایرانی (ی) کا گرنا جائز سمجھتے ہیں۔ آغوشی کا الف دبتا ہے جو قاعدہ میں ہے۔

---

# ردیف میم

غزل ۱　　　　اشعار ۵

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس　　برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اول تو آزادوں کو غمِ دنیا ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی ہے تو ایک ثانیہ سے زیادہ نہیں اس لیئے ہم اپنے ماتم خانہ کی شمع برق کی بناتے ہیں کہ اس کی روشنی ایک نفس سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ برق سے مراد اگر آہ سوزاں لیں تو یہ معنی ہوں گے کہ ایک آہ کی اور جل بھن کے رہ گئے۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال　　ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بُت خانہ ہم

گنجفہ۔ وہ کھیل ہے جس کی آٹھ بازیاں ہوتی ہیں۔ اور ہر بازی کے بارہ گول پتے ہوتے ہیں۔ اکے سے لے کر دہلے تک دس پھر وزیر اور بادشاہ اس کو تین آدمی کھیلتے ہیں بعض مقام پر تاش کو گنجفہ کہتے ہیں۔ بازیوں کے نام یہ ہیں ؎

تاج است و زر سفید و شمشیر و غلام　　چنگ است و زر سرخ و برات است و قماش

ورق گردانی = ایک مرتبہ پتے تقسیم کیئے ہوئے جب کھیل چکتے ہیں تو پھر کھیلنے کے لیئے پتے خوب پھینٹے اور

تے ہیں۔ جناب آسی کہتے ہیں کہ گردانی میں بادی النظر میں (ی) مصدری معلوم ہوتی ہے، مگر دراصل یائے فاعلی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ مصدری ہی ہے اور زید عدل کی طرح مبالغہ کے لیئے ہے یعنی عین ورق گردانی ہیں۔ یا۔ مصرع یوں ہو ؎

ہیں ورق گردانِ نیرنگیِ یک بُت خانہ ہم

ورق گردان خود اسم فاعل ترکیبی ہے۔ اور اس میں یا مصدری کا اضافہ کیا ہے۔ جیسے عالم گیرسے عالم گیری۔ بت خانہ = بے مراد تمنا و آرزوئے کثیر۔ نیرنگ = سحر و افسوں و طلسم و مکر و حیلہ۔ وہیولائے ہر چیز۔ و خاکہ (بفتح اول و بکسر نیز)۔

کبھی کسی امید کے برآنے کا خیال بندھتا ہے۔ کبھی مایوسی اس سے ہوتی ہے۔ کبھی کوئی تمنا پیدا ہوتی ہے اور کبھی کوئی۔ الغرض ہمارا خیال ایک گنجفہ باز ہے جس طرح اس کے پاس کبھی کوئی بازی آتی ہے کبھی کوئی کبھی کوئی بازی کم کبھی کوئی بازی زیادہ آتی ہے۔ اسی طرح ہم بھی بت خانہ آرزو کی اُلٹ پلٹ کیا کرتے ہیں۔ مگر کوئی تمنا نہیں آتی۔

باوجودِ یک جہان ہنگامہ پیدائی نہیں ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

یک جہان ہنگامہ = ہنگامۂ کثیر۔

دل پروانہ کی محفل شبینہ میں ایک آگ بھڑک رہی ہے مگر دکھائی نہیں دیتی۔ اسی طرح ہنگامہ ہستی تو بہت کچھ ہے مگر حقیقۃً ہماری ہستی کا کوئی وجود نہیں۔ ہستی تو بس ایک ہی ہے۔

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمّتِ مردانہ ہم

طالب دنیا جو ہم نہیں ہیں وہ اپنے ضعف اور ناتوانی کی وجہ سے ہے۔ نہ قناعت کی وجہ سے۔ قناعت کی وجہ سے تارک الدنیا ہوتے تو اچھا ہی تھا۔ مگر بحالتِ موجودہ تو ہم ہمت مردانہ کی تکیہ گاہ کے لیئے وبال ہیں۔ اگر ہمت مردانہ ہوتی تو قناعت کو اپنا معتمد علیہ بناتے۔ اب تو بوجہ ضعف جستجوئے دنیا نہیں کرتے ہیں۔ یہ تو عصمت بی بی بے چادری ہوئی۔

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زندان خانہ ہم

دائم الحبس۔ چوں کہ تمناؤں اور حسرتوں کے پورا ہونے کی کبھی امید نہیں اس لیے ان کو دائم الحبس کہا۔

چوں کہ لاکھوں حسرتیں دل میں بھری پڑی ہیں اور ان کے پورا ہونے کی بھی امید نہیں اس لیئے ہم اپنے دل کو قید خانہ جانتے ہیں کہ جس میں تمنائیں ہمیشہ کے لیئے قید ہیں۔

---

غزل ۲ شعر ۱

ش ۴ غ ۱ متاع خانہ زنجیر جز صدا معلوم    یہ نالہ حاصل دل بستگی فراہم کر

دل بستگی کسی سے دل لگانا۔ تعلق خاطر۔ جب کسی چیز سے دل بستگی ہوتی ہے تو اس کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اس لیئے دل بستگی کو زنجیر سے تشبیہ دی۔ (کر) کی جگہ (کن) لانے سے پورا شعر فارسی کا ہو جاتا ہے۔ معلوم بمعنی لفظ (نہیں) مستعمل ہے (بہ نالہ) اردو میں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

جب تعلق خاطر معشوق یا دنیا سے ہے تو نالہ کے ساتھ بھی دل بستگی مہیا کرنا چاہیے۔ کیوں کہ زنجیر کا دھن دولت سوائے صدا اور کچھ نہیں ہے۔

---

غزل ۲ اشعار ۲

ش ۵ غ ۲ رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم    مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور

وطن سے دور پردیس میں مجھے موت آئی یا قاتل نے مارا۔ اس سے میری بے کسی کی شرم رہ گئی۔ کیوں کہ پردیس میں اگر کوئی رونے پیٹنے والا نہیں تو کوئی ہرج نہیں یہاں میرا کوئی آشنا سا نہیں۔ وطن میں مرتا تو بھی کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ کیوں کہ کسی سے اُمید اس کی نہ تھی۔ بلکہ ممکن تھا کہ اہل وطن شماتت۔ وطعن و تشنیع سے کام لیتے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اگر وطن میں مرتا تو اپنی بے کسی پر افتخار کیوں کر کرتا۔ یعنی یہ امر کے کسی کے لیئے ننگ کا باعث ہوتا۔

جناب حسرت فرماتے ہیں۔ وطن سے دور مارے جانے میں بے کسی کی شرم رہ گئی۔ کیوں کہ اگر وطن میں مارا جاتا تو بے کسی کی تکمیل نہ ہوتی۔ وہی معنی جناب نظم کے ہیں۔

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا    رکھ لیجو میرے دعویٰ وارستگی کی شرم

لیجو ۔ لیجیو کو بھی مخفف کر ڈالا ۔ اب رکھ لینا بولتے ہیں۔ کمین ۔ گھات ۔ تاک ۔ وارستہ ۔ آزاد ۔ غیر مقید ۔ رہا ۔

معشوق کی زلفوں کے حلقہ ہائے دام دل کے پھانسنے کی تاک میں لگے ہوئے ہیں۔ اے خدا میری آزادی کے دعوی کی لاج رکھ لینا۔ کہیں گرفتار نہ کرا دینا۔

---

## ردیف النون

غزل ۱ — شعر ۱

غ ۱ — غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں — لوں وام بخت خفتہ سے اک خواب خوش ولے

دام بوا د ۔ قرض ۔ اُدھار ۔ بخت خفتہ ۔ مقابل بخت بیدار (جاگتا ہوا نصیب) سوتے نصیب کی ضد خواب خوش ۔ میٹھی نیند ۔ مزیدار نیند ۔

اپنے سوتے ہوئے نصیب سے میٹھی نیند قرض لے تو لوں مگر ڈر تو اس بات کا لگا رہتا ہے کہ ادا کہاں سے کروں گا ۔ تکالیف ہجر میں نیند تو آتی ہی نہیں ۔

---

غزل ۲ — اشعار ۸

غ ۲ — وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

یہ ساری غزل ایک رنگ میں رنگی ہے ۔ اور زمانہ گذشتہ کی یاد میں کہی گئی ہے ۔ علامہ شبلی مرحوم اپنی کتاب شعر العجم میں اس بات کے شاکی ہیں کہ فارسی اور اردو میں غزل مسلسل ایک مضمون کی نہیں ہوتی ۔ اول تو یہ بات ہی کیا ہے ۔ مسلسل مضامین کے لئے انھوں نے قصائد کی تشبیب اور بعد تخلیص مدح ممدوح اور مثنوی ۔ اور واسوخت اور شہر آشوب کو انتخاب کر لیا ہے ۔ فارسی میں نظیری کی دو غزلیں مسلسل مضمون میں ہیں ۔ ایک تو وہ غزل ہے کہ جس میں معشوق کا عاشق ہو جانا بیان کیا ہے جس کا قافیہ و ردیف (نمناک نگر) ہے ۔ اور غالب نے بھی دو تین غزلیں مسلسل مضمون میں کہی ہیں ۔ ایک تو یہی ہے ۔

اب دل مردہ ہو چکا ہے نہ ہجر کا ملال اور نہ وصال کا خیال ہے ۔ اگلا زمانہ جس جوش شوق و ذوق میں

گذرتا تھا اب وہ حال باقی نہ رہا۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے  ذوق نظارۂ جمال کہاں

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا  شورِ سودائے خط و خال کہاں
شورش۔ ہنگامہ

تھی وہ اک شخص کے تصور سے  اب وہ رعنائی خیال کہاں

جمال = خوبی صورت و سیرت۔ سودا = اخلاط اربعہ میں سے ایک خلط BLACK BILE جو مولّد جنون ہوتا ہے۔ باقی تین صفرا۔ بلغم اور خون ہیں۔ شخص۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ لفظ بہت بلیغ ہے۔ اگر اس کے بدلے (اک شوخ) کہتے تو معشوق کی تعریف نکلتی۔ اور اس سے ظاہر ہوتا کہ ابھی تک ذوق و شوق باقی ہے۔ جو معشوق کو ایسے لفظ سے تعبیر کیا۔ اور یہ مقتضائے مقام کے خلاف ہوتا۔ جناب آسی اس نکتہ کو اپنی شرح میں نقل کرتے ہیں اور حوالہ نظم کا نہیں دیتے تاکہ ان کی پیدا دار معلوم ہو۔ رعنا = رعونت سے مؤنث کا صیغہ ہے اور رعونت کے معنی عربی میں: حمق و استرخا کے ہیں۔ اہلِ عجم بمعنی زن خود آرا و زیبا و خوشنما و چالاک و متکبر لاتے ہیں اور صراح و منتخب میں بمعنی زن گول (احمق) و سست (سسترخی) ملتے ہیں۔

اشعار صاف ہیں معنی لکھنے کی ضرورت نہیں۔

ایسا آسان نہیں لہو رونا  دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

دل میں طاقت نہ رہی۔ جگر حال سے بے حال ہو رہا ہے خون کے آنسو روتے روتے یا مصائبِ عشق برداشت کرتے کرتے خون سب خشک ہو گیا اور ذرا بھی باقی نہیں رہا۔ ایسی حالت میں خون کے آنسو کیسے بہائیں اور خون کہاں سے لائیں۔ جب کہ خون ہوتے ہوئے خون کے آنسو رونا دشوار ہے۔

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق  واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

نہ تو اب نقد دل ہمارے پاس ہے اور نہ اشرفی داغ پھر عشق کے جوئے خانہ میں جا کر داؤں کس چیز کا لگائیں۔ لہٰذا قمار خانہ عشق ہی سے ہاتھ اٹھا لیا۔

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں  میں کہاں اور یہ وبال کہاں

وبال - شدت خامہ - سوء العاقبتہ۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ عشق و عاشقی میں گذرتی تھی اور تعلقات دنیوی کے وبال سے ہمیں کچھ مطلب نہ تھا۔ اب وہی ہم ہیں کہ فکر دنیوی میں انہماک۔ اور دماغ سوزی ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ وہ عناصر میں اعتدال کہاں

مضمحل = اسم فاعل از اضمحلال جس کے معنی مٹ جانا۔ اور گھل جانا ہیں۔ عناصر = جمع عنصر۔ اصل ہیولیٰ۔ مادہ۔ جسم بسیط (آب و آتش و باد و خاک) (اب یہ عنصر نہ رہے)۔ حرکت فلکی کی تاثیر اور عناصر کے تاثر سے پہلے چیزوں کا وجود مانتے تھے۔ عناصر کو اُسطقسات اور اخشیجان بھی کہتے ہیں کیوں کہ آپس میں ضد ہیں۔ شیخ سعدی گلستان میں کہتے ہیں ؎

چار طبع مخالف و سرکش چند روزے بوند باہم خوش
چوں یکے زین چہار شد غالب جان شیریں برآید از قالب

جب تک ان چاروں میں اعتدال قائم رہتا ہے وہ چیز باقی رہتی ہے ادھر اعتدال گیا اور وہ چیز فنا ہوئی۔

اے غالبؔ اب زمانہ پیری ہے اور قوائے جسمانی میں اضمحلال پیدا ہو گیا ہے۔ جوانی کے زمانہ کا اعتدال اب عناصر میں نہیں رہا۔ اب کوئی کام کریں تو کیسے کریں طاقت جواب دے رہی ہے۔ موت کے دن قریب ہیں۔

---

غزل ۳ اشعار ۹

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

معشوق نے ہمارے ساتھ وفاداری کی تو رقیب اس کا نام جفا رکھتے ہیں (تاکہ معشوق چڑے اور آیندہ وفا نہ کرے (رقیب کب چاہتے ہیں کہ وہ ہم سے وفا کرے۔ ہمارے ساتھ وفا کرنا تو ان کے حق میں بے شک جفا ہے) اور یہ کوئی نئی بات نہیں پہلے ہی سے یہ بات چلی آتی ہے کہ اچھوں کو لوگ بُرا کہا کرتے ہیں۔ جو خود بُرے ہوتے ہیں ان کو اچھا بھی بُرا دکھائی دیتا ہے۔

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

دیکھا چاہیے کہ وہاں جاکر ہم کیا کہتے ہیں - یاد کیجیے کہ سن کردہ کیا کہتے ہیں - جناب نظم فرماتے ہیں کہ پہلی صورت
کثیر المعنی ہے - اس سے یہ معنی زائد ظاہر ہوتے ہیں کہ معشوق کے سامنے جاکر جو محویت وازخود رفتگی ہوگی اس
سبب سے کہ دل تو ابھی سے پریشان ہے - نتیجہ کلام یہ -
میں کہوں گا کچھ اور منھ سے کچھ نکلے گا - اس سبب سے کہ دل تو ابھی سے پریشان ہے -
ان کو دیکھ کر سب رنج والم بھول جاؤں گا اور مجھ سے کچھ بھی نہ کہا جائے گا - کہنے جانے تو ہیں ان الفاظ
سے کس قدر مجبوری و مایوسی ٹپکتی ہے - دونوں شعر اعلیٰ درجے کے ہیں - اور مطلع سے دوسرا شعر بڑھا ہوا
ہے -

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو  جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

وہ لوگ پرانے زمانہ کے بھولے بھالے سیدھے سادے ہیں جو شراب اور نغمہ کو غم دور کرنے والا کہتے ہیں -
لیکن ہمارا غم تو ان دونوں سے بھی دور نہیں ہوتا - یا یہ بیان ہی غلط ہے یا ہمارا غم ہی ایسا ہے کہ کسی چیز سے نہیں
ٹلتا - پھر ان لوگوں سے تعرض بے کار ہے -

دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے  اور پھر کون سے نالہ کو رسا کہتے ہیں

نالہ رسا - عاشق کا وہ نالہ جو معشوق پر اثر کرکے اسے رحیم بنادے -
ہمارا نالہ رسائی اور تاثیر اس کو سمجھتا ہے کہ جب ہمیں غش سے فرصت ملتی ہے تو یہ پھر ہمارے دل میں آ
پہنچتا ہے -

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود  قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پرے - دور لکھنؤ میں اب نہیں بولتے - ادراک - معلوم کرلینا - پالینا - قبلہ - خانہ کعبہ اس لیے کہ
نماز میں اسے سامنے رکھتے ہیں یعنی منھ اس کی طرف ہوتا ہے - مسجود - جسے سجدہ کریں یعنی خدا - قبلہ نما - ایک آلہ
جو سمت قبلہ کو بتاتا ہے -
اللہ تو ادراک انسانی سے باہر ہے - وہ جہت و مکان و زمان سے بری ہے - کعبہ بمنزلہ قبلہ نما ہے جو
ایک جہت معینہ کو بتاتا ہے -

پائے افگار پہ جیسے تجھے رحم آیا ہے  خار رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

مہر گیا ۔ چین میں ایک پودا ہے اس کی جڑیں دو پتلیاں آمنے سامنے منھ کئے ہوئے ہوتی ہیں ۔ کہتے ہیں
ان پتلیوں کو جو کوئی اپنے پاس رکھے اور جس کسی کے پاس جائے وہ اس پر مہربان ہو جاتا ہے ۔ اس کو عربی میں
یروح الصنم (حرف پنجم حا رحطی ۔ مگر برہان میں جیم سے صحیح بتایا ہے) کہتے ہیں اور ہندی میں لکھمنی اور انگریزی میں
ROOT OF MANDRAK کہتے ہیں ۔

جناب نظم اس کی تفصیل نہ لکھ سکے ۔ اور ترجمہ بھی گیاہ آفتاب کیا ۔ اگر ترجمہ ہی مقصود تھا تو گیاہ محبت ترجمہ کرتے ۔
اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ۔ "در علم لغت فرشتہ عاجز" ۔

تمہاری جستجو میں جو کانٹے میرے پاؤں میں چبھے ان سے جو زخم پڑے ان کو دیکھ کر تم کو مجھ پر رحم آگیا ۔ لہٰذا تیری
راہ کے کانٹوں نے میرے حق میں مہر گیا کا کام کیا ۔ تو ہم ان کو مہر گیا کیوں نہ کہیں ۔

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا　　　آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

ایک چنگاری عشق کی دل میں چھپی ہوئی ہے اس سے ہم گھبرانے کیوں لگے ۔ ہم جو خواہاں ہوا کرتے ہیں اس
سے تفریح مقصود نہیں بلکہ اشتعال اس چنگاری کا چاہتے ہیں ۔

جناب نظم فرماتے ہیں ۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ روح حیوانی جو دل میں ہے اس کی حرارت سے گھبرا کر انسان کو
سانس لینے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ اور اس کا اشتعال مطلوب ہوتا ہے ۔ اور یہی باعث ہے کہ ہوا سے
ضروریہ میں داخل ہے تاکہ بار بار سانس لینے سے حرارت غریزی کا اشتعال ہوتا رہے ۔ دوران خون کا مسئلہ جب سے
ثابت ہوا اس سے ظاہر ہو گیا کہ واقع میں ایسا ہی ہے کہ ہر سانس سے ہوا سے روح حیوانی کو اشتعال مطلوب ہے اور جو
ہوا باہر نکلتی ہے وہ بعینہ ویسی ہے جیسی ہوا کہ چراغ کی لو سے پیدا ہوتی ہے ۔ اس شعر سے مصنف کے فلسفیانہ مذاق
کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

حضرت نظم نے یہ تاویل جو کی وہ اس کے مصداق ہے : التاویل بما لا یرضی قائلہ
تو یوروپ والوں کی جدید ہے ۔ ڈاکٹر بجنوری نے بھی اپنی کتاب میں جدید مسائل
اشعار غالب میں ٹھونسا ہے ۔ اس وقت کہ علوم جدیدہ ہندوستان میں پڑھائے جاتے ہیں اس مسئلہ دوران خون کا رواج
اب تک ہندوستان میں نہیں تو پھر زمانہ غالب کا کیا ذکر ۔

شیخ سعدی دونوں سانسوں کی نسبت یوں ارشاد فرماتے ہیں ۔ ؎

ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات است　　　و چون بر می آید مفرح ذات

یہی مطلب غالب کا ہے ۔

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ     اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

نخوت ۔ بفتح افتخار دعظمت ۔ نام خدا ۔ درمیان مدح کسی شخص کے اس کلمہ کو بولتے ہیں تاکہ نظر نہ لگے۔
دیکھیئے اس شوخ کا فخر و غرور کیا رنگ لاتا ہے۔ اب تو ہم ان کی ہر اچھی اور بری بات پر "نام خدا" ان کے خوش
کرنے کے لیئے کہہ دیتے ہیں۔ وہ پھول کر اور زیادہ بیرخی اور مظالم سے کام لیں گے۔

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہہ دیں شاید     مر گیا غالب آشفتہ نوا ۔ کہتے ہیں

مرثیہ ۔ رثی یرثی سے مصدر بھی ۔ مردہ پر رونا۔ وحشت ۔ غلام علی ۔ شیفتہ نواب مصطفےٰ خان ۔ اردو میں
شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ دونوں مومن خان کے شاگرد تھے۔ بعد وفات مومن غالب کی
شاگردی اختیار کی ۔ نوا ۔ نالہ ۔ سامان ۔ روزی ۔ توشہ و آذوقہ ۔ آشفتہ پریشان ۔ کہویں کی جگہ اب کہیں
بولتے ہیں۔
لوگ کہتے ہیں کہ غالب آشفتہ نوا مر گیا۔ ممکن ہے کہ اس خبر کو سن کر وحشت اور شیفتہ غالب کا مرثیہ کہیں

---

غزل ۴     اشعار ۱۱

داغ ۱۱ آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں     ہے گریبان ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

جو گل کہ گلشن میں نہ ہو۔ گھورے پر ہو اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح جنون عشق ہوتے ہوئے گریبان
چاک ہو کر دامن تک نہ پہنچے ایسا گریبان تو پیراہن کے لیئے باعث ننگ و عار ہے۔

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں     رنگ ہو کر اڑ گیا جو خون کہ دامن میں نہیں

اے گریہ کمزوری و ناتوانی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ اب میرے جسم میں ایک قطرہ بھی خون کا باقی نہیں رہا۔ اور
اس سے پہلے جو خون کے آنسو رویا تھا اور ان سے دامن خون آلود ہو رہا تھا۔ وہ خون کچے رنگ کی طرح اڑ گیا۔
اردو میں جب نون والے الفاظ کہ جن میں نون بعد مدہوں اور یہ الفاظ مضاف و مضاف الیہ یا معطوف و
معطوف الیہ بھی نہ ہوں تو اعلان نون اخفاء نون سے زیادہ فصیح ہوتا ہے ۔ خون اور دامن کے درمیان (کہ) اگر نکال
ڈالا جائے تو اعلان نون ہو جاتا ہے۔ اور اس کے نکالنے سے جملہ اور معنی میں کچھ نقصان بھی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ گریہ سے خضاب نہایت تصنع ہے اور تکلیف نامعقول ہے تو پھر اس طرح بنا سکتے ہیں۔

ضعف سے اے جان کچھ باقی مرے تن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزاء نگاہ آفتاب ذرہ اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

روزن دیوار سے جو ذرات روشنی کو لہراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان کو ہباء منثورا نہ سمجھو بلکہ اجزاء نگاہ آفتاب کا اجتماع ہے۔ آفتاب بھی تمہارے حسن بے مثال کے دیدار کا مشتاق ہے اور تمہیں جھانک کر دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس کی بھی رسائی تم تک نہیں۔

کیا کہوں تاریکی زندان غم اندھیر ہے پنبہ نور صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

قید خانہ غم کے اندھیرے کو میں کیا بیان کروں۔ اندھیر مچا ہوا ہے۔ یا۔ بے حد تاریکی ہے۔ ایسی تاریکی کہ اگر اس زندان کے روزنوں میں روئی رکھ دو تو وہ نور صبح کا کام دے اسی روئی کے مضمون کو دوبارہ اس طرح کہا ہے۔

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے خرابہ کی شب مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز ہے انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

عشق کو برق اور ہستی کو خرمن سے استعارہ کیا ہے۔

عشق جس نے گھر کے گھر تباہ کر دیئے ہیں اسی سے زندگی کا لطف اور مزہ ہے۔ اگر برق عشق نہ ہو تو انجمن ہستی انجمن بے شمع کی طرح بے رونق ہے۔

انجمن انجم اور نون نسبت سے مرکب ہے۔ جمع ستارگان اور اجتماع مردم کی مناسبت سے محفل کو کہتے ہیں۔

خرمن خر تفخیم کے لیئے اور من ایک وزن ہے۔ بہت سے من۔ چوں کہ کھلیان میں غلہ کثیر ہوتا ہے اس لیئے یہ نام ہوا۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

میں جو زخموں میں ٹانکے دلواتا ہوں تو رقیب مجھ پر یہ طعن کرتے ہیں کہ تکلیف نہ برداشت کر سکا اس لیئے سلوا کے ان کے اچھے ہو جانے کی تدبیر اور علاج کر رہا ہے۔ یہ طعن اس کا اس وجہ سے ہے وہ سمجھتا ہے کہ سوئی کے چبھنے میں کوئی لذت نہیں ہوتی ہے۔ میرا یہ فعل تو ایذا دوستی کی وجہ سے چاہتا ہوں کہ ایذا اور بڑھ جائے۔ مجھے اس میں مزہ آتا ہے۔

بسکہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے　　جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

چوں کہ کسی کی بہار ناز پر ہم مرتے ہیں۔ اس لئے مرنے کے بعد قبر میں بھی انھیں ناز کے پھولوں کا تصور ہے۔ اور جلوۂ گل کے سوا ہمارے مدفن میں گرد کا نام بھی نہیں۔ ساون کے اندھے کو سب ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا　　خون بھی ذوق درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

ہیولیٰ = مادہ لفظ یونانی ہے۔ ناسور = وہ زخم جس کی نسبت خیال ہے کہ اچھا نہیں ہوتا۔ نواسیر جمع۔
ہر قطرۂ خون کا مادۂ ناسور ہے۔ لہٰذا میرے جسم میں خون بھی لذت درد سے خالی نہیں ہے۔

لے گئی مینا کی نخوت قلزم آشامی مری　　موج مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

قلزم = درمیان مصر و مکہ ایک مقام کہ قلزم اسی لیے کہتے ہیں جو کہ مصر کے شمال میں واقع ہے۔ اگرچہ ایک خاص سمندر کا نام ہے۔ مگر مطلق بحر کے معنی میں شعرا استعمال کرتے ہیں۔ قلزم آشام = وہ شخص جو سارا پانی قلزم کا پی جائے۔ رگ گردن = نخوت و غرور۔ مصرع ثانی اس معنی کو چاہتا ہے کہ "صراحی میں شراب نام کو بھی باقی نہ رہی"۔
ساقی کو بڑا غرور تھا کہ میں ہر ایک کو چھکا دیتا ہوں۔ مگر مجھ ایسے دھتی شراب دھکوسنے والے نے خم کے خم خالی کردیئے اور ساقی کی وہ نخوت سب مٹا کے رکھ دی۔

ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود　　قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں

ہر طرف سے کم زوری گھیرے ہوئے ہے اور پیسے ڈالتی ہے۔ تو اظہار ناتوانی ہو تو کیسے ہو۔ ہر طرف سے ضعف کے دباتے رہنے سے میرے تن کو کسی طرف جھکنے کی بھی گنجایش نہیں کہ لوگ میرا قد خمیدہ دیکھ کر میری کم زوری کا اندازہ کر سکیں۔

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر　　بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

وطن سے مراد آگرہ۔ اور مسافرت سے مراد دہلی۔ یا وطن سے مراد دہلی۔ اور پردیس سے مراد کلکتہ۔
اے غالبؔ دیس میں تمہاری کیا عزت تھی جو پردیس میں تمہاری کوئی قدر کرے۔ بلا تصنع اور بے شبہ یقیناً میں وہ تنکا ہوں (وہ مشت خس ہوں) کہ اگر گھورے پر ہوں تو ذلیل و خوار ہوں۔ اور اگر کسی کے گھر پہنچوں تو جھاڑ کے

پھینک دیتے ہیں ۔ ہاں اگر بھٹی تک رسائی ہو تو عین آتش ہو کر قابل قدر چیز ہو جاتا ہوں ۔ یعنی فنا ہو کر وصول الی اللہ و فنا فی اللہ کا مرتبہ مل سکتا ہے ۔

---

غزل ۵ اشعار ۴

عہدہ سے مدح ناز کے باہر نہ آسکا گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

عہدہ سے باہر آنا = از عہدۂ چیزے بر آمدن کا ترجمہ ہے ۔ ترجمہ ہو کر نہ فارسی کا محاورہ رہا اور نہ اُردو کا ۔ اُردو میں اس کی جگہ عہدہ برآ ہونا البتہ بولتے ہیں ۔

اس کے تو ہزاروں ناز اور سیکڑوں ادائیں ہیں میں کس کس کی تعریف کروں ۔ کثیر ہونے کی وجہ سے مجھ سے حق تعریف ادا نہ ہو سکا ۔ ایک ادا ہوتی اور میں اس کی تعریف نہ کر سکتا تو میں کہتا کہ مجھ سے اس کی تعریف قضا ہو گئی (ادا نہ ہوئی) مگر جب لاکھوں ہیں تو ان کی تعریف تو میری حد امکان سے باہر ہے ۔ (قضا اور ادا میں رعایت لفظی ہے) ۔

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں

حلقہائے زلف گویا چشم کشادہ ہیں جو دل کو تاک رہی ہیں کہ کسی طرح دلوں کو پھانس لیں ۔ اور تار زلف کی وجہ سے ان آنکھوں کی نگاہ سرمہ سا ہو رہی ہے ۔ جس طرح چشم سرمگیں دل کش ہوتی ہے اسی طرح یہ حلقہائے زلف بھی دل کشی میں طاق ہے ۔

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

میں ہوں کہ لاکھوں جگر خراش نالے کیا کرتا ہوں ۔ اور تو ہے کہ ایک نالہ کو بھی سُن کر کچھ اثر نہیں لیتا اور نہ رحم کرتا ہے ۔ یہ تو میں لکھ چکا ہوں کہ مصادر فارسیہ اُردو میں ناگوار سمع ہوتے ہیں مگر ان کے ہم عصر بھی کہتے تھے ۔

ظالم مرے گمان سے مجھے منفعل نہ چاہ ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

منفعل نہ چاہ فارسی منفعل مخواہ کا ترجمہ ہے اُردو میں منفعل نہ کر بولتے ہیں ۔ ہے ہے = عورتوں کی بول چال میں زیادہ ہے ۔

میں اپنے ظن و گمان سے تمہیں مہربان و وفادار سمجھے ہوئے ہوں۔ خدا ایسا نہ کرے کہ تمہارے ظالمانہ سلوک سے مجھے بھی تم کو بے وفا کہنا پڑے اور اپنے گمان سے مجھے شرمندہ ہونا پڑے کیوں کہ اس وقت گمان یہ طعنہ دے سکتا ہے کہ تم تو بڑا وفادار کہتے تھے۔ اب یہ کیا ہوا۔ اور مجھ سے سوا شرمندہ ہونے کے اور کوئی جواب بھی نہ بن پڑے گا۔

جناب نظم میرا گمان تجھے بے وفا کہتا ہے اور میں باوفا۔ ایسا نہ کر کہ مجھے اپنے گمان سے منفعل ہونا پڑے۔ مطلب یہ کہ بے وفائی نہ کر۔ خدانخواستہ مجھے بھی بے وفا کہنا پڑے۔

جناب حسرت۔ مجھ کو میرے گمان سے شرمندہ نہ کر۔ بھلا میں اور تجھ کو بے وفا خیال کروں۔ انھوں نے مجمل اور مختصر کرکے ایسا گول مول کر دیا کہ اب سمجھ نہیں سکتے کہ پہلے کون باوفا سمجھتا تھا اور بعد سلوک کس کو بے وفا کہنا پڑے گا۔ بلکہ انھوں نے مطلب ہی کچھ کا کچھ کر دیا۔

---

غزل ۶ اشعار ۳

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں جو پھر آ بھی نہ سکوں ۱۰۶

گذرا ہوا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ چنانچہ یہ مصرع کہاوت ہو گیا ہے ؎ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ میں گذرا ہوا وقت نہیں ہوں جو پھر ہاتھ نہ آؤں۔ جب چاہو مہربان ہو کے مجھے بلا سکتے ہو۔

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے بات کچھ سر تو نہیں ہے جو اُٹھا بھی نہ سکوں

کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے البتہ سر نہیں اُٹھا سکتا ہوں۔ بات تو ایسا بوجھ نہیں ہے جس کو نہ اُٹھا سکوں پھر اغیار جو طعنے دیتے ہیں اس کی مجھے شکایت کیوں ہو۔

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر! ورنہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

تکالیف موجودہ سے نجات پانے کے لیے زہر کھا کے مر جانا کوئی دشوار نہیں مگر زہر میسر نہیں ہوتا۔ تیرے ملنے کی قسم تو زہر نہیں ہے جو میں زہر نہ کھا سکوں۔ ہاں تیرے ملنے کی قسم نہیں کھا سکتا ہوں کہ وہ تیری رضا پر منحصر ہے۔ تینوں شعر اچھے ہیں۔ مگر اس شعر کے مصرع ثانی میں غضب کا تنافر تین کاف (کہ کھا) کے مجتمع ہو جانے سے پیدا ہو گیا ہے۔

---

غزل ۷ اشعار ۵

۱۲ ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

کھل جانا = بے تکلف ہو جانا۔ اچھا شعر ہے۔

وقت مے خواری کسی دن تو ہم سے بے تکلف اور بے حجاب ہو جاؤ۔ ورنہ ہم خود ایک دن دست درازی اور چھیڑ چھاڑ سے کام لیں گے۔ اگر ہمارے اس فعل سے تم کو شکایت کا موقع ملے گا۔ تو ہم اپنی مستی کا عذر پیش کر دیں گے کہ نشہ میں یہ حرکت ہم سے صادر ہو گئی۔

غرۂ اوج بنائے عالم امکان نہ ہو اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

غرّہ = مغرور۔ اوج = بلندی و شرف۔ عالم امکان = دنیائے موجودات۔ (بنائے عالم امکان) سے جناب آسی بلند عمارت مراد لیتے ہیں۔ ایک دن = مراد قیامت۔

اے انسان اس بات پر مغرور نہ ہو کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ اور تمام چیزیں انسان کے لیئے پیدا کی گئی ہیں جیسا کہ اس حدیث میں ہے خلقتك لاجلی و خلقت الکل لاجلك کیوں کہ اپنے مرتبہ بلند کے موافق اگر تجھ سے افعال سرزد نہیں ہوتے ہیں تو یہ شرف اور غرور سب دھرا رہ جائے گا اور اسفل السافلین میں تیری جگہ ہو گی۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پیتے تھے = شراب پیتے تھے۔ فاقہ مستی = مفلسی اور ناداری میں اللے تللے سے صرف کرنا۔

جناب آزاد دہلوی اپنے تذکرہ آب حیات میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ قرض خواہوں نے مرزا پر نالش کر دی۔ مفتی صدر الدین صاحب آزردہ جو غالب کے دوست تھے ان کی عدالت میں جواب دہی کے لیئے بلائے گئے تو ان کے سامنے یہ شعر پڑھا۔ اور مفتی صاحب نے ان کا قرضہ ادا کر دیا۔

شراب پیے بغیر چارہ نہ تھا۔ لہٰذا مجبور ہو کے قرض ہی لے کے پیتے تھے مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھے ہوئے تھے کہ ادا کرنا محال ہے۔ اس لیے ضرور ہے کہ ایک دن قرض خواہوں سے بر سر بازار تھکا ضرور ہو گا۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے　　بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

اگر نوائے شادی میسر نہیں تو نغمہ غم کو بھی غنیمت جاننا چاہیئے۔ کیوں کہ زندگی کا یہ ساز ایک۔ دن بالکل بے صدا ہو جائے گا۔ بے صدا ہونے سے تو بے سُرا ہونا بھی غنیمت ہے۔

دل سے خطاب کرکے اس کے لیئے کلمہ تعظیم (جانئے) کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیئے " جان۔ لے " ہونا چاہیے۔

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

لکھنؤ والوں پر یہ اعتراض ہے کہ شعرائے لکھنؤ کا معشوق بازاری۔ پیشہ والی رنڈی ہے۔ معشوق کو عصمت شعار با حیا۔ اور زیادہ سے زیادہ شوخ ہونا چاہیئے۔ کیا اس شعر سے عاشق و معشوق دونوں بازاری لوفر نہیں لگتے۔ شہدے نہیں معلوم ہوتے چاہے جو ابا ہی دھول دھپا اس نے کیا ہو۔

اے غالبؔ دھول دھپا کرنا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں۔ مگر ایک دن ہمیں پہلے دھول دھپا کر بیٹھے تھے۔

---

غزل ۸　　　　　　اشعار ۱۲

ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں　　اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

وہ ہم پر کتنی ہی جفا کریں اس کے ساتھ یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ ہم ترک وفا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جفا کرنے سے ان کا مقصد میری وفاداری کا امتحان لینا نہیں ہے بلکہ صرف چھیڑ اور انداز معشوقانہ دکھانا مطلوب ہے۔

کس منہ سے شکر کیجیئے اس لطف خاص کا　　پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

پائے سخن درمیان نیست، کا ترجمہ کر دیا جو فارسی کا محاورہ ہے۔ اُردو کا محاورہ نہیں۔

گو وہ مجھ سے براہ راست بات چیت نہیں کرتے ہیں مگر میرے حال کی پوچھ گچھ دوسروں سے کیا کرتے ہیں۔ میں اس لطف خاص کا شکر کس زبان سے ادا کروں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ شعر حمد میں بھی ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک لفظ "پرستش" اس کو مانع ہے۔ اُردو میں "پوچھنے" کے معنی خبر گیری۔ امداد وغیرہ کے ہیں مگر فارسی میں شاید یہ معنی پرسش کے نہیں۔

ہم کو ستم عزیز۔ ستم گر کو ہم عزیز ‎ ‎ ‎ ‎ نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ہم اس کے ستم کو عزیز رکھتے ہیں۔ کیوں کہ ہم کو وہ عزیز ہے۔ پس ؎

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

اور وہ ستم گر ہم کو دوست رکھتا ہے کیوں کہ ہم اس کے مظالم خوشی کے ساتھ سہتے ہیں اور ستم ہی کے خواہشمند رہتے ہیں ۔ جب ہماری خواہش کے موافق کام کرتا ہے تو نامہرباں کیوں ہوا۔ لہٰذا ستم من حیث ہو ستم اسے مہربان نہ مانیں تو پھر موافق خواہش کام کرنے کی وجہ سے نامہرباں بھی نہیں کہہ سکتے۔

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی ‎ ‎ ‎ ‎ آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

دُشت سنسکرت میں بھی دُشت بمعنی زشت وبد اور نام سے دشنام مرکب ہے ۔ یوں معنی گالی کے ہیں ۔ شعرا معشوق کے دہانہ کو کو خوردی اس کی صفت سے چھوٹا کرتے کرتے معدوم کر دیتے ہیں۔ اور بوسہ دہن یا رخسار کا لیا جاتا ہے۔ اور گالی زبان سے دیتے ہیں۔

نثر کی ضرورت نہیں رہی مگر لکھتا ہوں ۔ بوسہ دہن نہیں دیتے ہو نہ دو کیوں کہ دہن تو تمہارے ہے نہیں۔ مگر جب زبان موجود ہے تو گالیاں دینے کو کون مانع ہے ۔ گالیاں ہی دو ۔ تاکہ تغافل و عدم التفات تو نہ معلوم ہو۔

ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے ‎ ‎ ‎ ‎ ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں

جانِ مطرب ترانۂ ہَل مِن مزید ہے ‎ ‎ ‎ ‎ لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

پشت گرمی = اعانت و امداد و استظہار۔ ہل من مزید = کیا کوئی بڑھانا چاہتا ہے ANY ONE MORE نیلام کے وقت نیلام کرنے والا یہ جملہ کہتا جاتا ہے ۔ مطرب ۔ ترانہ ۔ پردہ سنج ۔ الفاظ متناسب نہیں ۔

باوجودیکہ تمہارا قہر و عتاب جان گھلائے دیتا ہے ۔ اور باوجودیکہ طاقت و قوت اس قہر کے اُٹھانے کی نہیں ۔ لیکن جب تمہاری خوشی اسی میں ہے تو ہم اس سے بھی زیادہ قہر و عتاب کے خواہاں ہیں۔ اور کبھی منہ سے دُہائی یا الاماں کے الفاظ نہ نکلیں گے۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم　　دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو　　ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

اے مخاطب عشق کے ہونے ہوئے اگر دل درد عشق سے دو ٹکڑے نہ ہو تو سینہ کو خنجر سے چاک کر کے ایسے دل کو نکال کے پھینک دے ۔ اور اگر آنکھوں سے اشک خونیں نہ بہتے ہوں تو دل میں چھریاں بھونک کیوں کہ جس دل میں آتش شعلہ در نہ بھڑکتی ہو ایسا دل تو سینہ کے لئے باعث ننگ ہے ۔ اور جو نفس کہ آتش فشاں نہ ہو وہ دل کے لیے موجب عار و شرم ہے ۔

آذر ۔ آتش ۔ چھری کے ساتھ چبھونے سے بھونکنا اچھا تھا مگر اس کی گنجایش نہ پائی ۔ چبھونا سوئی کے لئے مناسب ہوتا ہے ۔ سوئی چبھو وزن میں آجاتا ہے ۔

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب　　سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

حالت جنون میں اگر گھر چھوڑ کے ہم صحرا کو نکل گیا اور گھر ویران ہو گیا تو بلا سے ہو گیا ۔ اس سے ہم نقصان میں کیا رہے ۔ گھر تو سو گز زمین پر بنا ہو گا ۔ بیابان جس میں سیکڑوں میل کی وسعت ہے وہ ہاتھ آیا وہ تو کچھ مہنگا نہیں پڑا ۔ بلکہ سستا مل گیا ۔

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں　　گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

سرنوشت ۔ خیال ہے کہ جو تقدیر کا لکھا ہوتا ہے وہ پیشانی کی ہڈی پر مرقوم ہوتا ہے ۔

وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تیری تقدیر کا نوشتہ کیا ہے ۔ اور نوشتہ کیا ہو گا یہ جو میری پیشانی پر سجدہ بت کے نشان ہیں یہی نوشتہ تقدیر ہے کہ عمر بھر بت (محبوب) کو سجدے کیے جاؤ ۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی　　روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

روح القدس ۔ بضم قاف و دال لقب جبریل ۔ شعرا بسکون دال بھی نظم کرتے ہیں ۔

مرا ہم زباں نہیں ۔ جو اعلیٰ درجہ کی زبان مجھے ملی ہے وہ جبریل کو بھی میسر نہیں ۔

میرا کلام سراسر الہام ہے ۔ اگرچہ جبریل کو میری ایسی زبان حاصل نہیں مگر میری زبان کو اگر کوئی سمجھتا ہے تو

وہی سمجھتا ہے اور اسی سے میں اپنے کلام کی داد پاتا ہوں۔

جان ہے بہائے بوسہ۔ ولے کیوں کہے ابھی　　غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

ولے کہا۔ "مگر" نہیں کہا۔ حالاں کہ مگر بول چال میں زیادہ ہے۔

قیمت بوسہ جان عشاق قرار پائی ہے لیکن ابھی وہ جان لے کر بوسہ کیوں دینے لگا، کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ غالبؔ ابھی تو نیم جان نہیں ہے۔ اور جب میں نیم جان ہو جاؤں گا اور کہوں گا اچھا اب جان لے کے بوسہ دو تو کہہ دیگے کہ قیمت بوسہ تو جان ہے نہ نیم جاں۔ بہر صورت بوسہ ملنے کا نہیں۔

---

غزل ۹　　　　اشعار ۷

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں　　ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں　　۴۲غ

پاؤں میں چکر = علم سامندرک میں پاؤں کی اُنگلیوں میں چکر کا ہونا علامت زیادہ سفر کرنے کی مانی گئی ہے۔

میری صحرا نوردی کسی تدبیر سے رُک نہیں سکتی۔ پاؤں میں زنجیریں ڈال دینے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ زنجیریں میرے لیئے پاؤں کی انگلیوں کی چکر ہو گئیں جو اور زیادہ پھراتے رہتے ہیں۔

شوق دوڑائے ہے اس دشت میں مجھ کو کہ جہاں　　جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

شوق مجھ کو اس دشت معرفت میں دوڑاتا پھرتا ہے کہ جہاں کا راستہ سوائے دیدہ تصویر کی نگاہ کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اور دیدۂ تصویر میں نگاہ ہوتی نہیں اس لیئے معنی یہ ہوئے کہ راستہ معدوم ہے۔ اور دیدہ تصویر چشم حیران کی طرح قائم اور غیر متحرک ہوتا ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوئے کہ حیران و سرگردان بھی ہوں۔

حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے　　جادہ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں

جادہ = شاہراہ (منجد) مشہور معنی پگڈنڈی اور بٹیا۔ جادہ راہ میں اضافت خاص کی طرف عام کے ہے۔

وفا کے راستہ پر چلنا جلد ہلاک کر دیتا ہے۔ جس طرح تلوار کی تیز دھار گلا کاٹ جاتی ہے۔ افسوس ہے

کہ راہ وفاداری پر چلنے میں جو تکلیفیں اُٹھانا پڑتی ہیں اور انہیں میں ہم کو مزہ ملتا ہے وہ جلد ختم ہو جاتی ہیں۔ اور لذت ایذا اُٹھانے کی حسرت رہ جاتی ہے۔

رنج نومیدی جاوید گوارا رہیو خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں

زبونی بفتح اول بے چارگی۔ عاجزی۔ ناتوانی۔ نادانی۔ زیردستی۔ بدی (برائی)۔

ہمیشہ کی ناامیدی کا رنج خدا کرے کہ مجھے گوارا رہے۔ میں اس بات سے خوش ہوں کہ میرا نالہ تاثیر کی زبونی تو نہیں اُٹھاتا ہے اور منت پذیر تاثیر نہیں۔ اپنی غم دوستی کا اظہار ہے۔ اب (رہیو) کی جگہ رہے بولتے ہیں۔

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے لذت سنگ باندازہ تقریر نہیں

سر کھجانا = مار کھانے کی باتیں کرنا۔ یہاں مشتاق ہونے کے معنی پر مستعمل ہے۔ جہاں (ج) مخفف جس۔ اور ہاں ظرف مکان کے لیئے (جیسے ان کے یاں ہیں) معنی ہوئے (جس جگہ) مگر ظرف زمان کے لیئے بھی بمعنی جس وقت بولتے ہیں۔

بحالت جنون لڑکے جو پتھر مارتے ہیں اور ان سے زخم پڑ کے اچھے ہو جاتے ہیں بوجہ ایذا، دوستی پھر زخموں کو دل چاہتا ہے اور ان سے وہ مزہ ملتا ہے جو بیان میں نہیں آسکتا ہے۔

جب کرم رخصت بے باکی و گستاخی دے کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

جب کرم کریم اجازت بے باکی اور گستاخی دے کیوں کہ اس کا نام غفور و رحیم ہے جس کے معنی یہی ہیں کہ ہم کتنے ہی گناہ کریں گے وہ بخش دے گا۔ پھر گناہ کرنے میں کمی کرنا اور گناہ کرنے سے شرمانا اس سے بڑھ کر اور کون سا قصور ہو سکتا ہے۔

یا جب معشوق اپنے کرم و عنایت سے اجازت گستاخی اور بے باکی دے تو پھر گستاخی اور بے باکی کرنے سے شرمانا اس سے بڑھ کے قصور اور کیا ہو سکتا ہے۔

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

اے غالب ہم بھی ناسخ کی طرح اس بات کو مانتے ہیں کہ جو میر محمد تقی میر کی اُستادی کا قائل نہیں وہ خود کمال شاعری سے بے نصیب ہے۔

---

غزل ۱۰ شعر ۱

مت مردمک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں　　ہیں جمع سویدائے دل چشم میں آہیں

مردمک = مردم اور کاف تصغیر سے مرکب ہے۔ چھوٹا آدمی۔ جب کوئی شخص کسی کے سامنے آئے تو اس کی چھوٹی سی تصویر دوسرے شخص کی پتلی میں منعکس ہوتی ہے۔ سویدا = ایک نقطہ سیاہ مثل مردمک دل پر ہوتا ہے۔ دل چشم کو استعارہ شخص کے ساتھ کر کے اس کے لیے سویدائے دل تجویز کیا۔ آہوں کا محل اگر ہے تو دل ہے نہ سویدا مردمک۔ سیاہ دیدہ اور دود آہ اور نگاہ کی مناسبت سے سویدا لائے۔ تصنع بے لطف سے یہ شعر خالی نہیں۔ مت بمعنی (نفی) اب متروکات بعض شعرا میں سے ہے مگر نہ معلوم کیوں۔ دیدہ چشم اس لحاظ سے کہ دیکھتی ہے۔ آنکھوں کی پتلیوں میں جو نگاہیں ہیں ان کو نگاہیں نہ سمجھو بلکہ شخص چشم کے سویدائے دل میں دود آہ جمع ہو گیا ہے اسی کا نام نگاہ ہے۔ یعنی حسرت دیدار میں آنکھوں میں دود آہ جمع ہو گیا ہے۔ اجتماع آہ کو سیاہ دیدہ کہنا چاہیے تھا۔ مگر انھوں نے نگاہ کہا ہے۔

---

غزل ۱۱ اشعار ۶

عشق تاثیر سے نومید نہیں　　جاں سپاری شجر بید نہیں

شجر تنہ والے درخت کو اور بے تنہ والے کو نجم کہتے ہیں۔ درخت بید میں پھل نہیں آتا ہے۔
عاشقی اور جانبازی اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ یہ کوئی درخت بید نہیں جس میں پھل نہیں آتا۔ عاشقی کا اثر دکھا کے رہے گی لہٰذا ہم کو نا امید نہ ہونا چاہیے۔

سلطنت دست بدست آئی ہے　　جام مے خاتم جمشید نہیں

جمشید سے شراب کے ذکر کے ساتھ ایران کا بادشاہ جمشید مراد ہوتا ہے کہتے ہیں کہ شراب اسی کے زمانہ میں ایجاد ہوئی اور جب اس کے ساتھ سلطنت دیو۔ پری اور انگوٹھی کا ذکر ہو تو پھر حضرت سلیمان مراد ہوتے ہیں۔ یہاں دونوں مراد ہیں۔
جام شراب بھی ایک سلطنت ہے جو مے خواروں تک ہاتھوں ہاتھ پہنچی ہے۔ جام مے کوئی خاتم سلیمانی

نہیں جو حضرت سلیمان کے لیئے مخصوص تھی۔

کہتے ہیں کہ ایک انگوٹھی تھی جس پر اسم اعظم اللہ کا کندہ تھا اس کی برکت سے سلیمان دنیا بھر کے بادشاہ تھے۔ ایک دیو اسے چرالے گیا تو کچھ دن (½ 2) کے لیئے وہ بادشاہ ہوگیا۔

ہے تجلّی تری۔ سامان وجود　　　ذرہ بے پر تو خورشید نہیں

اے محبوب حقیقی تیری تجلی ہی باعث وجود موجودات ہے۔ جس طرح ذرہ کے ظہور کا باعث نور آفتاب ہے۔

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے　　　ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

راز کا رسوا ہونا = راز کا فاش ہونا۔ افشا، صاف لفظ تھا اسے نہ کہا۔ رسوا اس لیئے کہا کہ بدنامی کے ساتھ مشہور ہونا۔ کہنا چاہتے ہیں۔ بھید = راز قافیہ کی وجہ سے ہے ورنہ دشوار اور مشکل کا محل ہے۔ مرجانا تو کوئی دشوار کام نہیں ہے مگر مرجانے سے معشوق کی رسوائی ہوتی ہے کیوں کہ اس کے مظالم کا اظہار ہوتا ہے کہ اتنے ظلم کیئے کہ عاشق کو جان دے دینا آسان معلوم ہوا۔

گردش رنگ طرب سے ڈر ہے　　　غم محرومی جاوید نہیں

راحت کے بعد رنج زیادہ مکلف ہوتا ہے چنانچہ حدیث میں ہے نعوذ باللہ من الجور بعد الکور۔

یہ جو رنگ طرب اس وقت حاصل ہے اس میں انقلاب پیدا ہو جائے گا بس اس بات سے ڈرتے ہیں۔ ورنہ کسی دوسری خوبی سے ہمیشہ کے لیئے محروم ہو جانے کا ذرا بھی نہ غم ہے اور نہ پروا۔ مگر تم چھوٹ جاؤ گے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ　　　ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ " دنیا بامید قائم است " مگر جب ہم کو جینے کی امید ہی نہیں تو پھر ہمارے لیئے یہ مقولہ کہ امید پر لوگ جیا کرتے ہیں کیسے صادق آئے گا۔

غزل ۱۲ اشعار ۲

برشکال دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے کھُل گئی مانند گل سو جا سے دیوار چمن ۱۰ غ

برشکال۔ شاید برکھا سے بنا ہے فارسی کا لفظ نہیں۔ مگر ایرانیوں نے استعمال کیا ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ (ہے) کاتب کی غلطی ہے۔ (بھی) ہوگا۔ کھلنا = دیوار کے لیئے شگافتہ ہونا۔ پھول کے لیے شگفتہ ہونا۔
عاشق کے اشک چشم کی برسات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ جس نے دیوار چمن کو سو جگہ سے گل کی طرح کھلا دیا ہے۔

اُلفت گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی سرو ہے با وصف آزادی گرفتار چمن

وارستگی = آزادی۔ سرو = ایک درخت راستی میں مشبہ بہ قد یار۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ سرو سہی۔ سرو ناز۔ سرو آزاد۔
گل سے محبت کرتے ہوئے آزادی کا دعویٰ بالکل غلط ہے۔ چنانچہ سرو کو دیکھ لو کہ باوجود یکہ اس کی صفت آزاد ہے۔ بایں ہمہ پابند چمن ہے۔
سرو کو شعرا فاختہ کا معشوق کہا کرتے ہیں انھوں نے اسے عاشق باندھا۔

---

غزل ۱۳ اشعار ۶

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں ۱۰ غ

خیاباں = روش۔ مشہور معنی کیاری۔ چمن۔ اب سڑک کے معنی ہیں۔ دو الفاظ متجانس بلا عطف و تناسب ہوں تو معنی کثرت کے ہوتے ہیں۔ ارم = بہشت شدّاد۔ نقش قدم کو بہشت سے تشبیہ دیتے ہیں وجہ شبہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ شاید انگلیوں کے پوروں کے نشان کو گل تجویز کیا۔ اور اس طرح ارم بنالیا۔
اے محبوب تو جس راستہ پر چلتا ہے اور تیرے نقش قدم بنتے ہیں ہر نقش قدم ایک خیابان ارم معلوم ہوتا ہے۔

دل آشفتگان خال کنج دہن کے  سویدا میں سیر عدم دیکھتے ہیں

دل آشفتہ = پریشان خاطر۔ مراد دلدادہ۔ عدم وجود موجودات سے پہلے کا زمانہ اسے تاریک خیال کرتے ہیں۔ اور دہن محبوب کو بوجہ خوردی معدوم مانتے ہیں۔ سیر۔ تماشا۔ سویدا، نقطہ دل صرف لفظ متناسب ہے ورنہ معناً دل کہنا چاہئیے تھا۔

تمہارے گوشہ دہن کے تل کے دلدادہ کو سویدا، دل میں سیر عدم دکھائی دیتی ہے۔

ترے سرو قامت سے اک قد آدم  قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

تیرا سرو قامت ایک قد آدم فتنہ انگیزی میں قیامت سے بڑھ کے ہے۔

تماشا۔ کہ اے محو آئینہ داری  تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

تماشا۔ ایرانی اسم ہی بائے امر ملا کے۔ امر بناتے ہیں۔ جیسے ؎

رحمے بحال زار من

انھوں نے یہ اندھیر کیا کہ تماشائے بھی نہیں کہا بلکہ صرف تماشا کہہ کے۔ تماشا کر۔ مراد لی۔ (ذرا دیکھ اے) نہ کہا۔ تماشائے ہو یا تماشا اُردو کی بول چال نہیں۔

اے محو زینت و آرایش ذرا ادھر بھی تو دیکھ کہ کس حسرت و تمنا سے ہم تجھے دیکھ رہے ہیں، کیوں کہ اس زینت، جمال سے ہم تو بہرہ یاب ہونے کے نہیں۔ "کس تمنا" بہت بلیغ کلمہ ہے۔ اس نے شعر میں جان ڈال دی۔ حسرت کے لہجہ میں اسے پڑھو۔

سراغ تفِ نالہ لے داغ دل سے  کہ شبرو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

شبرو = مسافر شب۔ دن کو دوسرے امور کی وجہ سے یکسوئی خیال نہیں ہوتی ہے۔ رات کو فکر مند کو نیند تو آتی نہیں اس وقت خیال یار میں انہماک ہوتا ہے۔ اور بحالت نا امیدی عاشق نالے کیا کرتا ہے۔ شبرو کے معنی کو توال اور درد کے بھی ہیں اور بحالت جمع شب بیدار اور سالک کے معنی بھی ہوتے ہیں۔ اس محل پر ان معانی کو شعر میں دخل نہیں۔ بصیرۃ للطلاب لکھ دیا۔

سراغ = کھوج۔ پتہ۔ کھوج نکالنے میں ترکمانوں کو بڑی دست گاہ حاصل ہے۔ جو نشان قدم دیکھ کر

یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ نشان قدم والا کس قبیلہ کا ہے اور کہاں سے آتا ہے اور کہاں جائے گا وغیرہ۔ ممکن ہے کہ یہ بیان مبالغہ آمیز ہو۔

رات کے مسافر کے نشان قدم دیکھ کر لوگ مسافر کا کھوج لگا لیتے ہیں لہٰذا میرے نالہائے گرم کا اگر تم پتہ لگانا چاہتے ہو تو میرے داغ ہائے سوزناک دل کو دیکھو ان سے میرے نالہائے گرم کا کچھ پتہ تم کو لگے گا۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

فقیروں کی ایسی تغیر ہیئت کر کے ہم اہل کرم اور صاحبان دولت کی صرف آزمایش کرتے ہیں ورنہ کسی کا احسان اُٹھانا مقصود نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کوئی کرم کرنے والا نہ رہا۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ مجھے احتیاج کرم کرنے کی نہیں۔ لیکن انداز کرم پر میں فریفتہ ہوں اس کے دیکھنے کے لیئے فقیروں کا ایسا بھیس بنایا ہے۔ بھیس کے ساتھ 'بدلنا' بھی مستعمل ہے اور بنا کر کی جگہ لا بھی سکتے ہیں۔

---

غزل ۱۲ اشعار ۱۳

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

نار = آتش۔ دوزخ۔ التہاب = شعلہ ور ہونا آگ کا اس طرح کہ اس میں دھواں نہ ہو۔ کافر ہوں = ایک قسم کی قسم۔ اس لیئے لائے کہ کافروں کا دوزخ میں جلنا مانتے ہیں۔

چوں کہ دوزخ شعلہ ور ہونے میں آتش مزاجی محبوب سے ملتی جلتی ہے اس لیئے عذاب دوزخ سے اگر مجھے راحت نہ ملتی ہو تو مجھے کافر سمجھو۔ یعنی بوجہ مشابہت خوئے یار مجھے راحت ملتی ہے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

شب ہجر = شب فراق کو شعرا طولانی اور مکلف ہونے کی وجہ سے روز قیامت کا اتنا یعنی پچاس ہزار برس کا مانتے ہیں۔

اگر شبہائے فراق کو میں شمار میں لاؤں تو اتنی مدت اس عالم ویران میں میرے قیام کو ہوگی کہ جس کا میں حساب ہی نہیں لگا سکتا ہوں۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر　　آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

ان کی شوخی تو دیکھو کہ خواب میں آکر پھر خواب ہی میں دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئے۔ اب ہم کو ان کے انتظار میں نیند ہی کب آئے گی جو وہ خواب میں آئیں۔ یہ باتیں ان کی نہ آنے کی اور بھلانے کی تھیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ آنے کے ساتھ (وہ) ضمیر کو اس لیئے ترک کیا کہ جیسے سب جانتے ہیں کہ اُن کے سوا ہم کسی کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ یا جیسے معشوق کا ذکر کرتے کرتے یہ بات منھ سے نکل گئی۔ اور ضمیر دل میں رہ گئی۔

میرے نزدیک یہ ترک بالارادہ نہیں۔ بلکہ مصرع میں گنجایش نہ تھی۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

یعنی ہر بات سے انکار کے سوا اور کچھ نہ لکھیں گے۔ یا جواب ہی نہ دیں گے۔ یا خط بھیجنے کی ممانعت کر دیں گے میں ان سب باتوں پر برابر خط لکھے جاؤں گا شاید عاجز ہو کر وہ میری کوئی بات مان لیں۔ جب تک یہ تاویل یا کوئی اور تاویل مناسب نہ کی جائے گی تو دوبارہ خط لکھنے کا کیا فائدہ۔ آزمودہ را آزمودن جہل است۔ میری ان بے تکی باتوں پر لوگ کہیں گے "شعر غالب بمدرسہ کہ برد"

جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ شعر بہت بلیغ ہے۔ اپنا معاملات عشق میں صاحب تجربہ اور معشوق کا مزاج دان ہونا۔ اور اس کا بد عہد وحیلہ جو ہونا یہ سب معانی اس سے سمجھ میں آتے ہیں۔

دوسرا افادہ یوں فرماتے ہیں (آتے آتے) کے معنی جب تک قاصد آئے آئے۔ اور کبھی فعل کو محض تکرار معانی کے بیان کے لیئے اس طرح مکرر لاتے ہیں جیسے تم روتے روتے ہنسنے کیوں لگے۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام　　ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ساقی گری کا کام کسی محبوب حسین سے لیا کرتے ہیں مگر یہاں غیر محبوب مراد ہے۔ اور محفل یار میں عاشق سب کو اپنا رقیب تجویز کرتا ہے۔ اور وہ عاشق صادق کا مرنا ہی چاہتے ہیں۔ اس لیئے کہتے ہیں کہ محفل محبوب میں کبھی دورہ جام تو ہم تک آتا نہ تھا کہیں ساقی نے اس میں زہر نہ ملا دیا ہو جب تو جام ہم تک آیا۔

جو منکر وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے　　کیوں بدگمان ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

وہ تو وفا کے مطلقاً منکر ہیں۔ پھر میں ان سے بدگمان کیوں ہوں کہ وہ دشمن کے فریب میں آگر اسے باوفا سمجھیں اور اس پر لطف کریں یہ ان سے ہو ہی نہیں سکتا۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے          ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

خانۂ معشوق محل وصال ہے۔ عاشق کو اضطراب اس وجہ سے ہے کہ رقیب کہیں نہ آجائے تو یہ سب عیش بھر بھنڈ ہو جائے۔ مگر معشوق کو کسی وہم کی وجہ سے پیچ و تاب میں دیکھ کر عاشق اس کی تسکین کر رہا ہے۔ معشوق کے توہم سے اپنے آپ کو بری دکھاتا ہے۔

جناب نظم و جناب حسرت دونوں وہم و پیچ تاب معشوق کی علت یہی قرار دیتے ہیں کہ عاشق اپنے کسی دوسرے معشوق سے چھپ کے آیا ہے اس لئے یہ مضطرب ہے۔

جناب آسی ان کے معانی کو وہم ہی وہم بتاتے ہیں۔ اور اپنے معانی یہ لکھتے ہیں۔ عاشق کہتا ہے کہ تم کو کس وہم نے پیچ و تاب میں ڈال رکھا ہے کہ مجھ سے زیادہ مضطرب الحال ہو اس میں از راہ شوخ طبعی معشوق سے یہ کہلانا چاہتا ہے کہ اسے بھی رقیب ہی کا خوف ہے۔ یا یہ کہ میرا تو وہ رقیب ہے مجھے اس سے اس بات کا خوف ہے کہ اس سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ مگر تم کو اس کم بخت کی کیا فکر ہے۔ اگر وہ آ بھی جائے گا یا اس کو خبر بھی ہو جائے گی تو تمہارا کیا بنائے گا۔ تمہارے نزدیک جیسا میں ویسا وہ۔ تم فضول نقصان پہنچنے کے وہم میں پڑے ہو۔ کچھ رنگ لائے تو جواب دے دیجئے اور راستہ بتائیے۔

پھر کہتے ہیں کہ میرے معانی دوسرے شارحین سے اچھے ہیں کہ اگر معشوق کہے کہ جیسے تجھے رقیب سے خوف ہے ایسے ہی مجھے بھی۔ تو اس سے کہا جائے کہ آپ تو کہتے تھے مجھے کسی کا خوف نہیں میں کسی سے ملتا ہی نہیں پھر کس بات کا توہم ہے معلوم ہوا کہ آپ کی وہ سب باتیں غلط تھیں۔

آسی کے تاویلات اچھے نہ معلوم ہوئے نظم و حسرت سے بہتر تاویل کرنے میں فکر مساعد نہ ہوئی۔

میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے          جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

مجھ ایسے شخص کو ان کے ایسے شخص کی لذت وصال حاصل ہو یہ تو سراسر خدا کی قدرت ہے میں کہاں اور ان کا وصال کہاں۔ یہ ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے کہ اس پر مجھے نذر میں جان پیش کرنا چاہیئے تھا۔ مگر انتہائے مسرت اور گھبراہٹ میں جان پیش کرنا بھول گیا۔ دینی۔ بنا بر محاورہ دہلی مصدر (دینا) کی تانیث ہے۔ اہل لکھنو مصدر کو مؤنث نہیں بناتے۔

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

تیوری و شکن ابرو بحالت غضب۔ لکھنو میں بروزن طوطی (فعلن) بولتے ہیں دلی میں بروزن فاعلن اب بھی یا پہلے بولتے تھے۔ لکھنو کے موافق یوں نظم ہوسکتا ہے ؎

تیوری چڑھے ہوئی نہ ہو اندر نقاب کے

مصرع موجودہ سے تیقن پایا جاتا ہے۔ اور ترمیم سے دھوکا اور گمان۔ محل بھی اسی کا ہے۔
ان کے گوشہ نقاب میں ایک شکن پڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بحالت غضب تیوری پھر بل ہو۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

ایک نگاہ چرانے میں لاکھوں لگاوٹیں پائی جاتی ہیں۔ اور لاکھوں بناؤ میں بحالت عتاب ان کے بگڑنے میں۔ یہ شعر صنعت ترصیع میں ہے۔

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

وہ نالہ میرا جس نالہ سے آفتاب میں شگاف پڑ جاتا ہے مگر محبوب پر اثر نہیں کرتا ہے اور اس کی جگہ اس کے دل میں ذرا بھی نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح جادو کے اثر سے جہاز سراب میں چلنے لگے۔ معشوق سے مدعا طلبی میں وہ جادو کوئی کام نہیں دیتا ہے نہ معلوم وہ کس قسم کے ہیں۔ بہت تعجب کی بات ہے۔

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

چاندنی رات اور بارش میں شراب کا پینا لطف دیتا ہے۔
پندرہ دن ہر مہینے میں چاندنی رات ہوتی ہے۔ اور چار مہینے برسات کے یہ آٹھ مہینے ہوتے ہیں ان کو کبھی کبھی کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔

---

## دوسری غزل اسی قافیہ و ردیف و وزن میں

غزل ۱۳ اشعار ۱۱

یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
کل کے لیئے کر آج نہ خسّت شراب میں

کل = مراد روز آیندہ - وبمعنی قیامت - خسّت = بخل کنجوسی - سوءِ ظن = بدگمانی - ساقیِ کوثر = امیر المومنین حضرت علی - مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ بہشت میں حوض کوثر سے بھر بھر کے شراب طہور مومنوں کو پلائیں گے - کوثر و تسنیم وسلسبیل بہشت میں تین چشمے ہیں -

اے ساقی آج شراب پلانے میں بخل سے کام نہ لے - خوب چھکا دے - کل کی تجھے کیوں فکر ہے - کل تو حضرت علی پلانے والے ہیں - آج بخل سے کام لینا حضرت علی کے حق میں بدگمانی نہ ہوگی کیا ان کے پاس شراب کی کوئی کمی ہے -

گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

آج = دنیا - کل = عالم عقبیٰ - مصرع ثانی سے اشارہ اس آیہ وافی ہدایہ کی طرف ہے (پارہ ایک رکوع چار) واذ قال للملٰئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک قال انی اعلم ما لا تعلمون - جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں - تو فرشتوں نے کہا کیا تو ایسے شخص کو خلیفہ بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائیگا - حالاں کہ ہم تیری حمد کی تسبیح پڑھتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں - تو اللہ نے کہا میں اس بات کو زیادہ جانتا ہوں جسے تم نہیں جانتے ہو -

استفہام خواہش جواب کے لیئے نہیں ہے بلکہ فقط تنبیہ مقصود ہے -

آج دنیا میں ہم کیوں ذلیل ہیں - حالاں کہ عالم بالا میں فرشتوں کی گستاخی اللہ کو پسند نہ تھی جو انہوں نے فساد کرنے اور خون بہانے کو ہماری نسبت کہا اور اللہ میاں نے یہ کہہ کر انھیں جھڑک دیا کہ تم نہیں

جانتے ہو یہ ذلت تو ہمارے ہی کرتوتوں سے ہے۔

جان کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع　　　گر وہ صدا سمائی ہے چنگ ورباب میں

سماع = الذکر والسیت الغناء۔ ہر وہ آواز خوش جس سے انسان خظ حاصل کرے۔ (منجد میں بفتح اور فرائد اللغہ میں بالکسر لکھا ہے)۔ رباب = بضم ایک باجہ مثل ستار مگر اس میں سندریاں نہیں ہوتی ہیں۔ جان میں اخفاء نون ناگوار سمع ہے۔ چنگ ایک خمدار باجہ سارنگی کا ایسا۔ نعتہ منجد میں سج معرب سنج وچنگ بتایا اور تصویر جھانج کی بنائی ہے۔

جناب نظم اس شعر میں بھی استفہام کو برائے تنبیہ فرماتے ہیں۔ جناب آسی نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ جہاں تک ہوسکے نظم سے مخالفت کی جائے۔ اس استفہام کو بھی استخباری فرماتے ہیں۔ یعنی سائل دوسروں سے معلوم کرنا چاہتا ہے۔

شاعراز روئے تعجب کہتا ہے کہ اگر چنگ ورباب میں محبوب حقیقی کی صدا سمائی ہوئی ہے تو پھر نغمہائے وحدت سن کر سالک کی جان جسم سے کیوں نکلنے لگتی ہے اس کو تو جان لیوا ہونے کی جگہ جان بخش ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ آواز نہایت دل کش وجاذب روح ہے پھر کیوں نہ اپنا اثر دکھلائے۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے　　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

رَو = رفتار۔ روانی۔ لگام ہاتھ سے چھوٹ جائے اور پاؤں رکاب میں نہ ہو تو گھوڑا سوار کے اختیار میں نہیں ہوتا ہے جہاں جی چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ پا = بلا عطف واضافہ اردو میں کیسا برا معلوم ہورہا ہے۔ رخش = وہ گھوڑا جس کا رنگ سرخی وسپیدی آمیز ہو رستم کا گھوڑا اسی رنگ کا تھا اس لیئے اسے رخش کہتے تھے۔

توسن عمر روانی میں ہے۔ اور میرے ہاتھ میں اس کی نہ لگام ہے اور نہ میرا پاؤں ہی رکاب میں ہے۔ یعنی میرے اختیار سے باہر ہے۔ دیکھئے کہاں اور کب رکتا ہے۔ اور مجھے اپنی پشت سے گرادیتا ہے۔ یعنی کب موت آتی ہے۔ اور علائق دنیوی سے نجات پاکر فنا فی اللہ کا مرتبہ ملتا ہے۔ اور حقیقت لاموجود الا اللہ کی ظاہر ہوتی ہے۔

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے　　　جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ وتاب میں

چوں کہ میں لاموجود الا اللہ کے خلاف کسی اور کی ہستی کا بھی وہم جتنا مجھے پیچ وتاب میں ڈالے ہوئے ہے

اتنا ہی میں اپنی حقیقت سے بھی دور ہوں۔ اگر غیر کی ہستی کا وہم دل سے نکل جائے تو اپنی حقیقت ہم کو معلوم ہو سکتی ہے کہ ہم عین ذات الٰہی ہیں اور غیر کا وجود ہی نہیں ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے      حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شہود = معاینہ وظہور و حضوری۔ شاہد = ناظر۔ دیکھنے والا۔ مشہود = جسے دیکھیں۔ مشاہدہ = معاینہ۔ اہل تسنن میں معتزلی اور شیعہ دنیا و عقبیٰ دونوں میں دیدار الٰہی کے قائل نہیں۔ لیکن غالب مسئلہ وحدت وجود کو دخل دے رہے ہیں۔

جب رائی و مرئی و رویت میں غیریت نہیں ہے تو میں حیران ہوں کہ مشاہدہ و دیدار کس شمار میں ہے۔ معاینہ کے لیے تو بینندہ اور دید و دیدار میں مغایرت لازم ہے اور بنا بر لاموجود الا اللہ و وحدت وجود بیگانگی ہے نہیں پھر مشاہدہ کے کیا معنی ہیں۔ کون کس کو دیکھے گا۔

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر      یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

قطرہ و موج و حباب خود کوئی چیز نہیں ان کی ہستی وجود بحر پر منحصر ہے اور ہستی بحر کے یہ شئونات مختلفہ ہیں۔ اگر ان کو تحلیل کر دو تو وہی وجود واحد بحر رہ جائے گا۔ اسی طرح عالم کے شئونات کے تحلیل کرنے سے وجود واجب کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ یہ شعر بھی وحدت وجود میں ہے۔ یعنی ہستی ممکنات وجود واجب کے ضمن میں ہے۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی      ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

ادائے ناز = (ادا) اردو فارسی میں مصدر نہیں مگر بمعنی مصدر مستعمل ہے۔ یعنی گذاردن و بمعنی خوبی حرکات معشوق۔ و رمز و اشارہ۔ ناز = استغناء و فخر محبوب جس سے شوق عاشق برانگیختہ ہو۔ بوجہ اضافت معنی کہنے میں مجھے دشواری ہو رہی ہے مگر یہ کہ ناز کرنا یا ناز دکھانا معنی کہوں (ادا و ناز) پڑھنے میں سہولت ہے۔ واو عطف برائے تفسیر ہوگا۔ یا ادا کو نکال کے یوں کہیں (شرم اک طرح کا ناز ہے الخ) اپنے = اپنی ذات بمعنی بیگانہ یعنی عاشق۔ بے حجاب = کیوں کہ ناز کرنا خود دلیل بے حجابی ہے۔ یوں ہیں یعنی شرم کرکے حجاب شرم پردہ۔ آڑ۔

شرم کرنا چاہیے وہ بیگانہ ہی سے کیوں نہ ہو ایک قسم کا ناز ہی ہے۔ چوں کہ ناز خود دلیل بے حجابی ہے۔

اگر کچھ لگاوٹ نہ ہو تو حجاب ہی کسی سے کوئی کیوں کرے۔ باد جودیکہ بے حجاب ہیں مگر شرم کے پردہ میں حجاب والے بنتے ہیں۔ جو کچھ لکھ رہا ہوں بغیر سمجھے لکھ رہا ہوں۔ شاید باد جود غایت ظہور پھر بھی پردۂ خفا میں ہونا کہنا چاہتے ہیں۔

جناب نظم۔ اس غزل کے اکثر شعر تصوف کے رنگ کے ہیں۔ یہ شعر بھی تصوف ہی کا ہے۔ کہتے ہیں اس کا شرمانا اور سامنے نہ آنا یہ غمزۂ معشوقانہ ہے۔ یہ ہم نے مانا کہ یہاں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اور اپنا غمزہ اپنے ہی ساتھ ہے لیکن جب غمزہ و ادا خود ایک طرح کی بے حجابی ہے۔ تو اس کا حجاب کرنا عین بے حجابی ہوا۔

جناب حسرت۔ ان کا حجاب میں رہنا ہی بے حجابی ہے کیوں کہ پردہ میں رہ کر وہ اپنے سے نہیں شرماتے۔ حالاں کہ شرم جو ایک ادائے ناز ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ خود اپنی ذات سے بھی حیا کیجئے۔ یا۔ یہ مطلب ہوگا کہ ان کا حجاب کرنا بھی ایک طرح کی بے حجابی ہے۔

جناب آسی۔ شرم ایک ادائے معشوقانہ ہے کوئی نہ ہو تو خود ہی سے شرمانا چاہیئے۔ وہ اگرچہ شرمائے ہوئے ہیں اور حجاب میں ہیں۔ مگر حجاب سے بے حجاب ہونا ہی ایک امر خلاف شرم و ادائے معشوقانہ ہے۔ ان کے معانی تو مجذوب کی بڑ ہیں۔

جناب نظم و حسرت کے سمجھانے سے بھی میں نہ سمجھ سکا۔

آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آینہ دائم نقاب میں

حُسن کو زینت سے اب تک اسے فراغت حاصل نہیں۔ وہ ہمیشہ آئینہ نقاب کے اندر پیش نظر رکھتا ہے تاکہ آرایش کرتا رہے۔ آئینہ سے مراد آئینۂ رخسار ہے۔

جناب آسی۔ باد جودیکہ ایک جہان اس کا عاشق ہو چکا ہے مگر اس کو آرایش جمال سے فراغت حاصل نہیں ہوئی۔ اور اسی لیئے اب تک بھی پردہ میں وہ اپنی آرایش جمال میں مصروف رہتا ہے۔ نقاب کے معنی مطلق پردہ کے لیئے۔ یہ کس بنا پر۔

اس کے بعد جناب نظم کے معانی لکھ کر بنا بر عادات اس میں سقم نکالتے ہیں۔ فرماتے ہیں مولانا نظم نے اس شعر کو تصوف کے مضامین سے لبریز بنایا ہے اور یہ مفہوم ظاہر کیا ہے کہ۔ نقاب استعارہ ہے بے حجاب قدس سے۔ اور آئینہ اس میں علم ماکان ویکون وسیکون ہے۔ اور آرایش جمال سے فارغ نہ ہونا تفسیر کل یوم ھو فی شان ہے۔

نظم کے معانی لکھنے کے بعد فرماتے ہیں۔ یہاں ایک نکتہ یہ ہے کہ تاویل کو گنجایش ہے اس کو بھی تصوف میں لے جا سکتے ہیں اور جو معانی بتائے گئے وہ غلط نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ مگر استعارات جو اس میں بیان کیے

گئے ہیں وہ سب بعید الفہم ہیں۔ اور استعارہ کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مشبہ کی طرف (مشبہ نہیں وجہ شبہ) جلد سے جلد ذہن منتقل ہو جائے اور یہاں یہ کچھ بھی نہیں۔ واضح ہو کہ اگر استعارات غیر مانوس ہیں اور مشبہ بہ یا مستعار منہ کا ذکر نہیں کیا گیا تو فصاحت و بلاغت تو درکنار وہ شعر مہمل اور شاعر کو مہمل گو کا خطاب دلا دیتے ہیں۔

انھوں نے استعارہ کا صرف نام سن لیا ہے۔ تشبیہ و استعارہ میں وجہ شبہ اور وجہ جامع میں ندرت کا ہونا ہی خوبی ہے۔ ورنہ تشبیہ و استعارہ مبتذل ہوگا۔ استعارہ کی ایک قسم استعارہ بالکنایہ ہے۔" و آن عبارتست از ذکر مشبہ و ارادہ مشبہ بہ" مسعود سعد فرماتے ہیں ؎

بروے کردہ ہمہ حجرہ بوستان ارم — بزلف کردہ ہمہ خانہ کلبۂ عطار

روئے مشبہ کا ذکر ہے اور اس کا مشبہ بہ (مستعار منہ) محذوف ہے۔ اسی طرح زلف مستعار لہ مذکور ہے۔ اور مشک مستعار منہ محذوف ہے۔

ان سے کوئی پوچھے کہ نقاب سے جس کے معنی روئے بند ہیں آپ نے مطلق پردہ کیسے معنی لئے میرے نزدیک جب لفظ حجاب موجود ہے اور اس سے حجاب قدس معنی کہنا مقصود ہیں تو یہ کہنا چاہیئے کہ حجاب سے حجاب قدس مراد ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

جناب حالی یادگار غالب میں فرماتے ہیں کہ سالک کو تمام موجودات عالم میں اللہ ہی اللہ نظر آئے اسے شہود کہتے ہیں، اور غیب الغیب سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے درار الوراء ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت ابھی خواب میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے۔ اور اس سے بہتر اس مضمون کے لئے مثال نہیں ہو سکتی ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں۔ یعنی خواب میں خواب دیکھ رہے ہیں تو یہ غیب میں 'غیب ہے۔ غیب بہر حال غیب ہے اس کا مشاہدہ ممکن نہیں۔ مگر ہم اسے شہود سمجھتے ہیں۔ خواب میں جو کوئی اپنے آپ کو بیدار دیکھتا ہے وہ درحقیقت جاگتا کب ہوتا ہے۔ ایسے ہی ہمارا شہود سمجھتا ہے۔ مگر شہود کہاں۔

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

بوتراب لقب یا خطاب حضرت علی علیہ السلام بصورت کنیت ۔ ایک مرتبہ حضرت علی مسجد نبوی میں خاک پر سو رہے تھے ۔ جناب رسالت مآب صلعم تشریف لائے اور لفظ ابوتراب سے خطاب فرمایا۔ ندیم ۔ ہمنشیں دوست ۔ اللہ۔ ندیم دوست ۔ حضرت علی ۔ بندگی ۔ عبودیت ۔ غلامی ۔اطاعت ۔عبادت ۔

جناب نظم فرماتے ہیں ۔اس مضمون کا ایک شعر ناسخ کا بہت مشہور ہے ؎

بیعت خدا سے ہے مجھے بے واسطہ نصیب　　　دست خدا ہے نام مرے دستگیر کا

ناسخ نے پہلے مصرع میں ادعا کیا ہے اور دوسرے مصرع میں توجیہ ۔ اور مصنف نے دلیل کو دعویٰ پر مقدم کر دیا ہے ۔لیکن دعویٰ میں ابہام ہوتا ہے ۔ اور دلیل میں انکشاف ۔ اس سبب سے آداب انشا میں دعویٰ کو دلیل پر مقدم رکھنا بہتر ہے کیوں کہ ابہام کے بعد انکشاف لذیذ تر ہوتا ہے ۔

چوں کہ شاعر مصرع ثانی پہلے کہتا ہے اس لیئے تقدم دعویٰ ہی کو ہوا ۔

---

حدیث نبوی ہے النظر الیٰ وجہ علی عبادۃ ۔ حضرت علی کے چہرہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے ۔ اور عبادۃ مخصوص خدا کے لیئے ہے ۔ لہٰذا فرماتے ہیں حضرت علی جو محبوب الٰہی ہیں ان کی ذات گویا عین ذات الٰہی ہے لہٰذا ان کی بندگی گویا بندگی خدا ہے ۔

---

غزل ۱۴　　　اشعار ۱۰

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں　　　مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں　ا ب غ

دل اور جگر دونوں کو کھو بیٹھا ۔ میں اکیلا کس کس کو روؤں اور پیٹوں ان کا ماتم تو کثیر ہے ۔ اگر قدرت و استطاعت ہوتی تو نوحہ گر کو ساتھ رکھ لیتا کہ میں اور وہ مل کے ماتم دونوں کا کرتے ۔

عرب میں پیشہ ور عورتیں ہوتی تھیں جن کو ماتم کہتے تھے ۔ وہ اجرت پر صاحب عزا کے گھر بلائی جاتی تھیں اور نوحے پڑھ پڑھ کے میت کے اقربا کو رُلاتی تھیں ۔

اگرچہ جگر میں قوت احساس نہیں مگر شعرا دل کے ساتھ جگر کو بھی شریک کیفیات و جذبات دلی میں شریک کر لیتے ہیں ۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں　　　ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

رشک کے مارے نام ان کے گھر کا لینا نہیں چاہتے۔ راستہ اور محلہ کا نام لے کر بھی نہیں پوچھتے پھر اس سوال مبہم کا کوئی جواب کیا دے۔

جناب نظم اس دشواری کو یوں حل فرماتے ہیں۔ حالت اضطراب و کثرت قلق میں یہ کہتے ہیں کہ " ارے کدھر جاؤں " مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں غم بہلے اور تسکین ہو۔ اس شعر میں جگہ یعنی کوچہ معشوق تو معین ہے۔ مگر راہ چلتوں کے سامنے اس کا نام رشک کے مارے نہیں لے سکتے۔ اور پتہ نہ ملنے سے اضطراب و قلق پیدا ہو گیا ہے تو یہاں " جاؤں کدھر کو میں " دو معنی رکھتا ہے۔ اور یہی لطافت شعر میں ہے۔

جب یہ الفاظ اضطراب و قلق میں منھ سے نکلتے ہیں تو کسی سے ان کی بابت پوچھا نہیں کرتے ہیں۔ تو پھر مصرع مثل اس کے ہونا چاہیے ؎

اللہ میرے کیا کروں جاؤں کدھر کو میں

یا ؎

کوئی بتائے کیا کروں جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے گھر پر ہزار بار  اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں

چوں کہ رقیب کے گھر ان کی آمد و رفت زیادہ ہے اور عاشق کو اس کا علم بھی ہے۔ لہٰذا مشتاق دیدار ہو کر رقیب کے گھر متعدد مرتبہ بحالت مجبوری جانا پڑا۔ اور اس امر ناگوار طبع کو اختیار کیا۔

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے  کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

شعرا دہن و کمر محبوب کو چھوٹا کرتے کرتے معدوم کر دیتے ہیں۔ چوں کہ دہانہ کا چھوٹا اور کمر کا پتلا ہونا حسن میں شامل کر لیا گیا ہے۔ کمر کس کے باندھنا یعنی کسی کام کے کرنے پر استحکام کے ساتھ آمادہ اور مستعد ہونا۔ کسی امر پر کمر کستے ہیں یہاں اس کا ذکر نہیں۔ اپنی طرف سے "قتل پر" یا کوئی بات اور مناسب سمجھو بڑھا لو۔ میرے نزدیک۔ باندھیے "کی جگہ اس مطلب کے واسطے۔ " باندھتے " ہونا چاہیے " جناب نظم اور جناب حسرت نے۔ " باندھیے " کو اختیار کیا ہے۔ لیکن جناب آسی " باندھی ہے " لکھتے ہیں۔ ( باندھیں وہ ) بھی لا سکتے ہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ۔ " میں " کو اس شعر میں ذرا امتناز لہجہ میں پڑھنا چاہیے اور اس سے معنی

زائد یہ پیدا ہوں گے کہ (کوئی اور بھی نہیں۔" میں ") پھر اس کے معنی کو ایک اور معنی کے ساتھ ملازمت ہے کہ اس کی تصریح کو قلم انداز کرنا بہتر ہے۔

طرز ادا اس شعر کا اس دوسرے معنی سے ابا کرتا ہے قلم انداز کر دینا ہی اچھا ہوا۔

میں خوب جانتا ہوں کہ ان کے کمر تو ہے ہی نہیں پھر اسے وہ کس کے میرے قتل پر کیا باندھتے یا باندھیں۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اور تو اور جن پر سب گھر بار میں نے مٹا دیا وہ بھی کہتے ہیں کہ غالبؔ بے ننگ و نام ہے۔ اگر اس کا علم سے پہلے سے ہوتا تو میں اپنے آپ کو کیوں تباہ اور برباد کرتا۔" لو وہ بھی کہتے ہیں " اتنے ٹکڑے میں تو زبان کا مزہ ہے۔ باقی شعر بہت معمولی ہے۔ جو کچھ کہا تھا وہ بہت ہوتا تو کہہ سکتے تھے کہ ساری غزل کون اچھی کہہ سکتا ہے۔ نرم و گرم اشعار سب ہی کے ہوا کرتے ہیں۔ مگر کلام غالبؔ تو منتخب کر کے چھاپا گیا ہے۔ تو اچھے اشعار کے سوا کوئی سست شعر کیوں ہو۔ کہتے ہیں کہ دو تہائی اشعار نکال ڈالے گئے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جو شخص راستہ میں تیز جاتا ہوا مجھے دکھائی دیتا ہے تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ انھیں کے گھر جا رہا ہے۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیتا ہوں۔ جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو کہیں اور جا رہا ہے۔ اور دوسرا کوئی تیز رو مل گیا تو اس کے پیچھے ہو لیا۔ غرض کہ دیار یار میں تازہ وارد ہوں۔ غربت کی تکلیف اٹھا رہا ہوں۔ راہ بر کو پہچانتا نہیں۔

مضطرب الحال اور گم کردہ راہ کی خوب تصویر کھینچی ہے۔

جناب نظمؔ فرماتے ہیں کہ " ابھی " کے لفظ سے یہ بات پیدا ہے کہ بے وطنی کی مصیبت اور دشت غربت کی آفت نئی نئی سر پڑی ہے۔

اس شعر کے ضمن میں جناب آسیؔ نے شاعری اور مصوری کا موازنہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اُن مصوروں کا یہ کمال مرئی اور مادی چیزوں تک محدود اور منحصر ہے۔ غیر مرئی چیزوں کی تصویر اگر مصور کھینچے گا اور وہ بھی ایسی کہ جس کے دیکھنے سے اس کی حالت پر پورا پورا عبور غیر ممکن ہے۔ اس سے میری مراد جذبات ہیں۔ یعنی فرض کر لیجیے کہ غصہ، تمکنت۔ غرور۔ سادگی، متانت اُجڑے ہوئے کھنڈروں کے نقشے۔ ہرے بھرے باغوں کی سرسبزی اور رونق۔ بہتے ہوئے چشمے کی روانی وغیرہ کو ایک چابکدست مصور کھینچ سکے تو کیسے ممکن ہے کہ غصہ۔ تمکنت غرور

سادگی کے وجوہات ۔ بھیانک جگہ کے اسباب اور ان کے اُجڑ جانے کے اوقات ۔ دریا کی روانی کے ساتھ اس کے عمق وغیرہ کو کیسے دکھا سکتا ہے (اس آخری جملہ میں اور دیگر الفاظ میں بھی جذبات کی کیا اچھی تشریح فرمائی ہے)۔

اس بحث میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ فردوسی افراسیاب کے غصہ اور غیرت اس کے غرور و تمکنت تکبر دلیری اپنے مقابلہ پر دنیا کو ذلیل سمجھنے اور زمانہ کی حیرت انگیز انقلاب کی یوں تصویر کھینچتا ہے ۔

زشیر شتر خوردن وسوسمار عرب را بجائے رسید ست کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

جناب عبدالحق صاحب مدیر رسالہ اُردو ان کی شرح کی تنقید میں فرماتے ہیں کہ اس شرح سے یہ بالکل نئی بات معلوم ہوئی کہ یہ اشعار فردوسی افراسیاب کے جذبات کا خاکہ کھینچتے ہیں ۔ (یہ اشعار عربوں کی تحقیر میں ہیں کہ اونٹ کا دودھ پینے والے اور گوہ کھانے والی قوم ملک ایران کی تمنا کرے)۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں؟

اظہار خواہش میں احمقوں سے اس قدر خضوع و خشوع ظہور میں آیا کہ لوگ اُس پر گمان پرستش معشوق کرنے لگے ۔ اُن کے اس ظن کو یوں رفع کرتا ہے کہ اظہار تمنا عاجزی و تواضع کے ساتھ کرتا ہوں اہل دنیا جو احمق ہیں اسے پرستش قرار دیتے ہیں ۔ لہٰذا لوگوں کی اس بات سے حیران ہو کر پوچھتا ہے ۔ کیا واقعی میں اُس بت بیداد گر کو پوجتا ہوں جیسے اسے اس کی خبر نہیں کہ اظہار خواہش حد پرستش تک پہنچ جاتی ہے ۔ چوں کہ عاشق کو اپنی فروتنی بدرجہ غایت کا علم نہیں اس لئے اہل دنیا کے خیال پرستش پران کو احمق کہتا ہے ۔

پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوئے یار جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

پھر سے ایسا معلوم ہوتا ہے واقعہ پہلے بھی گذر چکا ہے ۔ اور اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں معلوم ہوتا ۔ (میں) سے مطلب پورا ہوتا ہے ۔ اپنی خبر ۔ خود تو اپنے گھر ہیں پھر اپنی خبر لینے کے لئے جانے کے کیا معنی ۔ دل کی خبر کہتے تو ممکن تھا ۔ مثلاً سے

جاتا کبھی چھٹے ہوئے دل کی خبر کو میں

جناب نظم : آپے سے جو میں گیا ہوا ہوں تو کہیں اور تھوڑی گیا ہوا ہوں ۔ کوئے یار ہی میں گیا ہوں گا ۔ وہی جگہ ایسی دلکش ہے کہ وہاں جا کر کوئی پلٹتا نہیں ۔ میں بھی وہیں ہوں ۔ اسی سبب سے آپ میں نہیں آتا اور آپ

میں نہ ہونے کی وجہ سے راہ بھی بھول گیا۔ نہیں تو ایک دن اپنی خبر کو وہاں جاتا۔

جناب نظم کے معنی سمجھتا نہیں۔ الفاظ موجودہ کے ہوتے ہوئے۔ مجھ سے کوئی معنی بنتے نہیں۔ بعد ترمیم شعر صاف ہوجاتا ہے معنی لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی خبر کے معنی یہ لیئے جائیں کہ میرا ذکر اچھا یا برا وہاں ہوتا ہے یا نہیں تو یہ معنی ہو سکتے ہیں۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا　　　سمجھا ہوں دل پذیر متاع ہنر کو میں

جس طرح میں متاع ہنر اور کمال کو مرغوب دل سمجھے ہوئے ہوں۔ اپنے اوپر قیاس کر کے اسی طرح اہل زمانہ کو بھی ہنر کو پسند کرنے والا سمجھتا ہوں۔ حالاں کہ اس زمانہ میں کمال کی قدر کون کرتا ہے۔ لہذا ہم کو کون پوچھے۔

اپنے پر اب اپنے اوپر بولتے ہیں۔ اگرچہ اور محاورات ہیں۔ اب اوپر تئیں کو ترک کرتے جاتے ہیں۔

غالبؔ خدا کرے کہ سوار سمند ناز　　　دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

سوار سمند ناز جو ناز کے گھوڑے پر سوار ہو۔ اس سے مراد علی بہادر ہیں۔

جناب آسی لکھتے ہیں کہ یا تو کسی کا نام ہے جو مصنف کے دوستوں میں ہیں۔ یا بہادر عالی گہر علی کی صفت ہے جس سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔

اگرچہ بجھوائے آیہ شریف لا تحسین الذین، قتلوا فی سبیل اللہ اموا تا بل احیاء عند ھم یرزقون (پارہ لن تنالوا۔ رکوع ۸) زندہ ہیں۔ مگر ان کی زندگی جسی نہیں جو ان سے ملنے کی کوئی تمنا کرے۔ خواب میں ملنے کا ذکر نہیں۔ مزید برآں سوار سمند ناز حضرت علی کے لیئے نہیں کہہ سکتے۔ پھر نہ معلوم جناب آسی کا ذہن حضرت علی سے مراد لینے کی طرف کیوں گیا۔ انھوں نے تو مردداً حضرت علی کو مراد لیا۔ جناب سہا اپنی شرح میں صرف حضرت علی ہی مراد لیتے ہیں۔

نہ کسی شارح نے بتایا اور نہ مجھے ہی معلوم ہو سکا کہ علی بہادر ہیں کون۔ اور معشوقانہ صفت (سوار سمند ناز) ان کے لیئے کیوں استعمال کی۔ حُسن پرست غالب کو کسی نے لکھا نہیں۔

ناز کو سمند سے استعارہ کرنے میں کوئی معقول وجہ جامع معلوم نہیں ہوتی اس لیئے جناب نظم نے اس کے معنی یہ لکھے کہ وہ سمند جو ناز سے چلے۔

---

غزل ۱۵ اشعار ۹

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

رقیب برائی کے ساتھ میرا ذکر ان کے سامنے کرتا ہے لیکن انھیں میرے ذکر اور نام سے بھی نفرت ہے۔ وہ کسی طرح کا ہو میرا ذکر سننا ہی نہیں چاہتے۔ جب یہ حالت ہے تو وہ رقیب سے بھی اگر خفا ہو جائیں تو کوئی عجیب بات نہ ہوگی۔

وعدۂ سیر گلستاں ہے خوشا طالع شوق مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

خوشا میں کوئی الف بمعنی (است) کہتا ہے اور کوئی بمعنی بسیار مقدر و مذکور اصطلاح صرف و نحو ہے۔ مقدر کے معنی عبارت میں نہیں مگر مقصود ہے۔ مذکور ذکر اور بیان میں جو آئے۔
اس نے سیر گلستان کا وعدہ کیا ہے۔ اے شوق قتل تیرے نصیب جاگے۔ گو وہ بظاہر قتل عاشق کو نہیں کہتے ہیں۔ مگر ضمناً سیر گلستان سے ان کا یہی مطلب ہے کہ وہ تجھے قتل کر کے گلہائے خون کی بہار دیکھیں گے لہٰذا تیرے لیئے یہ خوش خبری ہے کیوں کہ تیری تمنا بھی ان کے ہاتھ سے قتل ہونا ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں۔ عجب نہیں کہ مژدۂ قتل کی جگہ مژدہ وصل کہا ہو۔ وصل کا استعارہ بھی بہار کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ مگر گلستان کو مناسبت بوجہ سرخی گل اور سرخی خون زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

شاہد۔ معشوق ہستی مطلق محبوب حقیقی کمر کو شعرا معدوم کہتے ہیں۔ اور عالم بھی وحدت وجود ماننے والوں کی نزدیک معدوم ہے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ الوجود بین اور عالم دونوں معدوم ٹھہرے۔
معشوق حقیقی کی کمر بھی عالم کی طرح معدوم ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں کہ ایسا ہے لیکن ہم اس بات کو نہیں مانتے کیوں کہ عالم تو نیست مطلق اور شاہد ہست مطلق ان دو متضاد کا انضمام کیسے ہو سکتا ہے۔ کمر محبوب حقیقی تو ہے۔ شعرا خود دی میں مبالغۃً معدوم کہتے ہیں۔ اور بنا بر لاموجود الا اللہ عالم کا تو وجود ہی نہیں پھر عالم کو ہستی مطلق کیسے مانیں

لوگ کہتے تو ہیں لیکن ہمیں منظور نہیں

جناب نظم ۔ عالم کو ہستی کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ کمر کو معشوق کے ساتھ کہ اس کا نام ہی نام سنتے ہیں اور دکھائی نہیں دیتی ۔ مصنف نے لفظ منظور کو یہاں بمعنی مرئی و مبصر استعمال کیا ہے ۔ محاورہ اس کے مساعد نہیں ۔

مقصود جناب نظم یہ ہے کہ جب کسی لفظ سے معنی وضعی ہجور ہو جائیں تو معنی وضعی میں اس لفظ کا استعمال کرنا اجنبی اور غیر مانوس ہوتا ہے ۔

جناب حسرت ۔ غالب دنیا کے موہوم ہونے کو بہ غلو بیان کرتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے ۔ اور اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ جس طرح شاہد کی کمر نہیں ہوتی اسی طرح وجود عالم بھی موہوم ہے ۔ لیکن ہم کو یہ منظور نہیں کیوں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ "عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے" تو اگر چہ اس کے معنی یہی ہوں گے کہ عالم معدوم ہے ۔ لیکن "ہے" کا لفظ بھی ہم ایک شے معدوم کے لئے کسی طرح استعمال نہیں کر سکتے ۔

جناب آسی معنی حسرت ہی کو اپنی شرح میں لکھتے ہیں مگر شرح حسرت کا بنا بر عادت حوالہ نہیں دیتے ۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا ۔ لیکن    ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

دریا سمندر ۔ مراد ذات الٰہی تنک ظرفی کم ظرفی ۔ منصور حلاج جو انا الحق کہتے تھے ۔ اس کلمہ کی وجہ سے علمار شریعت نے انھیں سولی چڑھوا دیا ۔ ایران کے شہر بیضا میں پیدا ہوئے ۔ مقتدر باللہ خلیفہ عباسی کے زمانہ ۳۰۹ ھ میں مارے گئے تقلید ۔ پٹا گلے میں ڈالنا ۔ پیروی کرنا ۔ ہم کو تقلید منصور نہیں یہ اردو اچھی نہیں ہے

ہم کو منظور تنک ظرفی منصور نہیں

ہم بھی از روئے حقیقت اگرچہ عین ذات الٰہی ہیں ۔ مگر منصور کی طرح کم ظرف نہیں جو وہ انا الحق کہہ بیٹھا ۔

حسرت اے ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی    عشق پر عربدہ کی گوں تن رنجور نہیں

عربدہ ۔ بفتح اول و ثالث بد اخلاقی ۔ شدہ ہر شئی ۔ لیکن فارسی میں بمعنی جھگڑا ۔ لڑائی مستعمل ہے ۔ گوں ۔ ل (ہندی) ڈھب ۔ داؤ (داؤں) گھات ۔ گوں گھات ملا کے بھی بولتے ہیں ۔

شئی ایسی پر قوت اور زبردست چیز سے جب طاقت اور ہمت تھی تو مقابلہ کر لیا کرتے تھے گو اس سے جیت

نہیں پاتے تھے اور مقصود ہم کو اپنا برباد و تباہ کرنا ہی تھا۔ مگر اب تن بیمار میں طاقت ہی نہ رہی اور اس ڈھب کا
نہ رہا کہ اس سے مقابلہ کا ارادہ بھی کریں۔ مگر خرابی کی حسرت تو ہے۔

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تجھے کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

پہلے مصرع کے (میں اور ہم) میں شتر گربہ ہے۔" میں جو کہتا ہوں کہ میں لوں گا۔ یا۔ ہم جو کہتے ہیں کہ ہم لیں گے
ہونا چاہیے۔ رُعونت ۔ حماقت و استغنا و شدت و کثرت حرکت مگر فارسی اور اُردو میں غرور اور ٹھسے
کے معنے ہیں۔

میں نے جو اُن سے کہا کہ یہاں جتنا جی چاہے ستالو۔ دور دور رہو مگر قیامت میں تو ہمارے حصّہ
میں آؤ گے۔ تو انھوں نے بڑے ٹھسّے سے کہا کہ ہم کوئی حور نہیں ہیں جو کسی کو ملیں (مطلب یہ ہے کہ ہم حور سے
بڑھ کے ہیں) حوریں اہل جنّت کو ملیں گی۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ شوخی اور حاضر جوابی بھی معشوق میں اچھی سمجھتے ہیں بلکہ اکثر ایسا شعر بیت الغزل
ہوتا ہے۔

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

لطف کرنے میں اگر تم کو دریغ ہے تو ظلم ہی سے کام لو۔ نہ ظلم اور نہ لطف تو یہ امر تو تغافل پر دال
ہے اور اتنی ناآشنائی مجھے گوارا نہیں۔ محض تغافل سے کام لینے میں تو تمہیں کسی طرح سے مجبور نہیں سمجھا
جاسکتا۔ اور معافی نہیں دی جاسکتی ہے

ظلم کر ظلم اگر لطف نہیں کرتا ہے

صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

صاف ۔ نتھری ہوئی شراب ۔ راح (رحیق)۔ اس لفظ کو بمناسبت دردی لائے۔ دردی =
تلچھٹ۔ گاد۔ دُرد اور باز فارسی الفاظ ہیں اور دردی اور بازی (ایک ی کے بڑھ جانے سے عربی ہو جاتے ہیں) جم جمشید
شہنشاہ ایران جس کی یادگار تخت جمشید اصطخر شیراز میں اب تک باقی ہے۔ کہتے ہیں زمانہ جمشید میں پہلے پہل شراب انگوری بنی
تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ جمشید اور حضرت سلیمان۔ (اور ابراہیم زرتشت۔ اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ) ایک ذات ہیں۔ واللہ اعلم۔
ہم مے خوار بڑے مرتبہ کے لوگ ہیں پیمانہ جمشید کی تلچھٹ پئے ہوئے ہیں۔ جو شراب کہ انگور کی نہ ہو

اسے منھ بھی نہیں لگاتے ۔ صاف اور درد میں تناسب لفظی سہی مگر معناً کوئی خوبی نہیں بلکہ کسی قدر مخل معنی ہے۔
افشردہ = نچوڑی ہوئی ۔
(بقیہ معنی) وہ شراب قابل افسوس ہے جسے ہم نہ پئیں ۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ     میرے دعوی پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

ظہوری = ملا نورالدین ترشیزی ۔ ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کے درباری شاعر تھے ۔ نوے برس سے زیادہ عمر پاکر ۱۰۱۶ھ میں انتقال کیا ۔ پہلے خفائی تخلص تھا ۔ غالبؔ نے طرز بیدل چھوڑ کے فارسی غزل میں عرفی ۔ نظیری اور ان کا ڈھنگ اختیار کیا تھا ۔

اے تماشائیاں ژرف نگاہ     ہاں بگوئید حسبتہ اللہ

کہ چساں از حزیں بہ پنجم سر     آں بہ جادو دی مے بدھر سمر

دل دہد کز اسیر برگردم؟     زاں نوآئین صفیر برگردم     دل دہد = آیا دل
(مغرب بشم)     اجازت و دستوری

دامن از کف کنم چگونہ رہا     طالب عرفی و نظیری را

خاصہ روح و رواں معنی را     آں ظہوری جہاں معنی را

حُجّت = وہ دلیل جس سے غلبہ خصم پر حاصل ہو ۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اعم ہے اس سے کہ اس کے مقدمات ثابت ہوں یا نہ ہوں ۔ ظہور اور خفا میں صنعت مقابلہ و تضاد ہے ۔ تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ میں ظہوری کا مقابل ہوں ۔ اس وجہ سے بھی یہ معنی ہوتے ہیں کہ ظہوری کا پہلے تخلص خفائی بھی تھا ۔
ظہوری کے مقابلہ میں میں گمنام ہوں (تواضعاً و انکساراً کہا) میرے اس دعوی پر یہ دلیل کافی ہے کہ وہ مشہور ہے اور میں شہرت یافتہ نہیں ۔

---

غزل ۱۶     اشعار ۱۰

ہیخ     نالہ جز حُسن طلب اے ستم ایجاد نہیں     ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

حسن طلب   اس شعر میں کیا ہے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے ۔

میرا نالے کرنا اس غرض سے نہیں کہ مجھے تیرے مظالم ناگوار ہیں اور میں فریاد کرتا ہوں تاکہ ظلم کرنا چھوڑ دو بلکہ میرا نالے کرنا حُسنِ طلب ہے کہ تم اور جور و ستم زیادہ کرو کیوں کہ ہم کو تمہارے ستم بھی مزہ دیتے ہیں۔

جب کبھی کچھ نظم کیا کرتا تھا تو زیادہ تر غالبؔ ہی طرحوں میں کچھ بک لیتا تھا، کیوں کہ غالبؔ کا وہ طرز کلام جو سہل ممتنع ہے مجھے دل سے مرغوب ہے۔ اور اس طرز میں غالبؔ کو عدیم المثال شاعر غزل گو سمجھتا ہوں۔

اس طرح میں مجھے اپنے دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔ اپنے کلام سے مجھے اتنی نفرت پیدا ہوئی کہ اس کے ضائع ہو جانے کے بعد پھر میں نے اسے کہیں جمع نہ کیا۔ اس لیئے کہ آٹھ دس برس انہماک کے بعد میری سمجھ میں آگیا کہ میں قدرت کی طرف سے فطرت شاعری لے کر نہیں آیا ہوں۔ وہ دو شعر یہ ہیں۔

شکوۂ ظلم و ستم اور ستم ایجاد نہیں ۔۔۔ گھٹ کے ارمان نکلتے ہیں یہ فریاد نہیں

سامنے جاتا ہوں کیا اُن سے شکایت میں کروں ۔۔۔ اس قدر ظلم اُٹھائے کہ مجھے یاد نہیں

سامنے جانے سے میرا مافی الذہن یہ ہے کہ سامنے ہونے پر سب شکوے ان کے ملنے کی خوشی میں بھول جاؤں گا۔ اور مسرت میں بیان بھی نہ ہو سکیں گے۔ شعرا جانیں کہ یہ مطلب پیدا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ یاد نہ رہنے کی علت کثرت ظلم مصرع ثانی میں موجود ہے۔

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ۔۔۔ ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

مشہور تو یہ ہے کہ شیریں کی خواہش سے جوئے شیر لانے کے لیئے کوہ بیستوں کو کھودنا شروع کیا تھا۔ انھوں نے مزدوری خسرو اس لیئے کہا کہ ان کی تخیل کے تکمیل اسی سے ہوتی تھی۔ اور خسرو شوہر شیریں بھی ہے۔ سی نے فرہاد کو بلوایا بھی ہوگا۔

خسرو چوں کہ شوہر شیریں ہے اور فرہاد بھی شیریں کو دیکھ کر اس کا عاشق ہوگیا تھا۔ لہٰذا خسرو فرہاد کا رقیب ٹھہرا۔ رشک کا مقتضی یہ نہ تھا کہ خسرو کی خواہش پوری کرتا۔ اس لیئے ہم اس کی نیک نامی کے قائل نہیں۔ عاشق صادق ہوتا تو ہرگز رقیب کے سامنے ہیٹا نہ بنتا۔ اس کی غیرت نے اس فعل کو کیسے قبول کیا۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم ۔۔۔ دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اگرچہ ہمارا گھر بھی ویرانی میں صحرا سے کم نہیں مگر اس میں وسعت و فراخی دشت کی ایسی کہا اور میرا جنون

مفرط وسعت کو چاہتا ہے۔

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب    لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں

صاحبان بصیرت کے لیئے افراط حادثات دنیا بمنزلہ مکتب ہے۔ وہ حوادث سے سبق لیتے اور عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اسی لیئے حوادث کی موجوں کے تھپیڑے ان کے لیئے استاد کے تھپڑوں اور تنبیہ سے کم کام نہیں کرتے۔

وائے محرومی تسلیم و بدا حال وفا    جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں

ہم تو تسلیم و رضا و وفا کے پابند ہیں جو ظلم بھی وہ کریں اسے سہتے ہیں اور شکوہ و شکایت و فریاد نہیں کرتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم میں قوت فریاد نہیں ہے۔ لہٰذا تسلیم کی وجہ سے جو محرومی ہم کو حاصل ہے اور پابندی وفا کے سبب سے ہم فریاد نہیں کرتے ایسی رضا اور وفا قابل افسوس ہے۔ کاش ہم فریاد کرتے اور اس کا ان پر اثر پڑتا تو اس سے اچھا تھا۔ بدا کا الف بھی خوشا کی طرح بمعنی است یا بمعنی بسیار ہے۔

رنگ تمکین گل و لالہ پریشان کیوں ہے    گر چراغانِ سرِ رہ گذرِ باد نہیں

تمکین = قیام و ثبات و قدرت۔ پریشانی رنگ = رنگ کا اُڑ جانا۔

اگر گل و لالہ ہوا کے راستہ کے چراغان نہیں ہیں تو پھر ان کے لیئے ثبات و قیام کیوں نہیں ہے۔ جس طرح ہوا کے جھوکوں کے سامنے چراغ نہیں ٹھہرتا۔ اسی طرح گل و لالہ کو بھی باد فنا کی وجہ سے بقا و قیام نہیں۔ دنیا کی ہر شئے فانی ہے۔

سبد گل کے تلے بند کرے ہے گل چیں    مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

سَبد = ٹوکری۔ گلچیں = پھول چننے والا۔ مالی۔ صیاد = پرندوں کو پکڑنے والا۔ چڑی مار۔ مرغ مراد بلبل۔

اے مرغ آزاد تجھے بشارت اور خوش خبری ہم دیتے ہیں کہ اس وقت گل زار میں صیاد نہیں ہے لہٰذا اے بلبل گلزار میں جا اور اپنے محبوب گل کے دیدار سے فرحت حاصل کر۔ اگر صیاد ہوتا تو تجھے پکڑ کے پنجرے میں بند کرتا۔ اور دیدار محبوب سے محروم رہنا پڑتا۔ لیکن اس وقت گلچیں گلزار میں ہے وہ تجھے اگر پکڑ بھی لے گا تو

پھولوں کی ٹوکری کے نیچے بند کرے گا جس سے کم از کم بوئے محبوب تو آتی رہے گی۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ شعرا کی عادت ہو گئی کہ گل و بلبل و شمع و پروانہ وغیرہ کا ذکر بھی مضمون شعر سمجھتے ہیں۔ وگرنہ جہاں تک غور کیجئے اس کا کچھ حاصل نہیں معلوم ہوتا۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا — دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد "نہیں"

نفی بمعنی انکار۔ اثبات اور گویا الفاظ متناسب ہیں۔

دہن تو ان کو ملا ہی نہیں وہ معدوم ہے۔ مگر بجائے دہن وقت ایجاد ان کو "نہیں" ملی ہے کیوں کہ ہر سوال کا جواب "نہیں" سے دیتے ہیں۔ انکار میں ان کا یہ جواب خود دلیل ان کے دہن ہونے کی ہے۔ ورنہ "نہیں" کیسے کہتے۔ یہی معنے حسرت نے لکھے ہیں۔

اثبات کو خود ہی مذکر بھی کہا ہے ؎

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

مگر یہاں مؤنث باندھا۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت — یہی نقشہ ہے مگر اس قدر آباد نہیں

تیرا کوچہ اور بہشت بالکل ایک دوسرے کے مماثل ہیں ہر طرح سے۔ مگر بہشت میں اتنی آبادی کہاں کیوں کہ ہر فرد بشر تمہارا عاشق ہے۔ اور ان سے تمہاری گلی مملو رہتی ہے۔ برخلاف بہشت کہ اس میں معدودے چند اعمال حسنہ والے جائیں گے۔

کرتے کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ — تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

غربت ۔ مسافرت شاید سفر سے مراد سفر کلکتہ ہے۔ کیوں کہ دوسرا سفر کرنا ان کی سوانح عمری سے معلوم نہیں ہوتا۔

اے غالبؔ تم مسافرت کے لوگوں کی شکایت کس منھ سے کرتے ہو وطن والوں کی نامہربانیاں کیا تم کو یاد نہیں پھر اجنبیوں سے مہربانی کی امید کیوں ہے۔

---

غزل ۱۷ اشعار ۳

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے کہ خوش رہا یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں ب۲ غ

دونوں عالم دنیا و آخرت دے کے وہ سمجھے کہ ہم بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ مگر ہم کو اس بات کی شرم دامنگیر ہوتی کہ ہم اس میں جھگڑا کیوں کریں۔ ورنہ ہماری خوشی تو اس بات میں تھی کہ ہم کو اور کچھ نہ دیتے۔ صرف وہ محبوب ہمارا ہم کو مل جاتا۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

راہ سلوک و معرفت میں چل کر تجھ تک پہنچنا حد امکان بشری سے باہر ہے۔ جتنے بھی اس راہ میں چلتے ہیں تھک تھک کے جب پتا نہیں پاتے ہیں تو کوئی کسی مقام پر اور کوئی کسی مقام پر رہ جاتا ہے منزل مقصود تک کوئی نہیں پہنچتا۔ جب کسی کو پتا لگتا ہی نہیں تو بے چارے اور کیا کر سکتے تھے۔

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

اہل بزم دوست دار شمع ضرور ہیں۔ مگر شمع کا غم ہی جاں گداز ہے اس کا علاج کس کے پاس ہے۔ شمع تو معشوق پروانہ ہے عاشق نہیں۔ اس شعر سے یہ نہ معلوم ہوا کہ شمع کو غم کس بات کا ہے۔ کیا یہ مقصد ہے کہ شمع بھی ان کے روئے روشن کی عاشق ہے۔ مگر شعر میں اس معنی کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ یا میں سمجھتا نہیں اور شارحین بھی نہیں بتاتے۔

---

غزل ۱۸ شعر ۱

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں ب۲ غ

غیر کی چکنی چپڑی باتوں نے اسے موہ لیا۔ ہم جو منھ سے کچھ کہتے نہیں اور صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں تو ہم پر وہ گمان بھی عاشق ہونے کا نہیں کرتے۔

---

غزل ۱۹ اشعار ۲

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں ضیغ

سُن - اب سُن کر بولتے ہیں۔ شعر میں تعقید ہے۔ قیامت ہے - کسی فعل ناپسندیدہ پر یہ کلمہ بولتے ہیں۔ دوسرا استعمال مجھے معلوم نہیں۔ میری سمجھ کے موافق شعر یہ چاہتا ہے کہ کسی غیر متوقع کام کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ یہ اور پہلے معنی تقریباً ایک ہیں۔

مجنوں نے جب یہ سنا کہ صحراء مجنوں میں لیلیٰ آئی تھی تو اس نے کہا یہ تو قیامت کی بات ہے۔ اور سخت تعجب میں کہنے لگا کہ زمانہ میں کیا کبھی ایسا بھی ہو جایا کرتا ہے۔ جو لکھا کچھ سمجھ کے نہ لکھا۔ صرف نثر بنا دینے کی کوشش کی ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ لیلیٰ کے آنے پر مجنوں نے تعجب کیا۔ اور تعجب کرنے کو یہ لازم ہے کہ شرم و حیا کے خلاف سمجھا۔ اور شرم و حیا کے خلاف سمجھنے کو لازم ہے کہ لیلیٰ پر وہ تشنیع کرے۔ اور تشنیع کرنے سے یہ بات لازم آئی کہ عاشق کی خبر لینے میں اس کو خود شرم و حجاب مانع ہے۔ غرض کہ اس شعر میں بلاغت کی وجہ یہی سلسلہ لزوم ہے۔ حاصل یہ ہوا قیامت ہے کہ عاشق کی خبر گیری میں بھی وہ حجاب کرتا ہے (میں اب بھی کچھ نہ سمجھا)۔

جناب آسی - وہ سنگ دل جذب دلِ عاشق سے بے خبر ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ لیلیٰ کا ناقہ راستہ بھول کر ایک شب تار میں اس کو ایسے جنگل میں لے گیا تھا جہاں مجنوں خاک چھانتا تھا۔ چنانچہ قیس کو جب یہ قصہ سنایا تو اس نے کہا کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ حجاب معشوقانہ معشوق کو عاشق کے پاس جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ یہ تو اس کے مصداق ہیں۔ من چہ میگویم و طنبورہ من چہ میسراید - یا۔ کہیں کھیت کی سُنیں کھلیان کی۔

جناب حسرت اپنے نزدیک جس شعر کو سہل سمجھتے ہیں اس کو سادہ چھوڑ دیتے ہیں۔ لہٰذا اس شعر پر بھی کچھ نہ لکھا۔

دوسری بات میرے ذہن میں یہ آتی ہے کہ : لیلیٰ دشت مجنوں میں آئی تھی۔ مگر مجنوں سے ملی نہیں تو اس کے آنے اور نہ ملنے کو سُن کر مجنوں نے کہا کہ یہ تو بڑی قیامت کی بات اور تعجب خیز ہے کہ آئے بھی اور پھر ملے بھی نہیں۔ کہیں دنیا میں ایسا بھی ہوا کرتا ہے۔ جب آئی تھی تو ملنا بھی چاہیئے تھا۔

قیامت ہے۔ تعجب سے اور طرز بیان چاہے اچھا ہو۔ مگر نفس مطلب میں کوئی خوبی نہیں معلوم ہوتی یا۔ الناس اعداء لما جھلت کا میں مصداق ہوں۔

دل نازک پر اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

سرگرم ۔ مستعد اور آمادہ ۔ اُلفت آزمانے میں ۔ شاید ۔ اُلفت آزمانے پر اسے سرگرم نہ کر زیادہ بولتے ہوں ۔

اے غالب مجھے اس کے دل نازک پر رحم آتا ہے ۔ لہٰذا اپنی الفت و وفاداری آزمانے پر اسے مستعد نہ کر ۔ ممکن ہے کہ اس سے قتل نہ کیا جائے ۔ یا ۔ نازک ہاتھ دکھ جائیں ۔ یا ۔ بعد قتل کر دینے کے انھیں رنج ہوا ور کڑھیں ۔ جو مجھے منظور نہیں ۔

---

غزل ۲۰ اشعار ۲

بیغ ۲ دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں

کسی پر عاشق ہو کے اب وہ فکر مند خلوت میں بیٹھے رہتے ہیں ۔ ہماری بے کسی و تنہائی کی داد ہم کو اسی دنیا میں مل گئی ۔ اب ان کو بھی معلوم ہوا ہوگا کہ جدائی محبوب میں دل پر کیا گزرتی ہے ۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام مہر گردوں ہے چراغ رہ گذار بادیاں

خلقت کے تمام افراد میں مادہ زوال فطرتاً موجود ہے ۔ حتیٰ کہ آفتاب جس پر حیات ذی حیات منحصر ہے وہ بھی ہوا کے راستہ کا چراغ ہے ۔ جس طرح ہوا کے سامنے چراغ بجھ جاتا ہے ۔ اسی طرح آفتاب بھی فنا ہونے پر تیار رہے ۔

---

غزل ۲۱ اشعار ۴

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں بیغ ۴

صبا ۔ ہوائے مشرقی ۔ شحرار ہوا ۔ کبوتر ۔ قاصد سے نامہ و پیام کا کام لیتے ہیں ۔ ہوا دیوار پر سے آتی ہے اور قاصد دروازہ سے ۔ یہ مطلع معمولی ہے ۔

حالت ہجر میں جو ہم دیوار و در کو دیکھتے ہیں تو ہمیں انتظار اس کا رہتا ہے کہ دیوار پر سے ہوا پیام اور در سے

قاصد نامہ لاتا ہوگا۔

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے　　　　کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ان کا ایسا شخص اور میرے ایسے آدمی کے گھر آئے اسے قدرت خدا کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہ امر تو ان سے بہت بعید تھا۔ چوں کہ ان سے اس فعل کی امید ہی نہ تھی اس لیئے متحیر ہو کر ہم ان کو غور سے دیکھتے ہیں کہ وہی ہیں یا کوئی اور۔ اور یہ گھر ہمارا ہی گھر ہے یا کسی دوسرے کا۔ کیوں کہ آنے کا تو گمان بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ اور اگلا شعر ان اعلیٰ اشعار میں ہے کہ جن کی نظیر دنیائے شاعری میں مشکل سے ملے گی۔

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو　　　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ان کا ایسا نازک اور ایسا کاری زخم کہیں ان کے دست و بازو کو لوگوں کی نظر نہ لگ جائے۔ یہ لوگ میرے اس گہرے زخم کو کیوں دیکھتے ہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس شعر کی خوبی اور تعریف حد بیان سے باہر ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر شعرا کے دواوین میں۔ اس کا جواب نہیں نکل سکتا۔

بالکل سچ فرماتے ہیں۔ ایسے ہی اشعار کی وجہ سے غالب علی کل غالب ہیں۔ مگر اردو میں طرز جدید کے مجدد انھیں کٹھیے اشعار کی وجہ سے ہیں جن کے سمجھنے سے میں تو عاجز ہوں۔

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں　　　　ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

طرف کلہ = گوشہ تاج۔ طالع = وہ برج جو افق مشرقی پر وقت ولادت مولود یا سوال ہو سنسکرت میں راش کہتے ہیں اور ادب میں بمعنی قسمت مستعمل ہے لعل یاقوت کی گھٹیا قسم ہے۔ اس کے لیئے کان بدخشاں مشہور ہے۔ اور شب چراغ اس کی صفت میں لاتے ہیں۔ لالہ اور بلبل کی طرح شعرا نے بک بک کر کے ان کی عظمت ہمارے دلوں پر بٹھا دی ہے۔ ورنہ لالہ ایک قسم کے پوستہ کا پھول ہے۔ گلاب ہر حیثیت میں اس سے بہتر ہے۔ اسی طرح بلبل سے تو ہمارے یہاں کا شاما اور کلچڑی کہیں بہتر ہے۔ شاما کے سُر سریلے اور خوش آیند ہوتے ہیں اور بلبل کے نغمے ایسے سریلے نہیں ہوتے۔ ہاں چوبیس گھنٹے زبان تالوسے نہیں لگاتی اسی وجہ سے اسے فارسی میں شب آہنگ کہتے ہیں۔ حالاں کہ دوسرے پرندے رات کو نہیں بولتے۔

بات اس شعر کی بھی بہت اچھی ہے۔ لیکن الفاظ پر شوکت فارسی نے اس کی شان کو گھٹا دیا۔ حالاں کہ شوکت والے

الفاظ شعر کی شان کو بڑھاتے ہیں۔

لعل و مروارید جو تمہارے تاج میں جڑے ہیں ان کا دیکھنا کیا دنیا میں کثرت سے پائے جاتے ہیں ہم تو ان لعل و گہر کی قسمت کو دیکھتے ہیں کہ تم ایسے شخص کے تاج میں لگ کر تمہارے سر پر ان کو جگہ ملی۔

اس طرح میں نے بھی کبھی بکو اس کی تھی دو چار شعر یاد ہیں انھیں لکھتا ہوں۔ ناظرین ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ تقابل مقصود ہے۔ کہاں غالبؔ اور کہاں میں۔ اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ جب سے میری سمجھ میں آیا کہ میں شاعری کی فطرت لے کے نہیں آیا ہوں۔ اسی وقت سے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ اور جو کہا تھا اُسے بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ کچھ تراجم نظم کے نظم میں یا تاریخیں اب بھی کہنا پڑتی ہیں۔ یا ایک سہرا عالی جناب مرشد زادہ آفاق ولی عہد بہادر کے تقریب شادی ۳ر اکتوبر ۱۹۴۶ء میں کہا ہے جسے آگے نقل کروں گا۔

| | |
|---|---|
| غلط ہے یہ مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں | سب اس بہانہ سے ان کی نظر کو دیکھتے ہیں |
| سب اُس کی برشِ تیغ نظر کو دیکھتے ہیں | یہ لوگ کیوں نہیں میرے جگر کو دیکھتے ہیں |
| یہ جانتے تو نہ خوگر ستم کے یوں ہوتے | ہم اپنی آہ میں اب کچھ اثر کو دیکھتے ہیں |
| کہاں تو دامن سفاک اور کہاں یہ رنگ | ہم اس رسائی خونِ جگر کو دیکھتے ہیں |

خم خانہ جاوید میں (مصنفہ جناب سری رام دہلوی) میری لائف تیسری یا چوتھی جلد میں چھپی ہے اس میں میرے نانہالی رشتہ دار میر نظام الدین المتخلص بہ مدھ نانک ہیں جو موسیقی میں مرتبہ نانک پر فائز تھے اور ہندی کے شاعر بھی تھے جن کا ذکر جناب میر غلام علی آزاد بلگرامی اپنے تذکرہ سرو آزاد میں فرماتے ہیں اور جن کی تاریخ وفات یہ ہے۔

| | |
|---|---|
| سُرپت درگ سوکھت نہیں نس دن رہت اُداس | مدھ نانک کے مرت ہیں چھون دیس بھیو اپاس |

اس شعر کی تشریح یہ ہے۔ سرپت = مالک سُر راجہ اندر جو موسیقی کے دیوتا ہیں۔ درگ = چشم۔ آنکھ۔ سوکھت نہیں = اس سے آنسو جاری ہیں۔ رہت = رہتے ہیں۔ اُداس = غمگین۔ مدھ نانک = مستی و عشق کے کامل۔ نس = تمام۔ مرت ہیں = مرتے ہی۔ چھوں دیس = ۱۔ آکاس لوک یعنی عالم بالا۔ ۲۔ دیو لوک عالم اوتار۔ ۳۔ مرت لوک عالم فانی۔ ۴۔ پاتال لوک عالم تحت زمین۔ تحت الثریٰ ۵۔ گندھرو لوک ۶۔ سوریہ لوک عالم آفتاب (سورج) کو مجمع ۱۔ واح کہتے ہیں۔ اپاس = فاقہ مراد روزہ۔

(معنی شعر) راجہ اندر کی آنکھ اشکوں سے سوکھتی نہیں اور وہ تمام دن اداس رہتے ہیں۔ میر مدھ نانک کے

سرتے ہی چھنوں دیسوں نے فاقہ کیا یعنی روزہ رکھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کی پہلی تاریخ تھی۔

اس شعر سے تاریخ ۱۰۹۶ھ نکلتی ہے۔ اور آزاد سن وفات ۱۰۹۸ھ بتاتے ہیں۔ بہر طور بنا بر شہرت ان کے نام کے آگے (اولیا) بڑھا دیا۔ اور میری سیادت میں بٹا لگا دیا۔

میرے دو شعروں کے دو مصرعوں سے ایک شعر بنا یا۔ اور لکھا کہ شعر تو اچھا ہے مگر شاداںؔ کو اس پر بڑا ناز ہے۔

میرے جاننے والے بخوبی واقف ہیں کہ میں ناز و فخر کو جانتا ہی نہیں تحریر و تقریر میں کبھی بھولے سے بھی کسی بات پر ناز نہیں کیا۔ اور ناز کس بات پر کروں جب کہ کچھے ہوئے ہوں کہ مجھ میں کوئی بات قابل ناز نہیں۔ یہ شرح بھی میرے اس بیان کی شاہد ہے۔

مطلع ذیل پر ایطے کا اعتراض بھی کیا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ شاداںؔ ایسے محقق سے ایسی غلطی قابل تعجب ہے:

نگاہ لطف تمہاری جدھر کو دیکھتے ہیں　　　تمہارے چاہنے والے اُدھر کو دیکھتے ہیں

بے شک۔ جدھر۔ کدھر۔ اِدھر۔ اُدھر میں (دھر) جگہ کے معنی میں ہے۔ یعنی جس طرف۔ کس طرف۔ اس طرف۔ اُس طرف معنی ہیں۔ لیکن ان قوافی میں ایطاء خفی مان کر سب نے انھیں استعمال کیا ہے۔ اور اس کی مثالیں میں نے شرح معمیات حدائق بلاغۃ میں لکھی ہیں جس کو شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے چھاپا ہے۔ اگر اسلاف اساتذہ بھی جواب کے لیئے کافی نہیں تو مجھے اپنی غلطی مان لینے میں ذرا تامل بھی نہیں۔

---

غزل ۲۲　　　　اشعار ۷

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں　　　شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں　　مبالغہ

**روز جزا** کو پچاس ہزار سال کا مانتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مجھے قیامت کا اعتقاد نہ ہو وہ تو ارکان دین میں سے ہے۔ مگر طول اور ہول میں میری شب فراق سے تو ہرگز زیادہ نہیں۔

کوئی کہے کہ شب مہ میں کیا برائی ہے　　　بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

شب مہ = چاندنی رات۔ کہتے ہیں کہ ابر اور چاندنی رات میں مے خواروں کو شراب پینے میں زیادہ مزہ اور لطف آتا ہے۔ ایک بزرگ دین سے پوچھا کہ زاہد کسے کہتے ہیں انھوں نے فرمایا کہ دریا کا کنارہ۔ ابر چھایا ہوا

ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہوں۔ میز۔ کرسی۔ فرش۔ کنٹر۔ صراحی۔ جام اور دیگر سامان عیش موجود ہو۔ اور معشوق حسین پہلو میں ہو۔ اور پھر اس کی طرف رغبت نہ کرے وہی زاہد ہے۔ باد سے مراد ٹھنڈی ہوا ہے۔

اگر آج دن کو ابر چھایا ہوا نہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں نہیں چلتی ہیں تو خیر بزم مے خواری ملتوی رہے۔ رات جب چاندنی رات ہوگی اس میں یہ بزم مے خواری آراستہ ہو اس کے لیئے شب ماہ کیا بری ہے ؎

کوئی بتائے شب مہ میں کیا برائی ہے

جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں　　جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

مرحبا رحب سے مشتق ہے جس کے معنی وسعت و فراخی کے ہیں۔ کسی آنے والے شخص کی آمد پر اظہار خوشی کے لیے اہلاً و سہلاً و مرحبا بولتے ہیں یعنی تم یہاں کیا آئے اپنے لوگوں میں آگئے۔ ہر طرح کی سہولت تمہارے لیئے یہاں موجود ہے۔ یہ گھر تمہارے لیئے فراخ ہے۔ کسی قسم کی تنگی نہ ہوگی۔ اور صرف مرحبا بجائے کلمۂ تحسین و آفرین بھی بولتے ہیں۔ کہیں کو اس میں (کو) بمعنی طرف ہے۔

ان کو میرے ساتھ وہ لاپروائی ہے کہ اگر میں ان کے یہاں جاؤں تو مرحبا نہیں کہتے اور اگر ان کے پاس سے کہیں اور چلا جاؤں تو میرے جاتے وقت "خیر باد" نہیں کہتے۔ اس محل پر خدا حافظ اور اللہ نگہبان زیادہ تر مستعمل ہے۔ خیر باد غلط نہیں۔

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں　　کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

اول تو وہ کبھی مجھے یاد نہیں کرتے اگر کبھی بھولے سے میں یاد بھی آجاتا ہوں تو کہتے ہیں کہ آج ہماری بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں۔ انھوں نے مجھے بانی شر و فساد و فتنہ پرداز قرار دے رکھا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ لفظ بزم اس شعر میں مقتضائے مقام سے گرا ہوا ہے۔ کیوں کہ مصرع ثانی معشوق کی زبانی ہے اور اس کے قول کی نقل ہے۔ اور لفظ بزم اس کے محاورہ کا لفظ نہیں ؎

یہاں تو آج کوئی فتنہ و فساد نہیں

جب بزم کی ہے تو بزم نہ کہے تو کیا کہے۔

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب　　گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں

علاوہ بکسر اول سرباری۔ وہ چھوٹا سا بوجھ جو کسی چوپایہ پر پورا بوجھ لادنے کے بعد رکھ دیتے ہیں۔ مزید

بر اُس کے معنی میں مستعمل ہے۔ عید - عود سے مشتق ہے چوں کہ ہر سال پلٹ پلٹ کے آتی ہے اس لیئے اسے عید کہتے ہیں۔

شراب فیاضی اور جرأت پیدا کرتی ہے۔ مے خوار بڑی خوشی سے دوسروں کو شراب میں شریک کرتا ہے اور بخل سے کام نہیں لیتا ہے۔

مے خواروں کے نزدیک حاصل مرادات شراب ہی ہے۔ مے کدہ والے ایسے فیاض ہیں کہ کچھ عید پر منحصر نہیں جس میں لوگ خیرات کیا کرتے ہیں۔ یہ علاوہ عید بھی شراب دیا کرتے ہیں۔ کوئی کسی وقت مے کدہ میں جائے کبھی محروم واپس نہیں آتا۔ اس قسم کے مضامین غزل میں کیا لطف پیدا کرتے ہیں۔ ہاں مے کدہ عشق سے استعارہ کرلیں تو خیر کوئی بات بھی ہوگی۔ فارسی میں بھی اسی بات کو کہا ہے۔

غم گین کسے نمیرد از کوے میکدہ تا ہم پیالۂ مہ عیدش نمی کنند

جہاں میں ہو غم وشادی بہم ہمیں کیا کام دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

فارسی کی مثل ہے۔ شادی و غم بہم توام است۔ غالب کہتے ہیں کہ ہم پر یہ مثل کبھی صادق نہ آئی۔ ہم کو تو خدا نے وہ دل دیا ہے۔ جو کبھی اسے خوشی نصیب ہی نہیں ہوتی۔

اس مثل کو اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو مبتلائے غم ہو اُس کی تسکین خاطر کے لیئے اسے کہتے ہیں کہ یہ غم کبھی دور ہو کر سرور بھی حاصل ہوگا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ دنیا میں شادی و غم کا بہم ہونا اس مقام پر ذکر کرتے ہیں، جہاں دنیا کے سرور و خوشی سے نفرت ظاہر کرنا منظور ہو۔ اس شعر میں مصنف نے تازگی یہ پیدا کی ہے کہ غم و شادی کے بہم ہونے پر حسرت ظاہر کی ہے۔ کہتے ہیں (ہمیں کیا کام) یعنی ہم تو محروم ہیں۔ ہم کو تو کبھی ایسی خوشی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ جو غم سے متصل ہو اور شادی مخلوط بغم کی حسرت کرنے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ شاعر کو انتہا کی غمزدگی ہے کہ ایسی ہیچ اور ناکارہ خوشی کی تمنا رکھتا ہے۔ اور یہی وجہ بلاغت اس شعر میں ہے۔

لفظ "بہم" نے جناب نظم کو مغالطہ میں ڈال دیا۔ اس لیئے شادی مخلوط بغم معنی کیے۔ بہم کے یہ معنی نہیں۔ بلکہ بہم کے یہ معنی ہیں کہ غم ختم ہو کر شادی آتی ہے۔

انھیں کے معنی دیکھ کے جناب آسی نے بھی لکھ دیا۔ ہم ہمیشہ غم ہی میں گرفتار رہے (یا یہ کہ ہم کو کبھی ایسی خوشی بھی نصیب نہ ہوئی جو غم سے ملی ہوئی ہو)۔

تم ان کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب — یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

(تم اور غالب میں تغایر اعتباری ہے) ۔ اے غالب تم ان کے وعدہ وصال کو انھیں کیوں یاد دلاؤ ۔ جب تم یاد دلاؤ گے تو وہ بنا بر عادت کہہ دیں گے کہ ہم کو تو یاد نہیں۔ پھر یاد دلانے کا کیا فائدہ ۔ اس سے نہ کہنا ہی اچھا ہے۔ شوخی کا بیان ہے ۔ اور شعر خوب ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں معشوق کی بد عہدی اور وعدہ خلافی کو جو لوگ اُلٹ پلٹ کے کہا کرتے ہیں وہ اس شعر میں تامل کریں کہ اس مضمون کہنہ کو کیا آب و رنگ دیا ہے۔ مطلب تو یہی ہے کہ میں جب انھیں ان کا وعدہ یاد دلاتا ہوں وہ کہہ دیتے ہیں یاد نہیں ۔ مگر اس مطلب کو ملامت گر کی زبانی ادا کیا ہے ۔ انھوں نے تغایر اعتباری نہیں مانا ۔ کہنے والا ملامت گر کو ٹھہرایا ۔

---

غزل ۲۳ — اشعار ۸

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں — ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

توسن = اسب سرکش ۔ اور صبا ۔ ہوائے مشرق کو کہتے ہیں مگر غالب نے تجریداً مطلق اسپ اور مطلق ہوا کے معنی میں استعمال کیا ہے ۔ حتیٰ کہ صبا کو ایک جگہ نسیم سحری کی جگہ نظم کیا ہے ۔ باندھنا شعر میں نظم کرنا ہوا باندھنا ۔ اثر جمانا ۔ رعب بٹھانا ۔

ہم تیرے گھوڑے کو تیز رفتاری میں ہوا کہتے ہیں ۔ اور یہ کہہ کر اپنے مضمون کا رعب اور اثر دکھاتے ہیں ۔ بجز محاورہ ہوا باندھنے کے اس شعر میں کیا دھرا ہے ۔

پروپگنڈا کرنے کا ترجمہ اگر ہوا باندھنا کیا جائے تو شاید بے جا نہ ہو ۔ اور پروپگنڈے کا ریشہ دوانی ۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے — ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں

ہماری آہ تو کبھی اپنا اثر نہیں دکھاتی ہے ۔ آہیں کر کے معشوق پر صرف اپنا رعب جماتے ہیں تاکہ ڈر کر ہمارے مقصد کو پورا کر دے ۔

تیری فرصت کے مقابل اے عمر — برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

فرصت = وقفہ ۔ قیام ۔ برق ۔ کی صفت کم وقفہ اور تیز رفتاری سے کرتے ہیں ۔ پا بہ حنا = پاؤں میں مہندی جو مانع رفتار ہوتی ہے ۔

برق باوجودیکہ تیز رفتار ہے اور کم وقفہ ۔ کیوں کہ اُدھر چمکی اور اِدھر غائب ۔ مگر اے عمر تیرے کم وقفہ اور تیز رفتاری کے مقابلہ میں برق کی تیز روی کوئی چیز نہیں ۔ گویا اس کے پاؤں میں مہندی لگی ہے ۔ سب قسم کے مضامین غزل میں کہہ لیتے ہیں ورنہ اس شعر کو غزل سے کیا تعلق ۔ ناصحانہ ہو سکتا ہے ۔

قید ہستی سے رہائی معلوم　　　اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں

بعد قطع تعلق جسم و روح چونکہ روح کو باقی مانتے ہیں لہٰذا مرنے کے بعد بھی ہستی سے رہائی نہیں ہوتی اور آزادی مطلق حاصل نہیں ہوتی ۔ فنا فی الذات ہو کے البتہ آزادی مل سکتی ہے ۔ اور یہ مرتبہ حاصل ہونا محال ہے ۔ لہٰذا آزادی بھی ہستی سے محال ہے ۔ اور جب تک ہستی ہے رنج و ملال سے چھٹکارا ناممکن ہے ۔ اشک کو دیکھو کہ جس کے سر ہے اور نہ پیر اسے شعرا اپنے مضامین میں باندھا کرتے ہیں حالاں کہ اسے کسی قسم کا احساس نہیں ہے وہ بھی قید سے آزاد نہیں ۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مصرع ثانی جو بطور تمثیل ہے میں اسے مطلقاً نہ سمجھ سکا ۔ جو کچھ جناب نظم و حسرت تحریر فرما رہے ہیں وہ بھی میری سمجھ سے باہر ہے ۔

جناب نظم ۔ لطف یہ ہے کہ ممکن پر عدم سابق بھی ہے اور لاحق بھی ۔ تو اشک کی طرح انسان بھی بے سرو پا ہے ۔ اور اشک کو باوجود بے سرو پا ہونے کے باندھتے ہیں ۔ اور کسی کے باندھنے سے بندھ جانا فرع ہے ہستی کی ۔ غرض یہ کہ ہم ہستی کی قید میں ضرور رہیں گے اور مرتبہ فنا جو عین آزادی ہے حاصل نہیں ہوگا ۔

جناب حسرت ۔ باندھتے ہیں یعنی شعرا مضمون شعر میں ۔ چوں کہ باندھنے کے معنی قید کرنے کے بھی ہیں ۔ اس لیے ایک پر لطف مضمون پیدا ہو گیا ہے ۔ نظم ہی کے معانی ہیں ۔

نشۂ رنگ سے ہے واشد گل　　　مست کب بند قبا باندھتے ہیں

اپنی رنگینی کے نشہ سے مست ہو کر اپنے جامہ میں گل نہیں سماتا ہے اور کھلا جاتا ہے ۔ بے شک مست لوگ اپنے بند قبا باندھا نہیں کرتے ہیں ۔ حرقت شراب کی وجہ سے مست لوگ تفریح کے لیے بند قبا کھول دیتے ہیں ۔

غلطی ہائے مضامین مت پوچھ　　　لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

غلط بفتحتین عدم معرفت وجہ صواب ۔ خطا در سخن ۔ اہل ہند نے اس میں یائے مصدری کا اضافہ کرلیا اور غلطی بولتے ہیں ۔ اہل ایران عربی کے الفاظ کی پروا نہ کر کے ان میں اپنا تصرف کرلیا کرتے ہیں، چنانچہ شماع عربی میں شمع بنانے والے کے معنی ہیں پھر بھی وہ اس میں یائے فاعلی بڑھا کر شماعی استعمال کرتے ہیں ۔ اپنے الفاظ میں بھی تصرف کیا کرتے ہیں ۔ باورچی ۔ (با ۔ بمعنی شوربا اور سالن) اور (ور) علامت فاعل سے مرکب ہے اس پر پھر (چی) علامت فاعلی (ترکی) بڑھا کے باورچی کہتے ہیں ۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ الفاظ فارسی وعربی جن پر تصرف لفظی یا معنوی اردو میں ہو گیا اور بول چال میں آ گئے ان کو اضافہ وعطف فارسی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ۔ کچھ وسعت ہو جاتی ہے اور ناگوار سمع بھی نہیں ۔

غلط مضامین شعرا کو کچھ نہ پوچھو ۔ یہ شعرا نالہ کو رسا باندھتے ہیں ۔ حالاں کہ نالۂ عشاق کو ہمیشہ بے اثر ہی ثابت ہوا ہے ۔

جناب نظم فرماتے ہیں غلط میں اضافہ (ی) غلط ۔ اس پر (ہا) سے جمع بنانا بھی غلط اور پھر اضافہ غلط در غلط ۔

اہل تدبیر کی وا ماندگیاں　　　آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

حنا عربی بتشدید نون ۔ مہندی ۔ آبلوں کا علاج اسے سمجھتے ہیں ۔ اور مہندی خود مانع رفتار ہوتی ہے پہلے مصرع سے (دیکھو) بوجہ سماعت وافسوس محذوف ہے ۔

اہل تدبیر اور عقل کے عجز اور لاچاری کو دیکھو کہ ایک تو آبلے خود ہی مانع رفتار ہوتے ہیں پھر ان پر مہندی کا ضماد کر کے اور زیادہ عاجز اور لاچار بن جاتے ہیں ۔ یہ آبلے صحرا نورد کے کہیں مہندی سے اچھے ہو سکتے ہیں ۔ نہ اس کا جنون جائے گا اور نہ دشت نوردی چھوٹے گی پھر آبلے اچھے ہوں تو کیوں کر ہوں ۔

سادہ پرکار ہیں خوبان غالب　　　ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

پرکار جو اپنے کام میں بڑا ہوشیار اور ماہر ہو ۔ سادہ ۔ دیکھنے میں بھولا بھالا ۔ خوبان ۔ حسینان ۔ الف و نون سے جمع فارسی ہے ۔ اس قسم کے الفاظ بلا عطف و اضافہ اردو میں اچھے نہیں معلوم ہوتے ۔

یہ حسینان جہاں دیکھنے میں بڑے بھولے بھالے ہیں مگر اپنے مطلب میں بڑے ہوشیار اور نکتہ کار ۔ ذرا انھیں دیکھو کہ ہم ایسے تجربہ کار آدمی سے وفاداری کرنے کا عہد کرتے ہیں جیسے ہم ان کے فریب میں آجائیں گے ۔ جب کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ معشوق کبھی بھی وفادار ہوتا ہے ۔

غزل ۲۴ شعرا

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

سخت۔ بہت۔ بہ۔ قسمیہ ہے۔
جتنے زیادہ آزار اٹھانے کی ہم میں ہمت ہے اس کے مقابلہ میں زمانہ ہم کو بہت کم ستانے والا اسد کی جان کی قسم معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ ہم کو تو اس سے کہیں زیادہ زمانہ کے مظالم کی امید ہے۔

---

غزل ۲۵ اشعار ۸

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

تم سے دور رہ کر جس طرح زندگی بے چینی میں گذر رہی ہے ایسی زندگی پر خاک ہو اور یہ نہ رہے تو اچھا ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ پتھر ہوتا اور تیرا سنگ آستانہ ہو کر دواماً تیرے در پر پڑا رہنا تو میسر ہوتا۔

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

مدام۔ ہمیشہ۔ دواماً۔ و بمعنی شراب ذکر پیالہ و ساغر کے ساتھ متناسب۔
برائی کی طرف ہمیشہ کے تغیرا ور انقلاب سے دل کیوں نہ گھبرا جائے۔ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں کہ وہ اسی کے لیئے بنتے ہیں۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

یا اللہ یہ زمانہ مجھے مٹاتا اور برباد کیوں کرتا رہتا ہے۔ میں دنیا کی تختی پر حرف مکرر تو نہیں ہوں جسے مٹا دیتے ہیں۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حد۔ انتہا۔ اور شریعت میں کسی گناہ کی سزا۔ عقوبت۔ مواخذہ و قصاص گناہ۔ کافر۔ ایرانیوں نے

اس لفظ کو بنفع کافر دیا۔ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ کافر دوزخ میں ابدالآباد کے لیئے رہے گا۔ اور مسلمان کے لیئے ایک حد معین کے لیئے سزا دلانے کے بعد بہشت میں جانا مانتے ہیں اور شفاعت و رحم کے وسیلہ سے مغفرت کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔

سعدی نے لازم اور ہیزم کا قافیہ اور قاآنی نے ظاہر اور ساغر کا قافیہ کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حرف روی متحرک ہو جائے تو اختلاف توجیہ جائز جانتے ہیں۔

" اے محبوب تم جو مجھے ہر طرح سے ستاتے رہتے ہو اور میری کوئی تمنا پوری نہیں کرتے۔ اچھا تم سے عشق کر کے میں گناہ گار ہوں۔ پھر بھی کافر تو نہیں ہوں۔ مظالم کی کوئی حد ہونا چاہیئے۔ عشق کر کے گنہ گار تو ہوا۔ کافر تو نہیں ہوں کہ ہمیشہ کے لیئے مجھے جدائی کی سزا دی جائے۔ بعد تامل سمجھ میں آیا کہ ساری غزل کا تعلق ظفر شاہ سے ہے۔

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے      لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

اس شعر سے واضح ہے کہ ساری غزل ظفر شاہ سے شکایت میں ہے۔

تم بوجہ سخاوت۔ یاقوت۔ پنا۔ سونا۔ اور موتی کی قدر نہیں کرتے ہو اور انھیں لٹاتے رہتے ہو۔ میں تو ان میں سے کوئی چیز نہیں پھر مجھے عزیز کیوں نہیں رکھتے۔ ساری غزل نہ عشقیہ ہے اور نہ نعتیہ۔

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ      رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

میں آنکھیں بچھانے کو تیار ہوں ان پر اپنا قدم رکھو۔ میں اپنے کمال کی وجہ سے مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں۔ جناب نظم فرماتے ہیں صاحب معراج سے خطاب ہے۔ میرے نزدیک اس جناب سے مخاطب کر کے اپنی بڑائی دکھانا کہ میرا رتبہ بھی مہر و ماہ سے کمتر نہیں سوء ادبی ہے۔ لہٰذا اس شعر سے بھی اور آئندہ بھی تخاطب ظفر شاہ سے ہے۔ آنکھوں پر قدم رکھنے سے دریغ کرنا اور اس کی شکایت بھی ظفر شاہ ہی سے ہو سکتی ہے۔

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیئے      کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

قدم بوسی کی خواہش ظفر شاہ ہی سے ہو سکتی ہے۔ نہ رسول مقبول صلعم سے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سہرے کی وجہ سے یا کسی اور بات پر ظفر شاہ غالب سے ناراض ہو گئے تھے اور کچھ دن یہ دربار کی حاضری سے محروم رہے تو اس کی شکایت میں یہ غزل کہی ہے۔

اپنی قدم بوسی سے مجھے کیوں محروم کر رکھا ہے۔ کیا میرا مرتبہ آسمان سے بھی کم ہے جو سر جھکائے ہمیشہ قدم بوسی

کیا کرتا ہے۔

جناب ختمی مرتبت کا معراج میں قدم آسمان پر رکھنا پہلے مصرع کی وجہ سے مراد نہیں ہو سکتا۔

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا     وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

معذرت میں اکڑ پھوں دکھانا جیسا کہ مصرع ثانی میں ہے مخل بلاغت ہے۔

غالبؔ اب تو تم ظفر شاہ سے تنخواہ پاتے ہو لہٰذا اس غزل کو دعا پر ختم کرو۔ کیوں کہ اب وہ وقت نہیں رہا جو کہا کرتے تھے کیا میں کسی کا نوکر ہوں۔

---

## غزل ۲۶     اشعار ۱۶

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں     خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

پنہاں سے قریب (خاک میں) نہ ہونے سے تعقید ہے۔ اس طرح قریب لا سکتے ہیں ؎

صورتیں کیا تھیں جو زیر خاک پنہاں ہو گئیں

یا ؎     صورتیں کیا ہوں گی جو مٹی میں پنہاں ہو گئیں

اور سب کہاں کے ساتھ کچھ کا بھی فائدہ میں نہ سمجھ سکا۔ سب کا اگر بشکل لالہ و گل نمایاں ہونا کہا جائے تو کیا کوئی ہرج ہو گا۔

یہ لالہ و گل جو ایسے حسین اور خوشنما ہیں اور انھیں حسینوں کی خاک سے اُگے ہیں جو مر کر خاک میں مل گئے۔ جب یہ لالہ و گل ایسی دل کش صورتیں رکھتے ہیں تو وہ صورتیں جن کی خاک سے یہ لالہ و گل اُگے ہیں کس غضب کی ہوں گی۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں     لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ عالم شباب میں طرح طرح کے جلسے کیا کرتے تھے۔ عیش و عشرت و عشق بازی سے کام تھا اب وہ زمانہ نہ رہا۔ گردش فلکی نے پیس ڈالا۔ پیری نے آ دبایا۔ معشوقوں کی بے وفائیوں نے ہمت پست کر دی۔ اب وہ سب لطف و مزہ بھول بیٹھے۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردہ میں نہاں     شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

بنات النعش ۔ سات ستارے ہیں۔ چار کھٹولے کی شکل کے اور تین ایک ستارہ سے تھوڑے تھوڑے

فاصلہ پر لٹکے ہوئے ان ستاروں کے بیچ والے ستارہ سے قریب سہا ہے۔ کھٹولے والے چاروں کو جنازہ اور ان تین لٹکے ہوؤں کو بنات یعنی جنازہ اٹھانے والوں کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ کھٹولے کے دو اوپر والے ستاروں سے اگر ایک خط مستقیم کھینچا جائے تو ٹھیک قطب شمالی پر پہنچتا ہے۔ بنات النعش کو دُبِّ اکبر یا اصغر بھی کہتے ہیں :

CONSTELLATION , LESSER BEAR

جناب نظم فرماتے ہیں کہ عربی میں جنازہ اُٹھانے والے کو ابن النعش کہتے ہیں۔ اور ابن النعش کی جمع بنات النعش ہے۔ جس طرح ابن آوی (گیدڑ شغال) اس کی جمع بنات آوی ہے۔ ابن عرس (نیولا۔ راسو) اس کی جمع بنات عرس لاتے ہیں۔ اور مذکر مؤنث دونوں کے لیئے بولتے ہیں۔ بنات المطر (بیر بہوٹی) ابن المطر کی جمع ہے۔
عربی میں جمع حکم تانیث میں ہوتی ہے اس لیئے بنات النعش کے لیئے صیغے مونث کے لائے۔ جناب آسی اس افادہ جناب نظم کو اپنی شرح میں نقل کرتے ہیں اور حوالہ شرح نظم نہیں دیتے۔ اسی پر کیا منحصر بکثرت معانی اشعار جناب نظم کے نقل کیئے۔ اور کہیں حوالہ نہیں دیتے۔ جب اعتراض کرنا ہوتا ہے تو پھر نام جناب نظم لکھتے ہیں۔ اور ایک اعتراض بھی ڈھنگ کا نہیں کیا ہے۔ جہاں تک دوسری اور خصوصاً جناب نظم کی شرح سے بالفاظ دیگر معانی لکھتے ہیں وہ تو ٹھیک ہوتے ہیں۔ اور جس شعر کی شرح میں اپنی جودت طبع دکھاتے ہیں ان کو الفاظ شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اپنا خیالی مطلب لکھا کرتے ہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ ستاروں کے کھلنے کی کیفیت کو عریاں ہونے سے تعبیر کیا ہے۔
بنات النعش دن بھر پردہ میں چھپی رہیں۔ رات کو نہ معلوم ان کے دل میں کیا بات آئی جو عریاں (برہنہ) ہو گئیں یہ شعر ہی کیا ہوا۔ اور اس کو غزل سے کیا تعلق۔ جب تک کہ ان کے جی میں کیا آئی کی تاویل مثلاً محفل شبینہ محبوب کے دیکھنے کے لیئے۔ یا مثل اس کی کوئی اور تاویل نہ ہو اس شعر کے معنی ہی کیا ہوں گے۔ ستارے تو کثرت ضیاء شمس سے دن کو نہیں دکھائی دیتے ہیں رات کی اندھیری میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ مضمون ہی کیا ہوا۔

جناب حسرت سہل سمجھ کر چھوڑ رہے ہیں۔
جناب آسی کی اُپج سُن لیجیے۔ یہ شعر اپنے معشوق کی طرف خطاب کرکے کہا گیا ہے کہ بنات النعش بڑی پردہ دار تھیں دن کو منھ چھپائے رہیں۔ مگر شب کو وقت آیا تو اپنا پردہ اٹھا دیا۔ تم ایسے ہو کہ شب وصل میں بھی مجھ سے شرمائے جاتے ہو۔ حالاں کہ یہ کوئی محل نہیں ہے۔ یا یہ کہ یہ ایک عاشقانہ حال ہے کہ معشوق سے کہتا ہے کہ دیکھو تم کہتے ہو کہ معشوقوں کا کام عریاں اور بے پردہ ہونے کا نہیں ہے دیکھو بنات النعش دن میں کیسی چھپی ہوئی تھیں۔ آخر شب کو اگر بے پردہ ہونے کا محل نہیں ہے تو وہ بے پردہ کیوں ہوگئیں۔
کیا بنات النعش بھی کوئی معشوق ہیں جو اُن کی مثال دے کر اپنے معشوق کو تحریص و ترغیب دلائی جائے۔

ان کے جی میں کیا آئی" اس فقرہ کو چٹ کر گئے۔ یہ ان کا اپنا خیالی مطلب نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ہمیشہ ایسی ہی بکل چچو اُڑاتے ہیں۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر	لیکن آنکھیں روزن دیوار زندان ہوگئیں

یوسف کی خبر نہ لی۔ یا۔ خبر یوسف نہ لی۔ وزن میں نہ آسکنے کی وجہ سے تعقید پیدا ہو گئی۔ روزن = روشن دان۔ دکھلا۔ ونٹی لیٹر۔ اس کو استعارہ چشم کے ساتھ کیا کرتے ہیں ؎

گو نہ یوسف کی خبر لی قید میں یعقوب نے

جب عزیز مصر نے حضرت یوسف کو تہمت زلیخائی کی وجہ سے جیل خانہ بھیج دیا۔ اگرچہ یعقوب وہاں نہ جا سکے اور یوسف کی خبر نہ لے سکے۔ مگر آنکھیں روزن دیوار زندان کی طرح بے نور ہو گئیں۔ یا روزن دیوار زندان ہو گئیں۔ پہلی بات ٹھیک ہے اور دوسری ادعا۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے	ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

زلیخا بضم اول وفتح ثانی۔ اصلی نام راعیل زوجہ پوتیفر POTI PHER عزیز مصر و عاشق یوسف۔ ایک مرتبہ زلیخا کی ہم جولیوں نے حسن یوسف کی مذمت کی تو زلیخا نے ان کو جمع کیا۔ اور ہر ایک کے ہاتھ میں ترنج (عربی اترج) انگریزی CITRON دیا اور ایک ایک چھری بھی اور کہا جب ہم یوسف کو سامنے لائیں تو اس ترنج کو کاٹنا جب یوسف سامنے آئے تو ان کے حسن کو دیکھ کر ایسی محو ہوئیں کہ بجائے ترنج اپنے ہاتھ کاٹ لیے۔ اس محویت کی وجہ سے ان کو عاشق یوسف قرار دے کر زلیخا کا رقیب کہا ہے۔ مصر کا نام توریت میں مزروم ہے۔

سب عشاق رقیبوں سے ناخوش رہتے ہیں مگر زلیخا اپنے رقیب زنان مصر سے خوش ہے اگرچہ وہ یوسف کے حسن پر فریفتہ ہو گئیں مگر زلیخا کا عشق بجا ہونا ثابت ہو گیا اور ان کی شماتت زلیخا کے سر سے ہٹ گئی۔ بالکل اچھوتی بات ہے۔

یہ معنی کہ روزن دیوار زندان نہ تھے بلکہ یعقوب کی آنکھیں نگران یوسف ہیں۔ محض ادعاء شاعرانہ ہوں گے۔ اور پہلے معنی قرآن کے موافق ہیں قولہ تعہ وابیضت عینٰہ حضرت یعقوب کی دونوں آنکھیں پٹم ہو گئیں۔ (اس بات کا تعلق اس سے اوپر والے شعر کے ساتھ ہے)۔

جوئے خون آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق	میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

شام جدائی کو نہایت تاریک مانتے ہیں۔ اور اندھیرے میں اور زیادہ دم گھٹتا ہے اور پریشانی خاطر حاصل ہوتی ہے (شمعیں دو) یا (دو شمعیں)۔

اے ناصحو! مجھے اشک خونیں بہانے سے منع کرو کیوں کہ یہ شب ہجر ہے اور اندھیری ہے خونیں آنسو بہنے دو۔ میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں اس اندھیری رات میں روشن ہوگئیں اور رونے سے بھڑاس نکل کے غم میں کچھ کمی ہوگی اور قدرے تسکین ہوگی۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

ہوگئیں کی ضمیر پری زادوں کی طرف پھرتی ہے۔ صیغہ تانیث ہونے کی وجہ سے ان سے اناث ہی مقصود ہیں۔

ہندوستان کے کچھ لوگ امرد کو شاعری میں معشوق بنانے کو امر خلاف فطرت قرار دے کر اس پر معترض ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی اور شمس العلما جناب تاجور نجیب آبادی بھی اس کے موید ہیں کہ عربی کی طرح اردو میں بھی عورت کو معشوق قرار دیا جائے۔ چنانچہ عندلیب سلمہٗ نے چند غزلیں بھی ایسی کہہ ڈالیں۔ ایرانی شاعری اور زبان میں افعال کی تذکیر و تانیث دونوں نہیں مختصر اسما ہیں کہ عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ جیسے دختر۔ کنیز۔ لولی۔ بانو۔ بیگم وغیرہ۔ ترک بچوں سے شعرا اظہار عشق کیا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ترک بمعنی معشوق ہی ہوگیا۔ لیکن سب شعرا نہ امرد پرست ہیں اور نہ مے خوار مگر امردوں سے عشق اور مے خواری کی بکواس سبھی کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اکثر شاعر عاشق مزاج بھی نہیں ایک ڈھرا جو اولیں نے باندھا اسی راستہ پر چلا کرتے ہیں۔

علامہ شبلی شعر العجم میں فرماتے ہیں کہ شاعری میں جب سے تصوف نے دخل پایا شاعری میں جان پڑ گئی۔ اسلام سے پہلے عربی میں تصوف کا نام نہ تھا۔ صدیوں بعد۔ تصوف مسلمانوں میں لایا گیا۔ اور جنید بغدادی و حسن بصری و بایزید و اویس قرنی وغیرہ کو صوفی تذکرہ نویسوں نے بنایا۔ مسئلہ وحدت وجود جو روح و رواں تصوف ہے میرا خیال یہ ہے کہ محی الدین العربی اسلام میں اس کے لانے والے ہیں۔ اور ان کی پیدائش ۵۶۰ھ میں ہے۔

چوں کہ اہل تصوف معشوق سے معشوق حقیقی مراد لیتے ہیں اور اس کے لیے تانیث کسی طرح جائز نہیں۔ لہٰذا صوفیانہ اشعار کہنے میں بڑی دقت پیش آئے گی۔ اسی لیے عربی میں تصوف کے اشعار قبل اسلام اور بعد اسلام بھی نہیں ملتے۔

کلام حافظ شیرازی میں ہر شعر سے معشوق حقیقی ہی مراد لینا چاہتے ہیں۔ اور بات جو وہ کہتے ہیں اس کا تعلق معشوق حقیقی

ہی سے مانتے ہیں۔ لہٰذا ذیل کے شعر میں۔

فغان زیں لولیاں شوخ و شیریں کار و شہر آشوب　　چناں بردند صبر از دل کہ ترکان خوانِ یغما را

لولی سے مراد نہ امرد ہو سکتی ہے اور نہ معشوق حقیقی۔ اسی طرح شعر مذکور غالب میں بھی پری زادوں سے مراد عورتیں ہی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اُردو اور فارسی کا محبوب امرد ہی ہے یہ غلط ہے۔ کیوں کہ داڑھی والا بھی ہوتا ہے اور پستان والا بھی۔ چاہے کم ہی۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اُردو و فارسی شاعری کا معشوق نہ مرد ہے اور نہ عورت اور یہ صورت سب سے اچھی ہے کیوں کہ جب کسی عورت مخصوص سے عشق کیا جائے تو اس کے اعزہ کے شرمانے کا۔ اور غیر متعین سے عشق جتایا جائے تب بھی بدگمانی کسی کی طرف ہو سکتی ہے اور اُس کے شرمانے کا موجب ہوگا۔

بر خلاف اُردو اور فارسی کے کہ اس کے معشوق کا وجود ہی نہیں ہے تو پھر کنایتہً بھی کسی کی جانب اشارہ نہیں ہو سکتا ہے۔ عرب بیشتر اپنی چچازاد بہن سے اظہار عشق کیا کرتے تھے یا فرضی نام لیلیٰ و سلمیٰ وغیرہ سے۔

بہتر طریقہ یہی ہے کہ حتی الامکان شعر کا مضمون ایسا ہی ہو کہ جس سے معشوق کی تذکیر و تانیث کچھ نہ معلوم ہو۔ جیسا کہ میرا شعر ذیل ہے۔

اک جگہ مجمع عشاق کا ہو جانا ہے　　حشر کہتے ہیں کسے اور قیامت کیا ہے

یہی حسینان جہاں جو دنیا میں ہم پر مظالم توڑا کرتے ہیں اور ہم کو ستاتے رہتے ہیں اگر قدرت خدا سے یہی جنت میں حوریں قرار پائے تو وہاں ان سے اپنا بدلہ خوب خوب نکالیں گے۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ جنت میں جانے والوں کو حوریں ملیں گی۔

اگر یہ شعرا اظہار عشق امردوں سے کرتے ہیں تو ان کو بچہ باز کیوں مانا ہے۔ صوفیوں کی طرح حسن پرست یہ بھی ہیں۔ اگرچہ نہ حسن پرست ہیں اور نہ بچہ باز۔ یقولون مالا یفعلون کے مصداق ہیں۔

اب امر واقعی بچہ بازی ہو تو اس امر خلاف فطرت سے کوئی زمانہ اور کوئی مُلک کبھی خالی نہیں۔ مزدوم بغداد سے قریب ایک شہر تھا۔ حضرت لوط کی امت اسی فعل سے مبتلائے عذاب ہوئی حتیٰ کہ لواطت بمعنی بچہ بازی ہو گیا۔ اور اسی شہر سدوم سے ماخوذ انگریزی میں ساڈومی SODOMY بمعنی بچہ بازی ہے۔

اس کے لکھنے سے میری غرض یہ ہے کہ کسی قوم کو مخصوص اس فعل مذموم سے متصف کرنا تعصب سے خالی نہیں۔ انسان جب تک انسان۔ ہے وہ ارتکاب معاصی سے بوجہ غلبہ خواہش بچ نہیں سکتا الانسان حریص لما منع۔ چاہے جہاں کا رہنے والا ہو۔

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں　　　نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں

زلفوں کے پریشاں ہونے سے ۔ لپٹ چمٹ ۔ بوس وکنار ۔ ہاتھا پائی وغیرہ میں ان کا بکھر جانا مراد ہے اور لفظ بازو اس بات کو بتاتا ہے کہ عاشق کے بازو پر سر رکھے سوتا ہو اور کروٹیں بدلنے میں زلفوں کا نظام بگڑ گیا ہو۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ شعر بیت الغزل اور کارنامہ ہے ۔ اس میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے۔

بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں　　　میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا

دبستاں = ادبستان ۔ مکتب ۔ جس میں لڑکے چیخ چیخ کے اپنا اپنا سبق یاد کرتے ہیں ۔ بلبل = عندلیب مختلف فیہ معلوم ہوتا ہے ۔ جناب میر سے کسی نے پوچھا کہ بلبل مذکر ہے یا مؤنث تو انھوں نے لطیفہ میں جواب دیا کہ جس کے پاس ایک (بُل = بُر ۔ فرج) ہو تو وہ مونث حقیقی ہوتی ہے ۔ اس کے پاس دو ہیں اور پھر بھی مذکر ہو ۔ اب لکھنؤ میں مذکر ہی بولتے ہیں ۔ چمن = چم خرام با ناز اور نون نسبت سے مرکب ہے ۔ روش پٹری معنی ہونا چاہئیں جس پر چمن میں ٹہلتے ہیں نالے صدائے درد ناک ۔
غزل خوانی ۔ مراد چہچہانا ۔ زمزمہ سرائی ۔ بلبل آواز خوش سُن کے خود بھی چہچہانے لگتی ہے۔
یہ شرح میرے لئے عذاب جان ہوگئی ۔ ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہوں ۔ مشکل اشعار تو میں سمجھتا ہی نہیں ۔ آسان کے بھی بعض الفاظ مصیبت میں ڈال دیتے ہیں ۔ اسی شعر میں نالہائے عاشق کا باعث غزل خوانی بلبل ہونے کے معنی کچھ نہیں سمجھا نالے چاہتے ہیں کہ نوحہ خواں بجائے غزل خوان ہو ۔ غزل خواں چاہتا ہے کہ نالے کی جگہ نغمے ہوں اگر نغمے ہوں تو نغمے کرنے کی علت کیا ہوگی ۔ میرے بنائے کچھ نہیں بنتی ۔ دوسروں کا ذہن رسا کہاں سے لاؤں ۔
جناب حسرت سہل مان کے چھوڑتے ہیں ۔ جناب نظم کی توجہ اس طرف نہیں ۔ جناب آسی نے غزل خواں کی طرف توجہ کی ۔ اور فرماتے ہیں:

۱۔ اس لیئے کہ بحیثیت عاشق کے ان کو ایک ہم جنس مل گیا اس کی ان کی خوشی ہوئی ۔
۲۔ یا اس لیئے کہ میں ایک دیوانہ ہوں مجھ کو دیکھ کے ان سے بھی جوش خوشی کو روکا نہ گیا ۔
۳۔ یا یہ کہ میں ایسا فصیح البیان تھا کہ میری غزلیں سن کر بلبل نے بھی نغمہ سنجی شروع کردی تم کلام

۱۔ ہم جنس کہاں وہ تو نالے کرتا ہے اور بلبلیں نغمہ سنجی کرتی ہیں۔ ہاں عشق میں متحد سہی۔ اس کی وجہ نہ بتائی کہ نالۂ عاشق پر بلبلیں نغمہ سنج کیوں ہوئیں۔

۲۔ دیوانہ کن الفاظ کی وجہ سے مانیں۔ اچھا دیوانہ بھی سہی (اگرچہ نالاں اور زاری کناں ہے۔) تو اسے چھیڑنا اور ستانا چاہیئے تھا۔ خوشی کا جوش کیوں ہوا۔

۳۔ ان کی فصیح البیانی سے بلبلیں نغمہ سنج کیوں ہوئیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اور چپ ہو جاتیں یا مداح سرائی کرتیں۔

مصرع ثانی یوں ہو ؎

بلبلیں سن سن کے نالے میرے نالاں ہوگئیں

تو کچھ میری سمجھ میں آتا۔ اور دبستاں سے تشبیہ چیخ پکار اور ہلڑ میں ہوگی اور نالے کرنے کا سبب یہ ہے کہ چمن میں محبوب کو نہ پایا۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار  جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہوگئیں

مژگان ۔ پلک۔ جمع اور واحد دونوں کے لیئے مستعمل ہے۔ مژگان ہو جانے سے مراد کوتاہ نظری ہے۔

از روئے تعجب سوال ہے کہ اے اللہ میری بدقسمتی سے وہ میری طرف کبھی نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے پھر بھی ان کی نگاہوں کے تیر میرے دل کے پار کیوں ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی ان کی کوتاہ نظری بھی مجھے اس قدر کیوں بھاتی ہے۔ یا کیوں مارے ڈالتی ہے۔

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے  میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہوگئیں

ضبط سے کام لے کر میں نے اپنی آہوں کو بہت روکا۔ لیکن میرے روکنے پر بھی میری آہیں بار بار ابھریں۔ ان کے ابھرنے اور دبنے نے چاک گریباں میں بخیہ کا کام کیا۔

سینے کے اندر آہوں کے ابھرنے اور دبنے سے چاک گریبان کا بخیہ ہونا۔ ایک مضمون بے لطف ہے۔ اور ادعا بے مزہ۔ سینے (بمعنی دوختن) اور بخیہ میں ایہام تناسب ہے۔

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا  سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہوگئیں

گویا کا لفظ مبالغہ غلو سے گھٹانے کے لیئے صرف کیا ہے۔ ہاتھ کی لکیریں = عربی میں ان کو اسارير

کہتے ہیں۔

شراب کی تعریف کر رہے ہیں۔ اس کو جانفزا اور بمنزلہ رگ جان کہتے ہیں۔

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

اگر ان کے حد تک رسائی ہوئی بھی تو ان کی دشنام دہی کا جواب کون دیتا! ور بدلہ کون لیتا یا شکوہ کون کرتا۔ وہ تو وہ جتنی دعائیں ہم کو یاد تھیں وہ ہم نے ان کے درباں کو دے ڈالیں۔ کہ اندر جانے دو۔ یا ہماری خبر ان کو کر دو۔

ہم مُوَحِّد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

مُوَحِّد = یکتائی و یہمالی خدا کا ماننے والا۔ وحدت بھی وہ وحدت نہیں جو ایک عدد میں ہے۔ ملت۔ طریقت و شریعت فی الدین۔ ایک پیغمبر کی ماننے والی قوم۔ رسم = رواج۔ و مقابل حقیقۃ۔ شاعرے گوید ؎

اری ذکر سمٰا ودّی حقیقۃ

کیش = دین و مذہب و ملت۔

ہم توحید صرف کے ماننے والے ہیں ہمارا مذہب رسم و رواج کا ترک کر دینا ہے اہل مذاہب پابند چند رسوم کے ہوتے ہیں جو پابند مذہب ہیں وہ عادۃً یا رداجاً ان پر عمل کیا کرتے ہیں۔ (غالبؔ نے مذہب میں صرف دو چیزیں اختیار کر لی تھیں ایک تو توحید لا موجود الا اللہ اور دوسرے محبت اہل بیت انھیں کو وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔) کیوں کہ جب تفرقۂ ملت مٹ جائے تو یہی عین ایمان ہے۔

جناب نظم نے فلسفیانہ رنگ میں توحید کو خوب لکھا ہے۔ اور وہ یہ ہے ہم موحد ہیں یعنی وحدت معبود کے قائل ہیں۔ اور واحد بھی وہ کہ جس میں نہ اجزاء مقداری ہوں جیسے طول و عرض وغیرہ اور نہ اجزاء ترکیبی ہوں جیسے ہیولیٰ و صورت۔ اور نہ اجزاء ذہنی ہوں جیسے جنس و فصل۔ غرض کہ اس کا علم محض سلبیات کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جیسے کہیں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ جسم نہیں وہ متحیز نہیں وہ مرئی نہیں وہ عاجز نہیں۔ وہ جاہل نہیں وہ حادث نہیں۔ وہ علت موجب نہیں۔ یہی سب سلبیات کہ ان کے اعتقاد سے اور سب ملتیں باطل اور محو ہو جاتی ہیں تو عین اجزاء توحید ہیں۔ تم کلامہ۔

متحیز نہ ہونا۔ زمان و مکان سے بری ہونا۔ بغیر آلات، سمع و بصر سمیع و بصیر ہونا۔ یہ سب باتیں عقل انسانی سے بالاتر ہیں۔ بالفرض اگر دلائل مسکت بھی ہوں تب بھی عام فہم نہیں۔ اور مذہب عالم و جاہل سب کے لیئے ہے۔ لہٰذا ایسی

دلیل ہونا چاہیئے جو عام فہم ہو نہ مبنی بہ مسائل فلسفیہ یونان۔

آسی ان کے بیان میں سے۔ اتنا اخذ کرتے ہیں۔ واحد وہ ہے جو جہات طول و عرض و عمق تغیر وغیرہ سے مبرا و منزہ ہو۔ یعنی ہم کہتے ہیں کہ خدا کوئی سمت کوئی جہت کوئی طول کوئی عرض کوئی تغیر نہیں رکھتا۔ مرئی نہیں غیر مرئی نہیں۔ غرض جس قدر بہ دیگر ملل مٹیں گے اسی قدر واحد کی صفت پر روشنی پڑے گی۔

طول و عرض و عمق کی تعبیر جہات سے انھیں کا کام ہے۔ مرئی نہیں تو جناب نظم نے لکھا ہے۔ غیر مرئی نہیں، اپنی طرف سے بڑھایا۔ یہ نہیں دیکھا کہ صفات سلبیہ میں اس کا ذکر بے جا ہے۔ اہل تسنن چوں کہ دیدار خدا کے قائل ہیں اس لیئے خلاف محل غیر مرئی نہیں لکھ دیا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

سے شاید رنج کا خوگر ہونا محاورہ ہو۔

الم متواتر و مسلسل کا اگر کوئی عادی ہو تو رنج بھی پھر رنج نہیں معلوم ہوتا۔ جس طرح کہ تنگ دستی دائمی ہو اور راحت کبھی نصیب نہ ہوئی ہو تو ایسی مفلسی زیادہ تکلیف رساں نہیں ہوتی ہے۔ راحت کے بعد رنج بے شک سخت مکلف ہوتا ہے۔ اسی واسطے حدیث نبوی میں ہے۔ نعوذ باللہ من الجور بعد الکور۔ شعر بہت اچھا ہے۔

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہل جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویران ہوگئیں

سیلاب گریۂ غالبؔ سے دنیا تباہ ہو جائے گی۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ مضمون بہت پامال اور مبتذل ہے۔ لہٰذا کہتے ہیں کہ رونے کی تاثیر سے ویران ہو جائے گی، ماننا چاہیے۔

شعر بہت معمولی ہے۔ جناب آسی نے مخالفت جناب نظم پر کمر باندھ لی ہے اس لیئے کہتے ہیں کہ یہ شعر نہایت بلیغ ہے۔ اور ایک ایک لفظ اس کا قابل داد ہے۔

اس سے پہلے جو شرح لکھ چکا ہوں اور اس کی ابھی صرف کاپی لکھی گئی ہے چھپی نہیں کہ میں نے نظر ثانی کرنا شروع کر دی۔ اور پہلا مسودہ میرے سامنے نہیں ہے۔ وہ لاہور میں ہے۔ اس لیئے اور نیز اس لیئے کہ کچھ باتیں نئی پیدا ہو گئی ہیں۔ لہٰذا اس شرح اور اس شرح میں عبارت اور مفاہیم میں بہت اختلاف ہو گیا ہے۔ کمی اور بیشی بھی باتوں میں ہو گئی ہے۔

اس طرح میں نے بھی کبھی خامہ فرسائی کی تھی۔ جو نسخہ چھپ رہا ہے اس میں پندرہ سولہ اشعار یعنی کل

غزل نقل کردی۔ یہاں صرف دو تین شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

میری ان کی حالتیں فرقت میں یکساں ہوگئیں	یاں طبیعت بگڑی واں زلفیں پریشاں ہوگئیں

میرا کیا بگڑا جو وہ زلفیں بنانے میں لگے	مر گیا میں مشکلیں سب میری آساں ہوگئیں

سامنا ہونے پہ شکووں کا بھلا پھر ذکر کیا	منتیں جو یاد آئیں صرفِ جاناں ہوگئیں

میری بزمِ تعزیت میں کونسا ہوگا بناؤ	جب ابھی سے آپ کی زلفیں پریشاں ہوگئیں

---

## غزل ۲۷ اشعار ۱۰

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں	یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

جیب کے معنی ہیں POCKET اور بمعنی COLLAR فارسی والے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ جیب بمعنی پاکٹ تو مؤنث ہے۔ اور جیب بمعنی گریبان اُردو میں مستعمل نہیں لہٰذا گریبان پر قیاس کر کے مذکر ہونا چاہیئے آگے جو فیصلہ اہل زبان کریں۔

یعنی اکثر جگہ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ میں سمجھ نہیں سکتا۔ یہ حرف تفسیر ہے اور محل تفسیر ہے نہیں۔ شاید ان کے زمانہ میں اسی طرح بولتے ہوں گے ؎

یاں تنگ کہ اپنی جیب میں اک تار بھی نہیں

بحالت جنون زنار (جنیبو) جو علامت صنم پرستی تھی اسے توڑ پھوڑ کے پھینک دیا۔ زنار تو زنار گریبان کے بھی چیتھڑے اُڑا دیئے ایک تار بھی باقی نہ رہا۔ کاش وہی تار رہتا تو کچھ تو علامت کفر عشق اور صنم پرستی پائی جاتی۔ اب تو نرے کھرے دیوانہ ہیں۔

دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے	دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں

دل حسرت دیدار کے نذر کر چکے۔ یعنی دل تمنائے دیدار میں کھو بیٹھے۔ اب جو اپنے اوپر نظر کرتے ہیں تو اپنے میں طاقت دیدار بھی نہیں پاتے۔ کیوں کہ دل تو رہا نہیں اور ایسے امور دل کی قوت پر منحصر ہیں۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

نہیں آسان = بمعنی دشوار۔ دشوار بھی نہیں بلکہ محال و ناممکن ہے۔

ملنا تیرا اگر دشوار ہوتا تو اس کے حاصل کرنے میں سہولت تھی۔ کیوں کہ سعی کر کے انسان دشوار پر بھی کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ مگر مشکل تو یہ آپڑی کہ دشوار بھی نہیں ہے بلکہ محال اور ناممکن ہے۔

دوسرے معنی جناب حسرت یوں تحریر فرماتے ہیں کہ تیرا ملنا سب کے لیئے مشکل ہو تو مجھ کو بھی صبر آجائے۔ مشکل تو یہ ہے کہ اغیار کے لیئے آسان ہے۔ میرے ہی لیئے دشوار ہے۔

اس سے بحث نہیں کہ مصرع اول کا طرز ادا۔ خصوصاً (تو سہل ہے) یہ معنی کہنے دیتا ہے یا نہیں۔ مگر جناب آسی اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں یوں ادا کرتے ہیں کہ۔ تیرا ملنا آسان نہیں یعنی دشوار ہے تو یہ تو ایک آسان بات ہے ہم صبر کر سکتے ہیں اور دل کو سمجھا بجھا سکتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تو غیر سے ملتا ہے اس کے واسطے تیرا ملنا دشوار نہیں ہے اس واسطے ہم کو صبر بھی نہیں آتا۔ اور حوالہ شرح حسرت کا نہیں دیتے۔

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں — طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

بغیر عشق کیئے ہم سے رہا نہیں جاتا ایسی زندگی ہمارے لیئے وبال جان۔ ہے مگر ساتھ ہی عشق تکلیف رساں بھی ہے۔ اگرچہ ہم اس کے آزار میں بھی لذت پاتے ہیں مگر اس لذیذ آزار کے اٹھانے کی بھی ہم میں اب طاقت نہیں اس وقت تک کے عشق کرنے سے قوت تحمل باقی نہیں رہی۔ کیوں کہ کبھی کوئی مراد پوری نہ ہوئی

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبال دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

شوریدگی = آشفتگی و پریشانی و در ہمی و برہمی۔ وبال = شدۃ و وخامۃ دسوء العاقبۃ۔ وبال کے معانی لغوی مذکور کے لحاظ سے دوش سے (جان) بہتر ہے سے

کہ ہے وبال جان

آشفتگی و پریشانی کی بدولت سر وبال جان ہو رہا ہے۔ یا اللہ صحرا میں تو کوئی دیوار بھی نہیں کہ سر پھوڑ کے مر جاتے اور اس عذاب سے چھوٹ جاتے۔

گنجائش عداوت اغیار اک طرف — یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

وہ کم زوری مسلسل ناکامی سے لاحق ہوگئی ہے کہ اب دل میں ہوس اور تمنا محبوب کی بھی باقی نہیں رہی۔ تو پھر رقیبوں کی عداوت کی گنجائش کا کیا ذکر۔

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان — آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں ؟

نوا نالہ خواہ انسان کا ہو یا پرندوں کا ؎

کیا بے نوائے الخ

آخر کیا میرے نالہائے زار مرغ گرفتار کے نالوں کے اتنا بھی اثر نہیں رکھتے کہ لوگ پیسے دے کر چڑی ماروں سے چھڑوا دیتے ہیں۔ میرے نالے تو ان سے کہیں زیادہ موثر ہیں خدا کو مان کے اپنے اوپر رحم کر دکہیں ایسا نہ ہو کہ تم کو ضرر پہنچے لہٰذا میرے نالوں سے ڈرو۔ اور مجھے نہ ستاؤ (اچھا شعر ہے)۔

سب شارحین جنھوں نے اس شعر کے معنے لکھے وہ یہی لکھتے ہیں کہ آخر یہ نالہ نالہ ہے۔ طیور کی نوحہ گری تھوڑی ہے کہ کچھ اثر نہ ہو۔

مصرع ثانی کا طرز ادا یہ معنی نہیں چاہتا ہے۔ اس مطلب کے ادا کرنے کے لیے تو یوں کہنا چاہیئے تھا کہ میرے نالے کیا کسی مرغ گرفتار کے نالے ہیں جو کچھ اثر نہ کریں۔

دل میں ہے یار کی صف مژگاں سے روکشی — حالاں کہ طاقت خلش خار بھی نہیں

روکشی ۔ مقابل و حریف ہونا۔

باوجودیکہ ایک کانٹے کے چبھنے کی تکلیف کے برداشت کرنے کی طاقت اب باقی نہیں رہی پھر بھی دل میں ہمت و جرأت صف مژگان یار سے مقابلہ کرنے کی ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اور (واو) حالیہ کا ترجمہ ہے بمعنی در حالیکہ۔ سادگی ۔ بھولاپن ۔ اے خدا ۔ برائے تعجب ہے۔

اے میرے اللہ ان کے اس بھولے پن اور سیدھے سادے ہونے پر کون نہ مٹ جائے کہ لڑنے کو تو آتے ہیں اور اپنے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں لائے۔ ان کا یہ بھولا پن تلوار سے زیادہ موثر ہے (خوب ہے)۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ لڑنے سے اختلاط میں ہاتھا پائی کرنا مراد ہے۔ (تلوار کا ذکر بے کار ہوگیا)۔

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا　　دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

خلوت و جلوت ۔ خلا و ملا ۔ تنہائی و مجمع ۔ اکیلا دوکیلا ہونا ۔ دیکھا ۔ تجربہ کیا اور آزمایا ۔
اسدؔ کو اکیلے اور دوکیلے دونوں میں ہم نے آزمایا ۔ اگر بالکل دیوانہ نہیں ہے تو اسے ہوشیار بھی نہیں کہہ سکتے ۔ نیم پاگل تو ہے ہی ۔

---

غزل ۲۸　　اشعار ۹

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں　　ہوا ہے تار اشک یاس رشتہ چشم سوزن میں

درخور ۔ سزاوار ۔ مناسب ۔ (لائق اور قابل) الفاظ اردو کی بول چال کے موافق بالکل سامنے کے تھے مگر فارسی درخور لائے ۔
چوں کہ میرے جسم میں ہر گھاؤ ٹانکے لگانے کے قابل نہیں اس لیئے سوئی بھی میری اس حالت کو دیکھ کر مجھ پر روتی ہے ۔ اور ٹانکے کا تاگا گویا بمنزلہ تار اشک ہو رہا ہے ۔

ہوئی ہے مانع ذوق تماشا خانہ ویرانی　　کف سیلاب باقی ہے برنگ پنبہ روزن میں

خانہ ویرانی ۔ گھر کا غیر آباد ہونا ۔ منہدم ہو جانا ۔ بے سرو سامان ہو جانا ۔ ذوق ۔ مزہ ۔ ذائقہ ۔ لطف ۔ اس لفظ کے استعمال کا فائدہ نہ معلوم ہوا ۔ روزن کا بند ہو جانا مانع تماشا تو ہو سکتا ہے ۔ ذوق تو ایک وجدانی چیز ہے ۔ یہ اعتراض اب بھی رفع نہیں ہوتا کہ گھر کے گر جانے سے روزن کی ضرورت کیا رہی ۔ مزید برآں جس کو اتنا ملال ہو کہ اس کے سیلاب گریہ سے گھر ڈھے جائے اس کی طبیعت سیر و تماشا کرنے اور دیکھنے کو کب چاہے گی ۔
میری خانہ ویرانی ذوق تماشا کو مانع ہوئی ۔ کیوں کہ سیلاب گریہ کے جھاگ روزن میں ان کے بند کر دینے میں روئی کا کام کرتے ہیں ۔

ودیعت خانہ بیداد کاوش ہائے مژگاں ہوں　　نگین نام شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

ودیعت خانہ ۔ امانت خانہ ۔ کاوش ۔ کرید ۔ چبھن ۔ شاہد ۔ گواہ ۔ مرے ہر قطرہ خون تن میں ۔ تعقید بوجہ دشواری نظم ہے ۔ دراصل یوں ہے ہر قطرۂ خون میرے تن میں ۔

مژگان کی کاوش کی بیداد کا میں امانت گھر ہوں۔ یعنی تیری مژگان کی یاد دل میں ہر وقت کرید اور خلش پیدا کرتی رہتی ہے۔ اور اس کرید نے ہر قطرہ خون کے نگینہ پر تیرا نام کندہ کر دیا ہے اور میرا سارا جسم ان کندہ نگینوں کا امانت خانہ ہے۔ جن کا حساب کر کے مجھے واپس کرنا ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ میرے ہر رگ و پے میں تم سمائے ہوئے ہو۔ نگین نام کے شاہد ہونے کے یہ معنی ہیں کہ میرے ہر قطرہ خون کے تم مالک ہو۔

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی　　شب مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

ت: اگر دیواروں کے روزن میں روئی شب ماہ کا کام کرے اس کی شب ہجر کی تاریکی کا بیان کون کر سکتا ہے

نکوہش مانع بیربطی شور جنوں آئی　　ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

شورش جنوں سے جو میں نے جیب و گریباں کی دھجیاں اڑائی تھیں جن سے میرا بیڈھنگا پن معلوم ہوتا تھا۔ ان دھجیوں کو میرے احباب کی شماتت و ملامت و تعریض نے گویا بخیہ کر کے درست اور ٹھیک کر دیا۔ اور میرے بیڈھنگے پن پر پردہ پڑ گیا۔

خندہ سے خندۂ دندان نما مراد ہے تاکہ بخیہ کے ٹانکوں سے مشابہت پیدا ہو جائے۔

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے　　پر افشاں جوہر آئینہ مثل ذرہ روزن میں

تمثال کے معنی یہاں عکس کے ہیں۔ پر افشاں = اضطراب۔ منتشر ہونا مراد۔ لہرانا۔ جوہر = لوہے کے آئینہ میں ہوتے ہیں۔ اور شیشہ کے آئینہ میں جلا ہوتی ہے۔

محبوب مہر مانند نے جو آئینہ دیکھا اور اس میں اس کا عکس پڑا تو اس تمثال بے مثال کو دیکھ کر آئینہ کے جوہر ذرات روزن (ہبا منثورا) کی طرح پریشان اور منتشر ہو رہے ہیں۔ یعنی مضطرب ہیں۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے　　جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

صحبت تو مخالف ہے لیکن میں کہہ نہیں سکتا کہ میں نیک ہوں یا بد ہوں۔ اتنا ضرور ہے اگر میں اپنے آپ کو گل تصور کروں تو بھٹی میں ہوں جہاں اس کی کوئی بہار نہیں۔ اور اگر تنکا ہوں تو گلشن میں ہوں جہاں سے اسے جھاڑ کے پھینک دیتے ہیں۔ یعنی اگر میں اچھا ہوں تو میرے ہم صحبت بُرے ہیں اور اگر ہم صحبت اچھے ہیں تو میں بُرا ہوں۔ بہر صورت صحبت ناسازگار ہے۔

ہزاروں دل دیئے جوشِ جنون عشق نے مجھ کو　　سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

جنون افراط سودا سے پیدا ہوتا ہے۔ اور سویدا ایک سیاہ داغ دل پر ہوتا ہے۔
افراط جنون عشق سے مجھے ہزاروں دل مل گئے۔ سوداویت نے ہر قطرۂ خون کو سیاہ کر کے نقطہ سیاہ قلب کر دیا۔ تو گویا ہزاروں دل باسویدا مل گئے۔
اچھا ہزاروں دل مل گئے تو پھر کیا ہوا۔ اتنے ہی دلوں کے موافق جوش جنون بھی ہے۔

اسدؔ زندانی تاثیر الفتہائے خوباں ہوں　　خم دست نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

حسینوں نے از روئے نوازش جو میرے گلے میں ہاتھ ڈالے تو ان کی الفت کی تاثیر سے وہ ہاتھ میرے گلے میں طوق بن گئے اور انھوں نے مجھے اسیر کر لیا۔ اور اپنا پابند بنا لیا۔
میں مصداق اس مقولہ کا ہوں کہ۔ شعر را بمدرسہ کہ برد۔ یہ ساری غزل تصنع نامقبول سے پُر ہے۔ مجھے ایک شعر بھی پسند نہ آیا۔

---

غزل ۲۹　　اشعار ۷

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں　　سوائے خونِ جگر۔ سو جگر میں خاک نہیں　　داغ

خاک۔ کچھ۔ ذرا۔ ہیچ۔ خون = دم۔ لہو۔ فارسی میں بمعنی غم بھی مستعمل ہے۔ خون جگر = (غم عشق) کھانے میں جو مزہ ہے ویسا مزہ لذائذ دنیوی میں ذرا بھی نہیں۔ اب رہا خون جگر تو اسے حرارت و غم عشق نے بالکل جلا دیا اور خشک کر دیا تو اب کھائیں تو کیا کھائیں اور زندہ رہیں تو کیسے۔

مگر غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لے جائے　　وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

بازو اور پروں میں قوت غم سہتے سہتے ذرا بھی نہ رہی پھر یار یا دریار تک پہنچیں تو کیسے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مر کر غبار ہو جائیں اور غبار کو ہوا اُڑا کے ان تک پہنچا دے دوسرا کوئی وسیلہ معلوم نہیں ہوتا۔

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے　　کہ غیر جلوۂ گل رہ گذر میں خاک نہیں

معلوم نہیں کہ کون بہشت خصائل آرہا ہے کہ جس کی آمد میں اس کے آنے کے راستہ میں فرش گل کے سوا زمین کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

بھلا اسے نہ سہی۔ مجھی کو رحم آتا　　اثر مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں

نفس سے مراد آہ۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ نفس بے اثر اسی نفس کو کہتے ہیں کہ جس میں کوئی تاثیر نہ ہو پھر یہ کہنا کہ اس میں اثر خاک نہیں کیا معنی رکھتا ہے۔ لیکن بول چال میں یہ طرز ادا ٹھیک ہے۔ جیسے من قتل قتیلہ فلہ سلبہ (جس نے مقتول کو قتل کیا لہٰذا اس مقتول کا حق قاتل کو ہے۔ مقتول کو قتل کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اچھا یہ مان لیا کہ وہ ہماری آہ پر تاثیر سے ذرا نہ ڈرتے اور مظالم کیئے جاتے۔ لیکن اگر میری آہ با تاثیر ہوتی تو ان پر رحم کھا کے کہ کہیں انھیں ضرر نہ پہنچے میں خود آہیں نہ کرتا۔ مگر میری آہ میں اثر تو مطلقاً نہیں ہے اس لیئے آہیں کر کے بھڑاس نکال لیا کرتا ہوں۔

خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش　　شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

گل مراد محبوب یا شراب۔ خراب مست۔ مے کش مراد عشاق سے

مے دو سالہ کی دکان بھر میں خاک نہیں

مے خوار محض تصور جلوہ گل سے مست ہو رہے ہیں ورنہ احاطہ مے کدہ میں دھرا کیا ہے۔ اگلے مے کش سب چٹ کر گئے۔

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ　　سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

عشق کو جب غارت گر کہا ہے تو تعمیر خانہ سے بھی مراد دل و جگر و دماغ و حواس ہونا چاہیئے۔
ہم تو پہلے ہی دل و حواس وغیرہ سب کھو بیٹھے ہیں۔ اب ہمارے پاس ہے کیا جسے عشق لوٹے لہٰذا ہم عشق سے شرمندہ ہیں کہ اس کے لوٹنے کے لیئے ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔
یا عشق غارت گر نے دل و حواس سب لوٹ لیئے۔ اب ہمارے پاس ان کی تعمیر کی حسرت کے سوا اور ہے کیا — لہٰذا معشوق کے سامنے پیش کرنے کے لیئے کوئی چیز تو ہمارے پاس نہیں ہم محبوب کو نذر کریں تو کیا نذر کریں۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ　　کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

کھُلا ۔ واضح ہوا۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ کھلا تنہا حال یا اسی کے مترادف لفظ کے بغیر اس معنی میں نہیں بولتے ۔

جب ہم پر یہ بات واضح اور روشن ہوگئی کہ اشعار میں اپنے کمالات دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں تو اب ہمارے اشعار بھی صرف دل لگی اور تفریح کے ہوتے ہیں۔ اس کے سوا اب ہمارے اشعار میں اور کچھ نہیں ہے ۔

---

غزل ۳۰ اشعار ۹

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں  روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دل بھر آنا ۔ غمگین و رنجیدہ ہونا۔ کوئی ۔ جب کسی کی طرف سے رنج کے ساتھ مروت کو بھی دخل ہو اور شکایت بھی مقصود ہو تو بجائے خطاب تنکیر سے مکالمہ کیا جاتا ہے ۔ اگرچہ مقصود تخصیص ہوتی ہے۔ اور معشوق ناز اور نخرہ دکھا کر تنکیر کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں ۔

جیسے معشوق ستاتا بھی ہے اور داد و فریاد بھی کرنے نہیں دیتا۔ تو عاشق اس کی اس حرکت پر کہتا ہے کہ دل ہے کوئی اینٹ پتھر نہیں پھر تمہارے مظالم پر میرا دل بوجہ درد و تکلیف کیوں نہ بھر آئے۔ تمہارا تو ہم کچھ بنا نہیں سکتے۔ لہٰذا رو دینے کے سوا بحالت مجبوری اور کیا ہم کر سکتے ہیں ۔ نہ تم ستاؤ اور نہ ہم روئیں ۔

بحر اس غزل کی رجز مثمن مطوی مخبون مذال اور بلا مذال ہے ۔ بروزن مفتعلن مفاعلات ۔ مفتعلن، مفاعلن ہے ۔ سالم وزن رجز آٹھ بار مستفعلن ہیں ۔

تقطیع دل ہ ت ہے ۔ مفتعلن ÷ ن سنگ خشت ۔ مفاعلات (مذال) بلا غنہ در د س بر = مفتعلن ÷ ن اا ے کون ۔ مفاعلان (مذال باغنہ)۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں  بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

در اور چوکھٹ تو کسی کی ملک ہوتے ہیں لہٰذا ان کے مالک کو حق ہوتا ہے کہ کسی کو وہاں نہ بیٹھنے دے ۔ مگر دیر و حرم کا تو کوئی مالک نہیں ۔ اس لیئے در و آستاں کی ایسی کوئی دو مملوک چیزوں کا ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ مثلاً باغ نہیں چمن نہیں ۔یا۔ قصر نہیں سرا (خانہ) نہیں ۔یا۔ مثل اس کے اور کوئی مناسب الفاظ رہ گذر مطلق گذرگاہ ۔ راستہ مگر یہاں مراد گذرگاہ معشوق تاکہ محبوب کو دیکھ سکیں ۔ غیر سے کوئی شاید اچھا ہوا ور کوئی سے مراد معشوق ہو یعنی تنکیر سے تخصیص ۔

ہم تو راستہ میں بیٹھے ہیں۔ یہ راستہ نہ دیر و حرم ہے اور نہ کسی کا دروازہ و آستانہ پھر ہم کو یہاں سے اٹھا دینے کا حق کس کو ہے۔

جب وہ جمال دل فروز۔ صورت مہر نیم روز آپ ہی ہو نظارہ سوز۔ پردہ میں منھ چھپائے کیوں

مہر نیم روز دوپہر کا آفتاب۔ خوب ۔گرم ہوتا ہے۔

چوں کہ یہ وزن مسمط چار گوشہ ہے اس میں تین قوافی غیر از قوافی غزل و قصیدہ لانے سے ترنم بڑھ جاتا ہے اور بحر بہت خوش آیند ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں دل فروز۔ مہر نیم روز۔ نظارہ سوز تین قافیے غیر قوافی غزل ہیں۔ اور غزل کے قوافی ستائے۔ چھپائے وغیرہ ہیں۔

جب اس کا حسن دل کا روشن کرنے والا۔ دوپہر کے آفتاب کی طرح بینائی و بصارت کو جھلسا دینے والا ہے تو پھر پردہ کرنے کی ضرورت کیا رہی۔ بے پردہ بھی ہو جاؤ تب بھی تمہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ جس طرح سورج کو کوئی کثرت ضیا کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتا حالاں کہ کس قدر نمایاں اور آشکارا ہے۔

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوک ناز بے پناہ تیرا ہی عکس رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

تیرے غمزہ کا خنجر جان لیوا ہے اور تیرے تیر ناز سے بچت ناممکن ہے۔ گو آئینہ میں تمہارا ہی عکس دکھائی دیتا ہے مگر تمہارے دشنۂ غمزہ اور تیر ناز سے بچ کیسے سکے گا۔ نقل پھر نقل ہے اور اصل اصل۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ خود عکس تیرا اگر آئینہ میں بھی دشنہ و ناوک لیئے ہوئے سامنے آیا تو تیرا کیا حال ہوگا۔

طرز ادا شعر کا اس معنی کا مقتضی نہیں۔ مولانا کا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ جب انھیں کا عکس رخ ہے تو اس کے پاس بھی تو دشنہ و خنجر ہوں گے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

زندگی اور غم کوئی دو جدا چیزیں نہیں حیات نام غم ہی کا ہے۔ لہٰذا جب تک زندگی ہے غم سے چھٹکارا نہیں حاصل ہو سکتا۔ ہاں بعد مرگ غم دنیوی سے نجات ممکن ہے اس سے پہلے نہیں ہو سکتی کیوں کہ سلب شے عن نفسہٖ محال ہے۔

حسن اور اس پہ حسنِ ظن۔ رہ گئی بوالہوس کی شرم　　اپنے پر اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

بوالہوس ۔ بڑا ہوس والا شعرا نے رقیب کا نام رکھ لیا ہے ۔ اپنے پر اعتماد ہے ۔ یعنی رہ جانتے ہیں کہ کون ایسا ہوگا جو ہمیں نہ چاہتا ہوگا ۔

ایک تو انھیں حسن خداداد حاصل ہے مزید براں حسن ظن بھی لوگوں سے رکھتے ہیں ۔ اور اپنے حسن پر اعتماد کلی ہے کہ ہم کو ہر شخص ضرور چاہتا ہوگا ۔ پھر رقیب کے دعویٰ عشق کی آزمائش وہ کیوں کریں ۔ اس لیئے رقیب کی شرم رہ گئی ۔ اگر وہ جانچ کرتے تو اس کی کرکری ہو جاتی ۔ وہ عاشق صادق کب تھا ۔

واں وہ غرورِ عزّ و ناز ۔ یاں یہ حجاب پاس وضع　　راہ میں ہم ملیں کہاں ۔ بزم میں وہ بلائے کیوں

ان کو اپنی عزت و ناز پر غرور ہے اس لیئے ہم کو اپنی بزم میں وہ کیوں بلانے لگے ۔ اور ہم کو اپنی وضع کا پاس ہے ۔ اور اپنے رنج و غم میں مبتلا ہیں نہ کہیں آتے ہیں اور نہ کہیں جاتے ہیں ۔ اپنی وضع داری کے لحاظ سے بغیر بلائے ان کے گھر بھی نہیں جاتے ۔ گھر سے نکلتے ہوئے تو کبھی کسی راستہ ہی میں ان سے مڈبھیڑ ہو جاتی اس کی بھی امید نہیں ۔ لہٰذا ان کے دیدار سے محروم رہنا ہی ہماری قسمت میں لکھا ہے ۔ اس شعر میں لف و نشر غیر مرتب ہے ۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی　　جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

بے شک ہم نے مانا کہ وہ کافر اور ظالم ہے ۔ جاؤ اپنی راہ لو ۔ اچھا وہ بے وفا ہی سہی ۔ جس کو اپنی جان اور دین عزیز ہوں وہ اس کے کوچہ میں جائے کیوں اور اس سے عشق ہی کیوں کرے ۔ اس سے عشق کر کے دین و دل سے تو ہاتھ دھونا ہی پڑے گا ۔ بول چال میں ڈوبا ہوا شعر ہے ۔ ناصحین کو بگڑ کے جواب دے رہا ہے ۔ ( خوب ہے ) ۔

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں　　روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

غالبؔ کے مر جانے کے بعد دنیا کا کوئی کام رُک نہیں رہا پھر اس کے مرنے پر زار و قطار رونے اور ہائے ہائے کرنے کی ضرورت نہیں ۔

ساری کی ساری غزل نہایت خوب ہے ۔ ایسے ہی اشعار کی وجہ سے غالبؔ علی کل غالب ہیں نہ

بیدل کے طرز کے اشعار کی وجہ سے۔

---

غزل ۳۱ اشعار ۱۰

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منھ سے مجھے بتا کہ یوں

غنچۂ ناشگفتہ ۔ منھ بند کلی ۔ وکنایہ از دہن محبوب ۔

میں بوسہ کی نسبت سوال کرتا ہوں لہٰذا بوسہ لے کے یا دے کے منھ سے بتاؤ کہ اس طرح لیا یا دیا جاتا ہے ۔ یہ کیا کہ غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے دکھا دیا اس سے تو ہمارا مطلب پورا نہیں ہوتا ۔

میں نے مردہؔ اس شرح کا ذمہ لے کر اپنے تئیں مصیبت میں ڈال لیا ۔ کچھ سمجھتا نہیں لکھوں تو کیا لکھوں ۔ سوال بوسہ لینے یا دینے سے ہے ۔ اس کے جواب میں محبوب نے غنچہ دکھا دیا کہ یوں ۔ کیا یہ بوسہ لینے یا دینے کا جواب ہو سکتا ہے ۔ پھر پہلے مصرع کی ردیف کیا معنے دے رہی ہے ۔ (غنچہ دکھا دیا کہ یوں) کے کیا معنے ہوئے ۔

اگر یہ معنی کہوں کہ دور سے غنچہ یا دہن دکھا دینے کا کیا فائدہ عمل کر کے دکھاؤ تو اس مطلب پر الفاظ دال نہیں اور کہ یوں ردیف اب بھی مربوط نہیں ہوتی ۔ گریبان پھاڑ کے کدھر نکل جاؤں کہ اس عذاب سے جان بچے ۔

پرسش طرز دلبری کیجیے کیا ۔ کہ بن کہے اس کے ہر ایک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

اس سے اس بات کے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ کسی کا دل لے لینے کا کیا طریقہ ہے ۔ کیوں کہ ان کے بغیر بتلائے ہر اشارہ سے یہ ادا ظاہر ہو رہی ہے کہ یوں دل لے لیتے ہیں ۔

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

خدا کرے کہ وہ میرے یہاں آئے مگر نہ اس طرح سے کہ رات کے وقت شراب پی کے اور رقیب کو ساتھ لے کے میرے یہاں آئے ۔ خدا نہ کرے کہ اس طرح آئے ۔

اگر لف و نشر مانیں تو یہ معنی ہوں گے کہ ۔ رات کے وقت مے پی کے میرے یہاں آئے ۔ مگر خدا نہ کرے کہ رقیب کو ساتھ لئے آئے ۔

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے　　　سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

میں نے جو محبوب سے کہا کہ رات رقیب کے ساتھ کیسی نبٹی ۔ تو ذرا اس کی شوخی تو دیکھو کہ جھٹ سے میرے سامنے آکر بیٹھ گیا اور کہا ذرا ادھر دیکھنا یوں اس سے بنی کہ ہمارا اور اس کا سامنا تھا۔

مصرع ثانی اچھا ہوا ہے ؎

سامنے آکے بولا وہ ۔ دیکھو ادھر ذرا کہ یوں

؎　سامنے میرے آگیا ۔ کہنے لگا کہ یوں

چاہے اظہار شوخی ہی کیوں نہ ہو ۔ مگر اس حرکت سے چھچھورا پن کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس کا سامنے آن بیٹھنا اور غصّہ کی نگاہ سے میری طرف دیکھنا دیکھئے کہ یوں تم گستاخی کرنے لگے ۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ میرے اس سوال پر ذرا دیکھنا اس کا سامنے آن بیٹھنا اور ذرا دیکھنا یوں ڈھٹائی سے سامنے آن بیٹھنا۔

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے　　　اس کی تو خامشی میں بھی نکلے ہے یہ مدعا کہ یوں

نظم و حسرت نے مصرع ثانی یوں لکھا ہے ؎

اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

(بھی) کے لیئے کوئی اور بات بھی ہونا چاہیئے ۔ اس کا ذکر نہیں ۔ مثلاً اس کا دل خاموشی کو چاہتا ہے ۔ اور خود چپ رہ کر بھی دوسروں کا چپ رہنا اس کو مطلوب ہے ؎

اس کی تو خامشی میں ہے ۔ بس یہی مدعا کہ یوں

جب ان کے چپ رہنے سے ان کا مدعا یہی ہے کہ دوسرے بھی چپ رہیں تو پھر ہم اس کی بزم میں اس کے سامنے چپ کیسے نہ بیٹھیں ۔ اور اپنا درد دل ان سے کیسے کہیں۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی　　　سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

ستم ظریف ۔ جس کی ظرافت میں ستم کو بھی دخل ہو۔

میں نے جو کہا کہ محفل ناز ۔ یا (یار) اغیار سے خالی ہونا چاہیئے اس نے ظرافت و شوخی ستم آمیز سے مجھ کو اُٹھا دیا کہ اس طرح خالی ہونا چاہیئے۔

اس طرح کی شوخی میں کوئی ہرج نہیں۔

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح　　　دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

اچھے خاصے تو ہیں، جبھی تو محبوب ہوش کے جانے کو پوچھتا ہے سے بے خود ہو جانے کی علت کا ذکر نہیں۔
اور بے خودی عاشق کو دیکھ کر ہوا کیوں چلنے لگی اس کی وجہ نہ معلوم ہوئی۔
مجھ سے محبوب نے پوچھا کہ ہوش کیسے جاتے رہتے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں مجھے اضطراب پیدا ہوا
کیوں کہ ہوش سے بے ہوش ہو جانا کوئی اختیاری چیز نہیں ہے۔ میرے اس اضطراب کو دیکھ کے ہوا چلنے لگی کہ اس
طرح ہوش چل دیتے ہیں۔ بے خود اور بے ہوش کو ہوا دیتے ہیں۔

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی　　　آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

کوچۂ یار چھوٹے ہوئے اتنی مدت گذر گئی اب مجھے یاد بھی نہیں کہ کس طرح کوچۂ محبوب میں میری بسر
ہوتی تھی مگر نقش قدم نے یاد دلا دیا کہ تم بھی میری طرح متحیر و ساکت و صامت یہاں پڑے رہتے تھے۔

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال　　　موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

محیط آب = دریا۔ بحر۔ سمندر۔ دست و پا زدن = مضطرب ہونا۔ ہاتھ پاؤں مارنا۔ سعی کرنا۔ شوق =
دیدار و وصال سے اس میں اضافہ ہوتا ہے (فرائد اللغۃ) شرط کے تحت میں (زوال ہو جاتا ہے) محذوف جز
ہے (تو دیکھ)۔
اگر تجھے اس بات کا خیال ہو کہ بعد وصال شوق کا زوال ہو جاتا ہے تو یہ خیال غلط ہے سمندر میں موجوں کو دیکھ
باوجود اتصال از بحر ہاتھ پاؤں مارتی ہیں اور مضطرب ہیں۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ اگر تجھے یہ خیال ہو کہ مبدء حقیقی تک پہنچ کے کیوں کر زوال شوق ہو جائے گا اور
کس طرح اتحاد پیدا ہو گا تو موج محیط کو دیکھ وہ بتا رہی ہے کہ اس طرح دست و پا مارتے مارتے آخر اتحاد
ہو جاتا ہے جو کہ مرتبہ اطمینان و سکون ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی　　　گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

کیونکہ = بمعنی کیوں کر اب نہیں بولتے۔ ریختہ = زبان اردو کو کہتے ہیں۔ اصل میں عمارت کا مصالحہ

(مسالا) جس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں جیسے چونا۔ سرخی۔ کنکریٹ۔ پزاوہ کی راکھ وغیرہ۔ اسی طرح زبان اُردو بھی مختلف زبانوں سے مرکب ہے۔ اور ریختہ ڈھلے ہوئے کے بھی معنی ہیں۔ چند دھاتوں کو ملاکے ڈھلی ہوئی کوئی چیز۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اُردو کی شاعری قابل رشک کلام فارسی کیسے ہوسکتی ہے تو اسے غالب کا کلام اُردو سنادو جو فارسی سے بڑھ کے ہے۔ فخریہ شعر ہے۔

---

# ردیف الواؤ

## غزل ۱ اشعار ۳

مطلع
حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو ۔۔۔ کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

حسد = کسی کا زوال نعمت چاہنا بغیر اس کے کہ وہ نعمت حاسد کو ملے۔

اگر حسد کی وجہ سے تو افسردہ خاطر ہو رہا ہے تو اہل دنیا پر نظر ڈال اور غور وفکر سے کام لے۔ ہوسکتا ہے کہ تیری کوتاہ بینی اس نظارہ سے دور ہوجائے۔ اور تو غفلت کی نیند سے بیدار ہوجائے۔ ہر شخص اپنی سعی سے کسی خوبی کو پاتا ہے۔ وما للانسان الا ما سعیٰ۔ تو بھی کوشش کر تاکہ وہ خوبی تجھے بھی حاصل ہو۔

حسد میں تنگ چشمی مانتے ہیں بلکہ تنگ چشمی کے معنی ہی ہیں۔

بقدر حسرت دل چاہیئے ذوق معاصی بھی ۔۔۔ بھروں اک گوشۂ دامن گر آب ہفت دریا ہو

معاصی = جمع معصیت ترک طاعت۔ عدم انقیاد۔ سرکشی۔ بھرون = دامن دامن ترکرنا۔ دامن آلودہ کرنا (فارسی کے محاورہ کا) اُردو ترجمہ کیا ہے۔ دامن بھرنا اس معنی میں اُردو میں نہیں بولتے ہیں۔

جتنے گناہ کرنے کی حسرت میرے دل میں ہے اسی قدر ذوق معاصی بھی ہونا چاہیے۔ اگر ساتوں سمندر کا پانی مل جائے تب بھی میرا ایک گوشۂ دامن بھی تر نہ ہوگا ۔۔

کہ دل تر گوشۂ دامن گر آب ہفت دریا ہو

فارسی میں تر دامن بمعنی عاصی ہے۔ اور ہفت دریا کثرت معاصی سے استعارہ ہے۔

اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آجائے　　　کفِ ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

قمری کو عاشق سرو اور خاکستری رنگ کا مانتے ہیں۔ ہندوستان میں سفید رنگ کی فاختہ کو قمری کہتے ہیں۔ مصرع ثانی میں تعقید ہے۔ دراصل ہر کفِ خاک ہونا چاہیئے۔

اگر وہ محبوب سرو بالا خرام ناز کے ساتھ گلشن میں آجائے تو گلشن کی ہر کفِ خاک قمری کی طرح اس کے حسن پر فریفتہ ہو کے نالۂ جاں فرسا کرنے لگے۔ نالہ فرسا ہونا = ایسے نالے کرنا جو نالوں کو فنا کر دے۔

---

غزل ۲　　　اشعار ۴

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں　　　بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو؟

اگر بھولے سے اتفاقاً کعبہ میں یا کسی اور مجبوری سے آ رہا ہوں تو مجھے طعنہ نہ دو۔ تمہیں کیا بتائیں کوئی ایسی ہی بات تھی جو یہاں آنا ہوا۔ مگر یہاں آکر بھی کیا ہم صحبتِ اہلِ کنشت کو بھول گئے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ان کی یاد تو کبھی میرے دل سے جانے کی نہیں۔

کنشت = آتش کدہ و معبد یہودان (عربی، ہج)

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

انہارِ بہشتی = چار ہیں۔ خمر۔ شہد۔ لبن (شیر۔ دودھ) ماء آسن (نہ بگڑنے اور سڑنے والا پانی)۔ لاگ = تعلق۔ وسیلہ۔ امید۔ طمع۔

لوگ طاعت و عبادت اس طمع میں کرتے ہیں کہ بہشت میں جا کر شراب و شہد اڑائیں گے۔ لہٰذا کوئی بہشت کو جہنم میں ڈال دے نہ بہشت رہے گی اور نہ شراب و شہد کی طمع میں کوئی عبادت کرے گا۔ پھر عبادت خالصتہً لوجہ اللہ ہوگی۔ کوئی ڈال دو۔ دہلی کی زبان ہے۔ کوئی ڈال دے لکھنؤ میں بولتے ہیں۔

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے　　　ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

قط = قلم کا بائیں جانب کو کج ہی ہوتا ہے۔ انحراف انحراف۔ امالہ۔ روگردانی۔ سرنوشت = تقدیر، قسمت۔ جو پہلے سے لکھ دیا گیا۔

ثواب کے طریقوں سے میں رو گرداں کیوں نہ رہوں جبکہ قلم تقدیر ہی میری حصّہ کا ٹیڑھا چلا ہے۔ یعنی تقدیر ہی میں کج روی لکھی ہے۔

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے          خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

لہنا۔ فائدہ۔ شکایت کے محل پر جب کوئی کسی کے ساتھ احسانات کرے اور محسن علیہ سے کچھ نفع نہ پہنچے یا ضرر پہنچے تو اس لفظ (لہنا) کو بولتے ہیں۔

ہم کشت وکار میں کتنی ہی کوشش کریں ہم اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ بالفرض اگر ہماری کھیتی کو ٹڈیوں نے نہ کھایا تو کھلیان پر بجلی گر پڑے گی۔ بغیر استعارات مفہوم پر لطف نہیں۔

---

غزل ۳          اشعار ۱۰

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو          کیجیے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو          ۱۴۸ غ

وارستہ۔ آزاد۔ محبت ہی کیوں نہ ہو یعنی ہم سے محبت ہی کرو۔

ہم اس بات سے آزاد ہیں کہ خواہ مخواہ تم ہم سے محبت ہی کرو۔ محبت نہیں کرتے ہو نہ کرو۔ عداوت ہی ہمارے ساتھ کیئے جاؤ۔ بے تعلقی محض تو اچھی نہیں۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا          ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

کمزوری کی وجہ سے اب قوت کسی سے میل جول کی بھی نہ رہی۔ حتیٰ کہ نقشِ محبت بھی اب دل پر بار معلوم ہوتا ہے۔ رنگ بمناسبت نقش لائے معنی کی خوبی کو نہیں بڑھاتا ہے۔

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ          ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

غیر کی چاہے شکایت ہی کیوں نہ ہو میں تو اس کا ذکر کسی حیثیت سے سنا ہی نہیں چاہتا۔

پیدا ہوئی ہے۔ کہتے ہیں۔ ہر درد کی دوا          یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہر درد کی دوا پیدا کی ہے۔ اگر ان کا یہ کہنا ٹھیک ہوتا تو مرض عشق کا بھی کوئی علاج

ہوتا مگر یہ تو درد بید دا ہے (ہی) کی جگہ (بھی) چاہیے۔

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ　　اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

خجالت کشیدن فارسی کا محاورہ ہے اُردو میں خجالت اٹھانا بولتے ہیں۔
میں بے کس ہوں میرا کوئی یار و مددگار نہیں پھر کسی کے سامنے اپنی کوئی خواہش پیش کر کے خواہاں اعانت کیا ہوتا۔ اور یہ اچھا ہی ہوا۔ کیوں کہ کسی سے امید مطلب برآری کی توقع ہی نہیں۔ ان کے کام نہ کرنے سے مفت کی شرمندگی ہوتی کہ انہوں نے میری بات نہ مانی اب اگر شرمندگی ہے تو اپنی ذات سے ہے کہ میں نے خود حصول مطلب میں سعی کیوں نہ کی۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

انسان خود اپنی ذات سے ایک ہنگامہ و مجمع خیال ہے۔ لہٰذا اس کی تنہائی بھی انجمن کا مرتبہ رکھتی ہے۔ ہر وقت اُدھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال　　حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

انفعال۔ خجلت و شرمندگی۔ ہنگامہ۔ تجرید بمعنی مجمع و جمعیت۔ زبونی۔ تفضیح دیدی۔ عبرۃ۔ نصیحت۔ پند۔ وعظ۔
کسی سے کچھ حاصل کرنا باعث شرمندگی ہوتا ہے کیوں کہ عالی ہمت کسی کا احسان مند ہونا پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا احسان اُٹھانا کثرت پستی ہمت کی دلیل ہے۔ اس لیے شدت منع احسان مندی میں فرماتے ہیں کہ زمانہ سے نصیحت حاصل کرنے کو بھی گوارا نہ کرد۔ اگرچہ اپنے آپ کسی برائی میں مبتلا ہونے سے دوسروں سے عبرۃ اور سبق لینا فعل عقل اور مستحسن ہے۔

وارستگی بہانۂ بے گانگی نہیں　　اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

آزادی اور ترک دنیا عذر معقول دوسروں سے اجنبی اور بے گانہ رہنے کا نہیں ہوسکتا ہے۔ انسان مدنی بالطبع پیدا ہوا ہے اس کی بقا ایک دوسرے کی اعانت پر موقوف ہے۔ محقق دوانی اخلاق جلالی میں لکھتے ہیں جو لوگ پہاڑوں میں منڈھی ڈال کے بیٹھ رہتے ہیں وہ تعاون کے تارک ہوتے ہیں جو فرض

انسانی ہے۔ لہٰذا ان کا یہ فعل مستحسن نہیں اگر وحشت و نفرت ہی کرنا ہے تو اپنی ذات سے کرنا چاہیئے کیوں کہ اپنے پہلو میں ایک دشمن قوی لیئے بیٹھے ہو جو تمہیں صراط مستقیم پر چلنے نہیں دیتا۔

مٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کوئی　　عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

چاہے عمر عزیز عبادت ہی میں صرف ہو مگر وہ ضایع ہی ہوئی۔ کیوں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے لہٰذا اس کا کام بھی اعلیٰ ہونا چاہیے۔ اسی لیئے عرفا ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون میں یعبدون کی تعبیر یعرفون سے کرتے ہیں۔ جب عرفان حاصل نہ کیا تو عمر ضائع کی۔ اس لیئے جو لوگ سوچ بچار کرنے والے ہیں وہ اس موقع فرصت حیات پر جو حصول عرفان میں صرف نہ ہوئی اس کا غم ایسے لوگوں سے کبھی دور نہیں ہوتا ؎

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اُس فتنہ جو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ　　اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

اسدؔ نے اس فتنہ جو کے دروازہ پر دھونی رمالی ہے۔ چاہے اب ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ برپا ہو جائے۔ جو مصیبت اور عذاب وہ ہمارے سر لائیں اب تو ہم ہٹنے کے نہیں ایسے ڈٹے ہیں۔ یہیں بیٹھے ہوں گے جب قیامت میں مردے قبروں سے اٹھیں گے۔

---

غزل ۴　　شعار ۱۲

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو　　مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو　　۱/۱غ ۱۲

قفس = پنجرا عربی تفعص۔ نوا سنجان گلشن = طیور نغمہ سرا۔

میں تو پنجرے میں بند ہوں۔ گلشن کے آزاد نغمہ سرا پرندے اگر میرے نالہ و فریاد کو اچھا بھی نہ سمجھیں تب بھی میرا ہونا گلشن میں ان کے عیش و سرور کے لیئے جب مخل نہیں تو اسے برا کیوں سمجھیں۔ بند ہو کر مجھے بھی دور سے بوئے گل تو آجاتی ہے۔ اور ان کا میں کیا بگاڑتا ہوں۔

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے　　نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

دشمن حقیقی ہم دم تو اس کا ہو نہیں سکتا کیوں کہ عاشق صادق تو ہے نہیں۔ مگر مجھے تو یہ رشک بھی مارے ڈالتا ہے کہ وہ بھی محبوب کی آرزو اور تمنا رکھتا ہے۔ یا اللہ تو نے آرزو نے دوست دشمن کو کیوں دی۔

نہ نکلا آنکھ سے تیرے اک آنسو اس جراحت پر    کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگاں سوزن کو

مژگان سوزن۔ سوئی کی نوک۔

میرے ایسے زخم کاری کو دیکھ کر تیرا ایک آنسو بھی نہ نکلا جو تیرا ہی لگایا ہوا ہے۔ حالاں کہ سوئی جسے کچھ احساس نہیں ٹانکے لگانے میں اس کی پلک سے بھی اشک خونیں اس زخم کو دیکھ کر ٹپک پڑے۔

حالت زار پر بے حس چیز کے رونے کو میں نے بھی کہا ہے۔

نہیں ٹپکتے ہیں پیہم یہ خون کے قطرے    ہمارے حال پہ روتا ہے تیرا خنجر بھی

جناب نظم (سینہ) بمعنی صدر اختیار کر کے فرماتے ہیں۔ سوزن سے سوزن غم مراد ہے۔ جس کا مقام سینہ کے اندر ہے۔ اگر سوزن سے یہ استعارہ نہ لیں تو شعر عامیانہ ہو جائے گا۔ جیسے نافہم شعرا امر غیر واقعی نظم کر دیا کرتے ہیں۔ ہاں اگر سینہ (بمعنی صدر کی جگہ) سینے (بمعنی دوختن) ہو تو استعارہ کی ضرورت نہیں۔

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں    کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

میرے ان ہاتھوں کو خدا شرمائے کہ بحالت فراق میرا گریبان پھاڑتے اور اس کی دھجیاں اڑاتے رہتے ہیں۔ اور وقت رخصت محبوب اس کا دامن پکڑ پکڑ کے اسے روکتے ہیں کہ نہ جاؤ۔

معشوق کے اسمائے صفتی فارسی جیسے جان اور جانان وغیرہ بغیر مضاف و مضاف الیہ یا صفت و موصوف اور اسم اشارہ مگر بترکیب فارسی اردو میں ناگوار سمع ہوتے ہیں۔

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آسان سمجھتے ہیں    نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

وہ اتنے لوگوں کو قتل کرتے ہیں کہ خون کا دریا بہ نکلتا ہے اور اس میں ان کا گھوڑا پیرنے لگتا ہے۔ یہ نظارہ ہم نے ابھی دیکھا نہیں ہے اس لیئے مقتل میں چلا جانا ابھی ہم کو آسان معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ نظارہ دیکھ کر حواس قائم رہنا دشوار ہوگا۔ معشوق کی کثرت خونریزی کا بیان ہے۔

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا    کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو

لفظ کان یں اخفار نون اُردو میں ناگوار طبع ہے۔ جوہر۔ معدن کی اشیاء خام چاہے سونا چاندی ہو یا لوہا ایسے نکلتے ہیں کہ اگر ناواقف کے ہاتھ لگیں تو وہ کنکر پتھر سمجھ کے پھینک دے بنانے کے بعد لوہے میں جوہر پیدا کیے جاتے ہیں۔

مجھ ایسے مشہور دیوانہ کے لیئے زنجیر بنے کا جو شہرہ ہوا تو معدن میں جنبش جوہر نے لوہے کو بے تاب کر دیا کہ ہم سے اس کے لیئے زنجیریں بنتیں تو اس دیوانہ کے دیدار سے ہم بھی شرفیاب ہوتے (کوئی اچھی تخیل نہیں)۔

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے　　　سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو

شعر قابل شرح اور ترجمہ نہیں۔ اگر استعارات سے کام نہ لیا جائے تو اس شعر میں کیا دھرا ہے۔ مثلاً ابر سے مراد کسی قسم کی خوبی۔ اور برق سے مراد سامان بربادی وغیرہ۔ بہر طور حاصل شعر یہ ہے کہ کسی خوبی کے حاصل ہونے سے پہلے سامان بربادی مہیا ہو جاتا ہے ایسا بدقسمت ہوں۔

وفا داری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے　　　مرے بت خانہ میں تو گاڑو کعبہ میں برہمن کو

برہمن ۔ بفتح ثانی و بکون نیز برہما یعنی آدم سے بنا ہے۔ ہندوں نے انسانوں کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے۔ اول برہمن دوم چھتری سوم ویش چہارم شُدر۔ جمشید نے بھی چار صنفیں کی تھیں:

۱۔ کاتوری۔ زاہد و عبار　۲۔ نیساری۔ سپاہی و جنگجو　۳۔ نسودی۔ کاشت کار و زراع

۴۔ اہنوخوشی۔ پیشہ ور۔

ایمان کی جڑ اور بنیاد وفاداری کے استقلال و استحکام پر ہے۔ کفر پایہ دار بھی قابل قدر ہوتا ہے۔ اگر برہمن بت خانہ میں بھی مرے تب بھی اپنی پایداری وفاداری کی وجہ سے مستحق اس کا ہے کہ کعبہ میں دفن کیا جائے۔

کعبہ کی عمارت چوں کہ مکعب ہے اس لیئے بیت اللہ کو کعبہ کہتے ہیں۔

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو　　　جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

جناب نظم فرماتے ہیں کہ تلوار سے استعارہ ناز و ادا و جور و جفا سے ہے۔ اور گردن جھکا دینے سے مراد گوارا اور برداشت کرنا۔ اور شہادت سے مقصود خون بے دیت ہے۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا　　رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

رہزن ۔ قاطع الطریق مراد یار ستم گار ۔ لٹے ہوئے مال سے مراد ۔ ہوش و حواس و دل و جگر وغیرہ یا تعلقات دنیوی ۔

اگر عشق محبوب میں اسے دیکھ کر ہوش و حواس و خواہشات و تعلقات دنیوی کو کھو نہ بیٹھتا تو باوجود شب فراق ہر بات سے بے خبر ہو کر کیسے سوتا ۔ اگر یہ چیزیں ساتھ ہوتیں تو شب جدائی میں نیند کیسے آتی ۔ مختلف خیالات رات بھر بے چین رکھتے ۔

اگر استعارات سے کام نہ لیا جائے تو اس شعر میں کیا دھرا ہے ۔ اور اسے غزل کا شعر کیوں کر کہیں ۔

جناب آسی اس شعر کو بیت الغزل بغیر استعارات کے معنی وضعی لکھ کر فرماتے ہیں ۔

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے　　جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

کو کھودیں دو کاف کے اتصال سے تنافر پیدا ہو گیا ۔ (جو کھودیں) کہنے سے یہ تنافر دور ہو سکتا ہے ۔ معدن ۔ کان عربی میں بکسر دال ہے ۔ ایرانی بفتح دال نظم کرتے ہیں ۔ صائب نے بفتح دال کہا ہے ۔ اور اردو میں بھی بفتح دال ہی بولتے ہیں ۔

کیا ہم میں اشعار کہنے کی قوت نہیں ۔ جو جواہر کے خواہاں ہوں ہم تو اشعار در بار کہہ سکتے ہیں جو جواہر سے بہتر ہیں ۔ کیا ہم دل و جگر عاشقانہ نہیں رکھتے ہیں جو کان کھود کر جواہر نکالیں ۔

مرے شاہ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ　　فریدوں و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

سلیمان بن داؤد دونوں پیغمبر تھے اور مسلمان اس لئے بہادر شاہ کی صفت میں سلیمان جاہ کہا اور مسلمان سلیمانؑ کو تمام دنیا کا بادشاہ بھی مانتے ہیں ۔ دارا ۔ یا ۔ داراب ۔ دار پوش ۔ ایران کے خاندان کیانی کا نواں شہنشاہ ہے ۔ اس سے پہلے دو دارا اور گذرے ہیں ۔ سکندر اعظم کے مقابلہ میں شکست کھا کر قتل ہوا ۔ حضرت عیسٰی سے تین سو اکتیس ۳۳۱ سال قبل گذرا ہے جمشید ۔ جم خاندان پیشدادیان کا شہنشاہ اس کی یادگار تخت جمشید اصطخر شیراز میں اب تک باقی ہے ۔ اور اس کا جام شعرا میں بہت مشہور ہے ۔ حضرت عیسٰی سے آٹھ سو سال پہلے گذرا ہے ۔ بہمن بن اسفندیار ایران کا قدیم بادشاہ جس نے خاندان رستم کو تباہ کیا ۔ بقول شعرا اژدہا اس کو نگل گیا ۔ فریدون ایران کا قدیم بادشاہ ۔ کاوہ آہنگر کی اعانت سے ضحاک بادشاہ ظالم پر فتح پائی اور

بادشاہ ہوا۔ اس کے تین بیٹے سلم و تور و ایرج آپس میں لڑکے مر گئے تو اس کا پوتا منوچہر بادشاہ ہوا —
کیخسرو ایران کے کیانی خاندان کا تیسرا بادشاہ اور کیکاؤس کا پوتا تھا۔ نوے سال عمر پائی اور ساٹھ
سال سلطنت کی۔

ان شاہان ایران کو میرے سلیمان جاہ ظفر شاہ سے کیا نسبت۔ بہادر شاہ ان سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔
خصوصاً جبکہ بہادر شاہ مسلمان ہیں اور یہ لوگ کافر تھے۔

---

غزل ۵ اشعار ۸

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

یہ مطلع پست خیالی اور بد مذاقی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔
کسی کے پاؤں دھو دھو کے پینا۔ اس سے ارادت رکھنا اور محبت کرنا۔ سیمتن۔ اسمائے صفتی محبوب
میں سے ہے۔ چاند کا ایسا بدن والا یعنی گورا چٹا۔
جب میں چاہتا ہوں کہ اس کے پاؤں دھو کے پیوں وہ مارے ضد کے لگن سے باہر اپنے پاؤں کھینچ لیتا
ہے اور اپنے پاؤں کے دھوون پینے دینے پر بھی راضی نہیں۔
پاؤں بتقدیم نون بر واؤ — یہی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ اور پاووں جمع پاؤں کی ہے۔ اصل میں
(پاووں تھا) ایک واؤ کو (ہمزہ) سے بدل دیا۔ جیسے داوود کو داؤد۔ اردو میں (وں) بھی علامت
جمع ہے۔

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

سادگی۔ بھولا پن۔ بے وقوفی۔ جب خسرو نے دیکھا کر فرہاد کوہ بیستون کو کھود لے گا۔ اور مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا
پڑے گا۔ تو اس نے ایک کٹنی کو بلایا۔ اور فرہاد کے مرجانے کی اس سے تدبیر چاہی کیوں کہ عادل تھا اور قتل کرا دینا
نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑھیا پہاڑ پر گئی۔ اور فرہاد سے کچھ فاصلہ پر بیٹھ کے چیخیں مار مار کے رونا شروع کیا۔ فرہاد چوں کہ
درد رسیدہ تھا اس نے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں شیریں کی دایہ ہوں اور شیریں مر گئی یہ سُن کر
فرہاد نے وہ تیشہ اپنے سر پر مار لیا اور مر گیا۔ ہیہات۔ عربی میں اسم فعل ہے مترادف شتان اے بَعُدَ۔ فارسی
اور اردو میں بمعنی افسوس مستعمل ہے۔ کسی کے پاؤں پڑنا اس سے التجا کرنا۔ کسی کی خوشامد کرنا منت اور

سماجت کرنا۔ اس کی عظمت کرنا اور اپنے کو حقیر جتانا۔ جناب نظم فرماتے ہیں۔ کسی کی مصیبت پر جوش محبت میں کہتے ہیں کہ ہے ہے میں اس کے پاؤں پڑوں۔ اور یہ بڑے محاورہ کا لفظ ہے۔ اس غزل میں صرف یہی شعر غنیمت ہے آگے خیر سلا۔ ممکن ہے کہ ردیف کی دشواری سے ہو۔

فرہاد نے اپنے بھولے پن سے اس عیارہ کے مکرو فریب پر اپنی جان دے دی۔ وہ پاؤں پڑنے کے قابل تھا۔ اس مکارہ کے پاؤں کیوں نہ ٹوٹ گئے۔ تاکہ اس تک نہ پہنچتی اور نہ اس کے قریب جاتی اور نہ اس کے چرتر سے فرہاد اپنی جان دیتا۔ وہ عاشق صادق تھا۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اس کی سزا ملی ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

میرے قلم سے سزا ملی نکل گیا۔ سب نسخوں میں (ہے یہ سزا) لکھا ہے۔ (یہ ہے سزا) اس سے اچھا تھا۔
راہزن سے مراد یار غارت گر و ستم گار۔

عشق سے ہم بہت گریز کیا کرتے تھے مگر دل نے مجبور کر کے اس غارت گر دین و دنیا کے عشق میں پھنسا دیا کہ اب ہم کو اسی راہزن کے پاؤں دبانا پڑتے ہیں۔ یہ ہم کو اس گریز کی سزا مل رہی ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس شعر کے جو معنی حقیقی ہیں وہ تو شاعر کا کلام نہیں معلوم ہوتے ہاں اگر یہ سب باتیں استعارہ سمجھو تو وہ بھی صاف نہیں۔ جناب اسی خلاف عادت اس کی تائید کرتے ہیں۔ اور معنی وہی لکھے جو الفاظ کے وضعی ہیں۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس شعر اور اس سے پہلے شعر میں قافیہ بندی کے سوا اور کچھ نہیں۔

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

خستہ۔ تھکا ماندہ۔ زخمی۔

درد عشق کے علاج کی تلاش میں جو میں دور دور مارا مارا پھرا ہوں تو جسم سے بھی زیادہ میرے پاؤں زخمی ہیں۔ مگر درد عشق کا علاج ہاتھ نہ لگا کیوں کہ وہ تو مرض لاعلاج ہے۔

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

پاؤں ہلنا۔ فکر مند آدمی پاؤں کو جنبش دیتا رہتا ہے۔ یا آج کل کے نوجوان پاؤں ہلاتے رہتے ہیں۔
مجھے صحرا نوردی کا کس حد کا ذوق ہے کہ مرنے کے بعد بھی کفن کے اندر میرے پاؤں ہلتے رہتے ہیں۔ تصنع غیر دلچسپ

یے سوا اس شعر میں اور کیا ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں۔ خود بخود پاؤں کا ہلنا ایک امر فطری ہے۔ اور اس بات کو مصنف نے سب سے پہلے نظم کیا ہے۔ بجائے ذوق لفظ فکر کچھ زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ مرنے کے بعد نہ ذوق ہوتا ہے اور نہ فکر۔ لیکن حالت فکر میں پاؤں ہلتے یا ہلاتے ہیں۔

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف      اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں

اس بہار میں جوش گل اس قدر ہے کہ ہر طرف پرندوں کے پاؤں ادھر سے اڑنے میں ان کے دام محبت میں پھنستے ہیں اور یہاں سے آگے اُڑ کے جانے کو ان کا دل نہیں چاہتا۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں      دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رات کو وہ کسی کے خواب میں گیا ہوگا جبھی تو آج اس بت نازک بدن کے پاؤں دکھتے ہیں۔ غلو کے ساتھ نزاکت کا بیان ہے۔

غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو      پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

خسرو کی مناسبت سے لفظ شیریں سخن صرف کیا۔ کلام۔ مزہ اور سخن بھی الفاظ متناسب ہیں۔ خسرو شیریں سخن۔ بہادر شاہ۔

---

غزل ۶      اشعار ۲

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار      یعنی یہ میرے آہ کی تاثیر سے نہ ہو      ۳۳غ

یعنی یہ بھی ویسا ہی ہے جو مجھے پریشان کیا کرتا ہے۔ اس کی جگہ میں (کہیں) لانا چاہتا تھا مگر اس کی گنجائش نہ تھی۔ لہذا (یارب) تجویز کرتا ہوں۔ اگرچہ اب معنی اور ہو جائیں گے۔ جناب نظم فرماتے ہیں معشوق کا دسواسی اور خفقانی ہونا بھی ایک ادائے معشوقانہ ہے ؎

اے کاش میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

وہاں ان کو ہول دل اور خفقان ہے۔ اور یہاں میں اپنی جگہ پر شرمندہ اور خجل ہو رہا ہوں کہ کہیں میری تاثیر

آہ سے تو انہیں ہول دل نہیں ہو رہی۔ ہے۔

(یارب) ہے دوسرے مصرع کے معنی۔ خدا کرے کہ ان کو ہول دل میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو۔ کیوں کہ میں ان کے مظالم اٹھاتا ہوں۔ مگر اپنی طرف سے ان کی تکلیف کا ہرگز خواہاں نہیں۔

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوق ستم تو دیکھ　　　آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

اے ظالم اپنے ذوق ستم کو تو دیکھ کہ تو اپنی صورت نہیں دیکھتا اور اپنی زینت نہیں کرتا جب تک کہ تیرے سامنے چشم مقتول آئینہ نہ ہو۔ (سے) "من" بیانیہ کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں اس محل پر کا بولتے ہیں۔

---

غزل ۷　　　اشعار ۱۱

۱ــ　وا ں پہنچ کر جو غش آتا پے ہم ہے ہم کو　　　صدرہ آہنگ زمین بوس قدم ہے ہم کو

پے ہم اگرچہ اصلاً یہ لفظ (پے) کی اضافت کے ساتھ ہے لیکن اس کا استعمال اب بلا اضافت ہی ہے۔ صدرہ سو بار آہنگ ارادہ وقصد۔

کوئے یار میں پہنچ کر جو ہم کو متواتر غش آجاتا ہے تو اس کی علت یہی ہے کہ ہم اپنے قدموں کی بار بار پابوسی کریں کہ وہ ہم کو کوئے یار تک لائے۔ یا۔ معشوق کے نشان قدم کو بوسہ دینا مقصود رہے۔ ان تک تو رسائی ممکن نہیں جو ان کی پابوسی کریں۔

دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے　　　کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو

ہم یکدگر۔ ایک دوسرے کو۔

ہم کو اور ہمارے دل کو باہم ایک دوسرے کو کس قدر مزہ گرفتاری میں ملتا ہے کہ ہم دل کو اور دل ہم کو ہمیشہ پابند وفاداری رکھتا ہے۔

ضعف سے نقش پے مور ہے طوق گردن　　　تیرے کوچے سے کہاں طاقت رم ہے ہم کو

رم۔ گریز۔ مفر۔

جس ضعیف کے لیے نقش پائے مور طوق گردن کا کام کرتا ہو اس میں قوت تیری گلی سے بھاگ جانے کی

کہاں - حاصل یہ ہے کہ ہم تمہارے کوچہ سے ہٹ نہیں سکتے۔

جان کر کیجیے تغافل تو کچھ امید بھی ہو　　　یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

اپنا جان کر اگر غفلت سے کام لو تو آیندہ عنایت کی بھی امید ہو سکتی ہے۔ لیکن ناآشناؤں کی طرح نظر بے التفاتی سے کبھی میری طرف دیکھ لینا یہ تو میرے لیئے زہر قاتل کا کام کرتا ہے

رشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزیں　　　نالۂ مرغ سحر تیغ دو دم ہے ہم کو

دو دم۔ دوہری باڑھ والی ایک باڑھ تو رشک کی اور دوسری نالہ نے دردگی یا خود تلوار کی۔ ایک تو مرغان سحری کے نالہائے دردناک اور پر تاثیر دوسرے ان کا ہمارے ساتھ ہم رنگ ہوتے کا رشک ہمارے لیئے تیغ دو دم کا کام کر رہا ہے اور مجھ کو بے موت مارے ڈالتا ہے، کیوں کہ نالہ ہائے دردناک اور پر تاثیر میں ہم اپنے آپ کو یکتا سمجھے ہوئے تھے۔

سر اُڑانے کے جو وعدہ کو مکرر چاہا　　　ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

مکرر = دوبارہ - ترے سر کی قسم ہے یعنی تیرے سر نہ اوڑانے کی ہم نے قسم کھائی ہے۔

اپنی تکلیف رساں زندگی سے عاجز ہو کر پہلے ہم نے ان سے قتل کا وعدہ ہی لیا تھا اس وقت بھی انکار کر دیا تھا۔ اب دوبارہ تجدید وعدہ چاہی تو مسکرا کے بولے کہ ہم کو تو تیرے سر کی قسم ہے یعنی سر نہ اُڑانے کی ہمیں قسم ہے۔ وہ جان دے کے بھی تکلیف سے میرا چھٹکارا نہیں چاہتے۔

ہنس کے بولے بہت بلیغ جملہ ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ (ترے سر کی قسم ہے ہم کو) اس جملہ کو میں نہ سمجھ سکا۔ شارحین نے بھی میرے سمجھنے کے موافق کچھ نہ لکھا۔ جناب نظم دوسرے معنی یہ تحریر فرماتے ہیں کہ تیرا سر اُڑا دیں گے۔ آسی انھیں کے تتبع میں دونوں معانی لکھتے ہیں مگر ان کا حوالہ نہیں دیتے۔ جناب حسرت صرف ایک معنی یعنی تیرا سر ضرور اُڑا دیں گے۔ لکھتے ہیں اور بس اور مجھے دونوں معنوں سے تسلی نہ ہوئی۔ پھر کیا کرتا۔ نقل پر اکتفا کی۔

جناب بیخود دہلوی تو ناقل معانی جناب نظم ہیں ہی وہ بھی اور احسان دانش بھی یہی دونوں معانی جناب نظم کے لکھے ہوئے نقل کرتے ہیں۔

(ہنس کے بولے) یعنی میرا مطلب سمجھ گئے کہ اس طرح یہ مصیبت سے نجات چاہتا ہے۔ تو یہ سمجھ کر

ہنسے اور کہا کہ ہم نے تو تیرے سر نہ اڑانے کی قسم کھائی ہے تو قسم توڑ کے تیرا سر کیسے اڑائیں۔ غریق کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہوں مگر ساحل مراد ہاتھ نہیں آتا۔

دل کے خون کرنے کی کیا وجہ۔ ولیکن ناچار  پاس بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو

دل کے خون کرنے کی کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ مگر فراق ہوا اور آنکھوں سے اشک خونیں نہ بہیں تو آنکھیں بے رونق رہتی ہیں۔ اس لیئے ان کو بارونق بنانے کے لیئے مجبوراً ہم کو خون کے آنسو بہانا پڑتے ہیں۔ چوں کہ فراق میں وہ ہمارا ساتھ دیتی ہیں کیوں کہ رونے سے دل کی بھڑاس نکلتی ہے۔ اس لیئے ہم کو بھی اُن کی پاسداری اہم ہے اور انھیں بے رونق نہیں چاہتے ہیں۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو  ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

تم ایسے نازک ہو کہ ہماری خموشی کو بھی فریاد و فغان سمجھتے ہو۔ اور ہم ایسے عاجز ہیں کہ تمہاری غفلت شعاری بھی ہمارے لیئے ظلم و ستم ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی  ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

لکھنؤ دراصل لکھمنو۔ لکشمنؤ۔ لچھنؤ۔ راجہ دسرت کے بیٹے لچھمن برادر رام کو ان کے باپ نے لکھنؤ لچھمن کی جاگیر میں دیا تھا ان کی نسبت سے یہ نام ہوا۔ کثرت استعمال سے ایک میم کم ہو کر لکھنو رہ گیا۔ یعنی ویسا ہی ہے جو مجھے عاجز کرتا ہے۔ چوں کہ متعدد جگہ استعمال کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے وقت میں ایسے محل پر یوں ہی بولتے تھے۔ آج کل کے موافق (ہم پر) یہاں موزوں ہے۔ یا (کچھ بھی)۔

غالب نے کوئی لمبا سفر نہیں کیا۔ صرف پنشن کھلوانے کی غرض سے کلکتہ گئے تھے اور اسی دوران سفر میں بہ زمانہ نصیرالدین حیدر بادشاہ اہل لکھنؤ کے اشتیاق کی وجہ سے لکھنؤ اترے تھے۔

غالب کہتے ہیں کہ ہم لکھنؤ کیوں آئے اس کا سبب خود ہم کو معلوم نہیں ہوتا اگر یہ کہیں کہ بطور سیر و تفریح ہم گئے تو سیر و تماشا کی ہم کو ہوس نہیں۔

پانچ ہزار روپے بادشاہ نے ان کو دلوائے تھے درمیانی لوگ تین ہزار خود کھا گئے۔ غالب تک دلی میں دو ہی ہزار پہنچے۔

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر　　　عزم سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

چوں کہ یہ شعر بالائے قطعہ بند ہے اس لیئے اس میں علّت سفر شوق کو بتا رہے ہیں۔
ہمارے سلسلۂ شوق سفر اس لکھنؤ پر ختم نہیں ہے بلکہ ارادہ زیارت مرقد جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالب اور حج مکہ معظمہ کا بھی ہے (عزم ہے ہم کو) یہ کون سی آرزو ہوئی۔ ہمارا عزم ہے۔

لیئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ　　　جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

ایرانی کبھی حرف اول لفظ کو اس لفظ کی طرف مضاف کر دیتے ہیں مگر مقصود فی البیان مضاف الیہ ہی ہوا کرتا ہے۔ جیسے شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

کہ چو سین سخن دراز تراست

ظاہر ہے کہ طول و وسعت سخن میں ہے نہ سین سخن میں۔
ہم اجرا پنشن کی امید میں کلکتہ جا رہے ہیں۔ راستہ میں جو ہم لکھنؤ میں اُتر پڑے تو ہم کو نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ سے کرم دبخشش کی بھی امید ہے۔ یا کلکتہ کے انگریزوں سے۔

---

غزل ۸　　　اشعار ۷

داغ　تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو　　　مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

تم کو جو غیر سے رسم و راہ ہے اسے تم جانو اور غیر۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو یہ کون سا گناہ ہو گا۔ مجھ سے ترک ملاقات کے کیا معنی۔

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے　　　قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

روز حشر کی بازپرس سے تم بھی بچ نہیں سکتے بالفرض اگر ہمارا قاتل رقیب ہے تو تم گواہی میں پکڑے جاؤ گے۔ نہ تو چھوٹ جاؤ یہ ہو نہیں سکتا۔ اگر الزام قتل سے بچ بھی جاؤ۔

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں　　　مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

وہ اضمار قبل از ذکر ہے۔ اور مرجع مہر و ماہ ہے۔ اردو اور فارسی میں جائز ہے۔
یہ ہم مانتے ہیں کہ تم بشر سے بھی افضل بلکہ مہر و ماہ اور ملک ہو۔ مگر کیا مہر و ماہ بے گناہوں کو مارنے والے اور حق کے نہ پہچاننے والے واقع ہوئے ہیں۔ جیسے کہ تم ہو۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار  مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

معشوق اگر وسواسی اور خفقانی ہوتا ہے تو عاشق وہمی اور شکی۔ کوئی تار نقاب محبوب میں ابھرا ہوا دیکھ کر عاشق کو شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تار نگاہ رقیب کا تو نہیں ہے جو اسے تاک رہا ہو اور یہ تاکنا کسی غیر کا عاشق کو گوارا کب ہو سکتا ہے۔ اور یہ خیال میرے لیئے جانکاہ ہے۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید  مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

خانقاہ مرکب از خان بمعنی شاہ۔ و قاہ معرب گاہ بمعنی جا۔ بادشاہ کی جگہ۔ فقرا کی عظمت کی وجہ سے ان کے مزار کو کہتے ہیں۔ مسجد۔ جائے سجدہ۔ مدرسہ۔ بسکون ثانی جائے درس و تدریس۔
مے کدہ جس سے زندگی کا مزہ تھا جب وہی چھٹ گیا تو اب مسجد اور مدرسہ اور خانقاہ سب ہمارے لیئے برابر ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست  لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

جلوہ گاہ لکھنؤ میں مؤنث ہے۔
بہشت کی جو تعریف کی جاتی ہے اس کے صحیح ہونے میں ہمیں شک و شبہ نہیں لیکن خدا کرے کہ وہ تری جلوہ گاہ بھی ہو۔ اگر تری جلوہ گاہ نہ ہوئی تو پھر کوئی چیز نہیں۔

غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں  دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

غالب اور دوسرے لوگ بھی اگر مر جائیں تو کوئی نقصان کی بات نہیں۔ اے اللہ دنیا ہو اور بہادر شاہ ہوں۔ یعنی قیامت تک زندہ رہیں کیوں کہ ان کے نہ ہونے سے بڑا نقصان ہے۔ ان کا ایسا سخی دوسرا پھر کہاں ہاتھ لگے گا (غالب نہ ہو تو ذرا بھی ضرر نہیں)۔

---

غزل ۹ اشعار ۱۰

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو ہیخ

کیا ہوگی جگہ کیوں کر ہو فرما رہے ہیں۔ اور (کس طرح ہو) کے معنی بھی چسپاں ہیں۔
پہلے ہم تمنا رکھتے تھے کہ کوئی صورت ایسی نکل آئے یا کوئی ایسا وسیلہ مل جائے کہ ہمارے اور ان کے دو دو باتیں ہو جائیں۔ ان سے پہلے امید تھی کہ مجھ پر رحم کریں گے۔ لیکن اب ان کی غفلت شعاری سے یہ امید بھی باقی نہ رہی بالفرض اگر ہم کہہ بھی گذرے اور انھوں نے کچھ نہ کیا تو پھر بتا ڈر اس وقت کیا ہوگا۔
جناب نظم کا ارشاد ہے کہ اب وہ دن نہیں رہے جو یہ کہا کرتے تھے دیکھیں ان سے گفتگو ہو تو کیا ہو۔ کہہ سن چکے اور کچھ نہ ہوا۔ اب پھر کہیں تو کیا ہو۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے جب کہے سے کچھ نہ ہوا۔ تو پھر بتا ڈر اب کیا ہو اور اب کیا کریں۔
جناب حسرت فرماتے ہیں کہ "کہے سے" یعنی گفتگو ہونے پر بھی کچھ نہ ہوا۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

ذہن۔ قوت نفس مشتمل بحواس خمسہ باطنی وظاہری کہ آمادہ برائے اکتساب علوم ہے۔
اگر وصال نہ ہو تو کہاں جائیں۔ کیا کریں۔ کیا مر جائیں۔ اور اگر ہو تو اس کے اسباب و وسائل و تدابیر کیا ہیں ہمارے نزدیک اسی ادھیڑبن میں مبتلا رہنے کا نام وصال ہے۔ اور وصال میسر ہونا محض خیال ہے۔

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو

کشمکش اور گومگو دونوں امر و نہی کی ترکیب سے اسم بن گئے ہیں (کھینچا تانی۔ چپ چاپ) وکشاکش و غم و الم و خوش و ناخوش اور بمعنی مع۔ ساتھ۔
کشمکش کے ساتھ ہم کو پاس ادب بھی ہے پھر کیا کریں۔ حیا کے ساتھ وہ چپکی بھی تانے ہے ہیں اس لیئے کچھ بنائے نہیں بنتی۔ عجب مخمصہ میں جان ہے۔ اپنے ادب اور ان کی حیا کی وجہ سے گستاخی اور ہاتھا پائی بھی نہیں کر سکتے۔

تمہیں کہو کہ گذارا صنم پرستوں کا بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

تمہاری ایسی خصلت و عادت بے وفائی اور جفائی دوسرے معشوقوں کی بھی ہو تو پھر تمہیں بتاؤ کہ عشق بازوں کا گذارا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ وہ تو بے موت مر جائیں گے۔

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ — جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

تم اگر آئینہ میں اپنا عکس دیکھتے ہو تو زچ بچ (جز بز) ہوتے ہو باوجودیکہ وہ تمہارا ہی عکس ہے اور اس میں کوئی ناز و ادا ذاتی نہیں۔ اگر شہر میں تمہارے ایسے دو ایک حسین پیدا ہو جائیں تو پھر تم پر کیا گذرے گی اور کیسی بنے گی۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

روز سیاہ۔ روز بد۔ مگر مفہوم شعر منحصر لفظ سیاہ پر ہے۔

میرا ایسا روز سیاہ جس کے نصیب میں ہو وہ اپنے روز سیاہ کے مقابلہ میں رات کو دن نہ کہے تو کیا کرے کیوں کہ میرا روز سیاہ وہ ظلمت انگیں ہے کہ رات اس کے سامنے اندھیری ہونے پر بھی مرتبہ روز روشن کا رکھتی ہے۔ لہٰذا رات کو دن اور دن کو رات کہے بغیر چارہ نہیں۔

ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر — ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

جب وہ ہماری بات ہی نہیں پوچھتے ہیں تو پھر ہم کو ان سے کسی قسم کی امید اور ان کو ہمارے عشق صادق اور وفاداری کی قدر کیوں کر ہو۔

جناب نظم (وہ) کو دو بنانے میں کچھ افادہ فرماتے ہیں۔ جو مختصراً یہ ہے وہ کی ہائے مختفی محض برائے اظہار حرکت ہے (جیسے "کہ" وغیرہ میں) اسے حذف کر کے اشباع حرکت ضمہ سے دوسرا واو پیدا کیا تو دو ہو گیا۔ اس مختفی کا قافیہ الفاظ ذوات الالف کے ساتھ اردو میں جائز ہے۔ جیسے دریا کا قافیہ لالا (لالہ) اور زمانا (زمانہ) کا قافیہ آنا وغیرہ درست ہے۔

اس کے بعد میر کا یہ شعر ؎

کون کہتا ہے تجھے یاں یہ نہ کر تو وہ کر — پر ہو سکے تو پیارے دل میں بھی ٹک جگہ کر

لکھ کر فرماتے ہیں کہ میر علیہ الرحمہ کی زبان پر (وہ) بفتح واؤ (دو بہ ہا۔ مظہرہ) تھا جب تو (جگہ) کے ساتھ قافیہ لائے۔

جناب آسی نے بیڑا اٹھایا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کی تغلیط کریں اپنی شرح میں ان کی شرح پر متعدد جگہ منہ کی آئے ہیں اور منھ کی کھائی ہے۔

غالب کے (وو) کی تاویل جو جناب نظم نے لکھی ہے نقل کرتے ہیں مگر حوالہ ان کا نہیں دیتے۔ میر کے (وو) بالفتح کے لیئے یوں رقم طراز ہیں۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ میر صاحب کی زبان پر (وہ) بفتح نہ تھا۔ بالضم تھا۔ اور (ہ) ان کے یہاں بھی مکتوبی تھی ملفوظی نہ تھی۔ بلکہ جگہ کا کاف فارسی انھوں نے مضموم کر کے وہی قاعدۂ اشباع جاری رکھا۔ اور یہ لفظ (جگہ) بضم گاف نواح دہلی میں اب تک بولا جاتا ہے۔

جس طرح اوٹ پٹانگ جواب اس لفظ کا دے رہے ہیں اسی طرح اشعار غالب کے مطالب بھی لکھا کرتے ہیں جب جناب نظم کے معانی سے کچھ الگ کہنا چاہتے ہیں۔

اچھا نواح دہلی میں پہلے بھی اور اب بھی بضم ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ سند کے ساتھ یہ بتانا چاہیئے کہ دہلی میں اب بھی یا پہلے (جگہ) بضم گاف بولتے تھے یا بولتے ہیں۔ میر صاحب تو نواح دہلی کے نہیں۔ کسب زبان کا زمانہ آگرہ میں گذرا۔ پھر دہلی میں رہے۔ بعدہ ساری عمر لکھنو میں رہے۔

جو شخص اشباع کے معنی نہ جانتا ہو وہ جرأت ایک علامہ کے اعتراض اٹھانے میں سعی لاطائل کرے۔ اشباع کسی حرکت کو اتنا سیر پڑھنے کا نام ہے کہ اس حرکت کے اخوات والا حرف پیدا ہو جائے۔ ضمہ کے اشباع سے واو پیدا ہوتا ہے۔ ان کے بتانے کے موافق (جگہُ) سے جگوہ ہونا چاہیے۔ (جگہ) کی (ہ) مظہرہ ہے۔ کسی نے اسے مختفی نہیں مانا۔ ان کے کہنے کے موافق اگر (جگہ) کی (ہ) کو بھی مختفی مان لیں تو (وو) کی طرح جگو ہوگا۔ لہذا لازم ہوا کہ کسی وقت میں جگہ کا جگو بولنا ثابت کیا جائے۔ اشباع میں حرکت کے موافق کوئی حرف علت پیدا کرتے ہیں۔ کیا کسی حرف کو اصل لفظ سے حذف بھی کر دیتے ہیں۔ (ہ) چاہے مظہرہ ہو یا مختفی یہ کہاں گئی۔ غرض کہ اس لفظ میں اشباع کو کوئی دخل نہیں۔ اگر یہی کہنا تھا تو کہتے کہ (ہ) واو سے بدل گئی۔

بڑے سے بڑا آدمی بشر ہے۔ ہر شخص سے امکان غلطی کا ہے۔ بلکہ کون ایسی تصنیف ہے جو غلطی سے مبرا ہے۔ مگر غلطی۔ سہو الخیال۔ مسامحہ۔ فروگذاشت کسی کی دکھاؤ تو اسے واقعی ہونا چاہیئے نہ ان کی طرح سے اوٹ پٹانگ۔

کون ایسا شارح کلام غالب ہے جو شرح جناب نظم سے مدد نہیں لیتا ہے۔ بعض نے تو انھیں کے مطالب الفاظ بدل کے لکھ دیئے۔

یوپی کے پورون اور مواضعات میں (وہ) بفتح واو اور جگہ بتشدید گاف مع الفتح اب بھی نہیں بولتے ہیں۔

جناب میر پور وے یا موضع کے نہیں۔ ان کی نسبت یہ کہیں گے کہ (وہ) بفتح میں انھوں نے تصرف کر کے واو کو مفتوح کیا اور اس کی (ہ) کو مظہرہ بنایا۔ لیکن ان کا یہ تصرف کرنا اور جگہ کے قافیہ میں لانا قابل تتبع نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ اسے عمومیت کا درجہ حاصل نہ ہو جائے۔ ورنہ یہ تصرف انھیں تک محدود رہے گا اور قابل اعتراض ہو گا۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گمان تسلّی کا　　　نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو

ہمارا یہ گمان غلط نہ تھا کہ ان کے خط کے آنے سے ہمیں گو نہ تسلی ہو گی مگر چشم دیدار طلب جب محض خط پر مطمئن نہیں تو پھر کیا کیا جائے۔

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار　　　یہ نیش ہو رگ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو

نثر اس شعر کی یوں ہے کہ اس کی مژہ کو دیکھ کر یہ نشتر رگ جان میں اتر جائے تو پھر تمہیں بتاؤ کہ مجھ کو قرار کیوں کر آئے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس شعر میں بے طرح تعقید ہے۔ (کہ مجھ کو قرار) کے اپنے محل پر نہ ہونے سے بری تعقید پیدا ہو گئی ہے۔

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقول حضور　　　فراق یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

اے غالب میں کوئی دیوانہ نہیں ہوں۔ لیکن بقول حضور (بہادر شاہ) فرقت محبوب میں مجھے تسکین ہو تو کیسے ہو۔ مصرع ثانی بہادر شاہ کا ہے۔

فارسی میں یائے معروف کا قافیہ یائے مجہول سے اسی طرح واؤ معروف کا واؤ مجہول سے کرتے ہیں، کیوں کہ وہ اپنے لہجہ میں ان دونوں کو معروف ہی بولتے ہیں اس لیئے فارسی میں یہ قوافی صحیح ہیں۔ مگر اُردو میں معروف و مجہول کا تلفظ الگ الگ ہے۔ اس لیئے اُردو میں ناگوار سمع ہوتے ہیں۔ غالب نے فارسی کا تتبع اُردو میں بھی کیا۔ یا فارسی کے سب قوافی کو بضمہ مجہول مانو۔

---

غزل ۱۰　　　اشعار ۱۱

ہیغ ۱۱ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو　　　نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو

نوا سنج = نالہ کرنے والا کیوں کہ نوا بمعنی نالہ بھی ہے۔ نوا سنج فغان تجرید اً پورے کلمہ کے معنی نالہ وفریاد کرنے والا۔

جب کسی کو دل دے کے اس کے عاشق ہو گئے تو نالہ وفریاد کے کیا معنی۔ عشق میں، مصائب وآلام ہی اٹھانا پڑتے ہیں۔ جب دل ہی سینہ میں نہ رہا تو زبان کیوں ہو۔ خموشی کے ساتھ تکالیف برداشت کرنا چاہئیں۔ عشق ہی کیوں کیا۔ جب کیا ہے تو تحمل اور صبر سے کام لو۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

سبک سر = سفیہ وفرومایہ۔ خوار وذلیل۔ بے قرار۔ بے وقار۔ جلد باز۔ سرگراں = ناراض اور ناخوش۔ (کیا) کی جگہ (کیوں) زیادہ بول چال میں ہے۔

خفا رہنا۔ مہربانی سے نہ پیش آنا ان کی عادت ہے اس سے وہ کبھی نہیں ہٹتے تو پھر ہم بھی اپنے صبر وتحمل کی وضع کو کیوں چھوڑیں۔ اور بے وقوف بن کے کیوں پوچھیں کہ تم ہم سے ناخوش کیوں ہو۔

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

میرے ہم دم وغم خوار نے مجھے رسوا اور بدنام کر دیا غم خوار کی اس محبت اور شفقت کو آگ لگ جائے کیوں کہ میری حالت زار کو سن کر وہ اس قدر مضطرب الحال ہوا کہ میرا راز عشق افشا ہو گیا اور میری رسوائی ہوئی۔ جو میرا حال غم سننے کی تاب نہیں رکھتا ہے اس کو میرا ہم راز بھی نہ ہونا چاہیئے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس شعر میں مصنف کی انشا پردازی داد طلب ہے کہ کتنا جلد خبر سے انشا کی طرف تجاوز کیا ہے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

ہماری وفاداری اور عشق کو تم مانتے نہیں پھر تو ہمارا عشق کرنا محض سر پھوڑنا ہے۔ سر پھوڑنے کے لیے اے سخت دل وظالم دنیا میں ہزاروں پتھر اور دیواریں ہیں ان سے سر پھوڑ لیں گے تمہارے آستانہ در کی خصوصیت کیا رہی۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اے میرے ہمدم وہم جنس چمن میں کل بجلی گرنے کا واقعہ جو پیش آیا اس کے بیان کرنے میں پس وپیش کرنے کی

ضرورت نہیں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ بجلی ہمارے ہی آشیانہ پر گری ہو۔ اور آشیانے بھی تو چمن میں ہیں۔ کس طرح سے اپنے دل کو تسکین دے رہا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس قدر معانی ان دونوں مصرعوں میں سما گئے ہیں کہ اس کی تفصیل لطف سے خالی نہیں۔ تفصیل بیان کرنے کے بعد ارشاد کرتے ہیں کہ علاوہ اس کثرت معانی کے اس مضمون نے جو دوسرے مصرعے میں ہے تمام واقعہ کو کیا دردناک کر دیا ہے۔ اور آداب کاتب کے دو جلیل الشان اصولوں کو کیا خوب نباہا ہے۔ ایک تو یہ کہ خیر الکلام ما قل و دل۔ دوسرے الشعر کلام ینقبض بہ النفس او تنبسط یہاں انقباض خاطر کا اثر پیدا ہوا ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں۔ پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

یہ کہہ ..... نہیں ہیں جناب نظم و جناب حسرت دونوں استفہام انکاری فرماتے ہیں یعنی کیا یہ کہہ سکتے کہ ہم دل میں تیرے نہیں ہیں یعنی ہیں۔ شاید اس طرح اس مصرع کا کچھ فورس (زور) بڑھ جائے ؎

یہ کہہ سکتے ہو کب دل میں نہیں ہو۔ یہ تو بتلا دو کہ جب دل میں تمہیں تم ہو پھر آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

یہ تو تم کہہ ہی نہیں سکتے کہ تم میرے دل میں نہیں ہو۔ جب یہ ثابت ہے کہ میرے دل میں تمہیں تم ہو اور کسی دوسرے کی جگہ میرے دل میں نہیں۔ پھر میرے سامنے کیوں نہیں آتے الگ تھلگ کیوں رہتے ہو۔ جو کسی کو عزیز رکھتا ہو اس سے تو زیادہ ملا کرتے ہیں۔

غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

اپنے کو کھینچنا۔ کسی سے تنے رہنا۔ دور رہنا۔ اکڑے رہنا۔

صرف کشش قلبی کی شکایت بے جا ہے۔ اگر انصاف سے دیکھو تو قصور کس کا ہوگا تم اگر تنے اور اکڑے نہ رہو تو یہ اینچا تانی تمہارے اور جذب دل کے درمیان کیوں واقع ہو تمہارے کھینچنے ہی کی وجہ سے تو یہ کشاکش ہے۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

یہ فتنہ یعنی تمہارا دوست ہونا۔ فتنہ کے عربی میں ضلال و کفر و فضیحۃ۔ محنت۔ چتون۔ عبرۃ۔ عذاب۔ مرض معانی ہیں۔ اردو اور فارسی میں شر و فساد کے معنی میں مستعمل ہے۔

تم جس کسی کے دوست ہو جاؤ تو تمہارا دوست ہونا کسی آدمی کے تباہ اور برباد کر دینے کے لئے کیا

کم ہے جو آسمان بھی اس کے ساتھ دشمنی کرے۔ یعنی تمہاری دوستی فلک کی دشمنی سے بڑھ کے ہے۔

بول چال میں اللہ میاں پر الزام لگانے کو سوء ادب سمجھ کر برائی کی نسبت تقدیر یا فلک سے کرتے ہیں۔ جو حقیقتہً ان ڈائرکٹلی الزام اللہ میاں ہی پر ہے کیوں کہ تقدیر کس کی کی ہوئی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک ذرہ بھی بغیر حکم خدا حرکت نہیں کرتا ہے۔

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں　　　عدو کے ہو لیئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کسی کے ہو لینے سے ہو رہنا زیادہ بول چال میں ہے۔

جب تم بغیر آزمایش میرے دشمن کے دوست اور طرف دار ہو چکے تو پھر میرا امتحان لینا امتحان کا ہے کو ہوا یہ تو ستانا ہوا۔ دونوں کی جانچ کرتے تو کھرا کھوٹا معلوم ہوتا اس کے تو جانچے بغیر دوست بن بیٹھے۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی　　　بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

کہ کیوں ہو (کہ کیوں ہو) میں تنافر ہے (کہ ہو کیوں) کر دینے سے تنافر بھی دور ہو جاتا ہے اور زور (فورس) بھی بڑھ جاتا ہے۔

میں نے جو تمہاری بھلائی کے لیئے کہا کہ غیر سے ملنے میں تمہارے لیئے رسوائی ہے یہ سن کر تم نے کہا کہ رسوائی کیوں ہونے لگی۔ یہ جواب ان سے سن کر عاشق کہتا ہے مگر طعناً کہ جی آپ نے بجا فرمایا اور ٹھیک کہا بے شک رسوائی کیوں ہونے لگی۔ ہاں ذرا پھر تو کہیئے کہ رسوائی کیوں ہو عاشق نے جب دیکھا کہ یہ میری بات ماننے کے نہیں تو ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ مگر طرز ادا اس شعر کا (پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو) اظہار ناراضی و ناخوشی بلکہ خفگی کر رہا ہے۔ جیسا کہ بولتے ہیں کہ ہاں ذرا یہ بات پھر سے تو کہو تو ابھی منھ بنا دیں گے۔

جناب نظم فرماتے ہیں فقط خاطرے (کیوں ہو) اس مقام پر مصنف نے استعمال کیا ہے ورنہ ایسے مقام پر یوں کہتے ہیں کہ رسوائی کیوں ہونے لگی۔ تاہم بندش اس کی سحر کے مرتبہ تک پہنچ گئی ہے۔

بلا لحاظ معنی یہ شعر محاورہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر مصرع ثانی کے الفاظ مجھے معانی برمحل کہنے سے دقت میں ڈال رہے ہیں۔ شاید الفاظ (پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو) دوہرانے کی خواہش یہ ظاہر کرنے کو کی ہو کہ تمہارا ہی قول صحیح ہے میں غلطی پر تھا۔ اور تمہاری یہ بات مجھ کو اس قدر بھلی معلوم ہوئی کہ میں اسے دوبارہ تمہارے منھ سے سننا چاہتا ہوں۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب　　　ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اے غالب تم طعنوں سے اپنا کام ان سے نکالا چاہتے ہو وہ تمہارے بھڑوں میں آکر اور اپنی عادت قدیم بے مہری چھوڑ کر تم پر مہرباں کیوں ہونے لگے۔

بہرطور ساری غزل لاجواب ہے اور حد تعریف سے باہر۔ خصوصاً تین شعر۔

---

غزل ۱۱ اشعار ۳

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

صحبت اہل زمانہ واہل وطن سے تنگ آکر فرمار ہے ہیں کہ اہل وطن میں نہ کوئی ہمدرد نہیں سب منافق یا عدو ہیں۔ لہٰذا ان سے دور ایسی جگہ رہنا چاہیئے کہ جہاں کوئی نہ ہو کہ جس سے بات چیت کریں اور نہ ہمارا کوئی ہم زبان ہو کہ وہ ہماری اور ہم اس کی بولی سمجھ سکیں ۔۔ السلامۃ فی الواحدۃ پر عمل کریں تاکہ کسی سے رنج پہنچنے کا موقع ہی نہ ہو۔

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار کا گھر۔ منڈھی۔ جھوپڑا (کا) کو چھوڑ کے (سا) نہ معلوم کیوں اختیار کیا۔ اسی طرح بنانا کی جگہ بنایا۔ (اگر غلطی کاتب نہ ہو۔ یا میری غلط فہمی نہ ہو) دیوار کے مناسب ہمسایہ اور در کے مناسب پاسبان۔ پاسبان = پاس بمعنی (پہر) اور بان کلمہ حفاظت بمعنی دربان امرا کی ڈیوڑھی پر دربان ہی گھنٹہ بجانے کا بھی کام کرتا ہے۔ معنی لکھنے کی ضرورت نہیں۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

تیمار۔ خدمت وغم خواری ومحافظت بیمار۔ نوحہ۔ نالہ وفریاد کے ساتھ مردہ پر رونا۔ نوحہ خواں = نالہ وفغان کے ساتھ مردہ پر رونے والا۔ معنی واضح ہیں۔ کسی نسخہ میں (بیمار دار) بھی ہے۔

---

# ردیف ہاء ہوز

## غزل ۱ شعر ۱

۱ از مہر تا بذرہ دل و دل ہے آئینہ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

طوطی ۔ استعارہ اس شخص سے ہے جو ہر چیز میں اس محبوب حقیقی کی ذات کو دیکھے ۔ اور غیر از ذات واحد کسی غیر کا وجود اس کو نہ دکھائی دے ۔ از مہر تا بذرہ ۔ آفتاب سے لے کر ذرات تک ۔ دو متضاد یا متقابل کے ذکر سے کلیت مراد لیتے ہیں ۔

زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز ۔ یا کل دل ایک دوسرے کے لئے آئینہ ہیں جن میں سوائے ذات واحد کے اور کچھ نہیں دکھائی دیتا ۔ جس طرح طوطی کے سامنے داہنے ۔ بائیں پیچھے اوپر نیچے اگر آئینہ ہو تو سب میں اپنا ہی عکس اس کو دکھائی دے گا ۔ لیکن دیکھنے والے کو بصیر ہونا چاہیئے ۔

شش جہت میں شمال اور جنوب کی فارسی کمتر لوگوں کو معلوم ہوتی ہے ۔ اس لئے بصیرۃً للطلاب لکھتا ہوں (مشرق ۔ خاور) (مغرب ۔ باختر) (شمال ۔ برین) (جنوب ۔ فرودین) (فوق ۔ بالا) (تحت ۔ زیر)

---

## غزل ۲ اشعار ۲

۲ ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غم کدہ جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

خزاں ۔ بفتح نام ماہ ہشتم از سال ملکی ۔ فصل خریف ۔ برگ ریزاں (پت جھڑ) ۔ سبزہ زار ۔ گھر میں گھاس اگنا اس کی ویرانگی پر دال ہوتا ہے ۔ حاصل یہ ہوا کہ گھر ویرانہ ہو رہا ہے ۔ محض لفظ سبزہ زار سے بہار کہا ہے ۔ جس غم کدہ کی بہار ویرانگی سے ہو اس کی خزاں کی کیا حالت ہو گی ۔

ناچار بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے دشواریٔ رہِ ستم ہم رہاں نہ پوچھ

دوسرا مصرع یوں بھی ہے ؎

دشواری رہ و ستم ہمرہاں نہ پوچھ

یہی صاف ہے۔

چوں کہ رفیق راہ موجود ہیں اس لیئے اپنے آپ کو بے کس بھی نہیں کہہ سکتے۔ ساتھ ہی ان کے مظالم ناقابل برداشت ہیں اور اس پر راہ بھی دشوار گذار۔ مجبوراً بے کسی کی حسرت ہی کرنا پڑتی ہے کیوں کہ ان سے یعنی اہل دنیا سے علیحدگی محال ہے۔ حالاں کہ ان کی رفاقت سے تنہائی اچھی ہے۔

---

# ردیف یار تحتانی

غزل ۱ — اشعار ۴

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے — طاقت کہاں جو دید کا احساں اُٹھائیے

مژگان اُٹھانا قافیہ کی مجبوری سے کہا۔ ورنہ آنکھ اُٹھانا محاورہ ہے یا نظر اُٹھانا۔

ہم تو پابند عشق ہو کر دُنیا کے لذائذ سے بیزار ہیں۔ حالاں کہ جدھر آنکھ اُٹھا کے دیکھو سیکڑوں جلوے پیش نظر ہوتے ہیں۔ مگر ان کے دیکھنے سے جو حظ و تفریح ہوگی اس کا احسان اٹھانے کی ہم میں طاقت کہاں عشق کی ناکامیوں نے تو افسردہ دل کر دیا۔

ہے سنگ پر برات معاش جنون عشق — یعنی ہنوز منت طفلاں اٹھائیے

معاش۔ جس چیز سے زندگی ہو جیسے کھانے پینے کی چیزیں — یہ یعنی بھی وہی ہے جو مجھے پریشان کرتا ہے۔
پھر کس طرح نہ منت طفلاں اٹھائیے

برات۔ پروانہ۔ چک۔ ہنڈی جس کے وسیلے سے روپیہ خزانہ سے وصول کریں۔

جنون عشق کی معیشت کا پروانہ سنگ پر منحصر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کی سنگ باری کا احسان اٹھایا کریں کیوں کہ بحالت جنون اس کے بغیر زندگی کیسے ہوگی۔

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

اے مخاطب دیوار خانہ مزدور کے بار احسان سے خم ہو رہی ہے۔ اے خانماں برباد اگر گھر ڈھے گیا یا گرنے والا ہے تو اس کی درستی کے لیئے مزدور کا احسان نہ اٹھا۔ احسان اٹھانے سے تو بے گھر رہنا اچھا ہے۔ دیکھو دیوار کو کہ اب تک بار احسان مزدور نہ اٹھا سکنے سے خمیدہ ہو رہی ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں۔ دیوار کا بار احسان مزدور سے خم ہونا۔ صنعت ادعائے شاعرانہ ہے۔ یا حسن تعلیل۔

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجیئے　　　یا پردۂ تبسم پنہاں اُٹھائیے

زخم رشک کو رسوا کرنا جناب نظم و حسرت نے یہی الفاظ رکھ دیئے۔ جناب آسی کہتے ہیں کہ لوگوں سے یہ شکایت نہ کرتے پھرئے کہ یہ جلتا ہے اور رشک کرتا ہے۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ محض پردہ اور تبسم پنہاں کی رعایت سے کہا گیا ہے۔ سمجھتا تو میں بھی نہیں ہوں شاید زخم رشک بڑھانے کے معنی ہوں۔ چوں کہ باعث اس کے بڑھانے کا محبوب ہی ہو گا اس لیئے نسبت فاعلیت محبوب کی طرف کی۔ اور لفظ رسوا اس غرض سے لائے کہ بڑے اور گہرے زخم کی وجہ سے اس کی شہرت ہوگی اور لوگ رشک کثیر کی وجہ سے مجھ کو یا تم کو رسوا کریں گے۔ آسان شعر میں بھی ایک آدھا لفظ ایسا رکھ دیتے ہیں کہ میں اُلجھن میں پڑ جاتا ہوں۔ دوسروں کی سمجھ سے مجھے کیا مطلب۔ اسی طرح تبسم پنہاں بھی اُلجھن میں ڈال رہا ہے۔ نہیں معلوم ہوتا کہ کس کے ساتھ اور کیوں اُٹھائیے دور کیجیئے۔ ہٹائیے۔ چھوڑئے۔

یا تو میرے زخم رشک کو بڑھا کے مجھے رسوا نہ کیجیئے۔ اور یا غیروں کے ساتھ مسکرا مسکرا کے خلوت میں باتیں نہ کیا کیجیئے۔

---

غزل ۲　　　اشعار ۹

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے　　　بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے　　　ق۳۲

ابرو کو محراب مسجد سے اور چشم کو مے خانہ سے تشبیہ ہے۔ بھوں اُردو کا لفظ ہے اس کا کوئی مترادف اُردو میں نہیں مگر اس محل پر ڈراؤنا معلوم ہوتا ہے۔ بھویں اس کی جمع ہے اس سے ڈر نہیں لگتا۔ قبلہ حاجات لفظ مناسب مسجد ہے۔ مگر حاصل شعر کی خوبی میں نہ سمجھ سکا۔ ردیف "چاہیئے" کے معنی بھی میری سمجھ سے باہر ہیں۔ جس طرح کہ بھوں کے پاس آنکھ ہے۔ اسی طرح مسجد کے پاس بھی مے خانہ کو ہونا چاہیئے۔ ایک مصرع میں چاہیے کا محل مجھے نہیں معلوم ہوتا۔ واللہ یعلم۔ میرے ایک نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے قابل لوگ سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی نقصان ہوتا تو جناب نظم و حسرت ضرور اس طرف توجہ فرماتے۔ ان کا توجہ نہ کرنا خود دلیل عدم سقم کی ہے۔ خرابات اور حاجات میں ایطا ہے کیوں کہ

(ات) دونوں میں ردی ہے۔اور دونوں میں جمع کے لیئے ہے۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہئے

اک اور۔ مجھ پر نہیں کسی دوسرے پر۔ مکافات۔ مجازات۔ بدلہ بدی۔

معشوق کی بے اعتنائی اور بے التفاتی سے عاشق پر کیا گذرتی ہے۔اب تک اس کا علم ان کو نہ تھا۔اب وہ جو خود عاشق ہوئے ہیں اور ان کا معشوق جو بے رخی کرے گا اس سے جو تکلیف ان کو پہنچے گی وہ ان کے اس ستم کا بدلہ ہوگا جو انھوں نے مجھ پر کیئے ہیں۔ ہر عمل کا ایک بدلہ ملا کرتا ہے ان کے عمل کا انھیں یہ بدلہ ملا۔

نظیری نے ایک غزل ردیف الرا رہیں معشوق کے عاشق ہونے میں کہی ہے مگر عاشق ہو کر بھی انداز معشوقانہ اس کے نہایت خوبی کے ساتھ دکھلائے ہیں ؎

دلبردہ در دل باختن معشوق عاشق پیشہ بین بگرفتہ در انداختن بازوئے چالاکش نگر

معشوق کسی اور پر عاشق ہو گیا ہے۔لیکن معشوقی کی ادائیں اب بھی قائم ہیں اس لیئے جب اس کا دل ہاتھ سے جا تا رہا تھا جھٹ اس نے معشوق کو اپنا عاشق بنالیا۔اس مطلب کو یوں ادا کیا کہ گویا دو پہلوان لڑرہے ہیں ایک پہلوان نے گرتے گرتے داؤں کر کے اپنے حریف کو پچھاڑ لیا۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ معشوق کے عاشق ہونے کا مضمون متروکات شعرائے لکھنؤ میں سے ہے۔

دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہئے

اے فلک میرے دل حسرت پرست کی داد ہی دے کہ کسی تمنا کے پورے نہ ہونے پر بھی ترک عشق نہیں کرتا ہوں۔اگر کوئی تمنا تو پوری نہیں کرتا ہے تو داد ہی میرے اس استقلال کی دے۔آخر کچھ تو میرے مافات کا بدلہ اور صلہ ہونا چاہئے۔

تلافی مافات۔ تدارک اس امر کا جو فوت ہو گیا۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوّری تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

ہم نے مصوری اسی لئے سیکھی ہے کہ حسینوں تک رسائی ہو۔ان سے ملنے کے لئے کوئی تو وسیلہ ہونا چاہئے۔ شعر پست ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

روسیاہ ۔ گنہگار جس طرح روسپید بمعنی مغفور ۔ فابیضت وجوھہ ففی رحمۃ اللہ
شراب پینے سے مقصود نشاط و سرور حاصل کرنا نہیں ۔ کسی نہ کسی طرح سے ایک طرح کی بے خودی چاہتا ہوں تاکہ
غم غلط رہے ۔ شعر اچھا ہے اور بندش خوب صاف ہے ۔

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروغ کو　　خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہئے

نما بفتح اول زیادہ ہونا ۔ بڑھنا ۔ اصل ۔ بیخ ۔ جڑ ۔ فروع جمع فرع ۔ شاخ ۔ ڈال ۔ خاموشی ۔ فارسی والے حروف
علت (والے) کو آخری لفظ سے گرانا نہیں چاہتے ۔ واؤ مجہول کو البتہ گرا دیتے ہیں ۔ غالبؔ نے بھی واؤ اور الف کو فارسی
الفاظ کے آخر سے نہیں گرایا ۔ مگر (ی) دیوان بھر میں دو جگہ گر گئی ایک تو اسی لفظ خاموشی سے اور دوسرے اس مصرع
کے پہلے لفظ ویرانی سے ۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پابندی کرنا چاہتے ہیں ۔ مگر دو جگہ سہو الخیال ہو گیا ۔ یا یوں سمجھو کہ حضرت انیسؔ کی طرح
فارسی کی (ی) کو گرانا جائز جانتے تھے ۔
انسان پہلے چپ چاپ کچھ سوچتا ہے پھر بات کہتا یا لکھتا ہے ۔ تو کلام کی اصل خموشی ہے ۔ بات ہو یا تحریر اس کے
معانی و مفاہیم پھر بھی پوشیدہ ہی رہتے ہیں ۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

نسرین جوہی نسترن سیوتی یاسمین چنبیلی یہ سب پھول سپید رنگ کے ہوتے ہیں ۔ لالہ ۔ ایک قسم کے پوست
کا پھول ہے گہرے سرخ رنگ کا بیچ میں سیاہی ۔ گل گلاب ۔ گلابی رنگ کا ۔
یہ سب رنگ کے پھول نتائج بہار ہیں ۔ اور فصل بہار کا ثبوت دیتے ہیں مگر خود بہار نگاہوں سے پنہاں ہے ۔

سر پائے خم پہ چاہئے ہنگام بیخودی　　رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہئے

قبلہ ۔ خانہ کعبہ کیوں کہ حالت نماز میں منھ کے سامنے اسے رکھتے ہیں ۔ مناجات ۔ نجویٰ سے بنا ہے جس کے
معنی چپکے چپکے باتیں کرنے کے ہیں ۔ کانا پھوسی کرنا مستعمل بمعنی دعا ۔

بحالت بے خودی دستی سرخم مے کے پاؤں پر ہونا چاہیئے اور بروقت دعا منھ قبلہ کی طرف یا آسمان کی طرف ہونا چاہیئے۔ یعنی ہربات اپنے موقع اور محل پر اچھی ہوتی ہے۔

یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات — عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہئے

عارف ۔ خداشناس۔

پیمانۂ صفات کی گردش کے موافق خداشناس کو ہمیشہ مست مے ذات ہونا چاہیے۔

جناب نظم ان آخری چار اشعار کو قطعہ بند مان کے یوں رقم طراز ہیں کہ تمام عالم اجسام کا مبدء جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ اور اس عالم سے باہر ہے۔ جیسے درخت کی شاخیں سب جڑ سے پھوٹ نکلی ہیں لیکن جڑ چھپی ہوئی ہے۔ دوسری تمثیل یہ ہے کہ جو بات ہے وہ خاموشی ہی سے نکلی ہے۔ یعنی پہلے معنی اس کے ذہن میں آئے ہیں اس کے بعد اس سے بات پیدا ہوئی ہے۔ اور خود معنی پوشیدہ ہیں۔ تیسری تمثیل یہ ہے کہ باغ میں رنگ رنگ کے پھول ہیں اور ہر رنگ میں بہار کا اثبات ہوتا ہے اور خود بہار آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ گلہائے رنگارنگ سے یہ سبق لینا چاہیئے کہ ہر رنگ میں انسان اپنے مبدء کو ثابت کرے کبھی نشۂ مے میں سرشار رہے کبھی زاہد شب زندہ دار رہے۔ یعنی یہ سب رنگ ذات کے صفات میں سے ہیں اور ہر صفت اپنے اپنے وقت پر ظہور کرتی ہے اور وجود ذات کی گواہی دیتی ہے۔

یہ سب مشئونات مختلفہ اسی ذات کے ہیں بقول ع کل یوم ھو فی شان مگر وہ ذات واحد ایک ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

---

غزل ۳ — اشعار ۷

۳-۳ بساط عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خون وہ بھی — سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

بساط عربی میں بمعنی فرش اور زمین وسیع ہے۔ بمعنی بضاعت و سرمایہ و استطاعت و متاع اہل فارس استعمال کرتے ہیں۔

ہماری عاجزی اور تواضع کی متاع میں صرف ایک دل ہمارے پاس تھا اور وہ بھی ایک قطرۂ خون سے زیادہ نہ تھا وہ سرنگوں ہوکر اشک خونیں کی شکل میں آنکھوں سے ٹپک پڑنے پر ہر وقت آمادہ اور تیار رہتا ہے۔ مصادر فارسی منفرداً اردو میں ناگوار ہوتے ہیں مگر بہ ترکیب فارسی ناگوار نہیں ہوتے ہیں۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چند بے تکلف سے　　تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

ہم کچھ دن بتصنع اس سے آزردہ اور خفا رہے مگر دل کب مانتا تھا۔ اب ہم بلا لحاظ اور پاس صاف صاف کہتے ہیں کہ وہ بناوٹ کی آزردگی بھی ایک قسم کا انداز جنوں ہی تھا۔ معشوق سے آزردگی کے کوئی معنی نہیں۔ شعر اچھا ہے۔

خیال مرگ کب تسکین دل آزردہ کو بخشے　　مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

زبوں = عاجز و ناتواں و ناکارہ۔

دل تو خواہاں وصال ہے۔ خیال مرگ سے اسے تسکین کب ہو سکتی ہے۔ موت تو فراق دائمی کا سبب ہوگی۔ مگر مصائب سے تنگ آکر میری تمنا کے جال میں خیال مرگ بھی ایک ناتواں و ناکارہ شکار ہے۔ تکالیف ناقابل برداشت سے بچنے کے لیئے کبھی کبھی خیال موت بھی آجاتا ہے۔

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم　　کہ ہوگا باعث افزایش درد دروں وہ بھی

ع　نمی کردم گہے نالہ اگر دانستم اے ہمدم　　کہ باشد باعث افزایش درد دروں آں ہم

اگر اے ہمدم و ہم نفس مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ نالہ کرنا درد باطنی کو بجائے تسکین اور بڑھانے والا ہوگا تو میں ہرگز نالہ نہ کرتا۔

نہ اتنا برش تیغ جفا پر ناز فرماؤ　　مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

فرماؤ = اور آپ بیٹھو دہلی میں اب بھی بولتے ہیں۔

تم اپنی تیغ ستم پر اتنا ناز کیوں کرتے ہو۔ میری بے تابی اور بے قراری کے سمندر میں جہاں اور امواج خوں ہیں وہاں ایک موج یہ شمشیر جفا بھی ہے۔ اس سے میرا کیا بگڑتا ہے جب ایسی ایسی سیکڑوں تلواریں مجھ پر چل رہی ہیں۔

مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے　　لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

واژگون اوندھا $4 + 2 + 1 = 7$ سات آسمان مانتے ہیں۔

ساقی گردوں سے شراب عیش و عشرت کی خواہش کیا کریں۔ اس کے پاس جبکہ ایک دو چار (یعنی سات) جام ہیں اور وہ بھی اوندھے جن میں ہے کیا تو وہ پھر ہم کو مے عشرت کہاں سے دے گا جب خود اس کے پاس نہیں۔

مرے دل میں ہے غالبؔ شوق وصل و شکوۂ ہجراں  خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

خدا وہ دن بھی لائے کہ شوق وصل اور شکایت تکالیف فراق کرنے کا مجھے موقع مل جائے (غالب تخلص بھی ہے اور صفت شوق وصل بھی) اچھا شعر ہے۔

---

غزل ۴  اشعار ۴

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے  تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

حسینوں کی محفل میں کلام میرے لبوں سے آزردہ اور خفا ہے۔ یعنی چپ رہتا ہوں اور کچھ نہیں کہتا۔ کیوں کہ خوشامد کرنے والوں سے عاجز آگیا ہوں انھوں نے خوشامد کر کر کے ان کا دماغ خراب کر دیا اب وہ میری سنتے نہیں۔ یا خوشامد طلب سے مراد وہی (بتان) ہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ سخن کو خوشامد طلب کہا ہے۔ یعنی محفل محبوب میں سخن میرے لبوں سے روٹھ گیا ہے۔ چاہتا ہے کہ میں اس کی خوشامد کروں تو لب تک آئے۔ غرض یہ ہے کہ معشوق کے سامنے بات منھ سے نہیں نکلتی۔ یا معشوق کو خوشامد طلب کہا ہے کہ ان کی خوشامد کرتے کرتے سخن لبوں سے بیزار ہو گیا ہے۔

خوشامد طلبوں چوں کہ صیغہ جمع ہے اس لئے اس سے سخن مراد نہیں لے سکتے۔ اور آزردگی سخن کی بھی یہ غرض نہیں کہ میں اس کی خوشامد کروں۔ بلکہ علت آزردگی سخن خوشامد طلبی محبوب ہے جسے سخن نہیں چاہتا۔

ہے دور قدح وجہ پریشانی صہبا  یک بار لگا دو خم مے میرے لبوں سے

صہبا، شراب سرخ رنگ۔

پیالوں میں بھر بھر کے جو شراب بے خواروں کو دی جاتی ہے تو وہ منقسم ہو جاتی ہے اور تقسیم خود دلیل انتشار ہے۔ لہٰذا شراب کو منتشر کیوں کر دو پورا مٹکا ہی میرے لبوں سے کیوں نہ لگا دو اس کا انتشار بھی نہ ہو گا اور میری نیت بھی سیر ہو جائے گی۔ مے خواری کا مبالغہ کے ساتھ بیان ہے۔

رندان در مے کدہ گستاخ ہیں زاہد　　زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

زنہار ہرگز طرف ہونا فارسی کے محاورہ طرف شدن کا ترجمہ بمعنی مقابل ہونا ہے۔ اُردو میں نہیں بولتے ہیں۔

اے زاہد میکدہ کے رند بڑے گستاخ ہیں ہرگز ان کے مقابلہ میں نہ آنا یہ تمہاری بری گت بنا دیں گے۔

آج زاہد کی بری گت ہوئی مے خانہ میں　　پا بدست دگرے دست بدست دگرے

بے داد وفا دیکھ کے جاتی رہی آخر　　ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

ہر چند تکالیف عشق سے میری جان مدت دراز سے ہونٹوں پر دھری رہتی تھی یعنی جان بلب تھا مگر وفا کرتے ہوئے بھی جو بے داد ان کی طرف سے ہوتی رہتی ہے اس کی وجہ سے لبوں پر بھی نہ ٹھہر سکی آخر کار نکل بھاگی۔

---

غزل ۵　　اشعار ۲

۱۲۵ غ ۲　تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا　　سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

جب کوئی ہمارا ذکر کرتا ہے چپکے سے سن لیتے ہیں اور اسے روکتے نہیں۔ کیوں کہ اس صورت میں بے مروتی اور عداوت کا اظہار ہوتا اور مجھے شکایت کرنے کا موقع ملتا اگرچہ وہ خود مجھے یاد نہیں کرتے ہیں۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ مصنف نے اس شعر میں معشوق کے مزاج کی اس حالت کو ظاہر کیا ہے جو انتہا درجہ کے بگاڑ میں ہوتی ہے۔ یعنی خفگی بھی ظاہر نہیں کرتے کہ معذرت کرلیں۔ نفرت بھی نہیں جتاتے کہ شکایت کریں۔ اظہار ملال بھی نہیں کرتے کہ منالیں۔ گویا ہمارے اور ان کے کبھی کی ملاقات ہی نہ تھی۔ اس قسم کی حالتوں کا نظم کرنا واقع فی النفس ہوتا ہے۔ اور یہ بڑے مرتبہ کی شاعری ہے۔ یہ محاکات کا اعلیٰ درجہ کا شعر ہے اور معشوق کی مزاجی حالت کی تصویر کھینچ دی ہے۔

غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو　　وہ سُن کے بلالیں یہ اجارا نہیں کرتے

درمیانی لوگ دوست دار غالب غالب سے حالت زار سُن کر غالب کو یوں تسکین دیتے ہیں کہ ہم تیری حالت موقع پاکر کہہ تو گذریں گے مگر اس کا ذمہ نہیں لیتے کہ وہ تیرا حال سن کر تجھے بلا بھی لیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ شعر تو صاف ہے مگر اس کے وجوہ بلاغت بہت دقیق ہیں عاشق نے تکالیف عشق و درد فراق و بے التفاتی معشوق سے تنگ آکر اپنے دوستدار غم خوار سے جو معشوق کا بھی ملنے والا ہے تمنا کی کہ ہمارا حال زار معشوق تک پہنچا دو شاید اس کو رحم آجائے تو واسطہ اس کے جواب میں کہتا ہے (سنا دینگے ہم ان کو) اس کے معنی محاورہ کے رو سے یہ ہیں کہ کسی وقت کسی نہ کسی طرح سے موقع پاکر مزاج کو دیکھ کر باتوں میں یا ہنسی ہنسی ہیں ان کے گوش گذار تیرا حال کردیں گے۔ اتنا ذمہ تو ہم لیتے ہیں (یعنی صاف صاف کہنے کی جرأت نہیں کرتے) اور بالتزام اس سے معشوق کا غرور و تمکنت و رعب و نازک مزاجی و خود بینی و خود آرائی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ کہنا کہ اجارہ نہیں کرتے۔ اس کے کہنے کا موقع جبھی ہوتا ہے جب کوئی نہایت مصر ہو اور کہے جس طرح بنے میرا اور ان کا ملاپ کرادو نہیں تو تم سے شکایت رہے گی۔

ایک تو کلام کا کثیر المعنی ہونا ہی وجوہ بلاغت میں سے بڑی وجہ ہے۔ پھر اس پر یہ ترقی کہ ادھر معشوق کی تمکنت اور ناز ادھر عاشق کی بیتابی و اصرار دونوں کی تصویر کھینچ دی ہے۔

---

غزل ۶ شعر ۱

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

میرے گھر میں دھرا کیا تھا جس کو غم عشق لوٹتا۔ ایک حسرت اپنے اصلاح کار کی تھی وہ اب بھی باقی ہے اسے تیرا غم بھی غارت نہ کر سکا۔

---

غزل ۷ اشعار ۷

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

فلک کا دیکھنا = مبتلائے مصیبت آسمان کی طرف بامید امداد دیکھتا ہے۔ (مصرع ثانی سے (رجوع یا ہوا) محذوف ہے۔ سر اٹھانا = مشغولیت سے فراغت پانا۔

اول تو غم دنیا سے فرصت ہی نہیں ملتی ہے اگر ملی بھی اور طلب امداد میں سر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا تو فوراً تم یاد آجاتے ہو کیوں کہ مظالم میں تم آسمان سے مشابہ ہو۔ اور پھر وہ غم تازہ ہو جاتا ہے۔

کھلے گا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا یارب　　قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

کسی بات کی قسم کھانا اس بات کے کرنے اور نہ کرنے دونوں معنوں کے لیئے مستعمل ہے یعنی کاغذ کبھی نہ جلائیں گے (کیوں کہ اس میں اللہ و رسول اور بزرگان دین کے نام ہوتے ہیں) یا ضرور جلائیں گے۔

وہ ہمارا خط پہلے بھی پڑھتے نہ تھے ہمیشہ جلا دیا کرتے تھے۔ تو اب پڑھنے کی کیا امید ہو سکتی تھی خصوصاً اب جبکہ انھوں نے ہر کاغذ کے نہ جلانے کی قسم کھالی ہے۔ اگر جلاتے تو اس سے شعلے اٹھتے جو میرے سوز نہانی کی ترجمانی کرتے۔ اس طرح میرا سوز غم ان پر ظاہر ہوتا۔ اب اس کی بھی امید نہ رہی۔ بالفاظ دیگر اسی مطلب کو جناب نظم نے تحریر فرمایا ہے۔ اور میں جناب حسرت انھیں کے متبع ہیں۔

چوں کہ انھوں نے ہر کاغذ کے جلانے کی قسم کھائی ہے کہ ضرور جلا دیں گے لہٰذا ہمارے خط کے مضمون کی اطلاع انھیں کیسے ہو سکتی ہے۔ جناب غالب اتنی سیدھی اور معمولی بات بہت کم کہا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا یہ رنگ گویا نہیں۔

لپیٹنا پرنیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے　　ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی

پرنیاں = ایک باریک ریشمی کپڑا۔ گویا کاغذ۔ مگر کے ہوتے ہوئے "ولے" بوجہ غلبہ فارسی اختیار کیا۔ شعلہ لپیٹنے کی چیز نہیں اخگر ہو تو بہتر ہے۔

شعلہ آتش کو پرنیان ایسے نازک میں لپیٹ دینا آسان کام ہے۔ مگر سوز غم کے دل میں چھپائے رکھنے کی حکمت دشوار ہے۔ یعنی دل پرنیان سے زیادہ نازک اور سوز غم انگارے سے زیادہ نمایاں ہونے والی چیز ہے۔

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا　　اُٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

سیر گل ولالہ کے لیئے اُٹھے تھے مگر در حقیقت ان کو اپنے زخمیوں کا دیکھنا منظور تھا۔ بہانہ کی شوخی تو دیکھو۔ یعنی گل بھی انھیں کے زخمی ہیں۔ یا زخمیوں کا دیکھنا ان کے نزدیک سیر گل کے مساوی ہے۔ زخمیوں کے دیکھنے سے انھیں تفریح ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ سیر گل ولالہ سے ہو۔

ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا　　ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

تم جو آئے تو اس سے مقصود تمہارا اپنے نازگی طرف ہم کو ملتفت کرنا تھا چنانچہ ہم اس پر مر مٹے اپنے بھولے پن کی وجہ سے۔ مگر تم آئے کیا ذرا دیر بھی نہ بیٹھے اور نہ بات چیت کی اور جلدی سے چل دیئے۔ تمہارا آنا کیا تھا تمہید جلانے کی تھی۔

لکدکوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

بتوں کے ناز جو حوادث و آفات سے بھی بڑھ کے ہیں پہلے اتنی قوت تھی کہ انھیں اٹھالیا کرتے تھے لیکن اب غم عشق نے ایسا ناتواں کر دیا ہے۔ کہ اب پایمالی حوادث کا بھی تحمل نہ رہا۔

کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالبؔ بدی کی اُس نے جس سے کی تھی ہم نے بارہا نیکی

خوبی، طعناً بمعنی برائی ہے۔ اوضاع جمع وضع مراد سلوک۔ نیکی اور بارہا کی قطع و برید کر کے قافیہ معمولہ بنایا ہے (انے) داخل قافیہ تھا اور (کی) ردیف۔ اس میں نیکی کے دو ٹکڑے کیئے۔ (نے) کو "بارہانے" میں شامل کر کے بہانے وغیرہ کا قافیہ بنایا۔ اور (کی) ردیف میں لے گئے۔ حالاں کہ (نیکی) ایک لفظ مستقل ہے۔ پہلے قافیہ معمولہ کا شمار عیوب میں تھا۔ اب ہنر سمجھا جاتا ہے۔

اے غالبؔ اہل زمانہ کی بدسلوکی کا میں کیا ذکر کروں جسکے ساتھ ہم نے نیکی کی اسی نے ہمارے ساتھ بدی کی۔

---

غزل ۸ اشعار ۲

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی ۳۰۳

حاصل پیداوار۔ آرزو خرامی سے مراد موافق آرزو تمنا خرام کرنا۔ جناب نظم فرماتے ہیں ترکیب تو نئی ہے مگر دلچسپ نہیں۔ اس کی تقلید سے احتراز کرنا چاہیئے۔ پھر اسے منادی کر کے اور اندھیر کر دیا ہے۔ اسامی جمع الجمع اسم بمعنی کاشت کار و مال گذار اردو ہے اور بجائے واحد مستعمل۔ ڈوبی ہوئی اسامی وہ مال گذار جس سے لگان ملنے کی امید نہ ہو۔ حاصل اور اسامی۔ گریہ اور ڈوبی ہوئی۔ بیٹھ اور خرام الفاظ متناسب ہیں۔

دل جو کاشت کار کشت امید اس کا کشت امید جوش گریہ میں سیلاب برد ہو گیا۔ اب اس کے پاس کچھ نہیں لہٰذا مراد حاصل ہونے کی نہیں اور آرزو کا نخل بے ثمر ہی رہے گا۔

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے　　میں بھی جلے ہووں میں ہوں داغ ناتمامی

داغ ناتمامی۔ کامل طور سے نہ جل جانے کا داغ۔ کی طرح سے۔ جنھوں نے اسے ترک کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کی طرح بھی محاورہ ہے اور وہی معنی کی طرح سے کے ہیں۔ جب کم سے کام نکلتا ہو تو زیادہ سے کیوں کام لیا جائے۔

آتش عشق سے جل تو رہا ہوں مگر جل کے خاکستر نہیں ہو گیا ہوں جو میری ناتمامی کی دلیل ہے۔ بحالت موجودہ اس شمع کی طرح ہوں جو پورے طور سے نہ جلی ہو اور بجھا دی گئی ہو۔ یہ میرے عشق کامل ہونے کی دلیل ہے ورنہ جل کے خاک ہو گیا ہوتا۔

---

غزل ۹　　اشعار ۸

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا مکان ہے　　جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسماں ہے

ہم ستم رسیدہ (عاشقوں) لوگوں کا عالم کس قدر تنگ ہے کہ چیونٹی کا ایک انڈا اس عالم کے لیئے آسمان ہو سکتا ہے۔ ستم زدگاں سے اردو میں ستم زدگوں اچھا ہے۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے　　پرتو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

کائنات۔ کائن کی جمع سالم ہے۔ ہونے والی چیزیں۔ مخلوقات۔ موجودات۔ حرکت۔ محقق دوانی اخلاق جلالی میں فرماتے ہیں کہ حرکت فلک بھی تلاش مبدء میں ہے۔ حرکت مادہ میں نہ ہو تو کوئی شئے وجود میں نہیں آسکتی۔ کل موجودات تجھے اپنا مبدء، اصل سمجھ کے تیرے جویا ہیں۔ جس طرح آفتاب سے ذرہ میں جان پڑ جاتی ہے۔ آفتاب نہ ہو تو ذرہ کا وجود کالعدم ہے۔ ذرہ سے مراد ہباً منثورا ہے جو روزنوں میں سے شعاع آفتاب کے گذرنے سے لہراتے معلوم ہوتے ہیں۔

حالاں کہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ　　غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے

سیلی۔ تھپیڑ۔ تمانچا۔ خارا۔ سنگ سخت مراد معشوق سنگ دل۔ شیشہ۔ مراد دل نازک۔ غمگین عاشق۔ مے سے مراد خون۔ لالہ رنگ۔ سرخ رنگ۔

باوجودیکہ معشوق کی سنگ دلی اور مظالم سے میرے شیشۂ دل میں خون بھرا ہے یعنی دل خون ہو رہا ہے۔
مگر جو لوگ عشق سے ناواقف ہیں وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ میرے شیشۂ دل میں مے عشرت بھری ہے۔
جناب نظم نے بغیر استعارات معنی وضعی الفاظ سے کام لے کر یہ اعتراض کیا کہ پتھر کی ضرب سے شیشہ کا ٹوٹ جانا سب کہتے ہیں مگر غالب نے سرخ رنگ ہو جانا خلاف واقع باندھا۔

کی اُس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا — آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

اہل ہوس ۔ رقیب و اغیار جن کو عشق صادق نہیں۔ جا گرم کردن ۔ بیٹھنا قیام کرنا فارسی کا محاورہ ہے اُردو نہیں۔ ٹھنڈا ۔ گرمی و سوز عشق سے خالی۔ گرم اور ٹھنڈا میں صنعت تضاد ہے۔
رقیبوں کے دل میں ان کی مرادیں پوری کر کر کے اپنے لئے جگہ پیدا کر لی ہے یہ دل اغیار جو سوز عشق سے بالکل خالی اور سرد پڑا ہے انھیں پسند کیوں نہ آئے۔ ٹھنڈے مقام کا ہر ایک جو یا رہتا ہے۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا — بس چپ رہو ہمارے بھی منھ میں زبان ہے

پورا شعر زبان کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔
عاشق نے رقیب کو بوسہ دینے کی شکایت کی تو معشوق اُس سے اُلجھنے لگا۔ اور کہا ہاں دیا۔ تمہارے باپ اجارہ ہے۔ عاشق اس جواب سے اس کی ڈھٹائی اور منھ زوری پر بگڑ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے بس چپ رہو ہمارے منھ میں بھی زبان ہے۔ ہم بھی کچھ کہہ بیٹھیں گے تو مرچیں لگ جائیں گی (بس چپ رہو) انھیں باتوں کو چاہتا ہے۔
مجھے معشوق کے ساتھ یہ تو تو میں میں اور پھکڑ بازی اچھی نہ معلوم ہوئی۔

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار میں — فرماں روائے کشور ہندوستان ہے

جبکہ ممدوح کی مدح مقصود ہے تو معشوق کے بھی سایہ دیوار کے تلے بٹھا کے ایک طرح کی حقارت کیوں کی جائے۔ ہاں یار سے مراد یار حقیقی ہو تو بات بن سکتی ہے ؂

بیٹھا ہے جو کہ ظل الٰہی میں تخت پر

ہندوستان ۔ ہندو اور استھان بمعنی جگہ سے مرکب ہے فارسی میں (ستان) بھی ظرف مکان کے لئے ہے عربی میں بعد حروف مدہ اخفائے نون نہیں ہوتا ہے۔ اُردو کی بول چال میں بھی اخفائے نون نہیں۔ نظم میں اخفاء جائز کر لیا ہے۔ پھر بھی اعلان فصیح ہے۔ فارسی میں بترکیب اضافی مضاف الیہ میں اعلان نون بعد حروف مدہ نا جائز قرار دیتے

ہیں اس لیئے جناب نظم (دوران کے تتبع میں جناب حسرت (ہندوستان) میں اعلان نون پر معترض ہیں۔ یہاں تو یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ ہندوستان علم ہے اور باعلان نون ہی ہے۔ علم میں تصرف کی ضرورت نہیں مگر دو اور مقاموں پر علم نہ ہونے پر بھی نون کو اعلان کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ؎

ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

یہاں وہ تاویل کام نہیں دیتی۔ جبکہ قاعدہ مسلمہ کو صحیح مان لیا جائے فرماں روائے کشور ہندوستان سے مراد ظفر شاہ۔

شعر کے معانی لکھنے کی ضرورت نہیں وہ خود صاف ہے۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا　　　کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

وجود جگر پہلے ہی سے محض نام کو تھا اور صرف اعتباری تھا آتش غم نے اسے جلا کے داغ بنا دیا۔ اب اگر کسی سے کہوں کہ داغ اسی جگر سوختہ کا نشان ہے تو کوئی مانتا نہیں۔ اب کیوں کر کسی کو سمجھاؤں۔

ہے بارے اعتماد وفاداری اس قدر　　　غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ وہ نامہرباں ہے

ہمارے پابند وفا ہونے پر ان کو بڑا بھروسا ہے۔ یا۔ اتنا تو اعتماد ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم کتنے ہی نامہربان رہیں مگر غالبؔ ہم سے منھ نہ پھیرے گا۔ لہٰذا اس اعتماد کی وجہ سے ہم ان کے نامہربان ہونے سے بھی خوش ہیں۔

---

غزل ۱۰　　　اشعار ۱۲

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے　　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

یہ غزل غالبؔ کے کسی محبوب کا مرثیہ ہے۔ مردہ کو زندہ فرض کر کے اس سے مخاطبہ کرتے ہیں اور اس کو اس کی زندگی کی باتیں یاد دلاتے ہیں۔ میں تحقیق نہ کر سکا۔

جناب عرشی منصرم کتاب خانہ ریاست رام پور نے بہت کچھ کام غالبؔ پر کیا ہے مگر ان کی کوئی تصنیف میرے پاس نہیں۔ غالب گمان ہے کہ انھوں نے لکھا ہوگا کہ یہ مرثیہ کس کا ہے۔ میں نے اس بات کی اہمیت بھی نہ سمجھی اس لیئے تلاش بھی نہ کی۔

جب تم زندہ تھے تو میری طرف سے غفلت برتتے تھے۔ اب کون سی بات پیدا ہو گئی جو میرے درد اور

تکلیف سے تم بھی بے قرار ہو۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے

اگر غم کی پریشانی اٹھانے کی تیرے دل میں ہمت نہ تھی تو غفلت شعاری چھوڑ کے میری غم گساری کی طرف کیوں مائل ہوئے۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ میری طرف سے غافل ہی رہتے۔

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

تم کو میری غم خواری کا خیال ہی کیوں پیدا ہوا جو میری دوستی تمہارے حق میں دشمنی ہو گئی کہ تم جان سے گذر گئے۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

اگرچہ تم نے زندگی بھر میرے ساتھ وفاداری کرنے کا عہد کیا تھا۔ مگر خود زندگی ہی کو استقلال و قیام نہیں اور جلد مر گئے۔

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی — یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

زیست چوں کہ تم سے موافق نہ تھی لہٰذا زیست مجھے سخت ناگوار ہے۔

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے تم نقابِ خاک میں جا کر چھپ رہے۔ کیوں کہ پیمانِ وفا تو نبھا نہ سکے یہاں تک کہ اپنی جان دے دی۔ مگر تم نے الفت کو فاش نہ ہونے دیا الفت کی پردہ داری کا تم پر خاتمہ ہے۔

گلفشانیہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

زندگی میں نازِ جلوہ کے پھول تم بکھراتے تھے اب وہ گلفشانی نازِ جلوہ کیوں نہیں۔ بجائے اس کے اب تیری قبر پر لالہ کاری نہ ہو رہی ہے۔

لالہ کاری مراد خون کے آنسو رونا۔ لوحِ مزار پر تھوڑا حصّہ کچا رکھ کر اس میں پھول کے بوٹے بھی

تفاؤلاً لگا دیتے ہیں۔

خاک میں ناموس پیمانِ محبت مل گئی　　　اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے

ناموس۔ لفظ یونانی ہے vouos اظہار فعل خیر۔ صاحب السر۔ مستعمل بمعنی شریعت۔ جبریل۔ دینار و عزت۔

تمہارے مرنے سے عزت پیمان محبت خاک میں مل گئی۔ تم کیا گئے دنیا سے راہ و رسم یاری ہی اُٹھ گئی۔ راہ و رسم یاری تمہاری ذات پر منحصر تھی۔

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا　　　دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

مجھے تو تمنا تھی کہ میں تمہاری تیغ جفا کے ہاتھوں مارا جاؤں گا۔ مگر ایک زخم جان لیوا بھی نہ لگنے پایا تھا کہ تمہارا ہاتھ خود بے کار ہو گیا یعنی میرے مرنے سے پہلے تم مر گئی۔

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال　　　ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

برشکال۔ سنسکرت برکھا سے فارسی والوں نے بنالیا ہے۔ اور برسات ہندی ہے مگر ایرانی بھی استعمال کرنے لگے۔

تمہارے فراق میں ستارے گن گن کے رات کٹتی ہے اور ہم اسی کی عادی ہو گئے ہیں تمہارے بعد یہ برسات کی اندھیری راتیں کیوں کر کٹیں گی۔ تمہاری زندگی میں تو یہ امید تھی کبھی تم مہربان ہو جاؤ گے تو وصال میسر ہو ہی جائے گا۔

جناب نظم فرماتے ہیں۔ برسات استعارہ رونے سے ہے۔ اور شبہائے غم کو شبہائے تار کہا ہے۔

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال　　　ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

کان تمہارے کبھی پیام و سلام نہیں سنتے آنکھیں تمہارے جمال کو نہیں دیکھتیں۔ بے چارہ ایک دل ہے اور اس پر اتنی ایک ناامیدواری ہائے افسوس ہائے افسوس۔

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ　　　رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

ابھی عشق مرتبہ جنون تک نہ پہنچا تھا کہ نوبت دشت نوردی کی آتی اور کوچہ گردی اور صحرانوردی کرتا اور تنہا رہے عشق میں رسوا اور خوار ہوتا کہ تم نے جان دے دی اور ذوق خواری جو تھا وہ دل کا دل ہی میں رہ گیا۔ افسوس ہے۔ ردیف کئی اشعار میں برائے بیت ہے۔

---

غزل ۱۱ اشعار ۶

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے تسکین کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لفظ عالم کے صرف کی خوبی نہ معلوم ہوئی۔ اور دے کا مخاطب بھی ظاہر نہیں لہٰذا (دے) کی جگہ (ہو) چاہیئے۔

ع سرگشتگی میں جینے سے بھی اب تو یاس ہے

حیرانی و پریشانی کی وجہ سے اب زندگی سے بھی مایوسی پیدا ہو گئی۔ لہٰذا تسکین کو خوش خبری ہو کہ اب مرنے کی امید بندھ گئی ہے۔ مر کر اطمینان خاطر حاصل ہو جائے گا۔

لیتا نہیں مرے دل آوارہ کی خبر اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

میرا دل مدت ہوئی کہ اس کی تلاش میں آوارہ گرد ہو چکا ہے لیکن وہ اب تک یہی سمجھے ہوئے ہے کہ میرا دل میرے قبضہ میں ہے۔

کیجے بیان سرور تب غم کہاں تلک ہر مو مرے بدن پہ زبان سپاس ہے

سپاس سہ جنان ولسان وارکان۔ اور پاس بمعنی حفاظت سے مرکب ہے یعنی دل و زبان و اعضاء و جوارح سے شکر منعم ادا کرنا۔

تب غم سے جو خوشی مجھے حاصل ہے اس کا بیان میں کہاں تک کروں میرے امکان سے باہر ہے کہ اس نے مجھے فکر دنیا سے فراغت دیدی۔ اس تب غم کے شکریہ میں میرے بدن کا ایک ایک رویاں زبان شکر ہو رہا ہے۔

جناب نظم (تلک) کے ترک کو اور ایسی کی جگہ (تک) کے استعمال کو بلاوجہ فرماتے ہیں۔ جناب آسی اس پر حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ زبان اُردو خود ہی تنگ ہے اس پر طرہ یہ کہ بعض الفاظ کو ترک کر کے اسے اور تنگ کرتے جاتے ہیں۔

جناب آسی پر موقوف نہیں اکثر انشا پردازوں کے قلم سے تنگی زبان اُردو کی شکایت نکلا کرتی ہے۔ جناب میر اُنیس مرحوم کے پوتے سید محمد عابد صاحب مرحوم نے اُردو کا لغت جمع کیا ہے۔ اور صرف وہ الفاظ لکھے ہیں جو رائج ہیں جن میں محاورے بھی شامل ہیں ان کی تعداد تین لاکھ ہوتی ہے مصطلحات علوم وفنون اس تعداد میں داخل نہیں۔ آنکھ۔ آنکھوں اور آنکھیں کی ترکیب سے تین ہزار اور کان اور کانوں کی ترکیب سے پانسو محاورے لکھے ہیں۔ دنیا کی کس زبان میں صرف ادبی الفاظ کی اتنی کثرت پائی جاتی ہے۔ سنتا ہوں کہ چینی زبان میں تین لاکھ سے بھی زیادہ الفاظ ہیں۔

دوسرا نقصان اُردو کا یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اگر اُردو میں سے فارسی کے الفاظ فارسی کو اور عربی کو عربی الفاظ دے دئے جائیں تو اُردو میں کیا رہ جاتا ہے۔ یہ الزام اس کے مرکب زبان ہونے پر ہے۔ انگریزی بھی اُردو کی طرح مرکب زبان ہے اس میں سے بھی فرنچ۔ یونانی۔ اتالین (لاطینی) جرمنی وغیرہ کو نکال دیا جائے تو اینگلو سیکسن کے کتنے الفاظ رہ جائیں گے۔ حالاں کہ اس وقت انگریزی بڑی وسیع زبان سمجھی جاتی ہے۔ زبان کا مرکب ہونا یہ کوئی عیب نہیں۔ یہ دیکھنا چاہیئے کہ خیالات انسانی کے ادا کرنے کے لیئے کس زبان میں الفاظ کثیر پائے جاتے ہیں۔ عربی عبری سے ماخوذ ہے۔

ظاہر ہے کہ جس زبان کے حروف ابجد زیادہ ہوں گے اسی کے کلمات بھی زیادہ بن سکتے ہیں۔ فارسی میں بیس اور انگریزی چھبیس اور عربی میں اٹھائیس حرف ہیں۔ عربی وفارسی واُردو کے الفاظ سات حرف سے زیادہ کے نہیں ہوتے۔ انگریزی کے الفاظ پندرہ سولہ حروف سے اور بعض بعض چھبیس حروف سے بھی مرکب ہوتے ہیں۔ ان کے لکھنے اور بولنے میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اور جگہ زیادہ گھیرتا ہے۔ برخلاف ٹائپ کے اس میں جگہ انگریزی میں کم صرف ہوتی ہے۔ اور عربی وفارسی واُردو کے الفاظ چوں کہ مفرد کی شکل اور ہے اور مرکب کی اور اس لیئے ان کی تحریر ایک قسم کی شارٹ ہینڈ رائٹنگ ہے۔

زبان کی خوبی یہ ہے کہ ایک مسمی کے لیئے مختلف اوزان کے نام ہوں۔ نہ یہ کہ ایک لفظ کے معانی کثیر ہوں۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ شئے مرکب کا اسم ایسا ہو کہ اس کے اجزاء پر دال ہو۔ یہ بات لاطینی میں زیادہ اس کے بعد سنسکرت میں اور کم کم اُردو اور فارسی میں ہے۔ عربی میں مطلق نہیں۔

مصطلحات علوم وفنون اُردو میں گویا نہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ مسلمانوں کی سلطنت میں درباری اور کورٹ کی زبان فارسی تھی۔ تمام کاغذات فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ اُردو کی تربیت کسی نے نہ کی۔ ابتدار حکومت میں ۱۸۵۷ء کے بعد اس کی طرف انگریزوں نے کسی قدر توجہ کی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُردو چوں کہ مرکب زبان ہے اس لیئے ضرورت نہ تھی اور عربی کے مصطلحات علوم وفنون عاریت کے لیئے۔

یورپ کے علوم وفنون جدیدہ مصطلحات سمیت اُردو میں آئے دن ترجمہ ہوا کرتے ہیں۔ جب کہ کسی کو دونوں زبانوں پر دسترس کامل ہو تو وہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرسکتا ہے۔ یہ قول انھیں لوگوں کا ہوسکتا ہے جو صرف ایک کے تو ماہر ہیں اور دوسری پر قدرت نہیں رکھتے۔ وہی اُردو کو بے سرمایہ کہتے ہیں۔
اب رہا یہ امر کہ کسی زبان کا اُردو یا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کہ اس کا فورس بھی باقی رہے بڑا مشکل کام ہے۔ اُردو کے شعر کی اگر کامل انگریزی داں بھی ترجمہ کرے تو اس شعر کے محاسن اور فورس کو باقی رکھنا ہر ایک کا کام نہیں۔

حضرت نظام دام ملکہ نے اس کا بھی بیڑا اٹھایا ہے اور اُردو میں جدید علوم وفنون کے مترادفات اُردو میں بھی بنائے جارہے ہیں۔ اور یہ بہت بڑی تربیت اور بڑا احسان اُردو زبان پر ہے۔

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب　　اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

اس کا مشارٌالیہ شب مہتاب ہے۔ شب مہتاب کو بلغمی مزاج اس لئے کہا ہے کہ ہر زمانہ کی رات اسی زمانہ کی نسبت سے ٹھنڈی ہوتی ہے اور چاند کا مزاج بھی ٹھنڈا ہے۔ جناب نظم اس کا مشارٌالیہ قائل یعنی شاعر کو قرار دیتے ہیں۔ راس، سنسکرت میں راش بمعنی طالع۔ وہ برج کہ وقت ولادت مولود یا وقت سوال افق شرقی پر نمایاں ہو۔ اُردو میں بمعنی مناسبت سزاوار۔ موافق۔ اور مفید مستعمل ہے۔ اور طالع بھی موافق ومخالف ہوا کرتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فارسی کے (راست) کا مخفف ہو جس کے معنی ٹھیک اور درست کے ہیں۔ طب یونانی سوائے اوجاع کے علاج بالضد کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی مرض اگر سردی سے ہو تو اس میں علاج ادویہ حارّہ سے کرتے ہیں اور اس کے بالعکس اگر مرض گرمی سے ہو تو ادویہ باردہ دیتے ہیں۔ شب مہتاب کا مزاج سرد ہے اور شراب کا گرم لہٰذا چاندنی رات میں جو ٹھنڈی ہے۔ شراب گرم کا استعمال کرنا اس کا علاج ہے۔
اے مخاطب چاندنی رات میں جتنی بھی شراب ملے ڈٹ کے پی جا۔ کیوں کہ اس کی ٹھنڈک کا علاج شراب حار ہی ہے۔

ہے وہ غرورِ حُسن سے بے گانۂ وفا　　ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے

باوجودیکہ ان کے پاس (یعنی ان کا) دل حق شناس ہے وہ وفادار اور بے وفا کو خوب پہچانتے ہیں مگر غرورِ حُسن کی وجہ سے باوفا سے بے وفائی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ معشوق کو پچارا دے کر اسے تان رہے ہیں تاکہ وفا کرنے لگے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ ہمارا دل حق شناس ان کے پاس ہے اور اس دل نے انھیں حق وفا سے آگاہ کر دیا ہے مگر وہ غرور حسن میں کب سنتا ہے۔ اگر دل حق شناس سے مراد معشوق کا دل لیں تو محاورہ کے خلاف ہوگا۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ اس کے پاس دل روشن و چشم بینا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کا دل روشن اور چشم بینا ہے۔

بمبا فرماتے ہیں مگر غالب تو زیادہ تر طرز ادائے فارسی کے مترجم ہیں۔ اور دل حق شناس دارد کا ترجمہ کیا ہے۔ انگریزی طرز ادا بھی فارسی سے ملتا ہے۔ HE HAS A GRATEFUL MIND۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ     مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

اوداس بمعنی افسردہ ہے مصنف نے بمعنی سنسان کہا ہے۔

مکان کی عظمت و بزرگی اس کے رہنے والے سے ہوتی ہے۔ مجنوں جو صحرا نورد تھا۔ اس کے مر جانے سے دشت سنسان ہو رہا ہے۔

---

غزل ۱۲     اشعار ۷

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے     خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

حال سے مراد جناب نظم نے واردات قلبیہ لکھی ہے۔

اگر چپ رہنے کا فائدہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ کوئی راز دلی سے واقف نہ ہو تو میں بک بک کر کے بھی خوش ہوں کیونکہ میری بات کو کوئی سمجھ نہیں سکتا لہٰذا خموشی کا فائدہ حاصل ہے۔

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ     دل فرد جمع و خرج زباں ہائے لال ہے

زبانہا جمع کا صیغہ اس لیئے لائے کہ گلے اتنے کثیر ہیں جو ایک زبان سے ادا نہیں ہو سکتے۔

حسرت اظہار کا گلہ میں کس کو سناؤں۔ کچھ تو گلے ظاہر کئے مگر ہزاروں ان کے رعب حسن یا خیال ناراضی سے بیان نہ ہو سکے۔ ان کے بیان کے لیئے زبانیں بھی بہت سی درکار تھیں اس لیئے وہ گلے دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ لہٰذا دل زبان لال کے بیان کردہ اور نہ بیان کردہ کی ایک فہرست جمع و خرج ہے۔ (جو شکایتیں کر لی گئیں ان کے لیئے زبان گونگی نہ ہوئی اور وہ گویا خرچ میں آگئیں۔ اور جو باقی رہ گئیں بیان میں نہ آئیں ان کے لیئے گویا زبان گنگ تھی اور وہ دل میں جمع ہیں۔

فرد - ایک دو ورق کاغذ کے جن پر حساب آمدنی اور صرف کا لکھا ہو۔ یا اسماء ان لوگوں کے ہوں جن کو مدعو کیا گیا ہو۔ کیا عجب ہے کہ یہ معنی عربی اور فارسی میں نہ ہوں۔ اگر ایسا ہے تو اضافت فارسی کا جھگڑا درمیان فرد جمع و خرچ پڑے گا۔

کس پردہ میں ہے آینہ پرداز اے خدا — رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

آینہ پرداز - آئینے کو جلا دینے والا۔ رحمت کو آینہ پرداز کہا ہے جو زنگ معاصی کو آینہ دل سے صاف کردے۔

یا اللہ رحمت جو آینہ دل کو زنگ معاصی سے پاک اور صاف کردے کس پردہ میں چھپی ہوئی ہے۔ کاش وہ سامنے آئے اور بغیر ہمارے سوال کے اور بغیر ہمارے عذر کرنے کے ہمارے گناہ معاف کرادے۔

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی — اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

اور - وا واستبعاد کا مترادف ہے یعنی بہت بعید ہے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ شوق کی صفت منفعل اچھی نہیں جناب حسرت (منفعل شو) سے تاویل کرتے ہیں۔ منفعل - شرمندہ اور پشیمان۔

اے شوق ہم نے جو اس محبوب سے عشق کیا تو تیرا یہ سمجھ کر کہ میں نے ایک دشمن سے دوستی پیدا کی اور تو اس پر پشیمان اور شرمندہ ہے یہ خیال تیرا بالکل غلط ہے۔ خدا نخواستہ وہ اور میرے دشمن نہ ہوں یہ تو بہت بعید امر ہے (ہے ہے) یہ کلمہ زیادہ تر عورتوں کی زبان پر ہے۔

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان — ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

مشکیں - مشک بضم اول وشین معجمہ فارسی ہے۔ ہندی کستوری عربی میں بکسر میم وسین مہملہ سے ہے۔ انگریزی میں بفتح میم اور سین مہملہ سے ہے۔ MUSK - انگریزی میں (U-یو) ضمہ کی بھی آواز دیتا ہے۔ (ین) نسبت کے لیئے ہے۔ (ی) نسبت کے لیئے قاعدہ یہ ہے کہ جب منسوب منسوب الیہ کا جزو نہ ہو تو (ی) لاتے ہیں۔ اور اگر جزو ہو تو (ین) جیسے لکھنوی اور زریں۔ مشکیں بمعنی معطر۔ اور مشک کا رنگ سیاہ مانتے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ پوشش کعبہ سیاہ ہوتی ہے۔ حدیث مشہور ہے کہ ولادت امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام خانہ کعبہ میں ہوئی۔ ناف سنسکرت NABHI انگریزی (نیول) NAVEL عربی سرہ اور مجازاً بمعنی مرکز و وسط و میان۔ بیچ۔ چوں کہ ناف تقریباً وسط جسم انسانی میں ہوتی ہے۔ اردو توندی۔

ناف زمین - وسط الارض۔ مسلمان کہتے ہیں کہ کعبہ وسط زمین میں واقع ہے۔ وہ چاہے اس بات سے

کوئی شرف پیدا کرتے ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ زمین گول ہے اور گول چیز کا ہر نقطہ وسط ہوتا ہے۔ قاعدہ کو مان کر کہ مضاف الیہ میں اگر نون بعد حرف مد آخر میں واقع ہو تو اعلان نون ناجائز مانتے ہیں۔ ناف زمیں میں اعلان نون ناجائز ہوگا۔ کیوں کہ اُردو متتبع قواعد فارسی ہے۔ مگر یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو امر فارسی میں ثقیل معلوم ہوتا ہو وہ اُردو میں بھی ثقیل ہو۔ انقلاب زمانہ سے فارسی میں بھی اعلان نون آگیا۔ چنانچہ (آن) ضمیر جو باخفا نون تھا۔ اب (آن) با اعلان نون بولتے ہیں حالانکہ ترکیب تو ترکیب مفرد میں بھی اعلان نون قبیح سمجھتے تھے اور عربی میں تو اخفار نون کسی لفظ میں ہے ہی نہیں۔ مگر یہ رائے شخصی ہوگی سب مان لیں تو ٹھیک ہے ورنہ اجتناب لازم ہے۔ نہیں تو ایسا استعمال مورد الزام رہے گا۔ غزال بفتح اول آہو۔ ہرن۔ کرجی سینگ نکلنے سے پہلے تک کے بچہ آہو معنی بتاتے ہیں۔ انگریزی GAZELLE اسی غزال سے ماخوذ ہے۔

لباس پوشش کعبہ جو (معطر و مشکیں) ہو رہی ہے وہ برکت قدم حضرت علی سے ہے ورنہ معطر کیوں ہوتی۔ یہ مانا کہ کعبہ ناف (وسط) زمین میں ہے مگر ناف (نافہ) آہو تو نہیں ہے جو معطر ہو۔ اگر صفت شوق میں لفظ منفعل برائے مان لیا جائے تو یوں بنا سکتے ہیں ؎

اے شوق بدگمان یہ ترا کیا خیال ہے

اکثر مضامین جو اُردو میں کہے ہیں انھیں مضامین کے اشعار کلام فارسی میں بھی ملتے ہیں اور اس کے بالعکس بھی۔ اسی مضمون کو فارسی میں فرماتے ہیں۔

از مکرمتش ناف زمیں ناف غزال است — مشکیں ز چہ شد ورنہ لباس حرم آیا

وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ تھا — دریا زمین کو عرق انفعال ہے

عرصہ ۔ میدان۔ آفاق جمع افق کنارہائے آسمان۔ چوں کہ زمین انھیں افقوں کے درمیان ہے اس لئے مجازاً دنیا مستعمل ہے۔ انفعال ۔ شرمندگی۔

میری وحشت میں صحرا نوردی کے لیئے چوں کہ میدان دنیا تنگ ہے۔ اور زمین اس کے لیئے مقام وسیع نہ پیدا کرسکی تو شرمندہ ہوئی لہٰذا سمندر کو سمندر نہ سمجھو بلکہ زمین کو شرمندگی سے پسینہ آگیا ہے۔ یعنی زمین مارے شرم کے پانی پانی ہوگئی۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

مت بمعنی نہ (نفی) کہنے میں اب شاعروں کی مت پلٹ گئی۔ نہ معلوم۔ حالاں کہ بہت نرم لفظ ہے۔ اے اسدؔ اس دھوکے میں نہ آجانا کیوں کہ ہستی محض اعتباری اور وہمی ہے۔ جیسا کہ اس مقولے سے ثابت

ہے الوجود بین العدمین عدم۔ سارا عالم ہی خیالی جال کے حلقے ہیں جس میں موجودات گرفتار ہیں۔

---

غزل ۱۳ — اشعار ۲

۱۴۴ غ ۲

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو — حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

اس غزل کی بحر مجتث مثمن مخبون ہے بروزن مفاعلن فعلاتن چار بار۔ اصلی وزن سالم مستفعلن فاعلاتن چار بار تھا۔ مستفعلن سے سین اور فاعلاتن سے الف بوجہ خبن حذف ہو گیا۔ تو وزن مفاعلن فعلاتن چار بار ہو گیا۔ حذر کرنا = پرہیز کرنا۔ بچنا دل میں چھپے ہوئے شکوہ و شکایت کو جو پیش نہیں کئے گئے ہیں ان کو دبی ہوئی آگ سے تعبیر کیا ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات شکایات موجب اشتعال آتش غضب ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ تشریح ایسی نہیں جس کی طرف دوسروں کا خیال نہ پہنچے مگر میں نے جناب نظم کی شرح سے نقل کیا ہے۔

تم سے جو شکووں کی باتیں سرزد ہوئی ہیں ان کو کرید کرید کے نہ پوچھو وہ تو ایک آگ ہے جو آتش خانہ دل میں ابھی تک دبی پڑی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کریدنے سے بھڑک اٹھے اور اس سے تم کو ضرر پہنچے۔ یا تم اور بھڑک اٹھو۔

دلا یہ درد و الم تو مغتنم ہے کہ آخر — نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

اے دل اس درد و الم کو بھی غنیمت سمجھ۔ کیوں کہ آخر کار یہ درد و الم تم کو فنا کر دے گا۔ پھر نہ گریہ صبح گاہی ہوگا اور نہ آدھی رات کی آہیں ہوں گی۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے جسے جناب نظم نے اختیار کیا ہے۔ کہ آخر کار اس گریہ اور آہ کے اثر سے وہ مہربان ہو جائیں گے اور مبدل العیش و نشاط ہو جائیں گے۔ پہلے معنے میں چوں کہ درد ہے وہ آخری معنے سے اچھے ہیں کیوں کہ آہ والا شعر واہ والے سے اچھا ہوتا ہے۔

---

غزل ۱۴ — اشعار ۶

ایک جا حرف وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا — ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

۱۴۴ غ

تیرے خط میں ایک جگہ سہواً لفظ وفا قلم سے نکل گیا تھا مگر وہ بھی مٹ گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرا کاغذ غلطی کو اپنے میں نہیں رہنے دیتا ہے۔ چوں کہ وفا تم میں چھو نہیں گئی ہے اور غلطی سے قلم سے نکل گیا تھا لہٰذا کاغذ پر

وہ بھی نہ رہا۔ اگر رہ جاتا تو پھر تم جھوٹ کے ملزم قرار پاتے۔ (پنسل ریزرا اور انک ریزر ربر کے ہوتے ہیں) تمہارا کاغذ MISTAKE RAZOR ہے۔

مٹ گیا تو پڑھا کیسے۔ دھندلا ہو گیا۔ ہلکا پڑ گیا۔ (شعر بے منطق نہیں ہے) یہ الفاظ ہوں تو قافیہ بردار بے محل ہو جائے گا۔

جی جلے ذوق فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں  ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

ہم تو فنا کے خواہاں ہیں۔ مگر پھر بھی باوجود یکہ آہیں شعلہ بار ہیں ہم جل کے فنا نہیں ہوتے۔ اپنے اس نقصان اور ناتمامی پر ہمارا دل کیوں نہ جلے۔

جناب نظم نے آج کل کی تحقیق کی بنا پر کہ ہر نفس سینہ میں اشتعال پیدا کرتا ہے۔ اور وہی اشتعال باعث حیات ہے۔ حالاں کہ ہر اشتعال میں جسم کا انس اور بدن کا ہیر فنا ہوتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حسب طبیعت در مقتضائے فطرت ہر ذی حیات کو ذوق فنائے جوہر ہے۔ اس لئے کہ وہی اشتعال جو فنا کرتا ہے عین حیات ہے۔ جو لوگ کہ سوانح حیات مصنف سے واقف ہیں انھیں حیرت ہوگی کہ ان کو یہ مسئلہ دوران خون کیوں کر معلوم ہوا۔

اسی طرح جناب ڈاکٹر بجنوری نے غالب کے اشعار میں تحقیقات جدیدہ کی باتیں زبردستی ٹھونسی ہیں۔ اسی کو التاویل بما لا یرضی قائلہ اور مدعی سست دگواہ چست کہتے ہیں۔ غالب کے زمانے کے نہ یہ مسائل ہیں اور نہ وہ انھیں جانتے تھے۔ نفس کے بارے میں شیخ سعدیؒ کی طرح بس اتنا جانتے ہوں گے۔ ہر نفسے کہ میرود ممد حیات است وچوں برمی آید مفرح ذات۔

جناب غالب صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ نفس آتش بار کے ہوتے ہوئے ہم پورے طور سے جل کیوں نہیں جاتے۔

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا  ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

آتش کی صفت خاموش بہت مشہور ہے نالہ سے ناچار ہے فارسی۔ غیر از نالہ چارہ ندارد کا ترجمہ ہے۔ ورنہ اُردو میں نالہ کرنے پر مجبور ہے۔ بولتے ہیں۔

آگ پر پانی ڈالنے سے اس کے بجھتے وقت آواز نکلتی ہے اس سے ثابت ہے کہ درماندگی اور عاجزی میں منھ سے ضرور نالے نکل جاتے ہیں۔ اور انسان بلا ارادہ چیخ اٹھتا ہے۔

ہے وہی بدمستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ　　　جس کے جلوہ سے زمین تا آسمان سرشار ہے

سرشار - لبریز - کناروں سے بہ نکلنے والا - عذر خواہ - قبول کرنے کے لئے خواہاں عذر ہونے والا -
جس محبوب کے جلوہ سے زمین سے لے کر آسمان تک پر ہے اگر ہر ذرہ کائنات اس جلوہ کو دیکھ کر بدمست اور بے خود ہو جائے تو بعید کیا ہے - وہ جلوہ ہی ایسا ہے کہ بلا ارادہ ہر شے بدمست ہو جاتی ہے - لہٰذا ان کی بدمستی قابل درگذر ہے اور سزاوار مواخذہ نہیں -

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی　　　زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

معشوق عاشق کو یاد دلاتا ہے کہ تو (عاشق) ہم کو (معشوق) اپنی زندگی اور باعث حیات کہا کرتا تھا -
اب کیوں ہمارے (معشوق کے) التفات کے ہوتے ہوئے تو (عاشق) کیوں بے رخی اور رکھائی سے پیش آتا ہے -
اس پر عاشق جواب دیتا ہے کہ ہمارا تم کو زندگی اپنی کہنا یاد نہ دلاؤ کیوں کہ آج کل تو ہم اپنی زندگی سے بھی بیزار ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم تم سے بیزار ہیں جو ناممکن ہے -

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا　　　تجھ پہ کھل جائے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

کہ تا وہی فارسی ہے - تاکہ وزن میں نہ آیا - اس لیئے صاف تھا مگر وہ فارسی کے آگے اردو بولنا نہیں چاہتے -
(کھینچی اس لیئے) عربی کی طرح شعر معقد ہے -
خط کے عنوان پر یا لفافہ پر پتے سے پہلے ہم نے تصویر آنکھ کی اس لیئے کھینچ دی ہے تاکہ تجھ پر واضح ہو جائے کہ ہم کو حسرت دیدار ہے - بہت معمولی شعر ہے -

---

غزل ۱۵　　　شعر ۱

پینس میں گذرتے ہیں وہ کوچہ سے جو میرے　　　کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے　　　۱۵غ ۱

پالکی میں جب وہ میری گلی سے نکلتے ہیں تو کہاروں کو کندھا بھی بدلنے نہیں دیتے اور جلدی سے نکل جاتے ہیں -
جناب بیخود دہلوی نے اس شعر کے ساتھ واقعہ لکھا ہے کہ مومن خاں ایک مرتبہ غالب کے کوچہ سے

پینس پر سوار گذر رہے تھے۔ کہاروں نے کندھا بدلنا چاہا تو انھیں روک دیا (کہیں جلدی جانا مقصود ہوگا) غالب نے ان کی اس حرکت کو دیکھ لیا تو شکایت میں یہ شعر لکھ بھیجا۔ یہ واقعہ بھی ہو تب بھی اس شعر کے دیوان میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی جہاں اور نکال ڈالے اسے بھی نکال دیا ہوتا۔ بہرحال شعر بد مذاق ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ کندھا اور کاندھا دونوں طرح بولتے ہیں۔ بدلنے کے ساتھ کندھا۔ اور دینے کے ساتھ کاندھا۔ میرا خیال ہے کہ "دینے" کے ساتھ دونوں بولتے ہیں۔

---

## غزل ۱۶ اشعار ۴

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

عنقا بفتح اول اعنق کا صیغہ مؤنث ہے بمعنی طویل گردن والی۔ ایک خیالی اور وہمی پرندہ جس کی نسبت کہتے ہیں معلوم الاسم و معدوم الجسم۔ سلیمان حیئم نے ققنس۔ موسیقار۔ ہما۔ سیمرغ اپنے لغت انگریزی فارسی میں سب کے لیے PHOENIX اختیار کیا ہے۔ ہما کو BIRD OF PARADISE بھی کہتے ہیں۔ حیرت میں سکوت وصموت طاری ہو جاتا ہے۔ عنقا ہونا۔ ناپید ہونا کسی چیز کا۔ فضا = جو کائنات۔ خلامیاں زمین و آسمان۔ میدان ہستی چونکہ فضائے وسیع ہے اس سے تمنا کی کثرت دکھانا مقصود ہے۔

میری زندگی حیرت آباد تمنا کا وسیع میدان ہے۔ یعنی تمنا کی کثرت اور ان کے نہ پورا ہونے پر حیرت ہے۔ اور اس میدان حیرت میں نالہ ناپید ہے۔ یعنی حیرت کے ساتھ تمنائیں کثیر ہیں اور نالہ بھی بوجہ رسوائی نہیں کرسکتا۔

یہ مانا کہ بلند خیالی مضامین آفرینی جدت طرازی اس شعر میں ہے۔ مگر طرز ادا سے ایسا بعید الفہم ہوگیا ہے کہ معنی کی تلاش میں حظ و لطف شعر سب غائب غلا ہوگیا۔

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

موسم بفتح میم و کسر سین۔ فصل۔ عربی میں اس کے معانی مجتمع الناس۔ (میلا) بڑی عید ہیں۔

زمانہ خزاں ہو یا بہار ہو یا کوئی رت ہو۔ ہم ہوتے ہیں۔ قفس کی قید ہوتی ہے اور ماتم بال و پر کا رہتا ہے۔ جناب نظم نے اطناب کو بیان کرکے اس شعر کی چستی بندش دکھائی ہے۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم　　اثر فریاد دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

دلبر ۔ دل چھین لینے والا۔ القاب معشوق میں سے ہے۔ دیکھا ۔ میں الف ماضی کا ہے۔ اور دوسرے قوافی میں اصلی اور روی الف ہی ہے ۔ اہل ایران روی اصلی اور روی غیر اصلی کو باہم قافیہ قرار دینا ایطاء کی طرح معیوب سمجھتے ہیں اور اس کا نام شایگان رکھتے ہیں ۔ جب کبھی بالضرورت کہتے ہیں تو اس کا عذر کرتے ہیں۔ اُردو میں مطلع کے سوا اور کسی شعر میں ایطا نہیں مانتے اور شایگان تو ان کے نزدیک عیب ہی نہ رہا۔ تاہم ایسے آزاد غیر مقید قوافی بھلے نہیں معلوم ہوتے ۔

اے ہم دم وفاداری نہ کرنا اصلی اصول حسینوں کا ہے ۔ اگر کبھی وفا ان سے سرزد ہو جائے تو یہ امر اتفاقی ہوگا عاشق کے دل غمگین کی فریاد کا موثر ہونا تو آج تک تجربہ میں نہیں آیا۔

نہ لائی شوخی اندیشہ تاب رنج نومیدی　　کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے

سے　　نیاز شوخی اندیشہ تاب رنج نومیدی　　کف افسوس مالیدن جو تجدید تمنا ہست

شوخی اندیشہ ۔ اس کلمہ کی طرف جناب نشتر اور حسرت نے بھی توجہ نہ کی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے خیال نے از روئے شوخی یہ سکھایا کہ معشوق بے وفا ہے ادنیٰ التفات نہیں کرتا لہٰذا ترک عشق کر دو ۔ ہم کسی نہ کسی طرح بسر کر ہی لیں گے ۔ اس ترک تعلق سے ہمیشہ کی ناامیدی اور یاس ہو گئی ۔ مگر پھر وہی خیال دائمی محرومی کے رنج کی تاب نہ لا سکا۔ عشق کرتے رہنے میں کبھی تو ان کے مہربان ہو جانے کی امید ہوتی ہے ۔ لہٰذا افسوس میں ہاتھ ملنا اظہار پشیمانی میں نہیں ہے ۔ بلکہ انھیں تمناؤں کے ساتھ تجدید عہد تمنا کے لیئے بیعت کرنا ہے کہ ترک عشق میں ہم سے غلطی ہوئی ۔ کیوں کہ محمل افتراق دائمی اور تمنا سے بھی الگ رہنا امکان سے باہر ہو گیا۔

تجدید عہد تمنا وزن میں نہ آیا لہٰذا عہد تجدید تمنا کہہ دیا۔ یعنی از سر نو تمنا کا عہد کرتے ہیں اب اس سے دست بردار کبھی نہ ہوں گے۔　سے

پھر نیا عہد تمنا ہے

---

غزل ۱۷　　اشعار ۲

غ ۱۳۸ / ۲　　رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے　　نبض بیمار وفا دود چراغ کشتہ ہے

دود ۔ دھواں ۔ اور نبض کی ایک قسم رددی ہے جو رینگنے والے کیڑے کی طرح بہت آہستہ چلتی ہے ۔ جو ضعف پر دال ہوتی ہے ۔ بود چراغ کشتہ ۔ بجھے ہوئے چراغ کی ہستی ۔ استعارۃً بیمار و فا مراد ہے ۔ دود چراغ کشتہ : بجھے ہوئے چراغ کا دھواں جو رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے فنا ہو جاتا ہے ۔ جس طرح دھواں چراغ کا رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے فنا ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح نبض سُست ہوتے ہوتے رُک جاتی ہے ۔

اے ظالم میں بجھے ہوئے چراغ کی طرح ہوں میری ہستی کیا ہے جیسے نبض بیمار و فا کم ہوتے ہوتے رُک جاتی ہے ۔ اسی طرح یہ نبض بھی ہماری رفتہ رفتہ رُک جانے کو ہے ۔

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں ورنہ یاں بے رونقی سود چراغ کشتہ ہے

چوں کہ دل تم سے لگایا ہے ۔ یہ دل لگانے کی آرزو ہمیں بے چین کئے ہوئے ہے ۔ ورنہ سوز عشق تو دل کے لئے سراسر باعث نقصان ہے ۔ جس طرح شمع یا چراغ کا جلتے رہنا اس کے فنا کا باعث ہوتا ہے ۔ اور بجھ جانا اس کے بقا کا سبب ہے ۔

---

غزل ۱۸ اشعار ۳

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

نوا ۔ ہر نغمہ و آہنگ و آواز ۔ تو کہوے تو گوئی یا تو گفتی کہ مجملہ ادات تشبیہ فارسی میں ہے ۔ اسی کا ترجمہ ہے ۔ شعلہ آواز ۔ آواز کی کھنک ۔ جو آواز کے لئے خوبی ہے ۔ شعلہ بمعنی FLASH عربی لہب کا مترادف ۔ دھواں ۔ دُخان ۔ دھوئیں سے کاجل پارا جاتا ہے (اس معنی سے ایہام تناسب ہے ۔ ایران و عرب میں کاجل نہیں ہوتا ۔) سرمہ معدنی چیز ہے ۔ مسلمان کہتے ہیں کہ تجلی سے جو کوہ طور جل گیا ۔ وہی جلا ہوا پتھر سرمہ ہے ۔ ہر ہفت یعنی آرایش اور زینت کی چیزوں میں ایک یہ بھی ہے :- ۱ ۔ سفیداب ۲ ۔ سرخاب ۳ ۔ حنا ۴ ۔ وسمہ ۵ ۔ زرک زریں (افشاں) ۔ ۶ ۔ سرمہ ۷ ۔ خال یا غالیہ ۔ کہتے ہیں کہ سرمہ اور سیندور کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے ۔ چراغ میں سرسوں کا تیل ڈال کر موٹی بتی روئی کی اس میں جلاتے ہیں اور اس کے شعلہ پر ایک کورا سکورا مٹی کا لوے ذرا اونچا ڈھک دیتے ہیں ۔ اس میں جو دھواں جمع ہوتا ہے اس سے کاجل بناتے ہیں ۔ مصنف مرحوم نے کاجل کی باتیں سرمہ پر عائد کر دیں چوں کہ دونوں زیبائی اور حسن چشم کا کام دیتے ہیں ۔ یا محض سیاہی کی وجہ سے سرمہ کو دود شعلہ کہہ دیا ۔ نوا ۔ بارہ مقام (راگ) موسیقی میں سے ایک مقام (راگ) کا نام ۔ کہتے ہیں کہ فیثا غورث نے بارہ بروج فلکی کی حرکت و آواز سے بارہ

راگ اور ہر ایک کی پستی و بلندی (زیر و بم) سے دو دو نغمے ایجاد کئے۔ کوئی موسیقار ایک خیالی پرندہ کو وجہ ایجاد ٹھہراتا ہے۔ کوئی لحن داؤدی کو سبب ایجاد موسیقی قرار دیتا ہے۔ بہر طور ہندی موسیقی اس سے الگ ہے

سرمہ بھی گویا کہ دود شعلۂ آواز ہے

چشم حسیناں اگرچہ گویائی نہیں رکھتی ہے مگر اشاروں میں اپنا سب مطلب ادا کر لیتی ہے۔ اور سرمہ جو آنکھوں میں ہے۔ وہ اس شعلہ آواز کا دھواں ہے۔

شعلہ سے اوپر دھواں ہوتا ہے۔ آواز کی (کھنک) کو شعلہ بھی کہتے ہیں مگر آواز کا تو وجود ہی نہیں اشاروں سے باتیں ہو رہی ہیں تو آواز کہاں سے پیدا ہوئی۔ یہی تاویل کر سکتے ہیں چاہے اچھی ہو یا بری مگر بات کا وسیلہ آواز ہے۔ اور جب اشارے آواز کا کام دے رہے ہیں تو مثل آواز ہے۔ مگر جو شئے بمنزلہ آواز پائی جائے اس پر حکم اصل آواز کا بہت تصنع ہوگا۔ بہر طور میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ یہ سب مان لینے کے بعد بھی حاصل مضمون شعر میں بھی کچھ لطف نہ پیدا ہوا۔

پیکر عشاق ساز طالع ناساز ہے    نالہ گویا گردش سیارہ کی آواز ہے

عشاق جمع عاشق اور بارہ مقامات موسیقی میں سے ایک مقام کا نام۔ طالع = راس۔ برج۔ ناساز = ناموافق۔ ساز = باجہ۔ سیارہ = گردش کرنے والا ستارہ = یہ میں ابھی لکھ چکا ہوں کہ فیثا غورث نے آواز گردش سیارہ سے موسیقی ایجاد کی۔

جسم عشاق ایک باجہ بخت مخالف کا ہے۔ اور نالہ اس پیکر میں جو باجہ کی طرح ہے گردش سیارہ مخالف کی آواز (سُر) ہے۔

دستگاہِ دیدۂ خونبار مجنوں دیکھنا    یک بیابان جلوۂ گل فرش پا انداز ہے

دستگاہ = دسترس۔ سامان۔ کارخانہ۔ اس میں لفظ دست پا کے مناسب ہے۔ دیدۂ خونبار سے جلوہ گل اور فرش پا انداز بنایا ہے۔ فرش پا انداز کسی معزز کی آمد پر سواری سے اُترنے کی جگہ سے نشست گاہ تک مخمل یا شالباف (ٹول) کا فرش بچھاتے ہیں۔ یک بیابان اظہار وسعت و کثرت کے لیئے ہے۔

چشم خونبار مجنوں کی وسعت و دسترس قابل دید ہے کہ سارا بیابان (بوجہ خونباری) گلوں کا فرش پا انداز بنا ہوا ہے۔

تخئیل بلند سہی مگر تینوں شعر تصنع غیر دل چسپ کی پوٹ ہیں۔ اول تو میری پسند اور ناپسند چیز ہی کیا ہے تاہم مجھے پسند نہ آئے۔

---

## غزل ۱۹ اشعار ۱۰

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی  میری وحشت تری شہرت ہی سہی

عشق تعلق خاطر۔ افراط حب۔ عشقہ (عشق پیچہ۔ لبلاب۔ انبربیل۔ اکاس بیل) جس درخت پر چھا جاتی ہے اسے خشک کر دیتی ہے۔ یہی حال عشق کا ہے۔ ارسطو کہتے ہیں کہ محبت فطری چیز ہے۔ اور عشق نام افراط محبت کا ہے۔ افراط و تفریط میں وہی مبتلا ہوتا ہے۔ جس کے دماغ کا توازن ٹھیک نہیں ہوتا ہے۔ وحشت = نفرت۔ خلوت۔ خوف۔ ہم انقباض خاطر از خلوت۔ انقطاع = دوری قلب از مودت۔ نفرت از انسان۔

یہ مانا کہ تمہارے سمجھنے کے موافق مجھ میں عشق نہیں ہے صرف وحشت اور جنون ہے۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ میری وحشت سے تمہاری شہرت تو ہوتی ہے۔ عداوت = ظلم۔ بغض۔ نگاہ پھیر لینا۔

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے  کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم سے ترک تعلق تو نہ کرو۔ اگر الفت و محبت نہیں کرتے ہو تو عداوت ہی سے پیش آؤ۔ بالکل بے گانگی تو ٹھیک نہیں۔

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی  اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

رسوائی = فضیحت۔ بدنامی۔ اے = اس محل پر سخت برا معلوم ہوتا ہے۔ اس بات کو سلامت طبع ہی سمجھ سکتی ہے۔ اچھا۔ مانا۔ یا ہاں چاہیئے۔ خلوت = تنہائی۔ خلاء سے مشتق ہے۔

یہ مانا کہ مجلس نہیں ہے جس میں عام اجازت داخلہ کی ہوتی ہے۔ تم اپنی خلوت میں بھی اگر ہم کو آنے دو تو اس میں تمہارے لئے کیا برائی ہو گی۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے  غیر کو تجھ سے محبّت ہی سہی

دشمن دو عدو و معروف اور شمان بمعنی ضد سے مرکب ہے یعنی عدو۔ مخالف۔ محبّت بفتح میم مصدر میمی از حب بمعنی دوستی۔

اچھا یوں ہی سہی کہ رقیب کو تم سے محبت ہے مگر ہم بھی تو اپنی ذات کے دشمن نہیں ہیں ہم تم تو مصداق اس

شعر کے ہو رہے ہیں ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

لہٰذا جب ہم تم ایک ذات ہو چکے ہیں تو تم سے دشمنی اپنی ذات سے دشمنی ہے اور کوئی اپنا آپ دشمن نہیں ہوا کرتا ہے۔ غیر کو اگر محبت کرنے والا بھی مان لیا جائے تو میرا ایسا اتحاد ذاتی اسے کب حاصل ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں۔ پھر ہم تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کیوں کریں جب تجھے غیر کی محبت کا یقین ہو گیا۔

جناب حسرت کا ارشاد ہے۔ اچھا اگر غیر کو تجھ سے محبت ہے تو یہی سہی۔ ہم کو بھی اپنے ساتھ دشمنی نہیں ہے کہ تیرے اس قول کے ہوتے ہوئے بھی دعویٰ محبت کئے جائیں اور تکلیف رشک برداشت کریں۔

جناب آسی۔ ان دونوں بزرگوں کے معنی ملا کر لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر غور کیا جائے تو لفظ (بھی اور سہی) اس بات کے شاہد ہیں کہ مصنف یہ کہنا نہیں چاہتے جو سمجھا گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ غیر کو تجھ سے محبت سہی (ہم بھی جانتے ہیں) (اس جملہ نے معنی بگاڑ دئے، کیوں کہ عاشق کو یہ قبول کب ہے۔ بلکہ قول معشوق کو نقل کر رہا ہے) مگر ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں۔ ہم بھی تو اپنے ہی ہیں۔ ہم کو بھی تجھ سے محبت ہے پھر ہم کو اس کے مقابلہ میں ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے۔

(بھی اور سہی) کا یہ زور (فورس) ہے کہ بادلِ ناخواستہ تمہارے کہنے کو مانے لیتے ہیں کہ غیر کو تم سے محبت ہے۔ مصرع کی نثر یہ ہے "ہم بھی تو اپنے دشمن نہیں ہیں" اس کے یہ معنی کب ہو سکتے ہیں کہ ہم بھی تمہارے اپنے اور یگانہ و دوست ہیں۔ یہ مطلب یوں ادا ہوتا "ہم اپنی ذات کے دشمن نہیں اور تمہارے اپنوں میں ہیں" اپنے "بمعنی یگانہ و دوست اس ترکیب ادا میں ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ میں چند مرتبہ لکھ چکا ہوں کہ جب ان دونوں بزرگوں سے کوئی الگ راستہ اختیار کرتے ہیں اور جدت دکھانا چاہتے ہیں تو ہمیشہ بھٹک جاتے ہیں اور اپنے ذہنی اور تو ہمی معنے لکھ دیتے ہیں جن کو الفاظ شعر اور ترکیب ادا سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں ہوتا ہے۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

آگاہی اور عرفان بھی اگر ہو تو اپنی ذات سے ہونا چاہئے جیسا کہ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب فرماتے ہیں من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ جس نے اپنی ذات کو پہچانا اس نے اپنے پروردگار کو پہچانا۔ اور اگر یہ مرتبہ عرفان نہ حاصل ہو سکے تو اپنی ذات کو بھول جانا اور سوائے ذات واجب اور کسی کو موجود

نہ سمجھنا یہ بھی مرتبہ فنانی اللہ ہے اور نہایت بلند ہے۔ جناب نظم اس کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ عرفا اور حقیقت شناس کے کلمات میں بھی اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام        دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی

برق خرام۔ تیز رفتار۔ دل کے خون کرنے سے مراد مبتلائے عشق ہونا ہے۔
اگرچہ عمر بہت جلد گذرنے والی ہے۔ پھر بھی اتنی ہی مدت اور وقفہ میں دل کا خون تو کیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں نون بعد حروف مدّ بلا ترکیب فارسی اعلان کے ساتھ بہ نسبت اخفار کے فصیح ہے۔

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں        نہ سہی عشق۔ مصیبت ہی سہی

سہی پہلا لفظ (سہی) حرف ہے (مان لو) اور دوسرا بننے سے ماضی اور حرف دونوں ہو سکتا ہے۔
اے محبوب تو ہمارا عشق تسلیم نہیں کرتا۔ اچھا یوں ہی سہی۔ ہمارے لئے وہ مصیبت ہی سہی مگر کیا ہم تمہاری وفاداری کو ترک کر دیں گے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا چاہے تم ہمارا عشق مانو یا نہ مانو۔

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف        آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

رخصت۔ اجازت۔
اے فلک ظالم اگر کوئی خوبی عشق میں تو حاصل ہونے نہیں دیتا تو کم از کم آہ و فریاد ہی کی اجازت دے گھٹ گھٹ کے تو نہ مروں۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے        بے نیازی تری عادت ہی سہی

اب تک تو ہم مراد نہ پوری ہونے پر اضطراب اور بے چینی سے کام لیا کرتے تھے۔ لیکن جب دیکھا کہ تیری عادت بے نیازی کی ہے تو اب ہم بھی رفتہ رفتہ تسلیم و رضا کی خصلت پیدا کریں گے۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ        گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

یار سے اے اسدؔ اظہار حسرت و آرزو دے وصل برابر کئے جاؤ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ تمہاری تمنا کبھی پوری نہ کریں گے۔ مگر سکوت و خموشی بھی اچھی نہیں۔ اور کچھ نہیں تو چھیڑ چھاڑ تو رہے گی۔ دل لگانے کو یہ بھی بہت ہے۔

غزل ۲۰      اشعار ۵

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے      صبح وطن ہے خندۂ دندان نما مجھے

میں عشق کے ہوتے ہوئے سکوت وصموت کے ساتھ چپ چاپ بیٹھا ہوا ہوں اور تلاش یار میں مارا مارا نہیں پھرتا ہوں اس پر اگر ملامت و سرزنش مجھے کی جائے تو بجا ہے۔ چنانچہ وطن میں جو صبح کی سپیدی ظاہر ہوتی ہے وہ خندہ دندان نما کے ساتھ میری تضحیک میرے اس فعل پر کرتی ہے اور بجا کرتی ہے۔ سعی تو ہونا چاہئے چاہے مطلب برآئے یا نہ برآئے۔

ڈھونڈھے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی      جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

ایسے مغنی (گویے) آتش نفس کو دل ڈھونڈتا ہے کہ جس کی آواز دل کش جلوۂ برق فنا کا کام کرے یعنی مجھے فنا فی المحبوب بنا دے۔

مغنی کے ذکر کی خوبی میں نہ سمجھ سکا۔ اگر جلوۂ یار کو اپنے فنا کا باعث قرار دیتے تو شاید اس سے کچھ اچھی بات ہوتی۔ مثلاً ؎

جویا ہے ایسے جلوۂ آتش نشاں کا جی      جو جلوہ ہو مماثل برق فنا مجھے

میں شاعر نہیں ہوں کوئی شاعر اس مفہوم کو اس سے اچھے الفاظ درچست بندش میں ادا کر دے تو ذکر مغنی سے شاید ذکر محبوب غزلیت سے زیادہ مناسب ہو۔

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادی خیال      تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

کروں ہوں اب متروک ہے۔ اس کی جگہ کرتا ہوں بولتے ہیں۔ مجنوں کے خیالات منتشر رہتے ہیں اس لیئے اس کی باتیں انمل بے جوڑ ہوتی ہیں لیکن مست کو جو خیال نشہ میں بندھ جائے اسی دھن میں نشہ اترنے تک رہتا ہے۔ جب تک ایسی ہی کوئی بات نہ بتائی جائے اس وقت تک بازگشت کے خیال نہ پیدا ہونے کی علت ظاہر نہیں ہوتی۔ کسی شارح نے ادھر توجہ نہ کی۔

میں جستجوئے یار کی وادئ خیال کو مستوں کی طرح اسی ایک خیال میں مستغرق ہو کر اس لیئے طے کر رہا ہوں تاکہ اس وادی سے انصراف اور واپسی کے خیال سے مجھے کچھ مطلب نہ رہے اور اسی دھن میں لگا رہوں۔

وادی ۔ اصطلاح جغرافیہ میں وہ میدان جس میں نہر کا پانی بحالت طغیانی جہاں تک چڑھ جائے مگر استعمال بمعنی صحرا ہوتا ہے۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں　　آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے

نکہت بکاف عربی بوئے دہن مگر مستعمل بمعنی خوشبو۔ کاتبوں نے اسے بکاف فارسی بنا دیا۔ اور رہایش بمعنی بود و باش و قیام پنجاب سے آیا۔ یوپی کے کاتب بھی کاف فارسی سے نگہت لکھنے لگے اور رہایش اخبار اور رسالوں میں آنے لگا۔

چوں کہ تم باغ میں بے حجابی بے شرمی۔ شوخی۔ نشاط سے کام لیتے ہو اور کھل کھیلتے ہو اس لیئے مجھے خوشبوئے گل سے شرم آتی ہے۔ خوشبوئے گل تو بے حجاب ہو کر تمام میں آوارہ ماری ماری پھرتی ہے اور تم اس سے بھی زیادہ میرے معشوق ہو کر بے حجاب ہو تو پھر مجھ کو بوئے گل سے شرم کیوں نہ آئے۔

جس طرح معشوق کا پردہ نشین اور خشمگین ہونا منجملہ صفات مانتے ہیں اسی طرح بے حجاب و بے باک شوخ اور چنچل ہونا بھی ایک انداز دل فریب مانتے ہیں۔ جب اسے ایک انداز معشوقانہ مان لیا تو پھر نکہت گل سے شرمانے کی وجہ کیا ہوگی۔ آدمی شرماتا ان امور سے ہے جن کا ارتکاب اسے پسند نہ ہو۔

جناب آسی ارشاد فرماتے ہیں۔ چوں کہ تو باغ میں بے حجابیاں کرتا ہے اور نکہت گل اس کا حظ اٹھاتی ہے اسی بنا پر اب نکہت گل سے مجھے شرم آتی ہے کہ وہ ایک کامیاب رقیب ہے۔ اب میری نظر اس کے سامنے نہیں اٹھتی۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ　　شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

چوں کہ میرے اشعار عاشقانہ اور رندانہ ہیں اس لیئے انتخاب اشعار سے لوگ میرے دلی رجحان کو سمجھ گئے کہ میں عاشق مزاج اور رند ہوں۔ اور اس انتخاب سے میری رسوائی ہوئی۔

محض انتخاب سے نہیں بلکہ اس کے شائع کرنے سے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ کڈھب اور بے معنی کہنے والا شاعر کہنے لگے۔ چنانچہ ان کو کہنا پڑا۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

---

غزل ۲۱ شعر ۱

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذرے غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے ۱۵۱غ ۱

گذرے اگر بیائے مجہول ہو تو ردیف (رکھتے ہیں) ہونا چاہیئے۔ اور اگر بیائے معروف ہو تو جو ردیف ہے ٹھیک ہے۔
اے غالب جب اپنی زندگی برے احوالوں (حالوں) گذر رہی ہے تو ہم کیا یاد کریں گے کہ ہمارا بھی کوئی خدا تھا۔ مصرع ثانی بالکل محاورہ میں ڈھلا ہوا ہے۔

---

غزل ۲۲ اشعار ۹

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے ۱۵۲غ ۹

محبوب کی محفل میں حیا۔ غیرت اور حمیت کو بالائے طاق رکھے بغیر چارہ نہیں ہوتا ہے۔ درمیان محبوب و رقیب خوب اشارے بازی ہوتی رہی مگر مجھ سے اٹھا نہ گیا کیوں کہ دل ان کو چھوڑ کے چلے جانے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ جناب نظم فرماتے ہیں گو سب لوگ اشارے کرتے رہے اور آوازے کستے رہے۔ جناب حسرت فرماتے ہیں۔ بیٹھا رہا یعنی بے حمیتی سے۔ اگرچہ اغیار میری جانب ازراہ تمسخر وطعن اشارے کرتے رہے۔

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

صدا۔ آواز بازگشت و مستعمل بمعنی مطلق آواز۔ اردو میں فقیروں کے آواز لگانے کو کہتے ہیں۔ سیاست = استصلاح خلق از ہدایت و بمعنی تادیب و سزا۔ آواز دینا اور آواز لگانا محاورہ ہے نہ صدا کرنا۔
میں تم سے ملنے کے لیئے تمہارے در پر گیا مگر دربان کے ڈر سے آواز نہ لگا سکا کہ مارے پیٹے گا۔ دھکے دے کے نکال دے گا۔ دل ہی تو ہے مصائب اٹھاتے اٹھاتے کمزور ہو گیا ہے۔ لہٰذا بے چون وچرا پلٹ آیا۔ ورنہ میں تمہارے در پر جاؤں اور فقیروں کی طرح آواز بھی نہ لگاؤں اور چپ چاپ واپس آجاؤں یہ مجھ سے کب ہو سکتا ہے۔ یہ شعر بد مذاق ہے۔ میرے نزدیک دوسروں کا حال نہیں معلوم۔ صدا کروں فارسی کا ترجمہ ہے۔ اردو میں صدا لگانا۔ آواز لگانا۔ آواز دینا۔

مدت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کئے　　رکھتا پھروں ہوں خرقہ و عمامہ رہن مے

رکھتا پھروں ہوں = اب رکھتا پھرتا ہوں بولتے ہیں۔ خرقہ = گدڑی۔ پیوند دار اور پھٹا ہوا جامہ۔ آب و ہوا = مراد فصل بہار مگر بزبردستی۔ عمامہ بکسر عین۔ دستار۔ پگڑی TURBAN ۔ دعوت بہار۔ مراد بہار میں شراب خواری۔ اضافت بادنی ملایست ہے۔

پھر بہار آگئی۔ پیسہ پاس نہیں یا زہد اختیار کرلیا تھا اب زہد سے اکتا گیا ہوں لہذا دستار اور خرقہ لیئے پھرتا ہوں کہ اس کو گرو کرکے شراب پی لوں کیوں کہ ایک مدت ہو چکی ہے جب فصل بہار میں مے نوشی کی تھی۔ زہد میں کچھ مزہ نہ پایا لہذا مے خواری کو پھر دل چاہتا ہے۔

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے　　بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر

صرفہ = فائدہ ۔ خضر بکسر اول وسکون ثانی و ثالث۔ یا بفتح اول وکسر ثانی نام پیغمبر کا۔ خضرت بمعنی سبزی سے مشتق ہے کیوں کہ ان کا لباس سبز مانتے ہیں۔ مسلمان ادریس ۔ الیاس ۔ خضر۔ عیسٰی اور بارھویں امام مہدی کو زندہ مانتے ہیں۔ سنیوں میں بھی امام مہدی کے پیدا ہو چکنے اور زندہ رہنے کی روایت پائی جاتی ہے (ایک مولوی فرنگی محلی لکھنوی کی کتاب وسیلۃ النجات دیکھو) حضرت = مراد خضر۔ معنی لغوی حضرت اور جناب کے بارگاہ ہیں، مگر بجائے کلمہ تعظیم مستعمل ہیں۔ کل = فردا مراد قیامت۔

عمر چاہے کتنی بڑی حضرت خضر ہی کی اتنی ہو مگر بے فائدہ ہی گذرتی ہے۔ چنانچہ حضرت خضر بھی کل قیامت میں کہیں گے کہ اتنی مدت دنیا میں زندہ رہ کر ہم نے کیا کام کیا۔

تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے　　مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ او لئیم

مقدور ہو = ممکن ہو۔ قدرت ہو۔ لئیم وہ کنجوس جو نہ خود کھائے اور نہ کسی کو کھلائے۔ گنجہائے گرانمایہ = قیمتی اشیا کے خزانے کنایہ قابل اور ذی علم آدمیوں سے ہے۔

اگر مٹی میں قابلیت جواب دینے کی ہوتی تو میں اس سے پوچھتا کہ وہ بڑے بڑے علما و حکما و شعرا جو مر کے تجھ میں دفن ہوئے انھیں تو نے کیا کیا۔ سڑا گلا کے خاک سیاہ کر دیا۔ حالاں کہ وہ قابل قدر اور محفوظ رکھنے کے قابل تھے جس طرح لئیم رقم کو جمع کرتا رہتا ہے اور اسے صرف نہیں کرتا۔ تو نے لئیم ہو کر ان خزانوں کو برباد اور تباہ کر دیا۔ لئیم بمعنی قابل ملامت بھی ہے اور اس محل پر یہی معنی اچھے ہیں۔

جناب آسی گنجہائے گرانمایہ سے سونا چاندی اور جواہر ہی مراد لیتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے اس صورت میں یہ شعر نہ تغزل کا رہا نہ صوفیانہ اور نہ ناصحانہ اور نہ عبرت انگیز۔ اور زمین سے اس خزانہ کے دریافت کرنے کا کیا فائدہ۔ انسانوں نے نکال لیئے اور جب کوئی کان معلوم ہو جاتی ہے نکالتے رہتے ہیں۔ اور نکالتے رہیں گے۔ جب بھی حدت دکھاتے ہیں ایسی ہی بے تکی اُڑاتے ہیں۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو　　کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

تہمت کے ساتھ مصادر گڑھنا۔ لگانا۔ دھرنا۔ باندھنا۔ (تراشنا)۔ گڑھنے کا ترجمہ کر دیا اور محض آرے کی مناسبت سے لاتے۔ آرے چلنا = کسی کو مصیبت اور عذاب میں مبتلا رکھنا۔ عورتوں کی بولی ہے۔ مرد کم یا بولتے ہی نہیں۔

کس دن ہم پر تہمتیں رقیبوں نے نہیں گڑھیں اور الزام نہیں لگائے۔ اور کون سا ایسا دن تھا جس میں ہم پہ مظالم نہیں ہوئے۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو یہ خو کہیں　　دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

التجا = عربی میں پناہ لینا۔ اردو میں مانگنا۔ سوال کرنا۔

بغیر مانگے بوسہ دینے کی عادت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو صحبت غیر میں پڑی ہے (عاشق کی کوئی تمنا تو وہ کبھی پورا نہیں کرتے تھے اب جو وصال میں بغیر سوال بوسہ عاشق کو دے دیا تو یہ بدگمانی اس کو پیدا ہوئی اور ساری خوشی مبدل بملال ہو گئی) یہ افادہ جناب نظم کا ہے۔ معشوق بازاری ہو گیا۔ یہ شعر مجھے پسند نہ ہوا۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں　　بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے

خو = عادت۔ خصلت۔ جو چیز کہ بھولے سے ہو اسے خو نہیں کہتے ؎

ضد کی ہے اور بات برا کس طرح کہیں

اپنی عادت کے خلاف سہواً اس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے۔ ضد کی وجہ سے جو جی چاہے کہو مگر حقیقۃً یہ بات بھی تو بری نہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ مطلب صاف ہے۔ مگر مہمل کلام معلوم ہونے ہی سے خوبی اس کی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی ہمدرد نے سمجھایا کہ وہ وعدہ خلاف اور بے وفا ہے اس سے محبت نہ کیا کرو۔ مگر عاشق کو بوجہ محبت اس کا کوئی فعل برا

نہیں معلوم ہوتا لہٰذا ہمدرد کو جواب دے رہا ہے۔

جناب آسی کی بھی ایک سن لیجیے (اگر اسے ضد چڑھ جائے تو خیر اس کا تو ذکر نہیں) مگر واقعی اس کی عادت بری نہیں ہے۔ چنانچہ اگر بھول گیا ہے تو بہت سی دفعہ اس نے وعدے وفا کر دیے ہیں۔

غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا　　مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

غالبؔ اپنے کسی ہمدرد سے طالب مشورہ ہے کہ ہم سے اب تکلیف ہجر اٹھائی نہیں جاتی لہٰذا اپنا حال ان سے کہنے جاتے ہیں۔ تو ہمدرد غالبؔ کو سمجھاتا ہے کہ اور کسی کو تو جانے دو تمہیں ذرا سوچ کے بتاؤ کہ ان سے تم کو جواب کیا ملے گا۔ یہ ہم مانے لیتے ہیں کہ ان تک تمہاری رسائی بھی ہو گئی اور تم کو اپنا درد دل کہنے کا بھی موقع مل گیا۔ اور انھوں نے تمہاری سب باتیں سن بھی لیں۔ اس کے بعد ان کا جواب کیا ہو گا۔ یہی نا کہ یا خاموش رہیں گے یا کسی تمنا کے پورا کرنے سے انکار کر دیں گے۔ پھر جانے کا کیا فائدہ ہوا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تجاہل عارفانہ ہو اور غالبؔ اپنے دل سے باتیں کرتے ہوں۔

---

غزل ۲۳　　　　اشعار ۷

رفتارِ عمر قطع رہِ اضطراب ہے　　اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے　　صحیح

آفتاب = آف سورج۔ تاب چمک جیسے خور۔ سورج۔ شید۔ نور۔ شمس اور دھوپ۔ دونوں معنی ہیں۔ صاحب غیاث اس کی ترکیب آفت آب سے بتاتے ہیں۔

عمر کی رفتار راہ کو بحالت اضطراب طے کر رہی ہے یعنی عمر بے چینی اور اضطراب میں کٹ رہی ہے۔ لہٰذا اس سال کا حساب بجائے آفتاب برق سے لگانا چاہیے۔ حالاں کہ سال کا حساب گردش شمسی پر منحصر ہے۔

مصرع ثانی کو ربط جبھی ہو گا جب اضطراب کے معنی (بسرعت) کیے جائیں اور یہ معنی مجھے معلوم نہیں۔ عربی میں تحرک۔ تموج۔ اختلال امور۔ تردد و ارتیاب کے ہیں۔

مینائے مے ہے سرو۔ نشاط بہار سے　　بال تدرو جلوۂ موج شراب ہے

مینا = سبز رنگ کے شیشہ کی صراحی۔ تدرو بدال مہلہ۔ کبک۔ چکور ایک قسم کا پہاڑی تیتر۔ شعرا سرو کے ساتھ فاختہ کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ نشاط بفتح نون سرعت۔ چستی۔ پھرتی۔ فارسی میں بمعنی خوشی مستعمل ہے۔ ظاہر ہے کہ بجائے نشاط اس محل پر (نمو ہے) کی ضرورت ہے۔ مگر یہ کہ کہیں خوشی میں بھی پھولتے ہیں۔ بال تدرو = فارسی میں کنایۃً لکا بہ

بھی مراد لیتے ہیں اور وہ بھی بہار کے لوازم میں سے ہے۔

بہار کی خوشی میں مینائے سبز رنگ پھول کے سرو کا لطف دکھا رہی ہے۔ اور بازوئے کبک (لکۂ ابر) موج شراب کا جلوہ دکھاتا ہے۔ پہلے مصرع کے تتبع ادا سے یہی معنی ہوتے ہیں۔ ورنہ دوسرے مصرع کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جلوہ موج شراب بال تدرو کا لطف پیدا کر رہا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ صحبت شراب میں باغ کا مزہ آرہا ہے۔

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا      نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

پاشنہ = ایڑی۔ گون بفتح اول ترکیب۔ تدبیر۔ ڈھب۔ طریقہ۔ اس کے ساتھ گھات بھی ملا کر بولتے ہیں۔ ثبات = استقلال۔ استحکام۔ نے = ہو یا نا اُردو میں ایسے محل پر ناگوار ہے۔ پاشنہ اُردو میں نہیں بولتے (ایڑی) کے قیاس پر مؤنث ہونا چاہیئے۔

استقلال کی ایڑی صحرانوردی یا عشق میں قائم رہنے کی وجہ سے زخمی ہو رہی ہے۔ نہ بھاگ کے اس سے پیچھا چھڑانے کی تدبیر آتی ہے۔ اور نہ اس پر قائم رہنے کی طاقت ہے۔

جاداد بادہ نوشی رنداں ہے شش جہت      غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

جاداد = جاداد فارسی میں دونوں طرح صحیح ہے اور ترکیب فارسی بھی ہے۔ پھر بھی اُردو میں کان عادی (جایداد) سننے کے ہیں۔ اس لیئے سماعت پر گراں (جاداد) گذرتا ہے۔ گیتی = دنیا۔ عالم۔ یہ دونوں مانوس الفاظ وزن میں بھی آتے ہیں مگر ان کی جگہ (گیتی) کو اختیار کیا۔ خراب = ویرانہ۔ مست۔

تمام عالم رندوں کی بادہ نوشی کے لیئے جاگیر ہے۔ مگر جو لوگ کہ غافل ہیں اور ان کی نظر حقیقت بین نہیں وہ دنیا کو ویرانہ خیال کرتے ہیں۔

اس طرح یہ شعر ادعائے محض ہوگا۔ اگر استعارات سے کام لیا جائے تو یہی شعر بلند مرتبہ ہو سکتا ہے۔ رند سے مراد مست مے معرفت۔ بادہ نوشی سے مراد ہے عرفان و شناسائی۔

یعنی دنیا کی ہر چیز سے اگر چشم حقیقت شناس ہو تو معرفت الٰہی حاصل ہو سکتی ہے مگر زہاد و عباد اپنی غفلت شعاری سے دنیا کو ویرانہ سمجھ کر اس کے ترک کی تعلیم دیتے ہیں۔

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا      جوش بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

حریف = مقابل۔ مراد دیکھنے کی قابلیت رکھنے والا۔ برق جب تک بادل میں چمکتی ہے برق ہے۔ اور اگر گر پڑے تو

صاعقہ ہے۔ بجلی کی چمک آنکھ کو خیرہ کردیتی ہے۔ جوشِ بہار کنایہ ہے۔ اور مناظرِ ہیچ دنیا ہے۔

اس محبوبِ حقیقی کے حسن کی برقِ درخشاں کا نظارہ کون کرسکتا ہے جبکہ مناظرِ ہیچ دنیا اس کے جلوۂ حسن پر نقاب کا کام کررہے ہیں۔ نقاب چہرہ کے دیکھنے کو مانع ہوتی ہے اسی طرح باوجود ظہور مستلذات دنیوی اس کے دیکھنے کو مانع ہیں اور اس کا حسن پردہ خفا میں رہتا ہے۔

میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں ۔۔۔ مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

یہ مانا کہ نگاہ کو تمہارا دیدار کبھی کبھی ہوجاتا ہے مگر میرے دل نامراد اور مضطرب کو تو تسلی نہیں ہوتی وہ تو خواہانِ وصال ہے۔

گذرا اسدؔ مسرّتِ پیغامِ یار سے ۔۔۔ قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

قاصد ان سے بات چیت کرے گا۔ اس کے رشک ہم کلامی کی وجہ سے اگرچہ وہ پیغام یار لائے گا اور اس سے مجھے مسرت ہوتی ہیں اس سے بھی ہاتھ اٹھاتا ہوں اور قاصد کو ان کے پاس بھیجنا نہیں چاہتا۔

---

غزل ۲۴ ۔۔۔ اشعار ۹

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ۔۔۔ میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

رشک = غبطہ کسی کی خوبی کو دیکھ کر اپنے لئے اس خوبی کا خواہاں ہونا بغیر اس کے کہ اس خوبی کے زوال کی خواہش اس دوسرے سے ہو۔ اور حسد دوسرے کی زوال نعمت چاہنا بغیر اس کے کہ یہ نعمت متمنی کو ملے۔ امراض نفسانی ہیں سے اول مرتبہ جہل مرکب کا ہے اور دوسرا نمبر حسد کا ہے۔

یہ میری بدقسمتی تو دیکھو جب وہ میرے سامنے آجاتے ہیں تو مارے رشک کے میں ان پر نظر نہیں ڈالتا کیوں کہ مجھے خود اپنی ذات سے رشک پیدا ہوتا ہے۔ اور میں اپنا آپ رقیب بن جاتا ہوں۔ یہ انتہا رشک کی ہے کہ اپنے آپ کو بھی دیدار یار سے محروم رکھتا ہوں جس طرح لئیم اپنی نعمت سے خود محروم اور بے نصیب رہتا ہے۔ (آخر پھر چاہتے کیا ہیں) یہ مضمون چاہے کتنا ہی نیا ہو مگر مجھے پسند نہ آیا۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ قیاس مصنف درست ہے کیوں کہ رشک بھی ایک طرح کا بخل ہی ہے۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے    آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

آبگینہ ۔شیشہ ۔کانچ ۔استعارہ دل نازک سے ہے اور گرمی اندیشہ کو تندی شراب سے تعبیر کیا ہے۔ ردیف (جائے ہے) کی جگہ اب جاتا ہے بولتے ہیں۔

غالب کے اس شعر سے اور ذوق کے مطلع سے مومن کا مطلع اچھا ہے۔ ؎

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے    تھامتا ہوں دل کو دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

غالب کا شعر تصنع سے خالی نہیں۔

میرے خیالات میں اگر یہی گرمی ہے جس سے میری حالت متغیر ہو رہی ہے تو دل سے ہاتھ دھو بیٹھنا لازم ہے۔ یہ خیالات کی شراب تو ایسی تند اور تیز ہے جس سے مینائے دل پگھلی جاتی ہے۔

غیر کو یارب وہ کیوں کر منع گستاخی کرے    گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

جناب نظم ۔حیا کو ذی روح PERSONIFY فرض کیا ہے۔ (یعنی شخص حیا سے بھی شرما جاتا ہے)۔ جس کے آنے سے معشوق کو حیا آجاتی ہے۔ مطلب یہ کہ اس قدر شرم ہے کہ رقیب کو گستاخی کرنے سے بھی منع نہیں کرتا۔

جناب حالی ۔گر حیا بھی اس کو آتی ہے۔ یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش سے شرما جائے ہے یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے (یادگار غالب)۔

جناب آسی ۔غیر کے چھیڑنے اور گستاخی کرنے سے اس کو شرم آتی ہے تو وہ اس شرم سے بھی شرما جاتا ہے۔ یا شرما جانے سے یہ مراد ہے کہ اس کو شرم ضرور آتی ہے۔ وہ غیر سے بولنے اور اس کے ساتھ تکرار کرنے سے شرماتا ہے۔

ظاہر ہے کہ نظم حالی ہی کے مطلب کو لکھنا چاہتے ہیں۔

جناب نظم کی بات ادا کرنے کے لئے مصرع ثانی یوں ہونا چاہیے ؎

گر حیا آتی ہے اس سے بھی وہ شرما جائے ہے

کلمہ یارب کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ حیا کے آنے سے شرمانے کی تاویل جس کے جو سمجھ میں آئی کی۔ مصرع ثانی کے (بھی) کا فورس بھی نہ ظاہر کیا۔

یا اللہ یہ کیسی شرم ہے کہ وہ غیر کو کسی طرح گستاخی سے بھی روک نہیں سکتا اور تو اور وہ تو ایسے شرمیلے ہیں کہ اگر حیا بھی ان کو دامن گیر ہوتی ہے تو مارے شرم کے ان کے منھ سے کوئی بات نہیں نکلتی ہے۔ شدت حیا کا مبالغہ کے ساتھ بیان ہے۔

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے　　　دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

لت ۔ بری عادت کو کہتے ہیں مگر غالب نے چسکا اور لپکا کی جگہ استعمال کیا۔ نالہ کھینچنا بھی اردو نہیں۔ نالہ کشیدن کا ترجمہ ہے۔ دم لینا۔ سانس لینے کے معنی میں بھی اردو نہیں۔ اردو میں ٹھہرنے اور رکنے کے معنی ہیں۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ وہ ایرانی ہیں۔

شوق وصال کو اس بات کا چسکا کہ نالے کئے جاؤ شاید کبھی اپنی تاثیر دکھائیں۔ اور ضعف سے دل کی یہ حالت کہ سانس لینا تک دشوار ہے۔ عجب مصیبت میں جان ہے۔

دور چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ　　　نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

تیری بزم طرب سے نظر بد دور رہے۔ سبحان اللہ اگر میرے نالہ کو تیری بزم تک رسائی ہوتی ہے تو نالہ نغمہ کا کام کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنی تاثیر سے تم کو رحیم بنائے وہ تمہارے لئے باعث تفریح ہوتا ہے۔ یعنی تم میرے نالوں سے خوش ہوتے ہو۔ (معشوق پر طعن و تشنیع ہے)۔

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق　　　پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

طرز تغافل ۔ اجنبی اور ناشناس سا بننا۔ کھوئے جانا ۔ از خود رفتہ ہو جانا۔ پا جانا ۔ سمجھ لینا۔

اگرچہ اجنبی اور ناشناسا بننے سے راز عشق پر پردہ پڑا رہتا ہے اور لوگوں پر اظہار عشق نہیں ہوتا۔ مگر ان کے سامنے پہنچ کر ہم ایسے از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ وہ سمجھ جاتے ہیں۔ کہ یہ میرا عاشق ہے اور میرا حسن اس پر کارگر ہو گیا۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ (کھوئے جانے) کے معنی از خود رفتہ ہونے کے ہیں۔ یہ معنی (کھو جانے کے ہیں، ممکن ہے کہ دونوں مترادف ہوں)۔

اس کی بزم آرائیاں سن کر دل رنجور یاں　　　مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

دل کا بیٹھنا ۔ اس کا افسردہ اور رنجیدہ ہونا۔ نقش بیٹھنا اردو نہیں۔ نقش جمنا البتہ ہے۔ اور یہ ترجمہ نقش نشستن فارسی کا ہے۔ رنجور ۔ رنج اور علامت فاعل (ور) بمعنی صاحب سے مرکب ہے جیسے تاجور۔

اس کی زینت محفل کو سن سن کر میرا دل رنجور و غمگین بیٹھا (افسردہ) جاتا ہے جس طرح مدعائے نقش غیر ان کے دل پر بیٹھا ہوا (جما ہوا) ہے کہ اس کو عاشق صادق سمجھے ہوئے ہیں اور اس کی تمنائیں پوری کرتے رہتے ہیں۔

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا　　رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

عشق کی بیماری سے چہرہ کا رنگ اڑ کر زرد یا سپید پڑ جاتا ہے۔ رنگ اڑنا = رنگ کا سپید یا زرد پڑ جانا۔ رنگ کا کھلنا = (کھلنا) بضم کاف صاف اور گورا نکل آنا۔ وبکسر کاف خوب اور زیبا ہو جانا۔

جب سے وہ پری چہرہ کسی پر عاشق ہوا ہے تو اس میں نزاکت کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ غم عشق کی وجہ سے جتنا رنگ اڑ جاتا ہے اتنا ہی اس میں زیبائی اور خوبی بڑھتی جاتی ہے۔

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں　　کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

نقش کھینچنا۔ تصویر کھینچنا۔ کھنچنا۔ اکڑنا۔ ناز کرنا۔ تمنا اور کھینچنے کے معنی اپنی طرف مائل کرنے کے بھی ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے دونوں معنی ذہن میں ایک ساتھ رکھنے سے ہی شعر کے معنی ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر یہ صرف معنی کہیں کہ جتنی جتنی تصویر کھینچتا جاتا ہے اتنی اتنی وہ تصویر تیار ہوتی جاتی ہے۔ تو یہ بات ہی کیا ہوتی۔ اور اس معنی کو ناز سے کیا تعلق ہوا۔ اور اگر یہ معنی کہیں کہ جس قدر وہ اپنی طرف لے مائل کرتا ہے اتنی ہی وہ اکڑتی اور تنتی جاتی ہے تو اس بات کو کسی تصویر سے کیا علاقہ۔ چونکہ یہ دونوں باتیں مخالف الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی ہیں اس لئے مطلب لکھنے میں وہ الفاظ (کھینچنا اور کھنچنا) اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ اس تشریح کے بعد شعر کی نثر بنا کے لکھنے کی ضرورت نہ رہی۔

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسدؔ　　پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

مجھ میں آتش عشق اس قدر شعلہ زن ہے کہ میرے پاس کسی سے ٹھہرا نہیں جاتا حتی کہ میرا سایہ بھی مجھ سے گریز کرتا ہے جس طرح شعلہ سے دھواں گریزاں رہتا ہے۔

---

## غزل ۲۵　　اشعار ۴

مطلع　گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے　　تب اماں ہجر میں دی برد لیالی نے مجھے

نہالی = گدا۔ نہالچہ۔ گدا۔ اس پر تصویر شیر وغیرہ کی ٹپنے میں بنا دیتے ہیں۔ لیالی جمع لیل (زیادۃ الیاء) خلاف قیاس۔ اس کی جمع لیائل بھی آتی ہے۔ برد لیالی = راتوں کی ٹھنڈک۔ گرم کا لفظ اسی برد کی مناسبت سے ہے۔ گرم = مستعد و آمادہ۔ ہجر زمانہ کی رات اسی زمانہ کے دن سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ ہجر کی رات کو ٹھنڈا اس لئے بھی مانتے ہیں کہ عدم تاثیر

نارسی سے تو بہتر ہے۔ جس طرح گرم آہ گرم میں یعنی آہ باتاثیر ہے۔ اسی طرح آہ سرد یعنی آہ بے تاثیر ہے۔

تصویر قالین محبوب نے مجھے شب ہجر گرم فریاد رکھا کہ وہ محبوب آغوش تصویر قالین میں تو ہے اور ہم اس ہم آغوشی سے محروم ہیں۔ ان گرم آہوں کی وجہ سے اس شب ہجر کی برودت سے نجات ملی۔ حاصل یہ ہے کہ شب ہجر آہیں کر کے کاٹی۔

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم ۔۔۔ لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

نسیہ بکسر ادھار ضد نقد مراد عقبیٰ۔ نقد۔ جو رقم ہاتھ میں ہو۔ مراد دنیا۔ لے لینا۔ چھڑالینا۔ نجات دلانا۔ یہ بھی فارسی خریدن کا ترجمہ ہے۔

دنیا جو اس وقت نقد ہے اور عقبیٰ جو ابھی ادھار ہے۔ ان دونوں کی میری نگاہ میں کوئی حقیقت نہیں۔ میری ہمت عالی نے مجھے ان دولتوں سے بے نیاز کر رکھا ہے۔ (میری ہمت عالی نے مجھے لے لیا) کافی ہے۔ (مجھ سے) برائے بیت ہے۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم ۔۔۔ کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

اصنام جمع صنم بت پرستاری وہم۔ وہم پرستی۔ پرستاری۔ غلامی۔ فرمانبرداری۔ اطاعت۔ عبادت۔

سوائے وجود واحد کسی اور کا وجود ماننا یہ محض وہم پرستی ہے۔ ان اصنام خیالی یعنی وجود کثرت ماننے نے مجھے مشرک اور کافر بنا دیا۔

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا ۔۔۔ عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

کھٹکا بضم اندیشہ۔ خوف۔ ڈر۔ اپنے کو بلبل عاشق گل تجویز کیا ہے۔

بے پروبال اور مجبور و ناچار ہو جانے سے خوب ہی آرام و سکون ملا کہ اب تصور میں بھی ہوس گل کا کھٹکا باقی نہ رہا۔ اگر ہوس گل ہوتی تو باغ میں جاتا۔ اور صیاد گرفتار کرتا۔

---

غزل ۲۶ ۔۔۔ اشعار ۳

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے ۔۔۔ برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے ۔۔۔ ہیئۃ ۲

کارگاہ۔ کارخانہ۔ فیکٹری۔ داغ ساماں۔ وہ ذات جس کا سامان داغ ہو۔ اس غزل کی بحر مقتضب مطوی

مسکن بروزن فاعلات مفعولن چار بار بھی ہے اور بحر اشتر مکفوف مقبوض مجبق بھی ہے بروزن فاعلن مفاعیلن چار بار۔ خون گرم ۔سعی و کوشش ۔اس سے پہلے بھی ایک غزل اسی بحر میں آچکی ہے۔ دہقان معرب دہگان بمعنی کاشتکار و مزارع۔ مگر یہاں بمعنی باغبان مستعمل ہے۔

اس دنیا کے کارخانہ میں لالہ کو دیکھو کہ اس کا سامان داغ ہے۔ باوجودیکہ باغبان اس کے کشت وکار میں سعی اس کی خوبی کے لیئے کرتا ہے۔ مگر اس کی ساری کوشش لالہ کی خوبی کی جگہ برق خرمن کا کام دیتی ہے اور لالہ کے لیئے سامان داغ ہو جاتی ہے۔ یعنی ہستی دنیا سراسر آفت و مصیبت ہے۔

غنچہ تا شگفتن ہا برگ عافیت معلوم　　باوجود دل جمعی خواب گل پریشاں ہے

فارسی مصدر ان کے ہم عصر بھی استعمال کرتے ہیں۔ مگر اردو میں بلا ترکیب غیر مانوس اور ناگوار سمع ہوتا ہے۔ انھوں نے اس پر (ہا) جمع کا بھی بڑھا دیا۔ برگ = سامان۔ غنچہ کی پتیاں مجتمع ہوتی ہیں اس لیئے دل جمعی کے ساتھ تعبیر کیا۔ اور گل کی پتیاں کھل جاتی ہیں اس لیئے اس کے ساتھ لفظ پریشان لائے۔ اور گل کی خوشی اور برجا ماندگی کی وجہ سے خواب گل کہا۔

جب تک کہ غنچہ کھلے کون کہہ سکتا ہے کہ اسے عافیت و آرام نصیب ہوگا۔ باوجودیکہ اس وقت، بحالت غنچگی دل جمعی حاصل ہے۔ مگر گل خواب پریشاں ہی دیکھتا ہے کہ آئندہ گل ہو کر بھی دل جمعی اور عافیت حاصل بھی ہوگی یا نہیں۔

ہم سے رنج بیتابی کس طرح اٹھایا جائے　　داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

داغ میں سوزش اور تابانی ماننتے ہیں اسی وجہ سے شعلہ کے ساتھ اسے تشبیہ دی ہے۔ داغ پشت دست عجز یعنی رنج بیتابی کے اٹھانے سے۔

جو عاجزی لاحق ہوئی کہ کیوں نہیں اٹھایا جاتا اور اس حالت میں جو پشت دست کو زچ ہو کر کاٹا ہے اور اس کا داغ پڑ گیا ہے۔ خس بدندان جیسے عاجز ہو کر سپید جھنڈیاں بلند کرتے ہیں پیشتر دانتوں میں تنکا دباتے تھے۔ لہٰذا اس کے معنی اظہار عجز کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور پشت دست کاٹنے کے معنی حسرت کرنا اور پشیمان ہونا بھی ہیں۔

جب داغ پشت دست عاجزی کا شعلہ اظہار عجز کر رہا ہے تو پھر ہم سے رنج بے تابی کس طرح اٹھایا جائے۔ میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں یوں ہی بکواس کر دی لہٰذا بنا بر عادت جناب نظم و جناب حسرت کے معانی نقل کئے دیتا ہوں۔

جناب نظم ۔ مطلب یہ ہے کہ اس رنج کی تاب ہم سے نہ ہو سکے گی۔ اور یہ ہلاک کر دے گا۔ دست عجز سے وہ

ہاتھ مراد ہے جو صدمہ کے دفع کرنے سے عجز رکھتا ہے۔ اسی سبب سے اسے خس سے تشبیہ دی ہے اور داغ کو شعلہ سے۔ اور پشت دست زمین پر رکھنا عاجزی کرنے کے معنی پر ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ شعلہ کی آفت کو خس نہیں اٹھا سکتا۔ وہ اسے جلا کر فنا کر دیتا ہے۔ اور خس بدندان گرفتن بھی اظہار عجز کے معنی پر ہے۔ یہ دوسرا پہلو اس شعر کے معنی میں نکلتا ہے۔ یعنی میرے دستِ عجز کا داغ شعلہ خس بدنداں ہے کہ میری طرف سے اظہار عجز کر رہا ہے کہ رنج بے تابی اس سے نہ اُٹھ سکے گا۔

ان تینوں اشعار کے معانی بیان کرنے کے بعد مصنف مرحوم لکھتے ہیں۔ قبلہ! ابتدائے فکر سخن میں بیدل اسیر اور شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا — اسد اللہ خان قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان میں رہنے دئے۔ (دیوان موجود میں ایک تہائی اشعار اب بھی ایسے ہی ہیں۔)

جناب حسرتؔ۔ جب داغ اور شعلہ بزبان حال اظہار عجز کر رہے ہیں۔ اور بے تابی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تو بھلا ہم سے رنج بے تابی کیوں کر اُٹھے گا۔ شعلہ کا خس بدنداں ہونا اور داغ کی مشابہت پشت دست عجز سے ظاہر ہے۔

---

غزل ۲۷ — شعر ۱

ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے — اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ

دیوانگی اور وحشت کے جوش میں ہم نے صحرا نوردی اختیار کی اور یہاں اتنی مدت ہو گئی کہ گھر میں سبزہ (گھاس) اُگ آیا۔ جو گھر خالی پڑا رہے تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس گھانس اُگ آنے کی تعبیر طعناً بہار سے کی ہے۔ جب گھر خود ہی ویران ہو رہا ہے تو اب بیاباں میں رہنے کی کیا ضرورت رہی۔ وہیں کیوں چلے جائیں۔

---

غزل ۲۸ — اشعار ۷

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے — بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

سادگی سے مراد ننھا ہونا۔ اور بھولا پن۔
وہ جب بھی میرے قتل کے لیئے آتے ہیں خنجر لے کے آتے ہیں۔ اور ہمارے دل میں اس بات کی حسرت ہے کہ ہم ان کی سادگی پر جان دیدیں۔ یہ حسرت پوری نہیں ہوتی۔
میں ان کے اس بھولے پن پر مرنے کی حسرت رکھتا ہوں کہ وہ بغیر خنجر مرنے کو جانتے ہی نہیں۔ تو ان کے قتل کئے بغیر کیسے جان دوں لہٰذا سادگی پر جان دینے میں بس نہیں چلتا کیوں کہ جب وہ قتل کے لیئے آتے ہیں خنجر بکف ہوتے ہیں۔ بغیر خنجر مرنا ان کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ جو ہمیں منظور نہیں۔
نظر انصاف سے دیکھا جائے تو (پھر) بھرتی کا اور حشو محض ہے۔ پہلے واقعہ کے ذکر سے مضمون میں کس خوبی کا اضافہ ہوتا ہے ۔ بس نہیں چلتا مرا اگر۔ یا میرا بس چلتا نہیں اگر یا بس نہیں چلتا کہ خنجر تو اگر یا بس نہیں چلتا کہ اب خنجر الخ یا مثل اس کے کچھ اور بعد (پھر) کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا  میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لذت کے متناسب کوئی اور لفظ بھی شعر میں نہیں پھر (خوبی) کیوں نہ کہا جائے۔
اس کی تقریر میں یہ مزہ اور خوبی تھی کہ جو بات اس کے منہ سے نکلتی تھی گویا وہ پہلے سے میرے دل میں تھی اور اس نے میرے منہ سے چھین لی۔ (خوب ہے)۔

گرچہ ہے کس کس خرابی سے ولے بایں ہمہ  ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

میرا ذکر بے حد برائی کے ساتھ ان کی محفل میں ہوتا ہے مگر ہوتا تو ہے۔ لہٰذا میرا ذکر مجھ سے بہتر ہے برخلاف ہمارے کہ ہماری رسائی تو ان کی بزم تک نہیں۔
محفل جمع ہونے کی جگہ اور مجلس بیٹھنے کی جگہ۔ دونوں کے معنی بزم۔

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی  یہ جو اک لذت ہماری سعی لاحاصل میں ہے

ہجوم ۔ کثرت ۔ مل پڑنا ۔ بس لبس کر لاحاصل ۔ بے ثمر ۔ بے فائدہ ۔ بے نتیجہ ۔
اے کثرت یاس و ناامیدی اب آگے قدم نہ بڑھا۔ ایسا نہ ہو کر بالکل مایوس ہو کر سعی بے فائدہ کو بھی ہم چھوڑ بیٹھیں۔ اور کوشش لاحاصل میں بھی جو مزہ ملتا ہے وہ بھی خاک میں مل جائے۔ سعی بے نتیجہ سہی مگر جمود سے بہتر ہے۔

رنج رہ کیوں کھینچئے واماندگی سے عشق ہے　　اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

پہلے مصرع میں (سے) کی جگہ (کو) چھپا ہے۔ شعر کا طرز ادا یہ چاہتا ہے کہ کھینچنے کی نسبت جس کی طرف ہو۔ عشق کا بھی تعلق اسی سے ہو۔ منزل ۔ جہاں جانا مقصود ہو۔ اترنے کی جگہ۔ بیس کوس کے فاصلہ کو بھی کہتے ہیں۔ مسافت ۔ واماندگی ۔ تھک جانا۔ عاجز ہونا۔ پیچھے رہ جانا۔ رنج کھینچنا یہ بھی فارسی رنج کشیدن کا ترجمہ ہے۔ اردو میں رنج اٹھانا بولتے ہیں ؎

رنج رہ کیسے سہوں واماندگی سے عشق ہے

راہ عشق کی تکلیف کیوں اٹھاؤں میں تو واماندگی کو عزیز رکھتا ہوں یا واماندگی مجھ سے محبت رکھتی ہے پھر اس سے جدائی کیسے گوارا کروں۔ اس لیئے جو قدم کہ منزل میں ہے وہ اٹھ نہیں سکتا۔ یا یہ کہ جو قدم ہے وہ گویا منزل مقصود میں ہے پھر قدم اٹھانے اور آگے جانے کی کیا ضرورت رہی۔ جس واماندگی سے عشق ہے وہ تو حاصل ہے۔ اور واماندگی مایوسی سے پیدا ہوئی ہے جو ہمیشہ رفیق راہ رہتی ہے اور اس سے عشق ہوگیا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ (واماندگی کو) کی جگہ (واماندگی کا) ہوگا۔ اور یہ سہو کاتب ہے۔ اور (کو) مان کے یہ معنی ہوں گے کہ واماندگی کو میرے قدم سے عشق ہوگیا ہے۔ اور وہ نہیں چھوڑتی کہ میں منزل مقصود کی طرف جاؤں۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ منزل کے ساتھ جب "میں" بولیں تو راہ مراد ہوتی ہے اور (پر) کے ساتھ منزل مقصود۔ اور فارسی میں عشق بمعنی سلام و نیاز بھی ہے۔ لہٰذا (کو) کے ساتھ یہ معنی ہوں گے۔ ہم واماندگی کے نیاز مند ہیں کہ اس کی بدولت ؎

اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

واماندگی کو ان سے یا ان کو واماندگی سے عشق ہے اور اس وجہ سے قدم اٹھ نہیں سکتا۔ تو اس بات میں لطف شعر کیا پیدا ہوا۔ (کیوں) کے معنی (کیوں کر) کیے جائیں تو خیر کوئی بات بھی ہوتی ہے۔ یعنی رنج راہ اگر اٹھانا بھی چاہیں تو کیوں کر اٹھائیں کیوں کہ واماندگی تو پیچھے پڑگئی ہے اور ساتھ نہیں چھوڑتی۔ لہٰذا ایک قدم اٹھانا دشوار ہوگیا ہے۔ خدا جانے مصنف نے کیا کہا ہے۔

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی　　فتنۂ شور قیامت کس کی آب و گل میں ہے

آب و گل فطرت۔ خلقت۔ کیونکہ تخلیق انسانی مادطین سے ہے۔

تمہارے اس کہنے کو مانتے ہیں کہ ہمارا دل آتش عشق سے نمونہ دوزخ ہورہا ہے۔ مگر اسے بھی تو دیکھو کہ فتنۂ شورِ قیامت تمہاری فطرت میں بھی تو ہے۔

ہے دل شوریدۂ غالبؔ طلسم پیچ و تاب　　رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

طلسم ۔ یونانی زبان کا لفظ ہے اس میں جو پھنس جائے اس کا چھوٹنا مشکل ہوتا ہے ۔
غالبؔ کا دل پریشان پیچ و تاب کا ایک طلسم ہے اور اس میں تمہاری طلب کی تمنا گرفتار ہے ۔ ہم پر اگر رحم نہیں کرتے ہو تو اپنی تمنا ہی پر رحم کرو ۔ اور اس کو اس پیچ و تاب سے چھڑاؤ ۔ حاصل یہ ہے کہ ہماری تمنا پوری کرو ۔ معشوق کو پھسلا رہے ہیں ۔

---

غزل ۲۹　　اشعار ۸

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی　　۵۹ ب

دل و جگر دونوں تکالیف سے عاجز آ کر تیرے تیر نگاہ سے مرنے کے متمنی تھے سو تمہارے ایک ہی تیر ادا نے دونوں کی حسرت و تمنا کو پورا کر دیا ۔ ایسا توڑ اس تیر میں تھا کہ دوسرے تیر کی ضرورت نہ ہوئی ۔ (تک) کی جگہ (میں) اچھا ہے ۔

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ　　تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

خوشا (میں الف) بمعنی است ہے ۔ اور بعض کے نزدیک بمعنی بسیار ۔
تاکہ رسوائی نہ ہو اس لئے زخم جگر کو چھپانا پڑتا تھا ۔ لیکن اب جو غم عشق سے سینہ چاک ہو گیا تو اچھا ہی ہوا کہ پردہ داری زخم جگر سے فراغت مل گئی ۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اُٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

لذت خواب سحر ۔ جوانی میں جب نسیم سحری چلتی ہے تو خوب میٹھی اور مزہ دار نیند آتی ہے ۔ اُٹھئے کا خطاب عام سے ہے یا اپنے نفس سے ۔ بادہ شبانہ سے مراد مے خواری و غفلت ایام جوانی ۔
اب نشۂ شباب اتر چکا ہے اور غفلت شعاری کا زمانہ گذر گیا ۔ عالم شباب میں وقت سحر اینڈ اینڈ کے سونا جو مزہ دیتا تھا وہ مزہ زمانہ پیری میں باقی نہیں رہا ۔ لہٰذا غفلت سے بیدار ہونے کی ضرورت ہے ۔ اور کوئی مفید کام دنیا یا آخرت کا کرنا چاہئے ۔ شعر ناصحانہ ہے ۔

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں　　　بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

بارے ۔ المختصر۔ الحاصل۔ ہوا بمعنی خواہشات ۔ بمناسبت ہوس لائے کیوں کہ ہوا و ہوس ملا کے بھی بولتے ہیں۔ بال و پر۔ بازو و پر بمعنی قوت بھی مستعمل ہے۔

تکالیف عشق سے مر کر خاک ہو گئے۔ اور وہ خاک کوئے یار ہی میں اڑتی پھرتی ہے۔ خاک ہو کر بھی کوچۂ دلدار نہیں چھوٹتا۔ المختصر اے ہوا (خواہش ۔ محبت) اب ہوس بال و پر نہ رہی کہ اُڑ کے اور سعی کر کے حصول مطلوب کی خواہش کریں۔ اور یہ اچھا ہی ہوا کہ سب جھگڑوں سے نجات مل گئی۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ ہوا سے خطاب بے مزہ ہے۔ لیکن ہوس کی مناسبت سے مصنف نے صبا کو چھوڑ کر (ہوا) کو باندھا۔ اسی طرح بال و پر کی مناسبت یہ چاہتی ہے کہ کوئے یار کے بدلے صحن باغ یار میں خاک اُڑائی ہوتی۔ علاوہ ان باتوں کے یہ مضمون اتنا کہا گیا ہے کہ مبتذل ہو گیا ہے۔ غرض یہ شعر غالبؔ کے کلام کے مرتبے سے بہت گرا ہوا ہے۔

دیکھو تو دل فریبی انداز نقش پا　　　موج خرام یار کے کیا گل کتر گئی

گل کترنا ۔ قینچی سے کام کرنے والے کاغذ کو قینچی سے کاٹ کے نہایت عمدہ اور نازک کام بیل بوٹے وغیرہ کا بناتے ہیں جو بہت خوب صورت اور نظر فریب ہوتا ہے۔ اور اصطلاحاً مترادف شگوفہ چھوڑ دینے کا بھی ہے۔ یعنی کوئی ایسی بات کرنا جس سے فساد برپا ہو جائے۔ موج خرام یار ۔ مانا کہ موج اور خرام میں وجہ جامع حرکت اور تموج ہے۔ مگر موج خرام یار کا گل کترنا کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ لفظ موج میری سمجھ سے باہر ہے۔ حضرت مصنف ایک نہ ایک لفظ ایسا رکھ دیتے ہیں جو میرے لیے عذاب جان ہو جاتا ہے۔ پھر جناب نظم نے (خرام یار کے گل کتر گئی لکھا ہے) جس کی نقل میں نے بھی کی۔ اس (کے) کے ہوتے ہوئے معلوم نہیں ہوتا کہ گل کترنے کا فاعل کون ہے۔ اگر (کے) کی جگہ (بھی) پڑھیں جیسا کہ جناب حسرتؔ نے لکھا ہے تو موج خرام گل کترنے کا فاعل ہو گی۔ اس صورت میں بھی موج کچھ اچھا لفظ نہیں صرف خرام کافی ہے۔ پاؤں کی انگلیوں اور گدیلیوں اور ایڑیوں کے نقوش کو گل سے تشبیہ دیتے ہیں۔

میرے خیال میں اس مصرع کو شکل اس کے ہونا چاہئے ؎

کیا کیا خرام ناز صنم گل کتر گئی

طرز دل فریبی نقش پا ذرا دیکھو تو اس محبوب کی خرام ناز نے کیسے کیسے گل دل لبھانے والے کتر کے راستہ میں ڈال دئے ہیں۔ کہ ہر ایک ان پر فریفتہ ہے۔ اور راستہ گلزار بنا ہوا ہے۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی　　　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اب کی جگہ اگر (لو) ہو تو اب سے اچھا ہی ہوگا (تعجب کے لہجہ میں پڑھو)۔
جو لوگ کہ بوالہوس تھے وہ بھی حُسن پرست بن بیٹھے۔ اب اہلِ نظر اور عاشق صادق کی کیا عزت رہ گئی۔ ایسا زمانہ بے تمیزی کا آگیا ہے۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　　　مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

یعنی مراد یہ ہے کہ تابش اور نورِ چہرۂ یار تو مانع دیدار تھی ہی نظارہ بھی مانع دیدار رہا کیوں کہ ہر نظر مستی سے دیدار ہو کر ان کے چہرہ پر بکھر گئی اور اس نے تار ہائے نقاب، کا کام کیا۔

فرداودی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا　　　　کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

دی بکسر روز گذشتہ۔ یہاں مراد دنیا۔ مگر امروز سے مراد دنیا لیتے ہیں اور فردا سے عقبیٰ یا روز گذشتہ و آینده ہی مراد ہے۔
کل ہمارے پاس سے تم کیا گئے کہ ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی جو فردا میں ہونے والی تھی لہٰذا روز گذشتہ اور روز آینده دونوں ایک ہو گئے اور ماضی و استقبال میں امتیاز باقی نہ رہا۔ (کہ) کاف مفاجات بمعنی ناگہاں ہے۔

مارا زمانہ نے اسداللہ خاں تمہیں　　　　وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

اے غالب زمانہ نے تمہیں مار ہی ڈالا۔ پیری نے آگھیرا اب نہ وہ جوانی ہے اور نہ جوانی کے ولولے۔ پہلے مصرع سے اظہار تاسف ہے اور دوسرا استفہام ہے مگر اس سے بھی اظہار غم مقصود ہے۔

---

غزل ۲۰　　　　اشعار ۷

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے　　　　حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے　　۶۰ب

تسکین تو ہم کو صرف تمہیں سے ہو سکتی ہے کسی دوسرے سے نہیں۔ پھر بھی اگر حورانِ بہشتی کی صورت تجھ میں ملتی ہوتی ہو تو کم از کم ذوقِ نظر تو حاصل ہوگا اگرچہ اس سے تسکین تو نہیں ہو سکتی ہے۔ مقصود محبوب کو حوروں پر فوقیت دینا ہے۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل　　　میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

بعد قتل اے قاتل مجھے اپنی گلی میں دفن نہ کرنا مجھے یہ منظور نہیں کہ لوگ میری قبر کے پتہ سے تیرا گھر تلاش کریں۔ میرا رشک اس امر کو گوارا نہیں کرتا۔ مجھے یہ شعر کچھ اچھا نہ معلوم ہوا۔

جناب نظم یہ معنی بھی تحریر فرماتے ہیں کہ میری محبت اسے گوارا نہیں کرتی کہ تیرے قاتل ہونے کا حال مشہور ہو اور تجھ سے میرے قتل کا مواخذہ ہو (یا تیری بدنامی ہو)۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم　　　ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تمہارا ایسا فیاض آج ساقی بنا ہے تو مجھ ایسے دہشت والے کو خوب چھکا کر اپنی ساقی گری کی لاج رکھ لو ورنہ ہر رات کو جتنی بھی شراب ہاتھ لگتی ہے پی ہی لیا کرتے ہیں ؎

یوں تو پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

ہر شب کی قید کا کوئی خاص فائدہ نہ معلوم ہوا۔ اگرچہ بزم اکثر رات کو کیا کرتے ہیں۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم　　　میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

ندیم۔ ہم نشیں خصوصاً ہمدم بزم مے۔

تجھ سے نہ ہم کچھ کہتے ہیں اور نہ تیرے ذریعہ سے ان کو کچھ کہلواتے ہیں لیکن اے ندیم تجھے اگر نامہ بر مل جائے تو اس سے میرا سلام شکایت آمیز ضرور کہہ دینا کہ میاں تم خوب جواب لانے اور وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ تم سے تو ایسی امید نہ تھی (یہ سلام طنزاً ہے)۔

تم کو بھی ہم دکھائیں گے کہ مجنوں نے کیا کیا　　　فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

دکھائیں گے کے ساتھ (ملی) صیغہ ماضی ہونا چاہئے۔ اور (ملے) صیغہ مضارع کے ساتھ (دکھائیں کہ) ہونا چاہئے۔ جناب نظم نے (دکھائیں گے) ہی لکھا ہے۔ اور ان دونوں سے بہتر (دکھا دیں کہ) ہے۔

ہم کو اگر غم پنہاں سے فرصت ملے تو ہم تم کو دکھا دیں کہ مجنوں نے کیا ہی کیا جو ہم کر سکتے ہیں۔ وہ تو صرف جنگل جنگل مارا مارا پھرا اور ہم جان دے کے دکھا دیں۔ پہلے مصرع میں (بھی) مجھے برائے بیت معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ کہیں کہ اوروں کو اور تم کو بھی تو اس کہنے کا کیا خاص فائدہ ہوگا۔ کچھ کر کے دکھانا تو معشوق کو ہے اوروں سے کیا مطلب ؎

وہ کر کے ہم دکھائیں کہ مجنوں نہ کر سکا

سہ     پھر تم کو ہم دکھا دیں کہ مجنوں نے کیا کیا

**لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں     جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے**

حضرت خضر کا ایک سفر تلاش آب حیات میں مشہور ہے۔ اس کے بعد بھولے بھٹکے کو راستہ بتانے کے لیے بے صحرا البصرا مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور عاشق کا مارے مارے پھرنا تلاش محبوب میں۔ ہے اس لیئے کہتے ہیں یہ کیا ضرور ہے کہ ہم پیروی وتقلید حضرت خضر بھی کریں۔ بس اتنا ہے کہ صحرانوردی میں ایک بزرگ رفیق راہ مل گئے۔ (جانا۔ اتنا سمجھ لیا۔ اگر اس کی جگہ۔ مانا۔ ہو تو شاید زیادہ برمحل ہو) جناب نظم فرماتے ہیں کہ ہمارا مرتبہ سلوک بھی حضرت خضر سے کچھ کم نہیں۔

**اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا     تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے**

دیکھنا۔ کے یہ معنی ہیں کہ ذرا دیکھنا کہ غالب۔ وہاں کیا کرتا ہے اور کس حال میں۔ ہے۔ کہیں جب کوچہ دلدار کی تعین کر دی تو پھر کہیں نہیں۔ وہاں ہونا چاہیئے۔

اے مقیمان کوئے یار ذرا دیکھنا کہ غالب جو کوچۂ دلدار کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا وہ وہاں کیا کرتا ہے اور کس حال میں ہے۔ یار تک رسائی ہوئی یا نہیں۔

جناب نظم۔ عبارت تو یہ۔ ہے کہ وہاں کہیں اگر غالب مل جائے تو دیکھنا۔ اور مطلب یہ ہے کہ خیال رکھنا شاید غالب وہاں کہیں مل جائے۔ یہ مطلب۔ اس عبارت۔ سے (جو) کے سبب۔ سے نہیں نکلتا (جو) کے لفظ سے جملہ کو شرطیہ کر دیا اور شرط مقصود نہیں۔ اس۔ لیئے کہ شرط سے یہ معنی نہیں نکلتے کہ اگر غالب کہیں ملے تو دیکھنا۔ حالاں کہ جو ملے اس کا نہ دیکھنا کیا معنی۔ غرضکہ شرط یہاں کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس جملہ کی صورت شرط کی ہے مگر قصد شرط نہیں ہے۔ اور (جو) یا (اگر) اس محاورہ میں زائد ہوا کرتا ہے معنی مقصود بھی ہوا کرتے ہیں کہ دیکھنا یعنی خیال رکھنا شاید فلاں شخص کہیں مل جائے۔ لیکن محاورہ یوں نہیں جاری ہے کہ اس معنی کو جملہ شرطیہ کی صورت میں ادا کرتے ہوں۔ جیسا کہ مصنف نے کیا ہے۔ اور یہ مسئلہ نحو اردو کے نوادر میں سے ہے۔

---

غزل ۳۱     اشعار ۶

۱۳۱غ    کوئی دن گر زندگانی اور ہے     اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

وہ کر کے ہم دکھائیں کہ مجنوں نہ کر سکا
پھر تم کو ہم دکھا دیں کہ مجنوں نے کیا کیا

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

حضرت خضر کا ایک سفر تلاش آب حیات میں مشہور ہے۔ اس کے بعد بھولے بھٹکے کو راستہ بتانے کے لیئے بے صحرا بصحرا مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور عاشق کا مارے مارے پھرنا تلاش محبوب میں۔ ہے اس لیئے کہتے ہیں یہ کیا ضرور ہے کہ ہم پیروی و تقلید حضرت خضر بھی کریں۔ بس اتنا ہے کہ صحرا نوردی میں ایک بزرگ رفیق راہ مل گئے۔ (جانا۔ اتنا سمجھ لیا۔ اگر اس کی جگہ۔ مانا۔ ہو تو شاید زیادہ برمحل ہو) جناب نظم فرماتے ہیں کہ ہمارا مرتبہ سلوک بھی حضرت خضر سے کچھ کم نہیں۔

اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا — تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

دیکھنا۔ کے یہ معنی ہیں کہ ذرا دیکھنا کہ غالب۔ وہاں کیا کرتا ہے اور کس حال میں ہے۔ کہیں جب کوچہ دلدار کی تعین کر دی تو پھر کہیں نہیں۔ وہاں ہونا چاہیئے۔

اے مقیمان کوئے یار ذرا دیکھنا کہ غالب جو کوچۂ دلدار کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا وہ وہاں کیا کرتا ہے اور کس حال میں ہے۔ یار تک رسائی ہوتی یا نہیں۔

جناب نظم۔ عبارت تو یہ۔ ہے کہ وہاں کہیں اگر غالب مل جائے تو دیکھنا۔ اور مطلب یہ ہے کہ خیال رکھنا شاید غالب وہاں کہیں مل جائے۔ یہ مطلب۔ اس عبارت۔ سے (جو) کے سبب۔ سے نہیں نکلتا (جو) کے لفظ سے جملہ کو شرطیہ کر دیا اور شرط مقصود نہیں۔ اس۔ لیئے کہ شرط سے یہ معنی نہیں نکلتے کہ اگر غالب کہیں ملے تو دیکھنا۔ حالاں کہ جو ملے اس کا نہ دیکھنا کیا معنی۔ غرضکہ شرط یہاں کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس جملہ کی صورت شرط کی ہے مگر قصد شرط نہیں ہے۔ اور (جو) یا (اگر) اس محاورہ میں زائد ہوا کرتا ہے معنی مقصود یہی ہوا کرتے ہیں کہ دیکھنا یعنی خیال رکھنا شاید فلاں شخص کہیں مل جائے۔ لیکن محاورہ یوں نہیں جاری ہے کہ اس معنی کو جملہ شرطیہ کی صورت میں ادا کرتے ہوں۔ جیسا کہ مصنف نے کیا ہے۔ اور یہ مسئلہ نحوار دو کے نوادر میں۔ سے ہے۔

---

غزل ۳۱ — اشعار ۶

۱۴۴غ — کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

کچھ دن اور اگر زندہ رہ گئے تو ہم نے کچھ اور ہی مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ (جس کو غالب نے اپنے دل میں محفوظ رکھا اور ظاہر نہ کیا۔ تمہارا جو جی چاہے لگا لو۔ مثلاً ترک محبت کر دیں گے۔ بیابان نورد ہو جائیں گے۔ زہر کھا کر مر جائیں گے۔ معشوق کے گھر میں گھس پڑیں گے اور اس کو نکال لائیں گے) المعنی فی بطن الشاعر تو ہے ہی۔ مگر بندش کی صفائی اور روزمرہ کے لحاظ سے خوب ہے۔

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوز غم ہائے نہانی اور ہے

سوز غم پنہانی عشق میں جو حدت و شدت ہے ویسی گرمی آتش جہنم میں کہاں۔ غم پنہانی کی حرارت تو اور ہی چیز ہے۔ بات بہت معمولی ہے اور بہت کہی گئی۔ مگر طرز ادا زبان کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے۔

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے

یوں تو وہ ہم سے بار ہا ناراض ہو چکے ہیں لیکن اس مرتبہ کی ان کی خفگی بے ڈھب ہے۔ خدا خیر کرے۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

خط بمعنی مکتوب LETTER عربی و فارسی میں نہیں۔ مکتوب یا کاغذ کہتے ہیں۔
معشوق کا جواب نامہ بر نے لا کے دیا اس کے بعد ہمارے منھ کو تکے جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ زبانی بھی کہلا بھیجا ہے۔ اور وہ برا بھلا کہنا ہی ہوگا جس کے دوہرانے سے نامہ بر شرما رہا ہے۔

قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم وہ بلائے آسمانی اور ہے

قاطع اعمار۔ زندگی کو ختم کر دینے والا۔ سنسکرت میں اس ستارہ کو (مارکش) کہتے ہیں۔ وہ کا مرجع محبوب۔ اگرچہ بہت سے ستارے زندگی کے ختم کر دینے والے ہیں۔ مگر ہمارا محبوب ان سے بڑھ کے آفت روزگار ہے کہ رچھار چھا کے جلا جلا کے مارتا ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

کوئی آفت اور بلا ایسی نہیں جو ہم پر نہ ٹوٹی ہو۔ صرف ایک مرگ مفاجات باقی رہ گئی ہے سو اس سے قریب پہنچ چکا ہوں۔ ساری غزل روزمرہ کے موافق اور بندش میں صاف اور خوب ہے۔

مرگ ناگہانی جس کے آنے کا کوئی وقت نہیں چوبیس گھنٹوں میں جس وقت بھی آجائے۔ نابرائے نفی اور گہان اور گاہان مزید علیہ گہ اور گاہ بمعنی وقت سے مرکب ہے۔ جس کا کوئی وقت نہ ہو۔ اور بمعنی مرگ مفاجات بھی ہے۔ ایسی موت جو چٹ پٹ مار لے۔

---

غزل ۳۲ اشعار ۱۰

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

اُمید تو کوئی پوری ہی نہیں ہوتی مگر ساتھ ہی حصول امید کی بھی کوئی شکل نہیں دکھائی دیتی مصرع ثانی میں گنجایش نہ ہونے سے الفاظ مذکور نہ لاسکے۔

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

شب فراق میں باوجود تکالیف شدید اگر موت نہیں آتی تو ٹھیک ہے کیوں کہ موت کا ایک وقت معین ہے۔ مگر نیند کیوں نہیں آتی۔ باوجودیکہ نیند کا کوئی وقت معین نہیں اور اگر ہے بھی تو علی الخصوص رات ہی ہے۔

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

پہلے حال دل پر ہنسی آتی تھی کہ اس دیوانہ کو دیکھو ان کے ایسے بخود مغرور۔ خود پرست۔ بے پروا اور ظالم سے عشق کرتا ہے۔ اب مایوسی۔ غم دائمی نے وہ افسردگی پیدا کردی ہے کہ کسی بات پر بھی ہنسی نہیں آتی۔ (کیا کہنا ہے)۔ ہنسی سے تضحیک مراد ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

عبادت الٰہی اور اجتناب ازگناہ کو ثواب ضرور سمجھتا ہوں مگر کیا کروں طبیعت اس طرف کسی طرح مائل نہیں ہوتی۔ یعنی مسلمان ہوں اور گنہ گار۔ خضوع اور خشوع جب تک نہ ہو وہ عبادت کس کام کی۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ان کی ناراضی اور رسوائی کا خیال کرکے چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی ان کی بے رخی اور بدسلوکی کی شکایات

کا ڈھیر لگا سکتا ہوں۔

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں  میری آواز گر نہیں آتی

اگر میں نالہ و فریاد سے اتفاقاً کسی وقت چپ ہو جاتا ہوں تو کہتے ہیں آج اس کی فریاد کی آواز نہیں آتی کیا کسی اور سے دل لگا لیا۔ پھر کیسے نہ چیخوں اور ان کے اس شبہ کو کیسے دور نہ کروں۔ بجائے نالہ و فغان (چیخوں) اس لئے اختیار کیا کہ عاشق جانتا ہے کہ اس چیخ پکار کا اثر تو کچھ ہونے کا نہیں۔

داغ دل گر نظر نہیں آتا  بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

چارہ گر۔ معالج۔ جراح۔ و ہمدرد۔ ہو سکتا ہے کہ محبوب، مراد لیں۔
اے چارہ گر یہ مانا کہ داغ دکھائی نہیں دیتا کیوں کہ نگاہ سے دیکھنے کی چیز نہیں مگر کیا جلے ہوئے دل کی تجھے بو بھی نہیں آتی۔ چارہ گر کے انکار داغ کے جواب میں اس کی نافہمی پر طعن و تشنیع ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی  کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہماری کی جگہ (اپنی) چاہئے ؎
کچھ بھی اپنی خبر نہیں آتی
اب خود رفتگی کا یہ عالم ہے کہ ہم کو خود اپنی خبر نہیں کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی  موت آتی ہے پر نہیں آتی

مرنا، اظہار کثرت شوق کے لئے ہے۔ دوسرے مرنے کے معنی جان سے جانا۔ موت۔ مرگ۔
موت کی تمنا تو بے حد ہے کہ جان اس کے اشتیاق میں عدم تحمل مصائب کی وجہ سے نکلی جاتی ہے۔ مگر موت حقیقی جو انقطاع روح و جسم کر دے وہ کسی طرح نہیں آتی۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ  شرم تم کو مگر نہیں آتی

اے غالبؔ کیا منہ لے کے کعبہ جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ عمر ساری تو صنم پرستی اور کفر عشق میں کاٹی۔ ان افعال کے ہوتے ہوئے تو تم کو شرم آنا چاہئے۔ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔

---

غزل ۲۳ اشعار ۱۱

صہغ ۱۱ دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

استفہام تنبیہ اور تادیب کے لیئے ہے۔ درد سے مراد درد عشق۔
اے دل نافہم جب عشق اختیار کیا ہے تو اضطراب و بے قراری و عدم استقلال و بے صبری کیسی تحمل سے کام لے۔ اس مرض عشق کا تو کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ درد بے دوا ہے۔ مرو اور بھرو۔ اور اپنے کئے کو نبھاؤ۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

یا الٰہی (اے اللہ میرے) خطاب بحالت تعجب ہے۔ یا۔ استفہام ہی سے استعجاب مقصود ہے۔ ماجرا جو جاری ہوا مستعمل بمعنی واقعہ۔
ہم تو اس کے مشتاق ہیں اور وہ ہم سے بیزار ہے۔ یا اللہ یہ کیسا ماجرا ہے۔ ایسا بھی دنیا میں ہوا کرتا ہے کہ مشتاق سے بیزاری ہو۔

میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

کاش۔ حرف تمنا۔ بھی دوسروں کی طرح اللہ نے مجھے بھی زبان دی ہے گونگا نہیں ہوں۔
دوسروں سے ان کے مدعا کو پوچھتے ہو اور ان کی تمنا پوری کرتے ہو۔ اللہ نے مجھے بھی زبان عطا کی ہے مجھ سے بھی تو کبھی میری خواہش کو پوچھ لیا کرو پورا کر دینے کی تو تم سے امید نہیں۔

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

کوئی جب اس لفظ پر فورس (زور) دینا ہوتا ہے جیسا کہ یہی محل ہے تو اس کے (واد) کو حذف نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ اشباع کے ساتھ ہونا چاہئے ؂

کوئی بن تیرے جب نہیں موجود

یہ نازک فرق ہے۔ ہنگامہ مجمع۔ اگلے تین شعر بیاں ہنگامہ میں ہیں۔ غمزہ گوشہ چشم کی ادا۔ عشوہ = چشم نیم باز کی ادا۔ عنبر کوئی کہتا ہے کہ دریائی گائے کے فضلہ سے نکلتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ایک قسم کی مگس شہد کا موم ہے کوئی کہتا ہے کہ وحیل مچھلی میں سے نکلتا ہے WHALE (ماہی وال)۔

اے اللہ جب تیرے سوا کسی چیز کا وجود بنا بر لاموجود الا اللہ نہیں تو پھر یہ موجودات کیا چیز ہیں۔ یہ حسینان جہاں کون ہیں اور ان کے غمزہ اور عشوے اور ادائیں کیا چیز ہیں۔ ان حسینوں کی زلف پر پیچ و معطر کیوں ہے جو دل فریب ہے اور ان کی چشم سرمگیں دل کش کیا چیز ہے۔ اور یہ سبزہ و گل کہاں سے آ گئے۔ ابر و ہوائے مفرح کیا چیز ہے۔ ان مفرح اور دل فریب چیزوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایسا نفس مطمئنہ کہاں سے لائے جو ترک کر کے رجوع بحق کرے۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ان ایک معمولی ضمیر غائب با تعظیم ہے مگر اس کا لطف اہل زبان ہی اٹھا سکتے ہیں۔ لہجہ (ٹون) بدل بدل کے پڑھنے سے معانی متعدد اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ تعجب۔ حسرت۔ حیرت۔ مایوسی۔ وغیرہ کے معانی اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ضمیر بالکل بلبل شیراز کے (تو) کی طرح ہے جس کے بدلے میں صائب اپنا دیوان دینے کو تیار تھے ؂

کہ سر بکوہ بیابان تو دادہٗ مارا

جس نے وفا کا نام تک نہیں سنا ہمارے دیوانہ پن کو دیکھو کہ ہم ایسے شخص سے وفا کی امید رکھتے ہیں۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا اور درویش کی صدا کیا ہے

ہاں کلمۂ تنبیہ۔ سن۔ دیکھ۔

سن لو کسی کے ساتھ بھلائی کرنے سے خدا کی طرف سے خوبی حاصل ہوتی ہے۔ ہم تیرے محتاج ہیں اور محتاج و فقیر کی صدا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ شعر مرتبہ غالب سے بہت پست ہے۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

دعا دینے میں کیا رکھا ہے اس میں نہ ہینگ لگتی ہے اور نہ پھٹکری۔ میں تو ایسا عاشق صادق ہوں کہ تم پر جان نثار کرتا ہوں۔

شاید قافیہ (دعا) کی جگہ (وفا) زیادہ معنی خیز ہو۔

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ  مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

مجھے یہ تسلیم ہے کہ غالب میں کسی قسم کی کوئی خوبی نہیں مگر بربنائے "مفت راچہ گفت"۔ ایک بندۂ بے درم ارادت مند مفت میں ہاتھ لگے تو برا کیا ہے۔ یہ چند غزلیں بحور مستدس میں پوری کی پوری اچھی ہیں اور متعدد اشعار ان غزلوں کے عدیم المثال اور زائد الوصف ہیں۔

---

غزل ۴۴  اشعار ۹

۴۴ غ  کہتے تو ہو تم کہ سب بت غالیہ مو آئے  اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

ظفر شاہ نے اسی طرح میں مطلع کیا خوب کہا ہے ؎

یا آئے اجل یا صنم عربدہ جو آئے  ایسا نہ ہو یارب کہ نہ یہ آئے نہ وہ آئے

اے ہمہ مو تم سب کی تمنا ہے کہ وہ زلف مشکیں والا میرے پاس آئے۔ مگر خدا کرے کہ گھبرا کے اک دم تمہارے منہ سے نکل جائے کہ لو وہ آ گئے۔

وُو اس میں شک نہیں کہ (وہ) کی ہائے مختفی تلفظ میں نہیں آتی اور واو اول کے اسباع سے دوسرا واو پیدا ہو جاتا ہے مگر ضمہ مجہول پہلے واو پر ہوتا ہے۔ اور پہلے مصرع کے (مو) میں اصلاً تو واو مجہول ہے۔ مگر ہمارا تلفظ واو معروف سے ہے۔ اور یہاں قافیہ کا اعتبار تلفظ سے کیا جا رہا ہے۔ اس لیئے اس مطلع میں واو معروف اور مجہول کا قافیہ قرار پائے گا۔ وو کے تتبع میں اگر مو بواو مجہول پڑھیں یا مو (بواو معروف کے تتبع میں وو کو (بواو) معروف پڑھیں تو کس قدر ناگوار سماعت ہو گا۔ ایرانی واو اور یائے مجہول کا تلفظ معروف ہی سے کرتے ہیں اس لیئے بنابر تلفظ ان کے قوافی ٹھیک ہیں۔ مگر اردو میں واو جو یا (ی) دونوں کا تلفظ معروف اور مجہول میں الگ الگ ہے اس لیئے معروف کو مجہول یا مجہول کو معروف پڑھنے میں ثقالت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ان قوافی میں یہ نقصان ضرور ہے۔

اس وو (وہ) کے لحاظ سے چاہئے ہے کہ (یے ۔ یہ) کا قافیہ (لیے اور دیے) سے کیا جائے مگر یہ دیکھا نہیں گیا۔ شاید کسی نے کہا ہو۔

ان واو مجہول کے قوافی میں (بو) جو بواو معروف تلفظ میں ہے اور بھی لائے ہیں۔

ہوں کش مکش نزع میں ہاں جذب محبت　　کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے دیکھنے کو آئے

اگرچہ جاں کندنی میں مبتلا ہوں مگر اے کشش محبت اب بھی تو اسے کھینچ لا۔ چاہے میں اس سے نہ شکایت کر سکوں اور نہ شکر مگر وہ میرے دیکھنے کو آجائے۔ کم از کم وقت آخر اس کا دیدار تو ہو جائے گا۔ ظفر شاہ نے اس قافیہ کو بھی خوب کہا ہے ؎

آئے بھی تو آتے ہی لگے پھیرنے چتون　　کیا آئے وہ گردن پہ چھری پھیرنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم　　آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

صاعقہ = بجلی جو گر پڑے۔ سیماب = جیوہ۔ زیبق۔ پارا۔ ترجمہ لفظی آب سیم۔ چوں کہ پگھلی ہوئی چاندی کی طرح کا ہوتا ہے۔ معدنی چیز ہے۔

اگرچہ وہ آئے ہیں مگر بجلی اور شعلہ اور پارے کی طرح بے قرار ہیں۔ ایدھر جاتے ہیں اُدھر جاتے ہیں نچلے بیٹھے نہیں۔ چھلاوہ ہو رہے ہیں۔ جانے پر تیار ہیں۔ ذرا چپکے ہو کے بیٹھیں تو ان سے ہم اپنا درد دل کہیں۔ پھر اس صورت میں ان کا آنا کیا ہوا اگرچہ وہ آئے تو ہیں۔

جناب آسی فرماتے ہیں کہ بعض نسخوں میں (آنا ہی) یعنی مصدر کی جگہ حال یعنی (آتا ہے) ملتا ہے۔ وہ بھی صحیح ہے۔ ور یہ معنی ہیں کہ میرا عالم وہی شعلہ۔ سیماب اور برق کا سا ہے کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اس سے میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وہ نہیں آتا۔ اب چاہے آہی جائے۔ مگر میرا یہی خیال ہے (زبان کی کیا ریڑھ ماری ہے)۔

جناب نظم فرماتے ہیں: معشوق کی شوخی سے استعارہ ہے۔ اور آنے سے اسی کا آنا مراد ہے۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین　　ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

مسلمانوں کے خیال میں منکر اور نکیر دو فرشتے ہیں جو قبر میں آکر مردے سے کچھ سوالات کرتے ہیں۔ دوشینہ = شب گذشتہ والی۔

منکر و نکیر اور کسی طرح تو گھبرا کے بھاگ نہیں سکتے۔ ہاں ایک یہ تدبیر ہے کہ شراب شب گذشتہ کی اگر منھ سے بو آتی ہو تو آپ بھاگ جائیں گے۔ اور ان کے سوال و جواب کے عذاب سے نجات مل جائے گی۔ اپنے مطلب کے لحاظ سے بہت برا اور نہایت بد مذاق شعر ہے۔ نہ معلوم کہ وقت انتخاب کس خیال سے نہیں نکالا۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے　　ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

وہ کسی بھیس میں رنگ بدل بدل کے آئیں ہم ان کو ہر رنگ میں خوب پہچانتے ہیں۔ جلاد بن کے آئیں تو ہم ڈرتے نہیں کیوں کہ ہر وقت مرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور واعظ بن کے آئیں اور ترک عشق کی نصیحت کریں تو جھگڑنے کے نہیں مگر ساتھ ہی ترک عشق ہم سے ممکن نہیں۔

ہاں اہل طلب کون سُنے طعنہ نایافت　　دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اے جو یائے محبوب ہم نے اس کی بہت تلاش کی جب دیکھا کہ وہ ہاتھ آنے کا نہیں تو ہم اپنے ہی کو کھو بیٹھے۔ کیوں کہ نایابی کا طعنہ کون سنتا۔ لوگ کہتے بہت ڈھونڈھنے چلے تھے پا نہ لیا۔

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں　　اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

ہم آرام و سکون سے بیٹھ رہیں یہ ہمارا طریقہ نہیں کیوں کہ کسی مطلوب سے ہم کبھی خالی نہیں رہ سکتے۔ جب اس کے در تک رسائی نہیں ہوتی تو کعبہ ہی کو آتے ہیں۔ دریار کے مقابلہ میں کعبہ کی تحقیر مقصود ہے جو (یہ) اسے نکلتی ہے ؎

گندم اگر بہم نرسد بھس غنیمت است

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر　　اچھے رہے آپ اس سے مگر ہم کو ڈبو آئے

میرے رونے پیٹنے کا ذکر ہمدموں نے اس کے سامنے کیا۔ جب اس نے کہا کہ اگر ایسا ہوتا تو کچھ اثر ہم پر بھی ہوتا اور اثر ہے نہیں۔ بس ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ آپ تو اس کے سامنے اچھے رہے مگر ہم کو کہیں کا نہ رکھا۔ کبھی کبھی تاثیر گریہ سے اس کو دھمکا لیتے تھے وہ بات بھی جاتی رہی۔ اب اور بھی زیادہ ستائیں گے۔

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالبؔ　　ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

کیا بات ہے یعنی اس کا کیا کہنا۔ اعلیٰ درجہ کی ہے۔

اے غالبؔ اس کی انجمن ناز کیا کہنا ہے۔ نہایت خوب ہے۔ ہم بھی وہاں گئے تھے اور تیری سفارش بھی کی مگر وہ ذرا بھی متوجہ نہ ہوئے۔ اور تیری بد قسمتی پر رونا آگیا یا۔ اس انجمن کی خوبی کو دیکھ کر اپنے دل ہی دل میں گھٹے کہ ایسی انجمن اور اس کا لطف ہمارا ہم نفس غالبؔ اٹھانے سے محروم ہے کیسا بد قسمت ہے۔

---

غزل ۳۵ اشعار ۱۴

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے سینہ جویائے زخم کاری ہے

اک بے قراری کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اور کچھ سے بے قراری کو گھٹایا کیوں جائے۔ وزن میں نہ آسکتا ہو تو یہ تعقید بھی گوارا کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا مصرع اول یوں ہو سکتا ہے ؎

دل کو پھر ایک بے قراری ہے

(فائدہ) انتظاری ایرانی نہیں بولتے اس لئے نظم نہیں کرتے مگر اردو میں جب بولتے ہیں تو ایرانیوں کے تتبع کی کیا ضرورت۔ رہا یہ اعتراض کہ انتظار عربی کا خود مصدر ہے پھر یائے مصدری کی کیا ضرورت۔ ایرانی خود عربی کے صیغوں کی پروا نہ کر کے اپنا تصرف کر لیتے ہیں۔ شماع کے معنی شمع بنانے والا وہ پھر یائے فاعلی ملا کر شماعی کہتے ہیں۔ یا ورچی۔ (با وا با) بمعنی آش (سالن۔ شوربا) ور علامت فاعلی جیسے رنجور۔ گنجور۔ دستور (وزیر) مگر پھر اس پر (چی) علامت فاعلی ترکی بڑھا لیتے ہیں۔ الفاظ کی صحت بول چال پر منحصر ہے نہ قواعد پر۔ کیوں کہ زبان پہلے ہے اور قواعد زبان دیکھ کے بنائے گئے۔ زبان ماتحت قواعد نہیں۔ جب بول چال کے موافق کوئی قاعدہ بنائے نہیں بنتا تو مجبوراً اہل قواعد کو شاذ اور خلاف قیاس کہنا پڑتا ہے۔

دل میں پھر ایک اضطراب اور بے قراری پیدا ہوگئی ہے۔ اور عشق کا زخم مہلک کھانے کے لئے سینہ تیار ہے۔ کیوں کہ بغیر زخم عشق کچھ مزہ نہیں ملتا۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن آمد فصل لالہ کاری ہے

جنون عشق فصل بہار میں بڑھ جاتا ہے۔

چوں کہ فصل بہار آرہی ہے اس لئے ناخن غم پھر جگر کاوی کر رہے ہیں۔ جگر کھودنا بنا بر عادت فارسی جگر کاوی کا ترجمہ کر دیا۔ جو اردو میں نہیں بولتے۔ اس سے فارسی جگر کاوی نظم کر دیتے تو بہتر ہوتا۔ جیسے ؎

شغل ناخن ہے پھر جگر کاوی آمد موسم بہاری ہے

قبلہ مقصد نگاہ نیاز پھر وہی پردۂ عماری ہے

عماری۔ ایک قسم کی سواری عورتوں کے لئے پردہ دار جسے اونٹ پر محمل کی طرح رکھتے ہیں ؎

پھر وہی یار کی عماری ہے

جب عشق جوش میں ہے تو ہماری نگاہ نیاز کے لیئے محمل محبوب مقصد کا قبلہ ہے۔ عماری کو قبلہ کہنا زیادہ مناسب تھا بہ نسبت پردۂ عماری کے۔ شاید پوشش کعبہ ذہن میں ہے۔ پھر قبلہ نہ ہونا چاہئے۔ کعبہ مع۔ پوشش کعبہ بولتے ہیں نہ پوشش قبلہ۔

چشم دلال جنس رسوائی دل خریدار ذوق خواری ہے

چشم چمیدن سے چمش حاصل مصدر اور اس کا قلب بعض چشم ہے۔ علم معانی کا مانا ہوا مسئلہ ہے کہ کسی زبان میں الفاظ مترادف ہوتے ہی نہیں از روئے وضع فرق ضرور ہوتا ہے چاہے مصداق ایک ہو۔ آنکھ کو چشم اس لیئے کہتے ہیں کہ خانہ چشم میں حرکت کرتی ہے۔ اور دیدہ اس لیئے کہتے ہیں کہ دیکھتی ہے۔ دلال : وہ درمیانی آدمی جو خریدار اور صاحب مال کے درمیان سودا طے کرتا ہے۔ عشق میں ذلت و خواری ہی ہوا کرتی ہے۔
آنکھ رسوائی کے مال کی دلال ہے۔ کیوں کہ کسی حسین کے دیکھنے سے عشق پیدا ہوتا ہے پھر ذلت و رسوائی اس کے لوازم میں سے ہے۔ اور دل ذوق خواری کا مزہ اٹھانا چاہتا ہے۔ پہلے مصرع میں سے (ہے) بلحاظ اکتفا بالاخری محذوف ہے۔

وہی صد رنگ نالہ فرسائی وہی صد گونہ اشک باری ہے

عشق کے ہوتے ہوئے وہی سو طرح کی اشک باری بدولت چشم ہے۔ اور دل کی وجہ سے وہی پہلی سی فریاد وفغاں روح فرسا ہے۔

دل ہوائے خرام ناز سے پھر محشرستان بے قراری ہے

رفتار یار کو شعرا قیامت زا کہا کرتے ہیں۔
خرام ناز کی خواہش و محبت میں دل نے بے قراری کا قیامت زا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔

جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے روز بازار جاں سپاری ہے

روز بازار : پینٹھ کا دن۔ چوں کہ اس دن چہل پہل ہوتی ہے اس لیئے کبھی رونق بھی ہے۔ بازار داولیا کبھی سالن اور زار کثرت کے لیئے جیسے گلزار۔ دراصل روٹی سالن کے بازار کے لیئے وضع ہوا۔ پھر ہر بازار پر اطلاق ہونے لگا۔

جلوہ معشوق پھر متاع ناز کو پیش کر رہا ہے۔ پھر عاشقوں کے جان دینے کا بازار گرم ہے۔

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں　　　پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر اسی بے فا سے عشق کرتے ہیں۔ پھر اسی پہلے طرز کی رنج و آلام والی ہماری زندگی ہے۔ جناب نظم فرماتے ہیں۔ اسی پر مرتے ہیں جس کو دیکھ کر جیتے ہیں۔

پھر کھلا ہے در عدالت ناز　　　گرم بازار فوجداری ہے

فوجداری۔ یعنی محکمہ جنائی CRIMINAL COURT اردو کا لفظ ہے گو ترکیب فارسی الفاظ سے ہے۔ لہٰذا بنا بر مسلمات عطف و اضافت فارسی نہ ہونا چاہیئے۔ مگر میرا خیال ہے کہ جب ناگوار سماعت نہیں تو پھر ایسے الفاظ عربی و فارسی جن میں معنوی تصرف ہوا ہے عطف و اضافہ فارسی کے ساتھ نظم کرنے میں کیا ہرج ہے۔

اس قطعہ میں بہت سے الفاظ قانونی استعمال کئے ہیں جو قانون سازوں نے انگریزی مصطلحات قانونی کے لیے گڑھے ہیں اور وہ عربی و فارسی نہیں۔ جیسے سرشتہ دار۔ فوجداری۔ روبکاری۔ سوال۔ مقدمہ۔

علامہ شبلی شعرالعجم میں فرماتے ہیں کہ اردو فارسی میں غزل مسلسل مضمون کی نہیں ہوتی۔ اول تو یہ بات ہی کیا ہے۔ انہوں نے مسلسل مضامین کے لیے مثنوی واسوخت۔ شہر آشوب کو اختیار کیا ہے۔ یہ غزل اور ایک غزل اور مسلسل مضمون میں ان کی ہے۔ نظیری نے بھی معشوق کے عاشق ہونے کے بیان میں ایک غزل مسلسل اسی بیان میں لکھی ہے۔

ہو رہا ہے جہاں میں اندھیر　　　زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال　　　ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب　　　اشک باری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا　　　آج پھر اس کی روبکاری ہے

سرشتہ دار اصل میں سررشتہ دار تھا مگر بول چال میں دوسری (ر) حذف ہو گئی ہے۔ اس لفظ میں (رشتہ) لفظ مناسب زلف ہے۔ پارۂ جگر = جگر کے ٹکڑے جو غم عشق کی وجہ سے ہو گئے ہیں۔ گواہ عشق۔ مراد اشک۔ اشک باری کا حکم جاری ہے (کا) برائے اضافہ جو ادنیٰ ملابست ہے یعنی عشق کی طرف سے گواہی دینے کے لیے اشک باری کے نام سمن جاری ہوئے ہیں۔ اشک باری کے مناسب لفظ جاری ہے۔ ایک کثرت کے لیے ہے۔ روبکاری =

پیشی ۔ سماعت ۔

عدالت ناز میں زلف سررشتہ دار ہے۔ اور اس نے دنیا میں اندھیر مچا رکھا ہے۔ دل عشاق پر ظلم وستم ڈھا رہی ہے
جگر کے ٹکڑوں نے عدالت ناز میں مقدمہ دائر کر دیا ہے ۔یعنی زلف پر دعویٰ کر دیا ہے۔ اور فریاد وزاری کا ایک ہنگامہ
اظہار مظلومی کے لیئے برپا ہے۔ عشق کے دعویٰ کے ثبوت کے لیئے اشکوں کے گواہوں کے نام سمن جاری ہوئے ہیں اور
دل عاشق و تیر مژگان یار میں جو مقدمہ تھا۔ اس کی آج پیشی ہے۔

بے خودی بے سبب نہیں غالب  کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

ہماری بے خودی بلا وجہ نہیں ہے۔ کوئی تو ایسی بات ہے جس پر پردہ پڑا رہنا ہمارا مقصد و منشا ہے یعنی راز
عشق بے خودی سے چھپا رہتا ہے۔ عاشق و معشوق دونوں کی رسوائی نہیں ہوتی ہے۔ (بے خودی) کوئی اختیاری چیز
نہیں پھر پردہ داری کی نسبت عاشق کے اختیار کے ساتھ کیسے کی جائے۔

جناب آسی نے اس مقطع کو اوپر والے قطعہ کے ساتھ ربط دینے کی بے جا کوشش کی اتنی ایک مقدمہ بازی کے
بعد ان کا بے خودی کے ساتھ تعبیر کرنا انھیں کا کام ہے لکھتے ہیں۔

اگرچہ یہ مقطع اس قطعہ سے الگ معلوم ہوتا ہے۔ مگر دراصل اس میں شامل ہے۔ گویا پوچھا گیا ہے کہ اگر تم
کو مژگان نے ستایا ہے تو تم یہ بتاؤ کہ تم بے خود کیوں ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ قصور تمہارا ہے اور تم اس کو چھپاتے ہو۔ یعنی تم کو
عشق ہے اسی وجہ سے تم کو بے خودی ہے اور اس حالت میں مژگان کا کوئی قصور نہیں۔

ان سے کوئی پوچھے کہ مقدمہ بازی کرتے کرتے بے خودی کہاں سے آئی۔ اور مصرع ثانی سے اس بات کو ربط
کیا ہوا۔

جناب نظم نے لکھا کہ جو الفاظ کسی معنی کے لیئے ہندوستان میں گڑھے جائیں چاہے وہ الفاظ عربی و فارسی کے ہوں
مگر معانی عربی و فارسی کے نہ ہوں۔ یا وہ الفاظ عربی و فارسی جن میں تصرف معنوی ہندوستان میں ہوا ہو ان کو عطف و
اضافہ فارسی کے ساتھ بنا بر مسلمات جماعت استعمال نہ کرنا چاہئے۔ چوں کہ آسی کی عادت ہے کہ نظم کے خلاف کچھ ضرور
کہیں اس لیئے لکھتے ہیں۔ اگرچہ اس قطعہ میں جو الفاظ ہیں وہ اردو کے ہیں۔ مگر چوں کہ وہ الفاظ فارسی سے لے کر
اپنے یہاں کے خاص خاص معنوں میں مستعمل کر لیئے گئے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی ترکیب فارسی الفاظ کے ساتھ
ناجائز نہیں۔

جو مسئلہ کہ مسلمہ جماعت ناجائز ہو وہ ایک آسی کے کہنے سے تو جائز نہیں ہو سکتا۔ اسے یوں لکھنا چاہئے تھا۔ میری رائے
ہے کہ اسے جائز قرار دیا جائے۔" جب لوگ اسے بہتر سمجھ کے عمل پیرا ہو جاتے تب آپ جائز ہو جاتا۔ یہاں تک تو ایک بات بھی

مخالف جمہوران کے قلم سے اچھی نہ نکلی اور آیندہ کی بھی امید نہیں ہوتی۔

---

غزل ۳۶ اشعار ۳

۲۷۷ غ ۲ جنون تہمت کش تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی

ایذا دوست ہونے کی وجہ سے مصائب و آلام والی زندگی کو زندگی بالذت کہا ہے۔

ہمارے جنون پر الزام تسکین کا نہ ہونا چاہئے اگر ہم سے اظہار مسرت ہوا۔ کیوں کہ بوجہ ایذا دوستی جو مصائب والی زندگی سے ہمیں مزہ ملتا ہے وہ درحقیقت خراش دل پر نمک پاشی کا کام کرتا ہے تو ایسی شادمانی سے ہمارے جنون پر تہمت تسکین کیسے عائد ہو سکتی ہے۔ تہمت مشتق از مادہ وہم الظن فی الصدق۔ زخم پر نمک موذی ہوتا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ (لذت) کا لفظ محض تشنیع کی راہ سے ہے۔ کہتے ہیں اے جنون تو تہمت کش تسکین نہ ہو۔ یعنی اگر میں نے شادمانی کی تو اس سے تجھ پر تسکین کی تہمت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ میری شادمانی نمک پاشی زخم دل کے لیئے ہے۔ نہ یہ کہ اس سے تسکین ہو۔ اور لذت زندگی کا نمک پاش ہونا یہ مطلب رکھتا ہے کہ ان برے حالوں جیتے رہنا زخم دل پر نمک چھڑکتا ہے۔ اور زخم پر نمک چھڑکنے سے اور سوزش زیادہ ہوتی ہے تسکین کجا۔

جناب حسرت۔ قاعدہ ہے کہ تکلیف کی حالت میں اگر تھوڑی سی راحت مل جائے تو تکلیف اور راحت کے مقابلہ کی وجہ سے تکلیف کا احساس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اسی بنا پر کہتا ہے کہ ہم نے شادمانی کی (ترجمہ شادمانی کردم) یعنی کسی قدر لذت زندگانی حاصل کی تو اس سے ہمارے جنون پر خواہش تسکین کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس سے تو اور زخم دل پر نمک پاشی ہو جاتی ہے۔

جناب آسی کے خیالی معنی بھی ملاحظہ ہوں۔

اے جنون چوں کہ ہم نے کچھ خوشی کی ہے تو تجھ پر اس سے تسکین کی تہمت جو تیرے لیئے باعث ننگ ہے نہیں رکھی جا سکتی۔ بلکہ ہم نے اگر لذت زندگی کچھ اٹھائی ہے تو وہ اس لیئے اٹھائی ہے کہ کچھ دیر بعد جو وہ ہم سے چھن جائے گی یا ہم اس کو چھوڑ دیں گے تو وہ اور بھی ہمارے زخم دل کے لیئے باعث نمک پاشی ہو جائے گی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو عیش فانی ہو وہ اور بھی باعث تکلیف ہے۔

دوسرے یہ کہ اے جنون تسکین کی تہمت میری شادمانی کرنے سے تجھ پر نہیں رکھی جا سکتی کیوں کہ لذت زندگانی کو دیکھ کر میں ان لذتوں سے خوش نہیں ہوتا۔ جو اس میں موجود ہیں بلکہ اس کا افسوس کرتا ہوں کہ یہ مجھ کو میسر نہیں ہیں۔ اور اس سے میرے دل پر نمک چھڑکا جاتا ہے۔ اور یہ نمک پاشی میرے ایذا دوست دل کے لیئے باعث شادمانی ہے اور

اس شادمانی سے تو متہم بہ شادمانی حقیقی نہیں ہو سکتا۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

سے "بےمعنی" کی وجہ سے"۔ (اگر "سے" کی جگہ "کا" ہو) تو یہ معنی ہوں گے کہ آزادی کی کوشش کشاکش ہستی کا کیا بنا سکتی ہے۔ موج کا استعارہ زنجیر کے ساتھ بہت مشہور ہے۔ فرصت روانی کا موج آب کے لیئے زنجیر ہونا کیا معنی۔ خواہش کوشش وغیرہ ہو تو کچھ معنی ہوں گے۔ لفظ فرصت برائے بیت ہی نہیں بلکہ مخل معنی ہے۔

علایق و ضروریات ہستی کے ہوتے ہوئے آزادی کی کوشش کیا بنا سکتی ہے۔ مجبور ہے موج آب کو دیکھو کہ وہ رواں ہو کر آزاد ہونا چاہتی ہے مگر وہی اس کی روانی اس کے لیئے زنجیر پا ہوتی ہے اور گرفتاری دریا سے باہر نکل کر جا نہیں سکتی۔ اسی طرح جب تک زندگی ہے تعلقات زندگی سے آزادی محال ہے۔

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہ طفلاں ہے شرار سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

مرنے کے بعد بھی تیرا دیوانہ (یعنی میں) بچوں کا زیارت گاہ ہوں وہ میری قبر پر جو پتھراؤ کرتے ہیں جیسا کہ بحالت حیات کیا کرتے تھے تو ان پتھروں کے سنگ مزار سے ٹکرانے سے جو چنگاریاں نکلتی ہیں گویا وہ میری قبر پر پھول چڑھا رہے ہیں۔ صاحب مزار اگر نفسانی خوبی والا ہو تو اس کی قبر پر پھول چڑھاتے ہیں۔

---

غزل ۲۷ اشعار ۵

۱۰۹غ نہ کوہش ہے سزا فریادی بیداد دلبر کی مبادا خندۂ دندان نما ہو صبح محشر کی

سزا مناسب اور بدلہ بدی مقابل جزا خندۂ دندان نما سے مراد تضحیک۔ صبح کے پو پھٹنے کو خندہ کے ساتھ استعارہ کرتے ہیں جیسا کہ ؎

سپیدۂ سحر وصل کیا ہوا ظاہر ہنسی ہنسی میں زمانہ نے اشک بار کیا

معشوق کے مظالم کی جو فریاد قیامت میں خدا کے سامنے کرے وہ مستحق ملامت ہے اور کیا تعجب ہے کہ صبح محشر اس کی تضحیک کرے کہ جب اس محبوب کے مظالم کا تحمل نہیں ہے تو کس لیے تم نے پر اس سے عشق کیا محبوب کی بھی کوئی فریاد کیا کرتا ہے۔

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے　　اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

خاکِ دشت ۔ جناب نظمؔ دشت بمعنی صحرا کی جگہ دست (ہاتھ) تجویز کرتے ہیں اور بجا فرماتے ہیں کیوں کہ دشت میں تو ریت ہوتی ہے ۔ خاک کہاں ۔ پھر اس واقعہ مشہور کے ساتھ کہ لیلیٰ کی فصد کھلی اور مجنوں کی رگ دست سے خون بہا ۔ اسی لفظ دست سے تلمیح ہوتی ہے ۔ اور خاک دستِ مجنوں کا رگ لیلیٰ کے زخمی کر دینے کی نسبت یا دنی ملابست ہے کیوں کہ نشتر اسی خاک میں بوئے گئے اور نوک نشتر نے رگ لیلیٰ کو زخمی کیا ہے ۔ ریشگی ریش (زخم) سے مصدر خلاف قیاس زخمی ہونا ۔ دہقان ۔ دیہاتی یہاں مراد کاشت کار ۔ یہ معنی بھی وضعی ہیں ۔ ریشہ سے ریشگی ضابطہ میں ہے ۔ مگر ریش سے ریشگی خلاف قیاس ہے ۔

زندگیِ مجنوں میں لیلیٰ کی فصد کھلی اور مجنوں کے ہاتھ سے خون بہا ۔ اب اگر بعد موت مجنوں جو وہ خود اور اس کا ہاتھ خاک ہو گیا ہے اگر اس خاک میں کاشت کار نوک نشتر بو دے تو بوجہ اتحاد حسن و عشق رگ دست لیلیٰ زخمی ہو کر اس سے خون بہے تو کچھ بعید نہیں ۔ (ریشگی ۔ بخشے) یہ الفاظ کچھ اچھے نہیں ۔ ریش کر ڈالے ۔ ریش ہی کر دے یا مثل اس کے کچھ بہتر الفاظ ہونا بہتر ہوگا ۔ بہر حال یہ شعر تصنع غیر مطبوع کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔

جناب آسیؔ اس شعر کے معنی وہی لکھتے ہیں جو جناب نظمؔ نے لکھے مگر تجویز (دست) پر خامہ فرسا ہیں وہ بھی بے جا " واضح ہو کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے " ۔ اس سے نہ یہ لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور نہ لفظ خاک با معنی رہتا ہے ۔ حالاں کہ (دست) ہی سے یہ معنی بھی بنتے ہیں ۔ کیوں کہ تلمیح اسی لفظ سے پوری اترتی ہے ۔ اور خاک ہی سے معنی بھی درست ہوتے ہیں ۔ ورنہ دشت میں تو ریت ہوتی ہے ۔ خاک وہاں کہاں ۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا　　ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

بادبان ٹاٹ کے پردے جو مستول کی رسیوں سے بندھے ہوتے ہیں ان میں جب ہوا بھرتی ہے تو بادی جہاز تیز رفتار ہو جاتا ہے ۔ کشتی TRAY ہے جس میں جام و ساغر لگا کے لاتے ہیں اور اہل مجلس پر تقسیم کرتے ہیں ۔ دوسرے معنی جہاز SHIP کے ہیں ۔ اسی سے کام لیا ہے ۔ اور اس کے مناسبات میں سے بادبان ہے ۔ مجلس کی مناسبت سے پروانہ ۔ اور گرمی ۔ اور روانی پھر اسی مناسبت کشتی (جہاز) سے ہے اور ساغر وے بمناسبت کشتی بمعنی (ٹرے) لائے ۔ گرمی ۔ چہل پہل ۔

شاید پروانہ کے پرکشتی مے کے لیئے بادبان تھے۔ بزم کی چہل پہل اور اس کی گہما گہمی دورِ ساغر کی روانی کے باعث ہوئی۔

جب گرمی محفل باعث روانی دورِ ساغر ہوگئی تو پھر کشتی مے میں پر پروانہ کے بادبان لگا کر ایک جہاز کیوں تیار کیا گیا جبکہ اس سے کوئی کام بھی نہ لیا گیا۔ پہلا مصرع بے ضرورت رہتا ہے۔ کیوں کہ مصرع ثانی کے ساتھ اسے مربوط نہیں کیا گیا۔

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت      کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

پرفشانی ۔ پر پھڑپھڑانا۔ پھڑکنا۔ عرض کرنا ۔ پیش کرنا۔ بیان کرنا۔ شہپر ۔ پرندہ کے دس پروں میں سے اگلے چار پر۔ ان کو عربی میں قوادم اور باقی چھ کو خوافی۔ اور دسوں کو اردو میں دسوکا کہتے ہیں۔ پرندہ پہلے پر تولتا ہے اس کے بعد اڑتا ہے۔

مجھے جو شوق پر پھڑپھڑا کے اڑ جانے کا ہے تا کہ آزادی مل جائے اور وہ ممکن نہیں اس کے بیان کرنے کی مجھ میں قدرت نہیں (بیان سے باہر ہے) کیوں کہ اڑنے سے پہلے شہپروں کی طاقت ہی جاتی رہی تو پھر اڑوں تو کیسے اڑوں۔ غرض جنجال اور عذاب عشق سے جان چھڑانا ناممکن ہے۔

کہاں تک روؤں اس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے      مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

اس کے خیمہ کے پیچھے بیٹھ کر کہاں تک روتا رہوں اس تک رسائی تو ہوتی نہیں۔ یہ کیسی مصیبت ہے۔ یا اللہ کیا میری قسمت میں اس کے مسکن کی دیوار پتھر کی نہ تھی جو اس سے سر ٹکرا کر جھگڑا ہی ختم کر دیتا۔

پانچوں اشعار میں کوئی مزہ نہیں۔

---

غزل ۳۸ اشعار ۳

نثر — جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی — تو فسردگی نہاں ہے بہ کمین بے زبانی

جناب نظم نے۔ اس مطلع کے معانی لکھنے میں طول دیا ہے:۔
شعلہ۔ شعلہ عشق۔ فسردگی۔ ٹھٹھر جانا۔ کمین گھات۔
نقد داغ دل کی اگر شعلہ عشق نگہبانی نہ کرے تو افسردگی بے زبانی کی گھات میں اس کے پیچھے چھپی بیٹھی ہے (تاکہ اسے اڑا لے جائے) یعنی مایوسیوں کی وجہ سے داغ دل ٹھٹھرنے اور کمھلانے پر ہر وقت آمادہ ہے۔ مگر شعلہ عشق اسے دہکتا رکھتا ہے۔ اور ٹھنڈا نہیں ہونے دیتا۔
جناب نظم۔ شعلہ میرے داغ دل کی پاسبانی کر رہا ہے اور اسے ٹھنڈا نہیں ہونے دیتا۔ نہیں تو افسردگی بے زبانی کے پردہ میں چور کی طرح چھپی ہے کہ اس اشرفی داغ کو لے بھاگے۔ شعلہ کی تشبیہ بیاں سے مشہور ہے اس کا پاسبانی نہ کرنا یہی بے زبانی ہے اور اس بے زبانی کا انجام فسردگی ہے۔ داغ دل کو مدور مانتے ہیں اور اس میں چمک اور سوزش تجویز کرتے ہیں۔ اسی سبب آفتاب داغ۔ درہم داغ اور شعلہ داغ استعارات کرتے رہتے ہیں۔ آہ کو مستطیل شعلہ ور دود انگیز خیال کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ جب داغ دل اشرفی ہوا تو شعلہ آہ اس کی تمام رات نگہبانی کیا کرتا ہے۔ یعنی داغ کے ساتھ آہ آتشیں بھی ہے۔ اور افسردگی کو دزد نہیں کہا مگر اس کا فعل ایسا بیان کیا جو ان کا ہوتا ہے۔ یعنی افسردگی کا اشرفی داغ کی گھات میں لگا رہنا تو گویا اسے چور ہی تصور کیا جو کمین بے زبانی میں چھپا ہے۔ یہ سب استعارات لطیف ہیں لیکن حاصل شعر کو دیکھو تو کچھ بھی نہیں (نہ نقد) دونوں مجتمع ہو جانے سے تنافر پیدا ہو گیا ہے۔

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی — کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

بچے کہانی بڑے شوق سے سنا کرتے ہیں۔ (یہ دوسرا مطلع ہے) معشوق نے اپنے بچپنے میں تو میری رام کہانی کبھی سنی نہیں۔ اب جبکہ ان کا عالم شباب ہے میرے قصہ دردناک کو ان سے کیا امید کی جائے کہ وہ سن لے گا۔

یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا — کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

یونہیں۔ بلا سبب۔ میری زندگی ایسی بری ہے کہ میں کہتا میرے دشمن کو مل جائے۔ لیکن بلا سبب کسی کو دکھ پہنچانا اچھا نہیں اس لیئے یہ دعا نہیں کرتا ہوں مگر ایسی زندگی سے بیزار ضرور ہوں۔

غزل ۳۹ اشعار ۱۰

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

بے اعتدالی - حد سے متجاوز ہو جانا۔ سبک - خفیف - ذلیل - ہلکا - وقار و تمکیں کے خلاف -
جتنا بھی ہم اپنی حد سے متجاوز ہوئے اور سعی حصول مقصود میں قدم آگے بڑھایا۔ تو ناکام رہنے کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں ہماری وقعت جاتی رہی -

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

سخت اُردو اور فارسی دونوں میں بہت کے معنی میں مستعمل ہے -
چوں کہ دل حسن پرست ساتھ لائے تھے لہٰذا ابھی پر پرزے بھی جھاڑنے نہ پائے تھے کہ ہم دام عشق میں گرفتار ہو گئے۔

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

قسم ہونا جناب نظم فرماتے ہیں کہ محاورہ ہے کہ ہمارے پاس فلاں شے قسم کھانے کو بھی نہیں یا نام کو بھی نہیں۔ بنا اس محاورہ کی اس بات پر ہے کہ اگر وہ شے نام کو بھی ہوتی تو ثبوت قسم کے لیئے کافی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی ہستی جو قسم کھانے کے لیئے ہو اور برائے نام ہو وہ فنا اور نیستی کی دلیل ہے۔ اور یہ بھی محاورہ ہے کہ ہمیں فلاں شے کی قسم ہے یعنی اس سے کچھ تعلق نہیں ہے -
پہلے محاورہ کے الفاظ شعر میں نہیں۔ اور محاورہ اپنے الفاظ معینہ کے ساتھ ہوتا ہے اس میں تصرف کمی زیادتی یا تغیر کے ساتھ محاورہ کو بگاڑ دیتا ہے۔ دوسرے معنی کے لیئے بھی الفاظ کفایت نہیں کرتے۔ کیوں کہ الفاظ یہ ہیں۔ آپ ہم اپنی قسم ہوئے -
دیگر شارحین انھیں کی نقل کرتے ہیں خواہ مفہوم کے لحاظ سے یا الفاظ بدل کے۔ مجھے شرح جناب نظم پسند نہ آئی جو میری ہی سمجھ کا قصور ہے۔ اور میرے بنائے کچھ بنتا نہیں عجب مخمصہ میں جان ہے۔ اُلٹا سیدھا جو ذہن میں آتا ہے لکھتا ہوں۔
ہماری ہستی خود ہماری فنا پر دلیل ہے۔ کیوں کہ مانا ہوا مسئلہ ہے الوجود بین العدمین عدم۔
یعنی وہ ہستی جو دو عدم کے درمیان ہو وہ خود عدم ہے۔ لیکن ہم بمفاد موتوا قبل ان تموتوا عشق میں ایسے مٹے کہ ہم آپ اپنی قسم ہوئے۔ یعنی جس طرح ہماری قسم معشوق کے سامنے غیر اعتباری ہے اسی طرح ہماری ہستی غیر اعتباری ہے -

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر — وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

عشق کی سختی اٹھانے والوں (عشاق) کی حالت کچھ نہ پوچھو۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ ہمہ تن الم (رنج) بن کے رہ گئے۔ مجسمہ الم ہیں۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ الم کی طرح غیر محسوس ہو گئے۔
اگر (سراپا الم) پڑھ سکیں تو یہ معنی ہوں گے کہ جس طرح عربی میں (لم) حرف نفی تاکید کے لیئے ہے اسی طرح مثل حرف لم نفی ہو کے رہ گئے یعنی فنا ہو گئے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہاتھ قلم ہونا۔ ہاتھ کاٹے جانا۔ ہاتھوں کا بمنزلہ قلم ہونا۔
شعر سے تو ظاہر نہیں مگر غزل ہونے کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ محبوب کو لکھتے رہے اور محبوب ہی نے ہاتھ کٹوا لئے۔
قلم بمعنی کلک کے مناسب لکھنا۔ حکایت اور ہاتھ۔ اور کٹنے کے معنی سے مناسب خونچکاں۔

اللہ رے تیری تندی خو جس کے بیم سے — اجزائے نالہ دل میں مرے رزق ہم ہوئے

تندی خو۔ تیز طبعی۔ تند مزاجی۔ بیم فارسی سے شغف ہے اس لیئے خوف کو چھوڑ کے (بیم) کو اختیار کیا۔ ہم بمعنی ہمدگر۔ ایک دوسرے۔ اردو میں نہیں بولتے۔
خدا کی پناہ وہ کس قدر تند مزاج ہیں کہ ان کے خوف سے دل سے نالے نہ نکل سکے اور ایک نالہ دوسرے نالہ کو کھا گیا۔

اہل ہوس کی فتح ہے ترک نبرد عشق — جو پاؤں اُٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

اہل ہوس رقیب نبرد جنگ پاؤں اُٹھ جانا۔ قیام نہ کر سکنا۔ بھاگ جانا۔ صرف (اٹھنے) کے لفظ سے علم فتح بلند ہونا قرار دے دیا ورنہ پاؤں اُٹھنے سے علم فتح ہونے کے ساتھ استعارہ اچھا نہ تھا اس لیئے جناب نظم نے یوں اصلاح فرمائی۔

اُٹھا دفا سے ہاتھ تو اونچے علم ہوئے

مجھے ذکر نبرد عشق میں ذکر وفا اچھا نہ معلوم ہوا۔ اس لیئے یوں ترمیم کی۔

اُٹھے جو ہاتھ جنگ سے گویا علم ہوئے

جنگ عشق سے رقیبوں نے جو ہاتھ اٹھایا وہی ان کے لیئے گویا علم فتح بلند ہوا۔ کیوں کہ اگر جنگ کرتے تو شکست

کھانے کے سوا اور کیا ہاتھ آتا۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے　　جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

عدم میں شئے معدوم کے کچھ سپرد ہونا کیا معنی۔ عدم سے تو ازل ہوتا تو حق بجانب ہوتے۔ پھر نہ کھنچ سکنے کی کوئی علت نہیں معلوم ہوئی۔ واں ۔ زمانہ عدم یا ازل۔ یاں ۔ دنیا دم ۔ نفس۔ سانس۔ لفظ چند بھی مخل معنی ہے۔ کثیر یا مبہم رکھنا چاہئے تا کہ نہ کھنچ سکنے کی کچھ تو علت ہو۔ چند کا اطلاق تین سے نو تک پر ہوتا ہے۔

زمانہ عدم یا ازل میں چند نالے ہمارے سپرد تھے جو وہاں ہم نہ کھنچ سکے وہی اس دنیا میں نفس کے ساتھ موسوم ہیں۔ یہ سانس سانس نہیں بلکہ نالے ہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں اس شعر میں (دم ہوئے) اچھا نہیں۔ لیکن مضمون شعر نہایت لطیف ہے۔ مگر میں لطافت کو نہ سمجھ سکا۔ بجائے لطافت کچھ نقصانات معلوم ہوئے جن کو اوپر لکھا۔ چشم عیب بیں کو عیب ہی دکھائی دیتے ہیں۔

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی　　سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

دل لگی ۔ دل کا لگاؤ یعنی محبت وعشق۔ اور ہر وہ کلام جس سے تفریح ہو۔

ہم ایسے عاشق مزاج ہیں کہ گداگری اور فقیری میں بھی عشق کا پہلو ہم سے نہیں چھوٹتا چنانچہ سائل بھی بنے تو بھی عاشق اہل سخا ہوئے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس شعر کا مطلب کچھ نہ سمجھ سکا۔ عاشق اہل کرم ہونے میں دل لگی کسی معنی کے ساتھ کیا نکلی۔ پوری غزل سے مجھے کچھ لطف نہ آیا۔

---

غزل ۴۰　　　اشعار معہ قطعہ ۱۳

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے　　اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے　　۱۰۰اغ ۱۲

(سو) کی جگہ (وہ ۔ یا ۔ جو) ہونا چاہئے۔ صبح کے وقت شمع کو بجھا دیا کرتے ہیں۔

میرے ہجر کی رات میں جو ظلمت کدہ ہو رہی ہے غم کا وفور ہے جس نے اسے ظلمت کدہ بنا رکھا ہے۔ ہاں سحر ہو جانے پر دلیل ایک بجھے ہوئی شمع ہے جسے صبح کو بجھا دیا کرتے ہیں۔ جس گھر میں بجھی ہوئی شمع صرف دلیل صبح ہو جانے پر ہو اس گھر کی تاریکی کا کیا پوچھنا ہے لطف یہ ہے کہ جس چیز کو دلیل سحر قرار دیا وہ خود منجملہ اسباب تاریکی ہے۔ یہ معنی خود غالب نے عود ہندی

ہیں لکھے ہیں۔ اور پہلے مصرع کو مبتدا اور دوسرے کو خبر بتایا ہے۔

جناب نظم معنی اور ترکیب دونوں کو عجیب و غریب فرماتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ٹھیک تو کہتے ہیں۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ غالباً شمع خاموش کو علامت سحر اس وجہ سے کہا ہے کہ سپیدی شمع سپیدہ مستطیل صبح سے مشابہت رکھتی ہے۔ انسان ہی تو ہیں۔ ان کا خیال کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال　　مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

نے بکسر اول (نا) کا جمال ہے اور فارسی ہے اردو میں مستعمل نہیں۔ آشتی = صلح۔

ایک مدت ہو چکی ہے کہ کانوں نے خوش خبری وصال کی نہیں سنی اور آنکھیں دیدار یار سے محروم ہیں۔ پہلے کان مژدۂ وصال سنتے تھے تو آنکھوں کو کانوں پر رشک ہوتا تھا کہ ہم نے جمال یار نہیں دیکھا اور آنکھیں اگر اس کو دیکھ پاتی تھیں تو کان رشک کرتے تھے کہ ہم نے مژدہ وصال نہیں سنا۔ اب دونوں اپنے اپنے مطلوب سے محروم ہیں تو پھر ایک دوسرے سے مخالف کیوں ہونے لگے جب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں لہٰذا ہم جنس ہو جانے سے آپس میں اتحاد اور صلح ہے۔

مے نے کیا ہے حُسن خود آرا کو بے حجاب　　اے شوق ہاں اجازت تسلیم ہوش ہے

شراب نے ان کے حُسن کو جو ذاتی زینت رکھتا ہے اور ظاہری آرایش کی اسے ضرورت نہیں بے پردہ کر دیا ہے۔ ایسے میں اے شوق سن لے تجھے بھی اجازت ہے کہ ہوشیاری اور ادب کی باتیں چھوڑ کے اور گستاخ ہو کر اپنا مطلب حاصل کر لے یا۔ اپنے ہوش و حواس اس کے حوالہ کر دے اور بے خود ہو کر مراد دلی پوری کر لے۔ محض بے ہوش اور بے خود ہونے سے تو کوئی بات نہیں نکلتی ہے۔

گوہر کو عقد گردن خوباں میں دیکھنا　　کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

حسینوں کی گردن میں موتیوں کی لڑیاں دیکھنے کے قابل ہیں کہ ان کی قسمت تو دیکھو کہ گردن محبوباں تک ان کی رسائی ہوئی۔ جوہریوں کا بھی ستارہ کیسے اوج پر ہو گیا کہ ان کے موتی معشوقوں کی گردن میں پہنچے۔ اس سے ملتا جلتا ایک شعر کہہ چکے ہیں۔

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں　　ہم اوج طالع لعل و گوہر کو دیکھتے ہیں

اوج و حضیض و شرف و ہبوط ستاروں کو بروج میں ہوا کرتے ہیں۔

عاشق کو گوہر اور جوہری کی قسمت پر رشک پیدا ہوا۔

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست　　بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

دیدار یار شراب ہے۔ حوصلہ کار ساقی گر رہا ہے۔ نگاہ مے خوار ہے۔ بزم خیال عاشق ایک ایسا میکدہ ہے جہاں ہنگامہ شور اور غل بالکل نہیں (پہلے مصرع میں تینوں کے ساتھ یا صرف مست کے بعد (ہے) محذوف ہے) اور اضافہ کسی میں نہیں ہے۔ مبتدا و خبر ہیں۔

## قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل　　زنہار اگر تمہیں ہوسِ نا و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی　　مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

تازہ واردان = مراد عشاق۔ جوان۔ بساط = فرش۔ ہوا = خواہش و محبت۔ زنہار = کلمہ تاکید۔ بچو۔ پناہ مانگو نالے = بانسری کے نغمے مراد ہیں۔ نوش = مے خواری۔ عبرت = پند و نصیحت۔ نصیحت نیوش = نصیحت سننے والے۔ ساقی = بجلوہ فارسی ترکیب ہے۔ اُردو میں نہیں بولتے۔ آگہی = ہوشیاری۔ بیداری۔ مطرب = طرب اور خوشی میں لانے والا۔ گانے بجانے والا۔ رہزن = لٹیرا۔ تمکین = وقار و قدرت۔

اے بزم محبت میں نئے نئے آنے والو پناہ مانگو اور بچو اگر تم کو شراب پینے اور نغمے سننے کی ہوس ہے تو میرے حال پر نظر ڈالو اگر تم کو چشم عبرت پذیر حاصل ہے۔ اور میری سنو اگر تم گوش نصیحت نیوش رکھتے ہو۔ ساقی اپنا جلوہ دکھا کر ایمان چھین لیتا ہے اور ہوش اڑا دیتا ہے۔ اور گویا نغمے سنا سنا کر وقار اور ہوش و حواس باختہ کر دیتا ہے۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

**داماں** - مزید علیہ دامن - **فردوس** - لغت کنائز انڈیل میں اسے لاطینی اور یونانی کا لفظ بتاکے کہا کہ ٹھیک یہ ہے کہ ایرانی ہے اور معنی باغ کے ہیں - عربی میں آٹھ بہشتوں میں سے ایک بہشت کا نام اس کی جمع فرادیس لاتے ہیں کانوں کے لیئے جنت اس لیئے کہا کہ جنت میں خوش آواز پرندے چہچہاتے ہوں گے - باغبان کے بجائے گلچیں ہوتا تو اچھا تھا۔

۵ گلچیں کا دامن اور کف گلفروش ہے

رات کو دیکھتے تھے کہ گوشہ گوشہ بزم کا دامن گلچیں اور کف گل فروش بنا ہوا ہے - ساقی کی رفتار خوش کا لطف ہے اور چنگ کے نغموں کا مزہ آرہا ہے رفتار کو جنت کہنے میں وجہ شبہ حظ اور لطف ہو سکتا ہے - وہ رفتار یا ناز ساقی نگاہ کے لیئے جنت اور وہ نغمے چنگ کے کانوں کے واسطے طائران بہشتی کے چہچہوں کی طرح پر لطف ہیں - اب جو صبح کے وقت وہاں جاکر دیکھو تو صرف ایک شمع دکھائی دیتی ہے اور وہ بھی بجھی ہوئی۔

دو اشعار کے دو مصرعے ملاکر میں نے ایک شعر بنا دیا اور ایک شعر حذف ہوگیا - لہٰذا کاٹ کے خراب تبیس کرتا ہوں - اور دوبارہ وہ دونوں اشعار صحیح کر کے لکھتا ہوں اور معنی بھی تحریر کرتا ہوں۔

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں　　نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

**سور** - خوشی مترادف سرور۔

وقت صبح جو اس بزم میں جاکر دیکھو تو وہاں نہ وہ رات والا سرور اور نہ وہ جوش و خروش ہے - ہاں صحبت شب کے داغ فراق سے جلی ہوئی ایک شمع تو رہ گئی ہے مگر وہ بھی بجھی ہوئی ہے - بہت اچھا حیرت انگیز اور درد خیز نظارہ دکھایا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالبؔ یہ مضامین جو تمہارے دماغ میں آتے ہیں اور تمہارے قلم سے نکلتے ہیں - یہ مضامین غیبی ہیں اور تمہاری صدائے قلم فرشتہ غیبی کی آواز ہے - فخریہ شعر ہے۔

---

غزل ۴۱　　اشعار ۷

آ کہ مری جان قرار نہیں ہے　　طاقت بیداد انتظار نہیں ہے　　اغ

جناب نظم فرماتے ہیں کہ۔ جلد آ۔ کہنا بہتر تھا لیکن وزن میں گنجائش نہ تھی۔ جلدی سے میرے پاس آجا کیوں کہ میری جان بے قرار ہو رہی ہے۔ اور انتظار کے ستم اٹھانے کی طاقت مجھ میں باقی نہیں رہی ہے۔

یہ بحر منسرح مثمن عروض وضرب مخور اور باقی ارکان مطوی ہیں۔ وزن مفتعلن فاعلات مفتعلن فع دوبار ہے۔

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے — نشۂ باندازہ خمار نہیں ہے

حیات سے مراد مصیبت اور تکلیف والی زندگی۔

دنیا میں بحالت حیات تکلیف کے ساتھ بسر کرو تو جنت اس کے بدلے میں دیتے ہیں مگر یہ صلہ تو (یعنی راحت جنت) خمار (تکالیف زندگی) کا بدل حقیقی نہیں ہو سکتا۔ اس خمار کے دفع کرنے کے لیے شراب راحت اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہئے تھی اور وہ شراب وصال ہی ہے۔

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو — ہائے کہ رونے پر اختیار نہیں ہے

ہائے کلمہ تفجع۔ افسوس۔ وائے۔

رو دینا تو اختیاری چیز نہیں مگر افسوس کہ گریہ ہی تمہاری بزم سے میرے نکالے جانے کا باعث ہوتا ہے۔ اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں کہ جو سلوک تمہارا غیروں کے ساتھ ہوتا ہے وہ میرے ساتھ نہیں ہوتا۔

کاتب نے (تیری) کو (تری) لکھ کر وزن مفتعلن مفتعلن مفتعلن فع کر دیا۔ حالاں کہ دوسرا رکن فاعلات ہونا چاہئے۔ (تیری) میں اے دوسری (ی) گر کرے ہ تیرِ) بروزن فاعلاتُ ہو گا۔

ہم سے عبث ہے گمان رنجش خاطر — خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

خاک سے مراد طینت وفطرت لی ہے۔ اگرچہ اس لفظ سے مرنے کے بعد خاک ہو جانے کی طرف ذہن بہت جلد منتبادر ہوتا ہے۔ غبار۔ بہت مہین ذرات خاک کے اور مستعمل بمعنی کدورت یعنی رنجش اور خفیف ملال۔

عشاق کی آب و گل میں غبار (کدورت) کا نام بھی نہیں اور ہم بھی عاشق ہیں پھر ہم پر رنجش خاطر کا گمان بے کار ہے۔

عشاق جو مر کر خاک ہو گئے ہیں ان کی خاک میں بھی غبار کدورت نہیں۔

دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی — غیر گل آئینہ بہار نہیں ہے

جس طرح موسم بہار کا آئینہ گل کے سوا اور کوئی چیز نہیں اسی آئینہ میں شکل بہار دکھائی دیتی ہے اسی طرح جلوہ ہائے

معانی کا لطف بھی آئینہ دل ہیں ملتا ہے۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے　　وائے اگر عہد استوار ہے

بہزار دشواری ہی سہی خیر اس نے میرے قتل کر دینے کا اقرار تو کر لیا ہے۔ مگر سخت افسوس ہوگا اگر اس کے اس عہد میں استحکام نہ ہو۔ کیوں کہ ہم کو ایک منٹ بھی زندہ رہنا موجودہ زندگی کے ساتھ ناگوار ہے۔

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ　　تری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

کسی چیز کی قسم کھانا۔ اس کے ترک کا عہد کرنا۔
اے غالب ہم نے مانا کہ تو نے ترک مے خواری کی قسم کھائی ہے کہ آیندہ شراب نہ پئیں گے۔ تیرا ایسا مے خوار ترک مے کی قسم کھائے اول تو یہی تعجب خیز ہے اور مان لیں کہ تو نے ضرور قسم کھالی ہے تو تیری قسم کا اعتبار کیا آج نہیں تو کل قسم توڑ دے گا۔

---

## غزل ۴۲　　اشعار ۳

ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے　　کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

بحالت غم و مراقبہ سر زانو پر ٹکاتے ہیں۔
کثرت غم سے میرا سر جھک کر زانو سے اتنا مل گیا ہے کہ اب تار دامن اور تار نظر میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔ ان میں اگر فرق کر سکیں تو کیا اور نہ کر سکیں تو کیا۔ اتصال تار نظر و تار دامن کے ذکر سے شعر میں کیا لطف پیدا ہو رہا ہے۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ ہجوم غم سے سر زانو پر دھرا ہے۔

رفوے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی　　سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

اس سے پہلے اسی بات کو کہہ چکے ہیں ؎

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن　　غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

مطلب اردو میں بھی مطلوب و مقصود و غرض و مقصد مستعمل ہے۔ اگر مطلوب ہی کہنا ہے تو یوں نظم ہو سکتا ہے ؎

رفوئے زخم سے مطلوب ذوق زخم سوزن ہے

یہ اس لیئے لکھا کہ جناب نظم فرماتے ہیں کہ بضرورت شعری مطلب بجائے مطلوب کہا ہے۔
زخم میں جو ہم نے ٹانکے دلوائے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا کہ ہمیں زخم کا اچھا ہو جانا مطلوب ہے بلکہ اس سے مطلوب ہم کو وہ خلش ہے کہ جو سوئی کے چبھنے میں ہوتی ہے یہ نہ خیال کرنا کہ ہم کسی وقت درد سے لذت حاصل کرنے میں غافل ہیں۔

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب　　چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

غنچہ کی شکل مخروطی ہونے میں دل سے مشابہ ہوتی ہے۔
اس کے باغ میں آنے سے گلستان خود باغ باغ ہو جاتا ہے۔ غنچہ گل جو باغ میں چٹک رہے ہیں اس کو چٹکنا نہ سمجھو بلکہ اس کی آمد کی خوشی میں دل خندہ زنان ہے۔

---

غزل ۴۳　　　　اشعار ۳

۴۳ پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد　　خار پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے

پا بدامن اور خار پا ہونا دونوں کنایے ہیں مانع رفتار ہونے سے۔
میں جو صحرا نورد تھا حصول مقصود سے مایوس ہو کر بیٹھ رہا ہوں اور چل پھر نہیں سکتا اور مارے غم کے سر زانو پر دھرا ہے تو آئینہ زانو کے جوہر میرے لیئے خار پا کا کام کر رہے ہیں اور مانع صحرا نوردی ہیں۔
غم۔ فکر اور مراقبہ میں انسان سر کو زانو پر ٹیک لیتا ہے۔ اور سوچتا اور دھیان گیان کرتا ہے تو اس حالت میں انکشافات ہوتے ہیں اس لیئے زانو کو آئینہ کے ساتھ استعارہ کرتے ہیں۔ اور آئینہ سے مراد آئینۂ آہن ہے جس میں جوہر ہوتے ہیں۔

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت　　ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

سر ہر مو۔ مو سے مراد زلف ہے (رونگٹا) نہیں۔ تار نگاہ و تار زلف ہی بوجہ طول باہم مناسبت رکھتے ہیں۔ (رونگٹے) تو چھوٹی چیز ہیں۔ پھر دل عاشق زلف یار میں پھنسا مانتے ہیں تو باہم دگر آشنا ہو سکتے ہیں۔ رونگٹے نگاہ آشنا کیسے کہے جائیں۔ بہر حال لفظ (سر) کا کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ ؎

ہے نگاہ آشنا کا سا ترا ہر مو مجھے

وقت ہم آغوشی میرے دل کی حالت خوشی میں دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ ہر تار زلف یار اس دل کے ساتھ نگاہ آشنا معلوم ہوتا ہے۔ تو یہ ملنا بھی گویا دو بچھڑے ہوئے دوستوں کا ایک مدت کے بعد ملنا ہے۔

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

میں ہمہ تن نغمہائے شکوہ و شکایت کا ساز (باجا) ہوں۔ میرے حال کو کچھ نہ پوچھ تیرے لیئے مجمع میں یہی بہتر ہے کہ تو مجھے نہ چھیڑے۔ اس ساز کے چھیڑنے سے شکایت کے راگ نکلنے لگیں گے اور لوگوں میں تیری رسوائی ہوگی کہ یہ کیسا ظالم ہے کہ جس نے اس کو اس قدر ستایا۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ہیں سرود نغمۂ جاں سوز مجذوبان عشق چھیڑدے اور چھیڑ کر اک دل لگی دیکھا کرے

چھیڑنا باجے کے ساتھ اس کا بجانا۔ دوسرے معنی ستانا۔

---

غزل ۴۴ اشعار ۱۰

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے جان کالبد صورت دیوار میں آوے

گفتار میں آوے فارسی بگفتار بیائی کا ترجمہ ہے۔ اردو نہیں کالبد قالب۔ سانچا۔ ڈھانچا۔
جس بزم میں تو ناز کے ساتھ بولنا شروع کرے تو جاندار تو درکنار قالب صورت دیوار میں بھی جان پڑ جائے۔ شعرا یہ مانتے ہیں کہ معشوق کے لب و دہن سے جو بات نکلتی ہے وہ جان بخشی میں قوت احیاء حضرت عیسیٰ کا اثر رکھتی ہے۔

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

(ے) بھی فارسی کا ترجمہ ہے ؎

باآں قد دلکش چو بگلزار بیائی چوں سایہ بگردند بتو سرو و صنوبر

اس قد دلکش کے ساتھ اگر تو گلزار میں آئے تو تیری خوش قامتی پر فریفتہ ہو کے سایہ کی طرح سرو و صنوبر تیرے ساتھ ساتھ پھریں۔

تب ناز گراں مایگی اشک بجا ہے    جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

لختِ جگر ۔ جگر کے ٹکڑوں کو سرخی رنگ کی وجہ سے یاقوت کے نگینے ذہن میں تصور کر کے گراں مایگی کا لفظ لائے۔
ورنہ گراں قدری کہہ سکتے تھے۔

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر    کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

بھی مصرع ثانی میں اپنی جگہ پر نہیں ؎

کچھ لطف تجھے بھی مرے آزار میں آوے

؎

کچھ تو مزہ تجھ کو مرے آزار میں آوے

اے ظالم تو نے مجھے ستایا ہے ان مظالم کے دوہرانے کی اجازت مجھے دے تاکہ تجھے بھی مزہ اور لطف حاصل ہو کہ اچھا یہ ہم ہیں کہ ایسے ایسے ستم ہم نے اس پر ڈھائے ہیں۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ شعر حاصل اس زمین کا ہے۔

اس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ    طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

فسوں گر ۔ سحر ساز ۔ اس لئے کہا کہ آئینہ کا طوطی کی طرح بولنا کار سحر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ طوطی کا پنجرہ آئینہ کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور بولنا سکھانے والا آئینہ کے پیچھے ہوتا ہے۔ کیلے کا پتا منہ میں رکھ کر معلم سیٹی میں کچھ بولتا ہے۔ طوطی آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر یہ سمجھتی ہے کہ میرا ہم جنس بول رہا ہے کچھ دنوں میں اس آواز معلم کی نقل اتارنے لگتی ہے۔
اشارہ ۔ میں بھی انسان اپنا مطلب مختصراً ادا کر لیتا ہے۔
اس کی چشم جادوگر کا اشارہ اگر آئینہ پا جائے تو طوطی کی طرح آئینہ بھی بول اٹھے۔ اس کی آنکھ میں وہ جادو بھرا ہے۔ جب اشارہ چشم سے بھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ اور اس اشارہ چشم محبوب کا عکس آئینہ میں پڑا تو گویا آئینہ بول اٹھا۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب    اک آبلہ پا وادیٔ پر خار میں آوے

مدت سے کوئی عاشق صحرا نورد دشت میں نہیں آیا ہے لہٰذا کانٹوں کی زبان پیاس سے خشک ہو رہی ہے۔
ان کی پیاس بجھنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی آبلہ پا والا اس دشت پر خار میں آئے کہ اس کے آبلہ کی چھاگل سے ان کانٹوں کی پیاس بجھے۔

اس تخیل میں کیا مزہ ہے۔ کانٹوں کے ساتھ ہمدردی کیوں ہے۔ زبان۔ پیاس کانٹوں کی استعارۃً ہے حقیقت کو دخل نہیں۔ پھر یہ خیالی پلاؤ کیا مزہ پیدا کر رہا ہے (مجنوں کے بعد ایک ہمیں ہیں جو ان کانٹوں کی پیاس بجھا سکتے ہیں)۔

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تن نازک　　آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

خم کا لفظ برائے بیت ہے۔ آغوش حلقہ زنار۔ ادائے مطلب کے لیئے کافی ہے۔ لفظ نازک بھی یہاں کوئی خاص فائدہ نہیں دے رہا ہے۔ بت یا صنم جس کی ضرورت ہے وہ ندارد ہے۔ (جب وہ تن کافر۔ یا۔ جب وہ بدن بت) (جب وہ بت کافر)۔

جب اس بت کافر تن آغوش حلقہ زنار میں آئے تو میں مارے رشک کے مر کیوں نہ جاؤں کہ زنار کو تو ہم آغوشی نصیب ہے۔ اور میں محروم ہوں۔ (تن کافر میں اضافت توصیفی نہیں بلکہ اضافی ہے۔

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر　　کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

ناموس صاحب سر آخیر شریعت۔ جبرئیل۔ لفظ یونانی ہے مستعمل بمعنی عزت و آبرو۔ زر = سونا۔ روپیہ پیسہ اور پھول کا زیرہ۔

اگر زر کی ہوس باعث بربادی آبرو و عزت نہ ہو تو پھر کیوں معشوق گل اپنا مسکن باغ چھوڑ کے بازار میں آئے۔ یعنی ہوس زر میں گل باغ سے بازار میں آتا ہے۔ اسی سبب سے ہوس زر موجب غارت گری عزت گل ہوتی ہے۔ اگر بازار میں نہ آئے تو عزت بھی برباد نہ ہو۔ بازار میں بوجہ ہوس زر آنا اس کو معشوق بازاری بنا دیتا ہے۔ میرے نزدیک مصرع اول میں لفظ (گر) اس مطلب میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ (گر) کی جگہ (پھر) جڑنے سے یہ بات دور ہو جاتی ہے۔

الفاظ موجودہ شعر سے خیال اس طرف جاتا ہے کہ باغ کو چھوڑ کے گل بازار میں اسی لیئے آتا ہے تاکہ بربادی آبرو ہو۔ کسی شارح کو یہ شبہ نہ پیدا ہوا یقیناً میری ہی کج فہمی ہوگی۔ یا۔ (نہ ہو گر) کی جگہ (نہ ہوگی) شاید ہو۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ شعر کا مطلب یوں سمجھو کہ گلاب کا کھلنا اور زر گل کا نمایاں ہونا کیا ہے گویا زر کی ہوس میں ہاتھ پھیلانا ہے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ سر بازار آنا پڑا۔ نہیں تو بربادی ناموس کا کیوں سامنا ہوتا۔ غنچہ کی طرح بند مٹھی چلا جاتا جب ہاتھ پھیلا کر زر لیا۔ تو شاہد بازاری ہو گیا اور ناموس و عزت برباد گئی۔

تب خاک گریبان کا مزہ ہے دل نادان　　جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

اے دل نادان چاک گریبانی کا لطف تو اس وقت ہے جب ہر تار گریبان کے ساتھ تار نفس بھی کھنچ آئے۔ اسی

رنگ کا ایک شعر اسی غزل میں آچکا ہے ؎

تب ناز گراں مایگی اشک بجا ہے　　جب لخت جگر دیدۂ خونبار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے　　جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

خزانہ اور نفیس اشیا پر حکما طلسم باندھ دیا کرتے تھے تاکہ کوئی اسے نہ پاسکے۔ طلسم ۔ یونانی زبان کا لفظ ہے اور عربی میں دخیل ہے۔ اپنے کلام کو طلسم اس لئے کہا کہ مضامین نفیسہ پائے جاتے ہیں۔ اور ہر ایک کو دسترس (خصوصاً شاد ان کو) ان تک رسائی نہیں ہوتی۔ ہر ایک ان کی خوبی پر حیران ہو کے رہ جاتا ہے۔ جناب نظم فرماتے ہیں الفاظ کی تشبیہ طلسم کے ساتھ بدیع ہے۔

شعر ذیل مجھ سے نظر انداز ہو گیا لہٰذا بعد مقطع لکھنا پڑا۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے　　اے وائے اگر معرض اظہار میں آوے

معرض ۔ محل ۔ پیش کرنے کا اور رکھنے کی جگہ۔

میرا سینہ راز عشق سے آتش کدہ بنا ہوا ہے۔ بڑے افسوس کے لائق بات ہوگی اگر اس کا اظہار ہو۔ نہ معلوم کس کس کو پھونک دے گا۔

---

غزل ۴۵　　اشعار ۱۰

حُسن مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے　　اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

ماہ بہنگام کمال مراد بدر۔ خورشید جمال اس لیئے کہا کہ خورشید کو بہر حال ماہ پر فوقیت حاصل ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ　　جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

لحظہ ۔ پلک جھپکانا ۔ مدت قلیل ۔

بوسہ دینے پر تیار نہیں مگر دل پر ہر وقت نگاہ لگی رہتی ہے کہ اگر مفت ہاتھ آجائے تو مال ضرور اچھا ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

ساغرِ جم ۔ جامِ جمشید شعرا میں بہت مشہور ہے ۔ اور شراب کی ایجاد بھی اسی کے زمانہ میں ملتے ہیں ۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں غیوبات نظر آتے تھے ۔ یہ بھی خیال ہے کہ نجوم کی کتاب تھی ۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ حاصل یہ ہے کہ تکلف میں تکلیف ہی ہوا کرتی ہے سادگی اچھی چیز ہے ؎

ہر چہ گیرید مختصر گیرید

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے　　وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

سخی اور کریم کے لیئے یہ خوبی ہے کہ بے مانگے دے ۔ اور گدا جس کی عادت نہ مانگنے کی ہو یہ گدا کے لیئے خوبی ہے ۔

شریعت میں بھی سوال کی ممانعت ہے ؎

بے طلب دینے میں ہوتا ہے مزہ ہی کچھ اور

دوسری خوبی سخی کے لیئے اس میں ہے کہ نہ احسان جتائے اور دُ یکھے ۔ بے سوال کے کچھ ملے تو اس سے مسرت زیادہ ہوتی ہے ۔ جناب نظم فرماتے ہیں ۔ سوال کی مذمت کس خوش اسلوبی سے کی ہے (وہ) کی جگہ (اور) ہوتا کہ کریم اور گدا دونوں کے لئے شعر ناصحانہ ہو ۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق منھ پر　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ شعر الہامی ہے ۔ خدا داد ہے ۔ اور کیا تعریف کی جائے ۔

قافیہ حال جناب داغ مرحوم یوں نظم کرتے ہیں ؎

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں　　آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

دیکھیئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض　　اک برہمن نے کہا ہے یہ سال اچھا ہے

جناب نظم فرماتے ہیں بہت صاف اور اچھا شعر ہے ۔ مصرع لگایا خوب مگر مصرع ثانی کچھ اچھا نہیں ۔ بتوں کا لفظ برہمن کی مناسبت سے لائے ۔

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا　　جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

فرہاد کو کوہ کنی اور سنگ تراشی میں کمال حاصل تھا اسی کمال نے شیریں کے ساتھ اسے ہم سخن کیا ۔ ورنہ حسین کب عاشق کو منھ لگاتے ہیں ۔ کمال کسی چیز میں ہو وہ اچھی بات ہے ۔ اگرچہ اس کا پیشہ ذلیل تھا ۔ مگر یہی تیشہ رانی معشوق

سے ہم کلام ہونے کی باعث ہوئی۔ میرے نزدیک تیشہ غلطی کاتب ہے۔ پیشہ کہا ہوگا۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ پہلا مصرع گنجلک ہے (یعنی الفاظ اپنے اپنے محل پر نہیں۔ اور دوسرے مصرع میں تنافر ہے (کہ کسی میں دو کاف مل کر ککسی ہوگیا) اور دونوں مصرعوں میں ربط بھی خوب نہیں۔ اور مضمون بھی کچھ نہیں۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہوجائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

قطرہ یوں تو ایک بے حقیقت چیز ہے۔ مگر جب دریا سے مل جاتا ہے تو عین دریا ہو کر بڑی چیز ہو جاتا ہے۔ کام وہی اچھا کہا جا سکتا ہے، جس کا انجام اچھا ہو۔ چنانچہ عربی کی مثل ہے: الامور بالخواتیم۔

قطرہ = مراد انسان۔ دریا = ذات الٰہی۔ انسان ایک ناچیز اور بے حقیقت ذات ہے۔ لیکن فنا فی اللہ کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے تو عین ذات الٰہی ہو کر بڑی چیز ہو جاتا ہے۔ پھر اس سے بڑھ کے اعلیٰ مرتبہ کون ہو سکتا ہے۔

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

سرسبز = تازہ۔ شاداب۔ نیز حضرت خضر کا لباس سبز ملتے ہیں۔ اور نہال سے بھی مناسب ہے۔ نہال = پودا۔ مراد بیٹا۔ شاہ = ظفر شاہ۔ خضر سلطان = ایک بچہ تازہ پیدا ہوا ہے اس کا نام خضر سلطان رکھا گیا تھا۔ خدائے بزرگ خضر سلطان کو سرسبز اور آباد رکھے۔ ظفر شاہ کے باغ (گھر) میں یہ نیا پودا خوب ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

دل کے خوش رکھنے کو اسے چھپا ہوا ہے میں اپنی یاد پر (بہلانے کو) لکھ گیا۔ بہشت کیا ہے مولویوں نے بے وقوفوں کو ایک سبز باغ دکھا دیا ہے۔ ابلہوں کی جگہ ہے جیسا کہ کہا گیا ہے اھل الجنۃ بلہٌ۔ یا کروروں برس کی اس میں حوریں ہیں وہاں اور کیا دھرا ہے ؂

من ہمیہ دوزخ نکنم باغ ارم را

مگر اس خیال بہشت سے دل احمقوں کا البتہ خوش ہو جاتا ہے۔ اس کے لیئے بری بھی نہیں۔

---

## غزل ۴۶ اشعار ۷

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی ؁۴۶ غ

اگر میں نے تمہاری محبت میں تم جان بھی نثار کر دی اور پھر بھی تم کو تسلی نہ ہوئی تو کوئی ہرج نہیں۔ اس پر بھی اگر تم کو میرے عشق صادق کا امتحان لینا باقی رہ گیا ہو تو مجھے اپنے اعجاز سے دوبارہ زندہ کر کے پھر سے امتحان لے لو اور میرے جان دے دینے کو کالعدم سمجھ لو اور دیکھو کہ میں اب بھی تمہارے مظالم پر ثابت قدم رہتا ہوں یا نہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس شعر میں نہ فن معانی کی کوئی خوبی ہے اور نہ فن بیان و بدیع کا کوئی حسن پھر بھی اگر غالب اس شعر پر دعوائے یکتائی اور خدائے سخن ہونے کا کریں تو بالکل بجا ہے۔

خار خار الم حسرت دیدار تو ہے — شوق گلچیں گلستان تسلی نہ سہی

گلچین بمعنی گلچینی ہے۔ لفظ شوق کی ضرورت میری سمجھ میں نہ آئی۔ اور گلچینی بھی اس طرح لا سکتے ہیں ؎

نہیں گلچینی گلزار تسلی نہ سہی

رنج حسرت دیدار کے کانٹوں کی خلش تو ہے۔ اگر گلزار تسلی کی گلچینی امیدوں کے بر آنے سے نہیں ہے تو نہ سہی۔ حسرت دیدار تو ہے۔ بے تکلفی تو نہیں۔ ہے۔

مے پرستاں خم مے منھ سے لگائے ہی بنے — ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

مے پرستان سے اُردو میں (مے پرستو!) اچھا ہے۔ لگائے ہی بنے = طرز بیان چاہتا ہے کہ مصرع یوں ہو

؎ مے پرستو خم مے منھ سے لگا لو تم بھی

یا ؎ مے پرستو خم مے کیوں نہ لگا لو منھ سے

اے پرستاران مے ساقی کے نہ ہونے سے اب سوا اس کے چارہ نہیں ہے کہ خم مے منھ سے لگا لی جائے کیوں کہ سامان مے کشی ساقی کے نہ ہونے سے موجود نہیں ہے۔ اس لیئے خم کو منھ سے لگا کے ڈٹ کے پی لو اور خوب چہک جاؤ۔ ایک دن ساقی کے نہ ہونے سے کوئی ہرج نہیں بلکہ کچھ خوبی ہی ہے۔ وہ ہوتا تو دو ایک جام ہی دیتا جس سے تمہاری سیری نہ ہوتی۔

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا — گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

نفس سے مراد نفس شعلہ بار۔ چشم و چراغ بمعنی عزیز سیہ خانہ مشہور یہ ہے کہ لیلیٰ سیاہ خیمہ میں رہتی تھی اور (سیہ خیمہ) وزن میں آجاتا ہے۔ لیلیٰ کو کہتے ہیں کہ سیاہ رنگ کی تھی اس لیئے اس کا نام لیلیٰ رکھا۔ لیل رات کو کہتے ہیں۔ اور رات کے ساتھ لفظ چراغ مناسب ہے۔ ؎

کہتے ہیں لیلیٰ کا خیمہ تھا سیاہ     جس میں مجنوں کا سدا ماتم رہا

آہ آتش بار مجنوں اگر خیمۂ سیاہ لیلیٰ میں شمع کا کام نہیں دے رہی ہے تو نہ سہی وہ آہ شعلہ بار صحرا کو تو عزیز ہے۔ یعنی اگر قیس کی رسائی خیمہ لیلیٰ میں نہیں ہے تو نہ سہی صحرا کو یہ آہ عزیز ہے اور اسے روشن کر رہی ہے۔ شان استغنائے عشق اس شعر میں دکھائی ہے۔ یا ہیں انگور کھٹے ہی بھلے ہیں کا مصداق ہے۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق     نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

عاشق کے گھر کی رونق اور چہل پہل کسی نہ کسی ہنگامہ اور شور وغل پر منحصر ہے۔ اگر خوشی کے نغمے میسر نہیں تو غم کے نوحوں ہی کا ہنگامہ ہونا چاہیئے۔ عاشق کو سکون وقرار سے کیا تعلق۔ شعر خوب ہے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا     گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

نہ کسی کی تعریف کی ہمیں تمنا ہے اور نہ ہم صلہ وانعام کی پروا کرتے ہیں۔ پھر اگر ہمارے اشعار بے معنی ہیں تو ہونے دو۔

یہ شعر بتا رہا ہے کہ غالبؔ کی زندگی میں لوگ ان کے اشعار کو بے معنی کہا کرتے تھے چنانچہ یادگار غالبؔ میں لکھا ہے کہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جن کو دربار ظفر شاہ سے تعلق تھا ایک شعر ؎

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال     پھر دوا جتنی ہے کُل بھینس کے انڈے سے نکال

اور غالبؔ سے کہا کہ آپ کے دیوان میں یہ شعر ہے ذرا اس کے معنی بتلائیے۔ پہلے تو بہت حیران ہوئے پھر سمجھ گئے کہ مجھ پر طعن کرتے ہیں کہ تم ایسے بے معنی شعر کہتے ہو۔

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو     نہ ہوئی غالبؔ اگر عمر طبیعی نہ سہی

عشرت خوش زندگانی کردن۔ صحبت = ہم نشینی وہم کلامی۔ عمر طبیعی = مسلمان ایک سو تیس سال کی مانتے ہیں۔ اے غالبؔ اگرچہ عمر طبیعی ہونے کی امید نہیں اور نہ ہو لیکن جتنی بھی عمر ہوا اور وہ عشرت صحبت حسیناں میں کٹے اسے بھی غنیمت سمجھو۔

اس محل پر جناب نظمؔ نے بقاعدہ صرف (طبی اور طبیعی) پر افادہ فرمایا ہے اور طبی کو جو اسم منسوب ہے بقاعدہ صرف صحیح بنایا ہے۔

---

غزل ۴۷ اشعار ۷

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے ۱۹۱۲غ

بحر مجتث مثمن مخبون بروزن مفاعلن فعلاتن چار بار ہے۔ قتل ہونے کے لیئے ہم جلاد کے آگے کس خوشی سے جا رہے ہیں کہ سر جو کٹے گا وہ پاؤں سے بھی شوق قتل میں دو دو قدم آگے آگے ہے۔ جب آفتاب یا کوئی نورانی چیز پیچھے ہو تو سایۂ سر قدم سے آگے ہوتا ہے۔

قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

بس کی جگہ (پھر) بھی کہہ سکتے ہیں۔ خراب بادۂ الفت = مست مے عشق۔ خراب = ویران۔ وحشی ضائع و برباد شدہ۔

زمانہ ازل میں کاتب تقدیر نے مجھے مست مے عشق لکھنا چاہا کہ یہ دنیا میں جا کر عاشق مزاج ہو۔ لیکن اس کے قلم سے صرف لفظ خراب نکلنے پایا تھا کہ آگے قلم رُک گیا۔ اسی وجہ سے اب میں دنیا میں تباہ و برباد حال ہوں۔ کیوں کہ کاتب تقدیر کے قلم سے صرف (خراب) نکل کے رہ گیا۔ لہٰذا میں نرا خراب ہو کے رہ گیا۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہاں مضمون کے ناتمام رہ جانے نے بڑا لطف دیا اور ہر ایک حالت کی ناتمامی کا بیان ہمیشہ لطف دیتا ہے۔ اور قلم نہ چل سکنے کی وجہ سے مستی و مدہوشی ہے جو لفظ خراب لکھنے سے پیدا ہوئی ہے۔

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذت الم آگے

غم زمانہ نے ساری مستی نشاط عشق کی نکال دی۔ ورنہ دُکھ درد سے لذت ہم خوب اٹھایا کرتے تھے۔ (جھاڑی) بازاری لفظ ہے۔ (کھو دی) یا مثل اس کے کوئی بہتر لفظ ہو۔

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

خط لکھ کے نامہ بر کو دے کے نامہ بر سے پہلے ہم اس محبوب کے در پر پہنچتے ہیں کہ کہیں جواب آنے کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ خدا کے لیئے ہمارے اس جنون شوق کو لوگ دیکھیں اور اس جنون کی داد دیں۔ اس حد کا بھی جنون کسی کو ہوا کرتا ہے۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے　　تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بخم آگے

بھلائی کا ہم کو صلہ ملے اور تمہاری بُرائی کا تم کو صلہ ملے۔ یہ ایک بد دعا ہے مگر یہاں بد دعا میں بھی دعا پیدا ہے کیوں کہ زلف کا بکھرا اور پریشان ہونا بھی اس کے لیئے ایک حُسن ہے۔ مصرع ثانی میں تعقید ہے خم بخم پر پیچ و تاب طرہ مانگ کے پاس کے بال زلف کنپٹی پر کے بال گیسو کان کے پیچھے کے بال جعد گدی پر کے بال۔
اے طرہ ہائے پیچدار ہم نے جو یہ پریشانیاں عمر بھر تمہاری بدولت اٹھائی ہیں خدا کرے کہ یہی پریشانیاں تم کو بھی پیش آئیں۔

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے　　ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے دم آگے

پرافشاں پر جھاڑا ہوا۔ پر پھٹپھٹاتا ہوا۔ مضطرب۔ تیر اور طیر کے ساتھ اس لفظ کا استعمال دیکھا جاتا ہے خون کے ساتھ میری نظر سے نہیں گذرا۔ پریشان وزن میں بھی آتا ہے اور شاید اس سے اچھا بھی ہو۔ دم عربی میں خون۔ فارسی اور اردو میں سانس اور لزوماً جان۔ جگر خون بناتا ہے اور دل خون کو تمام جسم میں دوڑاتا ہے۔ دم کے ذو معنین ہونے سے یہ بات پیدا کر رہے ہیں زعم بفتح گمان باطل۔
دل و جگر میں جو ایک موج خون متموج ہے ہم اپنے گمان میں اسی کو (دم۔ جان۔ نفس) سمجھے ہوئے تھے۔ مگر نہیں۔ معلوم ہوا کہ غم عشق نے دل و جگر کو خون کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ پرافشاں اور مفہوم دونوں کو میں نہیں سمجھا۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ دم (سانس) کا تعلق پھیپھڑے اور دل سے ہے۔ جگر کو سانس سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر جگر شئے اندرونی کو بھی کہتے ہیں اس لیئے لفظ جگر لائے۔ نیز پھیپھڑا۔ ریہ۔ شش میں سے کوئی بھی نظم کرتے تو ناگوار سماعت ہوتا۔

قسم جنازہ پر آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ　　ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

جنازہ بکسر اول تابوت مردہ۔
جو ہمیشہ میری جان کی قسم کھایا کرتے تھے۔ (عزیز سمجھ کے۔ یا۔ جھوٹی) وہ اب میرے جنازہ پر آنے کی قسم کھاتے ہیں۔ یعنی انکار کرتے ہیں۔ یا۔ یہ کہتے ہیں کہ تیری زندگی میں تو تیرے پاس نہ آئیں گے۔ اب تیرے جنازہ ہی میں شریک ہوں گے۔ یا جیسے زندگی میں جھوٹی قسم میری جان کی کھاتے تھے۔ اب شرکت جنازہ کی بھی قسم جھوٹی ہے۔

---

## غزل ۴۸ — اشعار ۱۳

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے ۔۔۔ یہ بھی مت کہہ کہ جو کہئے تو گلا ہوتا ہے

شکوہ وشکایت کا تو ذکر کیا صرف نام شکوہ کا آیا کہ وہ بے مہر ناراض ہوا۔ لہٰذا شکوہ کا نام بھی زبان پر نہ آنا چاہیئے کیوں کہ نام شکوہ بھی اس کے نزدیک گلہ ہے۔

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا ۔۔۔ اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

چھیڑنا = شروع کرنا۔ ستانا۔ باجا بجانا۔ ذکر کرنا۔ پر ہوں = بھرا بیٹھا ہوں پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے شکووں کا تار باندھ دوں گا۔ اور تم کو ستانے کا مزہ مل جائے گا۔
میں شکووں سے ایسا بھرا بیٹھا ہوں جیسے راگوں سے باجا پر ہوتا ہے۔ ذرا چھیڑیے تو پھر دیکھئے آپ کو بھی کیسا مزہ آتا ہے۔

گو سمجھتا نہیں پر حُسنِ تلافی دیکھو ۔۔۔ شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

تلافی = تدارک الامر۔ مستعمل بمعنی بدلہ۔ حسن کا لفظ طعنًا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بمعنی خوبی ہی ہو۔ تو پھر یہ معنی ہوں گے کہ اگرچہ نادان اور الھڑ ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ میں جفا دوست ہوں پھر بھی مستعد جفا ہو جاتا ہے جو میری عین خواہش ہے۔
اگرچہ وہ نادان ہے اور اپنے افعال کے حسن وقبح کو نہیں جانتا مگر پھر بھی بجائے اس کے کہ رفع شکایت کرے اس کا دل اس کو میرے ستانے ہی پر آمادہ کرتا ہے۔ ذرا ان کی اس حسن (قبح) تلافی کو دیکھو۔

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال ۔۔۔ سُست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

مکوکب بفتح کاف ثانی اسم مفعول جو اپنی ذات سے نقطہ بیضا رہو۔ مستعمل بمعنی ستارہ دار۔ چمکدار۔ بھڑک دار۔
عشق کے راستہ میں چرخ ستارہ دار کے منحوس ستاروں کی ایسی چال ہے جیسے کوئی آبلہ پا سُست چلے کسی طرح نحوست ان کی دور ہی نہیں ہوتی۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم ۔۔۔ آپ اُٹھا لیتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

ہدف ۔ نشانہ ۔ ناوک ۔ ایک لکڑی نادہ ہے جس سے تیر ناوک بنتا ہے ۔ لیتے ہیں ۔ دیتے ہیں ۔ یا ۔ لاتے ہیں ہونا چاہئے ۔ غلطی کاتب ہے ۔ جناب حسرت نے (لاتے ہیں) لکھا ہے ۔ مگر (دیتے ہیں) اس سے اچھا ہے ۔

کیوں نشانہ تیر جور کا ہم نہ ہوں جب ان کا تیر خطا کرتا ہے تو ہم خود اٹھا لاکر انھیں دے دیتے ہیں ۔ دو ایک مرتبہ اگر خطا کرے گا تو پھر ہلاک ہی کر دے گا ۔

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ      کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

جب اپنی خواہش کے خلاف ہوا کرتا ہے تو ہمارا اپنا بدخواہ ہونا ہمارے لئے اچھا ہوتا کیوں کہ اس وقت ہم اپنے لئے برائی چاہتے تو ہمارے لئے بھلائی ہوتی ۔

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا (اور اب)      لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

پرے ۔ پار ۔ دور لکھنؤ میں اب نہیں بولتے ۔ (اب) چاہتا ہے کہ (میرا) کی جگہ (پہلے) ہوتا ۔

جب تک مصائب نہ اٹھائے تھے اور قوت تھی تو میرا نالہ عرش کے بھی پار پہنچتا تھا لیکن اب یہ ضعف و ناتوانی ہے کہ اس کا لب تک آنا بھی دشوار ہے ۔

## قطعہ

خامہ میرا کہ وہ ہے باربد بزم سخن      شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہ کواکب سپہ و مہر علم      تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجئے      تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینہ میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال      آستان پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں      یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

باربد بار = دربار ۔ و بد بمعنی بزرگ و خداوند ۔ دربار خسرو میں حاجب بار تھا ۔ جہرم صوبہ شیراز کا باشندہ فن موسیقی میں کمال رکھتا تھا ۔ سرود سیح بشش آوازہ و سی لحن اس کی ایجاد ہیں ۔ (بد کی ب) مضموم اور مفتوح دونوں طرح ہے ۔ کواکب

اس سے فوج کی کثرت مقصود ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ستارے تیری فوج ہیں۔ مہر علم = آفتاب تیرا رایت ہے۔ نشان پر آفتاب یا مہتاب اور تاج زرین کی شکل ہوتی ہے۔ اقلیم = یونانی کا لفظ ہے Klima پہلے دنیا کو سات اقلیم پر بوجہ آب و ہوا تقسیم کیا تھا۔ اور اب پانچ پر۔ فراہم کیجئے = اکٹھا کیجئے۔ نعل بہا = گھوڑوں کے نعل لگوانے کی قیمت = لشکر = سوار - فوج = پیدل۔ ناصیہ سا = پیشانی رگڑنے والا۔

میرا قلم جو بزم سخن میں مثل باربد ہے وہ تیری مدح میں اس طرح نغمہ سرائی کرتا ہے کہ اے شہنشاہ تمہاری فوج کثرت میں ستاروں کی اتنی اور تمہارا رایت آفتاب ہے۔ تمہارے انعام اور اکرام کا حق کس سے ادا ہو سکتا ہے۔ ساتوں اقلیم کی آمدنی اگر اکھٹا کی جائے تو وہ تمہارے لشکر کے گھوڑوں کی نعل بندی میں صرف ہو جاتی ہے۔ ہر مہینہ میں چاند بدر سے گھٹ کے جو ہلال ہو جاتا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ تیرے آستانہ پر پیشانی رگڑتے رگڑتے گھس جاتا ہے۔ میں جو تیری محفل میں ذرا گستاخی کے ساتھ غزل خوانی کرتا ہوں تو تیرا کرم ہی تو ذوق اور جوش بڑھا دیتا ہے۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اے غالب آج جو درد انگیز نالے مجھ سے نکل رہے ہیں اس میں میں معافی کے قابل ہوں، کیونکہ ہر روز سے زیادہ رد میرے دل میں ہو رہا ہے پھر نوا ہائے تلخ میرے منہ سے کیسے نہ نکلیں۔

غزل ۴۹ اشعار ۱۰

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

تو کیا ہے = تیری حقیقت کیا ہے۔ تو چیز ہی کیا ہے۔ یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی منہ زوری دکھائے۔ تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے۔ تمہیں یہ ناز ہے پھر کہتے ہو کہ تو کیا ہے۔ ذرا تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے۔
تم میری ہر بات پر یہی کہہ دیتے ہو کہ تیری حقیقت کیا ہے۔ تو چیز ہی کیا ہے۔ ذرا تمہیں انصاف سے کہو کہ یہ طرز گفتگو ارا کیسا ہے۔ بالکل انسانیت سے بعید ہے۔

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

تند خوئی میں اگر اس کو میں شعلہ آتش کہوں تو شعلہ میں اس کے ایسے کرشمے کہاں پائے جاتے ہیں۔ اور اگر شوخی میں ے برق کہوں تو برق میں اس کی ایسی ادا کہاں۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس کو کیا کہیں۔ کوئی اور ہی بتائے کہ آخر وہ ہے کیا۔

مطلب یہ ہے کہ وہ تند خوئی میں شعلہ سے بڑھ کے اور شوخی میں برق سے زیادہ ہیں۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے　　　وگرنہ خوفِ بد آموزی عدو کیا ہے

بد آموزی ۔ لگائی بجھائی ۔ عدو ، بفتح دشمن ۔ حد سے تجاوز کرنے والا۔
دشمن کی لگائی بجھائی سے ہم ذرا نہیں ڈرتے ۔ مگر ہمیں تو رشک اس بات کا مارے ڈالتا ہے کہ تم سے وہ ہم کلام ہوتا ہے ۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن　　　ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

لہو پہلے لہو بلکہ اشباع کے ساتھ لوہو بھی تھا۔ پیراہن ۔ کرتہ مجازاً اور لباس بھی ۔
سینہ خراشی سے تمام سینہ لہو لہان ہو رہا ہے ۔ اور لہو کے لیس سے پیراہن بدن سے چپک رہا ہے ۔ پھر ہمارے گریبان کے چاک میں رفو کی کیا ضرورت رہ گئی یہ علامت جنون ہمارے لیئے باقی رہے تو اچھا ہی ہے ۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا　　　کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

سوز عشق سے جب جسم جل گیا تو دل کیسے راکھ ہو جانے سے بچا ہوگا ۔ اب تم کو اس کو ڈھونڈ نکالنے اور جلانے کی فکر کیوں ہے ۔

وہ چیز جس کے لیئے ہم کو ہو بہشت عزیز　　　سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

گلفام ۔ سرخ رنگ ۔ فام بمعنی رنگ ہے ۔
بہشت میں اور کیا رکھا ہے ۔ ایک نهر من خمر لذة للشاربين ہے ۔ اسی کی وجہ سے ہم بہشت کو عزیز رکھتے ہیں ۔

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار　　　یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

اول تو میری پسند اور ناپسند کیا ۔ پھر بھی مجھے صراحی و شراب کا کوئی شعر اردو فارسی اور عربی کا پسند نہ آیا ۔ استعمال سے بحث نہیں ۔ مطلب صاف ہے ۔

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

ہو بھی ۔ اگرچہ ہے تو نہیں، مان لو کہ ہے ۔ کس امید کو مایوسانہ لہجے میں پڑھو۔
اول تو اب رنج اُٹھاتے اُٹھاتے طاقت گویائی ہی باقی نہ رہی ۔ اور بالفرض اگر ہے بھی تو کس امید پر اپنی آرزو کو پیش کروں ۔ تم نے نہ کبھی کوئی تمنا پوری کی اور نہ آئندہ اس کی امید ۔ بے مثل شعر ہے ۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اترتا وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

غالب کی شہر میں عزت ہی کیا تھی اسے پوچھتا کون تھا اب ظفر شاہ کا مصاحب ہوگیا ہے تو اتراتا پھرتا ہے ۔ خوشامدانہ شعر ہے ۔

---

غزل ۵۰ اشعار ۴

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں چل نکلتے جو مے پئے ہوتے

مے پیے ہوتے = صرف پیے ہوتے کافی تھا اور بول چال کے موافق تھا ؎
چل نکلتے اگر پیے ہوتے

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ میں ان کو چھیڑوں اور ستاؤں وہ کچھ نہ کہیں اور چپ رہیں ۔ خیر ہوگئی ۔ اگر کہیں پیے ہوتے تو چل نکلتے اور تیری دُرگت بنا دیتے ۔ اچھا شعر ہے ۔ بعد والا اس سے بھی اچھا ہے ۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاش کے تم مرے لئے ہوتے

قہر ہو بلا ہو ۔ عذاب ہو مصیبت ہو یا اس سے بھی کچھ بڑھ کے ہو تو ہوا کرو ۔ ہر حالت میں بلا شرکت غیرے تم مخصوص میرے لئے ہوتے تو کیا ہی اچھا ہوتا ۔
جناب نظم فرماتے ہیں ۔ نادر مضمون ہے ۔ اس کے علاوہ معشوق کی شوخ مزاجی عربدہ جوئی ۔ اور اپنا شوق و حسرت دونوں باتوں کی کیا خوب تصویر کھینچ دی ہے ۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا دل بھی یارب کئی دئے ہوتے

اتنے غم کثیر اٹھانے کے لئے ایک دل کفایت نہیں کرتا ہے۔ لہٰذا اتنے ایک غموں کے برداشت کرنے کے

لئے متعدد دل بھی لے اللہ تونے مرحمت کئے ہوتے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کئی دل مانگنا ایک نادر بات ہے۔ اسی سے اس شعر میں ندرت پیدا ہو گئی ہے۔

آہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

راہ پر آہ جانا۔ سیدھے راستہ پر چلنا۔ مقصود کے موافق ہو جانا۔ دوسرا مصرع بطور تمنا ہے اگرچہ حرف تمنا

نہیں ہے

کاش کچھ اور دن جئے ہوتے

اگر کچھ دن اور اے غالبؔ تمہاری زندگی ہوتی تو ضرور وہ تمہارے مقصود کے موافق ہو جاتے۔ اپنے افعال سے

پچھتاتے اور تمہارے عشق صادق کو سمجھ گئے۔

بہر طور چاروں اشعار خوب ہیں۔

---

غزل ۵۱ اشعار ۷

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

بوسہ۔ مقصد تو یہ ہے کہ تمہاری محفل میں غیر جام پی پی کے لطف اٹھائیں۔ مگر بوسہ کا لفظ محض اس لیے

لائے کہ۔ بوسہ بہ پیغام۔ جو ایک محاورہ ہے وہ پیدا ہو جائے۔ ہے

غیر اٹھائیں بزم میں حظ جام کے ہم رہیں مشتاق اک پیغام کے

جام کے بوسے لینا۔ اس سے مراد جام سے پینا۔ محفل۔ بزم محبوب۔ پیغام۔ پیغام طلب۔ تشنہ = بمنا بہ

جام۔ شعر بیان حسرت میں ہے۔

غیر تو بزم یار میں مزہ مزہ سے جام اُڑائیں۔ اور ہم مشتاق پیغام طلب کے رہیں۔ کس قدر لائق افسوس یہ

بات ہے۔

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ہتکھنڈے ہیں چرخ نیل فام کے

خستگی۔ مجروح وزخمی و درماندہ و بیمار ہونا۔ نیلی فام۔ نیلے رنگ کا۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ صفت

چرخ اس جگہ محض برائے قافیہ ہے معنی میں اسے دخل نہیں۔ بہ تکلف یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ نیلا رنگ منحوس ہوتا ہے اور غم کی نشانی ہے۔

یوں بنا سکتے ہیں ؎

ہتکھنڈے ہیں چرخ دشمن کام کے

دشمن کام ۔ وہ ذات جو دشمن کے مقاصد پورے کرے (ہتکھنڈے شعبدے۔ بازیچے) یا کسی کے مقاصد پورے ہونے کا دشمن۔

جس طرح ہر امر کا وقوع حکم خدا سے مانتے ہیں۔ مگر برائی کی نسبت خدا کی طرف سوء ادب ہے اس لئے فلک یا قضا و قدر کے سر لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح معشوق کے مظالم کی نسبت آسمان کی طرف کی ہے۔

ہم اپنی محرومی و درماندگی کا تم سے کیا گلہ کریں۔ ایسی باتیں تو چرخ کے بائیں ہاتھ کے کام ہیں۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مطلب کچھ نہ ہو ۔ تم سے مطلب پورا ہونے کی کوئی امید بھی نہ ہو۔ یا کوئی نئی بات لکھنے کو نہ ہو۔

تم کو ہم خط برابر لکھتے رہیں گے چاہے کوئی بات نئی لکھنے کو نہ ہو۔ کیوں کہ ہم تو تمہارے نام کے عاشق ہیں۔ تمہارا نام تو پتہ ہیں ہمارے قلم سے نکلے گا۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

زمزم ۔ آب درمیان نمکین و شیریں۔ ایک کنواں قریب کعبہ۔ جامۂ احرام ۔ ایک بے سیا کپڑا جسے ساری کی طرح باندھ کے طواف اور حج کرتے ہیں۔

رات کو چاہ زمزم پر بیٹھ کے شراب پی۔ اور سویرے ہی شراب کے دھبے جامہ احرام سے زمزم کے پانی سے دھوئے۔ رندانہ شعر ہے۔

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا۔ مگر یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

کیا ۔ کیسا۔ بہت زیادہ۔ مگر حرف استثناء مترادف الا۔ مقام شک اور گمان میں بھی مستعمل ہے۔ اور کبھی محل یقین و تمنی میں بھی لاتے ہیں۔ یہاں بمعنی یقیناً ہے۔ (کیا) کو اول مصرع میں ہونا چاہیئے ؎

کیا پھنسایا دل کو آنکھوں نے۔ مگر

یہ بکامشارالیہ آنکھیں ہیں ؎

کیسا آنکھوں نے پھنسایا دل ۔ مگر

میرے دل کو میری آنکھوں نے کیسا پھنسا دیا ۔ یقیناً یہ آنکھیں بھی تمہارے دام حسن کے حلقے ہیں ۔

شاہ کے ہے غسل صحّت کی خبر        دیکھئے کب دن پھریں حمّام کے

حمّام ۔ موضع استحکام ۔ نہانے اور غسل کرنے کی جگہ ۔ گرم پانی کی جگہ ۔ دن پھرنا ۔ بدنصیبی دور ہوکر خوش بختی حاصل ہونا
شاہ کے ہے غسل صحت ۔ شاہ کے غسل صحت یعنی غسل صحت شاہ ۔ اس مضاف و مضاف الیہ کے درمیان (ہے) آجانے
سے ان کے درمیان فصل ہوگیا ہے ۔ اور فصل درمیان مضاف و مضاف الیہ ناگوار ہوتا ہے ۔ فارسی میں البتہ جب
(را) بدل اضافت ہو تو فصل جائز ہوتا ہے ۔ شیخ شیراز ؎

کسا نرانشد ناوک اندر حریر        اگرچہ بدوزند سندان بنیر

اگر صحت سے تشدید دور کر دینے کو جائز قرار دیں تو یہ مصرع یوں ہو سکتا ہے ؎

شاہ کے غسل صحت کی ہے خبر

اور اگر (خبر گرم ہے) آجائے تو سب سے بہتر ہے ؎

ہے خبر غسل شفائے شاہ گرم

شاہ کے غسل صحت کی خبر گرم ہے ۔ دیکھئے حمام کی قسمت کس دن جاگتی ہے ۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا        ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

نکما ۔ نون نفی کے لیئے ۔ (کم مخفف کام) الف برائے فاعلیت ۔ ناکارہ ۔ بے کار ۔
عشق کر کے ہم کسی دوسرے کام کے لائق نہ رہے ۔ ورنہ عشق سے پہلے ہم بھی کام کے آدمی تھے ۔

---

غزل ۵۲        اشعار ۷

غ        پھر اس انداز سے بہار آئی        کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

بہار ۔ دراصل بہ آر تھا خوبی لانے والا ۔ کثرت استعمال سے (ب) کو فتحہ ہوگیا ۔ تماشا ۔ عربی میں بمعنی باہم رفتن
ہے ۔ فارسی اور اُردو میں بمعنی دیدن ۔ اور امر موجب تفریح اور بمعنی بازی مستعمل ہے ۔ کاف ابتدار مصرع میں اور مہر و مہ کی

خصوصیت تماشا دیکھنے میں کچھ اچھا نہ معلوم ہوا ؎

جس کو دیکھو وہ ہے تماشائی

اس سے صاف مصرع ہے۔

| | |
|---|---|
| دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک | اس کو کہتے ہیں عالم آرائی |
| کہ زمین ہوگئی ہے سرتاسر | روکشِ سطحِ چرخِ مینائی |
| سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی | بن گیا روئے آب پر کائی |
| سبزہ و گل کو دیکھنے کے لئے | چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی |
| فرطِ نشو نما سے اک کونپل | ہر سرِ خار پر نکل آئی |
| ہے ہوا میں شراب کی تاثیر | بادہ نوشی ہے باد پیمائی |
| کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ | شاہ دیندار نے شفا پائی |

عالم آرائی ۔ زینت دنیا ۔ زمین ۔ زم بمعنی سردی (ین) نسبت چوں کہ خاک کا مزاج سرد ہے ۔ روکش ۔ شرمندہ کرنے والا ۔ منھ بگاڑنے والا ۔ چرخ مینائی ۔ آسمان سبز رنگ اس سے مراد رات کا آسمان جو ستاروں کی وجہ سے پربہار معلوم ہوتا ہے ۔ کائی ۔ آب ایستادہ پر ایک سبز رنگ کی چیز کچھ مدت میں پیدا ہو جاتی ہے فارسی میں جُل وزغ ۔ جامۂ غوک ۔ عربی میں طحلب اور خزالضفادع اور انگریزی میں GREEN MOSS کہتے ہیں ۔ نرگس ۔ ایک قسم عبہر ہے جس کے اندر کی کٹوری زرد رنگ کی اور اس کے گرد سفید پنکھڑیاں ہوتی ہیں ۔ دوسری قسم شہلا ہے ۔ دو پچوتے نیم باز اور ان کے اندر زیرۂ مدور سیاہ بمنزلہ سیاہ دیدۂ چشم ۔ یہی آنکھ سے مشابہ ہوتی ہے ۔ دی ہے ۔ جب فاعل ظاہر نہ کریں تو اردو میں فعل لازم کا صیغہ مجہول لاتے ہیں اور فارسی میں صیغہ جمع ۔ جیسے گفتہ اند ۔ باد پیمائی ۔ کار بے ہودہ کردن ۔ دُنیٰی دُنُو سے مؤنث کا صیغہ ہے ۔ قریب والی ۔ چوں کہ کل عوالم سے عالم خاک قریب ہے ۔ اسی کی مناسبت سے دوسرے مصرع میں دین دار لائے ۔

یہ غزل نہیں ہے اس کو قطعہ یا قصیدہ کہہ سکتے ہیں جس کی تشبیب بہاریہ ہے اور ظفر شاہ کی تہنیت صحت میں کہا

گیا ہے۔ لہٰذا تحت عنوان قصائد اسے ہونا چاہئے۔

یہ اشعار معانی لکھنے کے محتاج نہیں۔ لہٰذا ایک شعر کے معانی طالب علموں کے لئے لکھے جاتے ہیں کہ اس زمانہ کی ہوا میں بھی شراب کی تاثیر ہے۔ اس لئے اس فصل میں شراب پینا ایک کار فضول ہے۔

---

غزل ۵۳ اشعار ۲

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے ۸۳غ

پہلو تہی کرنا۔ اپنے پہلو میں کسی کو جگہ دینا۔ کسی کام میں آنا کانی بتانا۔ ٹالنا۔ پہلو تہی کرنا۔ تغافل و عدم التفات سے کام لینا۔ جائے کسے خالی۔ محفل میں کوئی موجود نہ ہو اور اس کا انتظار ہو۔ یا یکایک وہ آپڑے تو کہتے ہیں کہ بس آپ کی جگہ خالی تھی خوب آئے۔ (پہلو تہی کرنے کے) ایک معنی یہ بھی ہیں کہ جس کی تعظیم و تکریم مقصود ہوتی ہے تو اس کو اپنے پہلو میں جگہ دیتے ہیں۔ یا اپنی جگہ اس کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

میرا دماغ عاجزی اور لاچاری میں آسمان پر ہے جتنی غفلت میرے ساتھ برتی جائے یہی مجھے پسند ہے۔ میرے حق میں بے توجہی و عدم التفات یہی میرے لئے تعظیم و تکریم ہے۔ میری تعظیم سے روگردانی کرنے ہی کو میں تعظیم سمجھتا ہوں۔ فارسی میں یوں فرماتے ہیں۔

در آغوش تغافل عرض یک رنگی توان دادن تہی تا میکنی پہلو بما بنمودہ جا را

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے

عالم اہل سخا و کرم کے نہ ہونے سے آباد ہے ورنہ وہ اپنی سخاوت سے تمام دنیا لٹا دیتے۔ اور عالم ویران ہو جاتا۔ جیسے کہ مے خانہ دنیا ساقیان باہمت و کرم سے خالی ہے۔ اسی لئے جام و سبو شراب سے مملو اور پُر رکھے ہوئے ہیں۔ دوسرا مصرع تمثیل ہے۔

---

غزل ۵۴ اشعار ۹

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری ۸۴غ

میری رام کہانی تو وہ کسی طرح سننے کے لئے تیار نہیں خصوصاً میرے منھ سے۔

خلش غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ　　　دیکھ خونناب فشانی میری

اپنے غمزہ خون ریز کی خلش کو مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ خون خالص جو بشکل اشک میری آنکھوں سے بہ رہا ہے اُسے دیکھ لے۔ "عیاں را چہ بیان"۔

خون نابہ خون لہو۔ نابہ مرکب از (نہ+آب) سے یعنی خالص۔ جس میں جو رقیق ہوا اور اس میں پانی نہ ملا ہو وہ خالص ہوتی ہے۔

کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے　　　مگر آشفتہ بیانی میری

بیان۔ اُردو میں یہ لفظ بین ہوگیا۔ مردہ کے اوصاف بیان کرکے اس پر رونا۔ ؎

بین کیا کرکے مرا روئیں گے

مجھ میں کونسا ایسا وصف ہے جس کو یاد کرکے میرے احباب مجھے روئیں گے۔ ہاں مجھ میں ایک آشفتہ بیانی بوجہ پریشان حالی ہے اسی کا ذکر کرکے رولیں گے اور بس۔

ہوں زخود رفتۂ بیدا خیال　　　بھول جانا ہے نشانی میری

بیداء۔ وہ دشت جس میں راہ رو ہلاک ہو جائے۔ صحرا۔ زمین خشک اپنی مٹی کے رنگ کی وجہ سے اور فلاۃ کا ترجمہ بیابان ہے۔ صحرا زیادہ مانوس لفظ تھا اسے چھوڑ کے بیدا کہا۔ اس کی جمع بید ہے۔

خیال احباب کے صحرا کا از خود رفتہ ہوں۔ یعنی احباب کے خیال میں بھی میرا وجود نہیں ہے۔ مجھ کو بھول جانا اور میری طرف سے نسیان یہی میرا پتا ہے۔ یا۔ اپنے ہی خیال کے صحرا میں ایسا گم گشتہ ہوں کہ میں خود اپنے آپ کو بھولا ہوا ہوں۔ اور اپنی ذات سے نسیان یہی میری نشانی ہے۔

متقابل ہے مقابل میرا　　　رُک گیا دیکھ روانی میری

خود مصنف نے اس شعر کے معنی عود ہندی میں مولوی عبدالرزاق شاکر کو یہ بتائے ہیں۔

تقابل اور تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت۔ شادی و غم۔ رنج و راحت۔ وجود و عدم۔ لفظ متقابل اس مصرع میں بمعنی مرجع ہے۔ جیسے حریف بمعنی دوست بھی مستعمل ہے۔ مقابل سے مراد معشوق ہے۔ جو ان کی روانی طبیعت کو دیکھ کر رک گیا یعنی خفا ہوگیا۔ ان کی حاضر جوابی و بذلہ سنجی اسے ناگوار گذری۔ اور روانی اور رکنے میں تقابل ہے۔ غرض کہ

معشوق میرے متقابل و متضاد ہے۔ اور وہ اور میں ضد ہمہ دیگر ہیں۔

مصنف خود جب یہ معنی کہتے ہیں تو کسی کو اس سے انحراف کا کیا حق ہے۔ مگر الفاظ شعر اور طرز ادا دوسرے معانی کی طرف بھی رہبری کرتے ہیں۔

متقابل۔ باب تفعل کے خواص میں سے ایک تکلف بھی ہے۔ تو متقابل کے معنی بہ تکلف مقابل ہونے والا ہوئے۔ اور اس سے مراد رقیب یا شعرا ہم عصر ہیں۔ اور شعر فخریہ ہے۔ (دیکھ) اب دیکھ کر یا دیکھ کے بولتے ہیں۔

میرا متقابل (رقیب یا شاعر ہم عصر) بتکلف متقابل بنتا ہے۔ مقابل صحیح نہیں ہے۔ جبھی تو میرے کلام کی روانی و خوبی و بذلہ گوئی اور ظرافت دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

قدر سنگ سرِ راہ رکھتا ہوں — سخت ارزان ہے گرانی میری

راستہ کے پتھر کی اتنی میری قدر ہے جو لوگوں کی ٹھوکروں کے نیچے آتا رہتا ہے۔ میری گران (قدری) بہت ارزان ہے۔ یعنی کوئی قدر نہیں رکھتا ہوں۔

ارزان و گران میں صنعت تضاد ہے اور سنگ کے مناسب بمعنی وزن۔

گردبادِ رہ بے تابی ہوں — صرصرِ شوق ہے بانی میری

گردباد۔ بگولا صرصر ہوائے تند و تیز۔ یہ نام آندھی کا حکایت الصوت سے ہے۔ کیونکہ ہوا کے تیز چلنے میں (سر سر) آواز نکلتی ہے۔ بانی۔ بنیاد نہندہ۔ بنائے اسم فاعل۔

بیتابی و بیقراری کا بگولا ہوں اور شوق مفرط کی آندھی اس کی بانی ہے۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا — کھل گئی ہیچ مدانی میری

اس کا دہن جو معدوم اور ہیچ ہے۔ کھل گئی = آشکارا۔ و نمایاں ہو گئی (دہن) کو نہ جاننا ہی لفظی معنی یہاں مقصود ہیں۔

جب اس کے دہن کا علم مجھے کسی طرح نہ ہوا۔ اس سے میری ہیچمدانی ظاہر ہو گئی۔

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ — ننگِ پیری ہے جوانی میری

اے غالب۔ مجھے میری ناتوانی و کمزوری نے مجبور اور لاچار کر دیا ہے۔ میری جوانی پیری کے مقابلے میں ننگ و

عار کی چیز ہے۔ اس جوانی سے تو پیری کہیں اچھی ہے۔

---

غزل ۵۵ اشعار ۳

**نقش نازبت طناز بآغوش رقیب پائے طاؤس پے خامۂ مانی مانگے**

طناز = عربی میں تمسخر کرنے والا معنی ہیں۔ فارسی میں مغرور و بخود نازاں۔ مانی = چینی مصور ۲۷۶ء زمانہ شاپور شاہ ایران کے زمانہ میں تھا۔ ایشیائی شاعری میں بہت مشہور۔ ارژنگ چین اس کی البم بہت مشہور ہے۔ اپنی تصاویر کو معجزہ قرار دے کر دعویٰ پیغمبری کیا تھا۔ بہزاد ایرانی مصور اس کے مقابلے میں مشہور ہے۔ لوقا بھی مصور مشہور ہے۔ طاووس = (طاؤس) مور۔ بہت خوب صورت اور چمک دار پروں والا پرندہ مگر پاؤں بہت بدصورت اور نازیبا۔ اُردو میں مثل ہے — مور: جا ناچا اپنے پاؤں دیکھ کر جھر گیا۔

جب وہ صنم نازاں بخود رقیب کی آغوش میں ہو تو اس کی تصویر بحالت ناز کھینچنے کے لئے مانی کا قلم پائے طاؤس کا ہونا چاہئے۔ یعنی جس طرح مور کے حُسن کے ساتھ اس کے لئے اس کے پاؤں بدنما ہیں اسی طرح آغوش رقیب میں اس کا ہونا بدنما داغ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو لفظ (ناز) غیر ضروری ہے۔

**تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے**

افسانہ غم ایسا قصّہ ہے کہ بوجہ غم اس کے بیان کرنے میں آشفتہ بیانی لازم ہے پھر اس کا اثر تم پر کیا ہوگا۔ لہٰذا متحیر و خموش ہوں۔ یہ تحیر میرا تمہارے لئے تماشا بن گیا ہے۔

**وہ تب عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے**

وہ تب عشق تمنا ہے۔ یعنی اس حرارت عشق کی تمنا رکھتا ہوں۔ یہ اُردو نہیں۔ بنا بر عادت "آن تب عشق تمنا دارم" کا ترجمہ کر دیا ہے۔ نبض جگر۔ جگر کو نبض سے کوئی تعلق نہیں مطلق رگ کے معنی میں کہا ہے۔ عرق بکسر اول چاہئے جو موزوں بھی ہے۔ رہا یہ کہ یہ لفظ اُردو میں ثقیل اور غریب ہے تو یہ اس کی کب پروا کرتے ہیں۔ بکثرت ایسے الفاظ انھوں نے نظم کئے ہیں۔ بہت قریب ایک شعر میں صحرا، کو چھوڑ کے (بیدار) نظم کیا ہے۔ یہ بیدار اردو تو کیا فارسی میں بھی غریب ہے۔ جناب نظم نبض جگر کی یوں تاویل فرماتے ہیں کہ جگر بمعنی اندرون و میان بھی مستعمل ہے لہٰذا نبض جگر کے معنی اندرون

سینہ ہوں گے۔ اور اس صورت میں اشکالی باقی نہیں رہتا (حرکت عروق) منجمد دیکھو۔ درمیان واندرون بھی معنی (دل) کے مجاز اہیں جیسے دل شب بمعنی جگر کے بہت کم ہیں۔ ریشہ دوانی = درخت کی جڑ کے مہین مہین سوت جو زمین کے اندر اندر پھیلتے رہتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے درخت کو غذا ملتی ہے اور اس کی پرورش ہوتی ہے۔ ان سوتوں کو ریشہ کہتے ہیں۔ ریشہ دوانی کے معنی اپنا اثر پہنچانا ہوئے۔ اسی طرح شمع کے شعلہ کا اثر اس کے اندر والے تاگے سے ہوتا ہے۔

فائدہ۔ انگریزی لفظ (انٹریگ) ترجمہ اہل ایران وسیسہ اور فتنہ کرتے ہیں یہ الفاظ انٹریگ کے مفہوم صحیح کو اچھا ادا نہیں کرتے۔ اگر انٹریگ کا ترجمہ ریشہ دوانی کیا جائے تو وسیسہ اور فتنہ سے غالباً اچھا ہو گا اور بحالت مصدر ہوا باندھنا کہا جائے۔

مجھے ایسی حرارت عشق کی آرزو ہے کہ وہ بار دگر شعلہ شمع کی طرح رگ جگر تک پہنچ کر دل وجگر سب کو جلا کے رکھ دے۔ شمع کے اندر کا تاگا بھی شعلہ شمع سے جلتے جلتے آخر کار خود شمع کو ختم کر دیتا ہے۔

---

## غزل ۵۶ اشعار ۳

گلشن کو تری صحبت ازبسکہ خوش آئی ہے ۔ ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

گلشن کو تیری صحبت چونکہ بہت پسند ہے لہذا ہر کلی کا کھلنا کیا ہے گویا گلشن نے تجھے اپنی گود میں لینے کے لئے اپنی آغوش کھول دی ہے۔

وہاں کنگرا استغنا ہر دم ہے بلندی پر ۔ یاں نالہ کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

کنگر بضم اول وثالث۔ بلندی۔ اور جیز سے طاق نما کر برسر دیوار قلعہ بناتے ہیں عربی شرفہ MERLON, EMBATTLEMENT OF A WALL۔ استغنا = لاپروائی۔

ان کا کنگرۂ استغنا ہر دم اونچا ہوتا جاتا ہے۔ یعنی ان کی لاپروائی بڑھتی جاتی ہے اور ہمارے نالہ کو الٹا دعوئے رسائی کا ہے۔ یعنی یہ بھی وہاں تک بغیر پہنچے نہ رہے گا۔ یعنی جتنے وہ لاپروا بنتے جائیں گے اتنے ہی ہم بھی نالے بلند کرتے جائیں گے۔

ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز ے ۔ جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

چشم نمائی = آنکھیں دکھانا۔ آنکھ سے اظہار غضب کرنا۔ داغ کو آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

چوں کہ غم انداز ضبط سکھاتا ہے۔ لہٰذا جو داغ غم ہے وہ گویا چشم نمائی استاد ہے۔

غزل ۵۷ — اشعار ۵

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اسے قسمت میں عدو کی

اللہ کے ساتھ تو تکار کرنے میں وحدت و یکتائی اللہ کی پائی جاتی ہے۔ اور صیغہ ہائے جمع و تعظیم میں کثرت کی بو پائی جاتی ہے۔ اس لئے تو سے مخاطبہ کرنا اچھا سمجھا جاتا ہے۔

لکھ دے اے اللہ تو قسمت میں عدو کی

جو زخم اس قابل ہو کہ رفو سے (ٹانکوں سے) اس کا علاج ہو سکتا ہو۔ میں اپنی ایذا دوستی کی وجہ سے ایسے زخم کا خواہاں نہیں۔ تو اے اللہ ایسے زخم کو میرے دشمن رقیب کی قسمت میں لکھ دینا۔

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

سر انگشت۔ انگلی کی پور۔ حنائی۔ مہندی لگی۔

تب و حرارت عشق سے سارا خون جسم کا خشک ہو گیا ہے ہاں محبوب کی مہندی لگی ہوئی انگلی کا تصور البتہ دل میں رہتا ہے۔ وہی ایک بوند لہو کی دل میں پائی جاتی ہے۔

جناب نظم مہندی لگی پور کی تشبیہ کے لہو کی بوند کے ساتھ بہت مداح ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ تشبیہ بالکل نئی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ مگر حاصل شعر میں کوئی خاص لطف نہیں۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

غالب کبھو اور کسو کو بجز قافیہ غیر فصیح سمجھتے تھے۔ اور لکھنؤ میں ناسخ کے زمانہ سے متروک ہے۔

عشاق اگر بے حوصلہ ہو کر حالت بے صبری و اضطراب میں فریاد و فغان کرتے ہیں تو ان کی فریاد سے تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ تمہارے مقابلہ میں ان کی سنتا کون ہے اس لئے تمہارے لئے بدنامی کیوں ہونے لگی۔ خوب ستائے جاؤ اور ان کو چیخنے دو۔

صید جیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

دشنہ نے کبھی منھ نہ لگایا ہو جگر کو خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف = ہزار افسوس۔ اک عمر = مدت دراز۔ عربدہ جو = جنگجو۔ دشنہ = ایک قسم کا خنجر۔ منھ لگانا = التفات سے پیش آنا۔ کسی کی طرف متوجہ ہونا۔ مراد اس سے جگر کا چاک کرنا۔ بات پوچھنا = کسی کا خبر گیرا ہونا۔ اس کی آؤ بھگت کرنا۔ تقریباً منھ لگانے کا مترادف۔ خنجر کو چوں کہ زبان سے تشبیہ دیتے ہیں اس لئے اس کے ساتھ بات پوچھنے کا محاورہ مناسب ہے۔ گلو کی بات پوچھنے سے مراد گلا کاٹنا ہے۔ وہ ناکام = سے مراد غالب ہی ہے۔

اے غالب ہم کو اس بات کی حسرت ہے کہ کوئی جنگجو سفاک ہمیں مل جائے۔ اور ہمیں قتل کر کے ان مصائب و آلام سے چھڑا دے مگر ہم پر ہزار افسوس ہے کہ ایک مدت دراز سے دشنہ نے ہمیں منھ نہ لگایا۔ اور خنجر نے ہماری بات نہ پوچھی۔ برابر مصیبتیں جھیلتے چلے آتے ہیں اور چھٹکارا نصیب نہیں ہوتا۔

اصل جملہ یہ ہے۔ اس نامراد پر ہزار افسوس ہے جس کو دشنہ نے ایک مدت دراز سے منھ نہ لگایا ہو اور خنجر نے بات نہ پوچھی ہو۔ لہٰذا تعقید ہے۔ کیوں کہ ناکام ایک شعر میں ہے اور منھ لگانا وغیرہ دوسرے شعر میں۔

---

غزل ۵۷ اشعار ۲

سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم حیران کئے ہوئے ہیں دل بے قرار کے ۱۷۶غ ۲

پشت گرمی = اعانت۔ سیماب = آئینہ کے پیچھے پارہ جب لگاتے ہیں تب ہی اس میں عکس کسی شے کا دکھائی دیتا ہے۔ اسی کو پشت گرمی کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ سیماب = زیبق۔ جیوہ۔ پارا۔ چوں کہ ٹھہرتا نہیں لرزاں رہتا ہے اس لئے دل بے قرار کو اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور سکوت وصوت کی وجہ سے حیرانی بھی آئینہ کے ساتھ لگاتے ہیں۔ دے ہے = اب دیتا ہے بولتے ہیں۔

سیماب آئینہ کی مدد کرتا ہے یعنی اسے آئینہ بنا دیتا ہے۔ مگر ہمارا دل جو مثل سیماب بے قرار ہے اس نے ہمیں حیران و پریشان کر رکھا ہے۔ کسی طرح بیقراری جا کے دل کو سکون و سکوت حاصل ہی نہیں ہوتا۔ یعنی یہ سیماب (بیقراری) آئینہ دل کی اعانت نہیں کرتا۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ سیماب آئینہ کی پشتبانی کرتا ہے۔ یعنی سیماب کے سہارے آئینہ آئینہ ہوتا ہے۔ اسی طرح دل بیتاب نے ہم کو آئینہ کی طرح سراپا حیرت بنا رکھا ہے۔

جناب حسرت۔ پہلا مصرع مثالیہ ہے۔ دل بے قرار کو سیماب سے اور اپنی حیرانی کو آئینہ سے مشابہ کیا ہے۔ مطلب

یہ ہے کہ جس طرح پارہ کی قلعی سے شیشہ آئینہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح بے قراری نے مجھے آئینہ حیرت بنا دیا ہے۔
تمثیل اور ممثل لہ کے عمل میں مطابقت ہونا چاہئے وہ اس معنی سے نہیں رہتی کیوں کہ سیماب کا آئینہ بنانا۔
اور فعل ہے۔ اور دل بے قرار کا حیران کرنا دوسرا فعل ہے۔ مگر یہ کہ کہیں کہ ہر ایک کے کچھ عمل کرنے میں تشابہ ہے فقط۔

آغوش گل کشادہ برائے وداع ہے　　اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

پھولوں کی شگفتگی کو ان کا کھلنا نہ سمجھو بلکہ بہار سے رخصت ہونے کے وقت ملنے کے لئے اپنی آغوش ان پھولوں نے کھول دی ہے۔ لہٰذا اے عندلیب اب تو بھی گلستان کو چھوڑ دے کیوں کہ زمانہ بہار جا رہا ہے۔

---

غزل ۵۸　　اشعار ۲

مطلع　ہے وصل ہجر عالم تمکین وضبط میں　　معشوق شوخ وعاشق دیوانہ چاہئے

وصل میں بھی اگر صبر وضبط وتحمل سے کام لیا جائے تو پھر وصال کیا ہے یہ تو ہجر ہوگا۔ وصال میں تو معشوق کو شوخ اور چنچل اور عاشق کو دیوانہ وگستاخ وبیباک ہونا چاہئے تب ہی وصال کا لطف ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ الفاظ عاشق ومعشوق پر اگر اضافتیں ہوں تو بندش بے تکلف ہو جائے اور وزن میں خرابی نہ آئے گی۔ کیوں کہ اس وقت فاعلاتن مفعولُ وزن ہو جائے گا۔ لیکن شوخ کے بعد (چاہئے) محذوف ہوگا۔ اور واو عطف فارسی وارُدو جملوں میں ہوگا جو برا ہوگا۔
وزن اس بحر کا مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن ہے۔ بوجہ زحاف تسکین اس وزن مفعول فاعلاتن مفعول فاعلن ہو جائے گا۔ اور واو عطف بھی (چاہئے) کی طرح حذف کر دیا جائے۔ یعنی ؎
معشوق شوخ۔ عاشق دیوانہ چاہئے
جو منظور جناب نظم واو عطف سے پیدا کرتے تھے اس طرح وہ جاتا رہے گا۔

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں　　شوقِ فضول وجراُتِ رندانہ چاہئے

اس لب سے یعنی اس کے لب سے۔ فضول = بڑھا ہوا۔ اردو میں بمعنی بے کار۔
اس کے لب ودہن سے کبھی تو بوسہ مل ہی جائے گا۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ شوق بڑھا ہوا اور جراُت ودلیری رندوں کی ایسی ہو۔

غزل ۵۹ اشعار ۱۰

مبالغ

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے   یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

ان حسینوں کے ساتھ جتنا بھی جی چاہے محبت کر دیہ اسی کے سزاوار ہیں۔ اس کے بعد اگر یہ بھی چاہنے لگیں تو اس سے بڑھ کے کون سی بات ہو سکتی ہے۔

صحبت رنداں سے واجب ہے حذر   جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے

حذر = اجتناب۔ پرہیز۔ مے کھینچنا = مے کشیدن کا ترجمہ ہے جس کے معنی شراب پینے کے ہیں۔ مگر اُردو میں مے کھینچنے کے معنی شراب پینے کے نہیں۔ بلکہ شراب کشید کرنے کے ہیں۔ جناب غالبؔ محاورات فارسی کے تراجم اُردو بلا تکلف بکثرت استعمال کرتے ہیں چاہے وہ تراجم اُردو میں نہ بولے جاتے ہوں۔ اس فعل کو وہ اپنے لیئے جائز مانتے تھے۔ (اپنے کو کھینچنا کسی چیز سے) اس چیز سے پرہیز کرنا۔ بچنا۔ (تراجم فارسی کی ایجاد سے شاید ان کو مقصود زبان اُردو کو وسعت دینا ہوگا۔ مگر مقبول نہ ہونے کی وجہ سے اس نے رواج نہ پایا۔)

بجائے مے کشی صحبت رنداں سے اجتناب واجب ہے۔

چاہیئے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل   بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

تمہارے ساتھ عشق کرنے کو میرا دل معمولی بات سمجھا تھا۔ اس کی وجہ سے ہم کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھا رہے ہیں۔ لہٰذا اب ہم کو اس سے مواخذہ اور باز پرس کرنا چاہیئے کہ یہی میری تکلیف کا باعث ہوا ہے۔

کسی سے سمجھنا = اس کو اس کے فعل کی سزا دینا۔ بھی = اور کس سے سمجھنا چاہیئے اس کا ذکر نہیں۔ اس لیئے بھی غیر ضروری لفظ ہے ؎

بارے اب اس سے سمجھنا چاہیئے

ہونا بہتر ہے۔ مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ معشوق سے بھی اور دل سے بھی سمجھنا چاہیئے۔

جناب نظمؔ کا ارشاد ہے کہ عاشق معشوق کو صلاح دیتا ہے کہ تم کو اس دل سے سمجھنا چاہیئے۔ اور آسیؔ نے بھی یہی معنی لکھ دیئے۔

اس صورت میں (بھی) کے یہ معنی ہوں گے کہ تم کو اس دل سے اور مجھ سے بھی سمجھنا چاہیئے یوں تو (بھی) اور بھی

فضول ہو جائے گا۔ اور معنی شعر کچھ اچھے نہ ہوں گے۔

چاک مت کر جیب بے ایام گل کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیئے

ایام گل ۔ فصل بہار۔ اس فصل میں جنوں جوش پر اور قوت شہوانی ہیجان میں ہوتی ہے۔ اُدھر کا قدرت اور فطرت کا۔

جب بہار آئے اور قبائے گل چاک ہو اس وقت گریبان دری و چاک دامانی کرنا کہ وہ اقتضائے وقت کے موافق ہوگا۔ بے وقت کی گوری جو تالے کے دوڑی۔

جناب نظم فرماتے ہیں۔ چاک گریبان کے منع کرنے نے بڑا لطف دیا کہ یہ بندش کا نیا انداز ہے۔ (مجھے اس میں کچھ مزہ نہ ملا) کیوں کر ان کی ایسی دقیقہ رسی مجھ میں نہیں۔ ایسی خواہش تو جیون ساتھی سے کی جا سکتی ہے۔ حقیقی جنون میں چاک گریبانی تو بے اختیارانہ ہوتی ہے۔ اس سے تو مصرع ثانی کچھ اچھا ہے۔

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی منھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

پردہ چھوڑ کے اپنے آپ کو بے گانہ و اجنبی دکھانے سے دوستی پر پردہ پڑا رہتا ہے اور راز عشق ظاہر نہیں ہوتا۔ پردہ کرنے سے ایک قسم کی لگاوٹ پائی جاتی ہے۔ لہٰذا راز دوستی چھپانے کے لیئے ہم سے پردہ چھوڑ دینا چاہیئے۔ (جیسے اعزہ میں چچا زاد۔ خالہ زاد۔ ماموں زاد بہنیں پردہ نہیں کرتی ہیں۔ لیکن جب منگنی کا پیغام دے دیا جاتا ہے تو پردہ کرانے لگتے ہیں)۔

میری از من و خلقے بگمانست از تو بے محابا شو دنشین کہ گمان برخیزد

بھترے دے کر اور چالوں میں پھانس کر معشوق کو اپنے سامنے لانا چاہتے ہیں۔

دشمنی نے میری کھویا غیر کو کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے

ہر وقت میری طرف کی لگائی بجھائی کرنے سے غیر نے اپنے آپ کو ان کی نگاہ سے گرا دیا۔ ایسا بھی کوئی دشمن ہوتا ہے کہ کسی کی دشمنی میں اپنا نقصان کر بیٹھے۔

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

ہم اگر رسوا ہونا بھی چاہیں تو اپنے کو رسوا کرنے میں ہماری کوشش کیا کام دیتی ہے۔ ہاں یار ہنگامہ آرا اگر چاہیئے

توہم کو بے صبر و بے قرار کر کے رسوا کیا کر سکتا ہے۔ اور یہ امر اس کے اختیار میں ہے۔ مگر اس نے توہم سے بالکل بے تعلقی اختیار کر رکھی ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے

اس سے بڑھ کے ناامیدی اور کیا ہو سکتی ہے کہ حصول مراد کا انحصار موت پر ہو۔ موت پر کسی کو اختیار نہیں۔ نہ معلوم کتنی مدت میں کٹے۔ یہ زمانہ انتظار کیسے کٹے گا۔ اور مرنے کے بعد اگر امید حاصل بھی ہو تو کیا۔ (اچھا شعر ہے)۔

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہئے

مہ طلعت۔ حسین۔ چاند ایسا چہرہ والا۔
اے غافل ان حسینوں سے عشق کرنے والے کو بھی اچھے خصائل والا ہونا ضروری ہے۔ وفادار ہو عاشق صادق ہو۔ متحمل بہ شدائد ہو۔

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

تو کی جگہ شاید (بھی) زیادہ بول چال میں ہو۔ آپ کی صورت بھی الخ جب کوئی شخص اپنی قابلیت اور استعداد سے بڑھ کے کسی امر کا متمنی ہوتا ہے تو طعناً اور تنبیہاً اس کے حق میں کہتے ہیں کہ ذرا آپ کی صورت دیکھئے یہ منھ اور مسور کی دال۔
میاں اسدؔ بھی حسینوں سے عشق جتاتے ہیں۔ کہاں اسدؔ اور کہاں عشق حسینان۔ یہ بھی اس قابل ہوئے کہ حسینوں سے الفت کریں ذرا ان کی صورت تو دیکھو۔

---

غزل ۶۰ اشعار ۱۰

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے بھاگے ہے بیابان مجھ سے

یہ تو قدم قدم چلتے ہیں اور بیابان ان سے بھاگتا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ جتنا آگے بڑھیں گے اتنا ہی ان سے منزل مقصود دور ہوتی جائیگی۔ حاصل یہ ہے کہ عشق و عاشقی میں حصول مطلوب محال ہے۔

درس عنوان تماشا بتغافل خوشتر ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھے

جناب نظم جو فرما رہے ہیں بالکل درست ہے کہ عنوان تماشائے دنیا کا سبق اگر لیا بھی جائے برائے تجربہ دنیا تو وہ بھی تغافل کے ساتھ اچھا ہے۔ اسے بھلا دینا چاہئے۔ اسی لیئے میری نگاہ شیرازہ مژگان کا رشتہ ہو رہی ہے اور آنکھ سے باہر نہیں نکلتی۔ عنوان کا لفظ مبالغہ پیدا کرنے کے لیئے لائے ہیں۔ کہ سارا درس تماشائے دنیا تو ایک طوما ہے اس کے پڑھنے کا کسے دماغ۔ عنوان تماشا کے دیکھنے سے بھی تغافل چاہئے۔ (نگہ مجھ سے فارسی نگہ از من کا ترجمہ ہے اُردو میں نگہ میری کہتے ہیں۔)

وحشت آتش دل سے شب تنہائی میں دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے

شب فراق میں آتش دل کی وحشت اور خوف سے میرا سایہ بھی مجھ سے اس طرح گریزاں رہا جیسے دھواں شعلہ سے بھاگتا رہتا ہے۔ وہ رات ایسی وحشت ناک تھی۔ اس کو بھی اپنے جل جانے کا خوف تھا۔ اسی مضمون کو پھر یوں فرماتے ہیں۔

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسدؔ پاس مجھ آتش بجان کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں کس قدر خانہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

خدا کرے کہ دوسرے عشاق کا غم مرگ معشوقوں کو سادگی سکھانے والا نہ ہو۔ میرے مرنے سے میرے محبوب نے میرے سوگ میں زینت کرنا چھوڑ دیا اس کا آئینہ کس قدر ویران اور ڈھنڈھار پڑا ہے۔

اگر پہلے مصرع کے معنی تمنا سے نہ کیے جائیں تو پھر (نہ ہو) کی جگہ (ہوا) ہونا چاہئے۔ جناب آسیؔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اے غم عشاق تو سادگی آموز بتاں نہ ہو۔ شاید یہ تخاطب کچھ اچھا نہ ہو۔

اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں صورت رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

آبلہ = کہتے ہیں کہ آبلوں میں پانی ہوتا ہے اور موتیوں کی طرح چمکتے ہیں۔ اسی چمک کی وجہ سے چراغان کہا ہے یا خون بھی ان سے بہنا مان لیا جائے۔ چراغان صیغہ جمع نہیں ہے بلکہ اظہار کثرت کے لیئے اسم ہے۔ جادہ کو رشتہ اور آبلوں کو گوہر بنایا ہے اور ان کی چمک کی وجہ سے یا سرخی خون سے چراغان کہا۔

جنون کے صحرا کا راستہ آبلوں کے اثر سے سلک مروارید کی طرح میری وجہ سے چراغان کا کام دے رہا ہے۔

بے خودی بستر تمہید فراغت ہو جو　　　پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستان مجھ سے

تمہید ۔ بچھانا مناسب بستر ۔ وہ باتیں جو موقوف علیہ کسی مطلب کی ہوں ۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں ۔ فراغت ۔ کسی امر سے خالی ہونا اور اس سے چھٹکارا مل جانا ۔ یہ معنی مناسب (مچ) ہیں ۔ اصطلاحًا راحت مل جانے کے معنی ہیں ۔ اور یہی مقصود ہیں ۔ ہو جو ۔ ہو جیو کی جگہ اب (ہو) بولتے ہیں ۔ مصنف نے اس پر یہ طرہ کیا کہ مخفف کر کے (ہو جو) باندھا ۔ شبستان ۔ قیام گاہ شب ۔

خدا کرے کہ میری بے خودی میرے لیئے مقدمہ فراغت رہے کہ جس کی وجہ سے میرا شبستان سایہ کی طرح پُر ہے ۔ یعنی بوجہ بے خودی سایہ کی طرح بے حس و حرکت بستر پر راحت سے پڑا ہوا ہوں ۔

شوق دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے　　　ہو نگہ مثل گل شمع پریشان مجھ سے

مثل گل شمع ۔ شعلہ شمع ۔ رشتہ شمع جو جل کے سیاہ ہو جاتا ہے ۔ گلگیر سے اسے جب کاٹ کے الگ کر دیتے ہیں تو روشنی بڑھ جاتی ہے ۔ اور گل کے چند ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور ہر ایک میں ایک لمحہ کے لیئے چمک بھی ہوتی ہے پھر بجھ جاتے ہیں ۔ اسی وجہ سے لفظ پریشان لائے ۔ اور اسی وجہ سے متعدد نگاہیں قرار دیں ۔ مگر یہ لفظ مجھے اچھا نہ معلوم ہوا ۔ اگرچہ میرا اچھا یا بُرا معلوم ہونا کیا حقیقت رکھتا ہے ۔ میرے خیال میں (دو چندان) اگر ہو بہت اچھا نہیں تو شاید پریشان ۔ سے تو کچھ اچھا ہو ۔ گل کترنے اور گردن مارنے میں بھی ایک طرح کا تشابہ ہے ۔

شوق دیدار میں اگر تو مجھے قتل کرے تو گل شمع کی طرح میری نگاہ اور زیادہ پریشان ہو کر پھیل کر ہر طرف تجھے دیکھے ۔ اور گل شمع کی طرح ایک نگاہ متعدد نگاہیں بن جائیں ۔

جناب نظم ۔ شمع کا گل لینے سے دھواں نکل کے ہر طرف پھیلتا ہے ۔ اسی طرح شوق دیدار میں میری نگاہیں دھوئیں کی طرح نکل کر پریشان ہوں ۔ یا ۔ شمع کا گل کترنے سے شعلہ شمع کی روشنی جس طرح پھیلتی ہے ۔ اسی طرح میری نگاہیں چاروں طرف پھیل جائیں تمہارے شوق دید میں ۔

جناب حسرت ۔ جس طرح گل کترنے سے اجزائے گل شمع پریشان ہو جاتے ہیں اسی طرح میری نگاہ شوق دید میں پریشان ہو جائے یعنی ایک نگاہ کی کئی نگاہیں ہو جائیں ۔ پریشانی نگاہ سے مراد تعدد نگاہ لینا ذرا دشوار معلوم ہوتا ہے ۔

بے کسی ہائے شب ہجر کی وحشت ہے ہے　　　سایہ خورشید قیامت میں ہے پنہان مجھ سے

بیکسی ۔ کسی سنگی اور ساتھی کا نہ ہونا ۔ ہے ہے ۔ بین ۔ افسوس ۔ خوف ۔ اور چڑھانے کے وقت بولتے ہیں ۔

شب ہجر میں کوئی میرا سنگی ہے اور نہ ساتھی۔ تنہائی کی وہ وحشت ہے کہ میرا سایہ بھی اس کی وحشت سے خوف کھا کر خورشید قیامت میں جا کر چھپ رہا۔

جب تک کہ کوئی شئے روشن کسی چیز کے آگے پیچھے نہ ہو اس وقت تک سایہ اس شئے کا نہیں ہوتا ہے۔ اور جب آفتاب سمت اور اس پر ہو تب سایہ معدوم ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آفتاب قیامت سوا نیزہ کے فاصلہ پر سر ہوگا۔ اس لئے سایہ بھی نہ ہوگا۔ ہجر کی رات کو قیامت زا بھی کہتے ہیں کیوں کہ عاشق کے لیئے سخت مکلف ہوتی ہے۔ اور ہر رات اندھیری ہوتی ہے۔ ہجر کی رات کو بہت اندھیری اور دراز بھی مانتے ہیں۔ خورشید قیامت = بوجہ کثرت نور چہرہ استعارۃً معشوق مراد لیتے ہیں۔ قدیار کو قیامت کہنا تو بہت عام ہے۔ خورشید لکھنوی ؎

نام یہ بھی ہیں شب ہجر و قد جاناں کے حشر کہتے ہیں کسے اور قیامت کیا ہے

الغریق تیشبث بالحشیش کا مصداق ہوں سمجھتا کچھ نہیں۔ شارحین کے بتانے سے بھی سمجھ نہ سکا۔ مجبور ہو کر ان کے معانی لکھ رہا ہوں۔

جناب نظم۔ شب غم کی بے کسی اور اداسی سے وحشت کھا کر میرا سایہ مجھ سے بھاگا ہوا ہے۔ اور آفتاب قیامت میں جا کر چھپ رہا۔ حالاں کہ سایہ آفتاب سے دور رہتا ہے۔ مگر میرا سایہ مجھ سے ایسا بھاگا کہ آفتاب میں اور آفتاب حشر میں پنہاں ہو گیا۔

جناب حسرت۔ بقول شاعر ؎

کسی کا کب کوئی روز سیہ میں ساتھ دیتا ہے کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

جناب آسی۔ ہائے ہائے شب ہجر میں مجھے جب وحشت ہوتی تھی تو سایہ کیا کیا مجھے ڈرایا کرتا تھا اسی کی شرم اور ندامت کی وجہ سے قیامت کے دن خورشید قیامت میں سایہ مجھ سے پوشیدہ ہو رہا ہے اور چھپا چھپا پھرتا ہے۔ (شعر محتاج شرح رہ گیا)۔

جناب آسی۔ میرے نزدیک اس میں ایک لطیف پہلو یہ بھی موجود ہے۔ کہ ہائے ہائے شب ہجر کی بے کسی کا کیا عالم ہے۔ اور اس میں کیسی وحشت ہے جس نے میرے اوپر قیامت برپا کر رکھی ہے۔ اور گویا میرا سایہ بھی اسی قیامت کے خورشید میں چھپا ہوا ہے۔ (سایہ کے پنہاں ہونے کی کئی وجوہ ٹھہرائی جا سکتی ہیں۔ خواہ میری بیکسی کے بڑھانے کے لیئے۔ خواہ میری وحشت سے ڈر کر۔)

یہ بھی کچھ سمجھ کے تو کہتے نہیں۔ جو خیال میں آتا ہے لکھ مارتے ہیں۔ وحشت نے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ یعنی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ مصیبت میں ڈالنے سے خود وحشت کو کس وجہ سے آفتاب قیامت کہیں۔ اور سایہ کا آفتاب وحشت میں چھپنے کے کیا معنی ہوئے۔ اور یہ ان کو لطیف پہلو دکھائی دیتا ہے۔

اب میری بکواس بھی سن لیجئے۔ جناب آسی کی طرح اٹکل پچو اڑاتا ہوں۔
دل وجگر تو پہلے ہی مجھے چھوڑ کر ان کے ہو رہے۔ ایک سایہ تھا وہ بھی میری وحشت ناک شب تنہائی سے ڈر کر خورشید قیامت کی (یعنی معشوق) کی حمایت میں جا چھپا۔ کس قدر میری بیکسی قابل رنج وملال ہے، اب خورشید قیامت (یعنی محبوب) کے ظہور (اس کے مجھ سے ملنے) سے یہ وحشت ناک شب تنہائی دور ہو سکتی ہے اور سایہ میرا ساتھ دے سکتا ہے۔

گردش ساغر صد جلوۂ رنگین تجھ سے　　　آئینہ داری یک دیدۂ حیران مجھ سے

جلوہ کو ساغر اس لیئے کہا کہ دونوں ہوشربا ہوتے ہیں۔
تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنا جلوہ دکھا کر ساغر مے کی طرح مجھے مست ومدہوش بنا دو اور میرا کام یہ ہے کہ میں ایک دیدۂ حیران کا آئینہ سامنے رکھوں یعنی حیران ہو کے رہ جاؤں (صد) کی ضرورت نہ تھی اگر ہو بھی تو ساغر کے ساتھ ہو تا کہ جلوہ کی خوبی میں اور اضافہ ہو جائے۔ اسی صد کی مناسبت سے دوسرے مصرع میں (یک) لائے۔ اگر (یک) کی جگہ (ایک) ہوتا تو اس کے معنی بھی کثیر کے ہوتے۔ یا (اک) ہی ہوتا۔

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد　　　ہے چراغان خس وخاشاک گلستان مجھ سے

ٹپکنا = ظاہر ہونا۔ اک = اظہار کثرت کے لیئے ہے۔
میری نگاہ گرم سے اے اسد ایک بڑی آگ کا ظہور ہو رہا ہے۔ جس سے خس وخاشاک گلستان میں آگ لگ رہی ہے اور گلستان میری وجہ سے چراغان ہو رہا ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ نگاہ کے گرم ہونے کی کوئی وجہ نہ معلوم ہوئی۔
شاید یہ وجہ ہو کہ گلستان میں محبوب ان کے ساتھ نہیں اس لیئے نگاہ گرم سے گلستان کو دیکھتے ہیں اور اس کی بہار ان کی نظروں میں خار معلوم ہوتی ہے۔

---

## غزل ۶۱　　　اشعار ۹

۱۹۱ پ　نکتہ چین ہے۔ غم دل اس کو سنائے نہ بنے　　　کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

سنائے اور بنائے۔ نون کو اگر روی قرار دیں تو قوافی میں کوئی عیب نہیں۔ اختلاف حرکت توجیہ بھی صحیح ہے، کیوں کہ روی متحرک ہے۔ مگر اور قوافی کی وجہ سے نون روی نہیں بلکہ الف روی ہے۔ اور دونوں قوافی میں یہ الف ردی

ہے ۔ اور دونوں قوافی میں یہ الف ردی تعدیہ کا ہے اس لیئے ان قوافی میں بنا بر مسلمات ایطا ہوگا ۔ بات کا بننا ۔ کسی کام کا ٹھیک اور درست ہونا ۔ بات بنانا ۔ تاویل کرنا ۔ بات کو پھیر پھار کے اپنے مطلب بر آری کے موافق لے آنا ۔ بات بن پڑنا ۔ بات بنانے کا فعل لازم ہے ۔ تدبیر بن پڑنے کے معنی ہیں ۔ اُردو شاعری میں مطلع کے سوا اور اشعار میں ایطا نہیں مانتے ہیں ۔

معشوق بڑا نکتہ چین اور دقیقہ رس اور باریک بین ہے ۔ اس لیئے غم دل اس کو سنایا بھی نہیں جاسکتا ۔ پھر اس سے مطلب برآری کیسے ہو جب اس کے سامنے بات بھی بنائی نہیں جاسکتی ۔

جناب آسی اپنی جدت طبع سے یہ معنی بھی لکھتے ہیں کہ غم دل میری عیب جوئی اور نکتہ چینی میں مصروف ہے کہ تو اس پر مجھے اظہار کیوں نہیں کرتا ۔ اور ہم کو اس سے سنایا نہیں جاتا ۔ یعنی ہم رعب حسن یا موقع نہ ملنے کی وجہ سے اس سے کچھ کہہ نہیں سکتے ۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ غم دل تو اپنی نکتہ چینیوں کی وجہ سے خواہش اس بات کی کرتا ہے مگر وہاں کی رنگت کو نہیں جانتا ۔ وہاں کوئی بات نہیں بن سکتی پھر بھلا کامیابی کیسی ۔

اس کو سُنائے نہ بنے ۔ مفعول اس جملہ میں کیا رہا ۔ اپنی طرف سے (غم دل) لگالو ۔ پھر معشوق کے نکتہ چین ہونے سے غم دل کا نہ سُنا سکنا سیدھی اور اچھی بات تو ہے ۔ اس کو بگاڑنے سے معنی میں کون سی خوبی پیدا ہوئی ۔ جو اس معنی سے تجاوز کیا جائے ۔

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل　　اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کسی پر بن جانا ۔ اس کا مصیبت میں مبتلا ہو جانا ۔ یہ ایک قسم کا کوسنا ہے ۔ اس لیئے اس محل پر اس کا استعمال برا ہے ۔ مگر غالب نے اس کے لفظی معنی لیئے یعنی وہ ایسے مجبور اور لاچار ہو جائیں کہ ان کو بغیر آئے چارہ نہ ہو ۔ لیکن جب کسی لفظ یا محاورہ کے معنی اصطلاحی عام ہو جائیں اور معنی وضعی مہجور تو پھر معنی وضعی میں استعمال کرنا غریب اور غیر مانوس ہو جاتا ہے ۔

اے دل تیری بے قراری کو دیکھ کر میں اسے بلاتا تو ہوں مگر تیری کشش بھی اتنی مؤثر ہونا چاہئے کہ وہ چلے آنے پر بھی مجبور اور لاچار ہو جائے اور بغیر آئے اسے کچھ اور نہ بن پڑے ۔

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے　　کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

مصرع ثانی میں بھی کی جگہ (ہی) ہو تو عیب نہیں ۔

لطف و مہربانی کی تو اس سے امید نہیں ۔ وہ میرے ستانے کو ایک کھیل سمجھتا ہے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ستانے کو

بھی چھوڑ بیٹھے یا بھول جائے۔ اور کسی دوسرے کام میں لگ جائے۔ کاش ایسا ہی ہو کہ اسے مجھے ستائے بغیر چین نہ آئے۔

غیر پھرتا ہے لیئے یوں ترے خط کو کہ اگر　　کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

معشوق پر طعن کرتا ہے کہ تو نے جو خط رقیب کو لکھا ہے وہ اس خط کو فخریہ اس طرح لیئے پھرتا ہے کہ اگر کوئی پوچھے کہ یہ خط کس کا ہے تو وہ چھپا بھی نہ سکے اور تیری رسوائی ہو۔ ایسے غیر محتاط کو خط لکھنے کی کیا ضرورت جناب نظمؔ فرماتے ہیں کہ یہ مضمون نیا اور سچا ہے۔

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا　　ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

بھلے اور برے میں صنعت تضاد ہے۔ بھلے۔ نیک خصال۔ خوش اخلاق۔
ان کی اس نزاکت کا برا ہو وہ اگر خوش اخلاق بھی ہیں اور عاشق کی تمنا پوری ہونے کو مانع بھی نہیں مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ اگر عاشق کے ہاتھ بھی لگ جائیں تو ان کی نزاکت کی وجہ سے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ جناب نظمؔ فرماتے ہیں کہ نزاکت کی تصویر کھینچ دی ہے۔
جناب نظمؔ یہ افادہ بھی فرماتے ہیں کہ نزاکت۔ بادشاہت چاہت۔ رنگت عربی کے قاعدہ پر قیاس کر کے مصادر گڑھ لیئے ہیں۔ از روئے قاعدہ غلط ہیں مگر استعمال اساتذہ سے صحیح ہیں۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

کس کی مراد اللہ کی۔
اگرچہ دنیا کی ہر شئے سے جلوۂ ذات الٰہی کا ظہور ہے۔ مگر اس عالم امکان میں یہ شیونات مختلف اس حقیقت پر ایسا گہرا پردہ ہیں کہ اس پردہ کا ہٹانا ہر شخص کا کام نہیں۔ شعر تصوف میں ہے۔ اور مسئلہ وحدت وجود کو کہنا چاہتے ہیں۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے　　تم کو چاہوں کہ نہ آؤ؟ تو بلائے نہ بنے

جناب نظمؔ۔ موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کیوں کہ وہ بغیر آئے نہ رہے گی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا کہ تم سے کہوں کہ تم نہ آؤ کہ پھر مجھ سے بلاتے بھی نہ بن پڑے۔ یعنی آپ ہی آنے کو منع کردوں تو پھر کس منھ سے بلاؤں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تمہارے نہ آنے سے موت کا آنا بہتر ہے۔
شاید کہوں اور دیکھوں کے درمیان (نہ) غلطی کاتب ہے۔

جناب حسرت۔ موت کی راہ دیکھنے سے کیا فائدہ کہ وہ تو خواہ مخواہ آہی گی۔ تمہاری خواہش کرنا چاہئے کہ اگر تم نہ آؤ تو مجھے بلاتے بھی نہ بن پڑے۔

جناب آسی۔ موت کی راہ کیوں دیکھوں وہ ایک نہ ایک دن ضرور آئیگی۔ مگر تمہارے آنے کا متمنی کیوں نہ رہوں۔ اگر تمہارے نہ آنے کا خیال بھی دل میں آجائے تو پھر تم کو کس منھ سے بلاؤں۔

کچھ الفاظ بدل کے یہ مطلب جناب نظم و حسرت ہی کا ہے۔

دوسرا احتمال اس شعر کے معانی میں یہ بھی موجود ہے کہ مجھ کو اس وقت ضرورت سخت ہے کہ موت کا داعی ہوں، کیوں کہ مجھے اپنی زندگی کاٹنی دوبھر ہے (مصرع تو کہتا ہے کہ ہمیں موت کے انتظار کی ضرورت نہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مجھے موت کی اس وقت ضرورت ہے) مگر ایسی ضروری شے کے بلانے کو میں ٹال سکتا ہوں۔ مگر آپ کو بلانا نہیں چھوڑ سکتا (مصرع ثانی کے یہ معنی کیسے ہوں)۔

تیسرے معانی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ آپ کے آنے سے مجھے شادی مرگ۔ ہو جائیگی مگر پھر بھی آپ کو بلاتا ہوں اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ نہ آؤ۔ کیوں کہ اگر بلانا چھوڑتا ہوں تو آیندہ کو میرا منھ نہ رہے گا کہ تم کو بلا سکوں۔ اور موت کا کیا ہے اس کا آپ کے بلانے کی حالت میں کیوں انتظار کروں وہ تو آپ کے آنے پر آئے بغیر نہیں رہ سکتی (مجنوں کی بڑ کے سوا اس میں کیا دھرا ہے)۔

چوتھے معنی یہ ہیں اور یہ سب سے بہتر اور مناسب مقام ہیں۔ (اپنی تعریف آپ کر رہے ہیں) یہ جو شب و روز میں موت کا انتظار کرتا ہوں یہ فضول ہے اس کو چھوڑ دینا چاہئے۔ اور اس کی راہ مجھے نہ دیکھنا چاہئے وہ تو خواہ مخواہ آئیگی۔ اور اس کے یقینی ہونے کا اور ضروری آنے کا سبب اور اس کے بلانے کی تدبیر یہ ہے کہ میں یہ چاہوں یعنی اس بات کی خواہش کروں کہ تم نہ آؤ۔ اس خواہش کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ گے اور میرا منھ نہ رہے گا کہ تم کو بلاؤں۔ اور پھر اس صدمہ سے لازمی مجھے موت آجائیگی۔

عاشق کے دل کی خواہش معشوق کے نہ آنے کی۔ معشوق پر کیسے ظاہر ہو گی کہ وہ ناراض ہو۔ شعر میں اس بات پر کون سے الفاظ دال ہیں۔

شاعر شعر میں ایک ہی مفہوم رکھتا ہے۔ مگر نشست و صرف الفاظ بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ دوسروں کو اور معانی کی طرف بھی لے جاتے ہیں۔ مگر یہ الفاظ کے پابند نہ ہو کر جو معانی ان کے خیال میں آتے ہیں لکھ مارتے ہیں۔

شادان۔ تم کو اور میں چاہوں کہ نہ آؤ؟۔ یہ جملہ استفہام ہے۔ یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ تم سا حسین ہو اور میرا ایسا عاشق صادق اور وہ یہ چاہے کہ تم نہ آؤ۔ یہ تو ناممکن ہے۔ یعنی تمہارا آنا ضرور چاہتا ہوں۔ اس کو استفہام کے ساتھ تعجب کے لہجہ میں پڑھو۔

موت کا تو ایک وقت معین ہے اس وقت وہ تو آ کے رہے گی ۔ تکالیف عشق سے اکتا کے اس کے آنے کی خواہش کروں یہ فعل میرا بالکل فضول ہے ۔ میرے انتظار یا خواہش پر اس کا آنا نہ آنا موقوف نہیں لیکن یہ کب ممکن ہے کہ تمہارا نہ آنا چاہوں یعنی تمہارا آنا تو بالضرور چاہتا ہوں مگر تمہارے بلا لینے کی تدبیر تو میرے پاس کوئی نہیں ہے ۔ اس کا کیا علاج ۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے　　کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے (سے) کی وجہ سے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ بار عشق جو اٹھائے ہوا تھا ۔ عدم تحمل کی وجہ سے میرے سر سے گر پڑا ۔ اب اس کے بار دیگر اٹھانے یا سر پر لینے کی ہمت نہیں ہوتی ۔ یہ کار عشق ایسا میرے لئے لازم آپڑا ہے کہ اس کا انجام تک پہنچانا میرے امکان سے باہر ہے اور کچھ بنائے نہیں بنتی ۔ ترک و اختیار دونوں دشوار ہیں ۔

عشق پر زور نہیں ۔ ہے یہ وہ آتش غالبؔ　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

عشق پر کسی کا قابو نہیں چلتا اور اختیار سے باہر ہے ۔ یہ وہ آگ ہے کہ کوئی شخص اپنے اختیار سے یہ آگ اپنے دل میں لگا لے تو یہ ممکن نہیں ۔ لگ گئی ہو اور اسے بجھانا چاہے تو یہ بھی اس کے بس کی بات نہیں ۔

معنی ذیل جناب نظم کے ہیں مگر آسی انہیں کی نقل کر کے معشوق کے دل میں آگ لگانے کو کہتے ہیں ۔ ساری غزل اچھی ہے ۔ غزل اسی کا نام ہے ۔

---

غزل ۶۲　　اشعار ۵

چاک کی خواہش اگر وحشت بعریانی کرے　　صبح کے مانند زخم دل گریبانی کرے　　۲وفی

اگر وحشت و جنون کو تمنا چاک گریبانی کی ہو تو زخم دل بھی کار گریبان کرے کہ اسے بھی مانند صبح وہ وحشت چاک کر کے زخم دل کو اور زیادہ بڑھا دے کیوں کہ بحالت جنون جسم پر کپڑا تو رہا نہیں ایک زخم دل مانند گریبان ہے اسے چاک کرے ۔

عریانی میں (ی) مصدری اور گریبانی میں (ی) لیاقت ہے ۔

جادہ کا تیرے یہ عالم ہے کہ گر پہنچے خیال　　دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

وہ عظمت کے لیئے اور (یہ) بھی اسی کا مترادف ہوتا ہے۔
تیرا جلوہ ایسا حیرت انگیز جلوہ ہے کہ خیال کرنے سے بھی چشم دل کو حیرت کی زیارت گاہ بنا دیتا ہے یعنی اس جلوہ کا محض خیال دل کو حیران کر دیتا ہے یہ کس قسم کا جلوہ ہے۔ کہ نہ کبھی دیکھا اور نہ کبھی سنا۔

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک　　آبگینہ کوہ پر عرض گرانجانی کرے

آبگینہ۔ کانچ، شیشہ مراد دل نازک و ناتوان عاشق۔ کوہ۔ کنایہ از شدت و سختی غم اور یار سنگ دل بھی مراد لے سکتے ہیں۔ گرانجانی۔ جانکا دوبھر ہونا۔ مصادر فارسیہ کا استعمال اُردو میں ناگوار ہوتا ہے مگر ان کے ہمعصر بھی استعمال کرتے تھے۔ مع عطف و اضافہ ایسا ناگوار نہیں جیسا کہ بلا عطف و اضافہ چاہے کوئی نظم کرے۔
ان سے اس بات کی بھی امید نہیں کہ وہ شیشہ دل کو توڑ کے پھینک دیں کہ اسی طرح سہی مصیبت سے تو نجات مل جاتی۔ کوئی کہاں تک بار کوہ غم اس دل ناتوان پر اٹھاتا رہے۔ یا کہاں تک کوئی اظہار غم ان سے کرتا رہے اور وہ کچھ نہ سنیں۔

میکدہ گر چشم مست ناز سے پائے شکست　　موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

اس کی چشم سے جو مست مے ناز ہے میکدہ کو شکست ہو جائے تو بعید کیا ہے۔ سب اس کے میکدۂ چشم مست ناز کی شراب سے مست ہوں گے اور میکدہ میں کوئی نہ جائے گا۔ اور شیشہ ساغر میں جو بال ہیں وہ دیدۂ ساغر میں کار مژگان کرے گا۔ تاکہ پوری آنکھ بن کر شکست میکدہ۔ یا میکدہ چشم مست ناز کو بدیدۂ حیرت دیکھے۔

خط عارض نے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد　　یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

خط عارض۔ ریش (ڈاڑھی) اور خط بمعنی تحریر بھی ہے۔ اور اُردو میں بمعنی مکتوب مستعمل ہے۔ یک قلم۔ بالکل۔ سراسر۔ کنپٹی پر کے بالوں کو جبکہ کچھ حصہ داڑھی کے بالوں کا شریک کرکے باقی رکھا جائے تو انہیں اُردو میں قلمیں کہتے ہیں۔ عارض۔ رخسار جن میں بزمانہ پیری دانت گر جانے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں فارسی میں پلہ اور الوار کہتے ہیں۔ اور عذار کلّہ کا وہ حصہ جو اُبھرا کنپٹی اور آنکھ کے پاس ان سے کسی قدر نیچے ہوتا ہے۔
یہ داڑھی نہیں ہے بلکہ اس نے زلف محبوب کو ایک عہد نامہ لکھ کر دیا ہے کہ وہ (زلف) جس قدر بھی دل عشاق کو (بکھر کے) پریشان کرے ہمیں سب منظور ہے اور ہم بھی اس کے شریک ہیں یا ہمیں پریشان کرے۔
ساری غزل تصنع بے لطف سے پر ہے۔

غزل ۶۳ اشعار ۵

۵۰۶ وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

ولے ۔ مگر کے جو تے ہوئے (ولے) لائے ۔ استعمال الفاظ فارسی سے مجبور ہیں ۔

جاگتے میں ان کے آنے کی تو امید نہیں ۔ لیکن اتنی امید ابھی باقی ہے کہ میرے خواب میں آکر وہ میری بے قراری میں مجھے تسکین ضرور دے گا ۔ مگر اضطراب دلی کی وجہ سے نیند تو آتی نہیں پھر وہ خواب میں بھی کیسے آئے ۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ پہلے مصرع میں (تو) امکان کے لئے ہے ۔ اور مصرع ثانی میں خواب کو مہتم بالشان کرنے کے لئے ہے ۔ یعنی خواب کا آنا ہی بڑی بات ہے ۔

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

لگاوٹ ۔ اختلاط ۔ آب ۔ جوہر ۔ برش ۔

اختلاط میں جو تم رو دیتے ہو اس سے تمہاری تیغ نگاہ میں اور قابلیت برش بڑھ جاتی ہے اور تیرا یہ رو دینا مجھے مارے ڈالتا ہے ۔ اس طرح کی آب تیغ نگہ کو کون دے سکتا ہے ۔ کوئی آب دے کے دکھائے تو جانیں ۔

دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

کہیں کے معنی وضعی اگرچہ (کوئی جگہ) کے ہیں ۔ مگر یہ معنی مقصود اس محل پر نہیں بلکہ بول چال اسی طرح ہے ۔ یا ۔ (کوئی نہ کوئی) معنی لیں ۔ یا ۔ "کچھ کہیں تو" معنی کیے جائیں یعنی کچھ نہ کچھ جواب تو دیں ۔

جناب نظم نے (کوئی نہ کوئی) معنی لکھے ۔ جناب آسی نے ان کی مخالفت اپنے اوپر لازم کر لی ہے ۔ لہٰذا لکھتے ہیں "کہیں ۔ کہیں کے معنی پر ہے" بھلا اس عبارت کے کیا معنی ہوئے اور کوئی کیا سمجھے ۔ یہ اتنا تو سمجھتے نہیں کہ ہم لکھتے کیا ہیں ۔ دوسرے معنی وضعی اس کے کوئی نہ کوئی جگہ کے ہیں ۔ کیا یہ معنی مقصود ہیں ۔

حضرت عیسیٰ اپنی جنبش لفظ سے مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے تم مسیحا ہو کر بوسہ دے کے ہمیں زندہ اور خوش کرنا نہیں چاہتے ہو تو ذرا لب ہلا کے منہ سے کوئی جواب تو دو چاہے وہ انکار ہی کیوں نہ ہو ۔ اور اس انکار سے ہمارا کام ہی تمام کر دو ۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ مصرع ثانی میں پہلا (تو) حرف جزا لئے شرط ہے ۔ اور دوسرا (تو) جواب میں اہتمام اور تاکید پیدا کرنے کے لئے ہے ۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے  پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اوک ۔ دونوں ہاتھ ملاکے کہ اس میں ظرفیت بھی ہو۔ ایک ہاتھ میں یہی بات ہو تو اسے چلو کہتے ہیں۔ اوک میں سمائی چلو سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے خواہش زیادتی شراب پائی جاتی ہے۔

اے ساقی اگر ہم سے نفرت ہے اور ہمیں نجس سمجھ کے ہم کو اپنا پیالہ نہیں دینا چاہتا ہے تو نہ دے اوک سے پلا دے۔ بہر صورت شراب تو دے۔ اس کے دینے میں تو بخل نہ کر۔

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے  کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

تو (فورس) کے لئے ہے۔ اور یوں ہی بولتے ہیں۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ الف تعدیہ علامت مصدر (نا) سے پہلے صیغہ امر میں بڑھانے سے بنتا ہے۔ مگر کبھی صیغہ امر کے درمیان بھی آجاتا ہے جیسے دابنا۔ سنبھالنا۔ نکالنا۔ وغیرہ۔ شعر بد مذاق ہے۔

محبوب نے جو مجھ سے یہ کہا کہ ذرا میرے پاؤں داب تو دے تو مارے خوشی کے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کیوں کہ اس نے کبھی میری طرف ادنیٰ توجہ بھی نہ کی اور ذلیل خدمت بھی نہ لی۔ (از خرس موئے بس است)۔

---

غزل ۶۴  اشعار ۶

تپش سے میری وقف کشمکش ہر تار بستر ہے  مرا سر رنج بالیں ہے مرا تن بار بستر ہے

میرے تڑپنے سے ہر تار بستر اینچا تانی میں پڑا ہوا ہے۔ تکیہ کے لئے میرا سر اور بستر کے لئے میرا جسم عذاب و آفت ہو رہا ہے۔

سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے  دل بیدست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

نور العین اور برخوردار = بیٹے کو کہتے ہیں۔ مستفید۔ بیدست و پا = عاجز اور لاچار۔

کسے را سر بطرف چیزے دادن = اس کو کسی طرف روانہ کر دینا۔ یعنی آنسو جو سیل ہو کر صحرا کی طرف بہہ گئے ہیں۔

آنسو جو بصورت سیلاب صحرا کی طرف بہہ گئے ہیں وہ میرے دامن کے نور العین ہیں۔ اور دل جو عاجز اور لاچار ہے۔

وہ مستفید (فرزند) بستر ہے۔ یعنی رویا کرتا ہوں اور بستر پر پڑا رہتا ہوں۔

خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے ہو  فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

خوشا میں الف بمعنی است ہے اور بعض کے نزدیک بمعنی بسیار ہے۔ تم آئے ہو سے (وہ آئے ہیں) بہتر ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کا ایسا شخص جس سے امید آنے کی کسی طرح نہ تھی وہ آئے ہیں۔ طالع بیدار = جاگتا ہوا نصیب اس کے مقابل میں طالع خفتہ بولتے ہیں۔ رنجور = بیمار۔ بستر کی بیداری طالع دکھانے کا کیا فائدہ۔ محل تو چاہتا ہے کہ خوش بختی بیمار کا اظہار کیا جائے۔ مثل اس کے ؎

عروج اختر خوش بختی بیمار بستر ہے

یا یوں پڑھو ؎

عروج اختر و خوش بختی بیمار بستر ہے

چار اضافتیں ہوگئیں اس لئے ایسی مضمون کو کسی اور طرح نظم کیا جائے۔

بالفاظ موجودہ جناب نظم یوں رقم طراز ہیں کہ بیمار کے سرھانے شمع جلانے کا دستور شاعروں میں مشہور ہے۔ اور شمع کی صفات میں سے بیداری بھی ہے۔ تو کہتے ہیں کیا اچھی یہ بیماری ہے کہ تم میرے دیکھنے کو آئے۔ اب شمع بالیں کو میں اپنا طالع بیدار سمجھتا ہوں کہ بستر مرض پر گرنے سے نصیبہ چمکا۔

ہو سکتا ہے کہ شمع بالیں سے استعارۃً محبوب مراد ہو۔ یعنی اس بیماری کی خوش اقبالی کا کیا کہنا کہ تمہارا ایسا آدمی بیمار پرسی کے لئے آیا۔ تمہاری ذات انور بستر کے لئے طالع بیدار ہے۔ یہ شمع بالیں نہیں ہے بلکہ بستر کا چمکتا ہوا طالع بیدار ہے۔ یا طالع بیدار شمع بالیں ہو رہا ہے۔

معانی میری تجویز کے موافق۔ اس بیماری کی اقبال مندی کا کیا کہنا کہ ان کا ایسا شخص اس بیماری کی وجہ سے عیادت اور بیمار پرسی کے لئے آیا۔ مجھ بیمار بستری کی قسمت کا ستارہ کس قدر عروج پر ہے۔

بطوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی  شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

پہلے مصرع میں چار اضافتیں ہیں۔ اردو میں توالی اضافات ثقیل ہوتی ہے۔ تین کو اساتذہ نے جائز قرار دے لیا ہے۔

شام فراق میں جو اضطراب کا جوش ہے اس کے طوفان گاہ میں تار بستر صبح محشر کے آفتاب کا شعاع ہے۔ اضطراب اور کھلبلی کی مناسبت سے صبح محشر لائے کہ اس دن بھی سب کو سخت اضطراب ہوگا۔ اور تار بستر کو بوجہ سپیدی شعاع

اجتناب کیا۔ اور شام تنہائی کو تاریک مانتے ہیں۔ طوفان گاہ اور جوش اضطراب کا حاصل تقریباً ایک ہے کیوں کہ دونوں سے کثرت اضطراب مقصود ہے۔ اس لئے مصرع اول مثل اس کے ہو تو بہتر ہوگا ؎

شب فرقت میں جوش اضطراب وظلمت شب کو

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلف مشکیں کی ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

جناب نظم فرماتے ہیں کہ (اس کی زلف مشکین کی) دو (کی) کی وجہ سے ثقل پیدا ہو گیا ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس سے اجتناب بہتر ہے ؎

ابھی آتی ہے بو بالش اس گیسوئے مشکیں کی

لفظ (دید) بھی اردو میں غیر مانوس ہے ؎

میرے دیدار کو خواب زلیخا عار بستر ہے

زلیخا نے یوسف کو خواب میں دیکھا اور عاشق ہوگئی۔ لیکن ہم کو تو اس کا وصال حاصل تھا چنانچہ اس کی زلف عنبر کی خوشبو ابھی تک میرے تکیہ سے آرہی ہے۔ لہٰذا کہاں ہمارا دیدار اور کہاں زلیخا کا صرف خواب میں دیکھنا۔ اس کا خواب میں دیکھنا تو میرے لئے عار بستر ہے جبکہ مجھے وصال حاصل ہے۔

گو بستر کے مناسبات لفظی۔ بالش۔ خواب موجود ہیں مگر بلحاظ معنی قافیہ بستر بے کار ہے۔ صرف اتنا کافی ہوتا ہے کہ خواب زلیخا تو میرے لئے عار ہے۔

کہوں کیا دل کی حالت ہے ہجر یار میں غالبؔ کہ بیتابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

اے غالبؔ مفارقت یار میں میرے دل کی کیا حالت ہے اسے کیسے بیان کروں۔ جس پر گذرتی ہے وہی خوب جانتا ہے۔ مختصر یہ بات ہے کہ ہر تار بستر میرے لئے خار بستر ہے۔ یعنی ہجر یار میں کانٹوں پر لوٹ رہا ہوں۔

بیتابی = عدم تحمل۔ اس سے زیادہ وضاحت یوں ہوتی ہے ؎

تڑپنے میں مجھے ہر تار بستر خار بستر ہے

---

غزل ۶۵ اشعار ۲

داغ ۲ خطر ہے رشتۂ الفت رگ گردن نہ ہو جائے غرور دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

رگ گردن ۔ فارسی میں بمعنی غرور ہے۔ خطر = اندیشہ۔ خوف۔ خطرہ۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ (یہ) کا حذف اس محل پر برا معلوم ہوتا ہے ؎

یہ ڈر ہے رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے

جناب نظم ۔معشوق سے خطاب ہے کہ میری دوستی و محبت پر تجھے غضب کا غرور ہوا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دشمنی کی طرف منجر نہ ہو جائے۔ اور یہ رشتہ الفت رگ گردن نہ بن جائے یعنی ایسا نہ ہو کہ غرور میں آ کر دشمن کی طرح ہمیشہ مجھ سے تمہاری گردن ٹیڑھی ہی رہے۔

جناب حسرت ۔ رگ گردن بحالت غیظ و غرور پھول جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کو میری دوستی پر اس درجہ اعتماد و غرور ہے کہ مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے۔ یعنی محبت مبدل بہ دشمنی نہ ہو جائے۔

شاید آخری جملہ سے تفسیر مصرع ثانی کی مقصود ہے۔ نہ اس جملہ کی کہ اس کو ڈر ہے کہ کہیں رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے۔

جناب آسی کہتے ہیں کہ رگ گردن بمعنی شہ رگ ہے۔ یعنی یہ ڈر ہے کہ یہ رشتہ الفت جو تجھ میں اور مجھ میں کمال کو پہنچ گیا ہے کہیں یہ رشتہ میرے لئے شہ رگ نہ بن جائے۔ اور اس کا مجھے غرور نہ ہو جائے کہ اس کے عتاب اور سزا میں تو میرا دشمن ہو کر اس رشتہ کو قطع کر دے اور اس سے میری گردن پر چھری چل جائے۔

یہ کبھی کچھ سمجھ کے نہیں کہتے۔ الفاظ شعر اور طرز ادا سے انھیں کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اور اپنا ذاتی خیال لکھ مارتے ہیں ان سے کوئی پوچھے کہ رشتۂ الفت کے شہ رگ بن جانے پر غرور کس بات کا۔ دور رگے سے تیسر رگے ہونے میں غرور کی کون سی بات ہو گئی۔ پھر جب گردن معنی شہ رگ مان لئے تو اب غرور کس کے معنی ہوں گے۔ پھر لکھتے ہیں کہ رگ گردن چوں کہ غرور کو بھی کہتے ہیں۔ اس واسطے اس لفظ نے دھوکا دے کر مولانا نظم کو یہ معنی بیان کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو مناسب مقام نہیں معلوم ہوتے۔ اور حسب ذیل ان کے معانی پر اعتراضات کرتے ہیں۔

جناب نظم ۔معشوق سے خطاب ہے کہ میری دوستی اور محبت پر مجھے غضب کا غرور ہے۔

جناب آسی کا اعتراض ۔ یہ امر خلاف واقع ہے۔ معشوق کو عاشق کی دوستی پہ غرور نہیں ہوتا۔

شادان ۔ غرور۔ استغنا۔ لاپروائی۔ ایشیائی شاعری میں صفات معشوق قرار دئے ہیں۔ یہ فرماتے ہیں کہ معشوق کو عاشق کی دوستی پر غرور نہیں ہوتا ہے۔

ہر شخص کے کان میں شیطان نے ۔"ہم چو من دیگرے نیست" پھونک دیا ہے۔ بڑی دانش مندی یہ ہے کہ اس مادہ خود پسندی کو ظاہر نہ ہونے دے۔ خوبی کوئی جو نہیں ہوتی ہے اسے انسان اپنے میں تجویز کر لیتا ہے چہ جائیکہ جسے حسن بے لاثانی شاعری میں مانا اور جس کی عاشق دنیا بھر ہو اور اسے غرور نہ ہو۔

جناب نظم۔ ایسا نہ ہو کہ دشمنی کی طرف منجر ہو جائے۔

جناب آسی۔ کوئی وجہ نہیں ہے۔

شاداں۔ وجہ وہی غرور ہے کہ عاشق کیوں وفاداری اور جان نثاری جتاتا ہے اس کے لیے سینکڑوں عاشق ہمارے موجود ہیں۔ فخر کس بات پر ہے۔ فخار سے یوں ہی بغض للّٰہی ہوتا ہے۔

جناب نظم۔ اور یہ رشتۂ الفت تیرے لئے رگ گردن نہ ہو جائے۔ اور رگ گردن غرور کو کہتے ہیں۔

جناب آسی۔ حالاں کہ پہلے فرما چکے ہیں کہ میری محبت اور دوستی پر مجھے غضب کا غرور ہو، ہے۔ معلوم نہیں دوبارہ غرور کب ـــ

شاداں۔ رگ گردن یعنی غرور۔ اور پھر غرور دوستی شعر میں خود دو مرتبہ غرور کا ذکر ہے۔

جناب نظم۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ غرور میں اکثر دشمن کی طرح ہمیشہ مجھ سے تیری گردن ٹیڑھی رہے۔

جناب آسی۔ یہ تیسری مرتبہ وہی کلمے دوہرا دئے ہیں۔

شاداں۔ یہ تفسیر اور نتیجہ اس دشمنی اور غرور کا دکھایا ہے۔ پہلے تو صرف مطلب کی مخالفت کیا کرتے تھے یہاں تحریر پر بھی معترض ہیں۔

جناب آسی۔ مولانا نے معلوم نہیں کیا خیال کیا کہ انھیں معانی کو تین مرتبہ دوہرا دیا۔ اور پھر بھی چول نہ بیٹھی۔ شعر کے الفاظ بالکل اس مضمون کے خلاف ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولانا حسرت صاحب کے یہاں بھی یہی معنی ہیں۔

جو شخص الفاظ اشعار سے تمسک نہ کر کے خیالی معانی لکھتا ہو وہ یہ کہے کہ شعر کے الفاظ اس مضمون کے بالکل خلاف ہیں۔ اور چول بھی نہ بیٹھی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ان سے کوئی پوچھے کہ رگ گردن کے معنی نہ رگ کے تم نے کون سی چول بٹھا دی بلکہ شعر کو مہمل بنا دیا۔

اذا نطق السفیہ فلا تجبہ　　　　　فخیر من اجابتہ السکوت

میں نے ان جہلات کو لکھ کر فضول کاغذ کو تباہ کیا۔

جو معانی جناب نظم نے تحریر فرمائے ہیں وہ بالکل درست اور بجا ہیں۔

مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ میرا رشتۂ الفت جو تیرے ساتھ ہے کہیں مجھے اس پر غرور نہ پیدا ہو جائے کہ ہم بھی ایسے ہیں کہ ان ایسے شخص سے محبت کرتے ہیں۔ غرور کرنے والے سے ہر شخص کو بغض للّٰہی ہوتا ہے۔ لہٰذا میرا یہ غرور دوستی پر تم کو میری دشمنی پر نہ آمادہ کر دے تو غضب ہی ہو جائے۔ اس معنی کے ساتھ بجائے (تو) وہ ہو تو اچھا ہے۔

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالبؔ — اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

نشو و نما۔ نشأ و پیدا شدن۔ و بلند شدن و ظاہر گردیدن نبات۔ نما بفتح اول مشتق از نمو زیادہ اور کثیر ہونا۔ بلند ہونا۔ حجم جسم۔ اقطار ثلاثہ میں بالنسبۃ بڑھنا۔ دونوں ملا کے بمعنی بالیدگی۔

اگر گلاب کے پھول بڑھ کے قد سرو پر چھا کے اس کے لئے کرتہ نہ بن جائیں تو اس فصل بہار کے نشو و نما و بالیدگی کی کوتاہی سمجھو۔ جناب نظمؔ اس کی مدح فرماتے ہیں کہ مبالغہ غیر عادی نہیں اور نقشہ جو کھینچا ہے وہ بھی نادر و بدیع۔ لیکن مجھے حاصل شعر سے کوئی لطف نہ آیا۔ جو میرے مذاق شعری کے نہ ہونے پر دال ہے۔

---

غزل ۶۶ — اشعار ۷

۵۶ب — فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابندِ نے نہیں ہے

ایقاع اردو لے۔ انگریزی HARMONIC CADENCES وہ آواز ممتد جس کے زمانۂ اجزا کی ابتدا سے اعتبار کیا جاتا ہے اس کو نقرہ یا فرصہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ نے۔ بانسری FLUTE۔ قافیہ لے مناسب غزل نہ تھا مگر خوب تغزل میں لے آئے۔

فریاد کے لئے کسی لے (ایقاع و نغمہ و آہنگ) کی ضرورت نہیں۔ برخلاف موسیقی کہ جب تک اس میں لے نہ ہو خوش آیند نہیں ہوتا۔ اور اثر نہیں کرتا۔ مگر فریاد جب دل سے نکلے تو موثر ہوتی ہے۔ وہ پابند لے اور نے نہیں۔

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے — گر باغ گدائے مے نہیں ہے

تونبا۔ تونبی۔ ایک قسم کی لوکی جس سے کاسۂ گدائی اور ظرف شراب بناتے اور ستار اور بین میں بھی کام کرتے ہیں۔

باغ ضرور گدائے مے ہے۔ جبھی تو باغبان تونبے بوتے ہیں کہ اس سے کشکول گدائی بنے اور باغ شراب بھیک مانگ کے پئے۔ بالکل مہمل شعر ہے۔ باغ کا بھیک مانگ کر شراب پینا یہ بات ہی کیا ہوئی۔ اور تصنع محض ہے۔

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے — پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

سی حرف تشبیہ اردو کا ہے۔ آسا اور سا۔ اور سان فارسی میں حروف تشبیہ ہیں۔

اصل وزن اس بحر کا مفعولُ مفاعلن فعولن ہے۔ اور بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف ہے۔ اس مصرع ثانی کا وزن بوجہ زحاف تسکین اوسط مفعولن فاعلن فعولن ہوگا۔ اگرچہ یہ زحاف عربی کا ہے مگر فارسی اور اردو میں بے تامل مستعمل ہے۔ تصوف کا شعر ہے اور مسئلہ وحدت وجود کو کہنا چاہتے ہیں۔

باوجودیکہ ہر شئے میں تیرا ہی ظہور ہے مگر شیونات ہونے کی وجہ سے کوئی شئے تیری مثل ونظیر نہیں ہے۔ تجھ سی کی (ی) باقی رکھو اور کوئی کی پڑھنے میں حذف کر دو۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے

ہم سے سنو۔ اپنے وجود ہستی کا دھوکا کبھی نہ کھانا۔ موجود تو سوا خدا کے اور کوئی ذات نہیں۔ لاکھ کوئی کہے کہ دیگر اشیاء کی بھی ہستی ہے کبھی نہ ماننا ہر گز نہیں ہے۔ اس دھوکے میں اگر آگئے تو مقصود اصلی وصول الی اللہ سے محروم جاوید ہو جاؤ گے۔

شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے اردی جو نہیں تو دے نہیں ہے

اردی بہشت فارسی میں بہار کا مہینہ ہے۔ اور دے۔ خزان کا۔ دوسرا مصرع تمثیل ہے۔ شادی وعیش کا متمنی نہ ہو تو پھر کبھی غم بھی پاس نہ آئے گا۔ کیوں کہ راحت کے بعد غم ہی ہوا کرتا ہے۔ جس طرح بہار اگر نہ ہو تو خزاں بھی نہ آئے۔

کیوں رد قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

رد قدح۔ جام مے کے لینے سے انکار۔ یا۔ مذمت وتردید شراب۔ قے مگس۔ کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی جو پھولوں کا رس چوستی ہے اسے تھوڑی دیر کے بعد قے کر دیتی ہے اسی کا نام شہد ہے۔

زاہد جام شراب لینے سے انکار کیوں کرتا ہے۔ یہ تو شراب ہے مکھی کی قے نہیں ہے۔ قے (شہد) سے نفرت ہونا چاہئے۔ نہ کہ شراب سے۔

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے۔ غالبؔ آخر تو کیا ہے "اے نہیں ہے"

اس غزل میں ردیف "نہیں ہے" نہیں ہے "ہے۔ اس کثرت نہیں ہے سے غالبؔ نے اپنا نام ہی شوخی و ظرافت سے نہیں ہے۔ رکھ لیا۔

اے غالب تم کہتے ہو کہ ہستی بھی کچھ نہیں کیوں کہ ہستی واجب کی ایسی نہیں۔ اور عدم محض بھی نہیں کیوں کہ بہر طور ہستی کا نام تو ہے۔ ممتنع تو نہیں۔ تو پھر اے میاں "نہیں ہے" اتنا تو بتاؤ کہ تم آخر ہو کیا۔ ہستی کا نہ ہونا اس لیئے کہا کہ فلسفیین کا مانا ہوا مسئلہ الوجود بین العدمین عدم ہے۔

---

غزل ۶۷ اشعار ۲

۱۰۷ع نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

ریزہ کنی (سودہ) بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ مرہم میں ادویہ پسی ہوئی کپڑ چھان کر ڈالتے ہیں۔ مگر ہیرے کی کنی مشہور ہے اس کا ترجمہ ریزہ کر لیا۔ الماس۔ مشہور تو یہ ہے کہ ماس فارسی زبان کا لفظ ہے۔ عربوں نے اس پر (الف لام) لازم کر لیا۔ جیسے (نجم) پر الف لام لازم کر کے ثریا کے معنی میں مخصوص کر لیا۔ رسالہ کا وہ جو فارسی زبان میں پہلے برلن دارالسلطنت جرمن سے ایک ایرانی نکالتے تھے اس میں اس لفظ کی تحقیق یوں لکھی تھی کہ یونانی زبان میں آداماس ہیرے کو کہتے ہیں۔ استعمال اس لفظ کا زمین مشرق میں قدیم سے پایا جاتا ہے۔ چنانچہ زبان پہلوی میں الماس اور الماست پایا جاتا ہے اس کی کنی اگر کھالی جائے تو احشار کے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

زخم دل کے مرہم کا نسخہ کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہے اس کے نسخہ کا جزو اعظم ہیرا ہے باقی اجزا نمک اور مشک ہیں اور یہ سب زخم کو بڑھانے والے ہوتے ہیں اور موذی بھی یعنی یہ زخم اچھا نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں ایذا ہونے ہی میں راحت ملتی ہے۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

مدت دراز سے تم میرے حق میں تغافل سے کام لیا کرتے تھے۔ ایک مدت کے بعد اس تغافل کا یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ میرے عشق صادق کی کشش سے وہ نگاہ غفلت گھٹتے گھٹتے نگاہ لطف و مہربانی کی طرف منجر ہوئی ہے اگرچہ اسے ابھی پورے طور سے نگاہ لطف نہیں کہہ سکتے۔

غفلت اور مہربانی اسی کے ساتھ برتی جاتی ہے۔ جس سے کوئی تعلق اور رشناسائی ہو۔ جس سے کسی قسم کا تعلق نہ ہو تو لطف و قہر کو اس کے ساتھ کچھ دخل نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر تغافل کا بڑھتے رہنا تجویز کریں تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ نظر تغافل جس کو نظر التفات سے کم درجہ حاصل تھا۔ اب نظر تغافل بڑھتے بڑھتے نظر بیگانگی کی حد تک پہنچ گئی۔

میں نے نہ معلوم کیا کب دیا لہٰذا اپنے دونوں معتمد علیہ کے معنی لکھے دیتا ہوں۔

جناب نظم۔ بڑا حسن اس شعر کا یہ ہے کہ معشوق کے تغافل کی تصویر دکھا دی۔ دوسرا لطف یہ ہے ایک نگاہ

یں ایسی تفصیل کہ نگاہ اور نگاہ سے کم ہونا۔ علاوہ اس کے ایک لطیفہ بھی ہے کہ نگاہ سے نگہ کم ہے کیوں کہ نگاہ میں ایک الف) نگہ سے زیادہ ہے۔

جناب حسرت۔ پہلے تغافل نادانستہ تھا یعنی بربنائے بیگانگی تھا لیکن اب دانستہ ہے جس کو درحقیقت التفات نا چاہئے۔ اگرچہ بظاہر ہم اس کو ایسا نہ کہہ سکیں۔

---

غزل ۶۸ — اشعار ۳

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے — مرتے ہیں و لے ان کی تمنا نہیں کرتے — ۸۰ وغ

یہ مگر کو چھوڑ کے (و لے) ہی لاتے ہیں۔

جس طرح کوئی کنگنک (لئیم) اپنی نعمتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتا اسی طرح یہ مرے جاتے ہیں مگر ان کے دیکھنے کی نا نہیں کرتے۔ خود اپنی ذات پر ان کو رشک آتا ہے اس رشک کی کوئی انتہا ہے۔

اس رشک کے مضمون کو کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے — میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

تکلف بر طرف نظارگی میں بھی سہی لیکن — وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربط نہانی — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

اگرچہ شریعت میں ہر جوان عورت کو ہر ایسے شخص سے پردہ کرنا چاہئے جس سے نکاح ہو سکتا ہو۔ مگر ہندوستان مسلمانوں میں رواج یہ ہے کہ قریب کے رشتہ داروں سے جس سے کہ نکاح ہو سکتا ہے پردہ نہیں کرتے۔ مگر جب نسبت جائے تو بیاہ تک پردہ کرانے لگتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلق کے ہوتے ہوئے پردہ کیا جاتا ہے۔ اور بے تعلق عدم ارتباط میں پردہ کی ضرورت نہیں۔

ظاہری ربط و ضبط پر پردہ نہ کرنے کا پردہ ڈال رکھا ہے کہ ہمیں غیر سے کوئی تعلق نہیں مگر حقیقۃً یہ پردہ نہ کرنا کا ان کے غیر سے ربط نہانی ہونے پر دال ہے۔

جناب نظم۔ ان کا مجھ پر یہ ظاہر کرنا کہ فلاں سے ہم پردہ نہیں کرتے۔ یہ ظاہر کا پردہ ہے۔ درحقیقت اس سے ربط نہانی ہے۔ ورنہ پردہ نہ کرنے کا کیا باعث۔ دوسرا پہلو پردہ نہ کرنے کا یہ ہے کہ اخفا نہیں کرتے۔ یعنی کسی بات چھپانے کی ہمیں عادت نہیں۔

جناب حسرت۔ وہ جو غیر سے بے تکلف ملتے ہیں اس سے غرض یہ ہے کہ لوگوں کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ ان کا رقیب کے ساتھ کوئی خاص تعلق بھی ہے۔ گویا ان کا پردہ نہ کرنا ایک پردہ ٹھہرا جس سے غیر کے ساتھ ان کے ربط نہاں کا راز پوشیدہ رہتا ہے۔ یہ وہی مضمون ہے کہ ؎

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی　　منھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

یہ باعث نومیدی ارباب ہوس ہے　　غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

جب تم غالب ایسے جان نثار وفادار کو برا بھلا کہتے ہو تو رقیب بوالہوس کو تم سے کسی خوبی کی کیا امید ہوگی۔ یہ فعل تمہارا غالب کو برا کہنے کا کوئی اچھا فعل نہیں ہے۔

رقیب کا ذکر کر کے صرف محبوب کو بہلانا مقصود ہے۔ رقیب کی دوستی مطلوب نہیں۔ بلکہ اپنے کو برا کہنے سے روکنا چاہتے ہیں۔

---

غزل ۶۹　　اشعار ۴

بکرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ　　خط پیالہ سراسر نگاہ گلچیں ہے

میرے نزدیک رنگ اور فروغ کے درمیان (واو) عاطفہ ہونا چاہیئے۔

لب محبوب کو گل۔ اور خط جام کو نگاہ گلچیں بنایا ہے۔ اور لفظ سراسر برائے بیت ہے۔

اے محبوب تیرے لب سرخ سے شراب میں سرخی اور چمک حاصل کرتی ہے اس میں یہ دونوں صفات تیرے عکس لب سے ہیں۔ اور خطوط جام تار نگاہ گلچین ہیں جو تیرے گلہائے لب کی گلچینی کر رہے ہیں۔

کبھی تو اس دل شوریدہ کی بھی داد ملے　　کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے

شوریدہ = پریشان۔ ایک عمر = مدت دراز۔ حسرت پرست = تکیہ پر سر رکھ کے لیٹنے کی حسرت۔ یا بوجہ ناتوانی عالم حسرت و یاس میں سر تکیہ سے اٹھ نہیں سکتا۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ بجائے دل (سر) کہا ہوگا۔ بہت برمحل تجویز ہے۔ داد ملنا = حق ادا کرنا۔ اس کی مدح کرنا۔ مگر یہاں مراد دل کی تمنا کو پورا کرنا ہے۔

کبھی تو اس دل پریشان کی تمنا پوری کر دو۔ ایک مدت دراز سے سر تکیہ پر رکھے عالم حسرت و غم میں پڑا رہتا ہے یا تکیہ پر سر رکھنے کی اسے حسرت ہے۔

**بجا ہے گر نہ سُنے نالہائے بلبل زار ‏ ‏ ‏ ‏ کہ گوش گل نم شبنم سے پنبہ آگین ہے**

پنبہ در گوش ہونا۔ غفلت سے کام لینا۔ کسی کی بات نہ سننا اور نہ ماننا ؎

سنے وہ کس طرح سے نالہائے بلبل زار

نم کا لفظ برائے بیت ہے۔ اور گل کو کان کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔

گل کے کان میں تو شبنم کی روئی ٹھنسی ہوئی ہے پھر وہ بلبل زار و نزار کے نالے کیسے سنے۔ اور اس کا اثر لے۔

مراد یہ ہے کہ معشوق غفلت شعار ہوا کرتے ہیں ؎

کہ گوش گل تو شبنم سے پنبہ آگیں ہے

اصل وزن مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن ہے۔ بوجہ تسکین اوسط دوسرے رکن کی جگہ مفعولن ہوگا (تو) کے واو کو ظاہر کرکے پڑھو۔

**اسد ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا ‏ ‏ ‏ ‏ مقام ترک حجاب و وداع تمکین ہے**

مقام بفتح میم جائے قیام اسم ظرف مکان ہے۔ محل۔ جگہ۔

اسد حالت جان کندنی میں ہے ایسے وقت میں تو اس سے ملنے کو جاؤ (اللہ کو مان کے) اس کے بعد پھر کون سا محل اس سے ملنے کا ہوگا۔ اب یہ محل حجاب و شرم کو بالائے طاق رکھ دینے کا ہے اور وقار و تمکین سے کام لینے کا نہیں ہے۔

---

## غزل ۷۰ ‏ ‏ ‏ ‏ اشعار ۳

**کیوں نہ ہو چشم بتاں محو تغافل کیوں نہ ہو ‏ ‏ ‏ ‏ یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے**

کیوں نہ ہو۔ تکرار سے تاکید مقصود ہے۔ یعنی ضرور ہونا چاہئے۔ (یعنی) یہ وہی مجھے پریشان کرنے والا لفظ ہے۔ (کیوں کہ) اس کی جگہ لا سکتے ہیں۔ بیمار۔ چشم نیم باز معشوق کی صفات چشم میں سے ہے۔ کیوں کہ وہ پورے طور سے آنکھ کھول کے کسی طرف نہیں دیکھتے۔ اور بیمار کی آنکھ بوجہ ضعف پورے طور سے نہیں کھلتی۔ بیمار کے لیئے اطبار بحالت علاج کچھ چیزوں سے جو مضر بیمار ہوں پرہیز بھی تجویز کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ پرہیز کو نصف علاج بتاتے ہیں۔ الاحتماء نصف الدوا ان کا مقولہ ہے۔

چشم حسینان محو تغافل عشاق کی طرف ہے کیوں نہ ہو۔ اس چشم بیمار کو ناز و استغنا کے طبیب نے نظارہ سے پرہیز بتایا ہے۔

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی　　　　وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

ان کا دیدار میسر بھی ہوا تو اس طرح کہ قتل کرنے کے لیئے آئے ہیں۔ مگر میری ناکامی کو دیکھو کہ اس قاتل کا خنجر تیز ہے جلدی سے گلا کٹ جائے گا اور حسرت دیدار رہ جائیگی۔ اگر اس کا خنجر کند ہوتا تو ذبح ہونے میں دیر لگتی اور کچھ تو حسرت دیدار پوری ہوتی۔ اس ناکامی کا کوئی ٹھکانا ہے۔

عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد　　　　جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

دیکھ کی جگہ اب دیکھ کر یا دیکھ کے بولتے ہیں ؎

عارض گل دیکھ کر روئے نگار یاد آگیا

لفظ نگار سے کچھ خوبی میں اضافہ ہو جائے گا۔

رخسارۂ گل دیکھ کر چہرۂ محبوب کی یاد تازہ ہو گئی۔ یہ فصل بہار کا جوش بھی اشتیاق پیدا کرنے والا۔ اور شوق کو برانگیختہ کرنے والا ہے۔

---

غزل ۱۷　　　　اشعار ۹

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے　　　　ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہئے　　۱۰۱غ

اس کو یعنی محبوب کو جو معہود ذہنی ہے۔ بشر = انسان۔ اس سے مراد قاصد۔ نامہ بر = قاصد۔ پیغامبر فارسی کی مثل ہے۔ ایلچی راز والے نیست۔

نامہ بر میرا خط لے کر محبوب کے پاس گیا اور اس کا حسن دلآویز دیکھ کر اسے دل دے بیٹھا۔ اور میرا رقیب بن گیا۔ اس پر کیا الزام لگایا جائے۔ میرا دل سوز ہے۔ مگر ساتھ ہی انسان بھی ہے۔ دل رکھتا ہے اور اس کا حسن لاثانی جاذب قلوب۔ مجبور ہو گیا۔ مجبور معذور ہوتا ہے پھر اس سے مواخذہ کیا کیا جائے۔

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے　　　　قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے

اجل کو یہ ضد ہے کہ آج روز فراق میں نہ آئے گی حالاں کہ بن آئے نہیں رہ سکتی آئے اور پھر آئے آج کے دن اس کے

نہ آنے سے ہمیں اس سے کس حد کا شکوہ ہے اسے کیا کہوں۔ وہ تو بیان سے باہر ہے۔

جناب آسی نے اسی مضمون کا اپنا شعر لکھا ہے جس کا مصرع ثانی اس سے اچھا ہے۔

یوں تو آئیگی اجل ایک نہ اک دن آکر  مگر آتی شب فرقت تو مرے کام آتی

اگر نہ کہیئے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیئے  رہے ہے یوں گہ وبیگہ کہ کوئی دوست کو اب

گاہ وبیگاہ بمعنی صبح۔ بیگاہ بمعنی شام۔ گہ وبیگہ۔ جب نہ تب۔ وقت بے وقت۔

رقیب کو جب دیکھو کوچۂ یار ہی میں دکھائی دیتا ہے۔ پھر کوئے یار کو رقیب کا گھر نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔

کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیئے  زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب

کرشمہ بکسر کاف وفتح میم بروزن فرشتہ ناز وغمزہ و اشارہ بچشم وابرو۔

ان کے ناز وادا و اشارات نے ہمیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے جیسے کہ ہماری خستہ حالی کی ان کو خبر ہے جبھی تو لگاوٹ سے کام لے رہے ہیں اور کچھ کچھ مہربان ہوتے جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر کہے وہ میری حالت زار سے واقف ہیں اس لیئے درد دل سُنانے کی ہم نے ضرورت نہ سمجھی۔

آسی مصرع ثانی میں انھیں کی جگہ ہمیں بنا کر فریب میں رکھنے کا فاعل معشوق کو قرار دیتے ہیں۔ اس صورت میں لفظ کرشمہ اور کیا کہیئے دونوں شکل سے چسپاں ہوں گے۔

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال  کہ یہ کہے کہ سر رہ گذر ہے کیا کہیئے

معشوق کی شوخی اور عیاری کا بیان اچھے پہلو سے کر رہے ہیں۔ وہ اگر بازار میں مل جاتے ہیں تو جان بوجھ کے عیاری کے ساتھ میرے حال کو دریافت کرتے ہیں۔ محض اس لیئے کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ میں کہہ دوں گا کہ یہ تو سر بازار ہے یہاں اپنی حالت ہم تم سے کیا بیان کریں۔ تنہائی میں موقع دو تو کچھ کہہ بھی سکوں۔

حاصل یہ کہ انھیں سنا ہی کب منظور ہے۔

تمہیں نہیں ہے سر رشتہ وفا کا خیال  ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے۔ مگر ہے کیا۔ کہیئے

تم میری نسبت وفاداری کا مطلق خیال نہیں رکھتے ہو یعنی مجھے وفادار نہیں جانتے ہو مگر میرے ہاتھ میں کچھ ہے یعنی وفا ہے اور یقیناً ہے مگر تم سے کیا کہیں تم تو ماننے کے نہیں۔ مگر لغات میں اور استعمال فارسی میں بمعنی یقیناً بھی ہے۔

یہ کچھ ہے یعنی وفا ہے۔ مگر اس کا نام اس لیئے نہ لیا کہ محبوب وفا کو جانتا ہی نہیں۔
ہمارے ہاتھ میں یعنی قبضہ میں کچھ ہے (یعنی وفا ہے) مگر تم کو کیا بتائیں کہ وہ کیا ہے۔ کیوں کہ تم تو اس سے نا آشنائے محض ہو۔
میں تو کچھ سمجھا نہیں لہٰذا بنا بر عادت دونوں بزرگوں کے معانی لکھے دیتا ہوں۔ الفاظ مختلف ہیں دونوں کا مفہوم ایک ہے۔
جناب نظم۔ اس شعر کا انداز بندش بھی نیا اور مضمون بھی تازہ ہے۔ نازکی مضمون تو یہ ہے کہ سررشتہ وفا کو ایک محسوس شئے فرض کیا ہے۔ کہ معشوق سے پوچھتے ہیں کہ ہماری مٹھی میں بتاؤ کیا ہے۔ اور بندش کی جدت یہ ہے کہ پوچھتے بھی ہیں کہ مٹھی میں کیا ہے اور پھر جو چیز مٹھی میں ہے اس کا نام بھی کہہ دیا ہے۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر کیا ہے یہ تم بتاؤ کہ تم کو سررشتہ وفا کا خیال نہیں۔
نہیں کے ساتھ کہو ہونا چاہیئے تھا۔
جناب حسرت۔ محبوب سے پوچھتا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں کوئی چیز ہے بتائیے کہ وہ کیا ہے۔ پہلے مصرع میں اس شئے یعنی سررشتہ وفا کا نام بھی ظاہر کر دیا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ محبوب وفا سے اس درجہ بے گانہ ہے کہ بتا دینے پر بھی اس کو یہ نہ معلوم ہو سکے گا کہ ہمارے ہاتھ میں سررشتہ وفا ہے۔

انھیں سوال پہ زعم جنون ہے کیوں لڑیئے　　　ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیئے

زعم گمان حق و باطل ہر دو۔
میں جو کبھی کوئی تمنا کرتا ہوں تو وہ اسے میرے جنون پر محمول کرتے ہیں۔ جب ہم ان کی تردید نہیں کرنا چاہتے تو ہم ان سے جھگڑا کیوں کریں۔ اچھا جیسا وہ کہتے ہیں یوں ہی سہی۔

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجئے　　　ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیئے

بہا قیمت کیا کیجیے۔ کیا کہئے۔ عاجز آنے کے محل پر بولتے ہیں۔ متاع۔ ساز و سامان۔ مال۔ سزا۔ سزاوار۔ ہنر۔ کمال۔
کمال شاعری سزاوار حسد ہے۔ یعنی لوگوں کا حسد کرنا کمال سخن کی دلیل ہے۔ پھر کیا کہا جائے۔ سامان ہنر کی قیمت ستم ہی ہے۔ لہٰذا مجبوری ہے۔ اسی مفہوم کو دوسری طرح یوں فرماتے ہیں۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے　　　بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں۔ لیکن ‏ ‏ ‏ سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہئے

سوائے۔ جناب نظمؔ فرماتے ہیں کہ عربی میں (ماسوئی) ہے اہل فارس یائے اضافہ بڑھا کے معاف کر لیتے ہیں۔ اُردو میں لوگ مضاف الیہ اُردو کا لفظ بھی لاتے ہیں اور (کے) بھی بڑھا لیتے ہیں جیسا کہ خود اس شعر میں موجود ہے۔ اور کہتے ہیں۔ سوائے خدا کے ہمارا کون ہے۔ اور مع عیال کے روانہ ہوا۔ لیکن محتاط لوگ یوں بولتے ہیں۔ سوا خدا کے ہمارا کون ہے۔ مع عیال روانہ ہوا۔ آشفتہ سر۔ پریشان دماغ۔ اور سوائے کے معنی بجز۔ علاوہ اور غیر کے ہیں۔

جناب آسیؔ اگرچہ جناب نظمؔ کا نام نہیں لیتے ہیں مگر ان کے اس افادہ کی تردید یوں کرتے ہیں کہ عربی میں سوئی بمعنی زیادہ ہے۔ اور اردو میں سوائے بمعنی علاوہ مہند ہے۔ اور فارسی میں بھی یوں ہی ہے۔

اُردو ایک مرکب زبان ہے۔ اس میں سنسکرت۔ پراکرت اور فارسی کا مواد زیادہ ہے۔ اور متبع فارسی ہے۔ براسہ عربی سے الفاظ اُردو میں بہت کم آئے ہوں گے۔ لہٰذا (سوائے) بھی بوساطت فارسی اُردو میں آیا زیادہ کے معنی عربی۔ فارسی اور اردو میں سے کسی میں نہیں۔ اُردو میں (سوا) جس کے معنی زیادہ کے ہیں وہ بغیر (ی) کے ہے اور ہندی کا لفظ ہے۔ وہی عربی کے معنی بجز۔ علاوہ۔ غیر کے معنی تینوں زبانوں میں ہیں۔ اور حرف استثنا ہے۔

جناب آسیؔ کو جناب نظمؔ کے مخالفت میں کچھ لکھنا لازم ہے چاہے وہ ان سٹ اور انکل پچو ہی کیوں نہ ہو۔

بہ تتبع فارسی اردو میں الفاظ فارسی و عربی ذوات الف میں (یائے زائد) بڑھا لیتے ہیں۔ جیسے بخشائے بخشائے اور خدائے خدائے۔ ان میں (ی) برائے اضافہ نہیں ہے۔ اسی طرح سوائے میں بھی۔ اور جب مضاف کرتے ہیں تو یہ (ی)۔ برائے اضافہ ہوتی ہے ورنہ زائد۔

یہ کون کہتا ہے کہ غالبؔ برا نہیں اور میں بھی اس بات کا مدعی کب ہوں۔ صرف اتنی بات ہے کہ پریشان دماغ ہے۔ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ پریشان دماغی کی وجہ سے جو باتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں ان کی وجہ سے چاہے اسے برا کہو تو کہو۔ درحقیقت وہ برا نہیں ہے۔

---

غزل ۷۲ ‏ ‏ ‏ اشعار ۹

دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے ‏ ‏ ‏ کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے ‏ ‏ ‏ ۲۰۲ / ۹

گرم = مستعد و آمادہ۔ دامن از چیزے افشاندن = اس چیز کو ترک کر دینا۔ اس سے تجرد اختیار کرنا۔ اردو میں بھی۔ دامن جھاڑ کے بیٹھ رہنے کی معنی بھی یہی ہیں کہ کسی چیز کا پاس نہ رہنا۔ وابستہ = پابند —

عریانی ۔ برہنگی و تجرد۔

مجھ کو باطناً مستعد و آمادۂ تجرد و ترک تعلقات دیکھ کر عریانی نے مجھے پابند جسم و جسمانیات باقی رکھا اور خود چلتی بنی۔ میں تو جسم سے بھی تجرد کا خواہاں تھا تاکہ فنا ہو کر وصال دائمی محبوب سے حاصل ہوتا۔

بن گیا تیغ نگاہ یار کا سنگ فسان مرحبا میں۔ کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

فسان ۔ سان کرنڈ کو جما کر مثل سنگ ایک چرخ بنا لیتے ہیں اور اس پر ہتھیار وغیرہ پر باڑھ رکھتے ہیں۔

میں اپنی سخت جانی کی وجہ سے تیغ نگاہ یار کے لیئے سان بن گیا۔ میرا کیا کہنا ہے اور میری گرانجانی کیسی مبارک ہے جس نے تیغ نگاہ یار کو اور تیز کر دیا۔ اب جلدی سے گلا کٹ جائے گا اور تمام جھگڑوں سے نجات مل جائے گی۔

مرحبا ۔ رحب سے بمعنی وسعت و فراخی۔ اہلاً ۔ لوگ ۔ سہلاً ۔ زمین نرم و ہموار و سہولت و آسانی کسی کی آمد پر اظہار خوشی کے لیئے اور اخلاقاً ان الفاظ کو دہراتے ہیں۔ یعنی یہ مکان آنے والے کے لئے تنگ نہیں فراخ ہے۔ اور گویا اپنے لوگوں میں آگیا۔ اور اس کے لیئے ہر طرح کی تن آسانی ہے۔

کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے جانتا ہے محو پرسش ہائے پنہانی مجھے

خاطر جمع ہے ۔ دل جمعی اور اطمینان قلب حاصل ہے۔ پرسش پنہانی ۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ کبھی تصور میں اور کبھی خواب میں اگر صورت دکھانا مقصود ہے۔ مگر مطلب مصنف ان الفاظ سے واضح نہیں ہوتا۔

وہ بے التفاتی اور عدم توجہ سے کام کیوں نہ لے۔ وہ اس بات سے مطمئن الخاطر ہے کہ ہم تصور اور خیال میں تو مو آتے ہیں اور عاشق اتنے ہی میں محو ہے پھر بے التفاتی سے کیا ہرج ہے۔

میرے غم خانہ کی قسمت جب رقم ہونے لگی لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے

میرے غم کدہ کی قسمت کو جب کاتب تقدیر لکھنے بیٹھا تو اس نے خود مجھے اسباب ویرانی میں لکھ دیا۔ یعنی میں بھی ویرانی کے سامانوں میں سے ایک سامان ہوں۔ یا۔ میں خود اپنے کو عشق کر کے برباد اور تباہ کرنے والا بنوں گا۔

بدگمان ہوتا ہے وہ کافر۔ نہ ہوتا کاش کے اس قدر ذوق نوائے مرغ بستانی مجھے

نوا ۔ نغمہ ۔ چہچہہ ۔ مرغ بستانی ۔ بلبل ۔

میں جو بلبل پالتا ہوں اور اس کے نغمہائے نالہ زار بوجہ ہم پیشہ ہونے کے پسند ہیں وہ اس کی تعبیر یوں کرتا ہے

کہ میں عاشق بلبل ہوں اس پر وہ بدظن ہوتا ہے کہ میرا عاشق کسی دوسرے سے عشق کرے۔ کاش مجھے ذوق نغمہائے بلبل کے سننے کا نہ ہوتا تاکہ وہ بدگمان تو نہ ہوتا۔ اسی مفہوم کو دوسری طرح اس سے پہلے کہہ چکے ہیں۔

کیا بدگمان ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے　　طوطی کا عکس سمجھے ہے وہ زنگار دیکھ کر

## وائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا　　لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

واں۔ مراد قبر۔ گور۔ قبر۔ تن آسانی۔ راحت جسمانی۔

زندگی بھر تو کسی قسم کی راحت نصیب نہ ہوئی۔ مرنے کے بعد خیال تھا کہ راحت و اطمینان کا لطف اور مزہ ملے گا۔ مگر افسوس کہ شور وہنگامہ محشر نے وہاں بھی سکون۔ آرام اور چین سے نہ بیٹھنے دیا۔

## وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے　　تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

تم نے آنے کا وعدہ کیا تھا اسے پورا کیوں نہیں کرتے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تمہارے وعدہ کے بنا پر اپنے گھر پہ تمہارے انتظار میں دربانوں کی طرح بیٹھا رہتا ہوں۔ اور دروازہ پر نگاہ لگی رہتی ہے۔ اور تمہارا انتظار کیا کرتا ہوں۔ مگر تم کسی طرح آہی نہیں چکتے ہو۔ یہ کیا طریقہ تم نے اختیار کیا ہے۔

## ہاں نشاط آمد فصل بہاری واہ واہ　　پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

نشاط۔ خوشی۔ چستی۔ پھرتی۔

ہاں اے نشاط آمد فصل بہاری تیرا کیا کہنا ہے۔ مجھے اس فصل میں پھر جنون غزل خوانی پیدا ہوا ہے تو بھی جوش میں اضافہ کردے۔

## دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی　　میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسف ثانی مجھے

ثانی۔ دوسرا۔ اور بمعنی مثل ونظیر بھی آتا ہے۔ میرزا۔ مرزا۔ لغوی معنی امیر زادہ۔ علی العموم مغول کے معنی ہیں۔ زبان حال میں اسم سے پہلے کلرک کے معنی دیتا ہے اور بعد اسم شہزادہ کے معنی ہوتے ہیں۔ سید کے لیئے کلمہ تعظیم آقا۔ اور غیر سید کے لیئے ( ریخ ) یعنی آغا قبل اسم لاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے میرے بھائی میرزا یوسف کو بیماری سے شفا دے کر دوبارہ زندگی عطا فرمائی مرزا یوسف اپنے حسن و جمال کی وجہ سے میرے لیئے بمنزلہ یوسف ثانی ہے۔

## غزل ۷۳ — اشعار ۵

**یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے — سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے** ۱ ۲۵

یارب ۔ اے پروردگار۔ فارسی میں بمعنی فریاد بے دہائی ہے مستعمل ہے۔ راحت و آرام و خوشی میں لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں۔ اور رنج و غم میں خدا یاد آتا ہے۔ ہنگامہ ۔ جوش و خروش و معرکہ۔ سبحہ ۔ تسبیح۔ سبحان اللہ کہنا۔

میں خوشی میں دوسرے لوگوں کی طرح خدا کو نہیں بھولا ہوں۔ یارب یارب کی رٹ لگاتا رہتا ہوں اور اس کی دھن لگی رہتی ہے۔ خوشی میں جو مسکراہٹ میرے لبوں پر آتی ہے وہ زاہدوں کے ذکر خفی کی تسبیح ہے۔

**ہے کشاد خاطر وابستہ در رہن سخن — تھا طلسم قفل ابجد خانۂ مکتب مجھے**

قفل ابجد کی تشریح لکھ چکا ہوں۔ (الف بے) عربی کی ترتیب کئی طرح سے کی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ خط کے موجد حضرت ادریس ہیں۔ عربی کی ایک پرانی مثل ہے۔ انما خدش الخدوش انوش۔ حانوش حضرت ادریس کا نام ہے اور اخنوخ بھی ان کو کہتے ہیں۔ (جز ابن نیست کہ نقش کرد مکتوب را حضرت ادریس) پھر اہل جفر نے ان حروف ابجدی کو کئی طرف سے ترتیب دیا۔ ایک ابجدی ہے جس سے اعداد جمل نکالتے ہیں۔ دوسرے ابتثی (ا۔ ب۔ ت۔ ث) یہی زیادہ تر رائج ہے۔ تیسرے ایقغی اس میں اس ترتیب سے حروف جمع کئے ہیں (۱+۱۰+۱۰۰+۱۰۰۰ ا۔ ی۔ ق۔ غ) (۲+۲۰+۲۰۰ ب۔ ک۔ ر) (۳+۳۰+۳۰۰ ج۔ ل۔ ش) وغیرہ۔

یہ عجیب بات ہے کہ یوروپ کی زبانوں میں بھی کچھ کچھ ترتیب ابجدی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ انگریزی الف بے کی پہلی سطر A.B.C.D میں علاوہ (C) کے ابجد کی شکل پائی جاتی ہے۔ K.L.M.N تو پورا پورا کلمہ کلمن ہے۔ اسی طرح Q.R.S.T بھی پورا پورا قرشت ہے۔ مگر مجھے پتا نہ لگا کہ کس نے کس سے اخذ کیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامی زبانوں سے حامی میں لیا گیا ہے۔

کشاد = کشایش۔ بستگی کی ضد۔ وابستہ = پابند۔ بازبستہ۔ رہن = گرو۔ کشاد کا لفظ طلسم کے بھی مناسب ہے۔ مکتب = جائے تعلیم۔ طلسم = یونانی زبان کا لفظ ہے اور عربی میں دخیل ہے۔ خطوط اور نقوش جنھیں ساحر استعمال کرتا ہے کہ جن کے ذریعہ سے دفع مضر و موذی اپنے خیال میں کرتا ہے۔ مکتب اگرچہ خود ظرف مکان ہے مگر پھر بھی اس پر (خانہ) بڑھا لیا۔ ایسے تصرفات ہوا ہی کرتے ہیں۔

میری بستگی خاطر کی کشایش کلام اور شعر کی پابند ہے۔ کیوں کہ ابتدائے تعلیم ہی میں میرا مکتب میرے لیے بمنزلۂ طلسم قفل ابجد تھا۔ جس طرح کہ قفل ابجد معین کلمہ (لفظ معین) کے بننے سے کھل جاتا ہے اسی طرح میری خاطر وابستہ کشایش شعر و سخن سے ہوتی ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس شعر میں تعدد اضافات اتنا ناگوار نہیں۔ جتنا کہ (در رہن سخن) ناگوار ہے۔ مگر اہل فارس اسی طرح فارسی میں عربی کو ٹھونستے ہیں۔ حافظ شیراز ایسے افصح الشعرا فرماتے ہیں۔

برجان لایموت چو آں بادشاہ را | دیر آن چنان کز د عمل خیر لا یفوت
جانش غریق رحمت حق کرد تا کند | تاریخ ایں معاملہ رحمان لایموت

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہئے | رشک آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

یارب یہاں پر کلمۂ تعجب ہے۔ آشفتگی۔ پریشانی۔
میں اپنی پریشانی خاطر کی داد کس سے چاہوں۔ میری نسبت سے تو جیل خانہ والے بہت آرام میں ہیں حتیٰ کہ مجھے ان کی زندگی بار احت پر رشک آتا ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ چاہئے کے معنی مانگئے ہیں۔ اور اب سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ جب زندان میں تو شوق صحرا نوردی تھا۔ اب صحرا میں ہوں تو اہل زندان پر رشک ہے۔

طبع ہے مشتاق لذت ہائے حرماں کیا کروں | آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

حسرت اصل میں یہی لفظ ہے میرے قلم سے (حرمان) نکل گیا۔ عربی میں اس کے معنی شدۃ ندامت کے ہیں۔ اور کبھی تلہف (افسوس) بھی۔ اردو اور فارسی میں وہ تمنا جس کے پورے ہونے کی آرزو نہ ہو۔ غالبؔ نے کبھی یاس و حرمان استعمال کیا ہے۔ مطلب مجھے = میرا مطلب ہے۔ یا۔ مجھے مطلوب ہے۔ چاہئے۔ مگر پہلے اس طرح بھی بولتے ہیں۔
میری طبیعت تو مشتاق یاس و حرمان ہے اور مجھے اسی میں مزہ آتا ہے۔ میں کیا کروں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ یہ جو میں آرزو کرتا ہوں اس سے آرزو کا پورا ہونا مقصود نہیں ہوتا ہے بلکہ شکست آرزو میرا مطلب و مقصد ہوتا ہے۔

جو مزہ ہجر میں ملا مجھ کو | نہ کبھی وصل یار میں پایا

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے | عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

صاحب کون نہیں جانتا کہ حا حطی اس لفظ میں مکسور ہے مگر بول چال کے موافق بفتح (ح) نظم فرمایا۔ جس طرح حضرت

مومن نے لفظ شمر بسکون میم کو بفتح میم نظم فرمایا (دل رکھے شمر کا سا)۔ آپ بھی۔ خود بھی۔

میرزا صاحب یعنی غالب مجھے عشق کرنے سے بہت روکا کرتے تھے۔ مگر خود کسی سے عشق کر کے میرے لیے ہو گئے۔

میرزا صاحب بطور طعن کہا ہے۔

خیر صاحب تو بفتح (حا) بول چال کے موافق نظم کر دیا مگر لفظ (نیّر) بکسر یائے مشدد ہے اسے فارسی اشعار میں قوافی

اختر و دل پروا خگر میں لائے ہیں۔

نامہ بناز دخویش کز اثر فیض مدح — نقطہ زبس روشنی تابش نیر گرفت

یہ لفظ کا فر بفتح کی طرح عام نہیں ہوا ہے۔ معدن بھی بکسر دال ہے اسے بھی گلشن وغیرہ کے قوانی میں لائے ہیں۔ صائب نے بھی اس لفظ کو بفتح دال نظم کیا ہے مگر یہ قابل استناد نہیں ہو سکتے۔ حرکت توجیہ کے اختلاف کو عیب اقوا کہتے ہیں۔

---

غزل ۴۷ — اشعار ۱۰

۱۔ بیج — چمن میں خوشنوایان چمن کی آزمایش ہے — حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمایش ہے

حضور شاہ۔ آخری بادشاہ دہلی کے سامنے جو اکبر ثانی بھی کہلاتے تھے۔ چمن سے مراد دربار ظفر شاہ۔ اہل سخن۔ خوش نوایان چمن سے مراد وہ شعرا جو اس مشاعرہ میں شریک تھے۔

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے — قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمایش ہے

قد و گیسو کی مناسبت سے دار و رسن مصرع ثانی میں لائے۔ ورنہ مجنون و فرہاد کے ساتھ ان کی خصوصیت نہیں عاشق معشوق کی ہر بات کا عاشق ہوا کرتا ہے۔ جہاں سے مراد یہ ہے کہ جس ذات سے ہم عشق کرتے ہیں وہ تو سولی اور پھانسی سے عشاق کا امتحان لیتا ہے کہ کون ایسی مصیبت میں مبتلا ہو کر ثابت قدم رہتا ہے۔ قد و گیسو میں، عشق قد و گیسو میں۔

کریں گے کوہکن کے حوصلہ کا امتحاں آخر — ہنوز اس خستہ کی نیروئے تن کی آزمایش ہے

نیروے بکسر نون قوت و طاقت۔

فرہاد جب تک کہ کوہ بیستوں کو کاٹ رہا ہے اس وقت تک تو اس کی قوت جسمانی کی آزمایش ہے آخر میں اس کے حوصلہ اور ہمت کی آزمایش ہوگی کہ پیرزال جب خبر مرگ شیریں سنائے گی۔ اور وہ سر میں تیشہ مار کے مرجائے گا اور اس سے بڑھ کے امتحان عشق میں کون سا مرتبہ ہوگا کہ جان نثار کر دے اور تحمل فراق دائمی نہ کر سکے۔

مومن نے لفظ شمر بسکون میم کو بفتح میم نظم فرمایا (دل رکھے شمر کا سا)۔ آپ بھی - خود بھی۔

میرزا صاحب یعنی غالب مجھے عشق کرنے سے بہت روکا کرتے تھے۔ مگر خود کسی سے عشق کر کے میرے ایسے ہو گئے۔

میرزا صاحب بطور طعن کہا ہے۔

خیر صاحب تو بفتح (حا) بول چال کے موافق نظم کر دیا مگر لفظ (نیّر) بکسر یائے مشدد ہے اسے فارسی اشعار میں قوافی

اختر و دل بر و اخگر میں لاتے ہیں۔

نامہ بناز دحمویش کز اثر فیض مدح　　نقطہ زبس روشنی تابش نیر گرفت

یہ لفظ کا فر بفتح کی طرح عام نہیں ہوا ہے۔ معدن بھی بکسر دال ہے اسے بھی گلشن وغیرہ کے قوافی میں لائے ہیں۔ صائب نے

بھی اس لفظ کو بفتح دال نظم کیا ہے مگر یہ قابل استناد نہیں ہو سکتے۔ حرکت توجیہ کے اختلاف کو عیب اقوا کہتے ہیں۔

---

غزل ۴۷　　اشعار ۱۰

۴-بہج　حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمایش ہے　　چمن میں خوشنوایان چمن کی آزمایش ہے

حضور شاہ۔ آخری بادشاہ دہلی کے سامنے جو اکبر ثانی بھی کہلاتے تھے۔ چمن سے مراد دربار ظفر شاہ۔ اہل سخن۔

خوش نوایان چمن سے مراد وہ شعرا جو اس مشاعرہ میں شریک تھے۔

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمایش ہے　　جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے

قد و گیسو کی مناسبت سے دار و رسن مصرع ثانی میں لائے۔ ورنہ مجنون و فرہاد کے ساتھ ان کی خصوصیت نہیں

عاشق معشوق کی ہر بات کا عاشق ہوا کرتا ہے۔ جہاں سے مراد یہ ہے کہ جس ذات سے ہم عشق کرتے ہیں وہ تو سولی اور

پھانسی سے عشاق کا امتحان لیتا ہے کہ کون ایسی مصیبت میں مبتلا ہو کر ثابت قدم رہتا ہے۔ قد و گیسو میں، عشق قد و گیسو میں۔

کریں گے کوہکن کے حوصلہ کا امتحان آخر　　ہنوز اس خستہ کی نیروے تن کی آزمایش ہے

نیروے بکسر نون قوت و طاقت۔

فرہاد جب تک کہ کوہ بیستون کو کاٹ رہا ہے اس وقت تک تو اس کی قوت جسمانی کی آزمایش ہے آخر میں اس

کے حوصلہ اور ہمت کی آزمایش ہوگی کہ پیرزال جب خبر مرگ شیریں سنائے گی۔ اور وہ سر میں تیشہ مار کے مر جائے گا اور

اس سے بڑھ کے امتحان عشق میں کون سا مرتبہ ہو گا کہ جان نثار کر دے اور تحمل فراق دائمی نہ کر سکے۔

کی چشکی کی قوت بہر طور آزمانا مقصود ہے۔
غرض کے عربی میں نشانہ کے بھی معنی ہیں۔ اس معنی کے ساتھ ابہام تناسب ہے اور بلطف خوبی واقع ہوا ہے
ممکن ہے کہ جناب غالب یہ لفظ بالارادہ نہ لائے ہوں۔

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندوں میں گیرائی    وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمایش ہے

گیرائی = پھنساؤ کشش۔ جذب۔ گرفتاری تسبیح کے مقابلہ میں (مالا۔ زنار سے اچھا ہوگا) ۔ نہیں کچھ سبحہ اور مالے الخ
نہ تو شیخ کی تسبیح میں کچھ رکھا ہے اور نہ برہمن کے جنیو میں کچھ دھرا ہے۔ فقط یہ دیکھنا ہے کہ یہ دونوں اپنی دھن میں
کتنے پکے ہیں۔

پڑا رہ اے دل وابستہ بیتابی سے کیا حاصل    مگر پھر تاب زلف پرشکن کی آزمایش ہے

وابستہ = گرفتار زلف۔ پابند عشق۔ تاب = طاقت۔ قوت۔ زور۔ بیتابی = عدم تحمل۔ اضطراب۔ بے قراری۔
تڑپنا۔ مگر = اور پھر یہ دونوں الفاظ میری سمجھ میں نہ آئے۔ دوبارہ آزمایش کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی ؎
اُسے جب تاب زلف پرشکن کی آزمایش ہے
یا ؎
اُسے منظور زلف پرشکن کی آزمایش ہے
یا ؎
غرض جب تاب زلف پرشکن کی آزمایش ہے
اگر دوبارہ کہنا ہی ضروری ہے۔ تب بھی لفظ (مگر) کچھ اچھے معنی نہیں دے رہا ہے۔ اسے نکال ڈالا جائے ۔ انھیں پھر الخ
جب انھیں دوبارہ اپنی زلف پرشکن کی قوت آزمانا مقصود ہے تو اے دل تو چپکا پڑا رہ۔ تیرے تڑپنے سے تو
کوئی نتیجہ نکلنے کا نہیں اس کی زلف پرپیچ سے رہائی ناممکن ہے بلکہ ممکن ہے کہ اس کے پھندے اور کس جائیں۔ پھر اضطراب
کا حاصل اور فائدہ کیا۔

رگ و پے میں جب اُترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو    ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمایش ہے

پے = عصب۔ پٹھا۔
ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔ اس میں جو مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں وہ ایسی ہیں جیسے کوئی زہر کھائے اور اس کا اثر منھ تک رہے

ب یہ زہر غم گلے سے اتر کے سارے جسم میں سرایت کر جائے گا اس وقت دیکھنا ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ تو ابھی سے گھبرایا جاتا ہے۔ اس وقت کیا کرے گا۔ اور کیسے متحمل ہوگا۔

وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا دیکھنا غالب نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

نئے اور کہن میں صنعت تضاد ہے (وہ۔ اور۔ میرے) کو ذرا زور دے کے پڑھو۔
وہ اور میرے گھر آئیں گے۔ یہ کب ہو سکتا ہے۔ وعدہ کا انھیں کب پاس رہتا ہے۔ اے غالب دیکھنا کہ ان کے آنے سے یہ چرخ کہن کیسے کیسے اور نئے فتنے اٹھاتا ہے اور کن کن مصیبتوں میں ڈالتا ہے۔
جناب حسرت۔ نیا فتنہ یعنی ان کے آنے کا فتنہ۔ بس اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کی۔ وہ آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ وعدہ کا کیا ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ مگر اے غالب دیکھنا یہ ہے کہ آکر کیسے کیسے نئے فتنے برپا کرتے ہیں جواب تک آسمان بھی وہ فتنے نہ اٹھا سکا اپنی فتنہ انگیزی اور آسمان کی فتنہ انگیزی کو آکر انھیں آزمانا ہے۔ یعنی آنے سے انھیں مقصود اور زیادہ ستانا ہے۔ کہ جتنا اب تک آسمان بھی نہ ستا سکا۔

---

غزل ۷۵ اشعار ۸

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے ۵ بیغ

مجھ سے عجیب طرح سے لائے ہیں۔ شاید میرے حق میں معنی کہنا چاہتے ہیں۔ نیکی سے مراد مجھ سے ملنا۔
کبھی اگر ان کے دل میں میرے ساتھ بھلائی کرنے کا خیال بھی آجاتا ہے تو اپنی پہلی جفائیں یاد کر کے مجھ سے شرما جاتے ہیں۔ اور وہ نیکی نہیں کر سکتے۔ اسی مفہوم کو پہلے یوں ادا کیا ہے ؎

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

اس شعر کا پہلا مصرع یوں ہونا چاہئے ؎

جور سے باز آئے پر باز آئے کیا مطلع بنانے کے لئے اس طرح کہہ ڈالا۔

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

جذبہ۔ کشش۔ کھینچنا۔ اپنی طرف مائل وراغب کرنا۔ کھینچنا۔ تننا۔ اکڑنا۔ آزردہ و خفا ہونا۔
اے اللہ یہ کیا بات ہے کہ میری کشش دل اُلٹی تاثیر پیدا کرتی ہے۔ کیوں کہ میں جتنا بھی انھیں اپنی طرف مائل و

راغب کرتا ہوں اتنا ہی وہ تنتے اور اکڑتے جاتے ہیں۔

وہ بدخواور میری داستان عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

عبارت مختصر۔ الغرض۔ قصہ کوتاہ۔ الحاصل۔ مختصر طولانی کا مقابل۔

وہ معشوق بدخصلت اور تند مزاج ہے اور میرا قصہ و غم عشق بہت لانبا چوڑا وہ تو وہ قاصد تک میری طولانی داستان سے گھبرا جاتا ہے ایک پنواڑا ہے کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا۔ تو پھر وہ تند خو ہو کر اسے کیسے سنیں گے۔

اُدھر وہ بدگمانی ہے۔ اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

وہ اور یہ دونوں اظہار کثرت کے لئے ہیں۔

وہ مجھ سے حد سوء ظن رکھتا ہے۔ اور میں غم عشق سے از حد ضعیف اور کم زور ہو رہا ہوں جسے وہ سمجھتا ہے کہ کسی دوسرے کے غم عشق سے میں ناتوان ہو رہا ہوں۔ اس بدگمانی کی وجہ سے میری پرسش حال نہیں کرتے۔ اور میں ناتوانی کے سبب سے اظہار حال نہیں کرسکتا۔ عجب مخمصہ میں جان ہے۔ کچھ بنائے نہیں بنتی۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

اے ناامیدی و یاس اتنا حوصلہ پست نہ کر ذرا دم لینے دے اور کچھ تو امید بندھا۔ یہ کیا اندھیر ہے کہ تیری وجہ سے خیال یار کا دامن میرے دل کے ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ یعنی بوجہ یاس تصور و خیال یار بھی دل سے نکلا جاتا ہے اور آیندہ ہمت غم عشق اٹھانے کی نہیں ہوتی ہے۔

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے۔ کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

نظارگی: بانے نسبتی نظارہ کرنے والا۔ مصدری بتکلف بن سکتی ہے۔

تکلف بالائے طاق رکھ کر بلا رد و رعایت میں یہ کہتا ہوں۔ مان لیا کہ دیکھنے والوں میں چاہے میں بھی ہوں مگر اس کو اغیار (رقیب) بھی دیکھیں رشک کے مارے یہ ظلم مجھ سے دیکھا جاتا ہے۔ یا اپنے ہی اوپر رشک آتا ہے۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

عشق کے ساتھ جنگ و مقابلہ میں سب سے پہلے پاؤں ہی زخمی ہو گئے۔ کیوں کہ عشق ہوتے ہی عشق مرتبہ جنون پر تھا۔

صحرا نوردی نے پاؤں میں چھالے ڈال دیئے تھے۔ لہٰذا مقابلہ عشق میں نہ توشبات و استقلال سے کام لے سکتا ہوں اس لئے کہ اس کے شدائد اٹھانے کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا ہوں۔ بھاگ کے اپنی جان بچاؤں تو پاؤں کے زخم بھاگنے نہیں دیتے۔ ایک جز اختیار کر کے اسے ترک کیا کریں۔ اور اسے چھوڑنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ اس سے پہلے بھی فرما چکے ہیں ؎

نے بھاگنے کی گو        نہ اقامت کی تاب ہے

دو گونہ رنج و عذابست جان مجنون را        ؎

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ        وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

اے غالبؔ کتنے اندھیر کی بات ہے کہ جس کافر کو رخصت ہوتے وقت میں اسے خدا کے سپرد بھی رشک کے مارے نہیں کر سکتا یعنی یہ نہیں کہہ سکتا۔ اچھا جاؤ تمہیں خدا کو سونپا تو وہ مدعی (رقیب) کا ہم سفر ہو۔

جناب آسی لکھتے ہیں کہ غالبؔ نے اس مضمون کو نہایت بے تکلفی سے ادا کیا۔ جس میں شوخی اور گستاخی پائی جاتی ہے اور ادب کے خلاف مگر جناب عارفؔ نے نہایت ادب کے ساتھ اسی مطلب کو ادا کیا ؎

نہ خداوند کو گر پاک و منزہ سمجھوں        کب گوارا ہے مجھے تجھ پہ نگہبان کرنا

افادہ۔ جناب نظم۔ فرماتے ہیں کہ مصنف نے اس شعر میں جس محل پر (نہ) کہا ہے۔ یہاں (نہیں) کہنا چاہئے تھا یا (ہے) کو ترک کیا ہوتا۔ کیوں کہ فعل منفی میں (ہے) بولنا خلاف محاورہ ہے۔ مثلاً مارے ضعف کے نہ بولا جاتا ہے۔ غلط ہے۔ (نہیں بولا جاتا ہے) صحیح ہے۔ ہاں جہاں (نہ) برائے عطف ہو وہاں (ہے) کے ساتھ جمع کرنا درست ہے ؎

نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے مجھ سے

اور نہیں بولا جائے ہے مجھ سے۔ نہیں پوچھا جائے ہے اس سے غلط ہے۔ نہ کے ساتھ ہے کا جمع کرنا اس سبب سے غلط ہے کہ ایسے مقام پر (نہیں) محاورہ میں ہے اور (نہیں) (نہ اور ہے) فعل ناقص سے مرکب ہے۔ اور نہیں کے ساتھ جب (ہے) بولتے ہیں تو وہ فعل تام ہوتا ہے۔

---

غزل ۷۶        اشعار ۴

زبسکہ مشق تماشا جنون علامت ہے        کشاد و بست مژہ سیلی ندامت ہے        ۷۶غ/۱

جنون علامت۔ بترکیب قلب علامت جنون۔ ندامت۔ پشیمانی۔ پچھتاوا۔ تماشائے دنیا میں انہماک اور مصروف رہنا چوں کہ علامت جنون اور بے ہودگی ہے لہٰذا پلکوں کا کھلنا اور بند ہونا ندامت کے تماچے ہیں۔

جناب آسی فرماتے ہیں کہ غالب نے شعر بیدل کا ترجمہ کیا مگر بیدل نے غالب سے بہتر کہا ہے ؎
حا

دیدہ را کہ بنظارۂ دل محرم نیست مژہ برہم زدن آز دست ندامت کم نیست

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغ طعن بدعہدی تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

کیوں کہ ۔ کیوں کر ۔ کس طرح ۔ اب اس معنی میں مستعمل نہیں ہے ۔ بدعہدی ۔ سے مراد دوسروں کو دکھانے کے لیئے زینت کرنا ۔ ورطہ ۔ محل ہلاکت ۔ مجازاً معنی بھنور ہو سکتے ہیں ۔ آب آئینہ کی وجہ سے تو ورطہ بنالو ۔ مگر ورطہ ملامت کہنے میں وجہ جامع کیا ہوگی ۔ اور آئینہ کا ورطۂ ملامت ہونا محض ادعا ہے ۔ (کہ) کی جگہ (تو) ہونا چاہئے ۔ (باعث ملامت) صاف الفاظ ہیں ۔ کیوں کہ عاشق صادق کو چھوڑ کے رقیبوں کے لئے زینت کرتے ہو ۔
تمہاری بدعہدی اور بے وفائی کے طعن و طنز کا دھبا میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم سے کیسے چھٹے گا جبکہ آئینہ تک تمہارے لیئے ملامت کا بھنور ہے پھر بھی بدعہدی سے باز نہیں آتے ۔ اور غیروں کے لیئے زینت کرنا نہیں چھوڑتے ۔

بہ پیچ و تاب ہوس سلک عافیت مت توڑ نگاہ عجز سر رشتۂ سلامت ہے

نگاہ عجز ۔ عاجزی اور انکسار کی نظر ۔ حرص و ہوس کا تقابل نگاہ سیر کو چاہتا ہے نہ عجز کو ۔ ؎
نگاہ سیر سر رشتۂ سلامت ہے
حرص و ہوس کی الجھنوں میں پڑ کے اپنے راحت و آرام میں خلل نہ ڈالو سلامتی تو نگاہ سیر اور قانع میں ہے ۔
القناعۃ کنز لا یفنی ۔

؎ نگاہ قانع سر رشتہ سلامت ہے

(سر) پر اضافت نہ دو اصل وزن مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن ہے ۔ فعلاتن بحرکت عین میں تین متحرک ہیں ۔ عین کو تسکین اوسط سے ساکن کیا تو (وزن) وزن مانوس مفعولن ہو جائے گا اور پورے مصرع کا وزن مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلن ہوگا ۔

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

وفاداری عشق میں عاشق کے لیئے سامنے کی چیز ہے وہ تو نہ ہو مگر دعوٰی بے اصل و کاذب عشق کا ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ فصل بہار تو ہو مگر جنون بناوٹ کا ہو ۔ یہ تو ستم ہے (رقیب پر طعن ہے) ۔ وفا ۔ مقابل وفا کا تو دشمن ہے یعنی وفا

پاس نہیں ہے۔ لیکن دونوں بزرگ اس کے معنی "محبوب آمادۂ وفا ہو" تحریر فرماتے ہیں۔ اس صورت میں وفا سے زید عدل کی طرح مبالغۃً وفادار مراد ہوگی اور وفادار سے محبوب مقصود ہوگا۔

---

غزل ۷۷ اشعار ۴

مطلع لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

لاغری میں مبالغہ ہے۔ خواجۂ زیر شاگرد ناسخ نے تو سے

کبھو تو لیٹ رہوں ایک تار بستر پر

کہہ کر کچھ تو اپنا وجود باقی رکھا تھا۔ انھوں نے تو اپنے آپ کو معدوم ہی کر دیا۔ دیکھ کر = غور سے دیکھنے کے بعد بھی۔ اسی بہانے سے لے پھسلا کر بزم میں رسائی چاہتے ہیں۔ جا دے = کسی قدر ناگوار طبع سلیم ہے۔ مگر قافیہ مجبور کر رہا ہے۔

• غم عشق اٹھاتے اٹھاتے میں اتنا لاغر و نحیف ہو گیا ہوں کہ اگر تو مجھے اپنی بزم میں آنے دے تو کوئی غور سے دیکھنے کے بعد بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں بزم میں ہوں۔ پھر کسی طرح کا کوئی الزام تمہیں کیا دے سکتا ہے۔ معنی بلا ضرورت بھی لکھ دئے۔

منھ نہ دکھلاوے نہ دکھلا۔ پر باندازِ عتاب کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

آنکھ دکھانا۔ آنکھیں نکالنا = غصہ کرنا۔ اظہار غضب کرنا۔ خفا ہونا۔ عتاب = غضب۔ وہ لوم جس سے اعراض میں اضافہ ہو۔ لوم۔ پردہ = مراد نقاب۔ دکھلانا = دیکھنا کا متعدی۔ دکھانا اور دکھلانا شاید دونوں ہیں۔ یا دکھلانا متعدی المتعدی ہے بہر طور اب اس محل پر دکھانے بولتے ہیں۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ غصہ کرنے کے معنی ہیں آنکھ دکھانا بصیغۂ واحد آنکھیں دکھانے بصیغۂ جمع سے فصیح ہے۔

اس سے لطف و کرم کی تو امید نہیں۔ لہٰذا منھ نہیں دکھاتا ہے تو نہ دکھائے بہر طور ذرا نقاب کھسکا کر اظہار غضب میں اپنی آنکھیں ہی دکھا دے۔ اس سے بھی کچھ لگاؤ تو پایا جائے گا۔ نہ مہر ہو اور نہ قہر یہ تو مطلق بیگانگی پر دال ہے۔

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم واں تلک کوئی کسی حیلہ سے پہنچا دے مجھے

اس سے آنے کی تو امید نہیں۔ خود جانے کی طاقت نہیں۔ لہٰذا کوئی کسی تدبیر سے اس تک مجھے پہنچا دے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر میری حالت زار دیکھ کر اسے مجھ پر رحم آجائے۔

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں          زلف گر بن جاؤں تو شانہ میں اُلجھا دے مجھے

وہ میری گرفتاری سے اس حد تک خوش ہے کہ اگر میں زلف بھی بن جاؤں جو باعث زینت محبوب ہوتی ہے تو اسے بھی کنگھی میں الجھا دے۔ (تصنع بے لطف ہے)۔

---

غزل ۷۸          اشعار ۱۴

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے          ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

دنیا کے واقعات و حوادث میرے سامنے بچوں کے کھیل ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت میری نظر میں نہیں اور میں ان سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتا ہوں۔ کل واقعات دنیوی میری نظر میں کھیل تماشے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے آگے          اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

اورنگ = تخت اہل تفسیر اس کی بساط کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ اک بات = معمولی اور حقیر بات (اک) تحقیر کے لیئے ہے۔ مسیحا = مترادف مسیح ہے۔ اور الف زیادہ ہے۔ کبھی ندا کے لیئے بھی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اصطباغ (بپتسمہ) کی وجہ سے یہ نام ہوا کیوں کہ شریعت عیسوی میں چلو میں پانی لے کر۔ اس پر باپ بیٹا اور روح القدس پڑھ کے اس پانی پر پھونک کے وہ پانی عیسائی مذہب قبول کرنے والے کے سر پر مل دیتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ تبلیغ اور وعظ کے لیئے زیادہ تر چلتے پھرتے رہتے تھے اس لیئے حضرت عیسٰی کا اسم صفت مسیح ہے۔ اعجاز = ایسا فعل خارق العادہ جس کے کرنے سے مقابلہ میں معجز نما کے لوگ عاجز ہوں مگر اُسی زمانہ کے۔ یہ ضروری نہیں کہ بعد کے لوگ اسی کو یا مثل اس کے نہ کر سکیں۔ یہ مطلع پہلے مطلع کی تفسیر ہے۔

تخت سلیمانی جو صبح کو چل کے ایک مہینہ کے فاصلہ کو۔ اور شام کو چل کے ایک مہینہ کے فاصلہ کو طے کر لیتا تھا میرے نزدیک ایک کھیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اور قم باذن اللہ کہہ کے حضرت عیسٰی کا مردہ کو زندہ کرنا بھی میرے خیال میں ایک معمولی اور حقیر بات ہے۔ بڑا فاصلہ تخت سلیمانی نے طے کر لیا۔ یا حضرت عیسٰی نے مردہ کو زندہ کر دیا۔ یہ سب امور دنیوی ہیں جن سے مجھے کوئی تعلق نہیں۔ پہلے مصرع میں بھی آگے ہے جو ردیف کا دھوکا دیتا ہے اس سے احتراز بہتر ہے۔

مان لو کہ وقت صبح ایک گھنٹہ میں تخت سلیمانی چالیس پچاس میل طے کر لیتا تھا۔ اب تو (ایروپلین) طیارہ۔ بادپیما

ایک گھنٹے میں ہزار سوا ہزار میل کا فاصلہ طے کر لیتا ہے اور اب تو اتنی رفتار کے ہوائی جہاز نکل آئے ہیں جن کی قوت پرواز قیاس سے باہر ہے۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور     جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

منظور بمعنی مبصر و مرئی عربی میں نہیں اس سے پہلے بھی یہ لفظ اسی معنی میں کہہ چکے ہیں۔ اردو میں بھی یہ معنی نہیں۔ مان لیا جائے کہ نظر سے منظور وہ شئے جو دکھائی دے از روئے لغت ہے۔ مگر جب معنی اصطلاحی کو غلبہ ہو جائے اور معنی وضعی مہجور ہو جائیں تو معنی وضعی پر اس لفظ کو استعمال کرنا غیر مانوس اور غریب ہوتا ہے۔ اردو میں لفظ منظور معنی مطلوب و پسندیدہ و مرغوب ہو گیا ہے۔

## افادہ جناب نظم برائے استفادہ طلاب مگر مختصر کر کے

علاوہ ذات باری۔ موجودات میں نفوس و ملائک وغیرہ ہیں یا اجسام جسے ہم دیکھتے ہیں وہ صرف اعراض ہیں۔ اور اعراض کا وجود بغیر جسم کے پایا نہیں جاتا۔ ان کی ہستی جسم کے ضمن میں ہے۔ باتفاق فلاسفہ وصوفیہ عالم اجسام محسوس نہیں۔ صرف بعض اعراض محسوس ہیں۔ اس سے آگے چل کے فلاسفہ کہتے ہیں کہ اعراض کے لئے ایک قسم کی ہستی ہے گو وہ قائم بالغیر سہی۔ اور صوفیہ کہتے ہیں کہ یہ بھی محض اعتبارات اور اوہام ہیں کہ ذہن انتزاعات و اضافات کو بھی محسوس سمجھتا ہے۔ اور صوفیہ کہتے ہیں کہ جس قدر ہستی اعراض کے تم قائل ہوئے یہ بھی محض وہم ہے۔ ان کے نزدیک وحدت متحیر ہوئی اس سے نقطہ پیدا ہوا اور نقطہ کی حرکت سے خط اور خط سے سطح اور سطح کے تموج سے عالم اجسام ظاہر ہوا۔ اور اس قسم کا عالم محض وہمی ہے۔ امیر المومنین حضرت علی بھی فرماتے ہیں۔ العلم نقطة فكثرها الجاهلون۔

سوا نام کے عنقا کی طرح عالم کی ہستی تو مجھے دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ ہستی اشیا بجز وہم میرے نزدیک اور کچھ نہیں۔

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے     گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

صحرا میں بحالت جنون اس قدر خاک اُڑاتا ہوں کہ سارا صحرا اور اس کی فضا گرد آلود ہو جاتی ہے۔ اور سمندر بھی مجھ اشک بار کے سامنے بحالت عجز جبین نیاز خاک پر رگڑتا ہے کہ کہاں تک میری طغیانی کو بڑھاؤ گے کیا ساری دنیا کو طوفان نوح کی طرح غرق کر دو گے جبیں خاک پر گھسنے سے استعارہ موجوں کا ساحل سے ٹکرانا ہے۔ یا اشکوں سے طغیانی ہو کر جو آب دریا خشکی پر چڑھ آیا اسے جبین بر خاک سائیدن سے تعبیر کیا۔

جبین خاک پر گھسنے کی تاویل جناب نظم خاک پر سر پٹکنے اور زمین دریا نکل آنے کے ساتھ فرماتے ہیں۔ یا سیلاب

اشک آنکھوں سے زمین تک پہنچ جاتا ہے۔

جناب حسرتؔ۔ مرے آگے کے معنی مجھ اشک بار کے ہوتے، کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

جناب آسیؔ۔ دریا از عجز یا بوجہ تاثیر درد میرے سامنے خاک پر اپنا ماتھا رگڑتا ہے۔ یا یہ کہ میری اشک باری دیکھ کر وہ عاجز ہو جاتا ہے۔

چیستان تو ہے ہی اپنی اپنی سمجھ کے موافق ہر شخص تکے لڑاتا ہے۔ اچھی بری تاویل کو ناظرین جانیں۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے　　تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

اے کیا پوچھتے ہو کہ تمہاری جدائی اور مفارقت میں میری حالت کیا ہوئی ہوگی۔ بس اسی کو دیکھ لو کہ تم اگرچہ میرے سامنے بیٹھے ہو۔ مگر پھر بھی تمہارا کیا رنگ ہے۔ تمہاری فرقت میں بس مجھے خدا ہی یاد آتا تھا۔ خیر وہ وقت تو گذر گیا مگر اس بات کو تو دیکھو اگرچہ تم میرے سامنے ہو مگر وہی بے رخی۔ تیوریوں پر بل۔ منھ پھلائے ہوئے۔ نہ اختلاط ہے اور نہ ارتباط اپنے اس رنگ کو تو دیکھو۔ سامنے ہو کر بھی فرقت کی حالت سے بدتر حالت میری کر رکھی ہے۔

جناب نظمؔ۔ "تیرا مرے آگے" کی جگہ (میرا تیرے آگے) کہتے تو شعر کا حُسن بہت زیادہ ہو جاتا مگر ردیف کی مجبوری سے۔ الٹ دینا پڑا۔ موجودہ الفاظ کے ساتھ یہ معنی ہوں گے کہ تو اپنی بے اعتنائی یا حسن کو میری آنکھ سے دیکھو اور اسی پر قیاس کرتے کہ تیری مفارقت میں میرا کیا حال ہوتا ہوگا۔

جناب حسرتؔ۔ جس طرح تو میرے آگے کشمکش حیا اور شوخی کے ہاتھوں دل تنگ و مجبور ہو کر بیٹھا ہے اسی طرح میں تیرے پیچھے تنگ دل اور پریشان رہتا ہوں (حیا اور شوخی کے اثرات ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہیں لہٰذا اس محل پر صرف حیا کا ذکر کفایت کرتا ہے۔)

جناب آسیؔ۔ یہ کیا پوچھتا ہے کہ میرا حال تیرے پیچھے کیا رہتا ہے۔ بس بعینہٖ یہی کیفیت ہوتی ہے جو تیری حالت میرے سامنے ہوتی ہے کہ بے قرار۔ شرمایا ہوا رنجیدہ سا بیٹھا رہتا ہے۔ ایسا ہی میں بھی رہتا ہوں (یہ معانی جناب حسرت سے ماخوذ ہیں) یا یہ کہ تو اپنے حسن کو میرے سامنے ذرا دیکھ کہ تو کتنا حسین ہے اور پھر خیال کرلے کہ تیرے پیچھے میرا کیا حال ہونا چاہئے۔ (یہ معنی جناب نظم کے ہیں مگر مختصر کر کے ابہام پیدا کر دیا) ان بزرگ کی یہ عادت ہے کہ انھیں دونوں بزرگوں کے معانی بالفاظ دیگر لکھتے ہیں مگر حوالہ کبھی نہیں دیتے لیکن جبکہ معانی نظم پر اعتراض کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یا جب ان سے الگ جودت طبع دکھانا چاہتے ہیں تو ہمیشہ ٹپ جاتے ہیں۔ اور الفاظ سے تمسک نہ کر کے اپنے خیالی معانی لکھا کرتے ہیں۔

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں　　بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے

خود آرا بت آئینہ سیما کی وجہ سے لائے ورنہ یہ صفت عاشق کے لیئے اچھی نہیں۔ مثل اس کے ہو ؎

سچ کہتے ہو نازاں بھی ہوں خود بیں بھی، نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے

اس سے ملتے جلتے مضمون کو نظیری نے بھی خوب کہا ہے ؎

عشق بازیم بمعشوق مزاجی انداخت
کز نیازیم کہ با دوست مرا نازے ہست

معشوق جب عاشق سے ملا تو عاشق پھولوں نہیں سماتا تھا اس کے دوستوں نے کہا آج تو خوب اکڑتے پھرتے ہو۔ اس کے جواب میں عاشق کہتا ہے کہ تم میرے پھولنے اور اکڑنے کو سچ کہتے ہو میں کیوں کر نازاں اور خود بین نہ ہوں۔ ہونا ہی چاہئے۔ کیوں کہ وہ بت آئینہ سیما میرے سامنے بیٹھا ہے اس کے ایسے شخص کے ہوتے ہوئے کس کو فخر نہ ہوگا۔

بت ـ صنم۔ معشوق۔ آئینہ سیما۔ جس کی پیشانی آئینہ کی طرح ہو۔ خود بین ـ جو اپنے آپ کو عظمت کی نظر سے دیکھے۔

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

پیمانہ ـ جام یا خطوط (میژر) گل افشانی ـ پھول جھڑنا۔

ساغر و شراب سرخ رنگ انگوری کوئی میرے سامنے رکھ دے تو پھر دیکھو کیا بلبل کی طرح چہکتا ہوں۔

نفرت کا گماں گذرے ہے میں رشک سے گذرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

رشک تو مقتضی اسی کا ہے کہ دوسروں کی زبان پر ان کا نام تک نہ آئے۔ مگر ان کا نام بہت پیارا بھی لگتا ہے ان تک رسائی تو ہوتی نہیں۔ نام تو سننے میں آتا ہے۔ لہٰذا میں کسی کو ان کے نام لینے سے کیسے روکوں۔ میں ایسے رشک سے باز آیا۔

جناب آسی اسی مفہوم کا ایک شعر مومن خان کا لکھتے ہیں۔ بے شک غالب کے شعر سے بندش میں بہت چست ہے۔ ؎

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر اک بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

خالی "گذرا" نے (نہ گذرا) باز آیا۔ زیادہ بول چال میں ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

کلیسا ـ یونانی زبان کا لفظ ہے ηστα ϵKKλ عربی میں دخیل ہے۔ یونانی کے موافق ایرانی کلیسا

بھی نظم کرتے ہیں۔ پیچھے ہے ۔ پیچھے پڑتا ہے۔ پشت پناہ ہے۔ آگے ہے ۔ پیش نظر ہے۔ اس کی طرف توجہ ہے۔ پیچھے اور آگے کہہ کر کفر کی طرف رغبت زیادہ دکھانا ہے۔

کافر عشق ہوں اس لئے توجہ علامات کفر کی طرف ہے۔ مگر ایمان پیچھے سے دامن پکڑ کے روکتا ہے۔ کعبہ جو اہل ایمان کی جگہ ہے وہ تو پیچھے ہے اور کلیسا جو کافروں کی جگہ ہے وہ سامنے ہے اور اسی کی طرف میری توجہ ہے۔ کعبہ (ایمان) مجھے کفر سے روک نہیں سکتا۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام    مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ہوں تو عاشق مگر معشوقوں کو بہکانا اور پھسلانا میرا کام ہے۔ چنانچہ لیلیٰ کے سامنے ایسی ایسی باتیں کیں کہ وہ مجنوں کو برا اور مجھے اچھا سمجھنے لگی۔ اپنی اور لیلیٰ دونوں کی بری تصویر کھینچی۔ اگر اس شعر کو بد مذاق کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے    آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

آگے آنا۔ سامنے آنا۔ کسی کے فعل کی سزا یا جزا ملنا۔

وصل محبوب سے خوشی تو سب کو ہوتی ہے۔ مگر شادی مرگ جیسی مجھے ہوئی ویسی کسی کو نہیں ہوا کرتی ہے۔ میں شب فراق میں جو تمنائے مرگ کیا کرتا تھا وہ تمنا بروز وصل پوری ہوئی اس ناکامی کو دیکھو۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ غالب کے کارناموں میں سے ایک شعر یہ بھی ہے۔

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو    آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

قلزم۔ بفتح اول وثالث مترادف عیلم چاہ کثیر الماء۔ وبضم اول وثالث ایک شہر کا نام جو مکہ اور مصر کے درمیان ہے اس شہر کے جانب شمال جو سمندر ہے اسی شہر کی نسبت سے قلزم کہلاتا ہے۔

عشق کر کے میری آنکھوں سے دریائے خون بہہ رہا ہے کاش اسی پر اکتفا ہو۔ مگر ایسا ہونے کا نہیں۔ دیکھئے آگے کو ابھی اور کیا کیا ہوتا ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے    رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

سارے جسم سے دم نکل چکا ہے مگر ابھی آنکھوں میں دم ہے۔ لہٰذا میرے سامنے سے ساغر و صراحی ابھی نہ اٹھاؤ۔ آنکھوں کو سینکتا رہوں گا۔ گو ہاتھوں میں جان نہیں ہے کہ جام بھر بھر کے پی سکوں۔ اشتیاق شراب خوب دکھایا ہے۔

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا　　غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا مرے آگے

ہم پیشہ ۔ عاشق مزاج ۔ ہم مشرب ۔ مے خوار ۔ برا کہنے والا بھی تبغایر اعتباری ۔ غالب ہی ہے ۔ یا ۔ مخاطبہ معشوق سے ہے ۔ اچھا ۔ قافیہ کی وجہ سے اپنے محل پر نہیں آیا ۔
غالب تو ہمارا ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے لے غالب یا اے معشوق اچھا تم اسے اور میرے سامنے برا کہتے ہو وہ تو بڑا اچھا آدمی ہے ۔
اس غزل کے اشعار نمبر ۵ + ۸ + ۱۰ + ۱۱ + ۱۲) اچھے اور بہت اچھے اشعار ہیں ۔

---

غزل ۷۸　　اشعار ۱۱

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہئے　　تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

یوں تو تم توجہ کرتے نہیں ۔ میں اگر اپنا حال زار تم سے کہنے بیٹھتا ہوں تو تم کہتے ہو جلدی سے اپنا مطلب کہو ۔ اب تمہیں انصاف سے کہو کہ جب تمہارا ایسا واقف حال تجاہل سے اور انجان بن کر یہ بات کہے تو پھر ایسے شخص سے ہم کہیں تو کیا کہیں ۔

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستم گر ہیں　　مجھے تو خو ہے کہ جو تم کہو بجا کہئے

معشوق نے کہیں اپنے آپ کو طنزاً کہہ دیا کہ ہاں ہم ستم گر تو ہیں تو عاشق نے کہدیا بجا ہے ۔ اس پر معشوق سمجھا کر یہ سچ مچ ہم کو ستم گر جانتا ہے لہٰذا بگڑ گیا تو عاشق عذر میں کہتا ہے کہ آیندہ پھر یہ نہ کہنا کہ ہاں ہم ستم گر ہیں ۔ کیوں کہ ہماری تو عادت ہے کہ تم جو بھی کہو ہمیں اس پر بجا اور درست کہہ دینا لازم ہے ۔ (کہئے) کی جگہ کہوں یا کہہ دوں کا محل معلوم ہوتا ہے ۔

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جائے　　نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

دل میں اُتر جائے ۔ دل نشین ہو جائے ۔ کھب جائے ۔ چبھ جائے ؎

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب وہ کھب جائے

قافیہ بھی شعر کے زور اور قوت میں پھس پھسا پن پیدا کر رہا ہے ۔ شاید دل ربا ۔ یا ۔ دل کشا اس سے اچھا ہو ۔ نگاہ ناز جب دل کو لگ جائے اور دل میں کھب جائے ۔ چاہے وہ نشتر ہی کیوں نہ ہو پھر اسے آشنا نہ

کہیں تو اور کیا کہیں۔

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکان　　　وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

دلکشا۔ دل کو فرحت دینے والا۔ اس کی بستگی کو کھولنے والا۔ تشرح البال۔
میں اذیت دوست ہوں اس لیے زخم پیکان میرے لیے باعث تسکین نہیں ہو سکتا وہ زخم تیغ ہی ہے جو میری دل کشائی اور راحت کا سبب ہو سکتا ہے۔ اس مضمون کو پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنئے　　　جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے

یہ شعر اخلاقی اور موعظت کا ہے۔
جو کوئی مدعی و مخالف و دشمن بنے جہاں تک ہو سکے برخلاف کما تکیل نکال سلوک کرو۔ اور اگر کوئی برا بھلا کہے تو تم اس کا بدلہ نہ لو۔ برائی بہر حال برائی ہے۔ چاہے انتقاماً کیوں نہ ہو۔

کہیں حقیقت جانکاہی مرض لکھئے　　　کہیں مصیبت ناسازی دوا کہیے
کبھی شکایت رنج گراں نشین کیجے　　　کبھی حکایت صبر گریز پا کہیے

جناب نظم فرماتے ہیں۔ بس میری یونہیں گذر رہی ہے اور میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ ایک ایک کے آگے اپنا دکھڑا روؤں۔ مرض عشق جو جان لیوا ہے اس کی حقیقت و کیفیت احباب یا معشوق کو لکھوں۔ اور دوا کی مصیبت جو بجائے فائدہ اور نقصان پہنچاتی ہے اس کو بیان کروں کبھی رنج جو اٹل ہے اس کی شکایت کروں اور کبھی صبر جو بھگوڑا ہے اور میرا ساتھ نہیں دیتا ہے اس کی فریاد کروں۔

رہے نہ جان تو قاتل کو خون بہا دیجے　　　کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

خون بہا۔ دیت۔ مقتول کے خون کا صلہ جو میت کے ورثہ قاتل سے لے کر اس کے قتل سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ خون بہا دینے سے مراد اس کا بخش دینا ہے۔
اگر کوئی مار ڈالے تو بجائے دیت و قصاص لینے کے اور الٹا خون بہا دیا جائے اور اگر خنجر سے زبان کٹے تو خنجر کی تحسین و آفرین کی جائے۔

یہ تعلیم حضرت عیسیٰ کی برخلاف اسلام ہے۔ اگرچہ تعلیم بہت اچھی ہے مگر فطرت انسانی اور ضرورت زمانہ کے خلاف ہے۔

نہیں نگار کو الفت نہ ہو۔ نگار تو ہے      روانی روش و مستی ادا کہئے

روش = رفتن کا حاصل مصدر بمعنی رفتار و خرام۔
معشوق کو اگر ہم سے محبت نہیں تو نہ سہی بہر طور محبوب تو ہے۔ معشوق کے توصفات میں بے وفائی۔ بے اعتنائی۔ بے التفاتی اور ظلم کرنا ہے۔ اور عاشق اسی کو پسند کرتا ہے۔ اس کی خوش خرامی اور ادائے مستانہ کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس قدر دلکش اور دل فریب ہے۔ یا روش۔ بمعنی طرز۔ سلوک۔ الفت نہ کرنا معشوقوں کا یہی طرز جاری ہے اور ان کی مستانہ ادا یہی چاہتی ہے۔

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو۔ بہار تو ہے      طراوت چمن و خوبی ہوا کہئے

یہ شعر مثل شعر بالا ہے۔ اور فرصت۔ بمعنی قیام ہے۔ طراوت = تازگی۔ سرسبزی اگر بہار کے لئے قیام نہیں تو نہ ہو۔ بہر صورت بہار تو ہے۔ جتنے وقت تک وہ رہتی ہے۔ چمن میں سرسبزی اور ہوا فرحت افزا تو ہوتی ہے یہ نظارہ و تفریح کیا کم لطف انگیز ہے۔ یہ پانچوں اشعار کوئی خاص مزہ نہیں دیتے ہیں معمولی ہیں۔

سفینہ جبکہ کنارہ پر آلگا غالبؔ      خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہئے

سفینہ کنارہ آلگنا۔ قریب مرگ ہونا۔ ناخدا۔ ملاح۔ جہاز کا کپتان۔ مراد محبوب۔
جبکہ کشتی کنارہ پر آگئی۔ اور ساری عمر مصائب میں کٹی تو اب اس محبوب ستم گر کی شکایت اس سے یا خدا سے کیا کریں اور اب شکایت کا فائدہ کیا۔

---

غزل ۷۹      اشعار ۷

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے      دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

دھوئے گئے = سب حجاب و شرم اور پاس تمکین و وقار کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور ناموس و عزت کو چھوڑ بیٹھے۔ اچھے خاصے لونگرا اور لوفر بن گئے۔ کسی بات کا خوف نہ رہا۔ اور = بہت زیادہ۔

رو رو کے ہم بالکل نڈر ہو گئے۔ اور ہر قسم کی بے باکی اور گستاخی کرنے پر آمادہ ہیں۔ پورے پورے رند اور اوباش ہو رہے ہیں۔ آب گریہ نے دھو دھا کے پکا شہدا بنا دیا۔ اب معشوق کو مجھ سے ڈرنا چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو اس کے ساتھ گستاخی کر بیٹھوں۔

پاک۔ نرے کھرے۔ خالص۔ پاک وصاف۔ کسی قسم کا لحاظ و پاس نہ رہا۔

صرف بہائے مے ہوئے آلات مے کشی — تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

دو حساب۔ آلات و سامان مے کشی۔ اور شراب خواری۔ پاک۔ بے باق۔

پیسہ پاس نہیں مگر جام و صراحی و مے کشی وغیرہ کا سامان سب موجود تھا۔ اور شراب پئے بغیر چارہ نہ تھا۔ پیسہ ہوتا تو خرید کے پی لیتے مجبوراً سامان مے کشی بیچ کے شراب پینا پڑی۔ ہمارے اوپر دو قرضے تھے۔ اور ان کا ادا کرنا فرض تھا۔ دنیا کے اور جھگڑوں سے ہمیں تعلق نہ تھا۔ لہٰذا سامان مے کشی بیچ کر شراب پی لی اور دونوں قرضوں سے اس طرح بے باقی حاصل کر لی اب ہم ہیں اور تجرد محض ہے۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم — بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

بارے۔ المختصر۔ حاصل کلام۔ "لیکن" اس سے زیادہ برمحل ہے۔ طبیعتوں کا چالاک ہونا۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ محاورہ واحد اور جمع دونوں کے ساتھ ہے۔ مگر غالبؔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے جمع کے ساتھ استعمال کیا۔ ان کے معلومات کے آگے میرا علم ہی کیا۔ میرے نزدیک اگر جمع کے ساتھ بھی ہے۔ تب بھی واحد زیادہ بول چال میں ہے۔

اگرچہ رقیبوں کے گھر آوارہ مارے مارے پھرنے سے دنیا بھر میں بدنام اور رسوا تو تم ہوئے مگر ساتھ ہی طبیعت کے چالاک اور بڑے ہوشیار ہو گئے کہ اب کسی کے بہلانے اور پھسلانے میں نہیں آسکتے ہو۔ ان کی عیاریوں اور گھاتوں کو تم جان گئے۔

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر — پردہ میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

گل کو اسم جنس مان کے بمعنی گلہائے کثیر کہا ہے۔

جو کوئی نالہائے بلبل کو بے اثر بتاتا ہے وہ غلط کہتا ہے۔ اگر بے اثر ہوتے تو لاکھوں گلوں کی جگر شگفتگی کے پردہ میں کیوں چاک ہو جاتے۔ یا کثیر پنکھڑیوں کی وجہ سے کثیر دل کہا ہے۔

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

اہل شوق ۔ عشاق ۔ خاشاک ۔ ساق علف جھانکڑ ۔ ریزہ چوب ۔ چھپٹیاں تنکے ۔ خار و خس ۔
عشاق کی ہستی و نیستی کو اے محبوب تو کیا پوچھتا ہے ۔ وہ تو اپنی آتش عشق کے خار و خس ہو گئے خاک اور راکھ ہو گئے ۔
اب انھیں نہ موجود کہہ سکتے ہیں اور نہ معدوم صرف راکھ تو ہیں ۔

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

جناب نظم فرماتے ہیں کہ (کرنا) اس سرے پر اور گلہ اس سرے پر ثقل سے خالی نہیں ۔ اس طرح کچھ قریب آ سکتا ہے ۔ ع

کرنے گلہ گئے تھے تغافل کا اس کے پاس

خاک ہو گئے ۔ جل کے ۔ یا نرم پڑ گئے ۔ یا ڈھیلے پڑ گئے ۔
اس کی غفلت شعاری اور لاپرواہی کی شکایت کرنے کے لیے ہم اس کے پاس گئے تھے لیکن اس نے ایک ذرا نگاہ کرم سے میری طرف دیکھا کہ میں جل کے خاک ہو گیا ۔ یا ڈھیلا پڑ گیا ۔

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اگرچہ اردو میں یائے مجہول و معروف دونوں کا گرانا جائز ہے ۔ مگر ممکن ہو تو یائے مجہول کو گرائے جیسے اسی مصرع اول میں ع

اس رنگ سے کل اس نے اٹھائی اسد کی نعش

یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگرچہ مصرع ثانی بتا رہا ہے کہ توہین کے ساتھ اٹھائی ۔ مگر تعیین نہ ہونے سے شعر میں سستی ضرور پیدا ہو گئی ۔
کل اس نے ایسی تحقیر و تذلیل کے ساتھ اسدؔ کی نعش اٹھائی جسے دیکھ کر دشمن تک غمگین ہو گئے ۔

---

غزل ۸۰ اشعار ۲

نشئہ ہا شاداب رنگ و سازہا مست طرب شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

شاداب ۔ تروتازہ ۔ سیراب ۔ پرآب ۔ شاد بمعنی بسیار اور آب سے مرکب ہے ۔ رنگ کے تینتیس ۳۳ معنوں میں سے مناسب محل یہ ہو سکتے ہیں ۔ زور و قوت ۔ خوبی و لطافت ۔ رواج و رونق شیریں کاری ۔ شیشۂ مے ۔ صراحی جسے سبز رنگ کی کانچ سے بناتے ہیں ۔

یہ درست ہے کہ نشۂ ۔ رنگ رلیاں ۔ ساز مستی ۔ طرب ۔ صراحی ۔ درخت ۔ باغ ۔ سرو ۔ ندی کا کنارہ ۔ نغمہ سب کے سب مناسبات و لوازم محفل عیش سے ہیں مگر میں نغمہ کو جوئبار کے ساتھ استعارہ کرنے میں وجہ جامع نہ پیدا کر سکا ۔ جو میری کم علم پر دال ہے ۔ جناب نظم اس تشبیہ کو جدید اور لذیذ فرماتے ہیں ۔ شاید روانی وجہ جامع ہو ۔

نشۂ رنگ سے تروتازہ ہو رہے ہیں ۔ اور باجے بھی مست طرب ہیں ۔ صراحی نغمہ کی ندی کا سرو سرسبز ہے یعنی زمانہ بہار ہے ۔ لوگ جمع ہیں ۔ محفل عیش و طرب مع سامان عیش مہیا ہے ۔

جناب نظم فرماتے ہیں ۔ نشہ راگ رنگ سے شاداب ہے ۔ اور ساز نشۂ طرب سے سرشار یعنی شراب کو نغمہ میں اور نغمہ کو شراب میں اس قدر سرایت ہے کہ مینائے شراب سرو کنار جوئبار نغمہ ہے سرو کی تشبیہ مینا سے پرانی ہے ۔ اور جوئبار کی تشبیہ نغمہ سے جدید اور لذیذ ۔

جتنے سیدھے سادے معنی میں نے لکھ دیئے یہ غالب کا ڈھنگ نہیں ۔ جناب نظم جو پیچدار معنی تحریر فرماتے ہیں انھیں کو ٹھیک ہونا چاہئے ۔

جناب حسرت فرماتے ہیں نغمہ کو باعتبار روانی جوئبار کہا ۔ اور شیشہ مے کو باعتبار سبزی اس جوئبار کا سرو سبز قرار دیا ۔ اس حالت سرد زمین نشۂ کو رنگ سے شاداب اور ساز کو نشۂ طرب سے سرشار ٹھہرایا ۔

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ عیش بزم دوست ۔۔۔ واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبار نغمہ ہے

اے ہمدم و ہم نشین مجھ سے یہ نہ کہہ کہ نالے کر کے محفل عیش یار کو درہم و برہم نہ کر بھائی جان میرے نالے تو اس کی بزم میں پہنچ کر نغمے کا کام دیتے ہیں کیوں کہ وہ میرے نالوں سے خوش ہوتے ہیں ۔ یا ان کی بزم اس قدر عیش و سرور سے لبریز ہے کہ میرے نالے وہاں پہنچ کر مبدل بہ نغمہ ہو جاتے ہیں ۔ ؎

ہر چہ در کان رفت نمک شد

---

غزل ۸۱ ۔۔۔ اشعار ۴

عرض نازِ شوخی دندان برائے خندہ ہے ۔۔۔ دعویٰ جمعیت احباب جائے خندہ ہے

عرض پیش کرنا شوخی جناب نظم فرماتے ہیں کہ دندان کے لیئے لفظ شوخی سخت بے جا ہے۔ (خوبی) ہونا چاہئے۔ بجا فرماتے ہیں خندہ اظہار خوشی۔ جمعیت۔ اجتماع۔ جماؤ۔ اتفاق۔ میل جول۔ خندہ تضحیک۔ مذاق تمسخر۔

دانت اپنی خوبی اتفاق پر نازاں ہوکر اظہار خوشی میں خنداں ہوتے ہیں۔ یعنی ہنسی میں دانتوں کا نمایاں ہونا گویا اپنی خوبی اتفاق پر نازش کا دکھانا ہے۔ مگر حقیقت امر یہ ہے کہ اتحاد و اتفاق احباب کا دعویٰ کرنا خود ہی تضحیک و تمسخر کے لائق بات ہے۔ انھیں دانتوں ہی کو دیکھ لو کہ ایک وقت میں ایک ایک کرکے ایک دوسرے سے الگ اور متفرق ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیتے۔

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجام گل　　　یک جہان زانو تامل در قفائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ یعنی معدومیت گل کے سوچ میں۔ تامل۔ غور و فکر میں انسان سر زانو پر رکھ لیتا ہے۔ یک جہاں۔ اظہار مقدار کثیر فکر اس سے مقصود ہے۔ اس طرح کے اور کئی الفاظ اس سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔ قفا۔ پیچھے۔ گدی۔ خندہ۔ غنچہ کا کھلنا۔ پھول ہو جانا۔ عبرت۔ نصیحت۔

گل۔ کے شگفتہ ہو جانے کے بعد اس کے عبرت انجام فنا کے بارہ میں غنچہ بے حد متفکر ہے کہ یہ گل اب کھلنے کے بعد خشک ہوکر جھڑ جائے گا۔

کلفت افسردگی کو عیش بے تابی حرام　　　ورنہ دندان در دل افشردن بنائے خندہ ہے

کلفت۔ رنج و تکلیف۔ افسردگی۔ گرفتگی۔ تنگی۔ انقباض خاطر۔ عیش بیتابی۔ افسردگی کے مقابلہ میں بیقراری اور اضطراب کو عیش سے تعبیر کیا ہے۔ دندان در دل افشردن۔ (دندان بر دل افشردن) کنایہ از تحمل مکروہات بودن۔ (بہار عجم) مگر انھوں نے معنی وضعی میں استعمال کیا ہے یعنی (اپنی بوٹیاں کاٹنا)۔

انقباض خاطر کے ہوتے ہوئے بیتابی (جو اس کے مقابلہ میں بمنزلہ عیش ہے)۔ حرام ہے۔ ورنہ دل کی بوٹیاں چبانا خوشی اور سرور کا باعث ہے کہ اسی نے تو کلفت پیدا کی ہے۔ یا۔ اس کے چبانے سے زخم خنداں حاصل ہوگا اور گرفتگی دل جاتی رہے گی۔

سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں　　　دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

آشنا۔ شناسا۔ اور بمعنی شناور بھی ہے۔ محیط۔ گھیرنے والا۔ چونکہ کل خشکی کو سمندر گھیرے ہوئے ہیں اس لیئے اہل ایران مجازاً بمعنی بحر کہتے ہیں۔

سوز درونی کے احباب قائل نہیں کہتے ہیں کہ سوز کے ہوتے ہوئے تو آنسوؤں کو خشک ہو جانا چاہیے۔ مگر مگر وہ نہیں جانتے ؎

پہلے دل جلتا ہے پھر آنسو نکلتا ہے

جبھی تو میرا دل گریہ کا بحر ہو رہا ہے۔ گو بظاہر ہونٹوں پر ہنسی ہے۔ جسے کھسیانی ہنسی کہہ سکتے ہیں۔ یا اس پر بھی خوش ہوں ؎

پورے ہیں وہی لوگ جو ہر حال میں خوش ہیں

جناب نظم صرف دوسرے شعر کی نسبت فرماتے ہیں کہ اس شعر کو چیستان یا معمیٰ کہہ سکتے ہیں۔ انصاف یہ ہے کہ جادۂ مستقیم سے خارج ہے۔

میرے نزدیک آخری شعر کو غیر مستثنیٰ کر دیا جائے ورنہ تین اسی کے مصداق ہیں۔ انھیں اُردو کا کلام تو کہی نہیں سکتے۔ ادنیٰ تصرف سے چاروں اشعار فارسی کے ہو جاتے ہیں۔ پہلا شعر تو بلا تصرف فارسی کا ہے۔ کیوں کہ (ہے) اُردو کی طرح فارسی میں بھی بمعنی (ہست) ہے۔

| | |
|---|---|
| عرض ناز شوخی دندان برائے خندہ ہست | دعویٰ جمعیت احباب جائے خندہ ہست |
| در عدم غنچہ ست محو عبرت انجام گل | یک جہان زانو تامل در قفائے خندہ ہست |
| کلفت افسردگی را عیش بیتابی حرام | ورنہ دندان درون افشردن بنائے خندہ ہست |
| منکر اند احباب سوز باطنی را گو مرا | دل محیط گریہ ولب آشنائے خندہ ہست |

---

غزل ۸۲ اشعار ۲

۳ ۱ | حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے | آئینہ زانوئے فکر اختراع جلوہ ہے

آئینہ زانوئے فکر۔ غور و فکر کے وقت سر زانو پر رکھ کے سوچا کرتے ہیں تو اس سے کچھ انکشافات ہوا کرتے ہیں اس لیئے آئینہ زانو استعارہ مشہور ہے۔ غالب نے آئینہ کو زانو بنایا ہے۔ آئینہ میں بھی چہرہ دیکھ کر آرایش و زینت میں ایجاد کر سکتے ہیں۔

حسن بے پروا۔ وہ حسن جو بعد زینت جلوہ دکھانے پر آمادہ اور کچھ پروا نہیں کرتا کہ یہ جلوۂ بازینت و آرایش عاشقوں کے دلوں پر کیا ستم ڈھائے گا مگر وہ لیے جلوہ کا خواہش مند ہے۔ اور جلوہ میں زینت سے ایجاد کرنے کی فکر میں آئینہ کو زانوئے فکر بنا رکھا ہے۔ آئینہ کو زانو پر رکھ کے بھی زینت کی جاتی ہے۔ یعنی اگرچہ حسن ذاتی مستغنی آرایش ظاہری ہے مگر اس کو بھی جلوہ دکھانے میں ایجاد زینت کی فکر رہتی ہے کہ کشش میں اور اضافہ ہو جائے۔

تا کجا اے آگہی رنگ تماشا باختن	چشم وا گردیدہ آغوش وداع جلوہ ہے

آگہی ۔ معرفت ۔ وقوف ۔ بیداری ۔ رنگ باختن ۔ شکستن ۔ رنگ کا اُڑ جانا چشم وا گردیدہ ۔ جو آنکھ کہ تماشائے عالم پر کھلی ہے ۔ رنگ بمعنی خجالت وانفعال وشرمندگی بھی ہے ۔

اے معرفت وشناسائی کہاں تک تماشائے عالم کر کے خجالت میں اپنے چہرہ کا رنگ متغیر کرتی رہے گی اور شرمندگی اٹھائے گی ۔ جو آنکھ کہ تماشائے عالم میں کھلی ہے ۔ اسے تو رخصت جلوۂ عالم کے لئے آغوش کشادہ سمجھ جس چیز کو قیام و ثبات نہیں اس سے دل لگانا کیسا ۔

(ہے) رہے یا اس کی جگہ (ہست) ہو جائے ۔ یہ دونوں اشعار بھی فارسی کے ہیں ۔ اور بہت گذھے ہیں ۔

---

غزل ۸۳	اشعار ۱۲

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی	مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

مشکل ۔ فارسی میں است محذوف ہوتا ہے اسی طرح انھوں نے اُردو میں (ہے) حذف کر دیا ۔ را وا کردن ۔ بات کرنے کا وسیلہ پیدا کرنا ۔ یہ بھی فارسی ہے ۔ اُردو نہیں ۔

کوئی شخص ان کی ضرب تیغ کھا کے گہرا اور چوڑا دہن زخم پیدا کرے تو اس دہن کی زبان حالی سے اس سے وسیلہ بات کرنے کا پیدا ہو جائے ۔ ورنہ دہن متعارف سے تو ان سے بات کرنا اور درد دل سنانا مشکل ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ گہرا زخم اپنے ہاتھ کا دیکھ کر اس کی تکلیف کا کچھ احساس ہو اور کچھ التفات و توجہ کرے ۔

جناب نظم زخم سے زخم عشق مراد لیتے ہیں ۔ عاشق نہ ہو تو معشوق کو اس پر التفات کرنے یا نہ کرنے کی کیا ضرورت ۔

عالم غبار وحشت مجنون ہے سربسر	کب تک خیال طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

مجنون جیسے اپنی وحشت میں خاک اڑا اڑا کر صحرا کو غبار آلود کر دے اسی طرح سارا عالم غبار آلود اور مکدر ہو رہا ہے ۔ وحشت کے ہوتے ہوئے خاک کیسے نہ اڑائی جائے اور کب تک زلف لیلیٰ کو غبار آلود ہونے سے بچایا جائے ۔ جب سارا عالم غبار آلود ہے تو زلف لیلیٰ کیسے محفوظ رہ سکتی ہے ۔

عالم سراسر وحشت کدہ ہے ۔ اس کو زلف لیلیٰ کی طرح کہاں تک مزین سمجھا جائے ۔ عقل مندی تو اس میں ہے کہ اس کو بالکل ترک کر دیا جائے ، کیوں کہ یہ غبار کی طرح آنکھوں میں کھٹکتا ہے ۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ عالم ایک نمایش سراب ہے کب تک اسے موج دریا سمجھا کریں۔

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

دل میں جا کرنا اُردو میں دل میں جگہ پیدا کرنا۔ بنا بر عادت (در دل جا گرفتن) کا ترجمہ کر دیا ہے۔ طرب انشاء خوشی پیدا کرنے والا۔ کیوں کہ انشاء کے معنی پیدا کرنے کے ہیں۔ دونوں عربی اور ترکیب فارسی کو اچھا نہ سمجھ کر جناب نظم فرماتے ہیں کہ یقیناً طرب افزا کہا ہوگا۔

رنج و ناامیدی دائمی سے وہ افسردگی پیدا ہو گئی ہے کہ اب التفات محبوب سے بھی مسرت نہیں ہوتی البتہ اگر کوئی میرے دل میں جگہ لینا چاہتا ہے تو درد بن کے میرے دل میں جگہ پا سکتا ہے۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

رونے سے (از گریستن) کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں رونے پر بولتے ہیں۔

اے ہم نشین میرے رونے پر مجھے ملامت نہ کر۔ آخر کبھی تو کوئی دل کی گرہ کھولے اور بھڑاس نکالے۔

چاک جگر سے جب رہ پرسش نہ وا ہوئی کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

ہم نے جگر چاک کر ڈالا مگر اس نے جب بھی نہیں نہ پوچھا۔ پھر اب گریبان چاک کر کے اپنے آپ کو رسوا اور بدنام کرنے کا کیا فائدہ۔

لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل تا چند باغبانی صحرا کرے کوئی

رگ گل شاخ اور جگر کے مناسب ضرور ہے مگر رگ خار کا استعارہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ؎

لخت جگر سے بن گیا ہر خار شاخ گل

صحرا کے ہر نوک خار پر جگر کے ٹکڑے لگے ہونے سے ہر شاخ گل معلوم ہوتا ہے کب تک میں صحرا کی باغبانی کر کے ایسے پھول لگاتا رہوں اب تو رحم کرو

ناکامی نگاہ ہے برق نظارہ سوز تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

تماشا کرنا = دیکھنا۔ اُردو نہیں فارسی میں بمعنی دیدن ہے اُسی کا ترجمہ کر دیا۔ ناکامی نگاہ کو برق نظارہ سوز کہا ہے۔ یہ ہمیشہ ٹیڑھا راستہ ہی اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ برق حسن مانع دیدار ہے ؎

ہے برقِ حسن باعث ناکامی نگاہ — تو وہ نہیں کہ تیرا نظارہ کرے کوئی

برق نظارہ سوز کو مبتدا اور ناکامی نگاہ کو خبر مانیں تو پھر ترمیم کی ضرورت نہ ہو گی اور وہی معنی ہوں گے جو میں ترمیم سے چاہتا ہوں۔ اور جو کچھ میں نے لکھا وہ فضول ہو گا۔

تیری برق جمال ہی نظارہ سوز ہے تو پھر نگاہ دیدار سے ناکام کیسے نہ رہے۔ تیرا حسن وجمال تو ایسا نہیں جسے کوئی دیکھ سکے ؎

برق نظارہ سوز ہے ناکامی نگاہ

جناب نظم فرماتے ہیں تو دیکھنے میں آ ہی نہیں سکتا ہے۔ طور پر جس صاعقہ نے نظارہ کو جلا دیا وہ تو نہ تھا۔ بلکہ ہماری ناکامی نگاہ بجلی بن کر گری تھی۔

ہر سنگ وخشت ہے صدف گوہر شکست — نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

صدفِ گوہر شکست۔ صدف شکستہ گوہر۔ بڑی ٹیڑھی ترکیب ہے۔ پھر سنگ وخشت کو صدف شکستہ کہنا اور بھی مصیبت ہے۔ مگر یہ کہ مجازاً علت سے معلول مراد لیں۔ مزید برآں نقطہ صدف نے گوہر کو معنی مروارید کے ساتھ خاص کر دیا۔ سر کے پھوٹنے سے جو خون نکلے گا اسے یاقوت اور لعل کہہ سکتے ہیں نہ موتی۔ اس لئے مصرع اول مثل اس کے ہونا چاہئے ؎

ہر سنگ وخشت کان کن یاقوت ولعل ہے

سودا۔ میرا اسماعی ہے نہ تحقیقی کہ (سودا) بمعنی خرید وفروخت ترکی ہے مگر مرزا رضا علی ہدایت شیرازی اپنے لغت فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں (سوداگر) کو سود بضم بمعنی نفع اور گر علامت فاعلی سے مرکب بتلاتے ہیں۔ مگر (الف) درمیانی کی نسبت کچھ نہیں کہتے۔ بہر طور (سودا) اس شعر میں بمعنی خرید وفروخت ہے۔

حالت جنوں میں جو اطفال اینٹ اور پتھر مارتے ہیں اور اس سے سر پھوٹ کے جو خون نکلتا ہے گویا ایک لٹی ہوئی سیپی موتیوں سے پُر ہاتھ آتی ہے۔ لہٰذا جنوں سے سودا کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے بلکہ نفع ہی نفع ہے کہ علائق دنیوی سے نجات مل جاتی ہے۔

جناب نظم (صدف گوہر شکست کے) معنی یوں تحریر فرماتے ہیں کہ جو پتھر اور ڈھیلے لڑکے سر پر مارتے ہیں وہ ایسی صدف ہیں جس کا موتی شکست سر ہے۔

جناب حسرت۔ لڑکے جو دیوانوں کو (سنگ وخشت مارتے ہیں)۔ ہر سنگ وخشت گویا ایک صدف ہے جس سے گوہر شکست حاصل ہوتا ہے۔

جناب آسی۔ ہر سنگ وخشت جو لڑکے دیوانے کو مارتے ہیں وہ صدف ہیں جن سے شکست سر کے دیوانے کو

ہوتی حاصل ہوتے ہیں۔ انھوں نے نظم وحسرت کے معانی ملا دیے۔

سر بر ہوئی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر　　　فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

عمر سر بر نہ ہوئی یعنی مر گئے۔ مصرع ثانی چاہتا ہے کہ مصرع اول یوں ہو ؎

سر بر نہ ہوگی وعدۂ صبر آزما سے عمر

مگر شعر کے معنی یوں کہے جائیں کہ

جب تیرے ساتھ اس سلوک کو لوگوں نے آزمالیا تو پھر کوئی دوسرا تیری تمنا کیا کرے۔

کسی دوسرے کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اپنے بیان سے وہ کمی ضرور رہتی ہے جس کا ذکر ہو چکا

ان کا وعدہ تو ایسا صبر آزما ہے کہ عمر ختم ہوگئی اور وعدہ وفا نہ ہوا۔ پھر بتاؤ کہ اتنا موقع کہاں کہ کوئی ان کی تمنا کرے

مر جائیں گے اور وعدہ وفا نہ ہوگا۔

ہے وحشت طبیعت ایجاد یاس خیز　　　یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

ایسی ایسی ترکیبیں ایجاد کرتے ہیں کہ میرا تو کیا ذکر جناب نظم وحسرت ایسے قابل لوگوں کو بھی معانی پیدا کرنے میں

دشواری لاحق ہوتی ہے۔ یہ درد = ایک پہیلی ہے۔ کہ (وہ) چاہتا ہے کہ (جو) ہو۔ مگر اس محل پر انھوں نے

(کہ) زیادہ استعمال کیا ہے (کہ) غلط نہیں۔

ایجاد کرنے والی طبیعت میں اس کی وحشت کی وجہ سے مایوسی پیدا ہوتی ہے کہ یہ نئی چیز کیسے اختیار کریں

اور نہ یہ درد عشق ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے اختیار نہ کیا جائے۔

جناب نظم۔ معنی آفرینی وخلاقی مضامین وایجاد واختراع لطایف ایسا وحشی فن ہے۔ جس سے یاس پیدا

ہوتی ہے۔ پھر بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ (یہ درد) سے ان کی مراد (ایجاد) ہے۔

اگر شعر کے یہی معنی ہیں تو اس کو غزل سے کیا تعلق۔

جناب حسرت۔ ایجادی طبیعت میں جو وحشت ہے وہ یاس خیز ہے۔ یعنی ہم وحشی طبع لوگ یاس کو ایجاد کیا کرتے

ہیں۔ اور اس طرح گویا مایوس ہونے پر مجبور ہیں۔

یاس کو ایجاد کرنے کے معنی کچھ سمجھ میں نہ آئے۔

جناب آسی۔ یہ تو نرالی اڑایا ہی کرتے ہیں۔ ان کی اپج بھی سن لیجئے۔ میں ان کی تحریر کا کوئی حاصل نہ نکال سکا۔

ایجاد سے مراد غالباً عالم ایجاد ہے۔ اس صورت میں یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ عالم ایجاد کی طبیعت ہی میں وحشت

ہے۔ اور یہ وحشت یاس خیز اور مایوس کن بلکہ یہ یاس ایک درد ہے جو ہر ساکن ایجاد کے دل میں پیدا ہونا ضروری ہے۔
آخری جملہ جناب حسرت سے لیا گیا ہے۔

بہر صورت شعر چیستاں ہے۔ اس لئے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔

**بے کاری جنون کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی**

شغل بضم اول وسکون ثانی بضمتیں و بفتحتین بھی صحیح ہے ضد فراغ (جب ہاتھ ٹوٹ جائیں) کیوں اس کی علت نہیں بتائی۔ شاید سر پیٹتے پیٹتے۔ اس صورت میں پیٹنے سے ہاتھوں کا ٹوٹ جانا کہنا کچھ اچھا نہیں۔ اس لئے اس مصرع کو یوں بنا لیا جائے۔ ؎

تھک جائیں جبکہ ہاتھ تو پھر کیا کرے کوئی

اور اگر ہاتھ ٹوٹ جانے کے معنے ہاتھوں کا بے کار ہو جانا کہیں تو پھر کسی بات کی ضرورت نہیں رہتی۔

صحرا نوردی۔ گریبان دری۔ چاک دامانی جنون میں سب کچھ کر چکے۔ حتیٰ کہ سر بھی پیٹ لیا اور ہاتھ بے کار ہو گئے تو کوئی بتائے کہ اب کیا کریں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ (کو) کی جگہ (میں) کا محل ہے۔

**حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی**

شمع سخن استعارہ صرف گداختہ کی وجہ سے ہے۔ ورنہ معنی میں کوئی خاص خوبی پیدا نہیں ہوئی۔

؎ حسن کلام و زور سخن دور ہے اسدؔ

شمع کی طرح پہلے دل گداختہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تب نور شمع سخن سے دل اہل بزم کو منور کر سکتے ہیں۔

---

## غزل ۸۴ — اشعار ۱۰

۱۴بغ **ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی**

ابن مریم ۔ حضرت عیسیٰ۔

اگر کوئی عیسیٰ وقت ہے اور مردوں کو زندہ کیا کرتا ہے تو ہمیں کیا۔ ہم تو جب جانیں کوئی ہمارے دکھ اور درد کو دور کردے۔

شرع و آئین پر مدار سہی     ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

یہ مانا کہ شریعت اور قانون کے موافق فصل قضایا ہوتا ہے مگر ہمارے ایسے قاتل کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ دھار دار آلات سے قتل کرے تو اس سے مواخذہ ہو سکے سزا دی جائے قصاص و دیت لیں مگر وہ تو اپنے ادا و ناز و حسن سے قتال عالم ہے پھر اس کا کوئی کیا علاج کرے۔

چال جیسے کڑی کمان کا تیر     دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

پہلا مصرع پورا پورا محاورہ ہے۔ جتنی کمان سخت ہوتی ہے اتنا ہی تیر کا پلہ دور تک اور رفتار تیز ہوتی ہے۔ اس کی چال کڑی کمان کے تیر کی طرح نہایت تیز ہے گویا چھلاوہ ہیں۔ ادھر دکھائی دئے اور ادھر نظروں سے غایب وہ کسی کے ہاتھ کب لگتے ہیں پھر ان کے دل میں کوئی جگہ کیسے پیدا کرے۔
جناب نظم ربط بین المصرعین یوں دیتے ہیں کہ معشوق کی بے اعتنائی کی چال کو کڑی کمان کے تیر سے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے     وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

وہ برا یا بھلا کچھ بھی کہیں چپکے سے سن لینا چاہئے۔ اگر کچھ رد و بدل یا جواب دہی یا عذر و معذرت کرو تو وہاں زبان کاٹ لی جاتی ہے۔ دونوں مصرعے محاورہ میں ڈھلے ہوئے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ     کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کوئی۔ یعنی معشوق۔ تنکیرِ معشوق معین کے حق میں مزہ دیتی ہے۔ یہ شعر بھی زبان میں ڈوبا ہوا ہے۔
بے التفاتی معشوق کی شکایت۔ رقیبوں سے ملنے کا گلہ۔ مصیبت کا اظہار۔ اس جنوں کی بک بک میں سب کچھ ہے۔ خدا کرے کہ وہ میری بکواس کو بالکل نہ سمجھے ورنہ اور زیادہ ناراض ہو جائے گا۔
جناب نظم فرماتے ہیں۔ کچھ نہ سمجھے سے غرض یہی ہے کہ سمجھے اور التفات کرے مگر اپنے بکنے پر آپ ہی تشنیع کی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کوئی نہ سمجھے اور راز فاش نہ ہو۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی     نہ کہو گر برا کرے کوئی

## روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

کہتے ہیں کہ مطلع کے بعد اور شعروں میں ردیف پہلے مصرع میں لانا یا قافیہ لانا جس سے شبہ مطلع کا ہو اچھا نہیں (کوئی مانے یا نہ مانے) (نہ کہو گر برا کرے) کسی کے افعال قبیحہ کا ذکر نہ کرو۔
کوئی اگر برا کہتا ہو تو اس کے نہ سننے کی کوشش کرو۔ اور کسی کے برا کہنے پر تم انتقاماً برا نہ کہو۔ اگر کوئی غلط راستہ پر جا رہا ہو تو حتی الامکان موقع دیکھ کر اسے غلط راہی سے روک لو۔ اور اگر کوئی تمہاری خطا کرے تو اسے معاف کر دو۔

یہ اشعار ناصحانہ ہیں اور ان میں طرز ادا یا بات کی بھی کوئی جدت یا خوبی نہیں معمولی باتیں ہیں۔

## کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند کس کی حاجت روا کرے کوئی

کس کی اس محل پر کس کس کی بولتے ہیں۔
جب سبھی حاجت مند ہیں تو پھر کوئی کس کس کی حاجت پوری کرے۔ جب سب حاجت مند ہیں تو کوئی تمہاری حاجت کیا پوری کرے وہ تو خود ہی ضرورت مند ہے۔ لہٰذا تم کو کسی سے شکایت نہ ہونا چاہئے۔

## کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی

مشہور ہے کہ خضر آگے تھے انھوں نے چشمہ آب حیات دیکھا اور پانی پیا۔ مگر سکندر محروم رہا۔
خضر ایسے شخص نے سکندر کے رہنما بن کر اس کے ساتھ کیا بھلائی کی آپ تو چشمہ آب حیوان کا پانی پی لیا مگر سکندر اس سے محروم رہا۔ اب بتاؤ کہ کوئی کس کو اپنا راہنما بنائے جب خضر ایسے شخص سکندر کو فائدہ نہ پہنچا سکے۔

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل کہ خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

## جب توقع ہی اٹھ گئی غالب کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

توقع = امید۔
اے غالب جب ہم کسی سے کسی قسم کی امید ہی نہیں رکھتے ہیں تو کسی سے اگر کوئی مطلب پورا نہ ہو تو شکوہ کسی کا کیوں کیا جائے۔
جناب نظم اس شعر کی بہت مدح فرماتے ہیں۔ بندش تو ضرور صاف ہے مگر بات کوئی نئی نہیں ہے۔

جب صاف کہتے ہیں تو خوب کہتے ہیں۔ اس غزل کے چھ اشعار نہایت خوب ہیں۔

غزل ۸۵ — اشعار ۳

۱۵ بہت سہی غم گیتی شراب کیا کم ہے — غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

یہ مانا کہ دنیا محل آلام ہے۔ مگر مجھے کیا پروا ہے اگر غم دنیا کثیر ہیں تو جناب امیر علیہ السلام ایسے ساقی کوثر کا غلام ہوں وہ بہشت میں چشمہ کوثر سے شراب طہورا ہمیشہ بکثرت عطا فرماتے رہیں گے وہاں شراب کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس الم دنیوی کا بدلہ وہاں خوب مل جائے گا۔

جناب حسرت نے اوپر والی غزل کے بعد اسی کو اختیار کیا ہے۔ مگر دوسرے شارحین اس کو ایک غزل کے بعد لکھتے ہیں۔

تمہاری طرز وروش جانتے ہیں ہم کیا ہے — رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

طرز ۔ لکھنؤ میں مذکر ہے۔

تمہارے طرز اور سلوک کو ہم خوب جانتے ہیں کہ بہر طور تم ہم پر ظلم ہی کرنا چاہتے ہو۔ رقیب کے ساتھ لطف و کرم سے پیش آنا میرے اوپر ستم نہیں تو اور کیا ہے۔

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی — یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

شعر وسخن میں قلم غالب سے آگ جھڑتی ہے ایسے دل سوز اشعار کہتا ہے جس کا ہم کو پورے طور سے یقین اور اقرار ہے مگر اب ضعف پیری سے اس میں دم کہاں باقی رہا ہے۔ جو ایسے اشعار کہے۔

غزل ۸۶ — اشعار ۶

۱ باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

جناب حالی یادگار غالب میں تحریر فرماتے ہیں کہ نظیری کے شعر ذیل سے غالب کا ذہن اس مطلع کی طرف منتقل ہوا ہے

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را　　　نوا گران نخوردہ گزند را چہ خبر

یہ جناب نظم فرماتے ہیں کہ (یہ) اشارہ ہے افعی کے نظر آنے کی طرف۔ میرا خیال ہے کہ یوں یا اس طرح باعظمت کے لئے ہے یعنی بہت زیادہ۔ مشار الیہ مصرع ثانی ہی ہے۔ خفقان۔ بالتحریک اضطراب القلب ایک مرض ہے جس میں حرکت قلب بڑھ جاتی ہے۔ دھڑکن۔ خیالات میں خوف سما جاتا ہے۔ سایہ شاخ کو سانپ اور پھول کو کفچہ مار (پھن) سے تشبیہ دی ہے۔

باغ جو مجھے خفقانی دیکھتا ہے تو یہ کہہ کر ڈراتا ہے کہ سایہ شاخ یہ گل مجھے سانپ معلوم ہوتا ہے۔ میں اس شعر کو نہ سمجھ سکا۔ اول تو باغ کا ڈرانا ہی کیا۔ پھر ڈرانے میں اس کی کیا غرض ہے۔

صاف اور سیدھا کرنا ہو تو یوں یا مثل اس کے کہا جائے تو کچھ سمجھ میں آئے۔ اگرچہ یہ ڈھنگ غالبؔ کے رنگ کے مخالف ہے ؎

باغ بھی ہجر میں پھاڑے ہی کھاتا ہے مجھے

اس طرح اس مصرع کا تیسرا رکن بجائے فعلاتن بوجہ تسکین اوسط مفعولن ہوگا۔

جناب ذوقؔ نے بھی اسی سانپ کے مضمون کو یوں کہا ہے ؎

سایہ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے　　　اژدہا بن بن کے شب اے رشک گلشن آب میں

جوہر تیغ بسر چشمۂ دیگر معلوم　　　ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر آب اگاتا ہے مجھے

تلوار بنانے کے بعد اس کو پانی اور تیل میں بجھاتے ہیں اس سے لوہا پکا اور آب دار ہو جاتا ہے۔

جوہر آب۔ چونٹیوں کی ٹانگوں کی طرح بجھاوے جو نقوش پیدا ہوتے ہیں۔ جس تلوار کو زہر کے پانی میں بجھاتے ہیں اس کا زخم اچھا نہیں ہوتا ہے۔ جوہر اور لوہے کا رنگ سبز مانتے ہیں۔ سرچشمہ بمعنی منبع ہے۔ اس جگہ چشمہ کافی تھا (لفظ سر) برائے بیت ہے۔ سبز رنگ آہن کو حقیقی سبزہ مان کر اگانے کا لفظ لائے۔ اور حکم سبزہ حقیقی اس پر جاری کیا۔ زہر آب: استعارہ غم و غصہ سے ہے۔ آب زہر آلودہ تیغ۔ تیغ غم۔ جوہر تیغ۔ تیزی تیغ غم۔ معلوم بمعنی نفی۔

تیغ غم کی تیزی کسی دوسرے چشمہ کے پانی میں بجھا دینے سے نہیں ہوتی ہے۔ اس میں تیزی جوہر مجھ ہی سے حل کے پیدا ہوتے ہیں۔ مرکز و مسکن غم میں ہی ہوں۔ کیوں کہ میں وہ سبزہ ہوں کہ آب زہر آلود سے جب اسے سینچا جائے تو ترقی پاتا ہے۔ اسی طرح سبزۂ آہن تیغ غم کی پرورش بھی مجھ سے ہوتی ہے۔

میں نے کچھ سمجھ کے تو لکھا نہیں یوں ہی آئیں بائیں شائیں بک دیا۔ لہٰذا بنا بر دستور دونوں بزرگوں کے معانی لکھتا ہوں ناظرین ان سے مطلب حاصل کریں۔

جناب نظم۔ زہر آب سے غم و غصہ مراد ہے۔ یعنی میری سرشت غم و غصہ سے ہے پھر اسی پر افتخار کر کے کہتے ہیں کہ تلوار کا جوہر تلوار کو زہر آب میں بجھانے سے ہوتی ہے اسی طور پر میری سرشت غصہ و غم سے ہے۔

جناب آسی۔ جیسے کہ تلوار کا جوہر زہر آب میں بجھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ سبزہ یعنی تلوار کا جوہر کسی دوسرے سرچشمہ سے نہیں اُگتا ہے۔ اسی طرح میری پیدائش بھی زہر آب غم سے ہوئی ہے۔

شعر ہی الجھن والا ہے کسی کی پیری نہیں چلتی۔

مدعا محو تماشائے شکست دل ہے　　　آینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

مطلب جب کسی طرح حاصل نہ ہوا تو دل جو صفائے باطن کا آئینہ تھا وہ ٹوٹ گیا اور اس کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔ جس کا خود مدعا تماشا دیکھ رہا ہے تو اسے ہر ٹکڑے میں ایک مدعا اپنے عکس کا دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہ تماشا دیکھ رہا ہے کہ ان ہزاروں خواہشوں میں ایک بھی پوری نہ ہوئی۔ (کثرت آرزو کا بیان ہے) ان ہزاروں ٹکڑوں کی وجہ سے آئینہ خانہ بن گیا۔ آئینہ خانہ (شیش محل) میں ایک شئے اپنے عکس سے کثیر معلوم ہوتی ہے۔ اب جو پارہائے دل پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم آئینہ خانہ میں آ گئے۔

جناب نظم۔ حصول مدعا سے دل ٹوٹ گیا۔ تو مدعا دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اور دل آئینہ تھا جب وہ ٹوٹا تو بہت سے آئینے پیدا ہو گئے اور آئینہ خانہ بن گیا۔ یہ طرز شعر مقبول نہیں۔

مصرع ثانی کے معانی نہ لکھے اور پہلے کے ساتھ ربط بھی نہ دیا۔ جناب حسرتؔ نے معانی جناب نظمؔ مع حوالہ نقل کر دینے پر اکتفا کی۔ دل ٹوٹ جانا۔ مایوس ہو جانا۔ ہمت ہار دینا۔

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک　　　آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

دنیائے عشق میں نالہ بڑی چیز ہے۔ اور عالم (زمین) ایک مٹھی بھر خاک سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی ہے اور آسمان بھی میری نظر میں بیضۂ قمری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ یعنی دنیا میری نظر میں ہیچ ہے۔ خاک مناسب قمری کیوں کہ اس کا رنگ خاکستری ملتے ہیں۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے　　　دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

اٹھانا۔ نکال دینا۔ تجہیز و تکفین کر کے مردہ کو قبر میں پہنچانا۔

زندگی میں تو وہ اپنی محفل سے مجھے نکال دیا کرتے تھے۔ دیکھنا ہے کہ مرنے کے بعد اب کون ہمیں اٹھاتا ہے۔ یعنی تجہیز و تکفین کرتا ہے۔ ایہام اس معنی کی طرف بھی کہ اب کون ہمیں نکال سکتا ہے۔

غزل ۸۶ اشعار ۳

۱۴۷۶ ۱ رَوندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی اترائے کیوں نہ خاک سرِرہ گذار کی

روندی ہوئی۔ پایمال۔ کوکبہ۔ جماعت یہاں مراد جلوس۔ سرِرہ گذار۔ راستہ گلی کا سرا۔ ناکا۔ (سر) برائے بیت ہے ے

اترائے کیوں زمین نہ ہر رہ گذار کی

جس جس راستہ سے جلوس شاہی کا گذر ہوا ہے وہاں کی زمین فخر کیوں نہ کرے۔ کیوں کہ اس پر سے جلوس بادشاہ کا گذر ہوا ہے اور اس کے پیروں کے نیچے آئی ہے۔

جب اس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

جب لالہ زار کے دیکھنے کے لیئے بادشاہ جائیں تو لالہ زار کی شہرت کیوں نہ ہو جائے۔

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے کیوں کر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

بھوکے۔ مشتاق۔ ہوا کھانے کی وجہ سے یہ لفظ لائے۔

اگرچہ ہم سیر گلستان کے مشتاق نہیں کیوں کہ دل مردہ ہو چکا ہے۔ مگر یہ ہوائے بہار ہے اور اللہ کی ایک نعمت ہے اس سے حظ و لذت کیوں نہ اٹھائی جائے۔

یہ غزل نہیں بادشاہ کے سیر باغ کرنے کے بیان میں ایک قطعہ یا مطلع ہے۔

---

غزل ۸۷ اشعار ۹

۱۴۸۰ ۱ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہزاروں خواہشیں اور آرزوئیں ایسی ہیں کہ ہر خواہش کے پورا ہونے کے دل سے متمنی ہیں۔ نہ پوری ہو تو جان جاتی ہے۔ اگرچہ لطف الٰہی یا کرم محبوب سے بہت سے ارمان پورے ہوئے پھر بھی کم پورے ہوئے کیوں کہ جتنے ارمان پورے ہوتے ہیں اتنے ہی یا اس سے زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لیئے ترک آرزو بہتر ہے۔ ورنہ یہ سلسلہ تو ایسا ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

اسی واسطے جناب امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔ الغناء فی الغربۃ وطن۔
ارمان کوئی ترکی کہتا ہے کوئی اردو۔ منوچہری دامغانی فرماتے ہیں ؎

نہ امید آں کا بج بہتر شوی تو  نہ ارمان آں کم تو دل بگسلانی

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر  وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

جو خون کہ میری چشم اشک بار سے زندگی بھر مسلسل بہتا رہتا ہے اور جسے ہر مرتبہ کا گریہ دھو دیتا ہے اور اس کی علامت خود میرے جسم پر نہیں وہ خون قاتل کی گردن پر کیا رہ سکتا ہے۔ پھر اسے میرے قتل کر دینے میں پاک نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ وہ مستحق ثواب ہوگا کہ اس نے مجھے اس عذاب دائمی سے نجات دلا دی۔ کیا رہے گا۔ استفہام انکاری ہے یعنی نہیں رہے گا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن  بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

خلد آٹھ بہشتوں میں سے ایک بہشت کا نام۔ کیوں کہ اس میں ہمیشہ قیام رہے گا۔
آدم تو بہشت سے اھبطوا منھا جمیعا کہہ کے نکالے گئے۔ مگر ہم تیرے کوچہ سے دھکے دے کے نکالے گئے کیوں کہ ہم وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ ضمناً کوچہ یار کو بہشت کہنا مقصود ہے۔

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا  اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

بھرم۔ حقیقت۔ عزت۔ آبرو۔ اعتماد۔ شعراء ایران میں درازی قد محبوب حسن ہے اور ہندوستان میں چھوٹا ہونا خوبی ہے اس لیے بوٹا سا قد کہتے ہیں۔ اور زلف کی درازی بھی حسن مانتے ہیں حتیٰ کہ ایڑی سے بھی نیچے پہنچا دیتے ہیں۔ سُرین تک اور کبھی کبھی بنگالنوں کے بال گھٹنوں تک تو دیکھنے میں آئے ہیں۔
یوں تو اے ظالم تیری درازی قد مشہور ہے مگر تیری زلف پرشکن کے پیچ و خم کھل جائیں تو تیری درازی قد دھری رہ جائے اور اس کی حقیقت درازی سب پر واضح ہو جائے۔ یعنی تیری زلف تیرے قد سے بھی دراز ہے اور قد کا حسن جبھی تک ہے جب تک زلف کھلی نہیں ہے۔

مگر لکھوائے اس کو کوئی خط تو ہم سے لکھوائے  ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کے قلم نکلے

اگر کے ہوتے ہوئے۔ مگر۔ نہ معلوم کیوں کہا۔

بہت سویرے قلم کان پر رکھ کے گھر سے اس لیئے چل کھڑے ہوتے ہیں کہ جو کوئی محبوب کو خط لکھے تو انھیں سے لکھوائے تاکہ لوگوں کے راز ان پر ظاہر ہوتے رہیں اور ان کو اس کے توڑ کرنے کا موقع ملے۔ یہ اسی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ یہ شعر بد مذاق ہے۔

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی    پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

جام جم، شہنشاہ جمشید کا جام کہتے ہیں کہ اس کا ایک کنارہ ٹوٹا تھا۔ اس میں غیوبات دکھائی دیتے تھے اور اس میں سات خط تھے۔ شراب کی ایجاد جمشید کے وقت میں ہوئی۔ شراب کے ذکر کے ساتھ جم سے جمشید اور دیو و پری و ملک و مور و طیور کے ذکر کے ساتھ سلیمانؑ مراد لیتے ہیں۔ تاریخ طبری اور شاہنامہ میں جمشید کے زمانہ میں شراب کا ایجاد ہونا اور ایسے جام کا ذکر مطلقاً نہیں۔ یہ آخری بات جناب نظم نے لکھی ہے۔
اب پھر وہ زمانہ آگیا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی مے خواری کی نسبت میرے ساتھ کی جائے اور جام جمشید بھی دوبارہ میرے وقت میں دنیا میں نکل آئے۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کے داد پانے کی    وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

خستہ ۔ زخمی۔
جن سے امید تھی کہ یہ ہمارے زخمی ہونے کی داد دیں گے وہ تو ہم سے زیادہ خستۂ تیغ ستم فلک نکلے۔ یعنی دنیا میں ہو کر راحت کسی کو نصیب نہیں سب آسمان کے ستائے ہوئے ہیں۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا    اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کسی پر دم نکلنا ۔ کسی پر جان دینا اس کا والہ اور شیدا ہونا۔
محبت میں جینے اور مرنے میں کیا تفاوت و فرق رہ گیا جبکہ جس پر جان جاتی ہے اسی کے دیکھنے سے زندگی بھی ملتی ہے۔ بہت خوب شعر ہے۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ    پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

کہاں مے خانہ کا دروازہ اور کہاں واعظ یہ تو بعید اور تعجب خیز امر ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کیوں کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جب ہم مے خانہ سے نکل رہے تھے تو وہ مے خانہ میں جا رہا تھا۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ حاصل اس شعر کا یہ ہے کہ شراب ایسی ہی چیز ہے کہ واعظ بھی چھپ کے پی لیتے ہیں۔

---

غزل ۸۸ — اشعار ۲

۸۸غ
۲

کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائیے — بے تکلّف اے شرار جستہ کیا ہو جائیے

صدا آواز بازگشت (ECHO) پہاڑ یا بلند عمارت سے ٹکرا کے آواز پلٹ آتی ہے۔ اس پلٹ کے آنے کو بار خاطر سے تعبیر کیا ہے۔ شرار جستہ۔ پتنگا۔ ہوں کے ساتھ اب ہو جاؤں بولتے ہیں۔
اگر صدا ایسی لطیف چیز بھی بنتا ہوں تو کوہ ایسے گراں وقار کو بھی بار خاطر ہوتا ہوں تو پھر اے پتنگے تو ہی بتا کہ تیری طرح بے ہو کر تڑپ کے جان کیسے دے دوں یہ فعل تو میرا منافی ضبط و تحمل ہو گا۔ لوگ مجھے کیا کہیں گے۔ (ماخوذ از شرح نظم)۔
جناب حسرت۔ شرار سے پوچھتا ہے کہ صدا بن کے بھی ہم بار خاطر کوہ ہوتے ہیں۔ اب تو ہی بتا کہ ہم کو کیا ہونا چاہیئے۔ اس انداز سوال سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میں بھی شرار کے مانند بے تکلف دم بھر میں جل بھن کر فنا ہو جانا چاہتا ہوں۔
بغیر کسی تکلف کے اے شرار جستہ مجھے بتا دے کہ آخر میں کیا بنوں کہ کسی کے بار خاطر نہ ہوں کیا تیری طرح جل کر فنا ہو جاؤں۔

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس — از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

کنج قفس۔ قالب جسمانی۔ یا دنیا و فلک۔
میرا یہ قفس جسمانی میرے بال و پر کے لیئے بیضہ (انڈے) کی طرح ننگ و عار ہے۔ یعنی تعلق جسمانی کی وجہ سے روح کی خوبیاں ظاہر نہیں ہو سکتی ہیں۔ اگر اس قالب عنصری سے نجات مل جائے تو ایک نئی زندگی روحانی ہاتھ لگے جس طرح انڈے سے پرندہ نکل کر ایک نئی زندگی پاتا ہے اور آزاد ہو جاتا ہے۔

---

۸۹غ
۳

غزل ۸۹ — اشعار ۳

مستی بذوق غفلت ساقی ہلاک ہے — موج شراب اک مژہ خواب ناک ہے

ساقی کو غفلت شعاری یعنی شراب دینے میں تاخیر و تساہل کرنے سے مزہ آتا ہے۔ یہاں خود ذات مستی (مبالغۃً) اس کے تاخیر کرنے سے ہلاک ہو رہی ہے۔ اور شراب کی موجیں چشم ساغر میں مژہ خواب آلود معلوم ہوتی ہیں افیمیوں کی پینک آ رہی ہے۔

مژہ کو خواب ناک کہنا نرالی بنوٹ ہے۔ چشم خواب ناک ہوتی ہے۔ بے مزہ تصنع ہے اور ان کا اصلی طرز کلام یہی ہے۔ موج کی تشبیہ مژہ سے ہو سکتی ہے اس لئے مژہ کہا۔

جناب نظم۔ ساقی کی ادائے غفلت شعاری نے مستی کو بھی ہلاک کر رکھا ہے اور شراب اس ذوق و شوق میں ایسی بے خود اور سرشار ہو رہی ہے کہ جو موج شراب ہے وہ دیدۂ ساغر کی مژہ خواب ناک ہے۔

جناب حسرت۔ مستی شراب کو بھی ساقی کی ادائے تغافل نے مست و بے خود بنا رکھا ہے۔ یہ وہی مطلب جناب نظم کا ہے۔

دونوں بزرگ خود مستی کو مست بنا رہے ہیں۔ اور شعر میں مستی کی ہلاکت کا ذکر ہے۔

جناب آسی۔ چشم مست کے لئے موج شراب مژگان خواب آلود ہے۔ یا دیدۂ ساغر کے لئے موج شراب مژہ خوابناک ہے۔ جناب نظم ہی کی بات بغیر حوالہ مختصر لکھ دی۔

چشم مست کہاں سے آ پڑی۔ دوسری تاویل جناب نظم کی ہے۔

جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

اگرچہ خیال حواس خمسۂ باطنی میں سے ہے مگر بول چال میں محل خیال دل ہی ہے۔ جیب خیال۔ مراد دل۔ تیرے ہاتھوں۔ تیری بدولت۔

تیری تیغ ناز نے جیب خیال (دل) کو ایسا چاک کر دیا کہ اب دل میں سوا زخم تیغ ناز کسی آرزو کے ٹھہرنے کی گنجائش نہ رہی۔ بالفاظ دیگر جناب نظم نے یہی معانی لکھے ہیں۔

جناب آسی۔ یہی نہیں کہ میرا گریبان اور دامن پیراہن تیرے خیال میں چاک ہو رہا ہے بلکہ مجھے سوائے گریبان پھاڑنے کے اور کوئی خیال بھی نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تیرے ہاتھوں جیب خیال تک ثابت نہیں۔

اپنے معنی لکھنے کے بعد جناب نظم کے معنی پر اعتراض فرماتے ہیں کہ مصنف نے دل اور جیب خیال دو لفظ رکھے ہیں۔ اس صورت میں تاویل جناب نظم غلط ٹھہرتی ہے۔

مجھے حسرت رہ گئی کہ جناب نظم و حسرت سے الگ ہو کر جو معنی کہنا چاہتے ہیں ان میں کبھی ایک تو ٹھیک ہوتا۔ ان سے کوئی پوچھے کہ آرزو دل میں ہوتی ہے یا خیال میں۔ جب دل چاک ہو گا جبھی تو آرزو نکل بھاگے گی۔ مصرع اول کے معنی چھوڑ بھاگے

کیوں کہ معنی سے ربط کھانا ہی نہیں ہے۔

جیب خیال کے معنی انہوں نے دل کیے ہیں۔ مطلب تو واضح ہے کہ زخم تیغ ناز کے سوا دل میں آرزو بھی باقی نہ رہی۔ اب جیب دل بھی تیری بدولت آرزو سے خالی ہے۔

دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ دل سے تو آرزو نکل گئی اور ایسی نکلی کہ اب اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ کیوں کہ تیر ناز سے دل تو چاک تھا ہی جیب خیال بھی جب چاک ہے تو آرزو کے رہنے کا ٹھکانا کہاں رہا۔ اس معنی سے (بھی) کی جگہ (تک) بہتر ہوگا۔

قافیہ چاک کی وجہ سے لفظ (جیب) لانے کی ضرورت پڑی۔

جوش جنون سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ    صحرا ہماری آنکھ میں اک مشت خاک ہے

جوش جنون و افراط وحشت کے موافق خاک اڑانے کے لئے کوئی چیز مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ ایک صحرا تو وہ میری نظروں میں ایک مٹھی بھر خاک ہے۔ میرے جوش جنون کے آگے یہ کیا حقیقت رکھتا ہے اور کیا کفایت کر سکتا ہے۔ اور اس جوش میں اتنی سی خاک اڑانے سے کیا کمی آسکتی ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں۔ صحرا کو دیکھ کر ایسا جوش جنون پیدا ہوا کہ کچھ اب سوجھتا نہیں۔ گویا صحرا میری آنکھ میں مٹی بھر خاک تھا۔ اور جس آنکھ میں خاک جھونک دی جائے اسے کیا خاک سوجھے۔

---

غزل ۹۰    شعر ۱

۲۲۴غ    لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی    قیامت کشتۂ لعل بتاں کا خواب سنگین ہے

لعل بتاں۔ لب محبوبان۔ گہوارہ میں جھونک دینے سے بچوں کو نیند آجاتی ہے۔ قیامت۔ غضب کی خواب سنگین گہری نیند۔ قیامت میں مردے جی اٹھیں گے مگر یہ مردے نہیں اٹھتے۔

حضرت عیسیٰ جن کے لب ہلانے (قم باذن اللہ) کہنے سے مردے جی اٹھتے ہیں۔ ان کی جنبش لب گہوارہ جنبانی کا کام دیتی ہے۔ ان کی نیند اور بڑھ جاتی ہے۔ ان حسینوں کے کشتگان لب کی کس غضب کی گہری نیند ہے ان کے مارے ہوؤں کو حضرت عیسیٰ بھی زندہ نہیں کر سکتے۔

---

غزل ۹۱ اشعار ۲

۱۲۶ آمدِ سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

طوفان = آب یا سیلاب مغرق۔ پانی یا ڈبو دینے والا اہلا (بہیا) رو سیل بفتح جریان آب سیلاب مرکب از سیل و آب۔ جریان آب (۔ اہلا۔ بہیا) طغیانی آب۔ آمد سیلاب = سیلاب پر اضافہ نہ پڑھو اور با اضافہ بھی پڑھ سکتے ہیں بدشواری تمام۔ صدائے آب کو سیلاب یا طوفان کہنا نہ معلوم کیا ہے۔ آب کا سیلاب ہوتا ہے۔

سیلاب اور طوفان دونوں الفاظ کا کھپانا کم از کم میرے لئے تو دشوار ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں اور صحیح فرماتے ہیں۔ سچ پوچھو تو یہ شعر بے معنی ہے۔ پانی کہاں سے آیا اس کا کوئی ذکر شعر میں نہیں۔ سیلاب کو اضافت نہ دیں تو بھی کچھ عمل صحیح نہیں نکلتا۔ یعنی طوفان صدائے آب اس کے حق میں سیلاب ہے۔ لیکن آب کہاں سے آیا۔ اور اس کی صدا میں طوفان کیوں برپا ہوا اس کا کچھ ذکر نہیں۔

ایک بزرگ داشت کی بنا پر کچھ معانی پنہاؤ بھی تب بھی حاصل شعر میں کوئی لطف اور مزہ نہیں تصنع ہی تصنع ہے۔ مزید برآں اُردو کی بول چال کے موافق قافیہ (جادہ) کو (جادے) پڑھنا پڑے گا۔ مگر دوسرے شعر کا قافیہ بادہ بتر کیب فارسی ہے اسے بکسر دال ردی نہیں پڑھ سکتے۔ اس کو مجری اور بعض غلو کہتے ہیں۔ جادہ اور بادہ میں دال ہی ردی ہے۔ (ہ) نہیں ہے کیوں کہ (ہ) مختفی میں قابلیت ردی ہونے کی نہیں مانتے ہیں فارسی میں ہائے مختفی کو ردی کبھی نہ دیکھو گے۔ اور اُردو متبع فارسی ہے۔ اسی وجہ سے اُردو میں (ہائے مختفی) کو الف قرار دے کر جن قوافی میں الف ردی ہو اس کے ساتھ لاتے ہیں جیسے آنا۔ جانا۔ اچھا وغیرہ کے ساتھ پردہ اور زمانہ کا قافیہ۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر (ہ) ردی قرار دیں تو وہ وزن شعر میں نہیں آتی اور ردی کو حذف نہ کرنا چاہئے۔ لہٰذا دال ہی ردی اور اختلاف حرکت کی وجہ سے عیب مجری یا غلو بھی ہے ۔

آمد سیلاب کا شور صدائے آب ہے

نقش پا کو استعارۃً ایک شخص مان گیا۔ جب شخص بن گیا تو اس کے کان بھی ہوں گے۔ جادہ کو درازی میں انگلی سے تشبیہ دی اگرچہ جادہ کے معنی لغت میں شاہراہ کے ہیں مگر پگڈنڈی اور بٹیا کے معنی میں لائے تاکہ انگلی سے تشبیہ ہو سکے۔ سے از بہ بیانیہ فارسی کا ترجمہ ہے۔ بمعنی (کے) جادہ کی انگلی۔ زبردستی کے معنی بھی لکھتا ہوں۔

شور صدائے آب گریہ آمد سیلاب پر دال ہے اس لئے نقش پا جادہ کی انگلی اپنے کان میں دے رہا ہے۔ تاکہ آمد سیلاب کی آواز کان میں نہ آئے اور اس کے آنے سے پہلے فنا کا خوف نہ لاحق ہو۔ کیوں کہ سیلاب آکر نقش پا کو تو مٹا ہی دے گا۔

بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا　　　　شیشہ میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

کا وحشت کدہ کے لحاظ سے کہا۔ ورنہ (کی) ہونا چاہئے۔ نثر اس مصرع کی یوں ہوتی ہے۔ ؎

کس کی چشم مست کی بزم مے وحشت کدہ ہے

یہ صحیح ہے کہ موج کی تشبیہ نبض سے ہے۔ مگر نبض پری کو شیشہ میں چھپانے کے کیا معنی ہوں گے۔ عزائم خان پری کو اپنی عزیمت اور منتر سے بوتل میں اتار کے زمین میں اس بوتل کو کس کے ڈاٹ لگا کے دفن کرا دیتے ہیں۔ پریوں کا مسکن ویرانہ تجویز کرتے ہیں۔ اس لئے وحشت کدہ لائے۔ مگر چشم مست ساقی یا محبوب سے بزم مے کا وحشت کدہ ہو جانا میرے ایسے آدمی کی سمجھ سے باہر ہے۔ موج بادہ سے میرے خیال ناقص میں یہ (سے) بھی از بیانیہ کا ترجمہ ہے یعنی بادہ کی پری۔ بے خوار اور شعرا اپنی پسندیدگی کی وجہ سے شراب کو پری کہتے ہیں۔

میں شاعر نہیں اسی وجہ سے مصرع ثانی یوں تجویز کرتا ہوں ؎

شیشہ میں گویا پری پنہاں ہوئی ہے بادہ سے

یا ؎

ہے صراحی میں پری پوشیدہ گویا بادہ سے

اب وہ عیب تجربی بھی نہ رہا۔

چشم ساقی کی صفت مست اور بیماری یوں ہی ہے۔ یا اس وقت سے پہلے جو شراب پی ہے اس کی مستی ابھی باقی ہے اس لیئے شراب دینے میں تاخیر کر رہا ہے جس کی وجہ سے بزم مے وحشت کدہ ہو رہی ہے۔ چوں کہ تقسیم کے لئے صراحی سے جام و ساغر میں ابھی نہیں آئی ہے تو شراب گویا ایک پری ہے جو شیشہ میں بند ہے۔

جناب نظم۔ (کا) کے یہ معنی ہیں کہ کس کی چشم مست نے بزم مے کو وحشت کدہ بنا دیا ہے اور موج شراب کو نبض پری سے تشبیہ دی ہے۔ تاکہ مطلب یہ نکلے کہ پری بزم مے سے وحشت کر کے شیشہ میں چھپ گئی۔

جناب حسرت۔ بزم مے اس کی چشم مست کے اثر سے یکسر وحشت کدہ بن گئی ہے وہاں کی ہر چیز سے وحشت نمودار ہے۔ مثلاً شیشہ میں بصورت موج بادہ گویا نبض پری پنہاں ہے۔ موج بادہ کو نبض پری سے مشابہ کر کے اظہار وحشت کیا ہے۔

جناب آسی ایک معنی تو وہی لکھتے ہیں جو اور شارحین نے لکھے۔ دوسرے معنی میں جودت طبع دکھاتے ہیں۔ یا یہ کہ پری کے سایہ سے انسان کو وحشت ہوتی ہے۔ یہ شیشہ میں موج مے ہے یا نبض پری ہے جس سے بزم سراسر وحشت کدہ بنی ہوئی ہے۔ اور مے کو پری سے مشابہت بھی دی جاتی ہے۔

شعر چشم مست ساقی کو علت بزم مے کے وحشت کدہ ہونے کی قرار دیتا ہے۔ اور یہ پری کے شیشہ میں بند ہونے کو علت ٹھہراتے ہیں۔ اور چشم مست ساقی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا یہ الفاظ بے کار ہیں۔ موج کی مشابہت کی وجہ سے لفظ نبض لائے جو معنی میں مخل ہے۔

غزل ۹۲ شعر ۱

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

نیرنگی و عجائب کاری تمنا کا صرف دیکھنا مقصود ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ کوئی تمنا پوری بھی ہو۔ کبھی امید اور کبھی یاس جو تمنا کرنے میں ہوگی اس کا مزہ اور ملال صرف دیکھنا ہے۔

غزل ۹۳ شعر ۱

مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی سیاہی جیسے گر جائے دم تحریر کاغذ پر

سیاہی شب ہجر نامہ تقدیر پر اس طرح پھیل گئی ہے کہ سب نوشتہ تقدیر اس میں چھپ کے رہ گیا۔ کچھ پڑھا نہیں جاتا۔ پس تصویر سیاہی شب ہجر ہے۔ جس طرح وقت تحریر پر روشنائی گر جائے اور تحریر پڑھی نہ جائے۔ یعنی میری قسمت میں ہجر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ قسمت سے نامہ قسمت مراد ہے۔ اور فرض یہ کیا ہے کہ خط تقدیر کے سب حروف تصویریں ہیں۔ مثلاً جیسے حروف مصر قدیم میں رواج رکھتے تھے۔ اور جو لوگ شانہ بین یا ہاتھ دیکھتے ہیں ان کا بھی یہی خیال ہے۔

لفظ تصویر سے مرحوم کا خیال نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

غزل ۹۴ اشعار ۵

ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

ہجوم نالہ کے بعد (ہے) محذوف ہے۔ مراد فوج کشی نالہ۔

نالہ فرج کشی کر رہا ہے۔ اور حیرت (کہ یہ معاملات عشق و عاشقی کس قسم کے ہیں) کی وجہ سے میں ایک فریاد بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ خموشی حیرت سونیستان کے ریشوں سے اظہار عجز و مغلوبیت کر رہی ہے کہ ہم ان نالوں کے حریف بوجہ ضعف نہیں بن سکتے۔

پہلے دانتوں میں تنکا اظہار عجز کے لیئے دباتے تھے۔ جیسے اب سفید جھنڈیاں بلند کرتے ہیں۔ اور نیستان کے ریشوں کے تنکے اس لیئے کہے کہ نے سے بانسری بناتے ہیں اور نالۂ نے شعرا میں مشہور ہے۔ لفظ صد سے مقصود (اظہار مغلوبیت کثیر ہے اور (یک) کے ساتھ صنعت بھی ہے۔

جناب نظم ہجوم نالہ سے پہلے (اے) محذوف مان کر نالہ کو مخاطب قرار دیتے ہیں۔

تکلف بر طرف ہے جانستاں تر لطف بد خویاں ‫ ‫ نگاہ بے حجاب ناز تیغ تیز عریاں ہے

میں بغیر لگی لپٹی صاف صاف کہتا ہوں کہ محبوبان بد خصلت کا لطف بھی زیادہ جان لیوا ہوتا ہے، کیوں کہ ان کی نگاہ بے حجاب ناز تو ننگی تلوار ہے۔ ایسی نگاہ کے ہوتے ہوئے اگر بنظر لطف بھی دیکھیں تو وہ بھی قتال عالم ہوتی ہے۔

ہوئی یہ کثرت غم سے تلف کیفیت شادی ‫ ‫ کہ صبح عید مجھ کو بد تر از چاک گریباں ہے

شادی کا مزہ اور لطف کثرت غم سے اس قدر مٹ گیا کہ صبح عید جو خوشی کا وقت ہے۔ میرے لیئے بد تر چاک گریباں سے ہے جو علامت غم ہے۔

صبح کے پو پھٹنے کو استعارۃً شعرا چاک گریبانی کہا کرتے ہیں۔ بیہ۔ اور۔ وہ بمعنی اس قدر۔ بہت زیادہ۔ عظمت اور ضخامت کے لیئے لاتے ہیں۔

دل و دین نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے ‫ ‫ کہ اس بازار میں ساغر متاع دست گرداں ہے

متاع دست گرداں = وہ مال جو پھیری والا تاجر ہاتھ میں لے کر گلیوں گلیوں بیچتا پھرتا ہے۔ محفل مے خواری میں ساغر بھی ہاتھوں ہاتھ گردش میں آتا ہے۔

اے مخاطب اگر تجھ کو ساقی سے سودا کرنا ہے تو دل و دین کی رقم نقد پیش کر کیوں کہ اس بازار عشق میں ساغر کا مال ایک متاع دست گرداں ہے جو ادھار نہیں ملتی ہے اور اس کی قیمت دل اور دین ہے۔ پیسہ اس کی قیمت نہیں۔

غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو — چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجان ہے

پرورش دینا فارسی پرورش دادن کا ترجمہ ہے۔ اردو میں پرورش کرنا بولتے ہیں (پرورش کرتا ہے عاشق کی) قلزم۔ شہر قلزم کی نسبت سے ایک خاص سمندر کا نام ہے جو درمیان مکہ و مصر ہے مگر شعرا بمعنی مطلق بحر استعمال کرتے ہیں۔ بلا کو صرصر (آندھی) کہا۔ مرجان۔ مونگا۔ سرخی رنگ کی وجہ سے چراغ روشن سے تشبیہ دی۔ بحر جاپان کے کورل آئیلینڈ (جزائر مرجان) مشہور ہیں۔ چراغ روشن۔ کنایہ اپنی جان یا دل یا ذات عاشق سے ہے۔

عشاق کی پرورش بلاؤں کی گود میں غم کیا کرتا ہے۔ گویا ہمارا دل یا ہماری ذات وہ چراغ روشن ہے جو بلاؤں کی آندھیوں میں روشن ہے۔ جیسے چراغ مرجان قلزم صرصر میں روشن رہتا ہے۔

---

غزل ۹۵ — اشعار ۳

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے — نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے

نگاہ کا دل سے نکلنا میں نہ سمجھ سکا۔ سرمہ۔ کہتے ہیں کہ برق تجلی سے جو کوہ طور جل گیا تھا اسی کے جلے ہوئے پتھر سے سرمہ بنتا ہے۔ شاید معدنی چیز ہے۔ سرب سوختہ۔ تماشا ادا = ادائے قابل دید۔ کہتے ہیں کہ سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ (بیٹھ) جاتی ہے۔ شاعر خموشی اور سرمہ میں تلازم قرار دے کر خموشی اور سرمہ کو ایک چیز قرار دیتا ہے ؎

نگاہ چشم تری سرمہ سا نکلتی ہے

یا

صدا گلے سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

اس مصرع پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ بیٹھی ہوئی آواز میں کون سی ادا قابل دید ہوگی۔ تو یہ جواب دے سکتے ہیں کہ معشوق کی ہر بات عاشق کو بھلی ہی معلوم ہوتی ہے۔

خموشی دیعنی سرمہ بوجہ تلازم) تیری نگاہ میں سرمہ کا کام کرتی ہے۔ یہ نگاہ سرمہ آلود میں یا تیری خموشی میں ایسی ادا پائی جاتی ہے جو قابل دید ہے۔

دونوں بزرگ دل ہی سے نگاہ نکالتے ہیں تو میرا نہ سمجھنا کیا وقعت رکھتا ہے۔

فشار تنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم — صبا جو غنچہ کے پردہ میں جا نکلتی ہے

غنچہ کی پتیاں جب تک نہ کھلیں خوب گتھی ہوتی ہیں۔ اس میں گنجایش کسی کی نہیں ہوتی۔
غنچہ ایسا پردہ نشین اور خلوت گزین ہے کہ اس تک کوئی پہنچ نہیں سکتا۔ اگر صبا اس تک پہنچتی ہے۔ تو تنگی جاے
اسے اس قدر فشار ہوتا ہے کہ پانی پانی ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام شبنم ہے۔ ہوا کا پانی اور پانی کا ہوا ہو جانا مانا ہوا مسئلہ ہے
کسی کی فرمایش سے سہی مگر شرح دیوان غالب لکھ رہا ہوں اور ایسا صاف شعر بھی نہیں سمجھتا تو پھر مشکل اور پیچ دار
کا کیا ذکر۔
غنچہ محبوب بلبل ہے اور خلوت نشین و شرمگین اس تک کسی کو رسائی نہیں ہاں اپنے کو مٹانا پسند کرے تو جائے۔ جس
طرح صبا اپنے کو مٹا دیتی ہے اور بصورت شبنم ہو کر اس تک پہنچتی ہے۔

## نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آب تیغ نگاہ ۔۔۔ کہ زخم روزن در سے ہوا نکلتی ہے

زخم روزن در ۔ زخم کا لمبا۔ چوڑا اور وار پار جسم سے ہو جانا مراد ہے۔ اور جو زخم ایسا ہو کہ جس سے ہوا نکلے
وہ مہلک ہوتا ہے۔ (مگر اس بات کا مجھے علم نہیں ہے)۔ دونوں بزرگوں نے اسے لکھا میں نے بھی نقل کر دیا۔ زخم روزن
در بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔
سینۂ عاشق سے تیزی تیغ نگاہ کی حالت کچھ نہ پوچھو کہ یہ زخم روزن در کی طرح سمجھا تا ہے اور اس سے ہوا وار پار
جاتی۔ ہے۔ جس طرح روزن در سے مرور ہوا ہوتا ہے۔
جناب نظم۔ جس دروازہ سے وہ جھانکتا ہے اس میں روزن نہ سمجھو بلکہ تیغ نگاہ نے زخم ڈال دیا ہے اور زخم بھی
ایسا گہرا کہ جس میں سے ہوا نکلتی ہے پھر سینۂ عاشق کی کیا حقیقت ہے۔ جس زخم سے ہوا نکلے اور سانس دینے لگے وہ ضرور
مہلک ہوتا ہے۔
جناب حسرت۔ حوالہ دے کر انھوں نے معانی جناب نظم نقل کر دیئے۔

---

## غزل ۹۶ ۔۔۔ اشعار ۱۰

## جس جا نسیم شانہ کش زلف یار ہے ۔۔۔ نافہ دماغ آہوے دشت تتار ہے

۲۲۶ غ
۱

تتار ۔ روسی ترکستان میں ایک شہر جس کے مشک نافہ والے ہرن اور ان کا مشک شعرا میں مشہور ہے۔
جہاں کہیں زلف مشکین یار میں نسیم کنگھی کرتی ہے تو اس زلف معطر کے اثر سے دشت تتار کے آہو کا دماغ بھی
نافہ ہو جاتا ہے۔

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا      آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

سراغ ۔ کھوج ۔ حیرت کو بوجہ سکوت وصوت آئینہ سے اور آئینہ کو حیرت سے تشبیہ دیا کرتے ہیں ۔ اے خدا خطاب خدا سے استعجاب کے ساتھ ہے ۔ شش جہت ۔ خاور ۔ باختر ۔ برین و فرودین و بالا وزیر ۔ انتظار کو ایک ملک وسیع مان کے اس کے لیے شش جہتیں قرار دیں ۔

حیرت کو کس کے جلوہ کا پتا لگانا منظور ہے کہ آئینہ بن کر ملک انتظار کے چھٹوں طرفوں میں فرش کی طرح پھیلی ہوئی ہے کہ کہیں تو اس محبوب (حقیقی یا مجازی کا) پتا لگے ۔

حیرت دو ہیں ایک مذمومہ جو جہالت سے ہوتی ہے ۔ دوسرے محمودہ جس کی نسبت حضرت رسالت مآب صلعم فرماتے ہیں اللھم زدنی حیرۃ فیک ۔

نظم و حسرت و آسی سب آئینہ کا فرش لگانا تجویز کرتے ہیں اور میں نے حیرت کو آئینہ قرار دیا ہے ۔

ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق      گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

میری سمجھ میں نہ الفاظ آتے ہیں اور نہ شعر ۔ غبار خود ہی ذرات ہوتا ہے ۔ غبار شوق کا ذرہ ذرہ ہو جانا کیا ۔ پھر غبار شوق کو دام سے استعارہ کرنے میں وجہ شبہ کیا ۔ اور اس غبار شوق کا صحرا اگر شکار بھی ہو گیا تو کیا ہرج ہوگا ۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ شوق کس بات کا ۔ اس شرح کو اپنے ذمہ لے کر عجب مصیبت میں پڑ گیا ۔ اتنی زحمت اٹھانے کے بعد چھوڑتے بھی نہیں بنتا ۔ گڑ بھرا ہنسیا ہو گئی نہ نگلتے بنتا ہے اور نہ اگلتے ۔ شارحین اپنی وسعت نظر و معلومات سے بلا پس و پیش اس دشوار راستہ کو طے کر جاتے ہیں اور میں دلدل میں پھنس کے رہ جاتا ہوں ۔

جناب نظم ۔ غبار شوق کو اُڑنے کی جا نہ ملے اس سبب سے ذرہ ذرہ ہو کر رہ گیا اور ذرے پھیل کر دام بن گئے ۔ کہ جس کا شکار فضائے صحرا ہے ۔ یعنی غبار شوق جال بن کے تمام صحرا پر چھا گیا ہے ۔ اس حاصل سے شعر میں کیا لطف اور مزہ پیدا ہوا ۔

دوسرے شارحین بھی اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں لکھ رہے ہیں ۔

ذرہ ۔ ذرات عالم یا جسمانی ۔ تنگی ۔ تنگی عالم ۔ دام ۔ وہی تنگی جا صحرا ۔ صحرا شوق مفرط دید محبوب دام پرندہ کے لیے جائے تنگ ہے ۔ یہ عالم یا جسم ان کے شوق کثیر کے لئے تنگ ہے ۔

ہر ذرہ عالم یا جسم تنگی عالم سے پس کے غبار شوق ہو گیا ۔ اور کوئی شوق دید پورا نہ ہوا ۔ اگر تنگی عالم کا یہی رنگ ہے تو دیکھنا ایک دن یہ شوق مفرط کا صحرا اس جال میں پھنس کے رہ جائے گا ۔ شکار کی طرح یعنی مٹ جائے گا ۔

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ　　　　نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس میں دو خرابیاں ہیں کیوں کہ یہ اصل میں دو جملے ہیں۔ دل مدعی بنا۔اور۔ دیدہ مدعا علیہ بنا۔اور یہ دونوں جملے اُردو کے ہیں۔ان کے درمیان واو عطف فارسی نہ ہونا چاہئے۔ دوسرے دیدہ فارسی میں بمعنی چشم ضرور ہے اور دوسرے شعراء نے بھی اُردو میں نظم کیا ہے۔مگر اردو میں ہر جگہ آنکھ کے بدلے دیدہ لانا اچھا نہیں۔ پھر یہ لفظ آنکھ کی جگہ عورتوں کی زبان پر خاص طور سے ہے۔جیسے دیدے پھوٹیں دیدوں کے آگے آئے۔ دیدہ دلیل (ڈھیٹ بے شرم) وغیرہ اور مجھے (پھر) کا لفظ بھی برائے بیت معلوم ہوتا ہے۔دوبارہ کے ذکر کا کیا خاص فائدہ اور معانی میں اس سے کیا اضافہ اور خوبی پیدا ہو رہی ہے۔لہٰذا بنا بر رائے جناب نظم یہ شعر یوں ہو سکتا ہے ؎

دل مدعی تو چشم بنی مدعا علیہ　　　　نظارہ کا مقدمہ اب روبکار ہے

(بنی میں تنازع مخلان ہوگا) اس تنازع کے دور کرنے کے لئے دونوں لفظ مذکر لائے۔

فائدہ مقدمہ بجائے مرافعہ اور روبکار بمعنی دائرا ور پیش کرنا اور روبکاری بمعنی پیشی دسماعت ہندوستان میں گڑھے گئے ہیں۔

دل نے آنکھ پر دعویٰ کیا ہے کہ تو نے ہی محبوب کا حسن وجمال دیکھ کر مجھے مصیبت میں پھنسایا ہے اور دوبارہ یہ مقدمہ چل رہا ہے۔

چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگ گل پر آب　　　　اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

جس طرح ایران و ہندوستان میں مسافر کے دروازہ سے نکلنے کے بعد کہتے ہیں کہ پلٹ کے دیکھو اور اسے شگون نیک بخیریت واپس آنے کا سمجھتے ہیں۔اسی طرح ایران میں آئینہ میدان میں رکھ کے اس پر پانی بھی گراتے ہیں اور اسے مسافر کے لئے شگون نیک مانتے ہیں ؎

آب بر آئینہ ریزند تفائے سفرے

گلاب کے پھول کی پتیوں کے آئینہ پر شبنم پانی چھڑک رہی ہے۔اے بلبل اس رسم کے ادا کرنے سے ظاہر ہے کہ بہار نے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہے۔

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے　　　　وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

پیچ ۔ اپنی بات، کی پیروی ۔ نبھاؤ ۔ ہٹ ۔ اصرار ۔ پہ بھی نگر ہے ۔ پر اور یاں سے یہاں فصیح ہے اس لئے
جناب نظم مصرع ثانی کی یوں ترمیم کرتے ہیں ۔ اور پر یا پہ کا حذف موافق روزمرہ ہے ؎

وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے

مصرع ثانی بتا رہا ہے کہ اسے وعدہ خلاف سمجھتا ہے ۔
دلدار نے جب آنے کا وعدہ کیا ہے تو ہم پر بھی لازم ہے کہ ہم انتظار کریں ان کے آنے یا نہ آنے سے غرض نہیں ۔
یہ تو کہنے کو نہ ہو کہ تم نے انتظار تو کیا نہیں پس جب معلوم ہوا کہ تم گھر پر نہیں ہو لہٰذا ہم نہ آئے ۔ اور تیرا انتظار نہ کرنا دال اس
بات پر نہ ہوگا کہ تو نے میرے وعدہ کو جھوٹ سمجھا ۔
جناب نظم یہ بھی لکھتے ہیں کہ خود ہندی غالبؔ نے اپیج کو مذکر استعمال کیا ہے اور یہاں مؤنث ۔ آخری فیصلہ ان کا
نہ معلوم ہوا ۔

بے پردہ سوئے وادی مجنون گذر نہ کر ہر ذرہ کی نقاب میں دل بے قرار ہے

جناب نظم فرماتے ہیں کہ ذرہ کے جگمگانے کو دل کے تلملانے سے تشبیہ تا ہے ۔ غرض یہ ہے کہ وادی مجنون میں جو ذرہ
ہے وہ آئینہ دار بیتابی مجنون ہے ۔
یہ کوئی نہیں لکھتا کہ بے پردہ جانے میں کیا ہرج ہوگا ؎

جو ذرہ ہے وہ ایک دل بے قرار ہے

اے مخاطب (لیلیٰ یا محبوب) دشت مجنون میں بے پردہ نہ جا ۔ کیوں کہ ہر ذرہ وادی مجنون کا ذرہ نہیں ہے بلکہ ذرہ کی شکل
میں ایک دل بے قرار مجنون ہے جس کی بے تابی تجھ ۔ سے دیکھی نہ جائے گی لہٰذا بے نقاب وہاں نہ جا ۔ ظالم سے ظالم کا دل بھی
اسے دیکھ کر ۔ بے قرار ہو جاتا ہے ۔

اے عندلیب یک کف خس بہر آشیاں طوفان آمد آمد فصل بہار ہے

بہر آشیاں = مہیا کر محذوف ہے ۔ ایسا حذف اُردو میں اچھا نہیں معلوم ہوتا ۔
اے بلبل باغ میں آشیانہ بنانے ۔ کے لئے مٹھی بھر تنکے جمع کر لے ۔ ورنہ فصل بہار کی آمد کا جوش اور طوفان اُٹھ رہا
ہے ۔ بہار آکر ہر ایک شئے کو سرسبز و شاداب کر دے گی اور تنکے پھر ہاتھ نہ لگیں گے ۔ پھر کیسے باغ میں آشیانہ بنا سکے گی ۔
اور دیدار محبوب گل کیسے کرے گی ۔

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی　　اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

آئینہ مراد دل ۔ تمثال ۔ تصویر ۔ عکس ۔ خبر ۔ واقعہ ۔ حقیقت ۔ یا ۔ معشوق کا سامنے ہونا یا تمنا و آرزو و حسرت کا پورا ہونا ۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس لفظ کو کچھ نہ سمجھا ۔
اے مخاطب دل کو نہ کھو بیٹھ ۔ اس میں تصویر یار یا مجمع حسرت تو ہے ۔ اگر معشوق سامنے نہیں ہے یا حصول مراد نہیں جو کچھ بھی ہے ۔ اسی ہی کی سیر کیا کم ہے ۔ اسی کو غنیمت سمجھ ۔ اور اس تمثال دار آئینہ دل کو ضائع نہ کر ۔
جناب نظم ۔ جس دل میں دنیا بھر کی حسرتیں اور آرزوئیں بھری ہیں وہ آئینہ تصویر تو ہے ۔ اگرچہ اس میں ایسی صفائی نہیں ہے کہ جلوۂ معرفت ہو سکے لیکن یہ سیر کیا کم ہے ۔ کعبہ سے اگر بت نہ نکل سکیں تو کیا ہوا بت خانہ کی کیفیت تو اس میں موجود ہے ۔
جس طرح کہ جملہ کا مطلب خبر سے پورا ہو جاتا ہے ۔ اس طرح حصول مطلب نہیں ہوا ۔

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط　　اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

غفلت نے عمر بھر کی کفالت کر لی ہے اور ٹھیکہ لے لیا ہے کہ یہ کبھی دور ہونے کی نہیں ۔ اے مرگ ناگہانی اب تجھے انتظار کس بات کا ہے کیوں نہیں آجاتی ایسے غافل اور مبتلائے عیش و نشاط کے جینے کی کیا ضرورت اور وہ دنیا میں رہ کر کس کام کا ہے ( پہلے مصرع سے "ہے" محذوف ہے ۔ لہٰذا عطف فارسی و اردو جملوں میں مثل سابق ہوا ۔ جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس کی پروا نہیں کرتے ۔

---

## غزل ۹۷　　اشعار ۷

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے　　ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسن و جمال میں تو تیرا مثل و نظیر کوئی ہے نہیں ۔ ہوتا تو لا کے تیرے سامنے کھڑا کر دیتا کہ تجھ کو کس بات پر ناز ہے تیرا ایسا دوسرا بھی موجود ہے ۔ لہٰذا ضرورت آپڑی کہ آئینہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دوں کہ اس میں اپنا ہی عکس دیکھ کے حیران ہو جائے کہ ارے یہ ہمارا مثل کہاں سے آگیا اور حیران ہو کر دوسروں کے لئے تماشا ہو جائیں ۔ یا وہ عکس خود ان کے لئے تماشا ہو جائے ۔

حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

تری بزم خیال یعنی میرا دل ۔ سویدا ۔ نقطۂ سیاہ قلب ۔ گلدستہ نگاہ ۔ کسی شارح نے نہ بتایا کہ کس کی نگاہ اور میری بھی سمجھ میں نہیں آتا ۔ شاید مجموعہ آرزو و تمنا مراد ہو جو محبوب سے عاشق کے دل میں ہیں ۔ مختلف آرزوؤں کو گلدستہ اس لیئے کہا کہ گلدستہ میں بھی مختلف پھول اور پتیاں ہوتی ہیں ۔ بزم خیال بھی کثرت آرزو کی وجہ سے بنائی ۔

حسرت نے میرے دل میں تمہاری طرف کی مختلف آرزوؤں کا ایک گلدستہ بنا کے رکھ دیا ہے ۔ جو نگاہوں کو گلدستہ کی طرح بھلا معلوم ہوتا ہے اور لوگ اسے سویدا ، دل سمجھتے ہیں ۔ یا میں سویدا کی طرح اسے دل سے لگائے ہوں ۔ حسرت نے اسے بنایا ہے اس لیئے یہ تمنائیں پوری تو ہوں گی نہیں ۔ اور عزیز اس لیئے ہیں کہ تمہارے ساتھ ان کی نسبت ہے ۔

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا افسون انتظار تمنا کہیں جسے

استفہام بطور استعجاب ہے ۔

یا اللہ محبت کے ساتھ گوش محبت میں تمنا پوری ہونے کے انتظار کا منتر کس نے پھونک دیا ہے جو عاشق حصول تمنا کے منتظر رہتے ہیں ۔ معشوق بھی کہیں تمنائیں پوری کیا کرتے ہیں ۔

سر پر ہجوم درد غریبی سے ڈالئے وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے

غریبی ۔ مسافرت پہلے بمعنی مفلسی و مسکینی عربی و فارسی میں نہ تھا ۔ اب زبان حال فارسی میں یہ معنی آ گئے ۔ کسی کے سر پر خاک ڈالنا ۔ اس کا ترک کر دینا اس بات کو دبا دینا ۔

مسافرت اور غریب الوطنی میں جو بکثرت تکلیفیں ہوتی ہیں اس لیئے اسے اختیار نہ کرنا چاہیئے بلکہ غربت کے سر پر خاک ڈالنا اتنی زیادہ مناسب ہے کہ صحرا کی خاک مٹھی بھر خاک ہو ۔ صحرا بھر کی خاک کو بنظر حقارت مٹھی بھر خاک کہا ۔

ہے چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں شوق عنان گسیختہ دریا کہیں جسے

عنان گسیختہ ۔ بگٹٹ " جب باگ ٹوٹ جائے تو گھوڑا سوار کے اختیار میں نہیں رہتا اور بے تحاشا بھاگتا ہے ۔

شوق عنان گسیختہ کو بوجہ روانی دریا کہا ہے اور اس سے مجازاً جوش اشک مقصود ہے ۔

چشم گریاں میں حسرت دیدار سے وہ شوق بے اختیار وکثیر پنہاں ہے جس کو بحر کہہ سکتے ہیں۔ اور ہر وقت بہ نکلنے پر تیار ہے۔

درکار ہے شگفتن گلہائے عیش کو　　صبح بہار پنبہ مینا کہیں جسے

عیش کے پھولوں کے کھلنے کے لیئے اس صبح بہار کی ضرورت ہے جسے صراحی کی روئی والی ڈاٹ کہتے ہیں۔ باغ کے پھولوں کے کھلنے کے لیئے صبح بہار کی نسیم

روئی کی ڈاٹ کو بوجہ سپیدی صبح سے تشبیہ دی۔

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے　　ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

غالب اگر واعظ سے خوار ہونے کی وجہ سے (چاہے دوسرے اطوار میں تو اس سے اچھا ہی کیوں نہ ہو) تجھے برا کہے تو اس کے کہنے کا برا نہ مان۔ دنیا میں کون ایسا ہے جسے سب اچھا کہتے ہوں۔ جو خود اچھے ہوتے ہیں وہ کسی کو برا نہیں کہتے ہیں۔

---

غزل ۹۸　　　　اشعار ۱۱

شبنم بگل لالہ نہ خالی زادا ہے　　داغ دل بے درد نظرگاہ حیا ہے　۲۲۸ غ ۱۱

بالفاظ موجودہ بھی پورا شعر فارسی کا ہے۔ نہ بھی چاہے تو (ہے) کی جگہ ہست لگالو۔ نہ خالی زادہ ہے نہ کی جگہ۔ نہیں چاہیئے۔ یعنی خالی از ادا نہیں ہے۔ گل کے ساتھ (ب) اور ادا کے ساتھ (ز) اور بھی اردو میں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ مصرع ثانی یوں سیدھا ہو سکتا ہے ـــ

داغ دل بے درد نکوہش کا سزا ہے

سزا بمعنی سزاوار (برہان دیکھو) ادا = بیان مطلب۔ نظرگاہ = منظر۔

فارسیت اس قدر غالب ہو گئی کہ امتیاز اردو و فارسی مفقود ہو گیا۔

گل لالہ پر شبنم کا ہونا اس مطلب کو ادا کر رہا ہے کہ جس دل میں داغ تو ہو مگر اس میں درد عشق نہ ہو وہ محل نظر شرم ہے۔ یعنی لالہ میں داغ ہے مگر درد نہیں ہے۔ اس لیئے اسے شبنم نہ سمجھو بلکہ بے درد ہونے کی شرم سے پسینہ آگیا ہے۔

دل خون شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار　　آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

یہ شعر بھی سراسر فارسی ہے کیوں کہ (ہے) فارسی میں بھی مترادف (ہست) ہے۔ آئینہ۔ مراد دل باصفا۔ خون شدہ کی وجہ سے اسے حنا (مہندی) کہا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ دل کو پہلے آئینہ ٹھہرا کے پھر اسے حنا بتانا بے حد تصنع ہے اور بے لطف۔

جناب حسرت۔ دل اور آئینہ کی رسائی قسمت کا مقابلہ کرتا ہے۔ ایک ہمارا دل ہے کہ حسرت دیدار کا خون شدہ ہے اور ایک آئینہ ہے جو بت بدست حنا کے ہاتھ میں ہے۔ یا یہ کہ دل حسرت دیدار میں خون ہو کر بصورت حنا اس کے ہاتھ میں آئینہ بن گیا ہے۔ پہلے معنی سے بدست حنا کو باضافت اور دوسرے معنی میں بلا اضافت پڑھتے ہیں۔

جناب آسی میرا دل حیران جو آئینہ اس لئے بنا تھا کہ معشوق اسے دیکھے اور اس صورت سے وہ معشوق کا نظارہ کرے۔ وہ حسرت دیدار میں خون ہوگیا اور اس تک نہ پہنچا۔ اور کم بخت حنا۔ اس کے ہاتھ کی آئینہ بنی ہوئی ہے۔ یا میرا دل جو حسرت دیدار میں خون ہوگیا تھا۔ وہ صورت آئینہ حنا بن کر اس کے دستِ نازک میں پہنچا ہے۔ دوسرے معنی جناب حسرت کے ہیں۔ "صورت آئینہ حنا بن کر" کے نہ معلوم کیا معنے رکھے ہیں۔ آئینہ کا حنا بننا نرالی بات ہے۔

ہمارا دل جو صفائی میں مثل آئینہ تھا کشمکش حسرتِ دیدار میں پس کر اس بت بدمست کے ہاتھ میں مہندی کا کام دے رہا ہے۔ یعنی یہ حنا ملنا نہیں ہے بلکہ ہمارے دل خون شدہ سے اس کے ہاتھ رنگین ہیں۔

شعلہ سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی　　جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے

کسی پر جی یا دل جلنا۔ اس کی دوستی و غم خواری میں دل کو رنج پہنچنا۔ کسی سے جی یا دل جلنا اس کی باتیں ناگوار ہونا۔ شعلہ۔ سوز عشق۔ افسردگی۔ ٹھٹھر جانا۔ جمود بستگی۔ انقباض۔

ہوس و تمنائے عشق سے جو بات کہ حاصل ہوئی وہ خود سوز سے نہ حاصل ہوتی۔ کیوں کہ دل کی افسردگی پر جی اس قدر جلا کہ جل کے خاک ہوگیا کہ اس قدر یہ افسردہ کیوں ہے لہٰذا تمنائے سوز ہوئی۔ مگر افسردگی پر اتنا جی جلا کہ سوز سے اتنا نہ جلتا۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق　　آئینہ بانداز گل آغوش کشا ہے

تمثال۔ تصویر۔ عکس۔ مجسمہ۔ بانداز۔ بطریق۔ بطور۔

تیرے عکس یا تصویر میں اس غضب کی شوخی ہے کہ آئینہ بطور گل شگفتہ ہزار ذوق کے ساتھ اپنی آغوش کھولے ہوئے ہے تاکہ اس کو اپنے گلے لگالے۔ گل کے کھلے ہونے کو آغوش کشائی کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ لفظ شوخی کا حسن میں نہ سمجھا (خوبی)

کہنا کافی تھا۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ　　اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

قمری ۔ فاختہ کی ایک قسم ہندوستان میں اس کا رنگ سپید ملتے اور عاشق سرد کہتے ہیں فاختہ کا رنگ البتہ خاکستری کہا جاسکتا ہے۔ قفس سے مراد قفس آہنی ہے بانس کی تیلیوں کا نہیں۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس کے معنی سبد (ٹوکری) کے بھی ہیں اور یہاں یہی مقصود ہیں۔

دیوان میں بھی اور کل شارحین نے قفس ہی لکھا ہے۔ مگر میرے نزدیک قفسی ہونا چاہئے یعنی لوہے کے پنجرے کے زنگ کا۔ اور بلبل کا رنگ ایسا ہی ہوتا ہے۔ قفس رنگ کی تشریح بھی کسی شارح نے نہ کی۔ اے نالہ۔ نالہ سے خطاب میں ذرا پیچ پیدا ہوتا ہے تو جناب غالب نے فرمایا کہ اے کی جگہ (جز) سمجھو۔

سوزِ عشق سرد سے قمری ایک مٹھی بھر خاک ہو کے رہ گئی ہے۔ اور بلبل آتشِ عشق سے لوہے کے پنجرے کے رنگ کی طرح ہے۔ مگر اے نالہ یہ تو بتا کہ جگر سوختہ عاشق کا نشان اور پتا کیا ہے یعنی کچھ نہیں ہے وہ تو محدوم محض جل کے ہو گیا۔ اور (جز) سے یہ معنی ہوں گے کہ جگر سوختہ عاشق کا اور کیا نشان ہو سکتا ہے البتہ اس کے جل جانے کے بعد بھی نالوں کی صدا آرہی ہے۔

خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو　　معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

خو سے مراد خصلت بے گانگی و بے التفاتی۔ ترکِ تعلق۔ کنارہ کشی۔ وحشت ۔ وحشت و جنون۔ بے حوصلگی۔ شوخی۔ چھیڑ چھاڑ۔ وغیرہ نہ ہونا۔

تیری خصلت کنارہ کشی نے میرے جنون اور آتشِ عشق کو ٹھنڈا کر دیا۔ معشوق ہوتے ہوئے انداز معشوقانہ چھیڑ چھاڑ۔ چنچل پنا۔ عتاب روٹھنا وغیرہ کا نہ ہونا معشوقیت کے لئے ایک عجیب مصیبت ہے۔

جناب نظم ارشاد فرماتے ہیں کہ معشوق ہو کر ایسا پھیکا پن ایسی ٹھنڈی طبیعت نہ ناز و ادا کا حوصلہ نہ چھیڑ چھاڑ کا مزہ۔ یہ طرفہ بلا ہے یعنی قابل نفرت ہے۔ خو سے بے دماغی و بد مزاجی مراد ہے۔ لفظ وحشت اس شعر میں مصنف نے ذوق و شوق کی جگہ پر باندھا ہے۔ کیوں کہ وحشت و نفرت قریب المعنی ہیں۔ وہ یہاں بنتے نہیں اس لئے مطلب یہی ہے تیری بد مزاجی سے دل کو وحشت و نفرت ہو گئی نہ یہ کہ وحشت دل افسردہ ہو گئی۔ غرض یوں کہنا تھا ؎

افسردہ کیا خواہشِ دل کو

؎ یا حسرتِ دل کو :: جب لفظ مطابق معنی ہوتا۔ اگر یہ رائے جناب نظم صحیح مان لی جائے تو "جذبۂ دل کو" بھی کہہ سکتے ہیں۔

جناب حسرت ۔ بے حوصلگی یہ کہ ہمارا جوش شوق اور وحشت محبوب کو گوارا نہیں۔ حالاں کہ معشوق کا اقتضا یہ تھا کہ وہ ان باتوں کو پسند کرتا۔

جناب آسی ۔ تیری بدخوئی نے میری آتش وحشت دل کو جو الفت و محبت میں پیدا ہو گئی تھی اسے افسردہ کر دیا۔ کیوں کہ تو معشوق ہے۔ اور مجھ میں ناز و انداز جور و جفا وغیرہ کا حوصلہ نہیں۔ یہ میرے واسطے ایک بلا ہے۔ یعنی وہ آگ بھڑکتی تو مجھے دم میں جلا کر خاک کر دیتی۔ مگر یہ افسردگی رہ رہ کر ستائیگی۔

ایسے اشعار پہیلی تو ہوتے ہیں جو جس کی سمجھ میں آتا ہے تاویل کیا کرتا ہے۔

## مجبوری و دعوائے گرفتاری اُلفت — دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

دست بہ تہ سنگ آمدن فارسی کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی مجبور ہونے کے ہوتے ہیں، کیوں کہ جب ہاتھ بھاری پتھر کے نیچے دبا ہو تو کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ (و او) ترتب امر بر امر کے لیئے ہے۔ آمدہ پیمان وفا، بلا اضافہ۔ وفا کا ہاتھ پتھر کے نیچے دبا ہوا۔ اور اگر اس قاعدہ کو دخل دین کہ (ہ) پر سے اضافتہ حذف کر دیتے ہیں جیسے نظامی کہتے ہیں کہ ؎

تو ئی کا فریدی زیک قطرہ آب

یعنی قطرۂ آب ۔ تو یہ معنی ہوں گے کہ ایک ایسا ہاتھ ہے جو پیمان وفا کے پتھر کے نیچے دبا ہے۔ حاصل دونوں کا ایک ہے۔

اُلفت میں پھنسے ہونے کا دعویٰ مجبوری ہے۔ ورنہ اس کی طرف سے تو کوئی برتاؤ اور سلوک اُلفت و محبت کا نہیں۔ کیا کریں عہد وفا باندھ چکے ہیں مجبوراً اسے نباہتے ہیں۔ چھوڑ سکتے نہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں۔ ہمارا پتھر کے تلے ہاتھ دب گیا ہے نکال تو سکتے نہیں کہتے یوں ہیں کہ محبت کو نباہ رہے ہیں۔ عہد و پیمان کرتے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں یہاں ہاتھ پر پتھر ہے۔

## معلوم ہوا حال شہیدان گذشتہ — تیغ ستم آئینہ تصویر نما ہے

تیری تیغ ستم ساز ایک آئینہ تصویر دار ہے۔ جس سے شہیدان گذشتہ کی حالت واضح ہو رہی ہے۔ یعنی تیری شمشیر سفاک جتلا رہی ہے کہ شہیدان ماضی کو کس بے دردی اور بے رحمی سے اس نے قتل کیا ہوگا۔ یا اتنی تیز ہے کہ اک دم گلا کاٹ دیا ہوگا اور حسرت دید بھی پوری نہ ہوئی ہوگی۔ یا تلوار کے ٹیڑھے کند۔ اور کر جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس بے رحمی سے وہ قتل ہوئے ہوں گے۔

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی        سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ۔ ایسے آفتاب کا نور جو دنیا کو روشن کرتا ہے۔ کنایہ از محبوب۔ اِدھر بھی ۔ ہم پر بھی نظر کرم کر۔ سایہ ۔ دوپہر سے پہلے سایہ کو ظل اور بعد کے سایہ کو فے کہتے ہیں۔ وقت کا اندازہ دھوپ اور سایہ دونوں سے ہوتا ہے۔ وقت پڑنا ۔ مصیبت و بلا و افلاس میں گرفتار ہونا۔ پرتو ۔ انعکاس نور۔ مجھے اس لفظ کے لانے سے کوئی خاص فائدہ نہ معلوم ہوا۔

اے خورشید جہاں تاب مجھ پر بھی نظر لطف وکرم کر۔ میں بھی سایہ کی طرح عجیب وقت بسبب وعذاب میں مبتلا ہوں اور سزاوار رحم ہوں۔ بہت درد انگیز شعر ہے۔ جناب نظم اس محل پر وقت پڑنے کے محاورہ کے صرف کرنے کے بہت مداح ہیں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد        یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

جن گناہوں کے نہ کرنے کی حسرت رہی یعنی قدرت سے فعل میں نہ آئے۔ ان کی بھی تو داد ملنا چاہئے کیوں کہ جب کوئی تمنا پوری نہ ہو اور اس کی حسرت رہے تو انسان کو سخت رنج و ملال ہوتا ہے۔ اور تکلیف اٹھانے کا صلہ راحت ہی ہے۔ لہٰذا اس رنج و تکلیف کا بھی صلہ عطا فرما۔ جبکہ اے خدا کئے ہوئے گناہوں کی تو سزا دے رہا ہے۔ چوں کہ جن گناہوں کی حسرت رہ گئی وہ کثیر ہیں تو ان کا صلہ بھی کثیر ہوگا۔ اور جو گناہ کرلیئے وہ قلیل ہیں تو ان کی سزا بھی تھوڑی ہوگی لہٰذا ان کے سہا کرنے کے بعد مستحق ثواب و راحت آخرت ہو جائیں گے۔ باوجود گنہگار ہونے کے امیدوار خوبی آخرت کے سزاوار اپنے آپ کو قرار دینا چاہتے ہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ شعر زائد الوصف ہے اس کی داد کون دے سکتا ہے۔ حضرت میر علیہ الرحمہ کہتے ہوں گے کہ یہ مضمون مجھ سے چھوٹ کے جناب غالب کے لیئے بچ رہا۔ یہ انھیں کا حصہ تھا۔ سزا ۔ بدلہ بدی و جزا ۔ بدلہ نیکی۔

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب        کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

اے غالب تمہارے ہم وطن تمہارے ساتھ بیگانوں کا سا سلوک کرتے ہیں کوئی تمہارا معین و مددگار نہیں تو تم ملول اور رنجیدہ نہ ہو۔ اگر تمہارا کوئی ہمدرد نہیں تو اللہ تو میری جان تمہارا نگہبان ہے۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔

---

غزل ۹۹ اشعار ۹

ا۔ منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

سب شارحین پہلے مصرع میں قافیہ نور اختیار کر رہے ہیں اس صورت میں لفظ (قد) مصرع ثانی کا بے کار ہوا جاتا ہے۔ لہٰذا نور کی جگہ (طور) پڑھنا چاہئے۔ صفت درازی میں اگر قد سرو ہو جاتا ہے تو طور بھی ہو سکتا ہے۔ منظور۔ پسندیدہ۔ مطلوب۔ یہ شکل یعنی بشکل قد و رخ تو۔ قسمت کا کھلنا۔ قسمت جاگ اٹھنا۔

معشوق کی تعریف حمد و خانہ اور حمد و رخ کی تعریف معشوقانہ اچھی نہیں مگر سب اس کی مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لئے اس مصرع کو نعتیہ نہ کہنا بہتر ہے۔

چوں کہ حدیث نبوی صلعم اول ما خلق اللہ نوری ہے۔ اس لیئے قافیہ نور بے جا نہ ہوگا۔ اور سب علل ہیں اس لیے نعتیہ بھی مان لو۔

تجلی طور کو تیرے قد و رخ کی شکل میں ظاہر ہونا مقصود تھا۔ تیرے قد و رخ سے ظہور تجلی کی قسمت جاگ اٹھی۔ یعنی تجلی طور نے تیرے رخ و قد میں ظہور کیا۔ (قد کو طور سے اور رخ کو تجلی سے تشبیہ دی ہے)

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا گویا ابھی سُنی نہیں آواز صور کی

صور۔ نرسنگھا۔ بگل۔ مسلمان کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اسرافیل کے صور پھونکنے سے قرب قیامت میں سب مر جائیں گے۔ اور دوسری مرتبہ میں سب جی اُٹھیں گے۔

میں جو آواز صور اسرافیل سے جی اُٹھا تو میرا قاتل مجھ سے لڑتا ہے کہ تو کیوں اٹھا۔ میرے کشتہ کو آواز صور سے بھی اٹھنا نہیں چاہئے۔ تو کیسے جی اٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے آواز صور سُنی نہیں جس سے سبھی جی اٹھے۔

اک خونچکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

کسی پر آنکھ پڑنا۔ کسی کے حسن کا آنکھوں میں کھپ جانا۔ بھلا معلوم ہونا۔

تیرے شہید جن کے کفن سے خون ٹپک رہا ہے اُن میں ایسا بناؤ اور زیبائش ہے کہ حوروں کی بھی نظر ان پر اُلفت کی پڑتی ہے۔ اور وہ اُن پر فریفتہ ہوتی ہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ شعر بھی ایسا کہا ہے کہ کروروں میں ایک آدھ ایسا نکلتا ہے۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ دلی میں

(کروروں) دونوں رائے متقلہ سے بولتے ہیں۔

**واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو　　　کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی**

طہور بفتح طا، مطبقہ طاہر سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ کیا بات ہے۔ کیا کہنا ہے بہت بڑی بات ہے۔ جملہ تعریف ہے مگر یہاں بطور طعن استعمال ہوا ہے یعنی کوئی چیز نہیں ہے۔

اے واعظ تم شراب طہور کو لئے پھرتے ہو یہ چیز ہی کیا ہے کہ نہ تم اسے پی سکتے ہو اور نہ کسی کو پلا سکتے ہو۔ پھر کس کام کی ہوئی۔

**آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج　　　اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی**

اُڑتی خبر۔ افواہ۔ خبر غیر معتبر (ریلومر) اُڑتی خبر کو خوب صرف کیا۔

بلبل کا چہچہانا آمد بہار پر دال ہے۔ مگر یہ خبر پرندوں کی زبانی افواہ ملی ہے۔ بلبل مختلف فیہ ہے مگر جناب میر کا لطیفہ اس کی تانیث میں مشہور ہے۔

اُڑتی خبر کی جتنی جی چاہے تعریف کرلو۔ مگر جب حاصل شعر یہ ہے کہ بلبل کے چہچہانے سے آمد بہار کی غیر معتبر خبر پرندوں کی زبانی سننے میں آتی ہے۔ اس میں کیا لطف اور مزہ ہے۔

مزید برآں معنوی نقصان بھی علاوہ خوبی محاورہ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ بلبل کا چہچہانا حقیقتہً بہار کے آجانے پر دال ہوتا ہے۔ اور شعرا اسے اُڑتی خبر کہتا ہے۔

**گر واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں　　　کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی**

کوئی شارح (گر) اور کوئی (گو) لکھتا ہے۔ (گر واں - پہ واں) طبیعت پر گراں ہیں لیکن کون ہے جو وہاں کا مخفف (واں) استعمال نہیں کرتا ہے۔

اگر اسے نکالنا چاہیں تو یوں نکال سکتے ہیں ؎

کعبہ میں بت نہیں پہ نکالے وہیں کے ہیں
خان خدا سے ان کو بھی نسبت ہے دور کی

خان بمعنی خانہ کے لئے برہان دیکھو۔

اگر اس شعر کے یہی معنی کیے جائیں کہ لات و عزیٰ و ہبل وغیرہ کبھی کعبہ میں تھے گو اب وہاں سے نکالے ہوئے ہیں مگر

ان کو نسبت خانۂ کعبہ سے ضرور ہے چاہے دور کی سہی۔ تو اس شعر میں کیا لطف پیدا ہوگا۔ اور یہ بات ہی کیا ہوئی۔ غزل کا شعر ہے۔ تاریخ لکھنا تو مقصود نہیں۔

ہاں کچھ استعارات سے کام لیا جائے تو البتہ یہ شعر حدِ غزل میں آسکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ (بت) سے استعارۃً ذہن میں حسینانِ عالم مراد لیں۔

اگرچہ یہ بت و اصنام (حسینان) اس وقت کعبہ میں نہیں ہیں مگر کبھی وہیں تھے، جس طرح اللہ کا گھر کعبہ ہے۔ اگرچہ اللہ کے لیئے کوئی مقام مخصوص نہیں مگر کعبہ کو خانہ خدا سے منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح کعبہ سے ان اصنام (یعنی حسینان) کو بھی نسبت دور کی ہے کیوں کہ اب کعبہ میں نہیں ہیں۔ جیسے اللہ کعبہ میں نہیں ہے مگر اللہ سے منسوب ہے۔ حاصل اس تقریر کا یہ ہوا کہ یہ بت (حسین) خدا ہیں پھر اگر میں صنم پرست ہوں تو بے جا کیا ہے۔ یہ صنم پرستی عین خدا پرستی ہے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

حضرت موسیٰ نے اللہ سے دیدار دکھانے کی تمنا اَرِنی سے کی تھی اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا لن ترانی تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے ہو۔ (نا) اردو کے محاورہ میں یہ ایسا لفظ ہے کہ اس کا ترجمہ اگر دوسری زبان میں کیا جائے تو سخت دشوار ہوگا جب کہ اس کی خوبی اور زور بھی باقی رہے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ "آؤ نا۔ دیکھو نا" مخفف۔ کیوں نہ آؤ اور کیوں نہ دیکھو گا ہے۔ اس کے بغیر حرف نفی کے معنی نہیں بنتے۔ اس (نا) سے "تو" کی طرح تاکید مقصود ہوتی ہے۔ یعنی ضرور دیکھو۔ ضرور آؤ۔ جیسے دیکھو تو۔ آؤ تو میں (تو) تاکید کے لیئے ہے۔ بہت خوب شعر ہے۔

یہ تو ضرور نہیں کہ موسیٰ کو جس طرح سوال تمنائے دیدار میں نفی کے ساتھ جواب ملا تھا۔ سب کو جواب نفی ہی میں ملے۔ آؤ ہم تم بھی ذرا طور کی سیر کریں شاید وہ معشوق حقیقی دیکھنے میں آجائے۔

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

کلام گرم۔ موثر بات۔ مقابل کلام سرد۔ کلام پر آتش غضب۔

کلام کا گرم اور موثر ہونا تو اچھی بات ہے۔ مگر اتنا بھی گرم نہ ہونا چاہیئے کہ جس سے بھی بات کی جائے وہ شاکی ہو۔ وہ ایسے آتش مزاج اور تند خو ہیں کہ جس سے بھی بات کرتے ہیں۔ وہ بات گالی گفتہ۔ طعن و طنز سے خالی نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کی باتوں سے ہر ایک کا دل جلتا ہے اور ہر ایک شاکی ہوتا ہے۔

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

ظفر شاہ نے ارادہ حج کیا تھا تو غالب تمنا کرتے ہیں کہ اگر آپ اس سفر میں مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں تو حج کا ثواب میں آپ کو پیش کر دوں گا۔ کیوں کہ میں اتنا مستطیع نہیں ہوں جو حج میرے اوپر فرض ہو حج سنتی اور مستحب ہوگا جس کا ثواب کسی دوسرے کو بخشا جا سکتا ہے۔

**افادۂ جناب نظم** ۔ زبان اُردو کا یہ نحوی طلسم دیکھنے کے قابل ہے کہ جہاں پر غالب نے (کی) استعمال کیا ہے یہاں (کے) بھی کہہ سکتے ہیں مگر قیاس (کی) کو چاہتا ہے۔ اسی طرح لفظ طرف جب اپنے مضاف الیہ پر مقدم ہو تو (کی) کہنا صحیح نہ ہوگا۔ مثلاً ؎

پھینکی کمند آہ طرف آسمان کے

اس مصرع میں (کی) کہنا خلاف محاورہ ہے۔ چوں کہ لفظ طرف مؤنث ہے اگر اس لفظ کو موخر کر دو تو کہیں گے آسمان کی طرف۔ اور اگر مقدم کر دو تو کہیں گے طرف آسمان کے۔ غرض کہ ایک لفظ جب مقدم ہو تو مذکر ہو جائے اور جب موخر ہو تو مؤنث ہو جائے۔ اسی کی نظیر نذر کرنا بھی ہے۔

---

## غزل ۱۰۰ اشعار ۹

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے  یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے  ۳۰ غ ۹

بودا۔ بزدل۔ کم زور۔ مصرع ثانی میں تعقید ہے۔ یعنی مصرع ثانی کی نثر یوں ہے۔ یہ رنج بہت ہے کہ مے گلفام (سرخ رنگ) کم ہے۔ مے کی صفت گلفام اس شعر میں اگر قبیح نہیں تو حشو ملیح بھی نہیں۔ شراب کو دافع غم کہتے ہیں۔
میرا دل حسرت زدہ و مایوس غم برداشت کرنے میں بہت ہیٹا ہے۔ رنج کے دفع کرنے کے لیئے اس کو زیادہ شراب کی ضرورت ہے اور وہی کم ہے۔ پھر یہ غم عشق کیسے اٹھاؤں۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ  ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

ساقی فیاض اور کریم ہے۔ اس سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میرے لیئے جام کی تلچھٹ اور (گاد) بھی بہت ہے۔ اس طرز ادا سے۔ زیادہ شراب مانگنا مقصود ہے (ہے یوں) سچ تو یہ۔ ہے واقعہ یہ ہے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں  گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کسی کو تیر و کمان سے مجھے مارنے کی فکر نہیں اور نہ صیاد گھات میں ہے کہ جال سے پکڑے۔ مجھے اس گوشۂ

قفس میں اگرچہ مقید ہوں مگر آرام بھی بہت ہے کہ ان جھگڑوں سے تو نجات حاصل ہے۔ السلامۃ فی الوحدۃ۔ ایسی آزادی جس میں خطرہ ہو اس سے تو گرفتاری ہی اچھی۔ کمان اور کمین میں صنعت شبہ اشتقاق ہے۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی　　پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

پاداش۔ جزائے نیکی دبعضے جزائے نیکی دسزائے بدی دونوں معنی مطلقاً کہتے ہیں۔ خام۔ ناقص زہد اگرچہ مکر اور تصنع آمیز نہ ہو تب بھی ماننے کے قابل نہیں۔ کیوں کہ زہد حقیقی میں بھی طمع خام صلہ کی ہوتی ہے۔ امور واجبی و فرضی و لازمی کے ادا کرنے میں امید صلہ کے کیا معنے برخلاف گنہگاروں کے کہ وہ امیدوار رحم و کرم حق تعالیٰ سے رہتے ہیں۔ اور اس کی صفت رحیمی و کریمی کے ظہور کا باعث ہوتے ہیں۔

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں　　پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

پابستگی۔ پابندی۔ اردو میں پابندی کا استعمال زیادہ ہے۔ خاص و عام میں صنعت تضاد ہے۔ پابستگی کو مناسبت صرف راہ سے ہے پابندی مناسب رسم و راہ دونوں سے ہے۔ ع

پابندی رسم و رہ آنام بہت ہے

آنام جمع انام (منجد)۔

عقلا اپنے کس سلوک و رفتار و طرز خاص پہ فخر کرتے ہیں۔ دیکھو تو پابند رسوم ہیں اور وہی عام لوگوں کے راستہ پر چلتے ہیں۔ اس کے سوا اور کیا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ جس طرز کا یہ شعر ہے۔ اس روش خاص پر مصنف کو اگر ناز ہو تو بجا ہے۔

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے　　آلودہ بہ مے جامہ احرام بہت ہے

مجھے کیا (مجھے کیا مطلب)۔ زمزم اور جامہ احرام کو لکھ چکا ہوں۔

مجھے چاہ زمزم ہی پر بیٹھا رہنے دو میں طواف خانہ کعبہ کیسے کروں۔ میرا تو جامہ احرام شراب سے آلودہ ہے نجس کپڑے کے ساتھ مسجد کعبہ میں کیسے جا کر طواف کروں۔ یہاں چاہ زمزم کے پانی سے جامۂ احرام کو پاک کروں گا۔ کوئی خاص لطف نہ پیدا ہوا۔

ہے قہر گراب بھی نہ بنے بات۔ کہ ان کو　　انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

اِبرام ۔ رسّی بٹنا۔ کسی امر کو محکم اور مضبوط کرنا۔ اُردو و فارسی میں بمعنی اصرار استعمل ہے ۔
ان کو انکار نہیں اور مجھے اصرار اور شوق بے شمار اس کے بعد وصال میں مانع کیا چیز ہے۔ اس پر بھی وصل میسر نہ ہو تو اس سے زیادہ غضب اور قہر کی بات کون ہو سکتی ہے۔

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ　　　رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

اے مرگ ابھی دنیا میں مجھے رہنے دے کیوں کہ جگر سراسر لہو ہو کر میری آنکھوں سے ٹپکا نہیں اور اس عشق و عاشقی میں مجھے ابھی بہت کام کرنے کو رہ گئے ہیں وفاداری کی تکمیل نہیں ہوئی ہے ۔ ناقص مرنا میں نہیں چاہتا۔
اگرچہ جگر کسی قسم کا احساس نہیں رکھتا ہے ۔ خون ضرور بناتا ہے۔ عشق و عاشقی میں پورا پورا دخل دل کو ہے۔ مگر شعرا جگر کو بھی شامل اور شریک کر لیتے ہیں۔ اگر دل کہنا ہو تو یہ مصرع یوں ہو سکتا ہے ؎

دل آنکھوں سے ٹپکا نہیں خون ہو کے بس اے مرگ

جناب نظم فرماتے ہیں کہ موت سے شکایت کرتے ہیں کہ ابھی تو نہ آئی ہوتی کیوں کہ ابھی تو مجھے بہت سی مصیبتیں اُٹھانا باقی ہیں ۔

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالبؔ کو نہ جانے　　　شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

غالبؔ اپنے کمال شاعری کی وجہ سے بہت مشہور ہے کوئی ایسا نہیں جو اسے نہ جانتا ہو۔ ساتھ ہی مے خواری اور عدم ادائے فرائض مذہبی کی وجہ سے بدنام بھی بہت ہے ۔

---

## غزل ۱۰۱　　　اشعار ۱۷

۱۸۶۲ء　مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے　　　جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

جوش مراد کثرت و افراط ۔ چراغان ، جمع چراغ نہیں بلکہ چراغہائے کثیر کے لئے اسم ہے ۔
جب اس کو اپنا مہمان کیا تھا اور کثرت جام مے سے بزم میں چراغان ہو رہا تھا اس کو گزرے ہوئے ایک مدت دراز ہو گئی اب پھر اسی منظر کو دل چاہتا ہے مگر اب اس کے اسباب کہاں ۔

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو　　　عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

لخت لخت ۔ پارہ پارہ ۔ عرصہ ۔ بمعنی مدت عربی و فارسی میں نہیں مگر نعمت خان عالی اپنے وقائع نعمت خان عالی میں بمعنی مدت لائے ہیں ؎

توان بعرصۂ چل روز یا دو ماہ رسید

ان کے مزاج پر تمسخر اور مزاح غالب ہے اس لئے قابل استناد فارسی میں نہیں ۔ عربی اور فارسی میں بمعنی مدت استعمال کرنے سے احتراز چاہئے ۔ اُردو میں البتہ بمعنی مدت بہت عام ہے ۔

جگر لخت لخت کی جگہ میرے نزدیک لختہائے جگر چاہئے ۔ اور یہ مصرع یوں ہو ؎

کرتا ہوں پارہائے جگر کو دوبارہ جمع

لفظ صرف مژگان سے نہیں کھلتا کہ عاشق کی مژگان یا معشوق کی مژگان اگر معشوق کی مژگان مراد لیں تو تیر یا ناوک مژگان ہونا چاہئے ۔ اور عاشق کی مژگان مراد لیں تو بقول جناب نظم زینت مژگان بہتر ہے ۔ دعوت مژگان نامقبول مضمون ہے ۔

جگر پارہ پارہ کو پھر جمع کر رہا ہوں ( پارہائے جگر کو پھر جمع کر رہا ہوں ) کیوں کہ تیر مژگان یار کی دعوت کئے ہوئے مدت ہو چکی ہے ۔ اب پھر اس کی دعوت کروں گا ۔ یا مدت سے اشک خونیں نہیں رو رہا ہوں ۔ اب پھر جگر کے ٹکڑے جمع کر رہا ہوں تاکہ یہ ٹکڑے آنسوؤں کے ساتھ بہہ کے پلکوں پر آئیں اور ان سے زینت مژگان ہو ۔ اگلے اشعار بتاتے ہیں کہ اپنی مژگان مراد ہے ۔

پھر وضع احتیاط سے گھبرا رہا ہے دم  برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

احتیاط سے کام لے رہا ہوں یعنی برسیں گزر گئیں کہ گریبان چاک نہیں کیا اس خیال سے کہ کہیں محبوب کی بدنامی نہ ہو ۔ مگر اب اس بے کاری سے دم گھبرا گیا ہے پھر جوش جنون اٹھا ہے اور گریبان چاک کئے بغیر چارہ نہیں ۔

پھر گرم نالہائے شرر بار ہے نفس  مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

ہر نفس کے ساتھ پھر نالہائے شرر بار گرم گرم نکل رہے ہیں ۔ یا پھر نفس نالہائے شرر بار کرنے پر مستعد و آمادہ ہے ۔ کیوں کہ نالہائے شرر بار سے چراغاں کئے ہوئے مدت گزر چکی ہے ۔

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق  سامان صد ہزار نمک دان کئے ہوئے

عشق پھر زخم دل کی پرسش کے لئے اس طرح چلا ہے کہ لاکھوں نمک دانیاں اپنے ساتھ لا رہا ہے تاکہ زخم دل پر چھڑکے اور ایذا پہنچائے ۔

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل ساز چمن طرازی داماں کئے ہوئے

مژگان کا قلم۔ خود نویس قلم (فاؤنٹین پن) خونِ دل سے بھر رہا ہوں۔ دامن کے چمن کے نگارین کرنے کے سامان کے ساتھ۔ دامن ہی چمن کیوں نہ ہو چمن کی زینت خامہ سے نہیں ہوتی۔ خامہ کی جگہ " دیدہ " دل ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ دامن کے چمن کو خون دل سے سینچیں گے۔ خامہ ہو تو دامن کے چمن کا نقشہ کھینچیں گے۔

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل خیال وصال یار کا اور آنکھیں نظارہ جمال دلدار کے سامان میں منہمک ہیں اور ایک دوسرے کے رقیب ہو کر اپنے اپنے مطلب کے حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ سامانِ دل۔ بے قراری اور سامان چشم اشک باری۔

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

طواف۔ گرد پھرنا۔ پندار۔ غرور خود داری۔ ملامت۔ عذل و تکدر۔ پشیمان کرنا۔ شرم دلانا۔ تحریض کے لئے زجر و توبیخ۔

اپنی خود داری کے بت کدہ کو ویران کر کے (چھوڑ کے) دل پھر کوئے زجر و توبیخ کے حرم کے طواف کے لئے جا رہا ہے۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب عرض متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

خریدار مراد محبوب۔

عقل و دل و جان کا مال پیش کر کے شوق پھر کسی خریدار (محبوب) کا خواہاں ہے کہ کوئی معشوق ملے اور عقل و دل و جان لے لے۔

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

گل و لالہ سے استعارۃً معشوق مراد ہے۔ صد گلستان کو ایک پیمانۂ نگاہ قرار دیا ہے۔ اور ایسے پیمانے بہت سے اس سے پہلے بنا چکے ہیں۔

پھر حسینوں کے پیدا کرنے کا خیال آ رہا ہے۔ اس صورت سے کہ اگر سو گلستان بھی ہوں تو نگاہ شوق سب سے حظ

اور لطف حاصل کر سکے۔

پھر چاہتا ہوں نامۂ دل دار کھولنا  جاں نذرِ دلفریبی عنواں کئے ہوئے

پھر دل چاہتا ہے کہ نامہ محبوب آئے اور میں اس کے سرنامہ کے عنوان کی دلفریبی پر بطور نذر جان پیش کر دوں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس  زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

پھر میری ہوس اس بات کی طالب ہے کہ معشوق اپنی زلف بکھرائے ہوئے کوٹھے پر دکھائی دے۔

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو  سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

آرزو و تمنا پھر کسی کو اپنے سامنے چاہتی ہے مگر اس طرح سے کہ خنجر مژگان کو خوب تیز سرمہ لگا کے کر لیا ہو مژگان

، خنجر کہنا نئی بات ہے۔ مگر سرمے سے تیزی دشنہ و تیغ و تیر نگاہ کی چاہئے۔

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ  چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

نوبہار ناز ہ کنایہ از محبوب۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ (تاکے) میں سے لفظ (تاک) پیدا ہو رہا ہے۔ (انگور کی بیل)

جو مناسب مے ہے۔ ورنہ تاکے ہے کی جگہ (ڈھونڈے ہے) چاہئے تھا۔

نگاہ کو ایک محبوب با ناز و ادا کی تلاش ہے جس نے نورمے سے اپنے چہرہ کو گلستان بنا لیا ہو۔ یعنی اثر شراب

سے اس کے رخسار سرخ ہو رہے ہوں۔

پھر سے ظاہر ہے کہ یہ سب واقعات اس سے پہلے بھی گزر چکے ہیں۔ اب دوبارہ انھیں باتوں کی خواہش ہے۔

یہ غزل ایک مسلسل مضمون میں ہے، اور شاید بعد انتخاب یہی سب سے بڑی غزل رہ گئی ہے۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں  سر زیر بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

پھر دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی ہے کہ محبوب کے دروازہ پر پڑے رہیں۔ اگر دربان ٹھہرنے کی اجازت دے تو

اس کے اس بار احسان سے ہم کبھی سر نہ اٹھا سکیں گے۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن  بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

دل بھرا تنے موقع و فرصت کا متلاشی ہے کہ رات دن بجز تصور یار کوئی دوسرا کام نہ ہو۔

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے　　بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

اے غالبؔ تو ہمیں چھیڑ نہیں ہم میں اشکوں کا جوش ہو رہا ہے۔ ذرا بھی تو نے اگر ہمیں چھیڑا تو ہم طوفان نوح دوبارہ پیدا کر دیں گے کیوں کہ بھرے بیٹھے ہیں اور آنسو بہانے پر آمادہ ہیں۔ تمام دنیا کو غرق طوفان اشک کر دیں گے۔

جناب نظمؔ فرماتے ہیں کہ طوفان کو طوفان برپا کرنے کے معنی میں لائے ہیں جس کی سند ملنا مشکل ہے۔ (بظاہر اس معنی کی ضرورت یہاں پر نہیں معلوم ہوتی)۔

---

## غزل ۱۰۲　　اشعار ۱۴

۱۳۰ـ　نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے　　رہے نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

نوید بضم مژدہ۔ خوش خبری۔ طرز۔ طور۔ طریق۔ دلّی میں اب بھی مؤنث ہے لکھنؤ میں مذکر ہے۔ اسی طرح لکھنؤ میں سم مؤنث ہے اور دلّی میں مذکر۔

دوست کا ظلم جان کے لئے مژدۂ امن و امان ہے کیوں کہ محبوب نے کوئی ظلم اٹھا نہیں رکھا۔ اب آسمان کوئی ظلم کہاں سے لائے گا جو مجھ پر ڈھائے گا۔ یا اس کے مظالم سے مر کے امن پا جائیں گے۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے　　رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونچکاں کے لئے

بلا سے یہ لفظ محبوب کے حق میں اس محل پر مجھے اچھا نہ معلوم ہوا۔ اس کی جگہ (تو کیا ہے) یا اور کوئی لفظ اس سے بہتر ہوتا تو شاید اچھا ہوتا۔

کچھ پروا نہیں اگر مژہ یار میرے خون کی پیاسی ہے۔ لیکن مجھے اپنی مژگان خون چکان کے لئے بھی تو کچھ خون رکھنا چاہئے۔ ورنہ علامت عشق اور اظہار درد کیسے ہوگا۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

اے خضر ہمیشہ کے لئے تم زندہ تو ہو۔ یا ہمیشہ کی زندگی پا کے چوروں کی طرح صحرا بصحرا چھپتے پھرتے ہو یہ زندگی کس کام کی اور ایسی زندگی میں کیا مزہ ہے۔ ایک ہم ہیں کہ عشق کی وجہ سے زندۂ جاوید بھی ہیں۔ بمفاد ے

من مات من العشق فقد مات شهید

اگر مر بھی جائیں تب بھی زندہ ہیں۔ اور لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اور دوسروں کے کام آتے ہیں۔

رہا بلا میں بھی مبتلائے آفت رشک بلائے جان ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

تیرے ادا و ناز عالم بھر کے لیئے آفت جان ہیں۔ اگر یہ بلا بھی تھے تو مخصوص میرے لیئے ہوتے۔ چوں کہ سب کے لیئے بلا ہیں اس لیئے ان کے بلا ہوتے ہوئے بھی مبتلائے آفت رشک ہوں۔ اس بلا میں بھی میں کسی کی شرکت نہیں چاہتا ہوں۔

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں دراز دستی قاتل کے امتحان کے لئے

دراز دستی ۔ جور و ستم۔ مگر غالبؔ اس کے وضعی معنے سے بات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لمبے لمبے بڑھ بڑھ کے ہاتھ لگانا۔

اے فلک مجھ کو میرے قاتل سے دور نہ رکھ کیا صرف میں ہی ہوں اور بھی تو عاشق ہیں اس کے بڑھ بڑھ کے ہاتھ لگانے کا امتحان ان پر کیا جائے۔ مجھے تو اس کے قریب ہی ہونا چاہیئے تاکہ سب سے پہلے اور آسانی سے مجھی کو قتل کر سکے اور مجھے عذاب سے نجات مل جائے۔ اس سے دور رکھنا ہے تو دوسرے قابل قتل عشاق کو اس سے دور رکھ کیوں کہ وہ مرنا نہیں چاہتے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

قفس میں بند ہو کر میری سعی بہبودی کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مرغ اسیر چند تنکے اپنے آشیانہ کے لیئے جمع کرے کہ جن کے جمع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مگر یہ حالت لاچاری اور مجبوری قابل رحم بھی ضرور ہے۔ پابند عشق ہو کر اسباب راحت و آرام کہاں میسر ہوتے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسبان کے لئے

کسی کے قدم لینا ۔ خوشامد میں کسی کے پاؤں پکڑنا۔ قدموں پر گرنا۔

میں دربار پر جو گیا تو دربان نے مجھے فقیر سمجھ کے روکا ٹوکا نہیں۔ مگر میری شامت جو آئی تو میں نے اٹھ کے اس کے پاؤں پکڑ لیئے بس وہ سمجھ گیا کہ اخاہ یہ تو وہی عاشق ہے۔ بس اس نے ٹھہرنے نہ دیا اور فوراً دھتا بتائی۔ اور گردن میں ہاتھ دیا۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس شعر کی بندش لاجواب ہے۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل　　کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

اس غزل کے تنگ کوچہ میں میرے شوق کے اندازہ کے موافق گنجایش نہیں۔ میرے بیان کے لئے اس زمین کے میدان کو زیادہ وسیع ہونا چاہئے۔

یہ شعر قصیدہ کی طرح گویا گریز (تخلیص) کا ہے۔ اگلے شعر سے تجمل حسین خان کی مدح شروع کرتے ہیں۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے　　بنا ہے عیش تجمل حسین خان کے لئے

اللہ تعالیٰ نے عیش اور مخلوق کو اس غرض سے دیا ہے تا عیش تجمل حسین خان کو نظر نہ لگے ورنہ حقیقۃً عیش بنا تو تجمل حسین خان ہی کے لیئے ہے۔

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

بار خدائے بترکیب قلب اے خدائے باری ہے بار قاضی دراہم کی طرح بمعنی خالق۔ وہ خدا جو خالق ہے۔ جناب نظم (بار خدا) کے معنی مالک باغ جہان لکھتے ہیں۔ استفہام = اظہار تعجب و مسرت کے لئے ہے۔

اے اللہ یہ کس شخص کا نام میری زبان پر آیا کہ میری گویائی نے میری زبان کا منھ چوم لیا۔ ایسا پیارا اور عزیز نام ہے۔

نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک　　بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لئے

دولت چوں کہ ہاتھوں ہاتھ گھومتی رہتی ہے اس لئے مال کو دولت کہتے ہیں۔ دین، دیہ مذہب ملت۔ ملک۔ سلطان۔ قہر۔ حساب۔ حکم۔ چرخ بریں عرش۔

دولت و دین کے مددگار ہیں۔ قوم و ملک کے یاور ہیں۔ عرش ان کی چوکھٹ کے لئے بنا ہے۔

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش　　بنیں گے اور ستارے اب آسمان کے لئے

تجمل کے معنی زینت اور آرایش کے ہیں اس لئے لفظ آرایش لائے۔

تجمل حسین خان کے زمانہ میں اہل زمانہ زینت و آرایش پر مٹے ہوئے ہیں لہذا ضرورت ہوئی کہ آسمان کی زینت اور دوسرے ستاروں سے کی جائے۔

تجمل حسین خان شاید باندہ ضلع فرخ آباد کے نواب تھے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے　　سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

مدح ۔ زندہ اور مردہ ۔ جاندار ۔ بے جان سب کی ثنا کو کہتے ہیں ۔ اور حمد صرف زندہ کی ۔ مدح قبل از اور بعد از احسان بھی ہوتی ہے ۔ مگر حمد بعد از احسان ہی ہوتی ہے ۔ مدح رضا پر اضافہ کا نام ہے کبھی آدمی راضی رہتا ہے کسی شئے سے چاہے مدح نہ کی گئی ہو ۔ سفینہ ۔ کتاب مناسب ورق و بمعنی کشتی مناسب بحر ۔ بحر بیکران ۔ وہ سمندر جس کا اور چھور نہ ہو ۔ اس سے مراد مدح تجمل حسین خان ۔ کاغذ ختم ہوگیا ۔ مگر مدح تمام نہ ہوئی ۔ ان کی مدح کے لئے تو ایک دفتر کی ضرورت ہے کیوں کہ ان کی صفات کثیرہ چند اشعار میں کیا آسکتے ہیں ۔

یہ شرح غزلیات ۲۰ ر دسمبر ۱۹۴۶ء مطابق ۲۵ ر محرم ۱۳۶۶ھ یوم جمعہ کو بار دیگر ختم ہوئی ۔

---

قصیدہ نمبر ۱ اشعار ۲۸

# قصائد

## در منقبت امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہا السلام

نظم ۲۳۳
اشعار ۲۸
مع مطلع ثانی

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بے کار سایۂ لالہ بے داغ سویدائے بہار

بے داغ ۔ بے عیب ۔ سویداء ۔ چمن کی جگہ اگر زمان ہو تو بہتر ہے کیوں کہ فصل بہار سے فیض یاب خود چمن بھی ہے ۔ فیض چمن سے ایک ذرہ بھی باغ کا بے کار نہیں ہے ۔ چنانچہ لالہ بے عیب کا سایہ بھی قلب بہار کے لئے نقطہ سیاہ قلب کا کام دے رہا ہے ۔ تشبیب قصیدہ کی بہار یہ ہے ۔

مستی باد صبا سے ہے بعرض سبزہ ریزۂ شیشہ مے جوہر تیغ کہسار

عرض بسکون ثانی مقابل طول ۔ پہنائی مراد وسعت ۔ جوہر کے ساتھ کئی جگہ یہ لفظ لائے حالاں کہ مقابل جوہر عرض بفتحتین ہے ۔ تیغ ۔ سر کوہ ۔ قلۂ کوہ ۔ شمشیر و تیغ کی آب کو بھی جوہر کہتے ہیں ۔ شیشہ مے مینا ۔ صراحی جو سبز رنگ کی ہوا کرتی ہے ۔ کہسار میں شاخسار کی طرح سار کثرت کے لئے ہے بمعنی سلسلۂ کوہ ۔ صبا ۔ باد مشرقی ۔ جہاں تک سبزہ پھیلا ہوا ہے اسے سبزہ نہ سمجھو بلکہ صبا نے بحالت مستی مینائے مے کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے اور وہ تمام میں پھیل کر تیغ کوہ (پہاڑ کی چوٹی) کے لئے جوہر کا کام دے رہا ہے ۔

سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

داغ پلنگ ۔ چیتے کی جلد کے سیاہ ٹپے ۔ ریشہ نارنج سے روئے شرار کی تشبیہ اچھی نہیں ۔ لہذا مصرع یوں ہونا چاہیئے ؂

تازہ ہے دانۂ نارنج کے مانند شرار

زمرد ۔ بضم را معجمہ و میم و رائے مہملہ مشدد ۔ نورتن میں سے ایک جوہر سبز رنگ ۔ ایرانی تخفیف رائے

پھل بھی لاتے ہیں۔
یہ کس بہار کی تاثیر ہے چیتے کے داغ بھی جام زمردین کی طرح سبز ہو رہے ہیں۔ اور چنگاریاں بھی دانہائے
نارنج کی طرح تر و تازہ و شاداب ہو رہے ہیں۔

مستی ابر سے گلچین طرب ہے حسرت　　کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

میری حسرت طرب گلچینی طرب کر رہی ہے۔ یہ گھنگھور گھٹا　　جو مستوں کی طرح جھوم جھوم کے آ رہی ہیں اور عالم
کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے (گھیر رکھا ہے) اگر اس تراکم غمام میں دونوں عالم کا فشار ہو جائے تو کچھ بعید نہیں۔ پھر
گلچینی طرب کیسے ہاتھ لگے گی۔
جناب نظم فرماتے ہیں۔ ابر چاروں طرف پھیل کے عالم کو آغوش میں لے لیتا ہے۔ تو حسرت مجھے ہوتی ہے
کہ یہ اپنی آغوش میں دونوں عالم کو لئے ہوئے ہے اور میرا آغوش خالی ہے لیکن اس حسرت کے ساتھ طرب بھی ہے
اس وجہ سے کہ ابر ہی طرب انگیز ہے۔ مولانا کا خیال نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

کوہ و صحرا ہمہ معموری شوق بلبل　　راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

شوق بلبل ۔ بلبل جس کا شوق رکھتی ہے یعنی گل ۔ معموری ۔ آبادی۔ جناب نظم فرماتے ہیں معمورہ بمعنی مقام
آباد چاہئے۔ بجا فرماتے ہیں۔ راہ خوابیدہ ۔ سنسان اور ویران راستہ۔ راہ کی صفت خوابیدہ۔ جناب غالب
کی جدت ہے۔ خوابیدہ کے مقابلہ میں بیدار لائے ۔ معمورۂ شوق بلبل سے مراد کوہ و صحرا کا پھولوں سے پُر
ہونا ہے۔
سراسر کوہ و صحرا میں پھول اُگ آئے ہیں راستے جو سنسان اور ویران پڑے تھے اب خندۂ گل سے بیدار ہیں
یعنی پھولوں کے چٹکنے کی آواز آ رہی ہے۔ یا۔ لوگ ان پھولوں کی سیر کے لئے نکل پڑے ہیں۔ اور راستوں میں چہل
پہل مچ گئی ہے۔

سونپے ہے فیض ہوا صورت مژگان یتیم　　سر نوشت دو جہاں ابر بیک سطر غبار

سونپے ہے ۔ یہ بھی فارسی (سپارد) کا ترجمہ ہے۔ ورنہ بخشے ہے۔ یا۔ دیتا ہے اردو میں چاہئے۔
مژگان یتیم کو خاک آلود مانتے ہیں کیوں کہ اس کا منھ دھلانے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔ دو جہاں ۔ اظہار
کثرت کے لئے ہے۔ سطر غبار ۔ تفنن طبع کے لئے نقاط سے حروف ترکیب دیتے ہیں۔ اور جب پھول بوٹوں سے

حروف بناتے ہیں تو اس کو خط گلزار کہتے ہیں ابر کا کام پھول پتوں اور درختوں کو سرسبز اور شاداب کر دینا ہے۔ اور مژگان غبار آلود یتیم گریہ سے تر رہتی ہے۔ سرنوشت۔ تقدیر کا۔

آج کل فیض ہوائے بہار ایک سطر تحریر بخط غبار کو (یا خود گرد و غبار کو) وہ عالم ابر کی تقدیر بصورت مژگان یتیم عطا کر رہی ہے۔ یعنی تحریر (لائن (LINE)) غبار یا سطر بخط غبار (WRITING) کو سرسبز اور شاداب کر دینے کی تاثیر فیض ہوائے بہار کو دے رہا ہے۔ جس طرح چشم غبار آلود یتیم آب گریہ برساتی ہے۔ اسی طرح خط غبار میں بھی پانی برسانے اور گل اور بوٹوں میں تازگی پیدا کرنے کی قابلیت اس زمانہ بہار میں ہے۔

کاٹ کے پھینکئے ناخن تو بانداز ہلال　　　قوت نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

ناخن جو بصورت ہلال ہوتا ہے اگر اسے کاٹ کے پھینک دیا جائے تو اس وقت قوت نمو کی تاثیر سے ہلال کی طرح بڑھ کے بدر کی طرح پورا گول دائرہ ہو جائے۔

کف ہر خاک بگردون شدہ قمری پرواز　　　دام ہر کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار

بگردون شدہ صفت خاک ہے۔ قمری کا رنگ خاکستری ہونیکا ذکر کئی مرتبہ آچکا ہے۔ آتش زدہ کاغذ۔ کاغذ میں جب آگ لگ جائے تو شعلہ آتش بہت جلد اس میں دوڑ جاتا ہے تو بنتے ہوئے توے کی طرح روشنی کے ذرات بصورت نقاط اس میں نمایاں ہوتے جاتے ہیں جن کو مور کے پروں کی چمک کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے۔ کہیں یہ ذرات چمکتے ہیں اور کہیں جلا ہوا سیاہ کاغذ ہوتا ہے اور کہیں سے کاغذ جھڑ جاتا ہے اس لئے اسے حلقہائے دام کہا جس میں گویا طاؤس پھنسا ہوا ہے۔ کاغذ آتش زدہ کی تشبیہ بھی طاؤس کے ساتھ آچکی ہے۔

ہر مٹھی بھر خاک جو آسمان کی طرف بلند ہوئی ہے اس وقت قوت نامیہ نے اس میں جان ڈال دی ہے اس لئے اس میں قمری کی ایسی پرواز ہے۔ اور جس کاغذ میں آگ لگ گئی ہو وہ ایک ایسا جال ہے جس میں طاؤس گرفتار ہے۔ کاغذ آتش زدہ کو بھی طاؤس جاندار کہنا مقصود ہے۔

ممکن ہے کہ میں اپنے مطلب کو دوسروں کے سمجھنے کے لائق نہ ادا کر سکا ہوں۔

میکدہ میں ہو اگر آرزوئے گل چینی　　　بھول جا یک قدح بادہ بطاق گلزار

طاق۔ طاق نسیان استعارہ مشہور ہے لہٰذا (بھول جا) کی مناسبت سے لفظ طاق لائے۔ ورنہ طاق کی ضرورت ہے اور نہ بھول جا کی۔ مطلب اتنے سے

چھوڑ دے یک قدح بادہ میان گلزار

ادا ہوتا ہے یا ـــ

رکھ دے اک جام پر از بادہ میان گلزار

اس بہار میں نشوونما کا وہ زور اور جوش ہے اگر اے مخاطب تو ایک جام شراب گلزار میں رکھ دے گا تو قوت نشوونما سے ایک جام کے ہزاروں جام بن جائیں گے اور پورا میکدہ تیار ہو جائے گا۔ چوں کہ گلزار ہی مے کدہ بنا ہے اس لئے خوب چھک کے پی اور پلا اور ساتھ ہی گلچینی بھی کرتا جا۔

موج گل ڈھونڈ بخلوت کدۂ غنچۂ باغ　　گم کرے گوشۂ مے خانہ میں گر تو دستار

دستار ۔ پگڑی کو لہریا بھی رنگتے ہیں۔ گوشۂ مے خانہ کی وجہ سے خلوت کدہ غنچہ کہا۔
اگر گوشۂ مے خانہ میں تیری پگڑی بحالت مستی گم ہو گئی ہو تو اے غنچہ باغ کے خلوت کدہ میں ڈھونڈ کیوں کہ اس وقت کی ہوائے بہار نے اسے بھی موج گل بنا دیا ہو گا۔
جناب نظم ۔ فیض ہوا گوشۂ مے خانہ کو غنچہ اور دستار کو موج گل بنا دے گا۔
جناب حسرت ۔ ہوائے بہار کی تاثیر گوشۂ مے خانہ کو غنچہ باغ کا خلوت کدہ ۔ یعنی گوشۂ باغ اور دستار کو موج گل بنا دے گا۔
دونوں بزرگ دو چیزیں بنا رہے ہیں اور میں نے بوجہ ذکر صرف دستار ایک ہی چیز کا ذکر کیا ہے۔

کھینچے گر مانی اندیشہ چمن کی تصویر　　سبز مثل خط نوخیز ہو خط پرکار

مانی مشہور مصور چینی جو اپنی تصاویر کو معجزہ قرار دے کر دعوی نبوت کرتا تھا اس کا البم ارژنگ بہت مشہور شعرا میں ہے۔ نوخیز ۔ گبرو جوان ۔ اٹھتی جوانی والا ۔ خط ریش ۔ مراد سبزۂ ریش ۔ خط لکیر LINE ۔
اگر تصور و خیال کا مانی اس بہار کے زمانہ کے باغ کی تصویر کھینچنا چاہے تو اٹھتی جوانی والے شاہد کے سبزہ خط کی طرح خط پرکار بھی تاثیر بہار سے سر سبز ہو جائے۔

لعل سے کی ہے پے زمزمۂ مدحت شاہ　　طوطی سبزہ کہسار نے پید امنقار

لعل سے کی ہے ۔ یہ بھی فارسی از لعل کردہ کا ترجمہ ہے ۔ اردو میں لعل کی بنائی ہے کہیں گے ۔ لعل یاقوت کی ایک قسم جس کا معدن خصوصاً کوہ بدخشان کو بتاتے ہیں ۔ شعرا نے بلبل اور لالہ کی طرح ہمارے دلوں پر اس کی بھی

عظمت بڑھادی ہے ورنہ یاقوت گھٹیا قسم ہے۔طوطی مراد طوطا (توتا) جس کے جسم کا رنگ سبز اور چونچ گہرے سرخ رنگ کی ہوتی ہے۔طوطا اور طوطی دو مختلف پرندے ہیں مگر ایرانی ایک کی صفات دوسرے پر عاید کردیتے ہیں۔
یہ شعر گریز کا ہے۔اب آگے مدح حضرت علیؑ شروع کرتے ہیں۔

وہ شہنشاہ کہ جس کی پے تعمیر سرا — چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار

چشم سے مراد خانہ چشم کیوں کہ خشت دیوار کا قالب (سانچا۔فرما) کہنا چاہتے ہیں۔جناب نظم آنکھ کے ڈھیلے (مقلہ) ہی کو خشت بنا کر یوں ترمیم کرتے ہیں ؎

ڈھیلے جبریل کی آنکھوں کے ہیں خشت دیوار

حضرت علیؑ وہ شہنشاہ ہیں کہ ان کے روضہ مبارک یا خانہ کے لئے اینٹ کا فرما چشم جبریل ہے۔ترمیم کے موافق یہ معنی ہوں گے کہ بجائے خشت دیوار جبریل کی آنکھوں کے ڈھیلے صرف ہوئے۔یا خشت خانہ حضرت علیؑ جبریل کی آنکھ کے لئے (مقلہ) کی طرح ہے۔ترمیم سے معنی میں ترقی پائی جاتی ہے۔

فلک العرش ہجوم خم دوش مزدور — رشتۂ فیض ازل ساز طناب معمار

فلک العرش نواں آسمان۔ہجوم اظہار کثرت کے لئے ہے۔جناب نظم خم بفتح اول بمعنی کجی اور ہجوم خم کے معنی کثرت خمیدگی فرماتے ہیں مزدور گنجور اور دستور (وزیر) کی طرح مُزد بمعنی اجرت اور (ور) بمعنی صاحب سے مل کر مزدوری والا معنی ہیں۔(رشتہ) تاگا۔مراد تعلق (ساز طناب) سامان رسن۔اس سے مراد ڈورا (ساہول) جس سے راج دیوار کی سدھائی دیکھتے ہیں۔

لفظ ہجوم خم مجھے پریشانی میں ڈال رہا ہے۔(فلک العرش دوش مزدور کی کثرت خمیدگی ہے)۔اسے میں کچھ نہ سمجھا۔اس لئے مثل اس کے چاہتا ہوں ؎

فلک العرش سبوئے و خُم دوش مزدور

سبو و خم بضم گھڑا۔مٹکا۔جس میں مزدور پانی بھر کے کاندھے پر اٹھا کے لاتا ہے اور سرخی اور چونا اور سمنٹ سے مصالحہ دیوار اٹھانے کے لئے بناتا ہے۔جناب نظم لفظ ہجوم سے تعرض تو کرتے ہیں اچھا ہو یا برا مگر حسرت وآسی اسے بے کار سمجھ کے معنی میں کوئی دخل نہیں دیتے ہیں اور ہے بھی بے دخل۔

مزدور کے کاندھے پر عرش سبو اور خم ہے جس میں پانی بھر کے مزدور لاتا ہے۔اور فیض ازلی الٰہی کا رشتہ (ڈورا۔تعلق) ان کے مکان کے بنانے والے معمار کے لئے بمنزلہ ساہول ہے۔

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام — رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

نہ چمن ۔ نو آسمان ۔ خطِ پشتِ لبِ بام ۔ کوٹھی پر کی دیواروں کی منڈیر کے نیچے بھی اور کمرے اور دالان کی کارنیس (کانس) کے نیچے بھی نیلے، سرخ یا سبز رنگ دیتے ہیں ۔ مجھے لفظِ پشت زائد معلوم ہوتا ہے ؎

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ سبزِ لبِ بام

کہنا کافی ہے ۔ واو مساوات کے لئے ہے ۔ مگر یہ فارسی میں ہوتا ہے ۔ یعنی نو دن آسمانوں کا سبزہ خطِ سبزِ لبِ بام کے برابر ہے ۔ اور سیکڑوں عارفوں (خدا شناس) کی ہمت کی بلندی ان کے حصار کی بلندی کے برابر ہے ۔ حصار ۔ قلعہ کی فصیل اور گھر کی چار دیواری و بمعنی قلعہ مجازاً ۔

واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے اک پرِ کاہ — وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

پرِ کاہ ۔ تنکا ۔ مروحہ ۔ بکسر راح یا ریح سے اسم آلہ ۔ ہوا پہنچانے کا آلہ ۔ باوزن ۔ پنکھا ۔ بال ۔ بازو و پر ۔ پریوں اور فرشتوں کے لئے پر تجویز کرتے ہیں ۔ اور مور کے دم سے مورچھل اور پنکھا بناتے ہیں ۔ خاشاک ۔ ساق علف (چوب ریزہائے باریک و خار وخس یا خاک آمیختہ ۔ محلِ مدح میں کوڑے کرکٹ کا ذکر مجھے اچھا نہ معلوم ہوا گو دوسرے مصرعے پرِ کاہ کی تعریف ہی کیوں نہ ہو ۔ نجف ۔ تل ۔ ٹیلا ۔ پشتہ ۔ وہ مقام بلند جہاں تک وادی میں پانی چڑھ کے نہ پہنچ سکے ۔ کوفہ میں ایک شہر جہاں حضرت علیؑ کا روضۂ مقدس ہے ۔

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا — چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

سیر ۔ چلنا پھرنا ۔ تفریح کرنا ۔ طریقت و معرفت میں کچھ درجات معین کئے ہیں اُن تک پہنچنا ۔ جوہر ۔ لوہے کے آئینہ میں ہوتے ہیں ۔ جی چاہے سیر کی جگہ (نفس) بنالو کیوں کہ جوہر کے معنی یہاں کمال بخلاصہ ہنر اور خوبی ہیں ۔ اور نقش کے ساتھ تجنیس بھی پیدا ہوتی ہے ۔ لفظِ چشم مجھے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے ؎

نقش ہر پائے ۔ اک آئینہ بختِ بیدار

بخت ۔ بیدار جیتا جاگتا نصیب ۔ مقابل بختِ خفتہ ۔

صحرائے نجف کی خاک عارفوں کی سیرِ مقامات کے لئے اکسیر ہے ۔ اور اس راستہ میں جو نشانِ قدم ہے اس میں بختِ بیدار کی شکل آئینہ کی طرح دکھائی دیتی ہے ۔

## ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز　　گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

احرام۔ وہ بے سلا جامہ ساری اور کفنی کا ایسا جسے باندھ کر حج و طواف کرتے ہیں۔ آئینہ ناز۔ وہ آئینہ جس پر فخر اور ناز ہو۔ کو کے معنی کے لئے۔ برائے۔ یہ بھی فارسی (را) کا ترجمہ ہے۔

برائے خورشید نجف کے ذرات قابل فخر آئینہ ہیں۔ اگرچہ ذرات کا وجود اور ان کی چمک دمک ذات خورشید پر منحصر ہے۔ اور برائے بہار صحرا نجف کی گرد اس کے کعبہ امید کی جامۂ احرام ہے۔ یعنی بہار وہاں کی گرد سے بہت کچھ امیدیں رکھتی ہے۔ کیوں کہ وہاں کی گرد جتنی بہار آور ہے اتنی خود بہار نہیں۔ (امید کو احرام بہار) اس کے معنی میری سمجھ سے باہر ہیں۔

یا بہار کی ایسی خوبی پائی کی خود امید وہاں کی گرد کا جامہ احرام باندھے ہے کہ اس گرد کا طواف کرے اور اس سے اپنی امیدیں پوری کرے۔

## آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیٔ ناز　　عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

عرض۔ پیش کرنا۔ خمیازہ۔ خم کجی۔ یازہ مشتق از مصدر یازیدن بمعنی دست دراز کردن۔ انگڑائی میں ہاتھ پھیلتے اور جسم ٹیڑھا بیڑا ہوتا ہے۔ جب نشہ اتر جاتا ہے تو نشہ باز کو انگڑائیاں آتی ہیں۔ اور اُسے نشہ والی چیز استعمال کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ خمیازہ ایجاد پیدائش و خلقت۔ یا مخلوق۔ یعنی خواہش ایجاد مستی ناز اگر یہ معنی ہوں تو ایجاد سے شاید لفظ ایزاد اچھا ہو۔ لفظ خمیازہ اسی معنی کو چاہتا ہے۔ یا ایجاد بمعنی خلقت کہنا مقصود ہے۔ موج غبار۔ غبار کا اٹھنا ہوا پر موقوف ہے اور ہوا خود متموج ہوتی ہے جس پر سے گذرے اس میں بھی لہریں پیدا کر دیتی ہے جیسا کہ ریت میں۔ بس سے زیادہ موج غبار کی تعبیر مجھ سے ممکن نہیں۔ لفظ موج سے انگڑائی کی صورت دکھانا چاہتے ہیں۔

جناب غالب علیہ الرحمہ والغفران کچھ ایسے استعارات سے کام لیتے ہیں کہ مجھ ایسے کم علم کے لئے ان کا سمجھنا ایسا دشوار ہوتا ہے کہ دوسرے شارحین کے بتانے سے بھی (اگر وہ بتاتے ہیں) میں نہیں سمجھ سکتا ؎

برین عقل و دانش بباید گریست

خود فطرت یا مخلوق کو وہاں سے (نجف یا روضہ مقدس سے) مستی ناز کی تمنا اور خواہش ہے۔ چنانچہ ہر موج غبار کو وہاں کے غبار کی موج نہ سمجھو بلکہ مستی ناز کے بڑھانے کے لئے انگڑائیاں لے رہی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) میرا ٹٹو اس سے آگے نہیں بڑھتا۔

# مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار　　دل پروانہ چراغان پر بلبل گلزار

شمع شبستان بہار کنایہ از جناب امیر علیہ السلام یا نجف شمع مناسب پروانہ اور بہار مناسب بلبل وگلزار۔
اے ممدوح تمہارے ہی فیض سے دل پروانہ چراغان ہو رہا ہے (جو عاشق شمع ہے) اور پر بلبل گلزار ہو رہا ہے جو عاشق گل ہے۔ یعنی سب کی مرادیں تمہیں سے حاصل ہوتی ہیں۔

شکل طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز　　ذوق میں جلوہ کے تیرے بہوائے دیدار

آئینہ خانہ۔ آئینہ کا چوکھٹا۔ طاؤس کا ذکر اس لیئے ہے کہ طاؤس کی دُم کے نقوش گول گول چمک دار درپچے کے ایسے ہوتے ہیں۔ ہوا = خواہش۔ محبت۔ باد۔ فضا۔
آئینہ تو آئینہ کا فریم (چوکھٹا) بھی تیرے جلوہ کے شوق و ذوق میں اور ہوائے دیدار میں طاؤس کی طرح پرواز کرنے لگے۔

تیری اولاد کے غم سے ہے برُدئے گردوں　　سلک اختر میں مہ نو مژۂ گوہر بار

اولاد مراد حسنین علیہما السلام۔ اولاد دوسرے نواسے اور پوتے جو کربلا میں شہید ہوئے۔ سلک اختر = موتیوں کی لڑی۔ ستاروں کو موتی تجویز کیا ہے۔ گوہر استعارۃً اشک غم مراد ہیں۔ یعنی غم شبیرؑ میں جو آنسو نکلتے ہیں وہ موتیوں کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ مژہ کی خمیدگی کی وجہ سے مہ نو (ہلال) کو مژہ گوہر بار کہا۔ اور ستاروں کو آنسو قرار دیا۔
ستاروں کی لڑی میں ہلال ایک مژہ اشک بار ہے۔ تیری اولاد کے غم میں یعنی ستاروں کا غروب ہونا اشک غم کا ٹپکنا ہے چشم و مژہ ہلال ہے۔ یا خود ستارے ہی اشک غم ہیں۔

ہم عبادت کو ترا نقش قدم مُہر نماز　　ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استظہار

ہم = نیز۔ بھی۔ فارسی کا طرز ادا ہے اور (ہے) محذوف پھر اسی (ہم کی جگہ) ہے کیوں نہ کہہ دیا جائے۔ مُہر نماز = سجدہ گاہ شیعوں میں خاک پاک کربلا سے بناتے ہیں۔ ریاضت = رنج کشیدن۔ فرمانبرداری و نفس کشی۔ استظہار =

پشت پناہی۔ امداد و یاری خواستن و قوی پشت شدن۔
تیرا نقش پا عبادت کے لیے سجدہ گاہ ہے۔ اور تیرے حوصلہ اور ہمت سے خود ریاضت کو مدد ملتی ہے۔

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعت نبی جام سے تیرے عیاں بادۂ جوش اسرار

زمزمہ۔ خوانندگی و ترنم کہ با آہستگی کنند۔ کیوں کہ زم کے معنی آہستہ کے ہیں۔ وہ کلمات جنہیں آتش پرست محل ستایش باری تعالیٰ و پرستش وہنگام غسل اور کھانے کے وقت ترنم کے ساتھ گنگنا کر ادا کرتے ہیں۔ نعت۔ مدح نبویؐ و منقبت مدح ائمہ و حمد ستایش باری تعالیٰ۔ جام سے مراد جام دل یا توحید یا علم اسی کی مناسبت سے بادۂ اسرار لائے۔
تمہاری مدح و ستایش عین ستایش نبوی بمفاد حدیث انا و علی من نور الواحد۔ وبفحوائے حدیث لحمک لحمی و دمک دمی ہے۔ اور تمہارے جام دل سے بادۂ اسرار الٰہی جوش مارتی ہے۔

جوہر دست دعا آئینہ یعنی تاثیر یک طرف نازش مژگان و دگر سو غم خار

دست دعا آئینہ۔ بترکیب قلب آئینہ دست دعا جس کے جوہر تاثیر کے ہیں۔ جوہر آئینہ کے ہوں یا تیغ کے چونٹیوں کے پاؤں کے ایسے ہوتے ہیں۔ ان سے ادنیٰ ملابست کی وجہ سے مژگان اور خار لائے۔
جناب نظم۔ جوہر دست دعا آئینہ اردو تو کیا فارسی میں بھی غریب ہے دست دعائے ممدوح کو آئینہ فرض کیا ہے اور آئینہ دست دعا کو بقلب اضافت دست دعا آئینہ کہا ہے۔ اور آئینہ میں جوہر ہوتے ہیں تو آئینہ دست دعا کا جوہر کیا ہے تاثیر ہے۔ اور جوہر آئینہ کو مژگان سے اور خار سے تشبیہ دیا کرتے ہیں اسی مناسبت سے لفظ مژگان و خار کو لائے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ ممدوح کے آئینہ دست دعا کا جوہر تاثیر دو وصف رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ نازش مژگان کا باعث ہے۔ یعنی مژگان ممدوح کو اسی تاثیر پر ناز ہے اس لیئے کہ دعا کے وقت مژگان سے بھی اشک ٹپکتے تھے۔ اب دعا کے قبول ہونے پر مژگان کو کیوں کر ناز نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جوہر تاثیر خار حسرت کے لیئے غم کا سبب ہے۔ اس لیئے کہ جب دعا نے تاثیر کی اور مراد آگئی تو پھر حسرت کجا۔ یا یہ غرض ہے کہ جوہر تاثیر رو کش مژگان خوبان و رشک افزائے خار مغیلان ہے۔ نہ کسی مژہ میں ایسی ناوک فگنی اور نہ کسی خار میں ایسی نشتر شکنی ہے۔ بہر حال بندش کی خامی اور مضمون کی ناتمامی سے یہ شعر خالی نہیں۔
جناب حسرت۔ دست دعا کو آئینہ اور اس کی تاثیر کو اس آئینہ کا جوہر قرار دے کر کہتا ہے کہ یہ تاثیر دعا مژگان خون فشان کے لئے مایۂ نازش ہے۔ اور خار حسرت کے لئے موجب ملال۔ مطلب یہ ہے کہ تیری دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے۔ اور اس لئے اس کی تاثیر مژگان کے لئے جو قبولیت دعا کے لیئے خون فشان رہتی ہے باعث ناز و خار غم کے لئے موجب ملال ہے۔

ظاہر ہے کہ حاصل تقریر وہی مطلب جناب نظم ہے۔

جناب آسی۔ دست دعا آئینہ ہے جس کا جوہر تاثیر ہے۔ وہ ایک طرف مژگان اشک فشاں کے لئے مایہ ناز ہے۔ تو دوسری طرف حسرت دل کے واسطے خار غم ہے۔ کیوں کہ دعا کرتے وقت مژگان سے آنسو نکلتے ہیں۔ جس سے دعا مقبول ہوتی ہے۔ اس سبب سے تو وہ جوہر آئینہ دست دعا یعنی تاثیر فخر مژگان ہے (کیا خوب تفسیر فرمائی ہے) ۔ دوسری طرف چوں کہ حسرت دل میں تاثیر کی وجہ سے مٹی جاتی ہے اس کے لئے خار غم ہے۔ یا یہ کہ وہ جوہر آئینہ دونوں چیزوں کا سبب ہے کہ ایک طرف اس سے مژگان کو ناز ہے۔ دوسری طرف وہ کانٹا بنی ہوئی ہے یعنی کانٹے سے مشابہ ہے۔ جوہر کانٹا بنی ہوئی ہے۔ یہ اصلی جملہ ہوا۔ تاثیر کی باتیں تو پہلے مطلب میں آچکیں اور دوسری بات اس سے الگ کہنا چاہتے ہیں۔ شاید جوہر ان کی زبان پر مؤنث ہے۔

ان کے مطلب سے بھی ظاہر ہے کہ جناب نظم کے مطلب کو بالفاظ دیگر ادا کر رہے ہیں۔ بلکہ اکثر الفاظ بھی انھیں کے ہیں۔ اب آگے کچھ جودت طبع دکھانا چاہتے ہیں۔ جواب تک کبھی تک سے نہ ہوئی۔

یہ بھی معنی پیدا ہوتے ہیں کہ سب جگہ آئینہ میں جوہر ہوتا ہے لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ دست دعا کا جوہر آئینہ ہے (کیا بات کہی ہے۔ نظر بد دور) اور آئینہ سے مراد تاثیر ہے۔ آئینہ سے تاثیر کی تشبیہ اس لئے دی کہ آئینہ بھی حسن و قبح کو ظاہر کرتا ہے اور تاثیر بھی نتیجہ دعا کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے گویا یہ آئینہ تاثیر ہے جس نے نتیجہ یہ ظاہر کیا ہے کہ ایک طرف مژگان کو یہ فخر ہے اور دوسری طرف غم خار ہے۔ یعنی دست دعا کا جوہر آئینہ۔ اور آئینہ تاثیر تو گویا تاثیر جوہر ہے اور اسی جوہر کے دو اثر ہیں ایک طرف نازش مژگان اور دوسری طرف خار دل غم۔ اس صورت میں جوہر دست دعا آئینہ ہونے کی انوکھی ترکیب ہونے کا اعتراض بھی اٹھ گیا۔ جو نظم صاحب نے اپنی شرح میں غالب پر کیا ہے۔

شعر میں مصنف جوہر کی تفسیر تو تاثیر سے فرما رہے ہیں۔ یہ آئینہ کو دست دعا کا جوہر فرماتے ہیں۔ آئینہ کا دست دعا کے لئے جوہر ہونا۔ یہ تو سب سے زیادہ انوکھی بات ہے اور پھر (یعنی تاثیر) کس مسئلہ کی تفسیر ہے اسے بتاتے نہیں۔ اور اپنے نزدیک اعتراض نظم کو انھوں نے اٹھا دیا۔

کسی نے اپنی دماغ سوزی نہ کی جناب نظم کے کچھ الفاظ بدل کے انھیں کے معانی لکھ دیئے۔ جناب نظم کا خیال اس طرف گیا کہ یہ شعر بھی مدح ممدوح میں ہے لہٰذا مدح میں لانے کی کوشش کی اسی وجہ سے راہ مستقیم سے ہٹ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر بھی گریز کا ہے۔ اور مدح سے دعا کی طرف آتے ہیں جو آخری جزو قصیدہ کی ہوتی ہے ۔

اگلا شعر اسی بات پر دال ہے۔ اور دعا کا لفظ اسی غرض سے لائے مطلب یہ ہے کہ:

میرے۔ دست دعا کے آئینہ میں جوہر کی جگہ تاثیر بھری ہوئی ہے۔ مگر اس میں دُہری تاثیر ہے۔ ایک طرف تو دوستداران حضرت علیؑ کی مژگان کے لئے وہ جوہر یہ تاثیر باعث فخر و ناز ہیں کیوں کہ اس کے حق میں جو دعا کی جائے گی وہ

ضرور مقبول ہوگی۔ چوں کہ تاثیر تو آئینہ دست دعا کی جوہری ہے۔ اور دوسری طرف وہ حضرت علی کے دشمنوں کے لئے خار غم و ملال ہے۔ اور یہ دعا بھی مقبول ہے۔

اگرچہ مژگان و خار جوہر کے مشبہ بہ ہیں مگر مجھے لفظ مژگان اچھا اس محل پر نہیں معلوم ہوتا۔ اگر مژگان کو نکال دیا جائے اور رعایت لفظ کی نہ رہے تو معنی میں کوئی خلل نہیں پیدا ہوتا ہے۔ دوہری تاثیر کا بیان رہے۔ مثلاً ؎

اک طرف موجب شادی و دگر سو غم خار

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ  خاک در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار

مردمک لفظ کی ترکیب چاہتی ہے کہ پتلی PUPIL معنی ہوں محل سیاہ دیدہ کے معنی چاہتا ہے۔ آئینہ دار فارسی میں بمعنی سرتراش (نائی ۔ حجام) ہے مگر جناب نظم و حسرت بمعنی خدمت گار و فرمانبردار فرماتے ہیں۔ میرے خیال میں معنی وضعی پر استعمال کیا ہے یعنی جو آنکھ تیری خاک در کو آئینہ اپنے لیئے نہ بنائے۔ جناب حسرت اقبال نگاہ کو باضافت پڑھتے ہیں اور بخت مندی و کام گاری نگاہ معنی کہتے ہیں یہی رائے جناب نظم کی بھی ہے۔

اس صورت میں میری رائے ناقص میں یہ آتا ہے کہ خانہ پر اضافت نہ دی جائے۔ تو تیسرے رکن فعلاتن کی جگہ مفعولن ہو جائے گا بوجہ زحاف تسکین اوسط۔ پھر قافیہ آئینہ دار بھی مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ اس کے معنی (نائی) کے ہیں۔ مجازاً خدمت گار اور فرماں بردار کہنا پڑتے ہیں۔ چشم کا خاک سے آئینہ دار ہونا بھی تکلف سے خالی نہیں۔ اس لیئے پورا شعر یوں ہو جائے تو شاید اچھا ہو۔ ؎

مردمک سے ہو عزا خانہ ۔ اقبال نگاہ  خاک در چشم کو جس کی نہ ہو کحل الابصار

نگاہ کی خوش بختی کا عزا خانہ آنکھ کا سیاہ دیدہ ہو جائے۔ جو چشم کہ فرمانبردار حضرت علی کے خاک در کی نہ ہو۔ یعنی وہ نگاہ خوش بختی کی ہمیشہ سوگوار رہی۔

معنی ترمیم۔ جس آنکھ کے لیئے خاک در حضرت علی کحل البصر نہ ہو اس کی نگاہ کی خوش بختی کے لیئے آنکھ کا سیاہ دیدہ عزا خانہ بن جائے۔ اور کبھی کام گاری کا منھ نہ دیکھے ناظرین مجھ سے اچھا سمجھتے ہیں آگے وہ جانیں۔ چوں کہ نگاہ کی خوش بختی بصارت پر منحصر ہے اس لیئے اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ آنکھ اندھی ہو جائے۔

دشمن آل نبی کو بطرب خانۂ دہر  عرض خمیازۂ سیلاب ہو طاق دیوار

آل نبی ۔ اسباط نبوی ۔ علی الخصوص حسنین علیہما السلام۔ ظاہر ہے کہ جس گھر کو سیلاب گھیر لے وہ ڈھے جاتا ہے۔ طاق عمارت محراب نما ہوتا ہے اور امواج آب بھی خمیدہ ہوتی ہیں۔ سیلاب ۔ طغیانی آب ۔ بہیا ۔ رو ۔ خمیازہ انگڑائی ۔ نشہ اتر جانے کے

نشہ باز کو انگڑائیاں آتی ہیں اور اسے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ میں لفظ خمیازہ کی خوبی نہ سمجھ سکا۔ مانا کہ سیلاب کی موجیں کج و داکج ہوتی ہیں اور انگڑائی میں بھی جسم ٹیڑھا بیڑا ہو جاتا ہے مگر جب شراب وغیرہ کا ذکر نہیں تو اس لفظ کے صرف میں لطف کیا۔ اس لیئے اس مصرع کو یوں تجویز کرتا ہوں ؎

موج سیلاب ہو اس کے لیئے طاقِ دیوار

یہ شعر دعائیہ ہے مگر دعائے بد میں۔

دنیا کے طرب خانہ کے طاق کی محرابیں دشمن اولادِ نبی کے لیئے امواج سیلاب بن جائیں۔ یعنی دشمن آل نبی کو کبھی خوشی زمانہ حاصل نہ ہو۔

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پر توشوق　　فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار

دیدہ تا دل کی جگہ ( دیدہ و دل ) صاف ہے۔ یک بہت زیادہ۔ خط کے معنی تحریر کے بھی ہیں۔ لہٰذا معنی اور راقم کی مناسب کے لیئے لائے۔ پھر جام اور سرشار کے بھی مناسب ہے۔ کیوں کہ جام میں ناپ کے لیئے خطوط ہوتے ہیں۔ ساغر دیدہ و دل سے استعارہ ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ لفظ خط محض لفظ معنی کی مناسبت سے لائے۔ اور لفظ راقم بہت مبتذل لفظ ہے۔ ان معنی پر راقم شعرا کی زبان نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قائل یا مثل اس کے کوئی لفظ ہوتا اسدؔ آنکھوں سے لے کر دل تک ایک بڑے پر توشوق کا آئینہ ہے۔ یعنی اسدؔ ہمہ تن شوق مدح حضرت علی بنا ہوا۔ اور فیض معنوی سے اس کا ساغر دل و دیدہ لبریز ہے۔ مگر ان کی مدح بی لا متناہی ہے پھر اس کی تکمیل مجھ سے کیسے ہو سکتی ہے۔

---

# قصیدہ ثانی در مدح حضرت امیر المومنین علیؑ ابو الائمہؑ

قصیدہ ۲      اشعار ۳۳

قیانظم ۲۲۴
اشعار ۳۳

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں      ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بین

یکتائی، وحدت۔ معشوق، محبوب حقیقی بمفاد حدیث اللہ جمیلٌ و یحب الجمال۔ حسن کا لفظ بھی اسی حدیث کی بنا پر ہے۔ خود بین۔ بفحوائے حدیث قدسی کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لکی اعرف۔

مسئلہ وحدت وجود ولاموجود الا اللہ کہنا چاہتے ہیں۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں العلم النقطة فکثرھا الجاھلون۔ یہ بھی فرماتے ہیں من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ یہ سب مقولے وحدت وجود پر دال ہیں۔ اور یہ آیہ قرآنی بھی اسی مطلب پر دال ہے۔ نفخت فیہ من روحی اگرچہ اہل مذہب (روحی) میں اضافت تملیکی مانتے ہیں۔ سورۂ رحمان کی دو آیتیں بھی لاموجود الا اللہ کو بتاتی ہیں۔ کل شئی ھالک الا وجھہ۔ و۔ کل من علیھا فان و یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ اہل مذاہب بھی روح کو باقی مانتے ہیں اور آیتیں سوائے ذات الٰہی کے اور کسی کو باقی نہیں کہتیں اس کے بعد نتیجہ لاموجود ہی کا نکلتا ہے۔ بربنائے کل یوم ھو فی شان، شیونات مختلفہ ہیں مگر ذات واحد ہی ہے۔ موجودات صرف اعتبارات ہیں۔ اور بس۔ حقیقت ایک ہی ہے۔

وحدت محبوب حقیقی کے سوا دہر میں اور کچھ نہیں۔ اگر حسن حقیقی خود بین نہ ہوتا (اپنے کو دیکھنا نہ چاہتا) تو دیگر اشیا کا وجود کب ہوتا۔ ہر ذرہ کائنات مظہر ذات الٰہی ہے۔ اور اس وحدت صرفہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

بے دلیہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق      بےکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

عالم کا تماشا اس بے دلی بے غوری اور بے فکری سے ہم کرتے ہیں کہ جس سے نہ عبرت و نصیحت ہی حاصل ہوتی ہے اور نہ مزہ ہی ملتا ہے۔ سخت قابل افسوس ہے۔ اور تمنا کی بےکسی اور محرومی پر بھی افسوس ہے کہ جس سے نہ دنیا

ہی حاصل ہوئی اور نہ دین ہی ہاتھ لگا۔ سعی تو کی نہیں پھر خالی تمنا سے دین یا دنیا کا کیا فائدہ پہنچتا ۔ وما للانسان الا ما سعی ۔

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم　　لغو ہے آئینہ فرق جنون و تمکین

ہرزہ ۔ بیہودہ و پوچ گوئی ۔ زیر و بم ۔ نیچے اونچے ۔ سر تمکین ۔ قدرت و وقار ۔ لغو ۔ اخلاط الکلام بلا فائدہ ۔

علاوہ وجود واجب ہستی و عدم اشیا کا راگ گانا بے سُری الاپ ہے ۔ اور دیوانگی و فرزانگی میں امتیاز کرنا بالکل لغو ہے ۔ جسے ہوشیاری سمجھتے ہیں وہ خود جنون ہے ۔ زیر عدم و بم ہستی ہیں لف و نشر غیر مرتب تھی ۔ لفظ آئینہ صرف نغمہ کے سجع کے لئے لائے ورنہ بے ضرورت ہے ؎

لغو و بے کار ہے تمیز جنون و تمکین

؎ لغو ہے تذکرۂ فرق جنون و تمکین

نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت　　سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق تحسین

جناب حسرت نکتہ چینی الفاظ و معنی سے اجتناب فرماتے ہیں ۔ اور جناب نظم کی توجہ ادھر ہوتی ہے مگران سے بھی زیادہ الفاظ مجھے پریشان کرتے ہیں ۔ جیسا کہ اس شعر میں لفظ خمیازہ اور اوپر والے شعر میں لفظ آئینہ ہے ۔ اور بکثرت الفاظ اس سے پہلے گزر چکے ۔ اور ہر جگہ میں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ جناب نظم اگر تسامح اور درگذر سے کام نہیں لیتے ہیں تو ضرور میری بد دماغی اور کم علمی پر یہ امر دال ہے ۔ خمیازہ کا لفظ میرے لئے پریشان کن ہے ۔ اگرچہ لفظ ۔ اندازہ ۔ بہت اچھا نہیں پھر بھی خمیازہ سے شاید اچھا ہو ۔ اور پیمانہ سے کچھ مناسبت بھی ہوتی ہے ۔ معنی اور صورت میں صنعت طباق ہے ۔

جناب نظم خمیازہ کو یوں کھپاتے ہیں ۔ نقش معنی سے تحریر معنی مراد ہے جس میں خمیازہ کی صورت پیدا ہو ۔ اور خمیازہ علامت خمار ہے ۔ اسی خمار کے دفع کرنے کے لیئے شراب تحسین کے پیمانہ کی ضرورت ہوئی ۔ دونوں مصرعوں میں دو باتوں نقش معنی اور سخن حق کا ذکر ہے اور ان کے اغراض بیان کئے ہیں ۔ جناب نظم دونوں کو ایک کر کے خمیازہ کو ربط دینا چاہتے ہیں ۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں ۔

اگرچہ مناسبت محل سے لفظ خمیازہ کو نہ ہوگی مگر بلحاظ لزوم در لزوم اگر خمیازہ کے معنی اشتیاق و رغبت لیئے جائیں تو معنی بن جائیں گے ۔ کیونکہ بحالت خمار انگڑائیاں آتی ہیں اور رغبت شراب کی طرف بے حد ہوتی ہے ۔

معنوی باتوں سے ہر شخص کی رغبت ہمہ تن دکھاوے اور نمود کی طرف ہوتی ہے۔ اور اگر حق و انصاف کی باتیں بھی کرتے ہیں تو اس سے تحصیل تحسین مقصود ہوتی ہے۔ کوئی خوبی کو خوبی سمجھ کے نہیں کرتا ہے بلکہ اس میں بھی ظاہر داری اور غرض کو دخل ہوتا ہے۔

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم  دُرد یک ساغر غفلت ہے چہ دُنیا و چہ دین

جب دنیا میں دعوئ اور شیخی علم غرض سے خالی نہیں اور دین میں عبادت بغرض نفع آخرت ہے تو نہ یہ علم کسی کام کا ہے اور نہ عبادت۔ بلکہ غفلت کے ساغر کی تلچھٹ ہے۔ جس کو ناکارہ ہونے کی وجہ سے پھینک دیتے ہیں۔

مثل مضمون وفا باد بدست تسلیم  صورت نقش قدم خاک بفرق تمکین

باد بدست۔ خالی ہاتھ رہنا۔ کچھ ہاتھ نہ لگنا۔ تسلیم۔ رضا۔ اپنے تمام امور کو خدا کے سپرد کر دینا اور اس کی مشیت پر راضی رہنا۔ کسی کے سر پر خاک۔ قابل تذلیل و ترک۔ فرق۔ مانگ مجازاً سر۔
تسلیم و رضائے ریائی اور نمود سے کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ جس طرح وفاداری سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور استقلال و پایداری کے سر پر بھی نقش قدم کی طرح خاک ڈالنا چاہئے کیوں کہ تمکین اور دیگر صفات حسنہ کی کوئی قدر باقی نہیں رہی۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ دوسرا پہلو بد دعا کا بھی نکلتا ہے۔

عشق بے ربطی شیرازۂ اجزائے حواس  وصل زنگار رُخ آئینۂ حُسن یقین

اجزاء حواس کے شیرازہ کی بے ربطی کا نام عشق ہے۔ یعنی عشق خلل دماغ کو کہتے ہیں۔ اور تمنائے وصل حسن یقین کے آئینہ رخ پر زنگار کا کام کرتی ہے۔ اگر عشق صادق ہوتا تو وصال دائمی ہوتا۔ اور انا لیلیٰ ہو جاتا۔

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب  بیستون آئینۂ خواب گران شیریں

رقیب سے مراد خسرو پرویز۔ آئینہ سے مراد وضوح۔ نمایش۔
فرہاد عشرت کدۂ خسرو کے لیئے ایک بھوکا مزدور تھا۔ اگر عشق صادق رکھتا ہوتا تو کبھی اپنے رقیب کا مزدور نہ بنتا۔ اور بوجہ جذب عشق بغیر کسی شرط کے اس کے پاس شیریں کھنچ کے چلی آتی۔ اور کوہ بیستون کے کھودنے کی شرط جو شیریں نے لگائی وہ اُس کی غفلت شعاری اور بے وفائی پر واضح طور سے دال ہے۔ اگر اس میں وفا اور عشق فرہاد میں صداقت ہوتی تو کسی شرط کے بغیر اس کی تمنا پوری کرتی۔

کس نے دیکھا نفَس اہلِ وفا آتش خیز  کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں

آتش خیز۔ گرم و پرتاثیر۔ نفس مراد آہ۔ حزن۔ افسوس بر مافات۔ غم جس کے ازالہ پر انسان قادر نہ ہو۔ مثل فوت محبوب۔ اور غم بعد نزول امر نیند لاتا ہے۔ ہم جس کا ازالہ انسان کر سکے جیسے افلاس۔ اور وہ، غم جو قبل نزول نیند اڑا دیتا ہے۔ علامہ سیوطی کہتے ہیں کہ ہم وہ غم جس کے وقوع اور جانے کا انتظار ہوتا ہے۔ اور غم وہ ملال جو واقع ہوا۔ یا کسی خوبی پر جو فوت ہو گئی۔

وفاداروں کی آہ کی تاثیر کس نے دیکھی۔ یا۔ دلہائے غمگین کے نالوں کا اثر کس نے پایا۔ یعنی دونوں چیزیں اس زمانہ میں مفقود ہیں۔

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن  نہ سر و برگ ستائش نہ دماغ نفریں

سر و برگ۔ ساز و سامان۔ و (سر) بمعنی خیال و برگ بمعنی سامان۔

لوگوں کے زمزمہ عشرت سن تو لیتا ہوں۔ مگر دنیا میں عیش کہاں۔ اسی لیئے مجھے ان کے اس فعل کی نہ تعریف کا خیال، ہے اور نہ عیش کا سامان۔ اور نہ اسی کا دماغ ہے کہ اس کی مذمت کروں۔ لوگ جو کرتے ہیں کریں مجھے اس سے کیا مطلب۔

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ  یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

ہرزہ سرا۔ بیہودہ گو۔ عیاذاً باللہ۔ خدا کی پناہ۔ خدا بچائے۔

میں کس قدر فضول بکواس کرنے والا ہوں کہ دنیا اور اہل دنیا کی مذمت کر رہا ہوں۔ اور اک دم طریقۂ وقار و تمکین خود داری سے الگ ہو گیا ہوں۔ مجھے کیا مطلب کوئی کچھ کرتا ہے کرے۔ تم تو مطلب اور نفع کی بات چیت کرو جو آخرت میں کام آئے۔ یہ شعر تخلیص کا بعد تشبیب واعظانہ مدح حضرت علی کی طرف ہے۔

نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیان تحریر  یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

لاحول۔ اللہ کے سوا کسی میں قدرت نہیں۔ ہذیان۔ بتوالی حرکات فارسی میں ثقیل معلوم ہوتا ہے اس لیئے بسکون ثانی استعمال کرتے ہیں۔ ترک صواب بوجہ مرض یا بسبب دیگر۔ بے ہودہ گوئی۔ بکواس۔ وسواس۔ جو امر کہ دل میں قبیل شر خطور کرے۔ اگر از قبیل خیر ہو تو الہام ہے۔ نقش۔ تعویذ۔

اے ہذیان لکھنے والے قلم لاحول کا تعویذ لکھ یعنی اس بکواس سے اجتناب کر۔ اور اے فطرت جو وسواس کی ہم نشین و ہمدم ہے یا علی کا وظیفہ جپ۔ اب مدح مرتضوی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مظہر ذات خدا جان و دل ختم رسل　　　قبلۂ آل نبی کعبۂ ایجاد یقین

جان و دل ختم ورسل بمفاد حدیث لحمك لحمی و دمك دمی رُسُل جمع رسول۔ نبی صاحب شریعت۔ ختم رسل = حضرت محمد مصطفٰے صلعم قبلہ = خانہ کعبہ۔ چوں کہ نماز میں منھ کے سامنے اسے رکھتے ہیں۔ اور کعبہ اس لیے کہ اس کی عمارت مکعب ہے اور قبلہ و کعبہ کلمہ تعظیم بھی ہے۔ کسی بزرگ کے لئے خصوصاً باپ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ حضرت علی ابو الائمہ ہیں۔ ختم بمعنی خاتم از روئے مبالغہ ہے اگرچہ خود مصدر ہے۔ یقین = حقیقت کا علم کے ساتھ ہی اس کے اس کا بھی علم ہو کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ علم جو بعد شک حاصل ہو۔ علی = اللہ کا بھی ایک نام ہے۔ مظہر ذات = خدا۔ جب اہل تصوف کل کائنات کو مظہر ذات خدا کہتے ہیں تو علی کا مظہر ذات خدا ہونا کیا بعید ہے۔ بلکہ ادنیٰ تعریف ہوئی۔ یقین۔ بقوائے قول علیؑ لوکشف الغطاء لما ازددت یقیناً۔ حضرت علی مظہر ذات خدا ہیں اور جناب رسالت مآب کے جان و دل ہیں۔ ابو الائمہ ہیں اور ایجاد یقین کے مرکز ہیں۔

سب ایجاد یقین باضافت لکھتے ہیں اور مجھے بحالت لفظ ایجاد باضافت معنی میں دشواری ہو رہی ہے۔ لہٰذا ایجاد و یقین بعطف پڑھنا چاہتا ہوں۔ مفاد انا و علی من نور واحد ان کی ذات اور ذات نبوی ایک ہے تو جناب رسالت مآب جس طرح باعث ایجاد خلق ہیں یہ بھی باعث ایجاد خلق ہوئے چنانچہ اگلے شعر میں خود مصنف بھی سرمایہ ایجاد کہہ رہے ہیں۔

ہو وہ سرمایہ ایجاد جہاں گرم خرام　　　ہر کف خاک ہے واں گردۂ تصویر زمین

سرمایہ ایجاد مراد حضرت علی گردہ خاکہ ایک سیاہ سفوف جس سے مصوّر پہلے تصویر کا خاکہ (اسکیچ) بناتے ہیں (ہے) کی جگہ (ہو) ہوتا مگر تکرار کے بچنے سے (ہے) کہا ؎

ہو جو وہ باعث ایجاد جہاں گرم خرام　　　ہر کف خاک بنے مایۂ یک تازہ زمین

حضرت علی جس جگہ پر چلیں وہاں کی ہر مٹھی بھر خاک دوسری زمین کی تصویر کے لیئے خاکہ کا کام دے۔ اس سے کیا تعریف قابل تعریف نکلی اسے میں نہ سمجھا۔ جناب حسرت نے (ہے) کی جگہ (ہو) ہی اختیار کیا ہے۔

جلوہ پرواز ہو نقش قدم اس کا جس جا　　　وہ کف خاک ہے ناموس دو عالم کی زمین

زمین۔ ہر شارح یہی لفظ اختیار کر رہا ہے۔ اگلے لوگ قصیدہ بھر میں تکرار قافیہ کو ایطاء سمجھتے تھے۔ قافیہ مکرر لانا

چاہتے تھے تو دوسرا اور تیسرا مطلع کہہ کے ایک نیا قصیدہ قرار دے لیتے تھے۔ اس کے بعد انیس اشعار کے بعد قافیہ مکرر لانے لگے کیوں کہ کمتر مقدار قصیدہ کی انیس مانتے ہیں۔ اور غزل میں پانچ کے بعد۔ مگر دو۔ مکرر قافیے برابر برابر اچھے کبھی نہیں سمجھے گئے۔ اس بنا پر بھی اور قافیہ (زمین) اس شعر میں خلل انداز معنی ہو رہا ہے یا کم از کم تکلیف پیدا کر رہا ہے لہٰذا میں ضمین بمعنی ضامن تجویز کرتا ہوں یا اور تعجب نہیں کہ مصنف نے یہی بضاد کہا ہو۔ ناموس ـ عزت و آبرو۔

جناب حسرتؔ (زمین) کی جگہ (امین) لکھتے ہیں بہر صورت زمین سے تو امین بھی اچھا ہے۔

نقش قدم حضرت علی کی خاک دونوں عالم کی عزت کی ضامن ہے یعنی باعث عزت و آبروئے دو عالم ہے۔

نسبت نام سے اس کے ہے یہ رتبہ کہ رہے ابداً پشت فلک خم شدہ ناز زمین

اس شعر سمیت تین قافیے برابر برابر زمین کے ہوتے ہیں۔ دواوین اساتذہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس قاعدہ کی پابندی کر رہے ہیں تو پابند نہ ہونا بھی پایا جاتا ہے۔ اور اردو میں تو ساری غزل ایک قافیہ میں قابل تحسین سمجھی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت علی مسجد نبوی میں خاک پر سو رہے تھے۔ جناب رسالت مآبؐ تشریف لائے اور لفظ ابو تراب سے خطاب فرما کر انھیں اٹھایا۔ اس لیئے ان کی کنیت ابو تراب ہو گئی یا۔ اب و اُم تفخیم کے لیئے بھی آتے ہیں جیسے ام القریٰ مکہ کا نام فریق کی اصل۔ بڑا قریہ۔ اُردو میں بھی باپ بڑائی کے لیئے لاتے ہیں جیسے وہ تو اس کے ہی باپ نکلے۔ اس لیئے ابو تراب کے معنی بڑے خاک والے کیوں کہ کپڑے حضرت علی کے خوب آلودۂ خاک ہو رہے تھے۔

جناب نظمؔ علو سے علی کا اشتقاق بتا کے اور علو فلک کا ذکر کر کے یوں نسبت نام ٹھہراتے ہیں جو مجھے پسند نہ آئی۔ کنیت ابو تراب کو بھی دخل دیتے ہیں۔ لیکن اس کو اچھا نہیں کہتے کیوں کہ یہ لفظ تو ذہن شاعر میں رہ گیا اور شعر میں نہ آیا۔

اس کنیت کے مشہور ہونے کی وجہ سے ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے اس لیئے اگر شعر میں نہ لائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

زمین کو چوں کہ کنیت حضرت علی ابو تراب سے نسبت ہے کیوں کہ تراب بمعنی زمین و خاک ہے اس نسبت نام کی وجہ سے زمین نازاں ہے۔ اور نعش حضرت علی زمین میں دفن ہے۔ زمین کو یہ رتبہ حاصل ہونے کی وجہ سے بار ناز زمین اُٹھانے میں ہمیشہ کے لئے پشت فلک خمیدہ ہے۔

برش تیغ کا ان کی ہے جہاں میں چرچا قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

برشِ تیغ ۔ تلوار کی کاٹ ۔ ضربة علی یوم الخندق افضل من عبادة الثقلین لا فتی الا علی لا سیف الا ذو الفقار ۔ جنگ خندق میں علی کی تلوار کی کاٹ اور ضرب دونوں عالم کی عبادت سے بڑھ کے ہے ۔

حضرت علی کی تلوار کی کاٹ کا دنیا میں شہرہ ہے ۔ لہٰذا اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں سلسلہ ایجاد عالم ہی منقطع نہ ہو جائے ۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ مبالغہ غلو ہے اور مبتذل ہے ۔

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے — رنگ عاشق کی طرح رونق بت خانہ چین

اس کا یعنی تیغ کا ۔ ٹوٹے ۔ فارسی کے محاورہ رونق شکستن و رنگ شکستن کا ترجمہ ہے اُردو میں رونق جاتی رہنا ۔ اور رنگ اُڑ جانا بولتے ہیں ۔ اس لیے ٹوٹنے کی جگہ ۔ (اڑ جائے ۔ ہو دور) ہونا چاہئے ۔ وہ اور یہ اُردو میں عظمت کے لیے بھی کہتے ہیں ۔ یا ۔ "ایسا" اس جگہ اس کے معنے ہیں ۔

ذو الفقار حضرت علی کا ایسا جلوہ ہے کہ جب وہ میان سے نکلتی ہے تو رنگ عاشق کی طرح رونق بت خانہ چین اڑ جاتی ہے ۔

فیض خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا — بوئے گل سے نفس باد صبا عطر آگیں

خلق بضم وہ ہیئت حاصلہ راسخہ نفس کہ جس سے افعال بغیر فکر و رویت ، بآسانی صادر ہوں ۔ خلق کو خوشبودار چیزوں سے اور حلم کو کوہ وغیرہ سے تشبیہ دیتے ہیں ۔

حضرت علی کے اخلاق حسنہ کا فیض شامل حال ہے جبھی تو باد صبا کی لپٹیں بوئے گل سے معطر ہمیشہ رہی ہیں ۔

باد صبا میں اضافت عام کی طرف خاص کے ہے ۔

جان پناہا ۔ دل و جان فیض رسانا شاہا — وصی ختم رسل تو ہے بفتوائے یقین

تینوں الف ندا کے ہیں اور منادی صفات مذکورہ کے ساتھ حضرت علیؑ ہیں ۔ وصی ۔ شرعاً وہ قائم مقام کسی کا کہ اس کے مرنے کے بعد اسے متوفی کے مال و اطفال پر حفظ و تصرف کا حق حاصل ہو ۔

وصایت ۔ حدیث غدیر من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ ۔ اور حدیث قرطاس کے ماننے اور نہ ماننے یا تاویل کرنے پر انحصار مذہب تسنن اور تشیع کا ہے یہ شعر ۔ اور رباعی ؎

مہ جانے نشین مہر باشد نہ نجوم

اور وہ خط جو نواب علاء الدین خان نے مولوی حمزہ خان کی طرف سے بطور نصیحت مرزا کو لکھا ہے۔ اور یہ شعر حافظ کا لکھا تھا ؎

چون پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو      رندی و خراباتی در عہد شباب اولیٰ

اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ یہ سب ان کے تشیع پر قوی دال ہیں۔

؎ اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطے مارنا اور ہے۔ اور عرفا کے کلام سے حقیقتہ حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو (خلفاء ثلاثہ) ابو الائمہ کا ہمسر ملنتے ہیں۔ مدح ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لاالہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ۔ و- لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے وقت میں سب مفترض الطاعہ تھے محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین و رحمۃ للعالمین ہیں مقطع نبوت کا مطلع امامت (خلافت خلفاء ثلاثہ سے انکار ہے۔ لفظ خلافت و امامت میں دھوکا نہ کھانا چاہیئے) کیوں کہ امامت و خلافت کو مترادف قرار دے کر فرماتے ہیں) اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے۔ اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے، ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی علیہ السلام ؎

برین زیستم ہم برین بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت کو زندقہ و مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں اگر مجھ کو دوزخ میں بھی ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تا کہ مشرکین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔

ان امور کے ہوتے ہوئے ان کو سنی یا تفضیلیہ سنی ٹھہرانا ہٹ دھرمی اور ابلہ فریبی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اگر سنیوں کا بھی عقیدہ ہے تو دنیا میں کوئی سنی نہیں سب مسلمان شیعہ ہیں۔

جناب آسی فرماتے ہیں کہ مصنف اپنے جوش عقیدت میں اپنے مذہب کے موافق یہ لکھ گئے۔ ورنہ یہی وہ مسئلہ ہے کہ جس نے دنیائے اسلام میں دو گروہ سنی اور شیعہ بنا دئے۔ حالاں کہ آج حضرت علی ہیں اور نہ حضرت عمرؓ اور یہ سب جھگڑا اور اس کا اعادہ فضول سے کم نہیں ہے۔

اتنا واضح طور پر اپنا عقیدہ تشیع ظاہر کر رہے ہیں پھر بھی جناب حالی خلط مبحث کر کے کبھی سنی ٹھہراتے ہیں اور کبھی سنی تفضیلی۔ شیعہ ہونے کا اقرار نہیں کرتے۔ ان کے تتبع میں دوسرے شارحین سنی بھی حد تفضیل تک پہنچتے ہیں۔ جناب آسی البتہ شیعہ کہہ رہے ہیں۔ مگر اظہار عقیدت کو ان کے نہ ہونے کے بعد فضول ٹھہراتے ہیں۔

وصایت سے درگذر کر کے اگر مسئلہ خلافت کو دیکھا جائے تو اس مسئلہ میں اہل تسنن کسی قانون کے پابند نہیں معلوم ہوتے۔ خلافت اول کو اجماعی کہتے ہیں حالاں کہ اس فیصلہ میں حضرت علی اور حضرت عباس عم نبی جو بڑے اہل حل وعقد میں تھے وہی شریک نہ تھے۔ پھر خلافت ثانوی بذریعہ وصیت ہے۔ تیسری خلافت تین شخصوں کی رائے پر منحصر تھی۔ لہٰذا خلافت اجماعی بھی نہ رہی۔ حضرت علی کے ایک مرتبہ خلیفہ ہونے کے بعد خلافت امیر معاویہ حکمین کے فیصلے سے ہوئی۔ امام حسن سے صلح کے بعد۔ پھر وہی باپ بیٹے میں آپڑی۔ بنی العباس کا زور چلا انہوں نے بنی امیہ سے چھین لی۔ اور آخر تک باپ بیٹوں کے اصول پر ہوتی رہی اور مستعصم باللہ تک سب امیرالمومنین و خلیفۃ المسلمین تھے۔ جب کوئی اصول قرار نہیں پاتا تو یہی اصول رہ گیا جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

اچھا ایک دوسری نظر سے اس خلافت پر نظر ڈالی جائے یعنی فاضل ومفضول کو دیکھا جائے۔ اہل تسنن اپنی احادیث ستہ اور اپنی تاریخوں سے فضائل خلفاء اربعہ ہر ایک کے الگ الگ جمع کریں۔ بعد اس کے تعداد و وقیع ہونے پر ہر ایک کے ساتھ فضائل علی کو دیکھیں۔ اس کے بعد خلفاء ثلاثہ کے فضائل کو ایک قرار دیں اور حضرت علی کے ان سب کے مقابل میں تعداد اور وقعت میں لائیں۔ اگر ہر ایک کے مقابل میں کثیر اور وقیع نکلیں تو بھی اور سب کے مقابلہ میں کثیر اور وقیع ہوں تو پھر بدرجہ اولیٰ مستحق خلافہ علی ٹھہریں گے۔ اور قانون عقل کا مقتضی ہوگا کہ فاضل کے ہوتے ہوئے مفضول کو نہ اختیار کیا جائے۔

حقیقت مذہب شیعہ پر دلیل نقلی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حدیث نبویؐ ہے کہ میری اُمت تہتر فرقوں میں منقسم ہو جائے گی ان میں سے ایک ناجی اور بہتر ناری ہوں گے۔

مذہب نام اصول کا ہے نہ فروغ و فرائض کا۔ اہل مذہب تارک اعمال فریقین کو فاسق و فاجر اور منکر کو کافر کہتے ہیں اور اصول مذہب تمام مسلم فرقوں کے نزدیک تین ہیں۔ توحید و نبوت و قیامت۔ مگر شیعہ ان پر عدالت اور امامت کا اضافہ کرتے ہیں۔ اگر علاوہ شیعہ باقی حق پر ہیں تو بہتر ناجی ٹھہریں گے اور ایک شیعہ ناری یہ حدیث کے خلاف ہے۔ کیوں کہ وہ ایک کو ناجی اور باقی کو ناری بتاتی ہے۔ لہٰذا یہ نتیجہ صاف اور واضح ہے کہ فرقہ شیعہ ناجی اور باقی ناری ہیں۔ حدیث مذکور متفق علیہ بین الفریقین ہے۔

اے جہاں کے پناہ اور اے فیض رسان جان و دل اور اے بادشاہ دین و دنیا تم بلاشک وشبہ یقین کے فتوے کے ساتھ وصی و جانشین و خلیفہ رسول ہو۔ اور پھر کس طرح اپنا شیعہ ہونا جناب غالب ظاہر کریں کہ جس سے سنیت تو درکنار تفضیل کا بھی پہلو باقی نہ رہے۔

عربی کی مثل ہے مافی الاناء یترشح۔ جو برتن میں ہوتا ہے وہ ٹپک ہی پڑتا ہے۔ دیوان بھر میں کہیں ایک جگہ بھی مدح خلفاء ثلاثہ میں ایک شعر بھی نہیں کہا۔ پھر سنی یا تفضیلی سنی کیسے کہا جائے۔

جسم اطہر کو ترے دوش پیمبر منبر نام نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگین

فتح مکہ کے بعد جب رسول مقبول مکہ میں داخل ہوئے تو خانہ کعبہ میں جاکر حضرت علی کو اپنے کاندھے پر چڑھایا۔ اور جو بت اونچے پر رکھے تھے علی نے انھیں گرا کر توڑا۔ جب اللہ نے عرش کو پیدا کیا (وجعلنا العرش علی الماء) تو وہ متزلزل تھا۔ اس پر اسمار پنجتن قلم سے لکھے گئے تو وہ ٹھہرا۔ انھیں دونوں حدیثوں کی طرف اس شعر میں تلمیح ہے۔

تیرے جسم پاک کے لیئے خانہ کعبہ کے بت گرانے میں دوش نبوی منبر بنا۔ اور تیرے نام نامی کے لیئے پیشانی عرش نگینہ ہے۔ عرش پر تیرا نام لکھا ہوا ہے۔

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر واجب شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئین

ممکن۔ قدرت و طاقت۔ وضد واجب۔ واجب۔ واجب الوجود۔ اللہ تعالیٰ۔ آئین بستن۔ زینت دنیا۔ آئین باندھنا اسی کا ترجمہ بنا بر عادت کر ڈالا۔ اُردو میں آئین بمعنیٰ زینت کسی مصدر کے ساتھ مستعمل نہیں۔ دوسرا مصرع تمثیل ہے۔

جس طرح شمع کی زینت شعلۂ شمع پر منحصر ہے۔ اسی طرح مدح ذات خدا پر موقوف ہے۔ کوئی اور تیری مدح کیا کر سکتا ہے۔ کیوں کہ ذات ممدوح کو خدا سے وہ ربط ہے جو شمع کو شعلے سے ہوتا ہے۔ یعنی علی فنا فی اللہ ہیں۔

آستان پر ہے ترے جوہر آئینۂ سنگ رقم بندگیِ حضرتِ جبریل امین

سنگ مراد سنگ آستان۔ جبریل عبرانی لفظ ہے کہتے ہیں کہ جبر بمعنی بندہ اور ئیل یعنی خدا معنی ترکیبی بندۂ خدا۔ چار مقرب فرشتوں میں سے ایک۔ میکائیل۔ اسرافیل۔ عزرائیل باقی تین کا نام ہے۔ امین ان کی صفت اس لیئے ہے کہ بے کم وکاست وحی الٰہی کو رسول تک پہنچا دیتے تھے۔ مصراع ثانی میں چار اضافتیں متوالی ہیں ــــ

لفظ آستان آگیا۔ طالب علموں کے افادہ کے لیئے دروازہ کے کل اجزاء کے نام لکھتا ہوں :

| فارسی | عربی | اردو | انگریزی |
|---|---|---|---|
| تیر سرور | ساکف | اُترنگ | LINTEL |
| آستانہ | عتبۃ اُسکفۃ | چوکھٹ | THRESH-HOLD, SILL |
| بازو | عِضادہ | بازو | POST OR SIDE |
| تختہ در | مصراع صحیفہ۔ ورقہ | کواڑ۔ پٹ | VALVE, SHUTTER |
| قاب۔ چارچوب | اطار | چوکھٹا | FRAME |
| در | بَاب | دروازہ | DOOR, GATE |

تیرے سنگ در کے آئینہ پر جوہر وقت جبریل امین کے سجدے ہوتے ہیں۔ جبریل کے پیشانی رگڑنے سے سنگ آستان میں جوہر پیدا ہو گئے ہیں۔ یا۔ جبریل کی رقم بندگی کے اس پر جوہر ہیں۔ لفظ رقم بھرتی کا معلوم ہوتا ہے۔ شاید۔ اثر۔ کچھ اس سے اچھا ہو۔

تیرے در کے کئے اسباب نثار آمادہ　　　خاکیوں کو جو خدا نے دئے جان و دل و دین

آمادہ کردن فارسی کے محاورہ کا ترجمہ ہے اُردو میں آمادہ کرنے کے معنی تیار کرنے کے اور ترغیب دینے کے ہیں۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ ان کے کلام سے کوئی اُردو نہیں سیکھ سکتا۔ اُردو میں اس محل پر مہیا کرنا بولتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں۔ خاکی سے مراد انسان۔ کیوں کہ عنصر خاک ان کی ترکیب میں غالب ہے ؎

در عالی پہ نچھاور کو ملا ہے سامان

اللہ نے انسانوں کو جان و دل و دین اسی لئے دئے ہیں کہ در روضہ حضرت علی پر انھیں نثار کر دیں۔

تیری مدحت کے لئے ہیں دل و جان کام و زبان　　　تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبین

دل و جان اسی لئے ملے ہیں کہ تیری مدح میں دہن و زبان کا کام کریں یعنی دل و جان سے تیری مدح سرائی ہو۔ اور لوح محفوظ تجھے کورنش کرنے کو پیشانی اور قلم ہاتھ بنا ہے۔ ہندوستانی سلام اسی طرح ہوتا ہے کہ پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ قلم وہی قلم جس کی نسبت کہا گیا ہے۔ اول ما خلق اللہ القلم تسلیم بمعنی سلام اردو کا تصرف ہے۔ قلم کو ہاتھ سے اور لوح کو پیشانی سے استعارہ کیا ہے۔

کس سے ہوسکتی ہے مداحی ممدوح خدا　　کس سے ہوسکتی ہے آرایش فردوس بریں

ممدوح خدا ۔ حضرت علی ۔ فردوس کے حروف پیراڈائز PARADISE میں پائے جاتے ہیں ۔ فردوس بریں ۔ اعلیٰ علیین آٹھ بہشتوں میں سے ایک بہشت کا نام ۔
حضرت علی جن کا مداح خود اللہ ہے ان کی ثنا وستایش دوسرا کون کر سکتا ہے ۔ جیسے فردوس بریں کی زینت خدا کے سوا کون کر سکتا ہے ۔ اس طرف اشارہ ہے کہ مدح حضرت علی صلہ بہشت ہے ۔ قرآن شریف میں متعدد جگہوں پر حضرت علی کی شان میں آیتیں ہیں ۔ مثلاً شب ہجرت جب بستر نبوی پر حضرت علی سوئے من یشتری نفسا الخ اور جب سائل کو نماز میں انگوٹھی دی و اتون الزکوٰۃ وھم راکعون وغیرہ ۔

جنس بازار معاصی اسداللہ اسد　　کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

معاصی جمع معصیت ۔ زلت ۔ ترک طاعت ۔ عدم انقیاد ۔ اسداللہ ۔ نام غالب اور اسد بھی تخلص غالب ہے ۔ اور اسداللہ وشیر خدا القاب حضرت علی علیہ السلام بھی ہیں ۔ معاصی ایسا فعل کہ جس کی حرمت کا علم ہوا ور حرام جان کے کیا جائے ۔
اسداللہ اسد (غالب) بازار معاصی کی جنس ہے ۔ یا ۔ اے شیر خدا (حضرت علی) اسد (غالب) بازار معاصی کا ایسا سرمایہ ہے کہ تیرے سوا اس کا گاہک کوئی نہیں تو ہی شفیع ہو کر اسے معاف کرا سکتا ہے ۔

شوخی عرض مطالب میں ہے گستاخِ طلب　　ہے ترے حوصلہ فضل پہ از بسکہ یقین

فضل ۔ احتیاط ورسخاوت کہ کمی کا گمان بھی نہ رہے ۔
تیرے فضل وکرم کی عالی ہمتی پر چونکہ غالب کو یقین کامل ہے اس لیئے مطالب کے پیش کرنے میں جرأت سے کام لیتا ہے ۔ اور دلیری اور بے باکی سے ان کے پورا کرنے کا خواہاں ہے ؎
کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

دے دعا کو مری وہ مرتبہ حسن قبول　　کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین

حرف ۔ بات فارسی میں حرف زدن کے معنی بات کرنا ہیں ۔ حالاں کہ "بات" بھی نظم ہوتا ہے مگر "بات" نہ کہا کیونکہ فارسیت کا غلبہ ہے ۔ حرف لائے ۔

اے اللہ میری دعا کو وہ مرتبہ حسن قبول عطا کر کہ خود قبولیت ہر بات پر سو بار آمین کہے۔ جب اجابت آمین کہے گی تو اس کی قبولیت میں کیا شک رہے گا۔

آمین۔ اسم فعل بمعنی استجب ہے یا قبول ہو معنی ہیں۔

فائدہ دعا ایصال الی المطلوب کے لیئے نہیں ہوسکتی ہے۔ اطمینان و سکون قلب یا عبادت کے طور پر دعا مانگنے میں کوئی ہرج نہیں۔

فرض کرو ہم کو کوئی تمنا پیدا ہوئی۔ ضرور ہے کہ اس کے پورا ہونے یا نہ ہونے کا علم اللہ کو ہے۔ اگر پورا ہونے کا علم ہے تو وہ تمنا پوری ہو کے رہے گی ورنہ علم الٰہی میں جہل لازم آتا ہے۔ اس کے جواب میں ہم کو یوں بہلایا جاتا ہے کہ اس کا حاصل ہونا مانگنے پر منحصر تھا۔ تمنا ظاہر کرنا تو لا علم کے سامنے ہوتا ہے کیوں کہ بغیر کہے وہ ہماری آرزو کو نہیں جانتا ہے اللہ کو تو ہر بات کا علم ہے۔ اس کو بتانے کی کیا ضرورت۔

دوسرا جواب یہ دیتے ہیں کہ احکام الٰہی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو کسی طرح ٹالے نہیں ٹلتے اور وہ لوح محفوظ پر لکھے ہوتے ہیں۔ ان کا نام قضا رکھتے ہیں۔ دوسرے قدر جو کسی وجہ سے ٹل جاتے ہیں۔ اور یہ لوح محو و اثبات پر مرقوم ہوتے ہیں۔

اس تقسیم کی مہملیت ظاہر ہے کیوں کہ پہلے خیال سے ہٹنے کے معنی یہ ہیں کہ پہلا خیال غلط تھا جب تو ترمیم کی۔ یا رعایت مقصود ہے اور یہ خلاف عدل و انصاف ہوگا۔ اور جس کے ساتھ یہ رعایت نہ کی جائے اس پر ظلم ہوگا۔

میں ادعونی استجب لکم۔ اور امن یجیب المضطر اذا دعاہ فیکشف السوء سے توفیق پیدا کرنے میں عاجز ہوں سوا اس کے کہ اطمینان اور سکون قلب اور یاد الٰہی کی ترغیب و تشویق کے لیئے یہ باتیں ہوں۔ راسخون فی العلم توفیق پیدا کر سکتے ہیں مجھ ایسے سے ممکن نہیں۔

غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز　　　　کہ رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگین

شبیر و شبر۔ حضرت ہارون برادر حضرت موسٰی کے دو بیٹوں کے نام۔ اور امام حسین کو شبیر اور امام حسن کو شبر بھی کہتے ہیں۔ یہ کلمات عبرانی ہیں۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ سینہ کا غم سے بھر جانا فارسی کا محاورہ ہے اردو میں دل کا غم سے بھر جانا بولتے ہیں۔ (بجائے سینہ قلب وزن میں آسکتا ہے)۔

غم امام حسین میں میرا سینہ یا دل اس حد تک لبریز اور پُر رہے کہ خون جگر سے میری آنکھیں سرخ رہیں یعنی ان کے غم میں خون کے آنسو روتا رہوں ؎

پہلے دل جلتا ہے تب آنسو نکلتا ہے

طبع کو الفت دُلدُل میں یہ سرگرمی شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبین

اس سے قدم یہ بھی فارسی کا طرز ادا ہے۔ اس کے قدم موزوں بھی تھا مگر یہ نہ کہا۔ اور یہی حال مجھ سے جبین کا ہے "میری جبین"۔ دُلدُل ۔ حضرت علی کے خچر کا نام۔ روز عاشور جس گھوڑے پر امام حسینؑ سوار تھے اس کو بھی دلدل اور ذوالجناح کہتے ہیں۔ پہلے مصرع سے (ہے) اور دوسرے سے (ہو) محذوف ہے۔

میری طبیعت کو دلدل کی الفت میں اس قدر جوش اور افراط شوق ہے کہ جتنا راستہ وہ طے کرے اس کے قدم ہوں اور میری پیشانی ہو۔ یعنی میری آنکھوں اور پیشانی پر قدم رکھ کر چلے۔ یعنی میں اس کے راستہ میں آنکھیں اور پیشانی کو فرش کر دوں اور بچھا دوں۔

طبع کو الفت دلدل میں یہ ہو گرمی شوق
قدم اس کے پڑیں جس راہ میں میری ہو جبین

دل الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزین

یہ شعر اپنے لئے دعا میں ہے۔ صدق ۔ راستی۔

میرے دل کو الفت حضرت علی سے نسبت رہے۔ اور میرا سینہ میدان وسیع توحید کا ہو۔ اور میری نگاہ کے سامنے جلوۂ محبوب حقیقی رہے۔ اور جو سانس لوں یعنی جو بات کہوں وہ صداقت سے خالی نہ ہو۔

صرف اعدا اثر شعلہ و دود دوزخ
وقف احباب گل و سنبل فردوس برین

دوزخ کے دھوئیں اور شعلوں کے اثرات علی اور ان کی اولاد کے دشمنوں پر صرف رہیں یعنی ان کے دشمن دوزخ میں جلتے رہیں۔ اور جو ان کے دوست ہیں ان پر بہشت کے گل و سنبل وقف رہیں۔

اعدا کے مقابل احباب۔ شعلہ کے مناسب گل دود کے تقابل میں سنبل اور دوزخ کے مقابلہ میں فردوس لائے۔

---

نظم ۲۲۵
اشعار ۶۱

قصیدہ نمبر ۳ اشعار ۶۸

# قصیدہ در مدح بہادر شاہ آخرین بادشاہ دہلی تہنیت عید میں

اک دم ہلال عید سے مخاطبہ کرتے ہیں۔

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

ہاں اے ہلال ہمیں بھی تو اس کا نام بتا جس کو تو جھک جھک کے سلام کر رہا ہے۔

دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح یہی انداز اور یہی اندام

جب تیس کو رویت ہونے والی ہوتی ہے تو اٹھائیس اور انتیس کی صبح کو چاند بشکل ہلال دکھائی دیتا ہے۔ اور جب انتیس کو ہونے والا ہوتا ہے تو ستائیس اور اٹھائیس کی صبح بصورت ہلال دکھائی دیتا ہے۔ بارہ بروج میں سے ہر ایک کو ڈھائی دن میں طے کرتا ہے۔ جب آفتاب کے ساتھ کسی برج میں تحت الشعاع میں ہوتا ہے تو نور شمس سے استفادہ نہیں کرتا ہے اور ڈھائی دن دکھائی نہیں دیتا۔ ہندی حساب سے دو صبح کو نمودار ہوتا ہے۔ اندام۔ بدن۔ تن۔ جثہ۔

دو دن آخر ماہ میں اسی مقدار و اندازہ سے جیسے ہلال ہوتا ہے وقت صبح دکھائی دیتا ہے۔

بارے دو دن کہاں رہا غائب بندہ عاجز ہے گردش ایام

المختصر تو دو دن کہاں غائب رہا۔ بعد سوال آپ ہی جواب دیتے ہیں کہ تو کیا کرے۔ گردش زمانہ سے انسان مجبور ہے۔ خدا نے جو گردش اس کے لئے مقرر کر دی ہے اس سے وہ ایک تل برابر نہیں ہٹ سکتا ہے۔

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا آسمان نے بچھا رکھا تھا دام

ہلال کو مچھلی سے تشبیہ دیتے ہیں اور ایک قسم کی مچھلیاں ہوتی ہیں جو اڑتی بھی ہیں بانس ڈیڑھ بانس بلندی پر اور بیس تیس گز کے فاصلہ کو طے کر کے پھر سمندر میں غوطہ لگا جاتی ہیں۔ یا اُڑنے کے لفظ سے باستعارہ تخیلیہ پرندہ تجویز کر دیجیے بکتے ہیں۔ مرت نے اپنے پنجے گاڑ دئے۔ اور نیز آسمان پر ہونے کی وجہ سے تو بھی۔ اڑ کے جانا ٹھیک ہو سکتا ہے یا

بھاگ جانا بنالیا جائے۔

آسمان نے تاروں کا جال بچھا رکھا تھا تو پھر بھاگ کے کہاں جا سکتا تھا لہٰذا ڈھائی دن کے بعد پھر نظر آنے لگا۔

مرحبا اے سرور خاص خواص　　　حبذا اے نشاط عام عوام

خاص۔ مخصوص ضد عام۔ خواص۔ خاص لوگ۔ حبذا: اسم اشارہ ہے مرکب از حب و ذا۔ استحسان اور مدح کے لیے مستعمل ہے۔ عربی میں بہر حال (حبذہ) ہونا چاہیئے۔ مگر بولتے حبذا ہیں۔ معنی لفظی محبوب ہوا یہ عام جو کل کو شامل ہو ضد خاص۔ خواص۔ خاص لوگ۔ مرحبا کا ذکر آ چکا۔ یہ شعر اگلے شعر کے ساتھ قطعہ بند ہے۔

اے خاص لوگوں کے سرور اور عام لوگوں کے نشاط کے باعث تیرا کہنا ہے۔ عباد اور زہاد کو تو خوشی اس لئے ہوتی ہے کہ مہینہ بھر روزے رکھ کر حکم الٰہی بجالائے اور عام کو عید ہونے کی مسرت ہوتی ہے۔

عذر میں تین دن نہ آنے کے　　　لے کے آیا ہے عید کا پیغام

عید۔ عود سے مشتق ہے چوں کہ ہر سال پلٹ پلٹ کے آتی ہے۔

تین دن غائب رہنے کے عذر میں تو عید کا پیغام لے کے آیا ہے شاد باش۔ جناب نظم فرماتے ہیں غیبت ماہ اصل میں ڈھائی دن ہے۔ کسر کو چھوڑ کے پہلے دو دن اور اب کسر کو پورا کر کے تین دن کہے۔ یہ بات محاورات اور عادات میں جاری ہے۔

اس کو بھولا نہ چاہئے کہنا　　　صبح جو جاوے اور آئے شام

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس مثل کو کہ۔ صبح کا بھولا جو شام آئے اسے بھولا نہیں کہتے۔ کس لطف کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اور کس محل پر صرف کیا ہے۔ کیوں کہ ستائیس یا اٹھائیس کی صبح کو چھپ کر پھر انتیس یا تیس کی شام کو دکھائی دیتا ہے۔ شعر صاف ہے معنی لکھنے کی ضرورت نہیں۔

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا　　　تیرا آغاز اور ترا انجام

پہلے مصرع میں (کہ) بے ضرورت ہے ؎

ایک میں کیا سبھوں نے جان لیا

مگر یہ کہ کہیں کا اصراف یا تعلیل کا (بلکہ کیوں کہ) معنی میں ہے۔ بہر طور نہ ہونا اچھا ہے۔
میں ہی نہیں سب جانتے ہیں کہ تو ہلال سے بدر ہوتا ہے پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر چمک کے نکلتا ہے۔
یہ بات کوئی اچھی بات نہ ہوئی۔ ابتدا میں نکل کے جتنی قربت ممدوح سے حاصل کرتا جاتا ہے اتنا ہی کامل ہوتا جاتا ہے۔ اور جب آفتاب سے آخر میں قربت اختیار کرتا ہے تو رفتہ رفتہ ناقص ہوتے ہوتے فنا پذیر ہو جاتا ہے۔

راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے      مجھ کو سمجھا ہے کیا کوئی نمّام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں      ایک ہی ہے امید گاہ انام

کہیں سے (کوئی) بہتر ہے۔ نمام = چغلخور۔ ساعی (سعایت کا اسم فاعل نہ سعی کا) واشی انام۔ مخلوق اسم جمع ہے۔ اس کا واحد کوئی نہیں اور نہ کوئی اور صیغہ اس کا اس معنی سے ہے۔ آنام و انیم اس کے لغات ہیں۔ جمع (قاموس و منتخب) از غیاث۔

یہ دوسرا شعر تخلیص و گریز کا ہے۔
اپنا راز دل مجھ سے کیوں پوشیدہ رکھتا ہے۔ کیا تو نے مجھ کو چغلخور اور لگائی بجھائی کرنے والا سمجھ رکھا ہے۔ مگر تیرے چھپانے سے ہوتا کیا ہے۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ فی الحال دنیا میں امید گاہ مخلوق سوا ذات بہادر شاہ اور کوئی ہے ہی نہیں۔

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش      غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو      تب کہا ہے بطور استفہام

حلقہ بگوش غلام ایران و عرب میں غلام کے کان میں کڑی ڈالنا علامت غلامی ہے۔ غلام بندہ۔ بردہ۔ مستعمل عربی میں اطفال بے ریش۔ امرد۔ اس کی جمع غلمان ہے۔
میں مانتا ہوں کہ تو ظفر شاہ کا حلقہ بگوش غلام ہے۔ مگر کیا میں ان کا غلام نہیں ہوں ضرور ہوں۔ اور اس کا بھی مجھے علم ہے کہ تو بھی اس بات کو جانتا ہے تب بطور استفہام انکاری تجھ سے دریافت کیا ہے۔ (کیا نہیں ہوں غلام) یعنی غلام ہوں۔

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ ۔۔۔ قربِ ہر روزہ برسبیل دوام

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا ۔۔۔ جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

عیدِ ماہِ صیام ۔ صیام جمع صوم بمعنی روزہ ۔ امساک از مباشرت و امتناع از اکل و شرب در اوقات معلومہ۔ عیدالفطر، فطرہ کی عید ۔ میٹھی یا سویوں کی عید ۔ روشناسی ۔ مشہور و معروف مگر یہاں ۔ سامنے آنا ۔ دیدار کرنا ۔ ملاقات کرنا ۔ ملنا مراد ہے ۔ برسبیل ۔ بطور و طریق ۔ دوام ۔ ہمیشگی ۔

قرب ہر روزہ بطور دوام اگر آفتاب کو حاصل ہو تو ہو ۔ مگر تیرا یہ مرتبہ کہاں کہ تو روز اس سے مل سکے سوا تقریب عیدالفطر کے ۔

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو ۔۔۔ پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

مجھے روزانہ اس سے قربت حاصل ہے لہٰذا مجھے معلوم ہے اور میں تجھے بھی بتائے دیتا ہوں کہ تو عنقریب اس کے فیض سے بدر کامل ہوا چاہتا ہے ۔

ماہ بن ماہتاب بن ۔ میں کون ۔۔۔ مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

ماہ ۔ مترادف قمر ۔ چاند و کنایہ از محبوب ۔ ماہتاب ۔ چاند اور چاندنی ۔

محل چاہتا ہے کہ دو الفاظ متغایر المعنی ہوں ۔ چاندنی معنی کہیں تو معنی اچھے نہیں ۔ اس لئے اسم وام سے بن کر اسم فاعل ترکیبی بمعنی نور دہندہ ماہ اس لئے آفتاب تجویز کرتا ہوں ۔ اگر ناظرین پسند کریں بانٹ دینا تقسیم کرنا ۔

چاند یا سورج بن یا کچھ اور کچھ بن مجھے اس سے کیا مطلب ۔ کیا تجھے جو انعام ملے گا مجھے اس میں شریک کرے گا جب ایسا نہیں تو جو تیرا جی چاہے بنا کر ہمیں کیا ۔

جناب ناظم فرماتے ہیں کہ پہلے مصرع میں تین جملے ہیں ۔ جس کے مضمون سے رشک ٹپکتا ہے دوسرا مصرع طنز سے پُر ہے ۔ چاروں جملوں میں حسن انشا ۔ پھر خوبی نظم و بے تکلفی ادا ۔

میرا اپنا جدا معاملہ ہے ۔۔۔ اور کے لین دین سے کیا کام

میرے اور ممدوح کے درمیان معاملات ہی اور ہیں ۔ مجھے دوسروں کے لینے دینے سے کیا غرض ۔ تجھ پر رشک

اس بات کا نہیں ہے کہ تجھے انعام ملے گا اور میں محروم رہوں گا۔

ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص    گر تجھے ہے امید رحمت عام

بخشش خاص۔ بوجہ شعر آیندہ مراد شراب۔ رحمت عام۔ نور بخشنا۔ بدر کامل بننا جس سے ساری دنیا فیض یاب ہوتی ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ لفظ آرزو مقتضائے مقام سے کسی قدر ا ‍ ہے۔ آرزو میں اس کے پورے ہونے کا اعتقاد نہیں ہوتا ہے۔ اور امید وار کو اپنی امید پوری ہونے کا اعتقاد ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ ؎

ہے مجھے بھی امید بخشش خاص

مجھے بخشش خاص کی ممدوح سے آرزو امید ہے۔ جو خاص میرے لئے مفید ہے۔ اور تجھے رحم و کرم عام کی امید ہے کہ جس کا فائدہ عام ہو۔ (نور ملنا۔ بدر کامل ہونا اس کا فائدہ عام لوگوں کو پہنچتا ہے۔

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ    کیا نہ دے گا مجھے مے گلفام

فرّ۔ شان و شوکت و رفعت و شکوہ و نور۔ و زیبائی و برازندگی۔ فروغ۔ مبدل فروز۔ شعاع و روشنی و تابش۔ گلفام۔ سرخ رنگ۔

جو تجھ کو زیبائش نور عطا کرے گا کیا وہ مجھے شراب انگوری نہ دے گا۔ ضرور دے گا۔ یعنی تیری چاندنی میں شراب پینے کے لئے مجھے ممدوح سے ملے گی۔

جبکہ چودہ منازل فلکی    کر چکے قطع تیری تیز گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر    کوے و مشکوئے و صحن و منظر عام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز    اپنی صورت کا اک بلّورین جام

منازل قمر اٹھائیس ہیں ان کو سنسکرت میں نچھتر کہتے ہیں۔ چودہ منازل چودھویں تاریخ کی شب کو طے کر کے بدر ہو جاتا ہے۔ مشکوے۔ حرم سرائے شاہان۔ بت خانہ۔ خلوت خانہ شیریں۔ کوشک و بالاخانہ۔ صحن۔ حیات و فنا۔ آنگن۔ منظر۔ بالاخانہ۔ جھروکا۔ برآمدہ۔ بلور۔ ایک معدنی سپید چمک دار پتھر جو در نجف سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ بلورین

میں (ی + ن) نسبت کا ہے۔ جبکہ منسوب منسوب الیہ ذات ہونے سے ظرف زرین۔ اور جب ذات نہ ہو تو (ی) نسبت کے لئے لاتے ہیں لکھنوی دہلوی۔ مگر استعمال میں اس کی پابندی باقی نہیں رہتی ہے۔ ذال اور زا ر شاید اس کے بارے میں میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ پہلے جناب غالب اس کے قائل ہوئے کہ یہ حرف عربی کا نہیں ہے۔ انھوں نے ہر وہ لفظ فارسی کا جس میں ذال تھا (زے) سے لکھنا شروع۔ پھر حضرات شبلی و حالی بھی اسی کے متتبع ہوئے۔ اور اب گویا یہی املا ہو گیا۔ مرزا رضا قلی ہدایت شیرازی نے اپنے لغت فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں اگرچہ ذال اور زے کے ہونے کی بابت دو شخصوں کے بتائے ہوئے قاعدہ کو لکھا اور باب گاف مع الذال قائم کر کے گذاشتن وغیرہ الفاظ بھی لکھے مگر قائل اسی کے ہیں کہ ذال فارسی کا حرف نہیں میں نے انوری کی رباعی اور قاآنی کے ایک مسمط کے اشعار لکھ کر بتایا کہ یہ فارسی میں وجود ذال کو ملنتے ہیں۔ بلکہ بنا بر قاعدہ ہر دال لفظ فارسی کا جو بعد حروف مدہ ہو جیسے کشاد۔ نمود وغیرہ اس میں بھی ذال معجمہ کہتے ہیں۔ اور پرانی قلمی کتابوں میں ذال کے حروف مدہ کے بعد آنے کے علاوہ تقریباً دال مہملہ پر بھی نقطہ لگا ہوا ملتا ہے۔ اس کے لئے درّۃ التحبا (مطبوعہ لاہور دیکھو۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ زردشتی فارسی کے الفاظ میں ذال معجمہ ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ اصل فارسی کا حرف نہیں مگر الفاظ فارسیہ میں ایرانیوں نے لے ضرور لیا۔ اس لئے میں گزارش و پذیرو وغیرہ کو ذال ہی سے لکھتا ہوں۔

اے ماہ جب تو چودہ منزلیں طے کر کے بدر کامل ہو جائے۔ اور تیرے نور سے گلی۔ حرم سرا۔ آنگن اور بالا خانہ منور ہو جائے تو اپنی صورت کا سپید اور چمکتا ہوا جام بلور میرے ہاتھ میں شراب سے لبریز دیکھ لینا۔

بدر سے استعارہ پیالہ پر از مے سے اور جام خالی کو ہلال سے تشبیہ دیتے ہیں۔

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا     توسن طبع چاہتا تھا لگام

چل ہو یا (جا) ہو اس میں چنداں تفاوت نہیں۔ مگر (چاہتا) کی جگہ (چابتا) ہونا چاہئے۔ جو لگام خائیدن کا ترجمہ ہو گا جس کے معنی نافرمانی و سرکشی کردن اسپ کے ہیں۔ توسن = سرکش گھوڑا۔ لگام چائیدن اور اس کا ترجمہ اُردو میں مستعمل نہیں۔ فارسی شعرا بھی قصیدہ میں غزل بھی ملا دیتے ہیں۔ غالب نے بھی انہیں کا تتبع کیا ہے۔ اور یہ شعر قصیدہ سے غزل کی طرف رجوع کیا ہے۔ طبیعت کا سرکش گھوڑا سرکشی کر رہا تھا آخر کار غزل کے راستہ پر لے نکلا۔ (چل نکلا۔ یا نکلا۔)۔

## مطلع غزل

زہر غم کر چکا تھا میرا کام     تجھ سے کس نے کہا کہ ہو بدنام

زہر غم عشق تو میرا کام تمام کر چکا تھا پھر تو نے مجھے قتل کر کے مفت میں اپنے سر بدنامی لی۔

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں    غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

شراب بھی حرام اور غم عشق سے زندگی بھی حرام ہو رہی ہے۔ پھر شراب ہی کیوں نہ پیے جاؤں کہ وہ غم غلط کرتی ہے غم عشق زندگی کے لئے وبال ہے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ نہایت لطیف مضمون ہے۔

بوسہ کیسا۔ یہی غنیمت ہے    کہ نہ سمجھیں وہ لذت دشنام

دشنام۔ دشت بمعنی زشت سنسکرت میں ڈشٹ بھی یہی معنی رکھتا ہے۔
اس کی گالیوں میں جو مزہ مجھے ملتا ہے خدا کرے کہ اس بات کو وہ نہ سمجھے ورنہ بوسہ دینا کیسا گالیاں بھی دینا چھوڑ دے گا۔

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس    اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

کعبہ بھی کبھی بت خانہ تھا اور دیر تو بت خانہ ہے ہی پھر کعبہ میں ناقوس بجایا تو کیا اور دیر میں احرام باندھا تو کیا ہر جگہ اسی کی ہے۔ بہر صورت رجوع الی المحبوب ہے اور کفر عشق سے کسی حالت میں خالی نہیں۔ عشاق ہر چیز میں اسی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ شاد آں ؎

چہ کفر و چہ اسلام ہر دو یک نیست    دوئی را بعشاق تو راہ نیست

کوئی رنگ ہو عشق سے خالی ہمارا فعل نہیں ہے۔
ناقوس ۔ لوہے یا لکڑی کا نرسنگھا جسے اوقات عبادت میں استعمال کرتے اور بجاتے ہیں۔ اور بمعنی جرس بھی مستعمل ہے۔ BELL و GONG اردو میں سنکھ بھی ترجمہ کرتے ہیں۔

اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد    چرخ نے لی ہے جس سے گردش دام

دام ۔ نسیہ ضد نقد۔ ادھار۔ کہتے ہیں کہ گردش فلکی تلاش مبدء میں ہے۔
مجھے اس جام معرفت کا دور فی الحال حاصل ہے جس کی گردش سے فلک نے گردش قرض لی ہے اور اس کی تلاش میں گھومتا رہتا ہے۔ حکما کا خیال ہے کہ حرکت فلکی تلاش مبدء میں ہے۔

بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار　　دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

ابرام - اصرار۔ضد۔ہٹ۔

پہلے دل کے لینے میں جن کو (معشوق) اصرار تھا۔اب وہی دل لینے کے بعد بوسہ دینے میں انکار کرتے ہیں۔ سخت تعجب ہے۔

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصّہ آئے　　کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

غصّہ - عربی میں اس کے معنی اندوہ گلو گیر کے ہیں۔غضب اور غیظ کے معنی بتصرف اُردو زبان میں ہیں۔
وہ اپنے سوا اور کسی کو غالب سمجھتے نہیں میں نے اسی لئے اپنا غالب نام رکھ چھوڑا ہے تاکہ ان کو غصّہ آئے۔ اور مجھ پر جفا کے لئے آمادہ ہوں وفا کی تو ان سے امید نہیں۔ظلم ہی کریں۔اسی طرح سے توجہ تو معلوم ہو بے تعلقی تو نہ دکھائی دے۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ　　اے پری چہرہ پیک تیز گام

پری چہرہ حسین۔پیک قاصد سرعت رفتار پیک کے لئے خوبی اور ہنر سمجھتے ہیں۔سیاروں میں ماہ سب سے زیادہ تیز رفتار ہے۔یہ ایک مہینہ میں بارہ بروج طے کرلیتا ہے۔کوئی چھتیس سال میں اس دورہ کو ختم کرتا ہے۔سریع السیر یہاں سے پھر غزل کو ختم کر کے چاند سے مخاطبہ شروع کرتے ہیں۔
مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے وہ سب کہہ ڈالا۔اے خوبرو قاصد تیز رفتار یعنی اے ماہ۔

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا　　ہیں مہ و مہر و زہرہ بہرام

ناصیہ سا - پیشانی رگڑنے والا۔سجدہ کرنے والا۔ زہرہ - جس کے طالع میں یہ سیارہ ہو اسے عیش و نشاط کی طرف رغبت زیادہ ہوتی ہے۔ بہرام - جلادِ فلک اس کو شجاعت سے منسوب کرتے ہیں۔زحل کے بعد اسے نحس اصغر جس طرح زہرہ کو بعد مشتری سعد اصغر کہتے ہیں۔

| اسمار سیارگان در فارسی | در عربی | در سنسکرت | در انگلیسی |
|---|---|---|---|
| کیوان | زُحَل | سنیچر | SATURN |
| زاوُش۔ ہُرمُز | مشتری۔ برجیس | برہسپت | JUPITER |
| بہرام | مریخ | منگل | MARS |
| مہر۔ آفتاب۔ ہور | شمس | سورج | SUN |
| تیر | عطارد | بدھ | MERCURY |
| پری دخت۔ بیدخت۔ زاور | زہرہ۔ ناہید | شکر | VENUS |
| ماہ | قمر | چندرمان | MOON |
| سراژدہا | راس | راہو | HEA OF DRAGON |
| دُم اژدہا | ذَنَب | کیت | TAIL OF DRAGON |
| نپطون | | | NEPTUNE |
| اورانوس | | | URANUS |

جس کے دروازہ پر چاند۔ سورج زہرہ اور بہرام سرٹیکی کرتے رہتے ہیں وہ کون ہے۔

تونہیں جانتا تو مجھ سے سُن — نام شاہنشہ بلند مقام

قبلہ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذوالجلال والاکرام

مقام بفتح میم منزلت و بضم جائے اقامت۔ قبلہ چشم۔ کیوں کہ چشم امید انھیں کی طرف لگی رہتی ہے۔ اور قبلہ دل اس لئے کہ رجوع قلب ان کی طرف رہتی ہے۔ ذوالجلال والاکرام۔ صاحب جلالت و شرف مراد اللہ۔ یہاں سے پھر رجوع مدح کی طرف کرتے ہیں۔

اے ماہ اگر تجھے اس عالی منزلت کا نام نامی نہیں معلوم ہے تو مجھ سے سُن۔ وہ امید گاہ چشم و دل ہے اور اس کا نام بہادر شاہ ہے اور اس کی ذات مظہر ذات الٰہی ہے۔

شہسوار طریقۂ انصاف — نوبہار حدیقۂ اسلام

طریقہ - سیرۃ - حالت - مذہب - راہ - حدیقہ - وہ باغ جس کے گرد چار دیواری ہو -

انصاف اور اسلام میں جو وزن ہے اسی وزن کا نام صنعت مرجز ہے - غالب و حالی نے مرجز میں وزن شعر بے قافیہ مانا اور جناب حالی نے اس کی تعبیر بلینک ورس سے کی یہ صحیح نہیں - یہ صنعت نظم و نثر دونوں میں ہوتی ہے - شہسوار - نوبہار - طریقہ - حدیقہ میں صنعت ترصیع ہے - ؎

طریق انصاف کے شہسوار ہیں اور باغ اسلام کے نوبہار ہیں

## جس کا ہر فعل صورت اعجاز جس کا ہر قول معنی الہام

الہام - القا ر روح میں بطریق فیض اور یہ خواص ولایہ میں سے ہے - جو لوگ قسم وحی سے قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب اس کا وقوع نفس میں عمل خیر سے ہو تو الہام ہے اور شر سے ہو تو وسواس ہے - بعض محققین کا قول ہے جب القا ر نفس میں بدون واسطہ فرشتہ ہو تو الہام ہے - فیضان اور بواسطہ فرشتہ ہو تو وحی ہے - اعجاز - خرق عادت کہ جس کے کرنے سے اس وقت کے لوگ عاجز ہوں -

ہر فعل ان کا صورت اعجاز رکھتا ہے - اور ہر قول ان کا الہام کا مرتبہ رکھتا ہے -

## بزم میں میزبان قیصر و جم رزم میں استاد رستم و سام

میزبان - محافظ میز - اس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ میز پر کھانا کھانے کا دستور پرانا ہے - اگر میز کے معنی TABLE کے ہوں - مقابل مہمان - قیصر - لقب بادشاہ روم - اب شاہ جرمن کا لقب تھا - CAESAR - اصل میں جولین خاندان کے (سی جولیس سیزر کا) لقب تھا - اس کے بعد اس کے جانشینوں کا بھی یہ خطاب رہا - جم - جمشید اور حضرت سلیمان - استاد - اُستا زر دشتیوں کی مذہبی کتاب اور (اد) نسبت سے مرکب ہے - جیسے آباد لفظی اُستا سے منسوب یعنی عالم استا - پھر بمعنی مطلق معلم - رستم - مرکب از رُست بمعنی زمین - اور تہم بمعنی پہلوان یعنی پہلوان زمین رستم کا خاندان سیستان کا رئیس تھا - سام - رستم کے دادا کا نام -

بربنا ر تواضع مہمان مکرم ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے اکرموا الضیف ولو کان کافرا مگر میزبان بھی مکرم ہی ہے -

محفل عیش میں قیصر روم اور جمشید ایسے عالی مرتبت بادشاہ کے تم میزبان ہوتے ہو - اور جنگ میں رستم و سام کا مرتبہ رکھتے ہو -

اے ترا لطف زندگی افزا　　　اے ترا عہد فرخی فرجام

فرخ ۔ مبارک ۔ خجستہ ۔ یمون ۔ مرکب از فر بمعنی زیبا ورخ بمعنی رو معنی ترکیبی زیبارو فرجام انجام ۔ انتہا ۔
اے ممدوح تیرا لطف زندگی بڑھانے والا ہے ۔ اور تیرا زمانہ سلطنت مبارک انجام ہے ۔

چشم بد دور خسروانہ شکوہ　　　لوحش اللہ عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم　　　جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام

لوحش اللہ ۔ ایرانی بجائے کلمہ تعظیم وتحسین واستعجاب استعمال کرتے ہیں ۔ مرشد جام ۔ شاید مولوی عبدالرحمٰن جامی مراد ہیں ۔ جام سیستان میں ایک شہر ۔ جام بمعنی پیالہ کی مناسبت سے جرعہ خوار لائے شکوہ بمعنی نہایت وشوکت وشان وبزرگی وعظمت وحشمت جرعہ خوار ۔ گھونٹ گھونٹ پینے والا ۔ مراد مے خوار ۔ لوحش اللہ دراصل لاوحشہ اللہ تعالیٰ تھا بمعنی ماشاء اللہ فارسی ہے عربی نہیں ہے ۔
تیری شاہانہ شان وشوکت سے نظر بد دور ہے ۔ اور تیرے خداشناسوں کے ایسے کلام کا کیا کہنا ہے ۔ قیصر روم تیرے فدائیوں میں ہے ۔ اور مرشد جام تیرے مے خواروں میں ہے ۔

وارث ملک جانتے ہیں تجھے　　　ایرج و تور و خسرو و بہرام

ایرج و تور و سلم فریدون کے تین بیٹوں کے نام ۔ خسرو پرویز و بہرام گور سب ملک ایران کے بادشاہ تھے ۔
ایرج و تور و خسرو و بہرام سب کے سب حقیقتہً تجھے وارث سلطنت جانتے ہیں ۔

زور بازو میں جانتے ہیں تجھے　　　گیو و گودرز و بیژن و رہام

گیو پسر گودرز بن قارن ۔ بیژن ۔ پسر گیو و خواہرزادہ رستم رہام بضم اول و بلاتشدید و مستعمل باتشدید ہم ۔ نام پسر گودرز ۔ یہ چاروں نسل کاوہ آہنگر سے تھے ۔
گیو و گودرز و بیژن و رہام تجھے زور بازو میں سب سمجھتے ہیں ۔

مرحبا موشگافی ناوک　　　آفریں آبداری دارئ صمصام

تیر کو تیرے تیر غیر ہدف  تیغ کو تیری تیغ خصم نیام

مرحبا کی تشریح لکھ چکا ہوں بمعنی آفرین و تحسین مستعمل ہے۔ غیر سے مراد دشمن۔ خصم خصومت اور دشمنی رکھنے والا۔ مراد دشمن۔ صمصام۔ وہ تلوار جو مڑے نہیں۔

تیرے تیر کی موشگافی کا کیا کہنا ہے کہ وہ بال کی کھال کھینچتا ہے۔ اور دشمن کے تیر کو نشانہ بنا دیتا ہے۔ جو تیر انداز ایسا قادر انداز ہو کہ مخالف کے تیر کو اپنے تیر سے اُڑا دے وہ بڑا کامل الفن سمجھا جاتا ہے۔ اور تیری تلوار ایسی دھار دار ہے کہ دشمن کی تلوار کو مجوف کرتے اس میں نیام کی طرح داخل ہو جاتی ہے۔ غلو ناپسندیدہ ہے۔

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند  برق کو دے رہا ہے کیا الزام

ترے فیل گران جد کی صدا  تیرے رخش سبک عنان کا خرام

تیرے فیل عظیم الجثہ کی چنگھاڑ نے رعد (گرج) کا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ اور تیرے اسپ سبک عنان کی چال بجلی کو الزام دے رہی ہے۔ یعنی تیرا گھوڑا بجلی سے زیادہ تیز رفتار ہے۔

فیل معرب پیل اس کے لئے عربی میں کوئی لفظ نہیں معلوم ہوتا۔ جَسَد۔ جسم۔ تن۔ رخش ہر گھوڑا۔ اور رستم کے گھوڑے کا نام۔ سبک عنان وہ گھوڑا جو سوار کی باگھ کے اشارہ پر چلے۔

فن صورت گری میں تیرا گرز  گر نہ رکھتا ہو دست گاہ تمام

اُس کے مضروب کے سر و تن سے  کیوں نمایاں ہو صورت ادغام

دستگاہ = قدرت۔ ادغام = قریب المخرج دو حرف متجانس کو ایک کر کے مشدد کر دینا جیسے فرخ کا اصل میں فراور رخ تھا۔ یا اردو میں بدتر کو بتر کر لیا ہے۔ اگر ادغام کوئی اصطلاح تصویر کی ہوتی تو خوبی میں اضافہ ہو جاتا۔ ضرب گرز کی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ سر دھنس کے سینہ میں چلا جائے۔ مضروب = ضرب زدہ۔ چوٹ کھایا ہوا۔

اس کا گرز مصوری میں کمال قدرت رکھتا ہے۔ جبھی تو اس کی ضرب سے سر دشمن سینہ میں دھنس کر ادغام پیدا کر دیتا ہے تو وہ گرز ادغام کی صورت نمایاں کر دیتا ہے اور اس کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ حالاں کہ معنی مصدری کا وجود فی الخارج نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی چیز میں ہو کر پایا جاتا ہے۔

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے صفحہائے لیالی و ایام

اور اُن اوراق میں بکلک قضا مجملاً مندرج ہوئے احکام

ازل ۔ وہ زمانہ جس کی ابتدا نہ ہو ضد ابد ۔ لیالی ۔ جمع لیل بمعنی شب ایام جمع یوم بمعنی روز ۔ کلک ۔ قلم نے ۔ قضا ۔ وہ حکم الٰہی جو کسی طرح نہ ٹلے ۔ مجملاً ۔ ضد مفصلاً ۔ مندرج ۔ اندراج سے صیغہ مفعول نوشتہ ۔ لکھا ہوا ۔

روز و شب کے صفحات پر جب زمانہ ازل میں قلم قضا سے اوراق لکھے گئے اور اجمالاً اس پر احکام الٰہی لکھے گئے جن کا اجرا ابد تک ہوتا رہے گا ۔

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

معشوقوں کے لیئے لکھا گیا کہ یہ عاشقوں کو قتل کیا کریں ۔ اور عاشقوں کے لیئے لکھا گیا کہ یہ ہمیشہ اپنے مقصد کے دشمن رہیں ۔

دشمن کام ۔ بلا اضافہ وہ شخص جو اپنے دشمن کے مراد کے موافق ہو اور خود تباہ و برباد رہے ۔ اور مع اضافہ وہ شخص جس کے مقاصد و مطالب دشمن رہیں ۔ یعنی اس کے مطالب پورے نہ ہوتے ہوں ۔

آسمان کو کہا گیا کہ کہیں گنبد تیز گرد نیلی فام

حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں خال کو دانہ اور زلف کو دام

گنبد ۔ ہر عمارت مدوّر ۔ خال ۔ تل تشبیہ بہ دانہ اور مشبہ بہ زلف دام (جال) جس میں عاشقوں کے دل پھنسے رہتے ہیں ۔ حکم ناطق ۔ جو کسی طرح نہ ٹلے ۔ فام ۔ رنگ ۔

آسمان کی نسبت کہا گیا کہ استعارۃً آسمان کو سریع الحرکت نیلے رنگ کا گنبد کہیں ۔ اور حکم ناطق لکھا گیا کہ شعرا تشبیہاً تل کو دانہ اور زلف کو جال لکھا کریں ۔

آتش و باد و آب و خاک نے لی وضع سوز و رم و نم و آرام

آگ نے وضع سوزش کی اور ہوا نے چلنے کی اور پانی نے تری کی اور خاک نے سکون کی اختیار کی۔

مہر رخشاں کا نام خسرو روز　　ماہ تاباں کا اسم شحنۂ شام

شحنہ = عسس۔ کوتوال۔ کوتوال کا کام حفاظت کے لیئے رات کو پھرنا ہے اور چاند بھی رات بھر گردش کرتا ہے۔
آفتاب منور کا نام بادشاہ روز رکھا گیا اور ماہ روشن کا نام کوتوال شب ہوا۔

تیری توقیع سلطنت کو بھی　　دی بدستور صورت ارقام

توقیع = دستخط شاہ۔ وفرمان شاہ جو مشعر قہر ہو۔ اور منشور شعر مہر۔ دستور = قانون وقاعدہ۔ وبمعنی وزیر کیوں کہ دربار شاہی میں مسند بیٹھنے کو ملتی تھی۔ ارقام = جمع رقم بمعنی تحریر۔ ارقام مصدر از باب افعال کی نسبت جناب نظم فرماتے ہیں کہ رقم سے ارقام اس معنی میں نہیں آتا ہے بلکہ ترقیم آتا ہے۔
ان سب کے لیئے جو کچھ تجویز ہوا وہ تو ہوا۔ مگر تیرے فرمان سلطنت کے لیئے اسی دستور کے موافق تحریریں ملیں۔

کاتب حکم نے بموجب حکم　　اس رقم کو دیا طراز دوام

اس حکم الٰہی کے کاتب منشی تقدیر نے بموجب حکم اس تحریر پر جو ممدوح کے لیئے لکھی گئی اس پر نقش و نگار ہمیشگی کا لگا دیا۔

ہے ازل سے روائی آغاز　　ہو ابد تک رسائی انجام

یہ تحریر جو ممدوح کے لیئے ازل میں جس کا اجرا ابتداءً ہوا اس کا اختتام ابد پر ہو یہ شعر دعائیہ ہے۔
جناب نظم نے یہ قصیدہ خصوصاً اس کی تشبیب کو مصنف کا کارنامہ کہا ہے۔ اور ان کے کمال پر دال ہے۔ اردو شاعری میں جب سے قصیدہ گوئی شروع ہوئی ایسی تشبیب کم تر کہی گئی ہوگی۔

---

# قصیدہ دوسرا مدح بہادر شاہ میں

قصیدہ ۴ اشعار ۴۲ مع غزل

صبحدم دروازۂ خاور کھُلا مہر عالم تاب کا منظر کھُلا

نقلم ۲۳۶
اشعار ۴۲

خاور ۔ مشرق۔ باختر۔ مغرب ۔ برین ۔ شمال۔ فرودین ۔ جنوب ۔ بالا ۔ فوق ۔ زیر ۔ تحت ۔ منظر ۔ بالاخانہ ۔ برآمدہ ۔ جھروکا ۔

صبح کے وقت دروازہ مشرق کھلا اور آفتاب عالم تاب کا منظر (مطلع افق مشرقی) کھل گیا اور خورشید نکل آیا ۔

خسرو انجم کے آیا صرف میں شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا

خسرو انجم ۔ کنایہ از آفتاب ۔ گنجینۂ گوہر ۔ کنایہ از ستارگان ۔ یا ۔ آسمان پر از نجوم (کو اتنا ضروری نہیں جتنا کہ جی سے شب جو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا ۔

رات کو جو ستاروں کے موتیوں کا خزانہ کھُلا تھا وہ آفتاب کے صرفہ میں آگیا یعنی آفتاب کے نکلنے سے ستارے غروب ہو گئے ۔

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا

سیمیا ۔ وہ علم جس کے ذریعہ سے چیز ہائے موہوم کو دکھا دیتے کہ جن کا حقیقتہً وجود نہ ہو ۔ ممکن ہے کہ میسمیرزم یہی ہو ۔ کیمیا کی طرح ہو سکتا ہے کہ مصری زبان کا لفظ ہو ۔ کیمیا کے معنی پوشیدہ کے ہیں اس کے جاننے والے اسے چھپاتے تھے اور اب بھی چھپاتے ہیں ۔ بوعلی سینا کہتے ہیں کہ قلب ماہیت ناممکن ہے ۔ قلب صفات ہو سکتا ہے ۔ رنگ و وزن سونے کا کسی ادنیٰ دھات میں پیدا کر سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ سونے کے دام بل جائیں ۔ مگر اس مصنوعی سونے میں اثر اصلی سونے کا نہیں ہو سکتا ۔ اور مصنوعی کا اگر ایسا کشتہ کیا جائے کہ بیک جو اور اسے ماءالحیات دے کے زندہ کیا جائے تو جس دھات سے بنا ہے زندہ ہو کر وہی دھات ہو جائے گا کہ جس سے بنایا گیا ہے ۔ ریمیا ۔ اس علم کے ذریعہ سے دور سے دور فاصلہ

پر ایک دم میں پہنچ سکتے ہیں۔ ہیمیا = علم طلسمات۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ریمیا و سیمیا و کیمیا  کس نداند جز بذات اولیا

صبح جب ہوئی تو چاند ستارے سب غائب ہو گئے اس سے معلوم ہوا کہ ان کا وجود موہومی تھا۔ اور اک نمود بے بود تھے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ  دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھُلا

بازیگر = تماشا کرنے والا۔ آج کل نوٹلی کہتے ہیں۔

ستارے دور ہیں قریب اور بڑے ہیں چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ متحرک ہیں مگر ساکن دکھائی دیتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بڑے فاصلہ پر ہیں مگر قریب قریب دکھائی دیتے ہیں۔ خود منور نہیں مگر منور نظر میں آتے ہیں۔ اسی طرح بازیگر بھی کچھ کا کچھ دکھاتے ہیں۔ کھُلم کھُلا دھوکا دیتے ہیں۔

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو  موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا

موتیوں کا زیور = کنایہ از ستارگان کھلا پڑا تھا۔ بکھرا پڑا ہے۔ یہ شعر کچھ اور کہلوانا چاہتا ہے۔
رات کو سطحِ آسمان پر ستاروں کا زیور مروارید کی کھلا پڑا تھا۔

صبح آیا جانبِ مشرق نظر  اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھُلا

نگارِ آتشیں رخ = کنایہ از آفتاب۔
صبح کو مشرق کی طرف ایک معشوق سرخ رخسار سر کھلا دکھائی دیا۔

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر  بادۂ گلرنگ کا ساغر کھُلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے  رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھُلا

ردِ سحر = جادو کا توڑ۔ نظر بندی = بازی گر جو کچھ کا کچھ دکھاتے ہیں اس کو نظر بندی کہتے ہیں۔ صبوحی = شراب صبح گاہی۔
صبح کے وقت جو ہم کو آفتاب دکھائی دیا تھا تو یہ نظر بندی تھی جب ردِ سحر کیا تو معلوم ہوا کہ آفتاب تو نہیں ہے

بلکہ شراب انگوری کا ساغر دکھائی دیا کہ جسے ساقی نے شراب صبح گاہی کے لئے ایک سونے کے جام میں سامنے لاکر رکھ دیا ہے۔
یہاں سے مدح بزم شاہ کی طرف گریز ہے۔

بزم سلطانی ہوئی آراستہ　　کعبۂ امن و امان کا در کھلا

کعبہ سے بزم کو تشبیہ دی ہے اور کعبہ کی نسبت قرآن کہتا ہے من دخلہ کان آمنا۔
محفل شاہی کیا آراستہ ہوئی گویا کعبہ امن و امان کا دروازہ کھل گیا۔

تاج زریں مہر تاباں سے سوا　　خسرو آفاق کے منھ پر کھلا

منھ کی جگہ سر بھی پڑھ سکتے ہیں۔ کھلنا = زیب دینا۔ سجنا۔ پھبنا۔
مونیکا تاج بہادر شاہ کے سر پر آفتاب سے بھی زیادہ زیبا معلوم ہوا۔

شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے　　راز ہستی اس پہ سر تا سر کھلا

(کہ) کی جگہ (جو) بھی ہو سکتا ہے۔
بادشاہ روشن ضمیر جن کو بہادر شاہ کہتے ہیں ان پر ستر موجودات بالکل واضح اور عیاں ہے۔

وہ کہ جس کی صورت تکوین میں　　مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

صورت تکوین = صورت ہستی و وجود۔ باوجود ترکیب فارسی لفظ تکوین میں اعلان نون ہے۔ جو مسلمات کے خلاف ہے۔ عربی میں اخفاء نون ہوتا ہی نہیں۔

بہادر شاہ کی وہ ذات ہے کہ جن کی صورت ہستی سے نو آسمان اور سات سیاروں کے پیدا کرنے کا مقصد واضح ہوا یعنی یہ سب تمہارے لئے پیدا کئے گئے۔

جناب رسالت مآب کے حق میں کہتے ہیں لولاک لما خلقت الافلاک اور خلقتک لاجلی و خلقت الکل لاجلک۔ جناب مصنف نے ان کی خصوصیات کو بہادر شاہ کے سر لگا دیا۔ اور شاعری میں یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ خدا تک بنا دیتے ہیں۔

وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے　　عقدہ احکام پیغمبر کھلا

تاویل ۔ ترجیح کسی محتمل کی بدون قطع۔ لفظ مجمل کا بیان دلیل ظنی کے ساتھ۔ اس کا استعمال زیادہ تر معانی اور جملوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ خصوصاً کتب الٰہیہ ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ تعبیر صحیح کو تاویل اور غیر صحیح کو تسویل کہتے ہیں۔ عقدہ۔ گرہ ۔گتھی ۔ مراد دشواری و اشکال ۔ ناخن سے گرہ کھولی جاتی ہے۔

وہ ایسے عالم متبحر ہیں کہ انھیں کی تاویل سے احکام نبوی کے اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔

اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا  پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے  واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

سرہنگ ۔ سردار لشکر و پیش رو سپاہ۔ کیوں کہ ہنگ بمعنی سپاہ بھی ہے۔

آج کل بعض مناصب فوجی کو لبصیرۃ الطلاب لکھتا ہوں۔

قشون و لشکر (رجمنٹ) فوج سواران ۔ فوج ۔ پیدل (انفینٹری) ۔ سرتیب برگیڈیر ۔ سرہنگ (کرنیل) (نظام ملیٹری) سرباز سپاہی ۔ سردار کل ۔ سپہ سالا کمینڈران ۔ چیف ۔ وکیل باشی ۔ سارجنٹ میجر ۔ اجودان ۔ معین ۔ ایڈجوٹنٹ) اجیٹن ۔ اجودان باشی (ایڈجوٹنٹ جنرل) امیر پنج (جرنیل) یاور (میجر) وکیل ۔ (سارجنٹ) فرماندہ ۔ امیر لنظام ۔ سرکردہ صاحب منصب ارشد (کمینڈر)

داراب و دارائے اکبر ۔ داریوس شہنشاہ ایران مقابل اسکندر ۔ روشناس ۔ شناسا و ملاقاتی اہل لغت مشہور و معروف و آشنائے ہمہ کس معنی لکھتے ہیں۔ چہرہ ۔ اردو میں ایک اصطلاح فوجی ہے شاید اس میں سپاہی کا حلیہ لکھا ہوتا تھا۔

اس کے فوجی عہدہ داروں کا جب مسٹر رول (رجسٹر) کھولا جاتا ہے۔ تو سب سے پہلے رجسٹر میں دارا کا نام نکلتا ہے۔ اور جب اس کے روشناسوں کی فہرست کھولی جاتی ہے تو وہاں قیصر کا نام نمایاں طور سے لکھا ملتا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں۔ کہ شعرا کی طبیعت میں تناسب کا ہونا ایک فطری امر ہے۔ اس لحاظ سے پہلے شعر کا مصرع ثانی یوں ہوتا تو اچھا تھا تاکہ دارا اور اسکندر کا مقابلہ پایا جاتا ؎

واں لکھا ہے نام اسکندر کھلا

اور اگر قیصر قافیہ میں لانا ضروری تھا۔ تو دارا کی جگہ خاقان لاتے۔ دارا اور اسکندر ۔ دونوں علم ہیں۔ اور خاقان و قیصر دونوں لقب ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ تناسب کی خوبی بڑھ جاتی جبکہ اس تناسب کو آسانی سے لا بھی سکتے تھے۔ نہ لائے تو وہ خوبی

جاتی رہی۔ معناً کوئی خرابی نہ ہوئی۔

یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس محل پر کھلا کھلا بتکرار کہنا ضروری ہوتا ہے۔

توسن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب      تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھُلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب      تو کہے بت خانہ آزر کھُلا

صرصر۔ آندھی کا نام بوجہ حکایت الصوت ہے۔ غیرتِ صرصر۔ تیز رفتاری میں آندھی کو شرمانے والا۔ تو کہے۔ فارسی تو گوئی کا ترجمہ ہے جو منجملہ ادات تشبیہ لایا جاتا ہے۔ اردو میں یہ معنی نہیں۔ آزر۔ عم حضرت ابراہیم جو بت تراش تھے۔ ان کے بنائے ہوئے بتوں سے بوجہ حسن محبوبوں کو بتان آزری کہتے ہیں۔

جناب نظم کو غالب کے صحیح کردہ نسخہ میں آذر بذال معجمہ ملا تو ان کو تکلفات کرنے کی ضرورت پڑی۔

بادشاہ کے گھوڑے میں وہ خوبی ہے کہ جب وہ تھان سے کھول کے سواری کے کام میں لایا جاتا ہے اس کے نقش سم (جس کو ہلال سے تشبیہ دیتے ہیں) ایسے دل فریب ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ آذر کا بت خانہ کھول دیا گیا ہے۔

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کی      مَنصبِ مہر و مہ و محور کھُلا

تربیت۔ تعلیم و پرورش۔ منصب۔ بفتح میم وکسر صاد مہملہ مرجع و مقام۔ وعلو و رفعت کارے از اعمال سلطنت۔ عہدہ۔ (پوسٹ) الفاظ منصب و مہر و مہ و محور سب میم سے شروع ہوتے ہیں اس صنعت کو لزوم مالایلزم کہتے ہیں۔ محور۔ بکسر میم ایک فرضی اور موہومی خط جو قطبین کو ملاتا ہے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ لفظ اس محل پر مہمل ہے اختر ہونا چاہئے۔ سچ کہتے ہیں۔

بادشاہ کے فیض تعلیم سے مجھ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ مہر و ماہ و اختر کا عہدہ اور کام کیا ہے۔ یعنی سب کارکن اور فرماں بردار بادشاہ کے ہیں۔ بنا پر خلقتك لاجلی و خلقت الکل لاجلك۔ انسان کے ضروریات مہیا کرنے کا کام یہ سب کیا کرتے ہیں۔

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک      میری حدِ وسع سے باہر کھُلا

دل میں بہت مشکلیں تھیں لیکن ہر مشکل آسانی سے میرے امکان سے باہر حل ہو گئی۔

تھا دل وابستہ قفل بے کلید　　کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھُلا

میرا دل منقبض و رنجیدہ بے کنجی کا تالا تھا۔ مگر اب اس میں انبساط اور کشایش پیدا ہو گئی مگر یہ نہیں معلوم کہ کس نے کھولا اور کب کھلا اور کس طرح کھُلا۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ استفہام اظہار تعجب اور خوشی اور اخبار کے لئے ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ممدوح کی وجہ سے وابستگی دور ہوئی۔

باغ معنی کی دکھاؤں گا بہار　　مجھ سے گر شاہ سخن گستر کھُلا

کسی سے کھلنا۔ اس سے بے تکلف ہونا۔ یہاں لطف و مہربانی و التفات مراد ہے۔
اگر بادشاہ نے مجھ پر لطف و کرم صرف کیا تو پھر میں باغ معنی کی بہار دکھا دوں گا۔ ایسا ایسا کلام کہہ کر سناؤں گا کہ باید و شاید۔

ہو جہاں گرم غزل خوانی نفس　　لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھُلا

طبلہ ڈبا (توطی)۔ عنبر۔ کوئی کہتا ہے کہ دریائی گائے کے گوبر میں پایا جاتا ہے کوئی کہتا ہے کہ ایک قسم کی شہد کی مکھی کا موم ہے۔ سیلاب سے نہروں میں بہ آتا ہے اور دریائی گائے اسے نگل لیتی ہے۔ ہضم نہ کر سکنے کی وجہ سے گوبر کے ساتھ نکل آتا ہے اور سطح آب پر تیرتا ہوتا ہے، اسے لوگ جمع کر لیتے ہیں۔ یہ بھی سُننے میں آتا ہے کہ وھیل مچھلی کے پیٹ سے نکلتا ہے۔ نفس۔ سانس جو باعث تکلم ہے۔
جہاں میں غزل خوانی پر مستعد ہوں تو میرا کلام ایسا عطر آگین ہے کہ لوگ سمجھیں کہ عنبر کا ڈبا کھُل گیا۔ یہ شعر غزل کی طرف گریز کا تھا۔

## غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا　　کاش کے ہوتا قفس کا در کھُلا

گوشۂ قفس میں کہاں تک پر کھلا بیٹھا رہوں۔ کاش پنجرے کی کھڑکی کھلی ہوتی کہ اڑ کے چلا جاتا تو آزادی حاصل ہو جاتی۔ عشق سے سوا تکلیف کے اب تک تو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اپنی گرفتاری سے آزادی کی حسرت کا اظہار ہے۔

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے  یار کا دروازہ پاویں گر کھُلا

یار کا دروازہ اگر ہم کھلا پائیں تو ہم یوں جانا نہیں چاہتے، کیوں کہ اس طرح تو اور لوگ بھی جا سکتے ہیں، ہاں ہم آواز دیں اور وہ دروازہ کھولیں تو معلوم ہوگا کہ وہ میرا آنا چاہتے ہیں۔ ورنہ ممکن ہے کہ وہ ناخوش ہوں اور نکلوا دیں ۔یا۔ رقیبوں کی طرح جانا نہیں چاہتے۔

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ  دوست کا ہے راز دشمن پر کھُلا

ہم ایسے نادان ہیں کہ ہم کو اپنی رازداری پر غرور اور گھمنڈ ہے۔ حالاں کہ اس کا راز رقیب پر سب عیاں ہے۔

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ  زخم لیکن داغ سے بہتر کھُلا

کھلنا ۔ زیب دینا ۔ زخم کا کھلنا ۔ زخم کا چاک ہو جانا۔ اس کے ٹانکے کھل جانا یا ٹوٹ جانا۔
دل پر داغ اگرچہ بھلا معلوم ہوتا تھا مگر زخم دل نے تو اور زیبایش بڑھا دی۔ کیوں کہ وہ تو سیاہ تھا اور زخم کے خون آلود ہونے سے اس میں رنگینی پیدا ہو گئی ہے۔

ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کمان  کب کمر سے غمزہ کی خنجر کھُلا

جناب نظم فرماتے ہیں کہ ابرو کو کمان اور غمزہ کو خنجر کہنا تو معمولی بات ہے مگر ابرو کو کمان دار اور غمزہ کو خنجر گذار کہنا نئی بات اور پر لطف ہے۔
کمان ابرو نے معشوق ہر وقت دل عاشق کو نشانہ بنانے کے لئے اور خنجر غمزہ محبوب ہر وقت جگر عاشق کو چاک کرنے کے لئے لیس رہتے ہیں۔

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ  رہروی میں پردۂ رہبر کھُلا

بدرقہ ۔ رہنما و نگہبان و نقیب کاروان۔ مسہل سے پہلے جو دوا پلاتے ہیں۔ فوج سے پہلے جو فوج آگے بھیجی جائے۔ ہر رہنما (گائڈ) شاید رہنما سے ذوق یا جنون مراد ہو۔
مفت کا رہنما کیا برا ہے۔ مگر جب راستہ میں ساتھ ہوا تو معلوم ہوا ؎

۵ او خویشتن گم است کرا رہبری کند

تو پھر ہم کو منزل مقصود تک کیا پہنچا سکتا ہے۔

سوز دل کا کیا کرے باران اشک　　آگ بھڑکی مینھ اگر دم بھر کھُلا

سوز دل کا کیا کرے ۔ جناب نظم فرماتے ہیں (کا) کی جگہ (کو) زیادہ محاورہ میں ہے۔ اور فیصلہ اہل زبان کے ہاتھ ہے۔

(کا) کے ساتھ علاج محذوف ہوتا ہے۔ اور (کو) کے ساتھ (لے کے) محذوف ہوتا ہے یعنی سوز دل کا کوئی علاج کیا کرے۔ اور۔ سوز دل کو کوئی لے کر کیا کرے ۔ مینھ سے استعارۃً اشک مراد ہیں۔

سوز دل کا کس کے پاس علاج ہے۔ آنسوؤں کا مینھ اگر دم بھر کے لئے کھُلتا ہے تو سوز دل کی آگ اور بھڑک اٹھتی ہے۔ بہر صورت جلتے رہنا اور روتے رہنا ہمارا کام ہے۔

نامہ کے ساتھ آگیا پیغام مرگ　　رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا

چھاتی ۔ سینہ یہ لفظ زیادہ تر عورتوں کی زبان پر ہے (سینہ) وزن میں آجاتا ہے۔

دم واپسیں انھوں نے خط بھیج کر پوچھا۔ لیٹے لیٹے پڑھنا چاہا مگر ساتھ ہی پیغام موت بھی آگیا۔ یا۔ خط کا آنا شادی مرگ ہوگیا۔ خط کو پڑھنے بھی نہ پائے اور خط ہاتھ سے چھوٹ کے سینہ پر دھرا رہ گیا۔ جناب نظم فرماتے ہیں یہ شعر بیت الغزل ہے۔

دیکھو غالبؔ سے اگر الجھا کوئی　　ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

دیکھو ۔ کلمہ تحذیر و تنبیہ ہے۔ تحذیر اور شرط کے بعد فعل حذف کر دیتے ہیں۔

دیکھو۔ خبردار ہو اگر کوئی غالبؔ سے الجھا تو اچھا نہ ہوگا۔ کیوں کہ وہ باطناً ولی ہے جس کو بد دعا دے گا اس کا ستیاناس ہو جائے گا۔ اگرچہ ظاہر میں کافر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ظاہر پر نہ جانا چاہئے۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال　　پھر مہ و خورشید کا دفتر کھُلا

یہاں سے پھر مدح بہادر شاہ کی طرف رجوع فرماتے ہیں ۔ مہ و خورشید سے مراد استعارۃً اشعار پر از مضامین عالیہ ہیں۔

اب پھر مدح بہادر شاہ کے لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور پھر مضامین عالیہ کا دفتر کھل گیا۔

خامہ نے پائی طبیعت سے مدد بادباں بھی (اُٹھتے ہی لنگر) کھلا

کھلا کا تعلق بادبان سے اور اُٹھا کا تعلق لنگر سے ہے۔ دوسرا مصرع بطور تمثیل ہے۔
طبیعت کی شگفتگی اور انشراح خاطر سے قلم کو مدد ملی اور چل نکلا۔ (خوب خوب مضامین اس نے لکھے) جیسے جہاز کا لنگر اٹھتے ہی بادبان کھول دیتے جاتے ہیں اور جہاز چل کھڑا ہوتا ہے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ طبیعت کے ساتھ بھی کھلنا بولتے ہیں بس اتنی مناسبت کافی ہے طبیعت کو بادبان کہا ہے۔

مدح سے ممدوح کی دیکھے شکوہ یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

دیکھے سے دیکھنا اچھا ہے کیوں کہ عرض و جوہر بھی واحد کے صیغے ہیں۔ شکوہ و عرض و جوہر سب کے معانی اوپر گذر چکے۔ مدح کو عرض اور ممدوح کو جوہر مانا ہے۔ جوہر کے معنی یہاں حسن ذاتی و خوبی فطری ہیں۔
میری مدح جو بمنزلہ عرض ہے اس سے حُسن ذاتی و خوبی بے فطری ممدوح کی جو بمنزلہ جوہر ہیں۔ واضح اور نمایاں ہوئیں۔ اس میں اپنی مدح مستقلاً اور مدح ممدوح ضمناً پائی جاتی ہے۔ اور فخر کرنا سنت شعرا ہے۔ اور آگے مدح ممدوح میں اپنی عاجزی کہیں گے۔

مہر کانپا چرخ چکّر کھا گیا بادشہ کا رایت لشکر کھلا

چرخ ۔ زردشتی فارسی میں چخر اور سنسکرت چکر اور اُردو ہندی چکّر بمعنی گردش اور پہیا ہے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ مہر کا کانپنا اور فلک کا چکر کھانا بعض حکما کے خیال سے ثابت ہے۔ غالب نے حکما کے خیال کی بنا پر نہیں کہا۔ بلکہ آسمان کو متحرک مانتے ہیں اور سورج کثرت نور کی وجہ سے لرزاں نظر آتا ہے۔ رایت ۔ عَلَم۔ جھنڈا کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم اس کے موجد ہیں۔ ایسے اسمار کہ جن کے آخر میں تائے قرشت ہو اور بروزن فعلن ہوں وہ سب مؤنث ہوتے ہیں۔ بجز معدودے چند جیسے رایت۔ شربت۔ خلعت۔
بادشاہ کا جب علم لشکر کھلا تو اس کی ہیبت اور رعب سے سورج کانپنے لگا اور چرخ کو چکر آ گیا کہ کہیں اس کا اثر ہم تک نہ آئے۔

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علوئے پایۂ منبر کھلا

بادشاہ کا نام چوں کہ خطیب منبر پر لیتا ہے اس سے منبر کا علو مرتبت ظاہر ہوا۔ منبر پہ بادشاہ کا نام لئے جانے کی

وجہ سے منبر عالی مرتبت ہوگیا۔ یا منبر کے عالی مرتبت ہونے کی وجہ سے منبر پر ان کا نام لیا جاتا ہے۔

سکّہ شہ کا ہوا ہے روشناس　　　اب عیار آبروئے زر کھُلا

عیار۔ خلوص۔ کھرا پن۔

چوں کہ اشرفی پر نام بادشاہ کا سکّہ پڑتا ہے یہی سبب اس کی توقیر کا ہے۔

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ　　　اب مآل سعی اسکندر کھُلا

کہتے ہیں کہ سکندر کی فرمائش سے حکیم بلیناس نے آئینہ لوہے سے بنایا تھا۔ اسکندریہ میں ساحل بحر پر ایک اونچے پھاٹک پر لگایا گیا تھا تاکہ دریائی لٹیروں کی کشتیوں کا عکس اس پر پڑے اور نگہبان ہوشیار اور تیار ہو جاتے ہیں۔ سکندر نے جو آئینہ بنانے میں کوشش کی تو اس کی غرض یہی تھی کہ ممدوح کے سامنے جائے۔ جب بادشاہ کے سامنے آیا تو انجام ایجاد آئینہ معلوم ہوا۔

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے　　　اب فریب طغرل و سنجر کھُلا

طغرل۔ بضم اول و ثالث ترکی میں بہری کو کہتے ہیں۔ طغرل بیگ میکائیل بن سلجوق کا بیٹا تھا۔ اور خاندان سلجوق کا پہلا بادشاہ ہے۔ پچیس سال سلطنت کرکے سن چار سو پچپن میں ستر برس کی عمر میں لاولد مرا طغرل بیگ نے اپنی بہن کی شادی قائم باللہ خلیفۂ عباسی کے ساتھ کر دی تھی۔ دو اور طغرل نام کے شاہ خاندان سلجوق میں گزرے ہیں۔ سنجر۔ سلطان ملک شاہ سلجوقی کا تیسرا بیٹا سن پانسو باون ہجری کو تہتر برس کی عمر میں مرگیا اور مرو میں دفن ہوا۔

حقیقی وارث سلطنت بہادر شاہ ہیں جب مخلوق نے ان کو دیکھا تو طغرل اور سنجر کا فریب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ مستحق سلطنت نہ تھے دھوکا دے کے بادشاہ بن بیٹھے۔

ہو سکے کیا مدح۔ ہاں اک نام ہے　　　دفتر مدح جہاں داور کھُلا

داور۔ اصل میں دادآور بمعنی منصف و عادل تھا۔ پھر معنی بادشاہ میں مستعمل ہوگیا۔

ممدوح کے صفات کثیرہ بیان کرنے کی قابلیت مجھ میں نہیں۔ ہاں نام کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے مدح ممدوح میں دفتر لپیٹ ڈالا۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ (کہ) کا حذف مصرع ثانی سے برا ہے۔

فکر اچھی پر ستایش ناتمام　　عجز اعجاز ستایش گر کھُلا

اگرچہ میری فکر مرتبہ اعجاز رکھتی ہے۔ مگر ممدوح کے صفات ہی اتنے ہیں کہ میں تکمیل تعریف نہیں کرسکتا۔ باوجودیکہ سخنوری میں مرتبہ اعجاز رکھتا ہوں مگر ان کی مدح نہ کرسکنے میں میرا عجز ظاہر ہے۔ عجز و اعجاز میں صنعت اشتقاق ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ ندرت یہ ہے کہ اعجاز میں عجز ثابت کیا ہے۔ حالاں کہ دوسرے لوگ ویسا معجزہ دکھلانے سے عاجز ہوتے ہیں۔ مگر اس معاملہ میں معجز نما خود عاجز ہے۔

جانتا ہوں۔ ہے خط لوح ازل　　تم پر اے خاقان نام آور کھُلا

اے بادشاہ نامور مجھے یہ بخوبی معلوم ہے کہ تحریر لوح ازل کا تمہیں پورے طور سے علم ہے پھر مجھے اپنی کوئی ضرورت بیان کرنے کی کیا ضرورت۔

مگر نوشتہ لوح ازل میں یہ دخل کیسے دے سکتے ہیں اور اس کے خلاف کیسے کرسکتے ہیں۔

تم کرو صاحب قرانی۔ جب تلک　　ہے طلسم روز و شب کا در کھُلا

صاحب قران ۔ وہ مولود جس کی ولادت کے وقت قرآن زہرہ و مشتری ایک برج میں ہو ایسا شخص بڑا جلیل القدر اور فاتح عالم ہوتا ہے۔ اسی لئے داستان امیر حمزہ کے مصنف نے ان کے نام کے ساتھ صاحب قرآن لگایا اور سیکڑوں طلسم انھوں نے فتح کئے۔ روز و شب کو طلسم کے ساتھ استعارہ اسی مناسبت سے کیا ہے۔

جب تک کہ رات دن ہیں یعنی قیامت تک تم بادشاہ صاحب قرآن رہو۔ امیر تیمور ممدوح کے جداعلیٰ بھی صاحب قرآن تھے۔

---

# مثنوی درصفتِ انبہ

مثنوی ۱ اشعار ۳۲

نظم ۲۳۷
اشعار ۳۲

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

خزینہ وخزانہ (خزینہ) بفتح اول شاید حمال خزانہ بالکسر کا ہے۔ جائے جمع کردن مال۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ کھولنے سے پہلے (حذف تو کا) بہت برا ہے۔

ہاں اے دل دردمند وزمزمہ ساز تو مضامین پوشیدہ راز کے خزانہ کے دروازہ کو کیوں نہیں کھولتا۔ لفظ دردمند کی خوبی اس محل پر میں نہ سمجھا۔ شاید یہ صفت اپنے دل کی واقعی قرار دی ہے۔ مستمند کے معنی بھی دردمند کے اور دوسرے معنی محتاج اور نیازمند کے بھی ہیں۔ چوں کہ غالب آم کو بہت پسند کرتے تھے لہٰذا مستمند کے دوسرے معنی سے براعت استہلال کی صنعت ہو سکتی ہے اور دردمند کے معنی اندوہ گیں اور غم ناک اور محنت کش بھی آتی رہتے ہیں۔

خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا

قلم صفحہ کاغذ پر کیا چل رہا ہے گویا شاخ گل سے پھول جھڑ رہے ہیں۔

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے نکتہ ہائے خرد۔ فزا لکھئے

خطاب دل سے ہے۔ پہلے مصرع کی ردیف سے درگذر کر کے (پوچھتا ہے) کے ساتھ دوسرے مصرع میں (لکھئے) کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لکھئے کے ساتھ (پوچھتے ہو) اگر ہو تو شاید دلّی کی بول چال کے موافق ہو جائے ورنہ اس طرح بولتے ہیں۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کہ کیا لکھوں نکتہہائے خرد افزا لکھ۔

ہاں ارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے

قلم سے مخاطبہ چھوڑ کے از روئے التفات اپنی طرف فوراً رجوع کر گئے۔

المختصر آموں کا کچھ بیان کیا جائے ایسا کہ قلم کے درخت خرما سے تازہ تازہ خرمے ٹپکنے لگیں۔ یعنی ایسے شیریں مضامین لکھے جائیں کہ جن سے خرموں کا مزہ ملے۔

آم کا کون مرد میدان ہے　　ثمر و شاخ گوئے و چوگان ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارمان　　آئے یہ گوئے اور یہ میدان

تاک۔ انگور کی بیل۔ آم کا مقابلہ بہ نسبت تاک کے انگور سے اچھا تھا۔

آم کا مقابل کون سا ثمر ہو سکتا ہے۔ آم گیند اور درخت انکی شاخیں چوگان ہیں۔ تاک کے دل میں ارمان کیوں رہ جائے۔ یہ گیند بھی موجود ہے اور میدان بھی موجود ہے مقابلہ کر کے دیکھ لے۔ آم سے بازی کبھی نہیں لے جا سکتا۔

تاک اُردو میں نہیں بولتے۔ اس کے معنی اُردو و فارسی میں انگور کی بیل ہیں۔ اور اس کے ہم وزن اسما بھی ناک۔ خاک۔ ڈاک۔ تاک جھانک وغیرہ۔ ان پر اور بیل پر قیاس کر کے اگر مؤنث کہیں تو کچھ برا نہیں۔

آم کے آگے پیش جائے خاک　　پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور　　بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے　　شرم سے پانی پانی ہونا ہے

پیش جانا۔ فوقیت حاصل کرنا۔ بڑھ جانا۔ جلے پھپھولے پھوڑنا۔ پورے طور پر انتقام لینے کی قوت نہ ہونے پر برا بھلا کہہ لینے پر اپنا دل خوش کر لینا مقدور زور قوت طاقت۔ ناب = مرکب از (نہ + آب) خالص بے میل۔ پانی پانی ہونا۔ مارے شرم کے پسینہ میں ڈوب جانا۔

انگور آم سے مزہ اور لطافت میں کیسے بڑھ سکتا ہے۔ انگور کی بیل صرف جلے پھپھولے پھوڑ لیتی ہے۔ یہ فعل بھی اس کا مجبوراً محض جی کا کھونا ہے اس سے کہیں آم کی برابری ہو سکتی ہے۔ صرف شرم کے مارے میں پسینہ میں ڈوب مرتا ہے۔ انگور بشکل آبلہ ہوتا ہے۔ جلے پھپھولے پھوڑنا اس محل پر خوب لائے ہیں۔

دوسرے شعر کے معنی لکھنا بھول گیا۔

جب آم پر کچھ زور نہ چلا تو انگور خالص شراب کی صورت میں پانی ہو کر رہ گیا۔ تینوں شعر بہت خوب ہیں اور محاورات نہایت برجستہ اور برمحل ہیں انگور کو پھپھولے کے ساتھ مشابہت تامہ ہے۔

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے　　آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نیشکر۔ گنا۔

اے سامعین و ناظرین تم کیا جانو۔ مجھ سے پوچھو تو میں تمہیں بتاؤں کہ آم کے مقابلہ میں گنا کیا چیز ہے۔ وہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ہے۔ گنا میٹھا تو ہے مگر آم کی ایسی لذت اور مزہ اس میں کہاں۔

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ و بار　　جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

برگ و بار کے درمیانی واو کی جگہ بھی (نہ) ہو تو کیا برا ہے۔
گنے میں نہ پھول ہوتے ہیں اور نہ شاخ اور پتے اور نہ ثمر اور زمانہ خزاں میں پیدا ہوتا ہے۔

اور دوڑائیے قیاس کہاں　　جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

اور زیادہ اگر قیاس و اندوہ کو ہم دخل دیں تو کہہ سکتے ہیں کہ جانِ شیریں میں مزہ کہاں جو آم میں ہے۔
شیریں اور مٹھاس میں صنعت ترجمۃ اللفظ کہہ سکتے ہیں۔

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی　　کوہ کن باوجود غمگینی
ق
جان دینے میں اس کو یکتا جان　　پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

جان میں اگر مزہ اور لطف آم کا ایسا ہوتا تو فرہاد باوجود غمگین اور جان دینے میں یکتا و وحید ہونے کے اتنی آسانی سے جان نہ دے دیتا۔

جان دینا۔ کسی پر عاشق ہونا اور اس پر مرنا۔ نیز جان نثاری کرنا۔ جان۔ روح اور جاننے سے صیغہ امر (اے بدان)۔

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر　　کہ دوا خانۂ ازل میں مگر
ق

آتش گل پہ قند کا ہے قوام　　شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

مگر ۔ بالضرور ۔ و بالتحقیق و بمعنی شاید لغات اضداد میں سے ہے ۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ لفظ ازل بے محل ہے۔ اس سے تو بہتر (قدر) ہے ۔ قند ۔ کھنڈ اور کھانڈ سے بنا ہے ایک قسم کی جمائی ہوئی شکر مخروطی شکل اسے فارسی میں تبرزد کہتے ہیں جس کا معرب طبرزد ہے ۔ قوام شکر ایسا شیرہ جس کے ٹپکانے سے تار بندھے ۔ اسے پرورده بھی کہتے ہیں ۔ یہ مربے میں کام آتا ہے ۔ جو پھل اُبال کے یا کوئی اور چیز اس میں ڈالی جائے وہ دیر تک سڑتی نہیں ۔ ریشہ نخی آم کے پھوسڑے ۔

مجھے یہ آم کا پھل یوں دکھائی دیتا ہے کہ جیسے قضا و قدر کے دواخانہ میں آتش گل پر قند کا قوام کیا گیا ہے ۔ اور آم کے جھونرے اسی قوام کے شیرہ کے تار کا نام ہے ۔

یا یہ ہوگا کہ فرط رافت سے　　باغبانوں نے باغ جنت سے

انگبین کے بحکم رب الناس　　بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

یہ دوسری تشبیہ آم کی ہے ۔ رافت ۔ ایصال نعمت صافی از الم یہ رحمت سے اقوی کیفیت میں ہے کیونکہ رحمت میں مبالغہ کا نام رافت ہے ۔ انگبین ۔ بہشت میں چار نہروں میں سے ایک عسل مصفیٰ کی بھی ہے ۔ رب الناس ۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ لفظ بھرتی کا ہے محض قافیہ کی ضرورت سے لایا گیا۔

سچ کہتے ہیں ۔ کھینچ تان کے یوں مناسبت زبردستی پیدا کر سکتے ہیں کہ رب بفتح (پروردگار) کی شکل رُب بضم میں پائی جاتی ہے جس کے معنی پرورده کے ہیں جسے شیرہ اور قوام بھی کہتے ہیں ۔ اور لفظ الناس میں بو اناس کی آتی ہے ۔ سر بمہر ۔ آم کی بونڈی کو تشبیہاً مہر کہا ہے ۔ امیروں کو جو تحفہ کھانے کی چیزوں کا بھیجا جاتا ہے اس کی بستی پر مہر لگاتے ہیں تاکہ آمیزش زہر کا مضنہ نہ رہے ۔

یا یوں کہو کہ منتہائے رحم و کرم میں باغ جنت کے مالیوں نے شہد کے گلاس اور کپیاں بھر کے ان پر مہر لگا کے بھیج دیئے ہیں ۔

یا لگا کر خضر کے

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل　　ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

شاخ نبات مصری کے قوزوں میں بانس کی پتلی پتلی تیلیاں رکھ کر جماتے ہیں ۔ مگر یہاں شاخ سے غصن مراد ہے

بعض درخت تخم اور گٹھلی سے نہیں پیدا ہوتے ہیں بلکہ ان کی شاخ (جیسے انگور اور گلاب وغیرہ) زمین میں دبا دیتے ہیں اس سے وہ درخت اُگ آتا ہے۔ اسے دبا کہتے ہیں۔ نخل ۔ درخت خرما خصوصاً۔ پھر ہر درخت کو بھی کہتے ہیں۔ تنہ والے درخت کو شجر اور بے تنہ والے کو عربی نجم کہتے ہیں۔

یا یوں کہو کہ حضرت خضر نے مصری کی شاخ کا دبا لگا کر اس کو چشمہ آب حیوان سے سینچا ہے تب آم کے درخت میں آم لگے ہیں۔ اگر حضرت خضر یہ عمل نہ کرتے تو آم کا درخت ہمارے ہاتھ کب لگتا۔ ہم ہیں اور اس ہیں بعدٌ بعید تھا۔

خضر بروزن فکر یا بروزن خجل بس یہی دو اعراب ہیں۔ اور بکسر اول وفتح ثانی جس نے نظرا ور جگر کے قافیہ میں باندھا اس نے غلطی کی۔

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس　　　　رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا اگر اِک بار　　　　پھینک دیتا طلائے دست افشار

ترنج ۔ بضمتین ایک قسم ترشاوے کی رنگ ریز کام میں لاتے ہیں اور کباب والے کباب پر اس کا عرق نچوڑتے ہیں ۔ زلیخا نے اپنے ہم محلہ کے ہاتھوں میں کاٹنے کے لئے یہی دیا تھا۔ انگریزی میں CITRON کہتے ہیں۔ ترنج دو ۔ زر دست افشار خسرو پرویز کو اہل عمل نے اس طرح کا بنا کے دیا تھا کہ اسے وہ ہاتھ میں رکھتا تھا اور موم کی طرح نرم تھا جس شکل پر اس کا جی چاہتا تھا بنا لیتا تھا۔ باس ۔ ہندی کا لفظ ہے بمعنی بو۔

خسرو پرویز کے پاس ترنج زر تھا۔ رنگ اس کا بھی آم کی طرح زرد تھا مگر اس میں آم کی ایسی خوشبو کہاں۔ اگر وہ آم کو دیکھ لیتا یا پا جاتا تو اس طلائے دست افشار کو پھینک دیتا اور آم ہاتھ میں رکھتا۔

رونق کارگاہِ برگ و نوا　　　　نازش دودمان آب وہوا

برگ ونوا ۔ ساز وسامان۔ اور برگ بمعنی ورق (پتا) اور نوا نغمہ طیور۔ اور نواۃ عربی میں گٹھلی کو کہتے ہیں۔ کارگاہ ۔ کارخانہ ۔ دودمان ۔ خاندان ۔ خانوادہ ۔ قبیلہ ۔ آب وہوا ۔ بعض درختوں اور آدمیوں کو کسی ملک اور کسی صوبہ کی آب ہوا موافق ہوتی ہے اور کسی کی نہیں ہندوستان کی آب وہوا کھجور کے لئے اور یورپ کی آب وہوا آم کے لئے موافق نہیں۔ آم گرم ملک کی پیداوار ہے۔ ہند میں اس کی قلم لگا کے اسے لطیف کر لیا گیا ہے۔

آم برگ ونوا کے کارخانہ کے لئے باعث رونق ہے اور خاندان آب وہوا کے لئے موجب فخر وناز ہے۔

رہرو راہ خلد کا توشہ　　　طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

رہرو۔ مسافر۔ توشہ۔ زادہ راہ۔ طوبیٰ۔ بہشت کے ایک درخت کا نام۔ سدرہ۔ بکسر بیری کا درخت عرش پر مسکن جبریل۔ جگر گوشہ۔ فلذۂ کبد۔ کلیجہ کا ٹکڑا۔ کنایہ از فرزند۔

آم خلد کے مسافر کے لئے زاد راہ ہے۔ اور درخت طوبیٰ و سدرہ کے لئے ثمرۃ الفواد (فرزند) ہے۔

صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم　　　ناز پروردۂ بہار ہے آم

پہلے مصرع میں جو صفات آم کے بیان کئے یہ تو سب پھلوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تعریف ہی کیا ہوئی۔ پروردہ۔ پالا ہوا۔ اور قوام و رُب کو بھی کہتے ہیں۔ برگ و بار۔ سامان۔

آم صاحب برگ و شاخ و ثمر ہے۔ اور بہار کا ناز نعمت کے ساتھ پالا ہوا ہے۔

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو　　　نو بر نخل باغ سلطاں ہو

نخل باغ سلطان۔ کنایہ از ولی عہد بہادر شاہ (نو برثمر نورسیدہ) یا بادشاہی کے باغ کا درخت۔

کبھی مشکل لفظ سے صنعت پیدا کرتے ہیں جیسے عرض بسکون ثانی مقابل جوہر یا کبھی تلفظ سے صنعت پیدا کرتے ہیں۔ جیسے خاص و آم (عام)۔ فن بدیع میں اگرچہ اس کا ذکر نہیں اور نہ کوئی نام اس کا ہے۔ مگر ہو تو اچھا ہے۔

وہ کہ ہے والی ولایت عہد　　　عدل سے اس کے ہے حمایت عہد

عہد۔ پہلے مصرع میں بمعنی پیمان اور دوسرے مصرع میں بمعنی زمانہ ہے۔ ولایت۔ خطہ و امارت۔ سلطان۔ وہ بلاد جس پر تسلط ہو۔ والی۔ حاکم۔ مالک۔ آقا۔ حمایت۔ دفع ضرر از کسے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ والی ولایت عہد سے خود ظفر شاہ مراد لیں اور یہی اچھا ہے۔ کیوں کہ اور اشعار مدح بہادر شاہ میں ہیں۔ ہاں اگر واقعہ کسی طرح سے ثابت ہو تو ولی عہد مراد لینا ضروری ہوگا۔

وہ سلطان وہ ہیں جو اس زمانہ کے مالک ملک ہیں اور ان کے عدل و انصاف نے اہل زمانہ سے دفع ضرر ہوتا رہتا ہے۔

فخر دیں۔ عز شان و جاہ و جلال　　　زینت طینت و جمال و کمال

جلال۔ عظمت وجبروت وکبریا۔ اس کا استعمال غیراجسام میں ہوتا ہے۔ ضد حقارت ہے۔ جاہ قدر ومشرف و علو منزلت۔ شان۔ امر وحال عظیم۔ طینت آب وگل وفطرت۔ وخلقت وجبلت۔ وخلیفہ طبیعہ۔ کمال۔ تمام تکمیل نقصان اصل کو کہتے ہیں۔ اور کمال کسی وصف کے پورا کرنے کے بعد تمام پر امر زائد کا نام ہے۔ جمال۔ بفتح حسن الصورت والسیرۃ۔ شیخ سعدی نے اس حکایت ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے

میں جو یہ شعر کہا ہے ؎

جمال ہم نشین در من اثر کرد     وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم

میں جمال بمعنی حسن سیرۃ ہے۔ ورنہ حسن صورت کسی دوسرے میں اثر نہیں کیا کرتا ہے۔

اس کے بعد معنی لکھنے کی ضرورت نہیں۔ بہادر شاہ کی تعریف میں سب الفاظ ہیں یہ شعر بھی بتاتا ہے کہ اوپر والا شعر بھی مدح ظفر شاہ میں ہے۔

کارفرمائے دین و دولت وبخت     چہرہ آرائے تاج ومسند وتخت

کارفرما وچہرہ آرا۔ بخت وتخت میں صنعت ترصیع ہے۔ اور دین وتاج۔ دولت ومسند میں صنعت مرجزیے۔ حاکم وعامل دین وسلطنت وخوش بختی ہیں۔ اور زینت دہ تاج ومسند وتخت ہیں۔

سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے     خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

ہما۔ کہتے ہیں کہ طائر ہما کا سایہ جس پر پڑ جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ اور بادشاہ کو ظل اللہ کہتے ہیں جس کا ترجمہ (خدا کا سایہ) مصنف نے کہا ہے۔

اس کا سایہ۔ سایہ ہما کی تاثیر رکھتا ہے اور وہ مخلوق پر سایۂ خدا ہے۔

اس کے بعد اب آخری حصہ میں دعا کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔

اے مفیضِ وجود سایہ و نور     جب تلک ہے وجود سایہ و نور

پہلے مصرع کے معنی اے خدا۔ مفیض فیض رساں۔

اے خدا جب تک کہ ظہور سایہ و نور ہے یعنی قیامت تک۔

اس خداوند بندہ پرور کو　　　وارث گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادمان رکھیو　　　اور غالبؔ پہ مہربان رکھیو

افسر۔ پگڑی اور کلغی والا تاج جیسا اکبر کے سر پر ہے۔ تاج کنگرے والا جیسا واجد علی شاہ کے سر پر ہے۔

اے اللہ! اس آقائے بندہ پرور کو جو وارث خزانہ و تخت و تاج ہے ہمیشہ خوش رکھنا اور غالب پر مہربان رکھنا۔

---

# قطعات

## قطعہ در مدح بہادر شاہ

قطعہ ۱　　　اشعار ۱۷

نظم ۲۲۸
اشعار ۱

اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر　　　اے جہاندار کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

شبہ۔ بالکسر مثل و مثال۔ نظیر۔ مثل در کیفیت۔ مثل۔ در کل حقیقۃ مشارک۔ عدیل۔ ایک اونٹ کے دو سوار پہلو بہ پہلو۔ مثل و نظیر۔ فلک منظر۔ جس کا بالاخانہ اور جھروکا مرتبہ فلک رکھتا ہو۔ یا فلک اس کا جھروکا ہو۔ کرم شیوہ۔ جس کا شعار کرم کرنا ہو۔ کرم پیشہ۔ جناب نظم فلک منظر کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ جس نے ان پر نظر ڈالی اس نے گویا فلک کو دیکھا۔ اس کا منظر فلک کی سے رفعت رکھتا ہے۔

معنی لکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

پاؤں سے تیرے ملے فرق ارادت اورنگ  فرق سے تیرے کرے کسب سعادت اکلیل

ارادت ۔ عقیدت ۔ اورنگ ۔ تخت ۔ اکلیل ۔ تاج اٹھائیس منزل قمر میں سے سترھویں منزل برج عقرب میں ہے تخت تیرے پاؤں سے سر عقیدت ملتا ہے ۔ اور تیرے سر سے تاج سعادت حاصل کرتا ہے پہلا شعر مبتدا تھا اور یہ خبر ہے ۔

تیرا انداز سخن شانۂ زلف الہام  تیری رفتار قلم جنبش بال جبریل

تیرا ایک کلام زلف الہام کے لئے کنگھی کا کام کرتا ہے ۔ الہام میں بھی زینت و آرایش پیدا کر دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ تیرا کلام سراسر الہام ہے اور تیرے قلم کی رفتار جنبش پر جبریل ہے ۔
جنبش بال جبریل ۔ جبریل جب حرکت کرتے تھے تو وحی لاتے تھے ۔ غرض یہ ہے کہ قلم حرکت کر کے معنی کا لوحی لکھتا ہے ۔

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم  تجھ سے دُنیا میں بچھا مائدۂ بذل خلیل

کلیم ۔ حضرت موسیٰ خدا سے باتیں کر لیتے تھے ۔ مائدہ ۔ دستار خوان پر از طعام ۔ بذل ۔ سخاوت و بخشش و عطا خلیل ۔ دوست (بطور معہود ذہنی) لقب حضرت ابراہیم بڑے مہمان دوست تھے ۔ بغیر مہمان کسی وقت کا کھانا نہیں کھاتے تھے ۔
اللہ سے جو تقرب حضرت موسیٰ کو حاصل تھا وہی تم کو حاصل ہے ۔ اور تمہیں نے حضرت خلیل اللہ کی طرح فیض عام کا دستر خوان بچھا رکھا ہے ۔

بسخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ  بکرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

ناصیہ ۔ پیشانی ۔ قلزم ۔ ایک سمندر درمیان عرب و افریقہ و بمعنی مطلق بحر ۔
اپنے کلام سے وہ معنی اور لفظ دونوں کا مرتبہ بڑھا دیتے ہیں ۔ اور اپنے فیض و کرم سے قلزم و نیل کی پیشانی پر داغ لگانے والے اور ان کو شرمندہ کرنے والے ہیں ۔ جو فیض ممدوح میں ہے وہ قلزم و نیل میں نہیں ۔

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توقیر  تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے باہر جانا	زہرہ نے ترک کیا جوت سے کرنا تحویل

برج ثور ۔ خانہ شرف ماہ ہے اور اصلی خانہ اس کا برج سرطان ہے۔ جوت ۔ خانہ شرف زہرہ ہے اور اصلی خانہ میزان ہے۔ توفیر = زیادتی۔ تقلیل ۔ کمی۔ تحویل ۔ کسی سیارہ کا ایک برج سے دوسرے برج میں جانا۔ زہرہ کو رقاصہ فلک کہتے ہیں۔ جس مولود کی ولادت کے وقت برج طالع میں زہرہ ہو وہ عیش وطرب کی طرف مائل رہتا ہے۔ اگر ماہ ہو تو اسے رنج والم کم ہوتا ہے۔ خوشی اور خوش حالی میں زندگی بسر کرتا ہے۔

تاکہ تیرے زمانہ میں عیش وطرب کی زیادتی ہو اس لئے زہرہ کبھی برج حوت سے نہیں نکلتی۔ اور تاکہ میرے زمانہ میں خوش حالی رہے اس لئے ماہ برج ثور سے کبھی نہیں ہٹتا۔

تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہین	تیری بخشش مرے انجاح مقاصد کی کفیل

یہ شعر صنعت ترصیع میں ہے۔ دانش ۔ علم وعقل۔ مفاسد۔ جمع مفسدہ بگاڑنے والی چیزیں۔ (مصلحت کا ضد) ۔ جن چیزوں سے کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ اصلاح = درستی کار۔ رہین = مرہون ۔ پابند۔ انجاح ۔ حاجت بر آوردن۔ مقاصد = جمع مقصد۔ ارادہ۔ مطلب۔ مطالب بھی کہہ سکتے تھے جو مقاصد سے زیادہ رائج ہے مگر بسجع مفاسد کا نہ رہتا۔ کفیل = ضامن۔ تیری واقف کاری میری بدحالی کی درستی کی پابند ہے۔ اور تیری سخا وعطا میرے مطالب کے برلانے کی ضامن ہے۔

تیرا اقبال ترحم میرے جینے کی نوید	تیرا انداز تغافل مرے مرنے کی دلیل

اقبال ۔ پیش آنا۔ دلیل ۔ وہ حجۃ جو مفید ظن ہو اور برہان وہ حجۃ قطعی جو مفید علم ہو اور دلیل و مدلول میں تخالف وغیریت نہیں ہوتی جیسے دخان اور نار۔ اور علامت میں تخالف ہوتا ہے۔ جس پہ سحاب و مطر تیرا رحم کے ساتھ پیش آنا میری زندگی کے لئے مژدہ ہے۔ اور تیری غفلت شعاری میری موت کی دلیل ہے۔

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں	چرخ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

قسمت ناموافق نے مجھے امن وامان دینا نہ چاہا۔ کہ میں چین اور راحت سے بیٹھوں اور فلک کج رفتار دغاباز نے مجھے ذلیل کرنا چاہا۔

تغافل ممدوح کے ذکر سے یوں شکایت پائی جاتی تھی اس لئے حرکات ناملائم کا باعث بخت وفلک کو قرار دیا۔

پیچھے ڈالے ہے سررشتۂ اوقات میں گانٹھ      پہلے ٹھونکی ہے بن ناخن تدبیر کیل

ڈالے ہے یعنی (ڈالتا ہے)۔ ٹھونکے ہے یعنی (ٹھونکتا ہے) بیائے مجہول پڑھا جائے تو اچھا ہے تاکہ بخت و فلک کی عادت مستمرۃ کا اظہار نہ ہو۔

بن ناخن میں کیل ٹھونکنا۔ یہ فارسی محاورہ۔ نے در بن ناخن کوفتن کا ترجمہ ہے اُردو میں نہیں بولتے۔ یہ اگلے زمانہ میں ایک قسم کی تعزیر تھی۔ جبکہ کیل بن ناخن میں ٹھنکی ہو تو چٹکی سے گرہ کشائی نہیں ہو سکتی ہے۔ اوقاتش تنگ سے فارسی کا محاورہ ہے یعنی تنگ دل ہوا (جز بز۔ زچ بچ ہوا)۔

یعنی بخت و فلک میرے اوقات راحت کے دھاگے میں گرہ ڈالنے سے پہلے ناخن تدبیر کو بےکار کر دیتا ہے تاکہ یہ گرہ کھل ہی نہ سکے اور ہمیشہ تکلیف میں رہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ گھانٹھ۔ اب متروک ہے گنے کی گانٹھ۔ کپڑے کی گانٹھ یا گانٹھ گرہ ملا کے اب بھی بولتے ہیں۔

تپش دل نہیں بے رابطۂ خوف عظیم      کشش دم نہیں بے ضابطۂ جر ثقیل

مصرع ثانی میں بجائے ضابطۂ (واسطہ) ہو تو معنی کہنے میں سہولت بھی ہوتی ہے اور سجع بھی ہاتھ سے نہیں جاتا برخلاف ضابطہ۔ ضابطہ۔ حکم کلی جو منطبق جزئیات پر ہو۔ قانون قاعدہ۔ جر ثقیل۔ بار کشیدن۔ ایک آلہ جس سے بھاری بوجھ اُٹھاتے ہیں۔

کوئی بڑا خوف لگا ہوا ہے۔ اسی خوف کے تعلق سے دل تڑپے ہے۔ اور سانس بھی بڑی دشواری سے لیتا ہوں جناب حسرت و نظم یہی معنی لکھتے ہیں۔

جناب آسی جناب نظم سے الگ معنی کہنا چاہتے ہیں۔ اور جناب نظم کے معنی بھی لکھتے ہیں اس خیال سے کہ یہ غلط ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔

میرے دل کی تڑپ بغیر خوف کے باقی نہیں رہی ہے۔ میرے دل میں حرکت بغیر خوف عظیم کے ہوتی ہی نہیں۔ اور میرا دم لینا بغیر امداد جر ثقل کے مشکل ہے۔

دل میں تڑپ درد۔ تمنا اور خوف سے تو ہوتی ہے۔ یہی مطلب پہلے مصرع کا سب ہی لکھتے ہیں۔ دوسرے مصرع کا مطلب عجیب و غریب ہے جس کے معنی سمجھنا مشکل ہے۔ دم لینے میں جر ثقیل سے امداد لینے کے معنی وہی سمجھتے ہوں گے۔

خوف عظیم = سے مراد شاید مرگ۔ ہے کہ دل کے تڑپنے میں ہر وقت موت کا اندیشہ رہتا۔

## در معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی     غم گیتی سے مرا سینہ امر کی زنبیل

لقا۔ داستان امیر حمزہ میں ساحروں اور کافروں کے پونے دو سو خداؤں میں سے ایک خدا جو مقابل حمزہ ہوتا تھا اور اس کی داڑھی کے بال میں موتی پروئے ہوئے تھے۔ اور اس کی بارگاہ قیطول ہوا میں معلق رہتی تھی۔

جناب نظم فرماتے ہیں (امر) کو الف سے لکھنا اور میم کو متحرک کرنا دونوں غلط ہیں۔ غالب نے سمجھا کہ داستان امیر حمزہ ہندوستان کی گڑھت ہے لہٰذا یہ نام فرضی ہے۔ یوں املا (اَمَر) اختیار کیا۔ حالاں کہ عمرو بن امیہ ضمر قبیلہ کے مہاجرین میں سے تھے۔ رسول مقبول نے مشرکین مکہ میں انھیں بطور جاسوسی بھیجا تھا اور مشرکین خُبیث کو سولی دینا چاہتے تھے۔ عمرو بن امیہ ضمری مشرکین کی آنکھ بچا کے خُبیث کو نکال لائے اس لئے داستان گویوں نے انھیں امیر حمزہ صاحب قرآن کا عیار قرار دیا۔ ان کے پہلو میں جسم کے اندر ایک زنبیل تھی جس میں سات ملک آباد تھے یہ جس مقابل اور مخالف سے ناخوش ہوتے اسے عیاری سے پکڑ کے اس زنبیل میں بند کر دیتے تھے۔ حمزہ اور عمرو فرضی نام نہیں ہاں قصہ جوان دونوں کے سر لگایا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے کہتے ہیں کہ اکبر کے زمانہ میں ملا دو پیازے نے اسے فارسی میں تصنیف کیا۔ پھر میر احمد علی لکھنوی نے اس میں دفتر ہوش ربا کا اضافہ کیا ان کے بعد محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر نے طومار باندھ دیا اور ان دونوں کی تصانیف کو نولکشور نے شایع کر دیا۔ میر باقر حسین دہلوی بھی مشہور داستان گو تھے۔ شاہزادہ علیم الدین نے بھی اس داستان کے پوٹ باندھ دیئے اور یہ تینوں چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں زندہ تھے۔

اگر (عمرو) صحیح تلفظ کے ساتھ نظم کرنا چاہیں تو دوسرا مصرع یوں ہو سکتا ہے۔ ؎

غم سے سینہ مرا ہے عمرو کی بے شک زنبیل

میرے صفحات نظم و نثر لقا کی داڑھی کی طرح معنی کے موتیوں سے پُر ہیں۔ مگر غم دنیا سے میرا سینہ عمرو عیار کی زنبیل بن رہا ہے۔ (جس میں سات ملک اور سات دریا تھے۔

## فکر میری گہر اندوز اشارات کثیر     کلک میری رقم آموز عبارات قلیل

یہ شعر صنعت مرجز میں ہے۔ ہر لفظ اس شعر کے ایک مصرع کا دوسرے مصرع کے ساتھ ہم وزن بوزن عروضی ہے اور باہم قافیہ نہیں علاوہ اشارات اور عبارات کے۔ یہی معنی تعریف مرجز کے کہ وزن وارد و قافیہ ہیں یہ مترادف بلینک ورس جیسا کہ غالب اور حالی نے سمجھا۔ کلک اُردو میں مستعمل کم۔ قلم پر قیاس کر کے مذکر ہونا چاہئے۔ مگر دہلی میں قلم بھی مؤنث ہے۔ رقم آموز جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ اسم مفعول ترکیبی ہے۔ یعنی تحریر سیکھا ہوا۔

میری یہ نظم اشارات کثیر کے موتی اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اور میرا قلم تھوڑی عبارت میں معانی کثیر لانے کو سیکھے ہوئے

ہے۔ یعنی میری عبارت ماقل و دل ہوتی ہے۔ گو میں نے صاف صاف اظہار حال نہیں کیا ہے مگر اس مجمل سے میرا مفصل حال واضح ہوتا ہے۔

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح　　　میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

میرے مبہم پر وضاحت قربان ہوتی ہے۔ اور میرے اجمال سے تفصیل ٹپکتی ہے۔

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف　　　جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

"اچھی" آسکتا تھا مگر فارسی سے شغف ہونے کی وجہ سے نیک کہا۔

اگر خوش حالی اور میری حالت اچھی ہوتی تو میں تکلیف نہ دیتا۔ اور دل جمعی اور فراغ حاصل ہوتا تو اتنی تعجیل نہ کرتا۔ میری حالت بہت زار ہے۔

قبلہ کون و مکان خستہ نوازی میں یہ دیر　　　کعبہ امن و امان عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

ڈھیل یہ قافیہ ہندی بھی (کیل) کی طرح بہت خوب ہے۔ گرہ کسی ہوئی جب تک ڈھیلی نہ پڑے نہیں کھلتی۔

خستہ = مجروح و زخم خوردہ و درماندہ و بیمار کون عالم وجود مکان کسی شئے کے ہونے کی جگہ۔ مقام۔ اسم ظرف مکان از کون۔

اے قبلہ عالم وجود اس درماندہ اور مجروح پر نوازش کرنے میں اتنی تاخیر اور اے کعبہ امن و امان میرے مشکلات کی گرہ کشائی میں اس قدر تساہل۔

---

۴ر جنوری ۶۴۷ – ۱۰ر صفر ۶۵ھ یوم شنبہ

# قطعہ در غزل

قطعہ ۲ اشعار ۲

نظم ۲۲۹ اشعار ۲

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

غیروں کی وفاداری کی تقریر کیا کرتے تھے یہ طرز ادا بھی فارسی ہی ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں۔ دوسرے مصرع میں خاموش رہنے کو کہتے ہیں، مگر چوتھے مصرع میں کہتے ہیں۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے۔ اسے تعقید معنوی فرماتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں۔ لہٰذا ان کی رائے کے موافق اس مصرع کو یوں بناتا ہوں۔

بیان کرتے تھے تم پر ہم مخالف اس کے رہتے تھے

نادانستہ بغیر سمجھے بوجھے۔ نافہمی سے۔ بلا تجربہ۔

جب تمہارا غیروں سے میل تھا تو تم ان کی وفاداری بیان کیا کرتے تھے اور ہم سُن کے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ اب ان سے بگاڑ ہو جانے پر تمہیں شرمندگی کیوں ہے، جو ہونا تھا سو ہوا۔ بس اب ہم سے مل جاؤ۔ اور ہم سے قسم لے لو ہم اب یہ بھی نہ کہیں گے کہ "کیوں ہم نہ کہتے تھے" مگر تم نے اس وقت ہمارا کہنا نہ مانا اب تو تم پر ان کی بے وفائی سب کھل گئی۔

# قطعہ دریادِ کلکتہ

قطعہ ۳ اشعار ۴

نظم ۲۴۰ اشعار ۴

کلکتہ کا جو ذکر کیا تونے ہم نشیں اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

کلکتہ۔ کالی ایک دیوی کا نام جس کا مندر کلکتہ میں ہے۔ اور کوتہ شگالی زبان میں کلمہ تعظیم ہے بمعنی جناب وحضرت۔ ہائے ہائے۔ کلمہ توجع۔ اور باقی تین شعروں میں حسرت وتمنا کے لئے ہے۔
اے ہمدم وہم نشین تونے جو ذکر کلکتہ کا کیا تو گویا ایک تیر میرے سینہ میں ایسا مارا کہ بے ساختہ منھ سے ہائے ہائے نکلتی ہے۔

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب وہ نازنین بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

مطرا۔ تروتازہ۔ ہے غضب۔ کلمہ تعجب۔ بتانِ خود آرا۔ حسینان کلکتہ۔
کیسے کیسے تعجب انگیز تروتازہ سبزہ زار (پارک) وہاں کے ہیں اور کیسے کیسے حسین اپنی ذاتی وفطری زینت رکھنے والے ہیں کہ جس کو دیکھ کر منھ میں پانی بھر آتا ہے۔

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

صبر آزما۔ بے چین کر دینے والا۔ حف نظر۔ حف شاید مخفف حیف کا ہے بمعنی افسوس وظلم۔
یعنی اگر ان کو نظر بد لگے تو بڑے افسوس اور ظلم کی بات ہوگی۔ یا۔ اردو ہپ کا بگڑا ہوا املا ہے۔ ہپ کے معنی تڑپ رجانے اور نگل جانے کے ہیں۔ یعنی نظر بد ہڑپ ہو جائے۔ بہر طور یہ قیاسات ہیں۔ تحقیق نہیں۔ طاقت ربا۔ قوت تحمل کو دور کر دینے والا۔
وہ ان کی بے چینی کر دینے والی نگاہیں خدا ان کو نظر بد سے بچائے۔ اور وہ ان کے تحمل دور کر دینے والے اشارے کہ جن کو کیا بیان کیا جائے۔ خدا کرے کہ پھر دیکھنے میں آئیں۔

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ　　　وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

کیسے کیسے تازہ اور شیریں میوے کہ جن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ان کا کیا کہنا ہے۔ اور وہ شراب خالص اور سہل البلع کہ جس کی حسرت و تمنا ہے۔

گوارا ۔ آسانی سے گلے سے اتر جانے والی غذا مستعمل بمعنی پسندیدہ۔

---

# قطعہ فی البدیہہ در صفت چکنی ڈلی

قطعہ ۴　　　اشعار ۱۳

نظم ۲۴۱
اشعار ۱۳

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی　　　زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

اچھی تو ہے ہی مگر تمہاری ہتھیلی پر ہونے کی وجہ سے اور خوبی بڑھ گئی اب اسے جتنا بھی اچھا کہا جائے سب اس کے لئے سزاوار ہے۔

خامہ انگشت بدندان کہ اسے کیا لکھئے　　　ناطقہ سر بگریبان کہ اسے کیا کہئے

انگشت بدندان حیران و پریشان۔ فارسی کا محاورہ ہے۔ سر بگریبان متفکر۔
قلم متحیر ہے کہ اس کی کیا تعریف لکھے۔ اور گویائی متفکر ہے کہ اس کے اوصاف کیا بیان کرے۔

مہر مکتوب عزیزان گرامی لکھئے　　　حرز بازوئے شگرفان خود آرا کہئے

حرز ۔ تعویذ۔ شگرف۔ عجیب و غریب۔ شگرفان۔ خود آرا کنایہ از حسینان۔ عزیزان گرامی عزت دار بزرگ لوگ۔

کسی معزز و محترم کے خط کی مہر ہے۔ یا حسینوں کے بازو کا تعویذ ہے۔

مسی آلود سر انگشت حسینان لکھئے　　　داغ طرف جگر عاشق شیدا کہئے

مسی ۔ ہندوستان کی چیز ہے اور سولہ سنگھار میں شامل ہے ۔ فارسی میں سنگھار کی سات ہی چیزیں ہیں انھیں ہر ہفت کہتے ہیں۔ مسی آلود ۔ مسی اگرچہ اُردو کا لفظ اور نکرہ ہے مگر فارسی لفظ (آلود) سے ترکیب دے کر اسم صفت بنا لیا ہے ۔ سر انگشت پور ۔ مگر یہاں انگلی کے اوپر کی پور مطلوب ہے ۔ کیوں کہ سر انگشت کے یہی معنی ہیں ۔ اردو میں انگوٹھا کلمہ کی انگلی ۔ بیچ کی انگلی ۔ مسی کی انگلی (بنصر) چھنگلیا نام ہیں ۔ اور بنصر کو مسی کی انگلی اس لئے کہتے ہیں کہ عورتیں مسی اسی انگلی سے لگاتی ہیں ۔ طرف ۔ گوشہ و کنارہ ۔ اگر داغ دل کہنا ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں ۔ ؎

یا اسے داغ دل عاشق شیدا کہئے

شیدا ۔ فریفتہ و دیوانہ ۔

حسینوں کی مسی بھری پور لکھا جائے ۔ یا عاشق دیوانہ کے کنارہ جگر کا داغ اس کو کہا جائے ۔ داغ عشق بھی عزیز چیز شاعری میں ہے ۔

خاتم دست سلیمان کے مشابہ لکھئے　　　سر پستان پر پریزادسے مانا کہئے

خاتم ۔ بفتح سوم انگوٹھی ۔ سر پستان ۔ بھٹنی ۔ مانا ۔ مشابہ ۔ ملتا ہوا ۔ (مان) امر میں دانا اور بینا کی طرح الف فاعلی ہے ۔ اُردو میں یہ لفظ بول چال میں نہیں ۔ سلیمان کے ہاتھ کی انگوٹھی جس پر اسم اعظم کندہ تھا اسے وہی انگوٹھی لکھا جائے یا حسینوں کے سر پستان سے مشابہ کہا جائے ۔

اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجے　　　خالِ مسکین رخ دل کش لیلےٰ کہئے

اختر سوختہ ۔ بدنصیبی و بدقسمتی کا ستارہ ۔ قیس ۔ مجنون کا نام قبیلہ بنی عامر سے تھا ۔
اسے مجنون کے اختر سوختہ سے نسبت دی جائے ۔ یا لیلیٰ کے رخسارہ دل کش کا خال سیاہ کہا جائے ۔

حجر الاسود دیوار حرم کیجے فرض　　　نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہئے

حجر الاسود ۔ سنگ سیاہ جو دیوار خانہ کعبہ میں نصب ہے اور حاجی اسے بوسہ دیتے ہیں ۔
اسے خانہ کعبہ کی دیوار کا سنگ سیاہ مان لو ۔ یا بیابان ختن کے آہو کا نافہ کہو ۔

وضع میں اس کو اگر سمجھئے قاف تریاق    رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہئے

سمجھئے انھوں نے بروزن فاعلن نظم کیا حالاں کہ بروزن فعولن ہے۔ اور سبزۂ نوخیز مسیحا کہنے کی مناسبت نہ معلوم ہوئی۔ خضر کو سبزہ سے مناسبت دیا کرتے ہیں۔ شاید قافیہ نے مجبور کیا۔ دوسرے شعرا کسی لفظ کے حرف اول کو مضاف قرار دے کر اس لفظ کو مضاف الیہ قرار دیتے ہیں مگر مقصود فی البیان وہ لفظ ہی ہوتا ہے۔ جیسے سعدی کہتے ہیں ؎

کہ چو سین سخن دراز تر است

ظاہر ہے کہ سین کی درازی قابل ذکر لیکن کلام البتہ طولانی ہوتا ہے۔ مگر جناب غالب نے حرف آخر لفظ تریاق کے قاف کو مضاف کیا۔ کیوں کہ قاف کی شکل چکنی ڈلی سے ملتی ہے۔ تریاق۔ معرب تریاک ہر دوائے دافع زہر۔ آج کل تریاک فارسی زبان میں افیون کو کہتے ہیں۔ وضع و شکل میں اگر اسے قاف تریاق کہیں تو رنگ میں اسے سبزۂ نورستہ مسیحا کہنا چاہئے ؎

وضع میں اپنی سمجھئے اسے قاف تریاق

سبزۂ نوخیز مسیں بھیگنا۔

صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز    میکدہ میں اسے خشت خم صہبا کہئے

صومعہ۔ بفتح اول و ثالث و رابع کوہ یا مکان بلند جس میں راہب یا عبادت گذار بقصد تنہائی بیٹھے۔ مہر نماز۔ سجدہ گاہ۔ خشت گاہ۔ خشت خم مسلک رندی میں قابل قدر چیز ہے۔
اسے عبادت خانہ کی سجدہ گاہ قرار دو۔ یا میکدہ کی خم شراب کی خشت سمجھو۔

کیوں اسے قفل در گنج محبت لکھئے    کیوں اسے نقطہ پرکار تمنا کہئے

نقطہ پرکار تمنا۔ لسر کا لگانے اور رجھانے میں عیاش لوگ پان پیش کرنے یا چوری چھپے کسی کے ہاتھ بھجواتے ہیں اور اسے مزہ دار اور خوشبو دار بنانے کے لئے الائچی اور چکنی ڈلی بجائے ڈلی ڈالتے ہیں۔ اور اس سے مطلوب کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔ جس طرح نقطہ مرکز کے بغیر پرکار سے دائرہ نہیں کھنچ سکتا۔ اور صحت دائرہ مرکز پر منحصر ہے اسی طرح حصول تمنا کا انحصار اس چکنی ڈلی پر ہے۔
خزانہ محبت گنج کے دروازہ کا قفل اسے کیوں لکھیں اور تمنا کے پرکار کا مرکز اسے کیوں کہیں۔ یہ آخری چار اشعار قطعہ بند ہیں۔ مجھے یہ استعارات و کنایات و تشبیہات اچھے نہ معلوم ہوئے۔ گو ہر سے کنایہ بھی شاید اچھا نہ ہو۔

کیوں اسے گوہر نایاب تصور کیجئے　　　کیوں اسے مردمک دیدہ عنقا کہئے

اسے گوہر نایاب کیوں خیال کیا جائے اور اسے عنقا کے دیدہ کی پتلی کیوں کہا جائے۔

کیوں اسے تکمہ پیراہن لیلیٰ لکھئے　　　کیوں اسے نقش پے ناقہ سلمیٰ کہئے

تکمہ ۔ آج کل دگمہ (دال وگاف) سے بولتے ہیں اور بٹن کے معنی ہیں۔ اردو میں گھنڈی کے حلقہ کو کہتے ہیں۔

سلمیٰ ۔ فرضی معشوقہ شعرائے عرب۔

لیلیٰ کے پیراہن کا بٹن اسے کیوں کہا جائے۔ اور کیوں ناقہ سلمیٰ کے پاؤں کا نشان بتایا جائے۔

اونٹ کے پاؤں کی گدیلیاں ڈلی سے مشابہ ہیئت میں ہوتی ہیں۔

بندہ پرور کے کف دست کو دل کیجئے فرض　　　اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے

سپاری ڈلی کو اب لکھنو میں نہیں بولتے۔ اس کے معنی حشفہ کے بھی ہیں ؎
اور چکنی ڈلی کو اس کا سویدا کہئے

بندہ پرور سے کرم حسین مراد ہیں۔

آپ کی ہتھیلی کو اگر دل مان لیا جائے تو یہ چکنی ڈلی اس کا سویدا ہے۔

کلکتہ میں کرم حسین نے کہا کہ فیضی نے فی البدیہہ ایک قصیدہ کہہ ڈالا۔ غالب نے کہا کہ اب بھی اللہ کے بندہ ایسے ہیں کہ دو چار شعر فی البدیہہ اب بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس پر کرم حسین نے ایک چکنی ڈلی اپنی ہتھیلی پر رکھ لی اور کہا اس پر کچھ فرمائیے تو غالب نے یہ تیرہ شعر فی البدیہہ کہے۔ اور اس کے صلہ میں وہ چکنی ڈلی اٹھالی۔

---

# بیسنی روٹی کی تعریف میں

قطعہ ۵ — اشعار ۲

نظم ۲ اشعا

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں۔ نکلتے نہ خلد سے باہر — جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

بادشاہ نے جو مجھے یہ بیسن کی روغنی روٹی بھیجی ہے اے مخاطب اس کی حقیقت مجھ سے نہ پوچھ۔ حضرت آدم گیہوں نہ کھاتے۔ بجائے گندم اگر یہ بیسنی روٹی کھاتے تو ہرگز خلد سے نہ نکالے جاتے۔

جناب حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں کہ جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہلِ دربار کے لئے بطور الوش بھیجا کرتے تھے۔ اس کے شکریہ میں کبھی کبھی مرزا کو قطعہ یا رباعی کہنا پڑتی تھی۔

جب چوبدار یہ الوش دے کر چلا گیا تو ایک باہر کا طالب علم جو ان سے پڑھتا تھا بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا بیسنی روٹی کون سی ایسی نادر چیز ہے جو بطور الوش بھیجتے ہیں۔

مرزا نے کہا ارے احمق ایک مرتبہ چنے نے بارگاہ الٰہی میں شکایت کی کہ لوگ مجھ پر بڑا ظلم کرتے ہیں۔ مجھے دلتے، بھونتے، پیستے، پکاتے ہیں اور مجھ سے سیکڑوں چیزیں پکا کر کھاتے ہیں۔ بارگاہ الٰہی سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جا، ورنہ ہمارا دل بھی یہی چاہتا ہے کہ ہم تجھ کو کھا جائیں۔

# قطعہ سہرے کے عذر میں

قطعہ ۶ اشعار ۱۲

نظم ۲۴۳ اشعار ۱۲

منظور ہے گذارش احوال واقعی اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

حالت واقعی کا اظہار منظور ہے۔ اس بیان سے اپنی خوبی طبیعت دکھانا مقصود نہیں۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

سو سے مراد کثرت ہے نہ تعداد۔

مدت دراز سے آبا واجداد سپاہی ہوتے چلے آئے ہیں۔ شاعری کو میں وسیلہ عزت نہیں سمجھتا ہوں۔ گویا شاعر کے نزدیک شاعری سے سپہ گری بہتر چیز ہے۔

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

آزادہ رو۔ وہ شخص جس کا سلوک آزاد لوگوں کا ایسا ہو۔

میری روش آزادوں کی ایسی ہے اور سب کے ساتھ صلح سے پیش آتا ہوں۔ ہرگز کسی زمانے میں کسی شخص کے ساتھ مجھے عداوت اور دشمنی نہیں ہوئی۔

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

ظفر شاہ کا غلام ہونا میرے لئے یہ کیا کم شرف و فخر ہے۔ ہاں اس کے ساتھ یہ بھی مسلم ہے کہ مجھے کوئی مرتبہ و عہدہ و امیری بھی حاصل نہیں ہے۔ مجھے ثروت نہیں۔ یہ کچھ اچھا نہیں ؎

حاصل اگرچہ منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

پرخاش ۔ خصومت وجنگ وجدال ۔ تاب ۔ مجال ۔ طاقت سب مترادف ہیں ۔
بادشاہ کے اُستاد سے مجھے خصومت کا خیال بھی ہو یہ میری مجال نہیں ۔

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر  سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

جام جہاں نما کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں غیوبات دکھائی دیتے تھے ۔
شہنشاہ کا دل خاصیت جام جہاں نمائے جمشید کی رکھتا ہے ۔ لہٰذا مجھ کو قسم کھانے اور گواہ لانے کی ضرورت نہیں آپ خود ہی واقف ہیں ۔

میں کون اور ریختہ ۔ ہاں اس سے مدعا  جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

مجھ اور اُردو شاعری سے کیا تعلق میں تو فارسی گو شاعر ہوں ۔ ہاں اُردو میں جو کہتا ہوں اس سے غرض صرف انبساط خاطر والا ہوتی ہے اور بس ۔

سہرا لکھا گیا زرہ امتثال امر  دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات  مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

سہرا میں نے والدہ جوان بخت کی فرمائش سے لکھا ہے ۔ مجھے ان کا حکم بجالانے کے سوا چارہ نہ تھا ۔
مقطع میں جو میں نے کہا ہے ؎

دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

یہ صرف سنت شاعری کو ادا کیا ہے ۔ کیوں کہ فخر و تعلی ہر بات میں مذموم چیز ہے مگر شاعری میں جائز قرار دی گئی ہے ۔ اس سے قطع محبت کسی سے مقصود نہیں ۔

ظفر نے اس مصرع سے سمجھا کہ میرے استاد ذوق پر چوٹ کرتے ہیں ۔ چنانچہ اس کے جواب میں ذوق سے اسی بحر اور قافیہ میں سہرا کہلوایا ۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ یہ معذرت نامہ قابل تقلید ہے ۔ کس کس خوبی اور حسن اسلوب سے رفع الزام کیا ہے اور استعطاف کے خواہاں ہوئے ہیں ۔

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنون نہیں وحشت نہیں مجھے

کسی سے مراد ذوق۔ سودا کی زیادتی سے جنون کا عارضہ ہوتا ہے۔
اس مصرعہ سے روئے سخن طنزاً حضرت ذوق کی طرف ہو تو دنیا و آخرت میں میرا منھ کالا ہو۔ میں دیوانہ ۔ مجنون اور جنگلی نہیں ہوں۔

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

میری قسمت تو بری ضرور ہے مگر از روئے طبیعت نیک واقع ہوا ہوں ۔ اس وجہ سے اللہ کا شکر گزار ہوں اور قسمت بری ہونے کی شکایت نہیں کیوں کہ طبیعت کا برا نہ ہونا بہت بڑی بات ہے۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

خدا کو گواہ دے کر اے غالب میں کہتا ہوں کہ میں اپنی بات میں سچا ہوں کیوں کہ جھوٹ بولنے کی مجھے عادت نہیں ہے۔

---

# سہرا

قطعہ ۷ — اشعار ۱۱

نظم ۲۴۳ اشعار ۱۱

جناب نظم اس سہرے کے مقابلہ میں جناب ذوق کے سہرے کے اشعار بھی لکھتے جاتے ہیں اور دونوں کے کلام پر انتقاد بھی کرتے جاتے ہیں۔

یہ سہرا جواں بخت فرزند ظفر شاہ کی عروسی کے وقت فرمائش سے کہا گیا ہے۔

نظم ۲۴۳ اشعار ۱۱

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا — باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

جناب نظم فرماتے ہیں کہ خالی سہرا اس محاورہ میں نہیں بولتے ہیں ۔ شاعری ۔ فضیلت یا سعادت کا سہرا کہتے ہیں جیسے کہ ذوق نے کہا ؎

آج ہے یمن وسعادت کا ترے سر سہرا

یہ بھی فرماتے ہیں کہ لفظ "آج" بھی داخل محاورہ ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہ محاورہ کسی واقعہ کے واقع ہوجانے کے بعد بولتے ہیں مثلاً یہ شعر یوں ہو ؎

خوش ہوا اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا باندھا شہزادہ جوان بخت کے سر پہ سہرا

یعنی سہرا باندھنے کی تکمیل تجھی سے ہوئی اور یہ کام کوئی دوسرا نہ کرسکا۔

اس کے بعد نثر میں معنی لکھنے کی ضرورت نہ رہی۔

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

مکھڑا۔ مکھ بمعنی منھ اور چہرہ۔ (ڑا) تصغیر کے لئے ہے اور تصغیر پیار کے لئے ہے۔

اس گورے گورے چہرہ پر یہ سہرا کیسا بھلا اور پیارا معلوم ہوتا ہے۔ تیرے دل کے روشن کرنے والے حسن کا زیور اور زینت ہے۔

تیرے حسن کا زیور ہے (زیور حسن تو) اور دل افروز حسن کی صفت ہے۔

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

لمبر = بلام اُردو میں یہی صحیح ہے انگریزی نمبر NUMBER سے لیا ہے۔ فارسی والوں نے (نمرہ) بنالیا۔

اے گوشۂ تاج تجھ کو نوشاہ کے سر پر چڑھنا زیبا ہے۔ مگر مجھے اس بات کا خوف ہے کہ سہرا کہیں تجھ سے بھی فوقیت نہ لے جائے۔ سہرا تاج۔ ٹوپی۔ پگڑی کے بھی اوپر باندھا جاتا ہے۔

ناؤ بھر کے ہی پروئے گئے ہوں گے موتی ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

ناؤ = ترجمہ کشتی۔ کشتی انگریزی یعنی TRAY (قیاس شاعرانہ ہے)۔ اس سہرے میں ناؤ بھر کے موتی صرف ہوئے ہوں گے اگر ایسا نہ ہوتا تو (ٹرے) میں لگا کر کیوں لاتے۔

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

ہفت بر اعظم کی طرح سات بحر اعظم بھی مانتے تھے۔ اب دونوں پانچ پانچ رہ گئے۔ سات سمندروں کے موتی

اکھٹا کئے گئے ہوں گے تب یہ گز بھر کا سہرا اس انداز کا بنا ہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ سہرے کے ساتھ گوندھنا بولتے ہیں۔ مگر (بنا) اس لئے اختیار کیا ہے کہ اُردو میں (بنا) بمعنی (دولھا) بھی ہے۔ لہٰذا اس لفظ کو لائے جو مناسب محل ہے۔

رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا

رگِ ابر۔ استعارہ مشہور ہے مگر یہاں بے ضرورت معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کے مناسب کوئی لفظ اس شعر میں نہیں ملتا مگر یہ کہ کہیں ریشم کا تاگا جس میں موتی پروئے گئے ہیں اس کے ساتھ رگ کو مناسبت ہے۔ اور پسینہ کا ٹپکنا کیہ کر ابرِ گہربار بنایا۔ موتیوں کا ذکر تو پہلے ہی سے ہے۔

دولھا کے چہرہ سے بوجہ گرمی جو پسینہ ٹپکا لہٰذا پسینہ اور سہرے کے موتی گیا ہیں ابر گہربار ہیں۔

یہ بھی بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

چوں کہ سہرے کی تعریف مقصود ہے اس لئے اس کی فوقیت کا مضمون مناسب مقتضائے مقام ہونا چاہئے۔

دولھا کی قبا سے بڑھ جانا ایک قسم کی بے ادبی بھی اس لئے سہرا قبا کے برابر رہا اس سے آگے نہ نکلا۔

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

مقرر۔ پہلے اس لفظ کو بمعنی بالضرور بولا کرتے تھے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ پھولوں کی وجہ سے معطر ہوتا تو اچھا تھا۔

مقرر کی جگہ حال کے لحاظ مکرر (دوہرا) بھی کہہ سکتے ہیں۔

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیوں کر سہرا

دولھا کے منھ پر باندھے جانے کی خوشی میں پھول اپنے جا پھولوں نہیں سماتے پھر بتاؤ کہ کوئی ان پھولوں کا سہرا کیسے گوندھے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ فصحا آپ میں سمانا بولتے ہیں۔

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

ترصیع کے لئے اگر روشن کی جگہ تاباں بولتے تو اس سے بہتر ہوگا۔ گوہر غلطاں موتیوں کی استدارت کی تعریف میں غلطان لاتے ہیں یعنی اتنے گول کہ اگر انھیں سطح تھالی میں رکھا جائے تو وہ برابر لوٹتے اور گھومتے رہیں اور ایک جگہ نہ ٹھہریں گے۔ دمک ۔ چمک سے زیادہ تاباں ہیں۔

دولھا کے چہرہ کی تابانی اور گوہر غلطان کی درخشانی دونوں مل کے سہرے میں ستاروں اور ماہ کا ایسا نور کیسے نہ پیدا کریں۔

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار　　لائے گا تاب گراں باری گوہر سہرا

ریشم کا تار جس میں موتی پروئے گئے ہیں اسے تار ریشم نہ سمجھو بلکہ یہ رگ ابر بہار ہے جبھی تو اتنے ایک موتیوں کے وزن کو یہ اٹھا سکتا ہے۔ ورنہ اتنا بار تار ریشم سے نہ اٹھتا۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں　　دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

ہم اور غالب میں تغایر اعتباری ہے۔

ہم کلام کے سمجھنے والے ہیں اور غالب کے طرف دار نہیں ہیں۔ دیکھیں ہم بھی وہ کون ہے جو اس سے بہتر سہرا کہہ دے۔

---

# قطعہ در مدح بہادر شاہ نصرۃ الملک

قطعہ ۸　　اشعار ۷

نظرہ ۲۲۵ اشعار، نصرۃ الملک بہادر تو ہی بتلا کہ مجھے　　تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

اے نصرۃ الملک ظفر شاہ بہادر تمہیں بتلا دو کہ مجھے جو تم سے اتنی بڑی عقیدت ہے وہ تمہاری کس بات سے ہے ایسی کونسی بات تم میں ہے جو میں تمہارا اتنا عقیدت مند ہوں۔

نصرۃ الملک خطاب ظفر شاہ ہے۔

احسان و اکرام و انعام اس عقیدت کی علت نہیں ہو سکتا۔ ضرور روحانی اور قلبی محبت و ارادت ہے۔

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے　　　رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ گرجی میں کبھی غور کروں　　　غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

اوقات ۔ اُردو میں عزت و حرمت کے معنی ہیں ۔

جناب نظم فرماتے ہیں (نفرت مری اوقات سے ہے) یہ محض غلط ہے ۔ محاورہ میں مری کی جگہ (اپنی) بولتے ہیں ۔ جناب نظم اس پر تعجب کرتے ہیں ۔

اپنی اوقات نظم ہو ہی نہیں سکتا تھا ۔ مجبور ہو کر مری لائے اگرچہ خلاف محاورہ ہے ۔ ہنگامہ ۔ مجمع و انجمن ۔

تمہاری ذات وہ ہے کہ اگر تم ہنگامہ آرائے انجمن ہوئے تو رونق بزم مہ مہر تمہاری ذات سے ہوتی ہے ۔ اور میں وہ ہوں کہ اگر دل میں ذرا غور کروں تو دوسروں کا کیا ذکر مجھے خود اپنی اوقات سے نفرت ہوتی ہے ۔ ؎

تنفر مجھے خود اپنی اوقات سے ہے

( ڈ اوقا ) بوجہ تسکین اوسط اس تیسرے رکن کا وزن مفعولن ہوگا ۔

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سردست　　　نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

خستگی ۔ زخمی اور مجروح ہونا ۔ اُردو میں تھکن ۔ درماندگی ۔ عاجزی ۔ میں جو معنی کہنا چاہتا ہوں اس کے مناسب (سبب سے) بدولت اچھا ہوگا ۔ سردست ۔ فی الحال ۔

خدا درماندگی اور عاجزی کا بھلا کرے کہ جس کی وجہ سے فی الحال میرے دل کو ایک قسم کی نسبت تیرے ہاتھ سے ہے ۔ یعنی جس طرح تیرے ہاتھ عطا و بخشش کرتے کرتے خستہ و درماندہ ہو رہے ہیں اور تھک گئے ہیں اسی طرح میرا دل خستہ و درماندہ افلاس سے ہے ۔

ہات کا قافیہ ساتھ تھا اور ہے ۔ مگر اس کے قوافی ہیں رات ۔ بات ۔ گھات وغیرہ بھی لائے ہیں اسی وجہ سے غالب نے بھی اسے (ہات) مانا ۔ مگر ساتھ میں سے (ہ) نہیں نکالی ہے ، کیوں کہ التباس (سات) عدد علت سے ہو جاتا ۔

ہاتھ میں تیرے رہے توسن دولت کی عنان　　　یہ دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے

قاضی حاجات ۔ حاجتوں کا پورا کرنے والا ۔ مراد خدا ۔

اسپ دولت و سلطنت کی باگ تیرے ہاتھ میں رہے ۔ خدائے قاضی حاجات سے صبح و شام میری یہی دعا ہے ۔

**تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا — گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے**

ملنا تیرا۔ تو جو مجھ سے ملتا ہے۔ (ملنا تجھ سے) میں جو تجھ سے ملتا ہوں۔ خضر سلطان ۔ بہادر شاہ کے فرزند جو ایک محبوب بی بی کے بطن سے تھے۔ سکندر کا لفظ اس لئے لائے کہ حضرت خضر کے ساتھ تلاش آب حیات میں سکندر بھی تھا۔

تو مرتبہ سکندر فیلقوس کا رکھتا ہے۔ تو جو مجھ سے ملتا ہے تو یہ امر میرے لئے باعث فخر ہے۔ اگر چہ مجھے خضر (حضرت خضر و شاہزادہ) سے بھی ملنے کا شرف حاصل ہے۔

**اس پہ گذرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار — غالبؔ خاک نشین اہل خرابات سے ہے**

خرابات = میکدہ۔

غالبؔ پر مکر و فریب و دغا و دروغ کا گمان نہ ہونا چاہئے۔ میں اہل صلاح و تقویٰ سے نہیں ہوں۔ سالوسی و مکاری تو ان کا کام ہے۔ میں اہلِ مے کدہ اور مے خواروں میں سے ہوں جو صادق القول ہوتے ہیں۔ لہٰذا جتنی باتیں کہیں وہ سچی اور دل سے نکلی ہوئی ہیں۔

---

# متفرقات

## قطعہ دربیان آخری چہار شنبہ ماہ صفر

قطعہ ۹ — اشعار ۵

نظم ۲۴۷ اشعار ۵

**ہے چہار شنبہ آخر ماہ صفر چلو — رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند**

آخری چہار شنبہ ماہ صفر کا۔ اہل تسنن میں روایت ہے کہ اس دن ۱۱ھ میں ماہ صفر ۱۱ھ میں جناب رسالت مآب کے مرض الموت میں کسی قدر افاقہ ہوا تھا تو آپ آبادی سے باہر باغات میں تشریف لے گئے تھے۔ اس کو خوشی کا دن سمجھا جاتا ہے۔

جناب نظم شیعہ ہیں اور اہل تشیع میں یہ روایت نہیں اس لئے لکھتے ہیں۔ تشبیب اس قطعہ میں فقط مدح کی تمہید ہے۔ ورنہ آخری چہارشنبہ کوئی خوشی کا دن نہیں۔

تعجب تو شارحین اہل تسنن سے ہے۔ چار پانچ مشرحین سنیوں کی دیکھیں وہ بھی اس چہارشنبہ کی خصوصیت نہیں بتاتے۔ بہادر شاہ نے یہ خوشی منائی تھی۔

صفراست عربی مہینوں کے نام کی وجہ تسمیہ ہے۔ عرب اسلام سے پہلے است۔ ذیقعدہ اور محرم کو نا ہہا حرام سمجھتے تھے۔ عرب ایک لٹیری قوم ہے ان مہینوں میں لوٹ مار کے لئے گھروں سے نہ نکلتے تھے۔ محرم ختم ہوتے ہی لوٹ کے لئے گھروں سے نکل جاتے تھے۔ گھر مردوں سے تلہا اور خالی ہو جاتے تھے۔ صَفَر۔ صفر بکسر صاد و سکون (فا)۔ سے بنا ہے جس کے معنی خالی کے ہیں۔

یہ بدھ کا دن آخر ماہ صفر کا ہے۔ اے مسلمانو چلو اور چمن میں شراب مشکیں کی ناندیں بھر کے رکھ دیں، خوب شرابیں اڑائیں اور خوشیاں منائیں۔

جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست  سبزہ کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

اگر پھولوں کو پھاندنا کوئی مسنون امر ہے تو خیر۔ ورنہ ذکر مستی ہوتے ہوئے بھی یہ حرکت متانت کے خلاف ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ مصادر مرکبہ میں ترتیب واتصال لازم ہے اور صحیح فرماتے ہیں۔ مثلاً کہہ بیٹھنا۔ بول اٹھنا وغیرہ) اگر ان کو اٹھنا بول۔ اور بیٹھنا کہا جائے تو کیسا ناگوار طبع ہوتا ہے۔ مگر بعض میں ترتیب کا نہ رہنا کچھ زیادہ ناگوار نہیں معلوم ہوتا۔ جیسے یہی (جائے پھاند) ہے۔ شاعر وزن اور قوافی کی پابندی سے ایسا کر لیتے ہیں۔ نثر اور بول چال میں ایسا کبھی نہیں کرتے۔ لہٰذا سب جگہ اتصال و ترتیب کی پابندی بہتر ہے۔ معنی خود عیاں ہیں لکھنے کی ضرورت نہیں۔

غالبؔ یہ کیا بیان ہے۔ بجز مدح بادشاہ  بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند

جناب نظم فرماتے ہیں کہ نہ بھانے کی علت قافیہ کی تنگی ہے۔ کل چھ قافیہ تھے پانچ کو کہہ چکے۔ چھٹا (ہراند) قابل ترک تھا۔

بساند۔ کھراند پہلے بساہند اور کھراہند بولتے تھے اور (ادوان) کو ادوائن تو بساند اور کھراند بھی قوافی ہیں مگر قابل ترک۔ نوشتخواند۔ یا۔ نوشت وخواند۔ لکھنا پڑھنا۔ معانی ظاہر ہیں۔

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں  ہیں جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

اس کی خوشی میں سونے اور چاندی کے چھلّے تقسیم ہوتے ہیں جن کے مقابلہ میں زر مہر اور سیم ماہ کی چمک دمک بھی کچھ نہیں بالکل بے نور ہیں۔

لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند　　　یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے

سمجھئے بروزن فاعلن بجائے فعولن اس سے پہلے بھی نظم کر چکے ہیں۔ اگر چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں۔ سہ
یوں مانئے الخ یوں جانئے الخ۔ یوں جان لو الخ یوں مان لو

جناب ڈاکٹر بجنوری کی طرح ان الفاظ "لاکھوں اور بے شمار" سے یہ خوبی جناب غالبؔ میں پیدا کرے کہ آج کل کی تحقیقات سے جو ثابت ہوا ہے کہ کہکشاں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں سورج اور چاند دکھائی دیتے ہیں ان کا ذہن رسا اور خیال بلند پیشتر سے اس بات کو جانتا تھا تو یہ خوش اعتقادی کے سوا اور کیا ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے ایسی ہی　　اشعار غالب میں پیدا کی ہیں۔ معنی لکھنے کی ضرورت نہیں۔

---

# قطعہ در مدح ظفر شاہ

قطعہ ۱۰　　　　اشعار ۱۱

نظم ۲۴۷
اشعار ۱۱

ا۔ اے شاہ جہانگیر جہان بخش جہان دار　　　ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جہانگیر وغیرہ دنیا بھر کو فتح کرنے والے۔ ساری دنیا کسی کو دے دینے والے۔ عالم بھر کو اپنے قبضہ میں رکھنے والے بشارت۔ تینوں حرکات کے ساتھ ہے مگر کسرہ افصح ہے۔ جناب نظمؔ فرماتے ہیں کہ ہے کی جگہ (ہو) ہو تو اچھا ہے تاکہ شعر دعائیہ ہو جائے۔

اے بادشاہ جہانگیر و جہان بخش و جہاندار تجھے غیب سے ہر دم سو طرح کی خوش خبریاں ملا کرتی ہیں۔ جہانگیر اکبر کے بیٹے کا لقب بھی ہے جن کی نسل میں بہادر شاہ تھے۔

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو　　　تو وا کرے اس عقدہ کو سو بھی باشارت

سو کی جگہ وہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔
جو گرہ مشکل کہ باوجود سعی کسی سے نہ کھل سکے تو اسے صرف ایک اشارہ سے کھول دیتا ہے۔ یعنی حلال مشکلات عالم ہے۔

**ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟ — گر لب کو نہ دے چشمۂ حیوان سے طہارت**

یہ ممکن نہیں کہ حضرت خضر جب تک کہ اپنی طہارت آب حیوان سے نہ کرلیں اس وقت تک تمہارا ذکر سکندر سے کرسکیں۔

**آصف کو سلیمان کی وزارت سے شرف تھا — ہے فخر سلیمان جو کریں تیری وزارت**

آصف بن برخیا کو سلیمانؑ کے وزیر ہونے پر شرف حاصل تھا۔ لیکن حضرت سلیمان اگر تیری وزارت کریں تو ان کے لئے یہ امر موجب فخر ہے۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ جو کی وجہ سے دو معنی نکلتے ہیں۔ یعنی جو سلیمان تیری وزارت کرے تو اس کے لئے فخر ہے۔ یا۔ جو تیری وزارت کرے وہ فخر سلیمان ہے۔ ذکر آصف سے سلیمان سے مراد حضرت سلیمان ہونا چاہئے سلیمان کو نکرہ نہیں بنا سکتے۔ دوسرے معنی کے لئے میاں نے کرے کی جگہ (کریں) بنا دیا ہے وہ صحیح نہ ہوگا۔ (کرے) ہی چاہئے۔ سلیمان جو۔ بجائے جو سلیمان کی تجویز بھی اچھی نہیں۔

**ہے نقش مریدی ترا فرمان الٰہی — ہے داغ غلامی ترا توقیع امارت**

فرمان الٰہی آیہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کی طرف اشارہ ہے۔ کیوں کہ اولی الامر سے مراد بادشاہ مسلمان ہے۔ توقیع کے معنی لکھ چکا ہوں۔ فرمان بادشاہ کا اپنے عہدہ داروں کے نام۔ امارت = امیری و سرداری۔

لوگوں کا تیرا ارادت مند ہونا بموجب حکم الٰہی ہے۔ تیرا داغ غلامی جس کسی نے لگوالیا (یعنی جو تیرا غلام ہوگیا) گویا اسے امیری کا فرمان مل گیا۔

**تو آپ سے گر سلب کرے طاقت سیلان — تو آگ سے گر دفع کرے تاب شرارت**

**ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی — باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت**

سلب = انتزاع چیزے از کسے بغیر قہر و جبر۔ سیلان = روانی۔ شرارۃ = عربی میں نقیض خیر ہے۔ بمعنی

رذالت وخطا۔ انھوں نے شرۃ بمعنی حدت استعمال کیا ہے اور شرارۃ سے ہے۔ موجۂ دریا میں (اس کی جگہ "آب رواں میں بھی") ہو تو صاف اور سیدھا ہو جائے۔ حرارت۔ گرمی۔

تو پانی سے اگر طاقت روانی سلب کرے۔ اور آگ سے تابش حدت دور کر دے تو موج دریا میں روانی ڈھونڈے نہ ملے اور جلتی ہوئی آگ میں حرارت باقی نہ رہے۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ ایسا مبالغہ شاید کوئی ممدوح بھی پسند نہ کرے۔

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیوں کر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر قاصر ہے شکایت میں تری میری عبارت

توغل۔ دور تک نکل جانا۔ پہاڑ پر چڑھنا۔ شکایت۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ بادشاہ سے کچھ شکایت لکھنے کا قصد تھا۔ مگر قافیہ کی تنگی کی وجہ سے مجبوراً دعا پر ختم کرنا پڑا۔

چوں کہ شکایت کا حال کھلتا نہیں۔ لہٰذا اگرچہ مجھے نکتہ سرائی میں کمال حاصل ہے۔ اور جادو نگاری میں بھی بڑی مہارت ہے۔ مگر مدح دعا پر ختم کیسے نہ کروں۔ کیوں کہ تمہاری باتیں اور صفات بیان کرنے سے میری عبارت قاصر ہے۔

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں نظارگی صنعت حق اہل بصارت

نوروز۔ پہلی ماہ فروردیں ایرانی نئے سال کا پہلا دن (نیو ایرس ڈے) اسلام سے پہلے ایرانیوں کا بڑی خوشی کا دن تھا۔ علی العموم اکیس مارچ کو ہوتا ہے۔ یہ زمانہ شباب بہار کا ہے۔ خوب خوب اثمار اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اب بھی ایرانی خوشی مناتے ہیں۔ حضرت کی خلافت ظاہری کا دن مانتے ہیں۔ کیوں کہ یوم غدیر ان کے نزدیک اصلی خلافت کا دن ہے۔

جن کو اللہ نے دل کی آنکھیں دی ہیں وہ ان صنائع الٰہی کو دیکھتے ہیں، کیوں کہ یہ زمانہ بہار ہے۔ مختلف قسم کے میوے پیدا ہوتے ہیں۔

تجھ کو شرف مہر جہاں تاب مبارک غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

عتبہ۔ آستانہ۔ نظارگی۔ تماشائی۔ شرف آفتاب۔ انیسویں درجہ برج حمل میں آفتاب کا نقطۂ شرف ہے۔

تجھ کو شرف آفتاب یعنی عید نوروز مبارک ہو اور مجھ کو تیرے آستانہ عالی کی زیارت مبارک ہو۔
نوروز یکم فروردین کو ہوتا ہے اور شرف مہر درجہ ۱۹ فروردین کو۔

---

# قطعہ دربیان روزہ مع لطیفہ

قطعہ ۱۱ — اشعار ۲

نظم ۲۴۸ اشعار ۲

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — وہ روزہ گر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

افطار۔ روزہ کھولنا معنی وضعی کھانا پینا۔ صوم۔ امساک از طعام وشراب وکلام وسیر وغیرہ۔ روزہ ناچارہ جس کے پاس کوئی تدبیر وعلاج مکروہ سے بچنے کی نہ ہو۔ مجبور۔ اردو میں لاچار زیادہ مستعمل ہے۔
جس شخص کو روزہ کھولنے کا سامان میسر ہو اسے لازم ہے کہ روزہ بالضرور رکھے۔ مگر جس کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو وہ بے چارہ روزہ نہ کھائے تو اور کیا کرے۔

---

# ماہ بماہ تنخواہ ملنے کی درخواست

قطعہ ۱۲ — اشعار ۳۰

نظم ۲۴۹ اشعار ۳۰

اے شہنشاہِ آسمان اورنگ — اے جہاندار آفتاب آثار

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشین — تھا میں اک دردمند سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ہوئی میری وہ گرمی بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرہ ناچیز روشناس ثوابت و سیار

آسمان اورنگ: آسمان۔ جس کا تخت ہو۔ یا۔ جس کا تخت مرتبہ آسمان رکھتا ہو۔ جناب نظم آفتاب آثار میں صنعت براعت اشہلال تجویز کرتے ہیں کیوں کہ آگے جاڑے کی تکلیف اور سردی کھانے کا شکوہ کیا ہے۔ بے نوا۔ بے پیسہ و سامان۔ سینہ فگار۔ زخم دار سینہ والا۔ زخمی دل۔ گرمی بازار۔ رونق۔ شہرت۔ ثوابت۔ علاوہ نو (مع راس و ذنب) یا۔ علاوہ گیارہ مع پلوٹون و اورینس) باقی ستارے فلک ہشتم (کرسی) پر نظام بطلیموسی میں تجویز کرتے تھے۔ راس و ذنب چوں کہ ضمنی سیارے ہیں اس لئے باقی سات کو سات آسمانوں پر مانتے تھے۔ زحل ساتویں پر اور قمر پہلے آسمان پر ہے۔

اے شہنشاہ آسمان تخت اور اے قابض عالم آفتاب کی ایسی نشانیاں رکھنے والے ہیں ایک بے سر و سامان گوشہ نشین فقیر تھا اور میں ایک درد رسیدہ زخمی دل آدمی تھا لیکن جب سے مجھے اپنا نوکر رکھ کے عزت دی تو میری شہرت ہوگئی یہاں تک کہ مجھ سا ذرۂ ناچیز شناسائے ثوابت و سیار ہوگیا یعنی آٹھویں آسمان تک شہرت پہنچی۔ یا مقیم دہلی اور صادر و وارد سب مجھ کو پہچاننے لگے۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقید حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

ہنجار = دستور۔ طریقہ۔ ڈھنگ۔ چلن۔ رواج۔ سلوک۔ رفتار۔ مدار۔ انحصار۔

میری تنخواہ جو پچاس روپیے مقرر ہے۔ اس کے ملنے کا عجیب ڈھنگ ہے۔ دستور ہے کہ مردہ کی چھ ماہی سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہے اور مخلوق اسی کی پابند ہے۔ لیکن مجھے دیکھو کہ زندہ تو ہوں مگر سال میں دو مرتبہ چھ ماہی ہوتی ہے۔

چھ چھ مہینے بعد سال میں دو مرتبہ ظفر شاہ کے یہاں تنخواہیں تقسیم ہوا کرتی تھیں۔

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا　　ہوگیا ہے شریک ساہوکار

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اُردو میں تکرار بمعنی بحث ہے مگر اس شعر میں بمعنی سود در سود لائے ہیں ورنہ تنخواہ کی تہائی سود میں نہیں لگ سکتی۔

بحث کے معنی یوں ہو سکتے ہیں کہ افغانی اب بھی چونی روپیہ ہندوستانی سے سود کا لیتے ہیں۔ ساہوکار۔ مہاجن ۔ داد و ستد کرنے والا (ساہو) کے معنی خود دیانت دار اور ایمان دار ہیں۔
چوں کہ مجھے ہر مہینہ قرض لینا پڑتا ہے۔ اور سود کی کمی و زیادتی پر بحث بھی رہتی ہے۔ پھر بھی مہاجن میری تنخواہ کی تہائی کا شریک ہوگیا ہے۔

آج مجھ سا نہیں زمانہ میں　　شاعر نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستان اگر سُنئے　　ہے زبان میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام اگر کیجے　　ہے قلم میری ابر گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد　　قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

نغز۔ خوب و نیک و عجیب و بدیع۔ قلم اسی دیوان میں مذکر بھی لکھا ہے۔ حضرت داغ بھی مذکر کہہ رہے ہیں۔ مگر آج کل اہل دہلی کی تحریروں سے مؤنث ہی پایا جاتا ہے۔ ظلم۔ اہل شرع تصرف ملک غیر میں فرماتے ہیں۔ حکما وضع الشئ علی غیر محلہ تعریف کرتے ہیں اور یہی خوب ہے۔ قہر۔ جبر۔ غلبہ۔
فی الحال زمانہ میں کوئی شاعر مجھ سا نادرہ گو اور خوش بیان نہیں ہے۔ اگر میں رزم کی داستان بیان کروں تو میری زبان قینچی کی طرح چلتی ہے اور اگر بزم کا حال لکھنا اپنے اوپر لازم کر لوں تو میرے قلم سے ابر نیساں کی طرح موتی برسیں۔ بڑے ظلم کی بات ہوگی اگر میرے کلام کی داد نہ دو۔ اور بڑا جبر ہوگا اگر [illegible] سے بحث نہ کی جائے۔

شرح جناب نظم میں اس قطعہ کے بہت سے اشعار نہ تھے اور وہی میرے سامنے تھی اس شعر بالا کے بعد۔ شرح جناب حسرت کو جو دیکھا تو اور اشعار ملے جو قافیہ ثوابت و سیار کے بعد کے ہیں۔ پھر نظر جناب نظم کی شرح پر جو پڑی تو اس میں بھی یہ اشعار ملے مگر جلد ساز نے اس ورق کو کہیں سے کہیں جلد باندھنے میں کر دیا تھا۔ لہٰذا ان اشعار کو یہاں

پر لکھتا ہوں۔

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری　　ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی　　جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ　　بادشہ کا غلام کام گذار

خانہ زاد اور مرید اور مداح　　تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر　　نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

اگرچہ کسی قسم کا کمال نہ ہونے کی وجہ سے۔ میں خود اپنی نظر میں اتنا ذلیل و خوار ہوں کہ اگر اپنے آپ کو میں خاکی کہوں تو اس نسبت سے خاک کو بھی شرم آئے گی لیکن اپنے دل میں اس بات سے خوش ہوں کہ بادشاہ کا غلام کارکن ہوں۔ خانہ زاد بھی ہوں۔ مرید بھی ہوں اور مداح بھی ہوں۔ اور ہمیشہ سے عرضیاں بھی لکھا کرتا تھا۔ المختصر نوکر بھی ہو گیا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر۔ لہٰذا نوکر ہو کر چار نسبتیں خانہ زادی۔ مریدی۔ مداحی اور نوکری متعین ہو گئیں۔
عریضہ بمعنی درخواست ہندوستان کی گڑھت ہے۔ عربی میں عرض حال کے معنی ہیں۔

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں　　ذوق آرایش سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر　　تا نہ دے باد زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش　　جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

گو ہے زار و نزار۔ جو ہے سخت نزار۔ اور ہے وہ نزار۔ آخری شعر کا آخری حصہ کتنے طرح ہو سکتا ہے۔ (اور وہ بھی نزار) یہ سب سے اچھا ہے تاکہ پوشش کی اہمیت زیادہ ہو جائے۔ پیر مقابل مرید۔ مرشد۔ ہادی۔ زمہریر۔ شدت البرد۔

پیرو مرشد اگرچہ مجھے سرو دستار کی آرایش کا ذوق نہیں ہے۔ مگر زمانہ سرما میں کچھ تو ہونا چاہئے تاکہ شدت سرما کی ہوا تکلیف نہ پہنچائے۔ چیزوں کی مجھے ضرورت کیوں نہ ہو۔ اللہ نے جسم دیا ہے اور وہ بھی دبلا پتلا ہے۔

ان اشعار کے نثر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ پوشش اردو میں صندوق و میز وغیرہ کے غلاف کو کہتے ہیں۔ لحاف و لباس وغیرہ کو نہیں کہتے۔ پوشاک اس لئے نہ کہا کہ وہ اعلیٰ درجہ کے لباس کو اُردو میں کہتے ہیں اور یہ محل کے خلاف تھا اس لئے پوشش کہا جس کے معنی تن ڈھکنے کی چیز ہیں۔

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال      کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ      بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان      دھوپ کھائے تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی      وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

تینوں اشعار میں (آگ۔ دھوپ) بڑے لطف سے صرف کئے دوسرے شعر کا دوسرا مصرع پورا پورا محاورہ ہے۔ وقنا ربنا۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو عذاب دوزخ سے بچا۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ ایسے الفاظ جیسے کہ لیل و نہار ہے اکثر مفرد استعمال کرتے ہیں جیسے اگر یہی لیل و نہار ہے تو زندگی حرام ہے۔ دونوں مؤنث ہوں جیسے خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ ایک مذکر اور ایک مؤنث ہو۔ جیسے اس عورت کا کمر کولا اچھا ہے تب بھی فعل مفرد ہی لاتے ہیں۔

جاندار ۔ جان رکھنے والا یہاں مراد انسان۔ یہ اشعار بھی آسان ہیں لہٰذا کون نثر لکھے۔

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں      مدعائے ضروری الاظہار

وہ مدعا جس کا ظاہر کرنا ضروری ہے آپ سے نہ کہوں تو پھر کس سے کہوں۔

قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

کے بعد کے بقیہ اشعار یہ ہیں۔

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا    آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

اُدھار ۔ قرض و دین ۔
آپ کا غلام ہو کے ننگا پھروں ۔ اور آپ کا نوکر ہو کے قرض کھاؤں ۔

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ    تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

میری تنخواہ مجھے ماہ بماہ ملا کرے تاکہ بسر اوقات میں دشواری نہ ہو (کہ نہ ہو الخ)
ع    مجھے تنخواہ دیجئے ہر ماہ ۔ کہ نہ ہو ۔

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام    شاعری سے نہیں مجھے سروکار

اس کے معانی کیا لکھے جائیں ۔ سروکار ۔ مطلب و غرض ۔

تم سلامت رہو ہزار برس    ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

معنی ظاہر ہیں ۔

---

قطعہ ۱۳    اشعار ۲

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے    جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
(نظم ۲۵ اشعار ۲)

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے    کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

سیہ گلیم ۔ بدبخت سیہ روز غالبہ بتوالی حرکات چوں کہ فارسی میں ثقیل ہے اس لئے وہ دوسرے متحرک کو ساکن کر لیتے ہیں جیسے شفقت بالتحریک سے بسکون فا ۔ شریک غالب ۔ جو تجارت یا اور کسی چیز میں کسی دوسرے سے زیادہ کا حصہ دار ہو ۔

میں ایسا بدبخت ہوں کہ کسی کو میرا نام بھی نہ لینا چاہئے ۔ یا ۔ میرا نام جو غالب ہے یہ نام کسی کو اپنا نہ رکھنا چاہئے ۔ ہر ایسے شخص کو جو دنیا میں فتح و ظفر کا خواہاں ہے ۔ کیوں کہ مجھے کبھی کسی پر غلبہ میسر ہی نہیں ہوا ۔ اور جو کوئی کسی امر میں میرا شریک

ہوا حتی کہ چاہے نام ہی کی شرکت ہو وہ میرا شریک غالب ہوتا ہے لہٰذا بدبختی میں بھی میرا شریک غالب ہوگا۔ یا میرا نام بھی لے تب بھی اس نام لینے کی تاثیر سے مجھ سے زیادہ بدبخت ہو جائے گا۔

# قطعہ بدرخواست رخصت برائے مسہل

قطعہ ۱۴ — اشعار ۲

نظم ۲۵۱ اشعار ۲

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی — مجھ پہ کیا گذرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے

تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد — تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

سہل = آسان۔ مُسہل = دست لانے والا۔ ان دونوں میں صنعت شبہ اشتقاق ہے۔ بن = بغیر
مسہل سے پہلے تین دن منضج پلاتے ہیں تاکہ مادہ فاسد میں نضج پیدا ہو کر اخراج کی قابلیت اس میں پیدا ہو جائے۔ پھر ایک مسہل دے کے تبرید پلاتے ہیں تاکہ ادویہ حارہ مسہل سے امعائی میں خراش نہ پیدا ہو۔ تبرید میں بارد اور لزج ادویہ ہوتے ہیں۔ ایک ایک دن کے فصل سے تین مسہل دیتے ہیں۔ اور مسہل سے خالی دنوں میں تبریدیں پلاتے ہیں۔ یہ سب مل کے بارہ دن ہوتے ہیں۔ غرض کہ بارہ دن کی رخصت مانگی ہے۔

# قطعہ در تاریخ کتخدائی میرزا جعفر

قطعہ ۱۵ — اشعار ۲

نظم ۲۵۲ اشعار ۲

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر — کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ

ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب — نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی محظوظ

خجستہ۔ بفتح جیم و فرخندہ بمعنی مبارک۔ طوئے لفظ ترکی۔ بمعنی کتخدائی۔ شادی۔
میرزا جعفر کون تھے اس کی تحقیق کا وسیلہ میرے پاس نہیں۔ محظوظ۔ حظ سے مشتق کہ بمعنی ہے۔ نصیبا۔ بہرہ۔ حصہ۔ مستعمل بمعنی خوشی۔ و بسرور سعادت۔

جناب غالب تاریخ کہنے سے بہت گھبراتے تھے۔ اور اس کی فرمائش ان کے لئے تکلیف دہ ہوتی تھی اعلیٰ قسم تاریخ کی یہی ہے کہ ایک لفظ میں ہو۔ پورا مصرع حشو سے خالی اچھا ہوتا ہے۔ اگر اس میں کوئی خوبی پیدا کی جائے تو اور بہتر ہے۔ اس کے بعد صوری و معنوی کا مرتبہ ہے اور زبر و بینات سب سے زیادہ مشکل ہے۔

مبارک محفل کتخدائی میرزا جعفر کی کہ جس کے دیکھنے سے سب کا دل خوش ہوا ہے۔ اے غالب چوں کہ مبارک سال میں یہ شادی ہوئی ہے اس لئے اس کا سال سن عیسوی سے لفظ "محظوظ" سے نکلتا ہے۔ جس کے اعداد (۴۰ + ۸ + ۹۰۰ + ۶ + ۹۰۰) یعنی ۱۸۵۴ء ہے۔

---

# دوسری تاریخ انھیں کی شادی میں

قطعہ ۱۶     اشعار ۲

نظم ۲۵۲
اشعار ۲

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی     ہوا بزم طرب میں رقص ناہید

کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے     تو بولا "انشراح جشن جمشید"

ناہید ۔ زہرہ جس کو رقاصہ فلک بھی کہتے ہیں۔ وہ تاریخ عیسوی سن کی تھی اور یہ سن ہجری کی ہے اس سے ۱۲۷۰ھ نکلتے ہیں۔

میرزا جعفر کی جب شادی ہوئی تو محفل شادی میں زہرہ کا ناچ ہوا۔ غالب سے کہا گیا کہ اس کی تاریخ کیا ہوگی تو غالب نے کہا۔ جشن جمشید کی ایسی کشادہ دلی اس میں ہے۔ انشراح جشن جمشید کے اعداد جمل بارہ سو ستر ہوتے ہیں جو ہجری تاریخ ہے۔

قطعہ ۱۷     اشعار ۲

نظم ۲۵۳
اشعار ۲

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں     دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ دھرنے نہیں کرتے ہوئے سلام     اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ دھرنا۔ ایشیائی سلطنت خصوصاً ہندوستان میں دربار شاہی کا یہ دستور، تہذیب تھی کہ

بادشاہ کے سامنے دربار میں اگر کسی دوسرے کو سلام کرنا ہوتا تھا تو ہاتھ ماتھے کی طرف لے جانے کے بجائے کان یا رخسار کی طرف لے جاتے تھے۔ دربار رام پور کا دستور یہ ہے کہ حضور رئیس میں دوسروں کے سلام کے لئے دونوں ہاتھ سینہ پر لے جاتے ہیں۔ اور اس محاورہ کے معنے کسی بات سے انکار اور حاشا کرنے کے ہیں اسی سے یہ مضمون پیدا کیا ہے۔ خانہ زاد۔ اولاد غلام جو آقا کے گھر میں پیدا ہو۔

درباری اگرچہ سب بادشاہ کے غلام ہیں۔ لیکن یہ درباری باہم ایک دوسرے کے آشنا نہیں۔ کیوں کہ دربار میں جب ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں تو ہاتھ کانوں پر رکھتے ہیں۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی کے آشنا نہیں۔

---

۹ر جنوری ۱۹۴۷ء ۱۵ر صفر ۶۶ھ

---

# رباعیات

رباعی ۱ اشعار ۲

نظم ۵۵ اشعار

بعد از اتمام بزم عید اطفال ایام جوانی رہے ساغر کش حال

آپہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم اے عمر گذشتہ الکدم استقبال

بزم عید اطفال۔ بلوغ سے پہلے زمانہ طفولیت میں بچوں کو نہ کسی بات کی فکر ہوتی ہے اور نہ غم ان کا جوش خون ان کو کودا تا پھرتا ہے۔ بلوغ کی حالت میں مستی کی سوجھتی ہے اور قوت شہوانی زور کرتی ہے۔ لفظ (بزم) کی خوبی میں نہ سمجھ سکا۔ (روز) ہوتا۔ استقبال = پیشوائی۔ یہ رباعی تمنائے عود جوانی میں ہے۔

طفولیت کے زمانۂ عید کے پورے ہوجانے کے بعد روز ہائے جوانی مستی میں گذرے۔ اب ملک عدم کے کنارہ تک پیری میں پہنچے ہیں۔ جہان اے جوانی معدوم ہو کر تو پہلے سے ہے۔ اے گذری ہوئی عمر جوانی ایک قدم ہی میرا استقبال کر یعنی اے جوانی مجھ سے مل تھوڑے ہی وقفہ کے لئے بھی تیرا حاصل ہونا غنیمت ہے۔ مدت قلیل ہی کے لئے سہی عود شباب کی حسرت کر رہے ہیں۔

---

# رباعی در غزل

رباعی ۲ اشعار ۲

نظم ۲۵۶ اشعار ۲

شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا

رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک ہر قطرہ اشک دیدۂ پُر نم تھا

عرق = پسینہ شاید بفتحتین ہے بسکون ثانی نہیں۔ عرق فشاں = پسینہ ٹپکتا ہوا یا ٹپکانے والا۔ اسم حالیہ یا اسم فاعل۔ طرفہ = عجیب و نادر و نو۔ عالم = حال و حالت۔

رات کو محبوب کی زلف اور پسینہ ٹپکتے ہوئے چہرہ کا غم تھا کہ وہ پیش نظر نہیں ہے۔ میں اس حالت کو کیا بیان کروں۔ عجیب حال اور عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ ہزار آنکھوں سے صبح تک رویا کیا۔ اور ہر قطرہ اشک ایک دیدۂ نمناک تھا۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ زلف سیاہ اور سپیدی رخسار کے عکس سے ہر قطرہ اشک کو آنکھ بنا دیا تھا۔ چونکہ آنسو کثرت سے بہے اس لئے ہزاروں آنکھیں ہو گئیں۔

# رباعی در غزل

رباعی ۳ اشعار ۲

آتش بازی ہے جیسے شغل اطفال ہے سوز جگر کا بھی اسی طور کا حال

تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

نظم ۲۵۷ اشکار ۲

آتش بازی = FIRE-WORK ۔ گیا ہے نکال = مصدر مرکب نکال جانا سے مشتق ہے (نکال گیا ہے) ہونا چاہئے۔ مگر باوجود تقدم و تاخر زیادہ ناگوار نہیں، جیسے بچوں کا اشتغال آتش بازی سے ہوتا ہے اور وہ اس کے تماشہ سے خوش ہوتے ہیں اور ان سے آگ کے شرارے نکلتے ہیں یہی حال سوز جگر کا ہے کہ اس سے آگ برستی ہے اور دھواں اٹھتا ہے۔ عشق کا ایجاد کرنے والا بھی کوئی آفت کا پرکالا تھا جو لڑکوں کے لئے ایک کھیل اور تماشا نکال گیا ہے۔
جناب نظم فرماتے ہیں کہ لڑکوں سے مراد معشوق ہیں کہ وہ عاشقوں کا دل جلا کے اس آتش بازی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔

# رباعی ۴

دل تھا کہ جو جان درد تمہید سہی بے تابی رشک و حسرت دید سہی

ہم اور فسردن اے تجلی افسوس تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

نظم ۲۵۸

سہی = ہاں۔ مان لیا۔ غنیمت ہے سبے پروائی ہے۔ کچھ ہی ہو۔ حرف تاکید۔ حرف شرط۔ لیکن یعنی صحیح درست۔

جانِ دردتمہید = ایسی جان جو ابتدائے درد مند ہے۔ سہی = پہلے اور دوسرے مصرع میں بمعنی برداشت کی ہے۔ اور چوتھے میں کچھ ہی ہو کے ہوتے ہیں۔ فسردن = افسردگی وانجماد۔ ٹھٹھر جانا۔ تکرار سے مراد اعادہ تجدید نو پیدا کردن۔ جان کے ساتھ (سہی) فعل کو نہ سمجھ سکا۔ سہنا کے معنی برداشت کرنے کے ساتھ جھیلنا وغیرہ کہا جائے تو شاید کچھ کھپ جائے۔ ورنہ درد مند صفت جان کی ہے۔ لہٰذا سہنے کا تعلق جان ہی سے ہوگا (اور جان سہنا) میری سمجھ میں نہ آیا ؎

گر عو درد انہیں تو تجدید سہی

جب دل تھا تو جان درد مند کو بھی جھیلا۔ رشک اغیار اور حسرت دید بھی برداشت کی۔ اب ہم ہیں اور جان افسردہ ہے۔ اے تجلی افسوس ہے اگر تیری تکرار یعنی اعادہ معدوم محال ہے تو از سر نو مجھ میں پھر سوز و گداز پیدا کر تاکہ زندگانی پرلطف ہو جائے۔ یہ افسردگی اور بے دلی پسند نہیں۔

---

# رباعی ۵

نظم ۲۵۹

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے     وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے

یعنی ہر بار کاغذ باد کی طرح     ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

حسد قماش = یہ غالب کی نئی گڑھت بجائے حسد شعار ہے۔ وحشت کدہ = ایسا گھر جس کے دیکھے سے وحشت ہو۔ تلاش = فارسی میں بمعنی جستجو وسعی ہے۔ مگر فارسی کا لفظ نہیں۔ عربی میں بھی مجھے نہ ملا۔ صاحب غیاث کہتے ہیں شاید ترکی کا لفظ ہے اور تالاش لکھنا چاہئے۔ مگر پڑھا (تلاش) جائے گا۔ جناب نظم فرماتے ہیں کہ تلاش سے مراد تلاش معاش ہے اور میرا خیال ہے کہ تلاش خصومت مراد ہوگی کاغذ باد = کنکوا۔ پتنگ۔

مخلوق حسد شعار اور لڑنے پر تیار رہتی ہے۔ خصومت کا وحشت کدہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے لڑنے کے لئے پیدا کرتے ہیں۔ یعنی ہر بار کنکوے کی طرح یہ بدمعاش ملا کرتے ہیں۔

---

# رباعی ۶

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا | اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا | نظم ۲۶۰

پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں | غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا

نژند۔ غمگین۔ پہلے دو مصرعوں کی ردیف (گویا) کچھ زیادہ فائدہ نہیں دیتی۔

دل بے حد غمگین ہو گیا ہے۔ محبوب سے شاکی ہو رہا ہے۔ مگر کیا کریں محبوب کے سامنے کچھ بولا نہیں جاتا گویا منھ میں قفل لگ گیا ہے۔

---

# رباعی ۷

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ | دم رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں | دم رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ

دم رک رک کر۔ نسخہ مطبوعہ تصحیح کردہ جناب غالبؔ و نسخ قلمی کتب خانہ ریاست رامپور میں جتنے نسخے ملتے ہیں سب میں (رک رک) بتکرار ہے۔ اور ہونا بھی یوں ہی چاہئے۔ تکرار ہی سے یہ معنی ہوتے ہیں کہ آہستہ آہستہ تدریجاً رکتے رکتے بالکل بند ہو گیا۔

نسخہ مطبوعہ بدایوں میں سے ایک (رک) نکال ڈالا گیا۔ کیوں کہ جناب نظمؔ نے اپنی شرح میں سب سے پہلے یہ اعتراض کیا ہے کہ وزن رباعی سے ایک سبب خفیف زیادہ ہو گیا ہے۔ اور اظہار رائے کیا ہے کہ عروض عربی ہندوستان کی آب وہوا کے موافق نہیں۔ ہم کو پنگل اختیار کرنا چاہئے۔ ایرانیوں نے مسلمان ہو کر عروض عربی اپنے یہاں لیا۔ مگر بہت سی باتیں جو زبان فارسی کے الفاظ کے لئے مناسب نہ تھیں انھیں ترک کیا اور جو مناسب معلوم ہوئیں ان کا اضافہ کیا۔

جناب آسیؔ نے بھی اپنی شرح میں ایک (رک) کو ترک کر کے لکھا کہ غالبؔ سے یہ امید نہیں ہوتی کہ وہ ناموزوں کہیں یہ کاتب کی غلطی ہو گی۔

مگر اس بات کو نہیں سنبھالتے کہ ان کے صحیح کئے ہوئے اور قلمی نسخوں میں تکرار کیوں ہے۔

ایک (رک) کو نکالنے سے وزن تو ٹھیک ہو جائے گا، اور خرابی وزن دور ہو جائے گی مگر مصرع بے معنی ہو جائیگا۔ کیوں کہ رک جانا اور بند ہو جانا مترادف ہے۔ رک کر بند ہونے کے معنی کیا ہوئے۔ عطف ان دونوں کے درمیان

ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ اور واو عطف تفسیر ہونا۔

لہٰذا اس مصرع ثانی کے بدلے خود جناب غالب کا یہ مصرع ؎

دل سخت نژند ہوگیا ہے غالب

لگا دیا جائے۔ اور اس سے پہلی رباعی کا پہلا مصرع یوں بنا دیا جائے۔ ؎

در عیش کا بند ہوگیا ہے گویا

یا اسی رباعی ہی میں یہ مصرع لگا لیا جائے ؎

در عیش کا بند ہوگیا ہے غالب

اس رباعی کے پہلے مصرع میں (کے) کی جگہ (کو) بھی پڑھ سکتے ہیں۔ سوگند فارسی کا لفظ ہے۔ مترادف قسم۔ کسی چیز کی قسم ہونے کے معنی اس چیز کا ترک اور حرام ہونا۔ محاورہ میں لفظ قسم ہے مگر یہ اس کا مترادف سوگند لائے۔ محاورہ میں تبدیل لفظ نہیں چاہئے۔

دل کو دکھ۔ رنج اور الم ہی پسند آگیا ہے۔ اور دل رکتے رکتے بالکل رک گیا ہے۔ خدا کی قسم رات کو نیند آتی ہی نہیں۔ سونا ہمارے لئے حرام ہوگیا ہے۔

دل کی حرکت بند ہو جانے سے آدمی مرجاتا ہے۔ پھر سونا جاگنا جیتے ہوئے لوگوں کا ایسا کیا۔

## رباعی ۸

نظم ۲۶۲

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ... سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ... گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اے دل۔ چوں کہ میرا کلام مشکل ہے اس لئے سخنوران کامل اسے سن سن کے آسان کرو کی فرمائش کرتے ہیں۔ اگر کچھ کہوں تو مشکل۔ اور کچھ نہ کہوں تو مشکل۔

چوتھا مصرع ضرب المثل ہے۔ گویم مشکل۔ اگر میں یہ جواب دیتا ہوں کہ تم میں میرا کلام سمجھنے کی قابلیت نہیں تو یہ اخلاق کے خلاف ہے اور لفظ سخنوران کامل بھی اس کے منافی ہے۔ یا میں آسان کہوں تو یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔ اور اگر ان کا کہنا نہ مانوں تو مروت کے خلاف ہے غرض کہ عجیب کش مکش میں مبتلا ہوں۔

---

# رباعی ۹

نظم ۲۶۲ بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جم جاہ نے دال — ہے لطف و عنایت شہنشاہ پر دال

یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال — ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

دال ۔ مقابل سالن ۔ دوسرا دال بمعنی دلالت کرنے والا ۔ جدال ۔ جنگ ۔ جھگڑا خصومت حق میں ۔ اس میں سے بھی لفظ (دال نکلتا ہے) چوتھے مصرع میں حرف دال مراد ہے ۔ یہ صرف ایک طرز ادا ہے ورنہ اس کے معنی میں کوئی دخل نہیں ۔ مطلوب دولت و دین و دانش و داد ہی ہے ۔ جم جاہ = جمشید یا سلیمان کا ایسا مرتبہ رکھنے والا ۔

بادشاہ جم جاہ نے جو مجھے دال بھیجی ہے وہ ان کی عنایت اور لطف کو ظاہر کرتی ہے ۔ یہ بادشاہ کی پسندیدہ دال بغیر کسی جھگڑے اور حجت کے عین دولت و دین و دانش اور داد لے کہہ سکتے ہیں ۔

جناب نظم فرماتے ہیں کہ اس طرز ادا کو اوروں نے بھی اختیار کیا ہے مگر نظر غور سے دیکھا جائے تو اس کے کچھ معنی نہیں ہوتے ۔ اگر کسی خوبی کے ساتھ کہا جائے تو ضرور لطف پیدا کرتا ہے ۔ مثلاً یہ قول کسی بزرگ کا عزت بے عین عبادت اور ذلت بے زار، زہد علت ہے ۔ سچ کہتے ہیں ۔ یہ دال (کھانے والی) دین و دولت کی حرف دال ہے اس کے کیا معنی ہوئے ۔

---

# رباعی ۱۰

نظم ۲۶۲ ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم — آثار جلالی و جمالی باہم

ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم — ہے اب کی شب قدر و دوالی باہم

ذوالجلال ۔ صاحب عظمت و بزرگی اللہ کا صفتی نام ہے ۔ آثار جلالی = وہ نشانیاں جو غلبہ و جبروت کو ظاہر کریں ۔ آثار جمالی ۔ وہ علامتیں جن سے لطف و کرم و عنایت ظاہر ہو ۔ سافل = ادنیٰ ۔ پست ۔ کمینہ ۔ اس سے قوم ہندو مراد لی ہے ۔ عالی ۔ علو مرتبت والے ۔ شب قدر = بیس رمضان سے اوپر ہر طاق عدد والی رات ۔ شیعہ شب بست و سوم کو اور سُنی شب بست و ہفتم کو مرجح سمجھتے ہیں ۔ دوالی ۔ دیوالی = اصل میں دیا اور والی سے مرکب ہے یعنی چراغ والی ۔ دسرت اودھ کے راجہ نے رام جی کو بن باس کا حکم بارہ سال کے لئے دیا تھا ۔ حیدرآباد کے

بنوں میں مع زوجہ خود سیتاجی رہتے تھے۔ راون لنکا کا راجہ یہاں شکار کھیلنے آیا تھا اور موقع پاکر سیتاجی کو لے بھاگا تو رام جی نے لنکا پر چڑھائی کی۔ اور فتح پاکر اپنی بیوی کو لے گئے اتنے میں بن باس کی مدت بھی ختم ہو گئی تو اجودھیا میں واپس آئے اور اہل شہر نے ان کی آمد کی خوشی میں چراغاں کیا اس لئے اس تیوہار کو دیوالی کہتے ہیں۔

بادشاہ میں صفات الٰہی اکٹھا ہیں۔ ان میں جلالی اور جمالی دونوں قسم کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ ادنیٰ اور اعلیٰ سب ہی کے خوش کیوں نہ ہوں کیوں کہ اس سال دیوالی اور شب قدر ایک تاریخ کو ہے۔

---

## رباعی ۱۱

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے     تا شاہ شیوع دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ     ہے صفر کہ افزایش اعداد کرے

گانٹھ یہاں کچھ ثقیل معلوم ہوتا ہے اگر ایسا ہو تو یہ مصرع یوں ہو سکتا ہے ؎

یہ رشتۂ عمر میں پڑی ہے جو گرہ

شیوع ۔ پھیلانا ۔ رواج دینا ۔ جاری کرنا ۔ رشتۂ عمر ۔ ایک ناڑا ہوتا ہے کسی شخص کی ولادت کے بعد سے ہر سال گذرنے پر ایک ایک گرہ بڑھاتے جاتے ہیں تاکہ عمر کا اندازہ رہے ۔ جس عدد کی داہنے جانب ایک صفر بڑھایا جائے تو وہ عدد دس گنا ہو جاتا ہے ۔ گرہ کی شکل صفر کی ایسی ہوتی ہے ۔

اللہ بادشاہ کی زندگی سے مخلوق کو خوش کرے ۔ تاکہ شاہ علم و انصاف کو دنیا میں پھیلائے ۔ عمر کے ناڑے میں گرہ لگائی گئی ہے یہ گویا بمنزلہ صفر ہے یہ صفر شمار عمر کو دس گنا کر دے ۔

---

## رباعی ۱۱

نظم ۲۶۶

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا     اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا

ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں     ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

اس عمر کے تاگے میں لاکھ تار ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ (یہ تمنا کوئی معنویت نہیں رکھتی ۔ انسان کے اختیار

کا کام ہے) لاکھ ہی سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عمر کے گنے جائیں۔ ہر سو برس میں جتنی گرہیں پڑیں ان کو ایک مان لیا جائے۔ اور ایسی گرہیں (سو کو ایک مانی ہوئی) ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوں۔ لکھنؤ سے باہر سینکڑا نون کے ساتھ بھی بولتے ہیں۔

## رباعی ۱۲

نظم ۲۶ کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں ۔۔۔ عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں

جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا ۔۔۔ کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

کسی چیز سے ہاتھ اٹھانا۔ اس چیز سے دست بردار ہو جانا۔ اسے ترک کر دینا۔ دوسرا محاورہ صرف ہاتھ اٹھانا ہے۔ جس کے معنی مارنے کے لئے ہاتھ اٹھانا ہوتے ہیں۔ ظلم سے ہاتھ اٹھانے کے دوسرے معنی بدقت یوں ہو سکتے ہیں کہ (سے) کے معنی (کے لئے) کہے جائیں۔ یا بہ سبب کہیں تو کچھ بنیں گے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اب اس نے مردم آزاری چھوڑ دی۔ اور عاشقوں کی پوچھ کچھ سے اسے اب شرم نہیں آتی۔ یہ سب کچھ سہی مگر جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا گیا ہو۔ میں کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہ ہوگی۔ (ہاتھ اٹھانے کے دونوں معنی مخاذہن میں رہیں)۔

---

## رباعی ۱۳

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے ۔۔۔ کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے

کہتے ہیں کہیں خدا سے۔ اللہ اللہ ۔۔۔ وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

درنگ۔ تاخیر۔ اللہ اللہ۔ تعجب۔ حیرت۔ شکوہ و شکایت کے محل پر بولتے ہیں۔ اللہ اسم ذات ہے اور دیگر اسما۔ اسمائے صفات ہیں۔ بعضوں کی رائے ہے کہ (ال + الا) سے مرکب ہے۔ صبح و شام کرنا۔ لیت و لعل کرنا۔ ٹالنا۔ دوسرے معنی وضعی ہیں۔ صبح پیدا کرنا اور شام پیدا کرنا یہ کام اللہ کا ہے اور انسان کی قدرت سے باہر سلام کرنے والے سلامی اور اُمیدوار کام کرنے والے دوسروں کی حاجت پوری کرنے والے صاحب مقدرت ہم اگرچہ سلامی اور اُمیدوار ہیں لیکن صاحبان قدرت و مستطیع ہماری اُمیدوار حاجت پوری کرنے میں درنگ سے کام لیتے ہیں

تو پھر ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ اچھا ان کا پیچھا چھوڑ دو اور اللہ کی طرف رجوع کرو مجھے حیرت و تعجب ہوتا ہے کہ ان کی طرف کیا رجوع کریں وہ تو خود ہی صبح و شام کرنے والے ہیں (اپنے دونوں معنوں کے ساتھ)۔

---

## رباعی ۱۴

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں

روزہ میرا ایمان ہے غالبؔ لیکن خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

اے غالب روزہ کے وجوب کا اذعان بالجنان اور اقرار باللسان ہے۔ اور میرا عین ایمان ہے مگر خورد خواب کا سامان اور آرام کے اسباب جیسے خس خانہ اور برف کا پانی وغیرہ کہاں سے لاؤں یہ چیزیں میسر ہوں تو روزہ رکھوں۔

---

## رباعی ۱۵

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے بھیجے ہیں جو ارمغان شہ والا نے

گن گن کر دیویں گے ہم دعائیں سوبار فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

ارمغان بفتح اول و ثالث۔ ہدیہ۔ تحفہ پیش کش۔ رہ آورد۔ سوغات۔ مراضہ۔ سوبار کی قید اس لئے لگائی کہ تسبیح کے سو دانے ہوتے ہیں۔ تسبیح سبحان اللہ کہنا۔ مالا جس پر وظیفہ پڑھتے ہیں۔ فیروزہ مبدل یا معرب پیروزہ نورتن میں اس کا شمار ہے توتیے کے رنگ کا لعاب دار بڑھیا ہوتا ہے نیشاپور کی کان مشہور ہے۔ یاقوت۔ نیلم۔ ہیرے وغیرہ کی طرح چمک دار اور شفاف نہیں ہوتا ہے۔ دانے اس رباعی کے قوافی میں الف ردی ہے اور (نے) ردیف مگر دو (نے) قافیہ معمولہ ہے جس کی قطع و برید سے قافیہ اور ردیف پیدا ہوتے ہیں۔ ان سیم کے بیجوں کی حقیقت کو کوئی کیا جانے جو بطور تحفہ بادشاہ نے بھیجے ہیں ہم بادشاہ کو گن گن کے سوبار دعائیں دیں گے کیوں کہ یہ بیج تو فیروزہ کی تسبیح کے دانے ہیں۔

فقط شادان ۸ جنوری ۱۹۴۷ء